مینامتی
صدیوں پر پھیلی ہوئی پراسرار و تاریخی داستان
شوکت زیدی

مینا متی

شوکت زیدی

انتساب

اپنی شفیق اور دعا گو

والدہ محترمہ سیّدہ وقار بانو

کے نام

جن کی تربیت، دعاؤں سے

میری ناسمجھی علمیت میں بدل گئی

شوکت زیدی

ترتیب

☆☆

احوالِ مصنّف

اکیڈمی

سیّد شوکت علی زیدی سادات نا ہرہ ضلع مظفر نگر یو پی بھارت کے ایک متوسط مگر علم دوست زمیندار خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مارچ 1948ء میں انہوں نے بھی اپنے والدین اور دو بھائیوں کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی۔ ان کے والد گرامی 1949ء میں سکھر ہی میں انتقال کر گئے تھے اور یوں بہت ہی کم عمری میں ذمہ داریوں سے نمٹنے کے لئے عملی زندگی کی ابتدا کی۔ شوکت زیدی نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول سکھر میں حاصل کی، بعد ازاں انٹر آرٹس ایس ایم کالج کراچی اور بی اے آنرز اور ایم اے کراچی یونیورسٹی سے کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شوکت زیدی کچھ دنوں تک مختلف کالجوں میں لیکچرر بھی رہے بعدازاں 1966ء میں جب انہوں نے مقابلے کا امتحان سی ایس ایس پاس کرلیا تو وہ درجہ اول گزیٹیڈ انکم ٹیکس افسر ہو گئے۔ اس حیثیت میں ان کی پاکستان کے تمام صوبوں میں تعیناتی رہی۔ دوران ملازمت یہ ترقی کرتے کرتے 21 گریڈ میں پہنچنے کے بعد ریٹائرڈ ہو گئے۔ علاوہ ازیں انہوں نے پاکستان اور پاکستان سے باہر کئی کورسز بھی کئے جبکہ دنیا کے تقریباً 35 ملکوں کا تفصیلی سیاحتی ومطالعاتی دورہ بھی کیا۔

شوکت زیدی نے کراچی میں قیام کے دوران بالخصوص اور پاک وہند میں بالعموم اپنی ادبی، سماجی اور ثقافتی خدمات انجام دیں۔ جس کی بنیاد پر انہیں زبردست شہرت حاصل ہوئی ۔ انہیں لکھنے لکھانے کا شوق اور شغف اپنے والد مرحوم سے میراث کے طور پر ملا۔ 1964ء میں ان کے روزنامہ ''حریت'' کراچی میں تنقیدی مضامین ہر ہفتے کئی سال تک شائع ہوئے جو ''دائرے'' کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی منظر عام پر آئے جبکہ اردو نثر نگاروں پر بھی ان کے تنقیدی مضامین ''طاقِ نسیاں'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ 1985ء میں شوکت زیدی نے اپنے مرحوم والد کی یاد میں ایک تعلیمی انجمن ''باقریہ ایجوکیشن سوسائٹی'' کی بنیاد رکھی جس کے سرپرست اعلیٰ وہ خود ہی تھے، اس سوسائٹی کی زیرنگرانی 1986ء میں پہلے دی ایلنس اسکول پھر 1987ء میں دی ایلیٹس ڈگری کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سوسائٹی کے چیئرمین اور دیگر عہدیداروں کی کوششوں اور ان قائم کردہ تعلیمی اداروں کی بنیاد پر ''دی ایلیٹس یونیورسٹی'' کے قیام کے لئے بھی جدوجہد کا آغاز کیا گیا لیکن تاحال ان کی یہ کوششیں ناگزیر وجوہات اور بیوروکریٹک دشواریوں کے سبب بارآور نہ ہو سکیں۔

1985ء ہی میں انہوں نے بزم ثقافت ایلیٹس کالج بھی قائم کی جس کے زیراہتمام چھ سالانہ یادگاری بین الاقوامی مشاعرے منعقد کیے گئے جو کراچی کی ادبی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مشاعرے رئیس امروہوی مرحوم، فیض احمد فیض مرحوم، جوش ملیح آبادی

مرحوم، استاد قمر جلالوی مرحوم اور حسرت موہانی مرحوم کی یاد میں منعقد کئے گئے تھے۔ ان مشاعروں میں سامعین کی تعداد فی مشاعرہ پچیس تیس ہزار تک پہنچتی تھی اور مجموعی طور پر ان مشاعروں میں لاکھوں سامعین نے شرکت کی جو کہ کراچی کی ادبی تاریخ میں ایک ایسا ریکارڈ ہے جس کا ٹوٹنا سر دست خارج از امکان نظر آتا ہے۔

1993ء میں اسی بزم ثقافت کے زیر اہتمام ایک بین الاقوامی کانفرنس بھی منعقد کی گئی جس میں دنیا بھر سے 16 ممالک نے شرکت کی اور شوکت زیدی وان کے تعلیمی ادارے کی بزم ثقافت کو بھی عالمگیر شہرت مل گئی۔ اور یہ بزم ایک نئے ثقافتی وادبی ادارے کی حیثیت سے روشناس ہوئی۔

شوکت زیدی کی بیگم ثریا شوکت اور ان کی بیٹی سارہ زیدی دونوں گولڈ میڈل ہولڈر اور بالترتیب سیاسیات اور صحافت میں فرسٹ پوزیشن ہولڈر رہی ہیں جبکہ ان کے بیٹے عدنان زیدی نیو ارک میں ڈاکٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اور ان کی دو چھوٹی بیٹیاں نادیہ زیدی اور لبنیٰ زیدی کمپیوٹر انجینئرنگ اور او لیول کی طالبات ہیں۔ ان کے دو چھوٹے برادران کراچی میں ہی مقیم ہیں جبکہ والدہ کا انتقال گزشتہ سال ہی ہوا ہے۔

شوکت زیدی خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کی نظمیں، غزلیں، دوہے اور گیت اکثر اخبارات و جرائد میں چھپتے رہے ہیں جبکہ ان کے دو شعری مجموعے زیر طبع ہیں جو جلد ہی منظر عام پر آجائیں گے۔!

☆☆
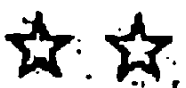
مینامتی، انشائیہ، افسانہ یا ناول؟

شوکت زیدی

☆

اپنی طالب علمی کے زمانہ میں 1954ء میں اساتذہ کے ہمراہ "موئن جو دڑو" جانے کا اتفاق ہوا۔ کھنڈروں میں گھومتے ہوئے میں نے وہاں کے چوکیدار سے پوچھا۔۔۔ "تمہیں ان ہزاروں سال پرانی عمارتوں کے قریب رہتے ہوئے کچھ ڈر نہیں لگتا؟" اس نے کہا "جی مرے ہوئے لوگوں سے کیا ڈرنا......" میں نے پھر پوچھا۔۔۔ "کبھی کوئی ڈرانے والی چیز بھی نہیں دیکھی؟" کہنے لگا۔ "نہیں کبھی نہیں۔ یہ جو گوتم بدھ کا استھان ہے کبھی کبھی یہاں سے گھنگروؤں کے بجنے کی آواز آتی ہے۔

یہ تھا کھنڈروں اور گوتم بدھ کی دنیا سے میرا پہلا تعارف۔ یونیورسٹی آف کراچی سے 1960ء اور 62ء کے درمیان بہت سے تقریری مقابلوں میں شرکت کے لئے پنجاب وغیرہ جانا ہوا ایک بار ٹیکسلا کی سیر کے لئے گئے تو ذہن نے پھر وہی سوال وہاں کے محافظ سے دہرایا۔

"تمہیں یہاں کوئی غیر معمولی چیز تو محسوس نہیں ہوتی؟......"

"نہیں مگر کبھی کبھی ایسی چاپ ضرور سنائی دیتی ہے کہ جیسے کوئی گھونگرو باندھ کے چل رہا ہے"

1966ء میں فنانس اکیڈیمی کی طرف سے مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلہ دیش) جانے کا اتفاق ہوا۔ ڈھاکہ سے کچھ دور ایک گوتم بدھ کے زمانے کا کھنڈر "مینا متی" نام کا موجود ہے وہاں گئے تو اس بنگالی چوکیدار سے اتفاقاً وہی پرانا سوال پھر دہرایا۔

"...... تمہیں یہاں ڈر تو نہیں لگتا"؟

"ہاں جی کبھی کبھی۔ یہ جو گوتم کا پگوڈا (افغانستان [illegible]) [illegible] ۔ کبھی کبھی [illegible]
کرتا ہوا اترتا ہے مگر پھر یہ آوازیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں [illegible] آوازیں [illegible]
جاتی ہیں......'

ایک تعلق گوتم بدھ کے پگوڈا اور موسیقی اور کسی گھوکر دل آواز [illegible] ان میں پیدا ہوا اس کا تھا وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ مجھے ان دیکھی دنیا زیادہ مرغوب نظر آنے لگی۔ سامنے کے مندرے کے مخفی اثرات کھلنے لگے مردوں کی دنیا میں گزرے ہوئے زمانوں میں۔ [illegible] جیسے کھنڈرات میں عجائب خانوں میں رکھی ہوئی قدیم اشیاء میں دنیا بھر کے آثار ماضی کے واقعات میں میرا دل کھنچتا رہا۔ اور ماضی کے واپس آنے کے امکانات میں ایک سوندھے خودی محسوس ہونے لگی اور "مینا متی" کا خاکہ ذہن میں ابھرنے لگا۔ تانے بانے بنتے چلے گئے اور یہ جو ناول آپ کے ہاتھ میں ہے وہ تیار ہوتا چلا گیا۔

1979ء میں ملتان پوسٹنگ ہو گئی۔ وہاں کا ماحول ایک بے نام سے تصوف کی فضا میں ملفوف ہے اولیاء اللہ کے مزارات صدیوں زندہ رہنے والی صاحب قبر کی زندگی کی دلیل ہیں۔ موت بہت سی شخصیات کو صرف چھو کر گزرتی ہے ان کے اعمال واقوال کو موت ضائع نہیں کرتی۔ مینا متی کا بیشتر حصہ ملتان ہی میں لکھا گیا...... مگر اکثر راتوں کو سرکاری دوروں کے درمیان ریسٹ ہاؤسز کی تنہائیوں میں اس کی "مشق سخن" جاری رہی۔ یہیں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ آخر یہ دنیا کیا یونہی چلتی رہے گی اس کا عدم پھر وجود میں ظاہر ہوگا کیا اس پوری کائنات میں ہم اکیلے ہیں یا دوسری دنیائیں بھی ہیں؟ اگر ہیں تو ان سے ہمارا تعلق کیا ہے؟ کیا مُردہ افراد، بادشاہوں اور تاریخ کے قصے کہانیوں کی دوبارہ ظہور پذیر ہونے کی یا زندگی ملنے کی کوئی امید رہتی ہے یہ اہراموں میں زندگی کی واپس آنے کے لئے منتظر مُردوں کی تختیاں، زندگی بعد الموت کا اسلامی تصور، لاماؤں کی مُردوں کو تلقین اور اسلام میں رجعت کا تصور، ہندوؤں میں آواگون سب کیوں؟ کسی نہ کسی طرح ماضی کے پلٹ آنے اور زندہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، پھر یہ بھی سوال ذہن میں ابھرنے لگے کہ کیا اسلام اور عرب میں حضورؐ کی آمد اور مولا علیؑ کی شخصیت کی اہمیت اور آخری زمانہ میں امام مہدی کے ظاہر ہونے کی اطلاعات کیا دنیا کے دوسرے مذاہب میں بھی موجود ہیں یا صرف ہم ہی اس ضمن میں

خوش عقیدگی کا شکار ہیں؟ یہ بھی دل میں سوال پیدا ہوتے تھے کہ مذاہب کی تقسیم کیوں ہوئی کیوں کہیں معبود سورج سمجھا گیا کیوں کہیں اس کو پرم آتما، کہیں خدا کہیں گاڈ کہا گیا اور کہیں خدا کو ہزار خانوں میں تقسیم کر دیا گیا، آہستہ آہستہ یہ راز بھی کھلتا چلا گیا کہ جیسے دنیا بھر کا ہر انسان ایک ہے اسی طرح معبود بھی ایک ہی ہے، سارے مذاہب ایک اہرامی تکون کی طرح اوپر جا کر ایک معبود حقیقی پر دلالت کرتے ہیں، یہ بھی راز کھلنے لگا کہ ماضی یاد رکھا جاتا ہے وہ ذہنوں میں زندہ رہتا ہے، اس عدم کی بھی ایک زندگی ہے اس کا اپنا سحر ہے اس کے اپنے کردار ہیں اور ایک حساس قلمکار یا فنکار یا متخیل دماغ اس ماضی کو کاغذ پر یا الفاظ کی صورت میں پھر سے گزرے زمانوں کو کاغذ پر انڈیل سکتا ہے۔

جب تک میں نے مینا متی لکھی میں پاکستان سے باہر نہیں گیا تھا مگر 1979ء کے بعد دنیا کی سیاحت کے موقعے ملتے گئے۔ پانچ مرتبہ اہرام مصر اور مصر کے تمام مشہور آثار قدیمہ کی سیر کی۔

پاکستان کے تقریباً تمام ہی کھنڈر دیکھے پاکستان سے باہر بھی بہت سارے عجائب گھر دیکھے اور اسطرح گزری ہوئی دنیا میرے سامنے آنے لگی۔ دنیا کے مذاہب کا مطالعہ کیا اور تمام انسانوں کو ایک ہی فکری اور خلوقی اور کسی عظیم ہستی کی پرستش کی لذت میں گرفتار پایا۔

مینا متی کے تانے بانے اہرام مصر، بابل، موئین جودڑو اور مینا متی (مشرقی پاکستان) کے گرد گھومتے ہیں موئین جودڑو اور مینا متی کا تذکرہ اس کے حصہ دوئم میں آئے گا۔ یہ بیک وقت ناول بھی ہے اور تحقیق بھی۔ مکالماتی بھی ہے بیانیہ بھی۔ آثار قدیمہ کے سربستہ رازوں کے انکشاف کا پیرایہ بھی اور مذاہب عالم کے ان شواہد کی طرف اشارہ بھی کہ ہمیشہ کسی اوپر سے آنے والی ہستی کا خوف اور ادراک ہر جگہ موجود رہا ہے، آپ جوں جوں اس کے آخری حصہ کی طرف بڑھیں گے اس بات کا اظہار زیادہ ہوتا جائے گا کہ مذہب اسلام اور اس کی سرکردہ شخصیات خدا کی خاص منتخب کردہ ہستیاں ہیں اور ان کی عظمت و جلالت ہر دور میں کسی نہ کسی طرح ظاہر ہوتی رہی ہے۔

مینا متی کا پہلا حصہ آپ کے سامنے ہے۔ اس لئے سحر میں گرفتار ہونے کے لئے تیار رہئے۔

شوکت زیدی

مینامتی کیا ہے ؟

ضیاء شہزاد

☆

اب سے تقریباً 35 سال پہلے کی بات ہے۔ سات رنگ ڈائجسٹ اپنی ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن تھا اور میں اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لئے شب و روز کوشاں تھا، ہر طبقۂ فکر سے مشورہ لینا ان دنوں میرا محبوب مشغلہ تھا۔ شوکت زیدی کا شمار میرے ان دوستوں میں ہوتا ہے جو حقیقی معنوں میں دانشور کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ سات رنگ ڈائجسٹ میں جو بھی نکھار آتا رہا، اس میں ان کے مشورے کارفرما رہے۔ پھر انہی دنوں میں نے شوکت زیدی سے کچھ لکھنے

کی فرمائش کی۔ ویسے تو مجھے معلوم تھا کہ انکم ٹیکس کی فائلوں کے ڈھیر سے سر اُٹھا کر کچھ لکھنا شاید ان کے لئے ممکن نہ ہو سکے لیکن اچھی اور خوبصورت تحریر حاصل کرنے کی جستجو کے سبب میں بار بار ان سے تقاضہ کرتا رہتا تھا۔ شوکت زیدی کی تحریر کا جادو میں اس سے قبل بھی روزنامہ "حریت" کراچی میں دیکھ چکا تھا، جب وہ "دائرے" کے عنوان سے مسلسل مضامین لکھ رہے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دن شوکت زیدی نے ایک رجسٹر میرے حوالے کر دیا۔ یہ "مینا متی" تھی ۔ایک کہانی، ایک داستان اور ایک تاریخ جو بقول ان کے میرے مسلسل تقاضوں کے سبب لکھی گئی تھی ۔۔ میں نے سرسری طور پر اس تحریر پر نظر ڈالی تو ایسا لگتا تھا کہ کسی نے بڑی عجلت میں کچھ لکھا ہے۔ ایک نظر دیکھنے میں وہ تحریر کٹے پھٹے اور بے ربط جملوں کا مجموعہ نظر آتی تھی۔ گھر آنے کے بعد اسی رات تھکا ہوا ہونے کے باوجود میں نے سوچا کہ ذرا پڑھ کر دیکھ لیا جائے، ممکن ہے کہ اس پر کچھ کام کرنا پڑے یا پھر یہ سات رنگ کے معیار کے مطابق ہی نہ ہو۔

بس پہلا پیرگراف پڑھنے کی دیر تھی کہ پھر میں اسے پڑھتا ہی چلا گیا۔ مجھے "مینا متی" پڑھتے ہوئے یوں لگا جیسے مجھے سحر زدہ کر دیا گیا ہو۔ تحریر میں جادو کچھ ایسا تھا کہ آخری سطر تک مجھے ہوش ہی نہیں تھا۔ یوں تو مجھے ہزاروں کی تعداد میں کہانیاں، ناول، افسانے اور مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن "مینا متی" پڑھ کر مجھے یوں لگا کہ زندگی میں اگر کچھ پڑھنے کا موقع ملا ہے تو صرف "مینا متی" ہے۔ شوکت زیدی کی اس جادو بھری تحریر کے متعلق میں بلا مبالغہ یہی کہوں گا کہ اب تک میری نظر سے اردو زبان میں کوئی ایسا نثری سلسلہ نہیں گزرا۔ دلچسپ اور چٹخارے دار تحریریں تو بے شمار لکھی گئی ہیں۔ کتابوں کے انبار لگے ہوئے ہیں لیکن "مینا متی" میں جو بات ہے، میرے پاس اس کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس انوکھی تحریر کی تعریف اور توصیف کے لئے میں کیا اور کیسے لکھوں۔"

مینا متی" حقیقت پر مبنی وہ کہانی ہے، جو بیک وقت اپنے جلو میں بہت سے پہلو لیے ہوئے ہے۔ کبھی اسے پڑھتے ہوئے قاری تاریخ کے گمشدہ اوراق کا سفر کرتا ہے، کبھی جغرافیائی سطح

عبور کرنے کا موقع ملتا ہے، کبھی یوں لگتا ہے کہ کسی مبلغ کے سامنے دوزانو ہو کر کسی آسمانی صحیفہ کا کوئی باب سننے کا اتفاق ہو رہا ہے۔ کبھی محسوس ہوگا کہ ماضی سے عہد جدید تک سائنس نے ارتقا کی جو منزلیں طے کی ہیں۔ وہ سب کچھ مینا متی کے ذریعے جاننے کا سنہری موقع مل رہا ہے۔ نسل انسانی کن ادوار سے گزرتی رہی ہے اس پر سیر حاصل اور جادو اثر بیان مینا متی کا دوسرا نام ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دنیا کی قدیم تہذیبوں کے بارے میں جو انکشافات مینا متی میں کیے گئے ہیں۔ وہ بلا شبہ ادب کے ایک قاری کے لئے بڑے چونکا دینے والے ہیں۔ مصر، بابل، نینوا اور عراق کی تہذیب، اہرام، مصر کے پراسرار اور پر ہول آسیبی سلسلے اور موہنجوڈرو کی پانچ ہزار سالہ تہذیب اصل میں کیا ہے؟ مینا متی ان کا جواب ہے۔ شوکت زیدی نے مینا متی کے ذریعے ادب کے ایک عام قاری کو دنیا کے تقریباً سب ہی مشکل اور سہل علوم سے آشنا کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مینا متی پر تبصرے کی دعوت دنیائے ادب کے مختلف اور معتبر ناموں کو دی جائے تو ہر شخص کا تبصرہ اتنا مختلف اور جداگانہ اور بے حد دلچسپ ہوگا کہ شاید اسے بھی ایک کتاب کی شکل میں طبع کروانا پڑے۔

"مینا متی" کی سات رنگ ڈائجسٹ میں آٹھ قسطیں شائع ہوئی ہیں، جو اہرام مصر اور مصر کی تہذیب کے پس منظر میں تھیں۔ دو غیر مطبوعہ قسطیں عراق کے پس منظر میں ہیں، جو سات رنگ میں شائع نہیں ہو سکی تھیں مگر اب زیر نظر کتاب میں شامل ہیں۔

ان دس قسطوں پر مبنی "مینا متی" کا جادو اب تحریری جادو ہے، جو بلا مبالغہ سر چڑھ کر بولے گا۔ میرا دعویٰ ہے کہ اردو ادب میں آج تک اتنی دلچسپ اور مکمل و جامع تحریر لکھی ہی نہیں گئی، جو بیک وقت مختلف ادوار، تہذیب، علوم کا کہانی کی شکل میں احاطہ کیے ہوئے ہو۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ "مینا متی" اگر دوسری زبانوں میں منتقل ہوئی ہوتی تو یہ ان زبانوں کے لیے بھی اگرانقدر اضافہ کا باعث ہوگی۔

"مینا متی" کی سب سے بڑی خصوصیت میری نظر میں اس سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہے

کہ سات رنگ برسوں ہوئے بند ہو چکا ہے مگر مینا متی کا حوالہ اسے آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے اور یہ بات اس اعتبار سے بڑی حوصلہ افزا ہے کہ سات رنگ جلد ہی دوبارہ منظر عام پر جلوہ گر ہوگا۔

شوکت زیدی دنیائے ادب کا وہ سپوت ہے، جو بیک وقت ایک تسلیم شدہ دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر، ادیب، افسانہ نگار۔ مضمون نگار اور تاریخ دان بھی ہے۔ "مینا متی" کی شکل میں شوکت زیدی نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ نثری ادب میں اتنا اہم اور بھاری بھرکم اضافہ ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد بڑے بڑے ادبی بت سرنگوں نظر آئیں گے اور شوکت زیدی ان سب سے الگ اور بلند دکھائی دے گا اس لیے کہ ابھی تک اردو ادب میں اس کے پایہ کا کوئی ادیب اور نثر نگار نہیں ہوا۔

ضیاء شہزاد

ایڈیٹر "داستان ڈائجسٹ" کراچی

مینامتی کی دنیا

ڈاکٹر جاوید منظر

ضیاء شہزاد صاحب دنیائے صحافت کے ممتاز اور منفرد صحافی ہیں۔ جن کی تحریر اپنے قاری کا دل موہ لیتی ہے۔ ایک ایسی شخصیت کسی کتاب پر مجھ سے اظہارِ خیال کی فرمائش کرے یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ ضیاء شہزاد صاحب نے کتاب کا مسودہ دیتے ہوئے فرمایا بھئی یہ شوکت زیدی کی کتاب کا مسودہ ہے جسے انشائیہ، افسانہ، ناول آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ شوکت زیدی کا

نام سنتے ہی میں نے سوچا کہ شوکت زیدی اور ضیاء شہزاد صاحب کی محبتیں تو میرے لیے سرمایہ حیات ہیں۔ مسودہ کی ورق گردانی کرنے لگا جیسے جیسے تحریر نظر سے گزرتی گئی میں حیرت واستعجاب کی کیفیت سے دوچار ہوتا چلا گیا اور اس مسودے پر لکھنا میری مجبوری بن گئی کیونکہ یہ میرا خاص موضوع ہے۔ اس مسودے کا ایک اقتباس پیش ہے:

''آج ۸/اپریل ۱۹۲۳ء کی رات بارہ بجے میری انگلیوں سے خون بہنا شروع ہوگا جو میری موت کا سبب بنے گا۔ میری موت کو طبعی نہ سمجھا جائے یہ خودکشی بھی نہیں ہے۔ میری لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے کیونکہ موت کا سبب ڈاکٹروں کو نہ معلوم ہو سکے گا۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ بینک آف انگلینڈ کے لاکرز میں، نوسیسہ کی تختیاں اور ایک قدیم مردہ ہاتھ کی تین خشک انگلیوں کی ہڈیاں جو میرا قیمتی سرمایہ ہیں، موجود ہیں۔ یہ میرے بیٹے ولسن میلکم کو جو قاہرہ میں آثارِ قدیمہ کی مہم میں شامل ہے۔ دے دی جائیں۔''

المشتہر

سرجان میلکم...عمر چالیس سال

۳۷ ہارلے اسٹریٹ لندن

''مینا متی'' کے باب نمبرا کی اس ابتدائی تحریر نے مجھے مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ لیا۔ بہتر ہوا گر مینا متی کے پس منظر کو دیکھ لیا جائے۔

''مینا متی'' دراصل سابقہ مشرقی پاکستان (جسے اب بنگلہ دیش کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے) کے شہر ڈھاکہ کے قرب میں واقع گوتم بدھ کے زمانے کے کھنڈرات ہیں جنھیں بنگلہ زبان میں ''مینا متی'' کہا جاتا ہے۔

۲۱ر جون ۱۹۴۸ء کو سر جان میلکم کے بیٹے ولسن میلکم کی موت بھی اپنے باپ کی موت کی طرح انھیں حالات میں چالیس برس کی عمر میں ہوئی جس کی خبر لزبن اور لندن کے اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی کہ ولسن میلکم جو ۱۹۰۸ کو رات کے بارہ بجے پیدا ہوئے تھے میڈیکل رپورٹ میں بھی کوئی طبی وجہ کی نشان دہی نہیں ہو سکی۔ اسی طرح انگلیوں سے خون فواروں کی طرح بہنا شروع ہو گیا اور یوں چند منٹوں کے اندر ولسن میلکم بھی موت کی وادی میں چلے گئے۔ اس خبر سے یہ بھی پتہ چلا کہ ولسن نے پہلے ہی اپنے دوستوں کو اپنی موت کے بارے میں وقت اور موت کا طریقہ بتا دیا تھا۔

اس خاندان کے تیسرے فرد یعنی ولسن میلکم کے بیٹے ولیم کی موت بھی انھیں حالات میں ہوئی۔ ان حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے ولیم کے بیٹے جوزف میلکم نے سوچا کہ میں بھی اب چالیس برس کا ہونے والا ہوں اگر میں نے اس سربستہ راز سے پردہ نہ اٹھایا تو میں بھی اپنے باپ دادا کی طرح چالیس برس کی عمر میں موت کا شکار ہو جاؤں گا۔ بعد تلاش بسیار جوزف کو اپنے دادا کی خودنوشت مل گئی جو اس سے قبل کسی کو بھی نہیں مل سکی تھی۔

جوزف میلکم نے اس داستان کو پرتگال کے اخبار کی ''دی کالونی'' میں شائع کیا اور یہی داستان محترم شوکت زیدی نے ''دی کالونی'' سے خصوصی اجازت نامہ کے ذریعے حاصل کی۔

جوزف میلکم نے یہ خودنوشت کو پڑھنے کے بعد داستان کے انداز میں لکھی جس کی چند سطریں اہل علم و دانش کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

''میرا نام جان میلکم ہے۔ میں انگلینڈ کا باشندہ ہوں ۱۸۸۳ء
میں کیمبرج کے قریب لٹل ٹیلفورڈ میں پیدا ہوا تھا اور میری
کچھ جائیداد لزبن میں بھی موجود ہے۔ میری عمر اب ۱۹۲۳ء
میں چالیس سال کی ہونے والی ہے۔ حالات کچھ ایسے ہیں
کہ شاید یہ سال میری زندگی کا آخری سال ہوگا۔ میں علم
تاریخ کا ایک مشہور طالب علم ہوں۔ میں نے سر جان مارشل
کے ہمراہ مصر، وادیٔ دجلہ، وادیٔ سندھ اور وادیٔ برہم پترا
میں متعدد کھنڈرات کی کھدائی میں حصہ لیا ہے۔ تاجِ برطانیہ
نے میری خدمات کے صلے میں مجھے 'سر' کا خطاب عطا کیا
ہے۔ جو کچھ لکھ رہا ہوں ممکن ہے افسانہ معلوم ہو
مگر بعض اوقات ہماری زندگی میں کچھ ایسے بھی واقعات
آ جاتے ہیں جو ناقابلِ یقین اور ناقابلِ توجیہ ہوتے ہیں۔
میرے ساتھ یہ ناقابلِ توجیہ واقعات اس وقت پیش آنے
شروع ہوئے جب میری عمر پندرہ سال کی تھی۔''

جوزف میلکم کی یہ خوبصورت تحریر پڑھنے کے بعد تجسس کی لہر ہمارے ذہن و دل میں یقیناً رواں ہوگی۔ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے تعمیری ادب انسانی زدگی کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ مینا متی جیسی کتب ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں اور یہی نہیں بلکہ ہم ایسی کتابوں سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں اور ہمارے معاشرے میں یورپ و امریکہ کی طرح کتابیں پڑھنے کا رواج ہمیں کتابیں خریدنے پر مجبور کرتا ہے۔

شوکت زیدی نے یہ خوبصورت ناول اہرامِ مصر اور مصر کی تہذیب کے تناظر میں تحریر کیا

ہے۔ آثارِ قدیمہ دراصل انسانی فکر کا وہ منفرد زاویۂ نگاہ ہے جسے ہم ماضی سے حال کا رشتہ جوڑنے میں شب و روز مصروف ہیں۔

''مینا متی'' دو حصوں پر مشتمل ہے جس کا پہلا حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اس پہلے حصے کو شوکت زیدی نے سات رنگ ڈائجسٹ کو اشاعت کے لیے پیش کیا، سات رنگ ڈائجسٹ نے دس اقساط میں سے آٹھ اقساط سلسلہ وار شائع کیں جبکہ دو قسطیں شائع نہیں ہوئی تھیں مگر اس کتاب میں شوکت زیدی نے تمام اقساط کو شائع کیا ہے۔

اس کتاب کے پبلشرز ضیاء شہزاد ان دنوں سات رنگ ڈائجسٹ سے وابستہ تھے جب انھوں نے اس کتاب کو قسط وار شائع کیا تھا۔ آجکل ضیا شہزاد ''داستان ڈائجسٹ'' کراچی کے مدیر ہیں۔

شوکت زیدی مرکزی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں دورانِ ملازمت وہ ۱۹۷۹ء سے دنیا کے گوشے گوشے میں یہ دیکھنے کے لیے گئے کہ یہ کائنات کیا ہے، کیا یہ اب بھی ناتمام ہے؟

انھوں نے مینا متی میں ایسے ایسے چونکا دینے والے انکشافات کیے ہیں جو ادبی دنیا کو حیرت زدہ کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ انھوں نے موہن جوداڑو کی پانچ ہزار سالہ تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ مصر، بابل، نینوا، ہڑپہ کو جس انداز میں پیش کیا ہے اسے بے مثال تحریر کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اُن کا اندازِ تحریر منفرد بھی ہے اور دلنشین بھی۔

اُن سے میرا تعلق ڈھائی تین دہائیوں پر مشتمل ہے آج سے کوئی پچیس برس قبل شوکت زیدی ایلیٹ کالج میں پابندی سے عالمی و کل پاکستان مشاعرے کراتے تھے، دبستانِ کراچی کے ممتاز اور معتبر شعرائے کرام کو مدعو کرتے تھے، یادِ رفتگاں کے حوالے سے بہت اہم مشاعرے ان کے ادبی ذوق کا پتہ دیتے تھے انھیں مشاعروں میں قمر جلالوی کی یاد میں جو مشاعرہ ہوا اس میں دنیا

کے اہم شعرائے کرام کو شوکت زیدی نے ایک سے شامیانے میں بٹھایا تھا۔

شوکت زیدی کا وہ دور جب انھوں نے کراچی سے شائع ہونے والے ڈان گروپ کے مشہور اخبار روزنامہ ''حریت'' میں دائرے کے عنوان سے تسلسل کے ساتھ قارئین کو خوبصورت مضامین پیش کیے اور آج یہ کتاب ''مینامتی'' پڑھ کر مجھے تقویت ہوئی کہ شوکت زیدی کینیڈا میں رہ کر بھی اسی تندہی سے اردو زبان وادب کی بھرپور خدمت کر رہے ہیں۔

آج جب بین الاقوامی طور پر اردو زبان کو دنیا کی دوسری زبان قرار دیا جا چکا ہے مجھے یقین ہے کہ شوکت زیدی کی ''مینامتی'' عالمی سطح پر مقبول کتابوں کی صف میں سرِ فہرست ہوگی جس کا دنیا کی تمام اہم زبانوں میں ترجمہ کیا جائے گا اور اردو دنیا شوکت زیدی کی اس کامیابی اور کامرانی پر فخر محسوس کرے گی۔

☆☆

شوکت زیدیؔ، مینا متی اور میں

رحمت روہیلہ

☆

شوکت زیدیؔ سے میرا تعارف غالباً ۱۹۵۱ کے اوائل میں اسلامیہ ہائی اسکول والس گنج سکھر میں ہوا تھا۔ میں اور وہ دونوں پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ہم دونوں پرانا سکھر کے رہائشی تھے۔ میرا مکان حسن چوک کے علاقے بھائیہ گلی میں واقع تھا اور شوکت زیدیؔ کا مکان ہماری گلی سے دو گلی آگے یعنی قریشی روڈ پر واقع تھا۔ یوں ہم محلہ دار بھی تھے۔ کلاس میں ہم دونوں ایک ہی بنچ پر بیٹھا کرتے تھے۔ میں ایک عام سا طالب علم تھا جبکہ شوکت زیدی ایک ہونہار اور ذہین طالب علم تھے۔ اسکول کے اساتذہ ان کی ذہانت سے متاثر تھے۔ ہماری جماعت کے مانیٹر بھی غالباً شوکت زیدیؔ ہی تھے۔ عام بچوں کی طرح شوکت زیدی کا بھی یہ لڑکپن کا دور تھا۔ لیکن اس لڑکپن میں بھی شوکت زیدیؔ کے ذہن میں دانش کا کافی ذخیرہ موجود تھا، وہ ڈبیٹر بھی تھے اور لکھک بھی۔

شوکت زیدیؔ بہت خوبصورت تھے اور ذہین بھی لہذا ہر لڑکے کی خواہش ہوتی تھی کہ شوکت اس کا دوست بن جائے۔ میں تو شوکت زیدی کا فطری دوست تھا کہ کلاس میں ایک ہی بنچ پر بیٹھتے تھے، محلے دار تھے اور اسکول ساتھ ساتھ آنا جانا بھی تھا۔ لہذا ہماری دوستی پکی تھی اور پھر ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہم بچھڑ گئے اور شوکت زیدیؔ اعلیٰ تعلیم کے لئے کراچی منتقل ہو گئے جبکہ میں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ بی کام کیا اور پراونشل سول سروس کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت میں چلا گیا۔

شوکت زیدی کبھی کبھی مختصر مدت کے لئے سکھر آتے، نشاط ہوٹل میں نشست ہوتی۔ دیگر احباب بھی آجاتے خوب گپ شپ ہوتی اور رات گئے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے۔ شوکت زیدی کی خبریں احباب سے ملتی رہتی تھیں۔ کبھی معلوم ہوتا ملتان میں ہیں، کبھی معلوم ہوتا لاہور میں ہیں اور کبھی کوئٹہ۔ سرکاری ملازمت میں سیلانی بننا ملازم کی مجبوری ہوتی ہے سو وہ مجبوری تا اختتام ملازمت جاری رہتی ہے کہ میں بھی اسی مجبوری کا اسیر رہا اور در در کی خاک چھانتا رہا۔

میں ۱۹۸۸ میں سکھر کو خیر آباد کہہ کر کراچی آ گیا تو بڑے صاحبزادے محمد کامل خان نے بتایا کہ انکل شوکت زیدی آج کل کراچی میں ہیں، سو ایک روز ہم انکے دفتر میں وارد ہو گئے۔ بہت خوش ہوئے موصوف کسی مشاعرے کو آرگنائز کرنے میں مصروف تھے اس طرح ہمارے اسکول کے زمانے کے تعلقات دوبارہ استوار ہو گئے۔

ضیاء شہزاد سے میرا تعارف سکھر کے مرکز ''نشاط'' میں ساٹھ کی دہائی میں شہر کی ایک معروف و معتبر ادبی و صحافتی شخصیت جناب رشید اطہر بھوپالی کے توسط سے ہوا تھا۔ (ان دونوں حضرات کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب ''عکس ناتمام'' میں کیا ہے)۔ ضیاء شہزاد بھلے اور ایماندار آدمی ہیں) شجر صحافت میں بہت سینئر ہیں بلکہ اب ان کا شمار صحافت کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ گزشتہ سال مجھے سعادت نصیب ہوئی اور میں عمرے کی غرض سے سعودی عرب گیا، میرا بیٹا وہیں ملازم ہے وہاں قیام کے دوران میں مختلف اخبارات اور جرائد کا مطالعہ کرتا تھا اسی مطالعے کے دوران ایک دن جب میں ''سعودی گزٹ'' پڑھ رہا تھا تو اچانک ایک مختصری خبر پر میری نظر پڑی تو، میرا دل انتہائے مسرت سے اچھل پڑا۔ خبر کے متن کے مطابق ہندوستان کی مدھیہ پردیش کی ایک یونیورسٹی کی طالبہ جن کا نام اس وقت میرے ذہن میں نہیں آرہا، ضیاء شہزاد کے کام پر P.hd کر رہی ہیں۔ میں مسرت اور حیرت کی کیفیت سے دوچار رہتے ہوئے خبر پڑھ رہا تھا۔ ان دونوں کیفیات کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ ضیاء شہزاد سکھر والے ہی تھے جو ایک طویل عرصے سے کراچی میں صحافت سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز و معروف شاعر بھی ہیں، اس کے باوجود کہ وہ کسی

لابی سے منسلک نہیں رہے اور گوشۂ گمنامی کو پسند کئے رکھا لیکن عالمی پلیٹ فارم ''فیس بک'' پر ان کے کلام کی بڑی دھوم رہتی ہے اور وہ دنیا کے پسندیدہ ترین اور قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے بے حد مقبول ہیں۔ بھارت کی جو طالبہ ان پر P.hd کر رہی ہیں وہ ان کے صحافتی اور شعر و ادب پر کئے گئے کام پر کر رہی ہیں۔ ''سعودی گزٹ'' کی خبر میں اگر ان کا کراچی کے حوالے سے ذکر نہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ شاید ضیاء شہزاد کوئی اور ہوں گے لیکن وہ ضیاء شہزاد یہی ہمارے دوست ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے کام اور نام کو توقیر عطا فرمائے۔

ضیاء شہزاد اور راقم دونوں شوکت زیدی کے مشترکہ دوست ہیں۔ شوکت زیدی کا کام اور نام دونوں سے بلند ہے۔ شوکت زیدی ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ ادیب اور دانش ور بھی ہیں۔ راقم ہنوز، طفل مکتب ہے اور علم کا متلاشی نا معلم، نا ادیب اور نا شاعر سو میرا یہ منصب کہاں کہ میں شوکت زیدی جیسے تخلیق کار اور ان کی تخلیق پر خیال آرائی کر سکوں۔ ضیاء شہزاد نے جس طرح مجھے پینٹ کیا ہے۔ یہ محض ان کی غلط فہمی ہے اور کچھ نہیں۔ حکم ہوا کہ میں بھی شوکت زیدی کے تاریخی ناول ''مینا متی'' پر چند سطریں تحریر کروں سو وہ حاضر ہیں۔

شوکت زیدی کا ناول ''مینا متی'' بھی کائنات کے تہذیبی راستوں کا ایک خوشگوار سفر ہے۔ جو آج کے جدید انسان کو اپنی تہذیب، تاریخ اور ادیان سے متعارف کرواتا ہے اور انسان کی Mystery کو سمجھنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ ناول تاریخ بھی ہے اور تہذیب کا گوشوارہ بھی۔ میرے نزدیک شوکت زیدی کا ''مینا متی'' اردو ناول نگاری کا ایک شاہ کار ہے اور انسانوں کی تہذیبوں کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر عہد کا انسان اپنی دنیا، تاریخ اور تہذیبوں کا عکس دیکھ سکتا ہے۔ خصوصی طور پر اردو ادب کے طالب علموں کے لئے ایک انمول اور بیش قیمت تحفہ ہے جس پر تحقیق کر کے Ph.D کی ڈگری حاصل کی جا سکتی ہے۔

باب نمبرا

"آج ۸/اپریل ۱۹۴۳ء کی رات بارہ بجے میری انگلیوں سے خون بہنا شروع ہوگا جو میری موت کا سبب بنے گا۔ میری موت کو طبعی نہ سمجھا جائے۔ یہ خودکشی بھی نہیں ہے۔ میری لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے کیونکہ موت کا سبب ڈاکٹروں کو نہ معلوم ہو سکے گا۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ بینک آف انگلینڈ کے لاکرز میں نوسیہ کی تختیاں اور ایک قدیم مُردہ ہاتھ کی تین خشک انگلیوں کی ہڈیاں جو میرا قیمتی سرمایہ ہیں، موجود ہیں۔ یہ میرے بیٹے ولسن میلکم کو جو قاہرہ میں آثارِ قدیمہ کی مہم میں شامل ہے دے دی جائیں۔"

المشتہر

سرجان میلکم........ عمر چالیس سال

۳۷۔ہار لے اسٹریٹ۔ لندن

لندن کے تقریباً تمام اخباروں میں برصغیر کے نامور تاریخ داں، سندھ اور دجلہ و نیل کی قدیم تہذیبوں کے ماہر سرجان میلکم کا یہ اعلان چھپا اور لزبن، پرتگال کے اخبار "دی کالونی" میں بھی یہ اعلان شائع ہوا کیوں کہ سرجان میلکم کا قانونی مشیر جوزف اسٹینلے اس وقت لزبن ہی میں تھا۔ سرجان کا انتقال بالکل اسی طرح ہوا جیسی کہ انہوں نے نشان دہی کی تھی اور جریانِ خون کا کوئی سبب معلوم نہ ہوسکا اور نہ ہی کسی بیماری کی نشان دہی ہی ہوسکی۔

۲۱۔ جون ۱۹۴۸ء کو لندن اور لزبن کے اخبارات میں اور خصوصاً لزبن کے اخبار "دی کالونی" میں ایک اور خبر یوں چھپی:۔

"سرجان میلکم کے فرزند اور برطانیہ کے ایک ممتاز ماہرِ آثارِ قدیمہ ولسن میلکم کل ۲۱، جون ۱۹۴۸ء کو نہایت عجیب و غریب حالت میں انتقال کر گئے۔ اُن کی عمر کل ہی چالیس سال کی ہوئی تھی۔ وہ ۱۹۰۸ء میں رات بارہ بجے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی انگلیوں سے یکایک فواروں کی طرح خون بہنا شروع ہوا اور چند منٹ کے اندر ہی اندر وہ انتقال کر گئے۔ میڈیکل رپورٹ میں موت کی کوئی طبی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ ولسن میلکم کے قریبی

دوستوں کا کہنا ہے کہ مرحوم کو اپنی موت کے صحیح وقت اور طریقۂ وفات کا بہت پہلے سے علم تھا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی انشورنس پالیسی کی حقدار ان کی بیوہ ہوں گی اور ان کے نوادرات کے سرمایہ میں سے سیسہ کی نو تختیاں اور کسی قدیم لاش کی انگلیوں کی تین ہڈیاں شامل ہیں۔ تختیوں پر کسی نامعلوم زبان میں عجیب پراسرار تحریریں موجود ہیں جو ہر دس سال کے بعد یکم فروری کو خون کی طرح سرخ ہو جاتی ہیں اور تپتے ہوئے لوہے کی طرح روشن نظر آتی ہیں۔ ان کا تذکرہ ولسن نے کئی بار اپنے دوستوں سے بھی کیا تھا۔ حسنِ اتفاق سے ولسن کا بیٹا ولیم میلکم بھی ایک آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے سلسلے میں کمبوڈیا میں تعینات ہے۔ چنانچہ ولسن میلکم کی وصیت کے مطابق تمام نوادرات ولیم کی تحویل میں دے دی جائیں گی۔ "حیرت کی بات یہ ہے کہ سرجان مارشل کے مشہور ہمراہی اور مختلف علاقوں میں آثار قدیمہ کی کھدائیوں میں حصہ لینے والے سرمار میلکم اور اب سرجان ولسم دونوں ایک ہی طرح کے حالات میں فوت ہوئے ہیں"۔

ولیم میلکم کا انتقال بھی ان ہی حالات میں ہوا اور اکتوبر ۱۹۷۱ء میں لندن کے اخبارات میں پھر اسی قسم کی خبریں شائع ہوئیں کیوں کہ ولیم میلکم ان دنوں لندن ہی میں رہائش پذیر تھے۔ "دی کالونی" میں اس خبر کے ساتھ ایک تفصیلی مضمون بھی شائع ہوا جس میں میلکم خاندان کے تین سربرآوردہ تاریخ دانوں اور ماہرِ آثارِ قدیمہ کے یکے بعد دیگرے ایک ہی قسم کے حالات و واقعات میں چالیس سال کی عمر میں اس دنیا سے گزر جانے کا تذکرہ تھا اور ہر ایک کو اپنے وقتِ انتقال اور طریقۂ رحلت کا علم تھا اور ہر ایک نے وصیت کی کہ اس کی موت کی تفتیش نہ کی جائے۔ ہر ایک کسی نادیدہ طاقت کے اثرات سے واقف تھا اور اس سے خوفزدہ بھی۔ نہ کسی نے اس اثر کو زائل کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی نے ان رازوں سے پردہ اٹھایا جو اس خوف کا باعث بنے تھے۔ تینوں افراد نے یہی وصیت کی تھی کہ ان کی موت کو نہ تو خودکشی قرار دیا جائے اور نہ ہی طبعی موت سمجھا جائے۔

ان حالات میں جوزف نے جو ولیم کا بیٹا تھا اس بات کا عہد کیا کہ وہ ہر صورت میں اس سربستہ راز سے پردہ اٹھائے گا کہ آخر وہ کون سی مافوق الفطرت طاقت ہے جو اس خاندان کے سربراہوں کو چالیس سال سے زیادہ زندہ رہنے نہیں دیتی۔ جوزف کی عمر ۱۹۶۹ء میں سترہ سال کی تھی مگر اس میں استقامت، عزم، عمل، اور لگن کی کوئی کمی نہ تھی۔

ایک دن وہ "کالونی" اخبار کے دفتر پہنچا اور ایڈیٹر کے ساتھ دیر تک ان حالات پر گفتگو کرتا رہا جن کے تحت اس کے پردادا، دادا اور باپ کا انتقال ہوا تھا۔ اس نے انتہائی غم و غصہ اور پُرجوش لہجے میں کہا۔

"اب میرا بھی وقت آگیا ہے۔ اگر میں نے کچھ نہ کیا تو میرا حشر بھی میرے باپ دادا کی طرح ہوگا۔ میں کسی بھی حالت میں لاوارثوں کی طرح مرجانے پر تیار نہیں ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کیمبرج یونیورسٹی میں آنرز کی کلاسوں میں داخلے کو فی الحال ملتوی کر کے اپنی تعلیم چھوڑ دوں گا اور ان حالات کی تحقیق کروں گا جن کے زیر اثر سب سے پہلے میرے دادا سر جان میلکم کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔"

چنانچہ جوزف نے ان حالات کی تفتیش شروع کر دی جو اس کے دادا سر جان میلکم کو پیش آئے تھے۔ سیسہ کی وہ نو تختیاں جو اُس خاندان کا سربستہ راز تھیں اس کے مطالعہ میں آگئیں۔ سُوکھے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کی تینوں ہڈیاں اس کی تحقیق کا مرکز بن گئیں۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے خاندان کی ملکیت کے تمام ملفوظات، کتابیں، پرانے مسودے، نوٹس، تحریریں سب ہی نکال کر از سرِ نو دیکھنا شروع کیں۔ جوزف رات دن اسی دھن میں غرق رہتا تھا کہ کسی طرح گتھی کا سرا ہاتھ آجائے۔ وہ ان تحقیقی مضامین کی گہرائیوں پر غور کرتا رہتا تھا جو سر جان مارشل اور ان کے ہمراہ میرے دادا سر جان میلکم نے مختلف یونیورسٹیوں اور مجالس میں پڑھے تھے۔ تین سال کے عرصے میں وہ قاہرہ، بابل، موئن جو ڈارو اور بنگال کے ضلع کومیلا میں بھی گیا تھا۔ یہ تمام وہ مقامات تھے جہاں اس کے پردادا سر جان مارشل نے قدیم تہذیبوں کے آثار دریافت کیے تھے یا اُن پر تحقیق کی تھی۔ اور انہی مقامات پر بعد میں کچھ عرصہ سر جان میلکم نے بھی آثار قدیمہ کی تحقیقات میں حصہ لیا تھا۔

آخر کار اس جستجو اور عرق ریزی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُسے اپنے پردادا کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کچھ نوٹس اور چند ڈائریاں ایسی مل گئیں جو ابھی تک کسی کے بھی زیر مطالعہ نہیں آئی تھیں۔ ان تمام جزئیات اور کڑیوں کو ملا کر جوزف نے وہ طویل تاریخی داستان لکھی جو لندن کے اخبار "دی کالونی" میں چھپی۔ یہ داستان دسمبر ۱۹۷۵ء سے جولائی ۱۹۷۶ء تک لگاتار اس اخبار میں روزانہ شائع ہوتی رہی۔ یہ ایک عجیب و غریب سرگزشت ہے۔ جو ناقابلِ یقین حد تک پراسراریت لیے ہوئے ہے۔ جوزف میلکم ابھی تک بقیدِ حیات ہے اور اقوام

متحدہ کے ذیلی ادارہ یونیسکو میں ایک اہم اور باعزت عہدے پر تعینات ہے۔ سرگزشت نہ صرف یہ کہ یہی ہے بلکہ ابھی تک سرجان میلکم کے کچھ ساتھی بھی بقیدِ حیات ہیں جنھوں نے کالونی، میں ہی خط لکھ کر جوزف کی داستان کے بعض حصوں کی تصدیق کی تھی۔ اس سرگزشت میں نہ صرف اہرام مصر کے پراسرار حالات، بابل کے جیتے جاگتے شہر کے مناظر طوفان نوح کشتی نوح اور پھر موہن جو ڈارو اور کومیلا کے ضلع میں واقع میناتشی کے کھنڈرات کے تذکرے ہیں۔ بلکہ گوتم بدھ اسلام ہندو مت اور عیسائیت کے احوال بھی موجود ہیں۔

ہم نے یہ داستان، دی کالونی، پرتگالی روزنامہ کی خصوصی اجازت سے اُردو میں منتقل کی ہے اور چونکہ اس میں نہ صرف وادیٔ سندھ بلکہ سابقہ مشرقی بنگال، کے بعض قدیم ادوار کا اور دنیائے اسلام کے مستقبل کا خاصا عکس ہے اس لیے اس کو ایک آزاد اور رواں ترجمہ کے ساتھ اردو قارئین کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ ہم آئندہ کسی اشاعت میں وہ خصوصی اجازت نامہ بھی شائع کر دیں گے جو پُرتگال کے اخبار "دی کالونی" سے ہم نے حاصل کیا ہے۔

سرگزشت جو جوزف میلکم نے پنے دادا کی خود نوشت داستان کے طور پر لکھی ہے یوں ہے:-

میرا نام جان میلکم ہے۔ میں انگلینڈ کا باشندہ ہوں میں ۱۸۸۳ میں کیمبرج کے قریب لٹل شیلفورڈ میں پیدا ہوا تھا اور میری کچھ جائیداد لزبن میں بھی موجود ہے۔ میری عمر اب ۱۹۲۳ء میں چالیس سال کی ہونے والی ہے۔ حالات کچھ ایسے ہیں کہ شاید یہ سال میری زندگی کا آخری سال ہوگا۔ میں علم تاریخ کا ایک مشہور طالب علم ہوں۔ میں نے سرجان مارشل کے ہمراہ مصر، وادیٔ دجلہ، وادیٔ سندھ اور وادیٔ برہم پترا میں متعدد کھنڈرات کی کھدائی میں حصہ لیا ہے۔ تاج برطانیہ نے میری خدمات کے صلے میں مجھے "سر" کا خطاب عطا کیا ہے۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں ممکن ہے افسانہ معلوم ہو مگر بعض اوقات ہماری زندگی میں کچھ ایسے بھی واقعات آجاتے ہیں جو ناقابلِ یقین اور ناقابلِ توجیہ ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ یہ ناقابلِ توجیہ واقعات اس وقت پیش آنے شروع ہوئے جب میری عمر پندرہ سال کی تھی۔

میرا عہدِ طفلی بہت نازو نعم اور محبت کی فضا میں گزرا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ معاشی طور پر ہم لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا کاٹیج ایک زرعی فارم کے ساتھ برمنگھم کے قریب قصبہ باٹرن میں ایک چھوٹی سی ندی کے قریب واقع ہے۔ ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک گھنا اور غیر آباد جنگل تھا۔ ہم نے اپنے فارم پر بطخیں اور مرغیاں پال رکھی تھیں۔ اکثر اوقات میں اپنی شکاری بندوق لے کر اکیلا ہی جنگل میں دور تک نکل جاتا تھا اور چھوٹی چھوٹی چڑیاں، ننھے خرگوش اور کبھی کبھی گلہری اور چڑیاں بھی مار لیا کرتا تھا۔ مہم جوئی میری فطرت میں شامل تھی۔ مجھے ہمیشہ نت نئے راستے، طریقے اور علمی نکتے معلوم کرنے کا جنون سا رہتا تھا۔ ہر نیا ماحول مجھے پُرجوش بنا دیتا تھا۔ شروع ہی سے میری دلچسپی علم تاریخ میں تمام مضامین سے زیادہ تھی۔

ہمارا مکان لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ مگر نہایت آرام دہ سا کاٹیج تھا۔ جب برف پڑتی تھی تو میرے والد، میری والدہ، ہماری خادمہ اور میں کئی کئی دنوں تک مکان سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ہم لوگ آتش دان کے قریب کمبل اوڑھے کرسیوں پر بیٹھے رہتے تھے اور تاجِ برطانیہ کی عظمتوں کے تاریخی قصے سنتے اور سناتے رہتے تھے۔ برفیلی راتوں میں کئی کئی بار قریب کے جنگل سے بھیڑیوں کی چیخیں، جنگلی گیدڑوں کی آوازیں اور لومڑیوں کے سرگشت کی چاپ سنائی دیا کرتی تھی۔ سرد اور خاموش راتوں میں ان جنگلی جانوروں کی آوازیں ماحول کو بے حد پُراسرار بنا دیا کرتی تھیں۔ اس ماحول میں میری نیند اکثر راتوں کو اُڑ جایا کرتی تھی۔ دل میں خوف سا آنے لگتا تھا اور ذہن نامعلوم کہاں کہاں بھٹکنے لگتا تھا۔ ایسے میں، میں اپنے پسندیدہ مضمون تاریخ کی کتابیں الماری سے نکال لیتا تھا اور بستر پر لیٹ کر اُن کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ کچھ تو سرد اور ویران راتوں کا سحر اور کچھ گزرے ہوئے بادشاہوں اور لوگوں کے قصے اور کچھ میرے اپنے تخیل کی پرواز مجھے زمانۂ قدیم کے افراد کے ساتھ ساتھ ان ہی کے زمانے تک پہنچا دیتے تھے۔

کبھی مجھے ایسے خواب نظر آتے کہ میں زمانۂ قدیم کے لشکروں کے ساتھ گھاس کے جوتے پہنے ہوئے چمڑے کا لباس، جانوروں کی کھال اوڑھے، لوہے کے تیر کمان کندھے پر لٹکائے، ہاتھوں میں ڈھال اور بلم لیے گھوڑے دوڑاتا پھر رہا ہوں۔ کبھی مجھے ایسا لگتا کہ میں کسی قبیلے کا سردار ہوں اور ان کے ساتھ کسی قربان گاہ تک جا رہا ہوں۔ جہاں مجھے کوئی

قربانی ادا کرنی ہے۔ کبھی لگتا تھا کہ مشہور جنرل ہنی بال کے ساتھ کوہِ یورال کی برف پوش بلندیوں کو عبور کر رہا ہوں۔ کبھی وائیکنگ کے ساتھ ہوتا اور کبھی ہن کے سردار اٹیلا کے ساتھ ساتھ۔ غرضیکہ میرا تصوراتی ذہن مجھے جاگتے سوتے نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتا تھا۔ جُوں جُوں میرا مطالعہ گہرا ہوتا گیا، یورپ کی قدیم تاریخوں سے، ان کی جزئیات سے میری واقفیت اور زیادہ ہوتی گئی۔

اینگلو سیکسن تاریخ ہی کے مطالعہ نے مجھے اپنی قوم کی عظمتوں سے روشناس کرایا۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ کا زمانہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ زمانہ تھا جب برطانیہ کے تاج کی چمک نے تمام دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا تھا۔ ہماری قوم کے اقبال کا سورج نصف النّہار پر چمک رہا تھا۔ ہمارے اسکول کے استاد، میری ماں، ایک میری گورنس سب کے سب ہمیں یہی درس دیا کرتے تھے کہ ہم دنیا کی عظیم ترین قوم کے فرد ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ ہم صرف اس لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی لیے بڑے ہو رہے ہیں اور اسی لیے تعلیم حاصل کر رہے ہیں کہ جلد از جلد کسی کالونی کے گورنر، فوج یا پولیس کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ کر برطانوی مقبوضات میں عیسائی مذہب اور برطانوی علوم اور اقدار کا چرچا کریں۔ قومی عزت اور تاجِ برطانیہ کی عظمت کا نقش ہمارے ذہنوں میں ہر روز گہرے سے گہرا ہوتا جاتا تھا۔

غالباً مارچ ۱۸۹۷ء کا کوئی اتوار تھا۔ میری عمر اس وقت ۱۴ سال کی تھی۔ ہمارے اسکول کا کرکٹ کا میچ قریب کی کاؤنٹی کے اسکول سے ہونے والا تھا۔ میں بھی اسکول کی ٹیم میں شامل تھا۔ ہمارے اسکول کی ٹیم بڑے طمطراق سے کھیلنے گئی اور خوب جم کر کھیلی، مگر ہم لوگ یہ میچ ہار گئے تھے کیوں کہ امپائر کے فیصلے جانب دارانہ تھے۔ میچ کے اگلے دن میزبان ٹیم کی طرف سے ہم سب کے لیے پکنک کا پروگرام تھا۔ قریب کے جنگل میں جا کر خود ہی لکڑیاں چننے کے بعد کھانا پکانا تھا اور شام کو واپس لوٹ آنا تھا۔ ہم سب لوگ جنگل پہنچ کر سیر کو نکل گئے، میں اور میرا ایک دوست روسی مارٹن ایک نسبتاً ویران اور تنہا راستے کی سَیر گشت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا دریا تھا۔ ہمارا خیال وہاں تک پہنچنے کا تھا۔ اس وقت سورج تیز تھا۔ نیلا آسمان بے حد دل کش اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ انگلینڈ میں ایسا چمک دار سورج بہت کم ہی نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہم نے سوچا کہ دریا میں تیرنے کا بھی لطف اٹھایا جائے۔ ہم دونوں باتیں کرتے کرتے رُکتے

رکاتے چلے جا رہے تھے اور ہمارے سروں پر بادل چھاتے چلے جا رہے تھے۔ جس کا ہم نے خاص خیال بھی نہ کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادل کی چھتریاں بن گئیں۔ آسمان اور سورج دونوں ہی چھپ گئے۔ ہلکا ہلکا ملگجا اندھیرا چھا گیا اور بارش شروع ہو گئی۔ آن کی آن میں بارش موسلا دھار ہونے لگی۔ ہم کبھی کسی درخت کے سائے میں آتے اور کبھی کسی گھنے درخت کی پناہ تلاش کرتے۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ بارش تیز ہوتی گئی میں اور روسی دونوں راستہ بھول گئے۔ کسی بہتر جائے پناہ کی تلاش میں بھیگتے بھاگتے ہم آگے اور آگے ہی بڑھتے گئے۔ سب ساتھی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور راستے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد دور اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ ہم نے سوچا کہ یہ کسی فارم ہاؤس یا کسی جنگل کے محکمہ کے گارڈ کی جھونپڑی ہو گی۔ چلو، کچھ بھی ہو بارش سے تو پناہ مل جائے گی۔ روسی اور میں دونوں ہی اسی سمت بھاگنے لگے۔ جنگل میں درختوں سے ڈھکی ہوئی خودرو جھاڑیوں اور جنگلی پھولوں کی بیلوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی کاٹیج تھی جو بظاہر بالکل ویران نظر آتی تھی۔ ٹوٹے ہوئے دروازے، زنگ لگی ہوئی کھڑکیاں، کئی جگہوں سے اینٹیں ٹوٹی ہوئیں اور کھپریل کی چھت بھی شکستہ تھی۔ مگر اس ویران کوٹھری میں بہرحال روشنی ہو رہی تھی۔ شاید کوئی آتشدان روشن تھا اور کوٹھری کی چھت سے ہوتا ہوا کھڑکیوں کے چھجے سے پانی موسلا دھار ٹپک رہا تھا۔ بارش اب اتنی تیز ہو گئی تھی کہ بالکل رات کا گمان ہونے لگا تھا۔ کوٹھری کے دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے مگر اندر کچھ نظر نہ آتا تھا۔

روسی اور میں نے کوٹھری کے قریب پہنچ کر دستک دی جس کے جواب میں اندر سے ایک کرخت نسوانی آواز نے للکار کر پوچھا۔

"کون ہے؟"

"میں روسی ہوں اور یہ میرا دوست جان میلکم ہے۔ ہم بارش میں گھر گئے ہیں۔ کیا ہمیں تھوڑی دیر کے لیے پناہ مل سکتی ہے؟"

جواب میں ذرا تامل سے دروازے تک کوئی آیا اور ایک سیاہ فام حبشی عورت نے اندر سے ہم دونوں کو گھورا۔ یہ ایک پچاس سالہ حبشی عورت تھی۔ جسم بھرا بھرا اور فربہ، آنکھیں بے حد چمک دار، دانت برف کی طرح سفید، اُس نے زبان سے ایک لفظ نہ کہا، بس دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ہم نے اشارہ کو حکم سمجھا اور اندر داخل ہو

گئے۔ کپڑے پانی میں شرابور تھے۔ کپکپی لگ رہی تھی۔ کپڑے بدلنے کا موقع خیر کہاں تھا۔ ہاں، البتہ آگ کی تپش پا کر ذرا جسم کو گرمی لگی اور اوسان بحال ہوئے۔ کچھ جان میں جان آئی اور ذرا ماحول کا جائزہ لینا شروع کیا۔

کمرہ میں کوئی پلنگ اور بستر نہ تھا۔ پتوں اور درختوں کی چھال کا نمدہ سا بنا ہوا تھا جو ایک کونے میں دھرا تھا۔ آتش دان کے قریب کچھ جنگلی پھل پڑے تھے۔ ایک طرف پرانی دیہاتی وضع کا پانی کا برتن رکھا تھا اور دو تین اینٹوں کے سہارے ایک کڑھاؤ رکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے آگ روشن تھی۔

ہمیں اس کوٹھری میں بیٹھے قریباً ایک گھنٹہ گزر گیا تھا مگر بارش کی شدت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ ہماری سیاہ فام میزبان نے ابتدائی جملے کے علاوہ ابھی تک ہم سے کوئی ایک بات بھی نہ کی تھی۔ وہ مستقل اپنی تیز اور چمک دار آنکھیں میرے چہرے پر گاڑے ہوئے تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کی نظروں کی چبھن کا احساس ہونے لگا۔ یکبارگی جو میں نے نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو مجھے یہ عورت اور حبشی عورتوں سے بالکل مختلف نظر آئی۔ میری دادی کی حبشی خادمہ، جوزی بھی گو سیاہ فام تھی مگر نہایت مہذب اور بڑے اچھے تراش خراش کے لباس پہنتی تھی مگر یہ عورت جو ہمارے سامنے تھی ان حبشی عورتوں سے قطعاً علیحدہ تھی۔ اس کا رنگ گہرا چمک دار سیاہ تھا۔ گلے میں ہڈیوں کی مالا تھی۔ کانوں میں ہڈیوں کے آویزے تھے۔ سینے پر ایک انسانی کھوپڑی ڈال رکھی تھی۔ ناک میں ایک دائرہ نما تنہ تھی۔ جو شاید کسی لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ چہرے پر سُرخ رنگ سے لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں دہشت زدہ کرنے والی چمک تھی۔ جب سے میں اس کے کاٹیج میں داخل ہوا تھا شاید اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی تیز اور چبھتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں اور نہ ہی ایک لفظ بولی تھی۔ مجھے اس عورت سے ایک خوف سا آنے لگا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں یہاں سے اُٹھ کر بھاگ جاؤں۔ مگر نہ جانے اس کی آنکھوں کی طاقت تھی یا ماحول کا سحر تھا کہ میرے قدم زمین میں جم سے گئے تھے۔ نہ میں اُٹھ سکتا تھا اور نہ بھاگ سکتا تھا۔ میرے حواس کی قوتیں اس کے اثرات میں جکڑی جا چکی تھیں اور میں ایک معمول کی طرح اس کوٹھری میں قید تھا۔

یکایک حبشی عورت اٹھی اور آہستہ آہستہ قدم بہ قدم چلتی ہوئی میرے قریب آگئی

اور میری پیشانی پر نظریں ڈال کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ میں شاید اپنی تمام قوت اکٹھی کر کے اچانک کھڑا ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ جو اب تک میری گود میں تھے نیچے گر گئے۔ ماحول کچھ ایسا وحشت ناک ہو گیا تھا کہ مجھ میں کچھ کہنے اور سننے کی طاقت ہی نہ رہی تھی۔

"میرا نام جان ہے، جان میلکم، ہم دونوں خراب لڑکے نہیں ہیں۔ ہمیں اگر تم برا آدمی سمجھتی ہو تو ہم دونوں ابھی واپس لوٹ جائیں گے۔"

میری اپنی آواز میرے لیے اجنبی تھی۔ بے جان اور بے طاقت۔ یہ ایک جملہ بھی میں نے نہ جانے کس طرح ادا کیا تھا۔

حبشی عورت کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے اور چہرے پر مسکراہٹ سی آنے لگی تھی۔ اس نے یکایک جھرجھری سی لی جیسے کسی خواب سے چونک پڑی ہو اور پھر خواب ہی میں بڑبڑانے لگی۔

"..... دریاؤں کے دیوتا! تو عظیم ہے، تیرا عہد پکا ہے۔ صدیوں کی تلاش ختم ہو گئی۔ بے شک دیوی کی ضد پوری ہو کر رہے گی۔"

پھر میری طرف رخ کر کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خود کلامی کے انداز میں بولی "ماتھے پر تین ستارے، گھٹنوں سے لمبے ہاتھ، ہتھیلی کی لکیروں میں جال بھی ہوگا، برستی بارش میں خود ہی منزل تک آئے گا۔ عظیم مردوقش! عظیم بوران! تیری کنیز نے تیرے لیے تحفہ چن لیا ہے۔"

پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"سن! تو اپنی منزل تک آگیا ہے۔ تیرا مستقبل یہاں نہیں ہے۔ تیری قسمت میں مینا متی لکھ دی گئی ہے۔ دریاؤں کی سرزمین تیری راہ دیکھ رہی ہے۔ جا! مینا متی کو، بوران کی بیٹی کو زمین سے نکال کر آزادی عطا کر۔ جا! مینا متی کو تلاش کر...!"

پھر وہ عورت منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی میرے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ چاقو نکال کر اس نے اپنی شہادت کی انگلی پر ذرا سا چرکہ لگایا۔ جب خون نکلنے لگا تو گلے میں پڑی ہوئی ہڈیوں کی مالا سے منتخب کر کے ایک ہڈی نکالی اور اس پر چند قطرے خون کے ٹپکائے۔ پھر ہڈی کو آگ میں ڈال دیا۔ ذرا سی دیر میں ہڈی جلنے لگی تو اس نے تپتی ہوئی ہڈی کو آگ سے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے

ہڈی کو بالکل سرد پایا۔ گویا اس میں آگ کی حدت بالکل نہ رہی تھی۔ اُس عورت کی آواز پھر گونجی۔

"میری طرف سے آقا زادی مینا متی کے لیے، آریاؤں کی بیٹی مینا متی کے لیے، ملکۂ بوران کی زندہ دفن ہو جانے والی مینا متی کے لیے، یہ ایک حقیر سا تحفہ ہے۔ تحفہ جب تک مینا متی تک نہیں پہنچتا تیرا محافظ رہے گا۔ میری طرف سے یہ تحفہ مینا متی کو دے دینا۔ دریاؤں کا دیوتا عظیم ہے۔ بوران عظیم ہے، مردوقش عظیم ہے، مینا متی عظیم ہے!"

میری سمجھ میں ان جملوں کا مطلب کچھ نہ آیا تھا۔ اس نے کیا کہا، کیوں کہا اور یہ سب کچھ کیا ہوا۔ مگر خوف اور حیرت نے میری زبان میں تالے ڈال دیے تھے۔ میرا دوست روسی بھی دم بخود تھا اور ہڈی ابھی تک میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔

"دریاؤں کی وادیاں تجھے پکار رہی ہیں۔ جا اور جلدی جا۔ مینا متی کو گہرائیوں سے نکال.....!"

یہ کہہ کر وہ حبشی عورت میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھی اور پھر بہت دیر تک کچھ پڑھتی رہی اور میرے اوپر، جسم پر، کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارتی رہی۔ پھر لکڑی کا ایک ڈبہ کھول کر چمڑے کی جھلی کا بنا ہوا ایک رومال سا نکالا اور اسے میرے سر پر رکھ دیا۔ پھر مجھے ایک کونے میں لے جا کر زمین پر بیٹھ گئی اور دُعائیہ انداز میں ہاتھ اُٹھا کر کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہی۔ یہ کوئی اجنبی اور نامعلوم سی زبان تھی جس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ نہ جانے اس قسم کی کون کون سی رسومات ادا کرتی رہی۔ پھر مجھے آگ کے قریب لے جا کر کھڑا کیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی۔

جب تین بار برف گر چکی ہوگی اور تین بار برف پگھل چکی ہوگی، تین سردیاں اور تین بہاریں آ آ کر لوٹ چکی ہوں گی تب تجھے جانا ہی ہوگا۔ بوران اور مردوقش تجھے خود اپنی طرف کھینچ لیں گے۔ تیرا راستہ کٹھن اور دشوار ہوگا، دیوتا تیرے محافظ ہوں گے مگر غلطیاں اور بے وفائیاں برداشت نہ ہوں گی۔ جا، اب تو جا۔ بس چلا جا۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازے تک ہمیں لے جا کر باہر دیکھا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو باہر نکال دیا۔ ہڈی اور چمڑے کا رومال میرے پاس تھا۔ باہر آ کر ٹھنڈی ہوا لگی اور خوش گوار موسم کا احساس ہوا تو نظر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ آسمان پر ستاروں کے پھول کھلنے لگے تھے۔ زمین پر بارش کا پانی اور آسمان پر بادل بس اب خال خال

ہی باقی رہ گئے تھے۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ ہمیں گونگوں کی طرح بیٹھے بیٹھے اس دہشت زدہ کوٹھری میں شاید کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ ماحول اتنا سنجیدہ اور فضا اتنی گھمبیرتا لیے ہوئے تھی کہ ہمیں کچھ بھی نہ پتہ چلا کہ وقت کیسے گزر گیا ہے۔

رُوسی اور میں چپ چاپ، دم بخود، حیرت زدہ سے کئی منٹ تک اس کوٹھری کے دروازے کے باہر کھڑے رہے۔ اس واقعہ کی صورت اب خواب جیسی تھی۔ گویا سب کچھ کسی لمحہ کی طرح گزر گیا تھا۔ اس کی ایک ایک تفصیل میرے حافظے پر اس طرح نقش ہو گئی تھی جیسے لکڑی میں میخیں گاڑ دی جاتی ہیں اور آج بھی وہ واقعہ اُسی طرح ذہن کے صفحہ پر لفظ بہ لفظ لکھا ہوا ہے۔ میں اور رُوسی آہستہ آہستہ اس سحر سے آزاد ہوئے اور ہم نے ایک سمت چلنا شروع کیا اور پھر ایک گھنٹے تک ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے کے بعد ایک کسان کی رہنمائی میں ہم اس اسکول تک پہنچے جہاں ہمارے دوسرے دوست جمع تھے۔ کچھ بچے ابھی تک نہیں پہنچے تھے جن کا انتظار ہو رہا تھا۔ نہ روسی اور نہ ہی میں نے اس واقعہ کا ذکر کسی سے کیا کیونکہ ایک خاموش اور ان کہے معاہدے کے ذریعے ہم نے اس راز کو اپنے سینوں ہی میں دفن کر لیا تھا۔ مجھے تو ایسی چُپ لگی کہ ذہن بیمار بیمار سا لگنے لگا۔ کچھ بارش میں بھیگنے کا اثر کچھ اس واقعہ کا تاثر کہ میں گھر پہنچتے پہنچتے بے حال سا ہو گیا۔ جسم میں اینٹھن اور بہت ہی شدید سا درد محسوس کرنے لگا۔ میرے بازو اور میری کمر دکھنے لگی تھی۔ صبح کو مجھے بخار نے آ دبایا اور میں ایک ہفتے تک بستر پر پڑا رہا۔

گھر والوں نے اس بخار کو صرف بارش میں بھیگ جانے پر محمول کیا اور کسی نے بھی مجھ سے کچھ پوچھا اور نہ ہی میرے اسپورٹس کے تھیلے میں کچھ دیکھا۔ کیونکہ اس میں وکٹ کی بیلز، بال، دستانے، کچھ رسالے، ایک اسکور بک اور اسی طرح کی الّم غلّم چیزیں بھری ہوئی تھیں اور اس کے ساتھ ہی وہ ہڈی اور رومال بھی موجود تھا جو مجھے اس سیاہ فام عورت نے دیا تھا۔ دوران بیماری مجھے ایسا ہی لگتا تھا جیسے اس حبشی عورت کی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں اور وہ نہ جانے مجھ پر کیا پڑھ پڑھ کر پھونک رہی ہے۔ مجھے اس قسم کے خواب بھی نظر آتے تھے مگر میں کسی سے کچھ کہہ نہ سکتا تھا اس لیے کہ میں خود بھی کچھ سمجھ نہ پایا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔

اپنی والدہ کی شب و روز کی تیمارداری سے میں جلد ہی بخار اور بیماری سے نجات پا گیا۔ کسی نہ کسی طرح وقت گزرتا گیا اور اس وحشی عورت نے جو ذہنی جھٹکا پہنچایا تھا میں

اب اس سے نکل آیا تھا۔
شاید ایک ماہ کا عرصہ بغیر کسی اہم واقعہ کے گزر گیا تھا۔ میں تندرست بھی ہو گیا تھا اور جب معمول اپنے مشاغل میں پہلی جیسی دلچسپی لینے لگا تھا کہ ہمارے اسکول کی ٹیم کو ایک اور اسکول کی ٹیم سے میچ کھیلنے کا دعوت نامہ ملا۔ اگلی صبح کو مجھے میچ میں شامل ہونے کے لیے علی الصبح ہی گھر سے چل دینا تھا۔ رات کافی دیر تک میں مطالعہ کرتا رہا۔ پھر سوچا کہ صبح کے لیے اپنا اسپورٹس بیگ درست کر لیا جائے۔ اس وقت غالباً نصف رات گزر چکی تھی۔ گھر میں میرے ڈیڈی، میری ممی اور ہماری خادمہ سب ہی لوگ اپنے اپنے کمروں میں سو چکے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ کبھی کبھار قریب کے جنگل سے کسی گیدڑ کے چیخنے کی آوازیں آ جاتی تھیں۔ یا پھر تیز ہواؤں کی سائیں سائیں کانوں میں آ جا رہی تھی۔
میں نے اپنا اسپورٹس بیگ اُٹھایا اور اسے بستر پر اُلٹ دیا۔ تھیلے سے ہڈی اور رومال تو صحیح و سالم نکل آئے مگر اس کے علاوہ ہر چیز جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ میرے دستانے، اسکور بکس، ایک دو رسالے، موزے، کرکٹ کے بال، یعنی ہر چیز جل کر راکھ میں بدل چکی تھی۔ تھیلا بھی بوسیدہ ضرور تھا مگر شاید سیسہ اور ٹین سے مل کر بنا ہونے کی وجہ سے کسی حد تک محفوظ تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی وجہ سے ہڈی شاید گرم ہو جاتی ہو جس کی تپش سے چیزیں جل گئیں۔ مگر چھونے پر ایسا محسوس ہوا جیسے کہ عام ہڈیاں سردی میں سرد اور بھاری سی ہوتی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آتی تھی کہ آخر اس ہڈی سے میرے تھیلے کی یہ تمام چیزیں کیسے جل گئیں۔
اپنے اسپورٹس کٹ کے جل جانے سے میں جھنجھلا گیا تھا۔ اب پچھلے کرکٹ میچ کی تمام باتیں اور جو انہونے واقعات مجھ پر گزرے تھے وہ سب پھر سے میرے سامنے آنے لگے۔ وہ حبشی عورت، وہ بارش کا برسنا، بوسی کا اور میرا اسی سحر زدہ کوٹھری میں کئی گھنٹے گزارنا، اس عورت کا ہڈی اور رومال دینا۔ سب کچھ ہی پھر سے نظروں میں گھومنے لگا۔ دل میں اس حادثہ کا خوف تو تھا مگر اب اسپورٹس کی تمام اشیاء کا راکھ ہونے سے خود پر غصہ غالب آ گیا تھا۔ مجھے اس ہڈی سے کچھ نفرت سی ہونے لگی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں سرگوشی اُبھری کہ سب کچھ جادو اور سحر کا شیطانی چکر تھا۔ ہمیشہ سے سنتے چلے آئے تھے کہ جادوگروں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ سو اس وقت مجھے وہ حبشی عورت، اس کا تحفہ، اس کا یہ تحفہ سب کچھ ڈھکوسلا محسوس ہوا۔ اس عورت نے یہ ہڈی اور رومال آخر مجھے ہی

کیوں دیا؟ ...... آخر کیوں؟ جتنا میں غور کرتا اتنا ہی الجھتا جاتا تھا۔ میرے دماغ میں رفتہ رفتہ یہ بات سماتی چلی گئی کہ اس حبشی عورت نے مجھے کسی سحر زدہ معمول کی طرح اپنے تصرف میں لانے کی سازش کی ہے۔ دماغ میں ہتھوڑے سے بجنے لگے۔ دل نے مشورہ دیا کہ اس چکر سے نجات حاصل کرنا چاہیے۔ آخر اس ہڈی کی بدولت کل کے میچ کا پروگرام غارت ہو چکا تھا۔ آخر کسی فوری جذبے کے تحت میں نے ہڈی اور رومال کو بستر سے اٹھایا، کھڑکی کھولی اور دور باہر پھینک دیا۔ ہڈی کے گرنے سے اتنی زوردار آواز آئی جیسے کسی نے بہت بڑا پتھر بلندی سے نیچے پھینک دیا ہو۔ میں نے فوری طور پر اس غیر معمولی بات کے متعلق غور کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ آخر اتنی ہلکی ہڈی کی آواز اس قدر بھاری کیوں ہوئی تھی۔

آنکھوں میں کچھ نیند بھی آنے لگی تھی۔ اس ہڈی اور رومال کے قصے نے ذہن کو پراگندہ بھی کر رکھا تھا۔ بس میں نے کھڑکی بند کرلی، لائٹ آف کی اور اپنے بستر پر کمبل لپیٹ کر لیٹ گیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں مجھے نیند بھی آگئی۔

وہ شاید غیر معمولی سی چاپ تھی جیسے کوئی بھاری وزن کا جانور تیزی سے دوڑتا آ رہا ہو۔ یا جیسے کسی بڑے پرندے نے اپنے پر بار بار پھڑپھڑانے شروع کر دیے ہوں۔ میری نیند کچھ ٹوٹ سی گئی تھی۔ شاید دو بجے کا وقت تھا۔ باہر بھاگنے اور دوڑنے اور پروں کے پھڑپھڑانے کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ میں کچی پکی نیند میں تھا۔ کچھ کچھ نیم خوابی سی تھی۔ اور کچھ سوتا اور کچھ جاگتا سا۔ یکایک ایک زوردار جھٹکے سے میرے کمرے کی جو کھڑکی جنگل کی طرف تھی دھڑ سے کھل گئی اور کمرے میں ہلکے بلب کی روشنی بھی دفعتاً بجھ گئی اور کوئی بہت بڑا سفید سا پرندہ اپنے پر پھیلائے سیدھا اڑتا ہوا میرے کمرے میں آگیا۔ اندھیرے میں سفید سفید سی بڑی سی چیز میرے بستر کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ پرندہ جسامت میں کسی عقاب سے کم نہ تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اب میں پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ مگر خوف کی لہریں میرے پورے بدن میں دوڑ رہی تھیں۔ اور میرے جسم کے تمام بال رونگٹوں کے ساتھ ساتھ کھڑے ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ پرندہ میرے بستر کی طرف بڑھنے لگا اور پھر قریب آ کر پیچھے کے زوردار جھٹکے سے جھپٹا مار کر میرا کمبل کھسوٹ کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر اس نے بستر پر میرے قریب آ کر اپنے سفید سفید پر اس طرح پھڑپھڑائے جیسے مجھ سرزنش کر رہا ہو، کمرے میں ایک طوفان سا آ رہا تھا۔

دہلتے ہوئے انگارے جیسی تھیں یا دو چمکتی ہوئی مشعلیں تھیں جو شاید غیظ و غضب سے بھرپور تھیں۔ پھر اس پرندے نے بالکل چہرے کے قریب آ کر اپنی چونچ میں دبی ہوئی ہڈی اور رومال میرے سامنے بستر پر ڈال دیے۔ جس جگہ ہڈی گری تھی وہاں سے بستر جلنے لگا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ہڈی کو اٹھا لیا۔ اُس میں قطعاً کوئی گرمی نہیں تھی۔ پرندہ مجھے خوں خوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پر پھڑپھڑا کر کسی نئے حملے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اُس کا انداز بے حد جارحانہ اور ہیبت ناک تھا۔ جس طرح زخمی شیر اپنے شکار پر جھپٹتا ہے یا جیسے کوئی لڑاکا مُرغا پینترا بدل بدل کر سامنے آتا ہے وہ کئی بار اسی طرح سامنے آیا۔ پھر وہ بستر کے کنارے سے اڑا اور کمرے کا چکر لگا کر اسی زور و شور سے پھڑپھڑاتا ہوا کھڑکی سے باہر نکل گیا اور پھر کھڑکی خود بخود زور سے بند ہو گئی۔ پھر باہر ایسا شور سنائی دیا جیسے ہزاروں پرندے ایک ہی ساتھ اڑ رہے ہوں۔

یہ سب کچھ ایک ہیبت ناک خواب سے کم نہ تھا۔ شاید میں اسے ایک ہیبت ناک خواب ہی سمجھتا مگر ہڈی میرے پاس ہی موجود تھی۔ وہی ہڈی جسے میں نے کچھ ہی دیر قبل اپنے ہی ہاتھوں سے کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ یہ ہرگز خواب نہ تھا۔ سب کچھ مجھ پر حقیقت میں گزر گیا تھا۔ اب خوف و دہشت سے سارے جسم میں کپکپی سی آنے لگی تھی۔ اب نیند کہاں تھی آنکھوں میں۔ صرف خوف ہی خوف بسا تھا۔ اور ریڑھ کی ہڈی میں سے رہ رہ کر لہریں سی نکل رہی تھیں۔ میں نے پلنگ کے نیچے سے اپنا گرا ہوا کمبل اٹھایا اور کمرے کی لائٹ کھولی۔ رات کے ڈھائی بجے تھے۔ پھر میں نے لائٹ آف کر دی اور دوبارہ کمبل اوڑھ کر لیٹا۔ مگر نیند اب کوسوں دُور تھی۔ میں اُس ہڈی کو دیکھنے لگا جو رفتہ رفتہ میرے دل و دماغ سے چپک کر رہ گئی تھی۔ بے خیالی میں اس ہڈی پر یوں ہی غور سے دیکھنے کے لیے جو ذرا دیر کے لیے نظریں جمائیں تو اس ہڈی کا رنگ بھی اب مجھے سفید کی جگہ کچھ کچھ سُرخی مائل نظر آیا۔ میں اسی طرح نظریں جمائے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر تپتے ہوئے لوہے جیسی سُرخی اس میں آ گئی۔ یہ سُرخ، اور سُرخ، اور سُرخ ہوتی گئی۔

آہستہ آہستہ اس ہڈی پر بے شمار لکیریں سی اُبھرنے لگیں۔ آڑی ترچھی لمبی سیدھی لکیریں جیسے کسی بڑے کینوس پر کسی بڑے شہر کے مکانات کی بالائی منزلوں کا نقشہ اُبھرتا ہے۔ یہ بالائی سطح میرے سامنے آ رہی تھی۔ پھر میری نگاہوں کے سامنے یہ

کینوس پھیلنے لگا۔ لکیریں پھیلتی اور سکڑتی جا رہی تھیں۔ اب یہ نقشہ واضح اور صاف ہو رہا تھا۔ یقیناً کسی قصبہ کا منظر تھا۔ موٹی موٹی دیواروں کے چھوٹے بڑے مکانات حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایک چوڑی سی سڑک پر ایک محل نما مکان بھی تھا۔ اسی سڑک سے ذرا آگے ایک دریا بہہ رہا تھا جس پر چھوٹی بڑی بہت سی کشتیاں کھڑی تھیں۔ سامان اُتر رہا تھا اور لوگ کندھوں پر مٹی کے برتن، لوہے کی چیزیں، اٹھا اٹھا کر اِدھر اُدھر لے جا رہے تھے۔ یہ عجیب وضع قطع کے لوگ تھے۔ تنومند، سیاہ فام، لمبے قد کاٹھ کے، بالائی اور زیریں جسم کو فقط ایک چادر سے لپیٹے ہوئے تھے جیسے قدیم زمانے میں رومن صرف ایک چادر سے جسم کی ستر پوشی کر لیتے تھے۔ مگر یہ لوگ رومن کے ناک نقشے سے بالکل جُدا تھے۔ ان کے بال گھنگھریالے، ناک کسی قدر چپٹی، جسم لمبے، رنگ سیاہی مائل گندمی اور آنکھیں بڑی تھیں۔ اس منظر میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ مزدور، کسان، دوکاندار، سپاہی، فوجی، امراء، فقراء، بس یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ٹیلی وژن کا کیمرہ کسی جیتے جاگتے شہر کے اوپر فوکس کر دیا گیا ہے اور سب کچھ وہاں سے نظر آتا جا رہا ہے۔ میں اس منظر میں کھو سا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دو وجود بن گئے ہیں۔ میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہوں۔ ایک تو وہ میں ہوں جو اپنے بستر پر بیٹھا ہوا اس منظر کو دیکھ رہا ہوں اور ایک میں وہ ہوں جو اس منظر کا جز بن کر ان آتے جاتے آدمیوں کے ساتھ چل پھر رہا ہوں۔ میں ایک تنگ سے بازار سے گزرا، اب ایک بڑے سے کڑھاؤ والے دکاندار کے پاس رکا۔ اسے میں نے گندم کے کچھ تھیلے دیے اور اس سے میں نے پانی پینے کا برتن لیا اور مٹی کا ایک گھڑا خریدا اور اب میں کسی مکان کی طرف نکل آیا۔ وہ بھی میں ہوں اور یہ بھی میں ہوں۔ پھر مگر میں نہ جانے کہاں ہوں۔

ہڈی پر کینوس جو بن چکا تھا وہ پھیلنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز ہلنے لگی۔ اور پھر ہڈی رفتہ رفتہ اپنی اصلی شکل میں لوٹ آئی۔ پھر میں نے ایک ہلکی سی سرگوشی سنی "یہ مرے ہوئے لوگوں کا ٹیلہ تھا۔"

یسوع مسیح یہ سب کیا تھا؟ یہ میں کس جگہ جا پہنچا تھا؟ یہ کون سی جگہ تھی؟ کون سا شہر تھا؟ کس شہر کا یہ انجام ہوا؟ مقدس باپ، اس سحر اور اس جادو سے مجھے نجات دے! مجھے یہ منظر کیوں دیکھنا پڑا؟ میں نے تو صرف غیر شعوری طور پر اس ہڈی پر نظریں جمائی تھیں۔ پھر مجھے جو کچھ نظر آیا اس میں میرے ارادے کو کچھ دخل نہ تھا۔

ایک ہی رات میں دو واقعے مجھے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھے۔

باب نمبر۲

صبح ہوئی تو میں نے سوچا کہ آج ممی اور ڈیڈی مجھ سے اس شور و شغف کے بارے میں ضرور پوچھیں گے جو رات میرے کمرے میں ہوا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ اگر ڈیڈی نے مجھ سے کچھ پوچھا تو میں اپنی بات کہاں سے شروع کروں گا، ان کو کیا کیا بتاؤں گا اور کیا وہ ان باتوں پر یقین کر لیں گے۔ جب بھی اسکول میں کوئی میچ ہوتا یا مجھے کسی جلسہ یا سیمینار میں شرکت کا موقع ملتا تو میں واپس آ کر ہر بات اپنے ڈیڈی سے کہہ دیتا تھا۔ یہ گفتگو عموماً رات کو کھانا کھانے کے بعد ہوتی۔ ہم سب لوگ آتش دان کے پاس بیٹھ جاتے، آگ جلتی رہتی اور میں ڈیڈی سے دن بھر کی سرگذشت، بحث مباحثہ، کھیل کود، شکار، جنگل کی سیر، تقریروں، ماسٹروں کی باتوں کی مکمل رپورٹ دے دیا کرتا تھا۔ پچھلے میچ کے بعد مجھے ایک دم بخار نے آ دبایا تھا۔ سو اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کہہ سکا تھا۔ نہ ہی ان سے میری کوئی گفتگو ہوئی تھی نہ انہوں نے کوئی خاص تفتیش کی تھی۔ ممی ڈیڈی کا خیال تھا کہ بے جا روک ٹوک، ہر وقت کی پوچھ گچھ اور بات بات پر پابندیوں سے بچوں کی قوتِ نمو میں فرق پڑتا ہے۔ ان کے ذہن آزادانہ سوچ بچار اور فطری مدافعانہ صلاحیتوں سے محروم ہونے لگتے ہیں۔ بہر حال، اسی تگ و دو میں کہ ممی اور ڈیڈی سے میں اب رات کے بارے میں کیا کہوں گا، میں ناشتے کی میز پر جا پہنچا، میچ کا پروگرام تو ممکن ہی نہ تھا کیوں کہ میرا تمام اسپورٹس کا سامان جل چکا تھا اور اس کے بغیر وہاں جانا بے کار تھا۔ ناشتے پر میں نے سب کے چہروں پر کوئی غیر معمولی بات نہ دیکھی۔ تمام روزمرہ کی صبحوں کی طرح یہ بھی ایک صبح تھی۔ اسی طرح سب نے ناشتہ کیا۔ کافی پی، ڈیڈی نے جلدی جلدی اخبار دیکھا۔ پائپ کے چند کش لیے، مجھے اور ممی کو دن بھر کے لیے کچھ عام سی ہدایتیں دیں اور مجھ سے آج کے میچ کے بارے میں معلومات کیں۔ میں یہ تو نہ کہہ سکا کہ ایک عجیب سے حادثے نے میری اسپورٹس کٹ جلا کر راکھ کر دی ہے جس کی وجہ سے میں آج کا میچ کھیلنے نہ جا سکوں گا مگر میں نے اسی لمحہ یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آج اسکول سے تو چھٹی پر ہوں ہی، رات کا واقعہ بھی گزر چکا ہے کیوں نہ آج میں پھر اسی جنگل میں جا کر اسی حبشی عورت سے معلوم

کروں کہ اس ہڈی کی مصیبت کو کیوں میرے پیچھے لگا دیا گیا ہے۔ چنانچہ گھر سے نکل کر ایک گاڑی میں قریب کے قصبہ پہنچا اور پھر اس جنگل کی طرف نکل گیا جہاں دریا بہتا تھا اور جہاں روسی اور میں چند ہفتے قبل راستہ بھٹک کر اس کوٹھری میں جا نکلے تھے۔

مجھے جنگل کے راستوں کا کوئی علم نہ تھا مگر میرا خیال تھا کہ کچھ دیر بھٹک کر وہاں تک پہنچ جاؤں گا اور ایسا ہی ہوا۔ شاید دن کے گیارہ بجے تھے کہ میں پھر اسی کاٹیج کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ کوٹھری بند تھی۔ بظاہر ویران، زندگی سے دور، نہ کوئی آہٹ نہ روشنی، ماحول پر سکوت تھا اور دروازہ اندر سے بند۔ میں نے کئی بار ہاتھ سے دروازہ تھپتھپایا۔ جب اندر سے کوئی آواز نہ سنائی دی تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ہڈی نکالی تاکہ اس کی مدد سے دروازہ کو زور سے کھٹکھٹایا جائے۔ ابھی ہڈی سے دروازہ کو چھوا ہی تھا، اور دستک بھی نہ دی تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ پتہ نہیں دروازہ خود بخود کھل گیا تھا یا اندر سے اس حبشی عورت نے کھولا تھا مگر بہرحال، اب میں باہر دہلیز پر کھڑا تھا اور وہ اندر سے کھڑی ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس عورت کے چہرے پر بہت سی کیفیات آآ کر گزر گئیں۔ اب اُس کی آنکھوں میں نرمی نہ تھی، نہ چہرے پر پذیرائی کے آثار، اب اس کی کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ غصہ، خونخوار نگاہوں کی چمک، مجنونانہ بے رحم جذبات کی سفاکی اس کے چہرے پر تحریر تھی۔ پھر افسوس، شفقتیں، رحم، محبتیں .... سب جذبے اپنا اپنا رنگ دکھا کر لوٹ گئے لمحہ بھر بعد یہ چہرہ پھر سے پتھر کا بن گیا تھا۔ بے حس چہرہ، ہر ایک جذبات سے عاری، اجنبی اور سرد، ادھر میرے دل میں بھی خوف، افسردگی، پشیمانی اور تجسس کے دائروں کے بھنور بنتے اور بگڑتے رہے۔ میں اس عورت کے روبرو ایک مجرم کی طرح کھڑا تھا۔ گویائی صلب تھی، ارادے منجمد اور حواس پر طوفان سا چھایا ہوا تھا۔ میں نے چہرہ اس کی طرف سے موڑلیا۔ جیسے لہریں رک جاتی ہیں اور بہتا ہوا پانی خاموش ہو جاتا ہے میں ذرا ٹھہرا کہ اپنی قوتیں جمع کر کے کچھ بول سکوں۔ ذرا نظر جھکائی تو ہاتھ میں دبی ہوئی ہڈی پر نگاہ جا پڑی۔ وہی ہڈی جس پر کل رات ایک شہر بنا اور بگڑ گیا تھا اور وہی جو ایک سفید پرندہ مجھے واپس دے کر لوٹ گیا تھا اور شاید وہی جس کی وجہ سے ابھی آن کی آن میں یہ دروازہ بھی کھل گیا تھا۔

یہ نظر پڑنا گویا جادو سے کم نہ تھا۔ آن کی آن میں میرے دل کا خوف نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ جسم کی کپکپاہٹ رک گئی، لرزشیں تھم گئیں، ناطاقتی کا احساس جاتا رہا، ہر

اندر آنے والی سانس گویا قوت کے خزانے مجھ پر لٹا رہی تھی، اور میرے اندر ہی کسی طاقت ور گرم بھٹی میں تپ کر پگھلتا ہوا گرم فولاد رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ پھر میں نے ٹھہرے ہوئے گہرے پانی کی طرح اپنے آپ کو اعتماد سے کھڑا ہوا پایا۔ یا تو یہ عالم تھا کہ میں اس حبشی عورت سے نظر بچا رہا تھا یا یہ کہ اب میری نظر جھکتی ہی نہ تھی۔ میری آنکھوں سے جیسے شعاعیں نکل رہی تھیں جو اپنے سامنے والی ہر چیز کو توڑ دینا چاہتی تھیں۔ آر پار ہو جانے کے لیے ہر رکاوٹ سے گزر جانا چاہتی تھیں۔ میں لب صاف اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ روبرو اور نظر سے نظر ملائے ہوئے۔ اس کی نگاہیں بھی میری نگاہوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے میرا جائزہ لے رہی ہوں، جیسے اپنی طاقتوں کو تول رہی ہوں۔ کوئی شکست ماننے پر تیار نہ تھا۔ مگر یہ کیفیت چند لمحوں تک ہی باقی رہی کہ نہ اس کی پلک جھپکی نہ ہی میری، پھر نہ معلوم کب اس کی آنکھ جھکی اور کب اس کے جسم کو ایک جھرجھری سی آئی مگر میں نے دیکھا کہ اس نے نظر جھکائی، مجھ پر فخر وانبساط کی سرخوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ سر بلند ہو گیا، اور میری اپنی نظروں ہی میں میرا قد کچھ اور بڑھ گیا تھا وہ دروازے سے ہٹ گئی اور بولی۔

"عظیم مردوقش! غلام غلام ہی ہے۔ کنیز تو کنیز ہے۔ بوران دیوی، صدیوں کی غلامی کو تجدید کی ضرورت نہیں ہے۔"

پھر آگے بڑھ کر وہ جھک گئی۔ دونوں گھٹنے زمین پر ٹکائے، چہرہ میرے ہاتھ کے نزدیک کیا اور فرطِ عقیدت سے ہڈی کو چوم لیا۔ اس حبشی عورت کا وجود لب گرم لوہے کی طرح پگھلنے لگا جسم لرزنے لگا مگر ایک ہلکی سی کپکپاہٹ کے بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچتے ہوئے کہنے لگی۔

"محافظ غداری نہیں کرتے۔ امانت والے خیانت نہیں کرتے۔ میناماتی کے محافظ مردوقش کی ہڈی اور بوران کے رومال کی تقدیس کو گستاخی اور بے ادبی سے دور رکھ، یاد رکھ اگر تو بوران کی اُمیدوں کا مرکز نہ ہوتا تو سفید عقاب تجھے کل رات ہی زمین میں دفن کر چکا ہوتا۔ سفید عقاب مردوقش کا عقاب تھا۔ اُس نے اپنا خون پلا پلا کر عقاب کے بازوؤں میں بجلی بھری تھی۔"

اندر کمرے کا ماحول اسی طرح پُراسرار تھا جیسا کہ پچھلی بارش کے دوران حادثاتی ملاقات کے وقت نظر آیا تھا۔ وہی کڑھاؤ، دہکتی ہوئی آگ، ہڈیوں کے ٹکڑے، کمرے میں

سیلن اور نمی، عجیب قسم کی بدبو آتش دان میں جلتی بجھتی چنگاریوں کی راکھ، اس کوٹھری کی یہی کائنات تھی۔ کھانے پینے کی کوئی چیز مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ شاید یہ حبشی عورت جنگل کے پھل کھا کر گزر کرتی تھی مگر اس دفعہ خوف اور ڈر میرے دل میں نہیں تھا۔ جب کہ پچھلی ملاقات کے وقت میرا دل اس سحرزدگی سے اس قدر جکڑا ہوا تھا کہ میری بولنے اور بات کرنے کی صلاحیتیں تک ختم سی ہو کر رہ گئی تھیں۔

کمرے میں آ کر میں پتیوں کے بنے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا اور اس عورت نے گڑھاؤ کے نیچے آگ سلگا دی۔ اس سرد موسم میں جسم کو گرم رکھنے کے لیے حرارت کی ضیافت بھی کچھ کم میزبانی نہ تھی۔ اب ذرا جسم میں گرمی آئی تو دل میں پھر تجسس کے جذبے سر اُٹھانے لگے۔

"سن! تو مجھے اپنا نام بتا۔ مجھے بتا کہ مردوقش کون ہے، مینا متی کون ہے، بوران کون ہے، دریاؤں کی سرزمین کہاں ہے، ہڈی اور کھال کا رومال تو نے مجھے کیوں دیا ہے؟" میرے لہجے میں ایک نٹ کھٹ لڑکے کی ضد تھی۔

"میں جاشن ہوں۔ میرا تعلق سیاہ براعظم سے ہے۔ ہمیں سحر کا علم سینہ در سینہ اپنی اولادوں میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ میرا علم مجھے بتاتا ہے کہ میرا خاندان ہرے بھرے جنگلوں کی آبادیوں سے نکل کر شہنشاہ خوفو کے عہد میں مصر پہنچا تھا۔ جب خوفو کا بڑا اہرام تعمیر ہو رہا تھا اور سنگ تراش چٹانوں میں ابوالہول کا چہرہ تراش رہے تھے تو میرے اسلاف دریائے نیل میں بہتی ہوئی کشتیوں سے چٹانیں کھینچ کھینچ کر (۲۶۰۰ ق م) میں خوفو کے اہرام تک لاتے تھے۔ میرے خاندان نے مردہ جسموں کو محفوظ کرنے کا علم سیکھا۔ میرے بہت سے اہلِ خاندان شاہانِ وقت کے ساتھ اہراموں میں ہڈیوں کا پنجر بنے آج بھی شاہی تابوتوں کے گرد پہرہ دے رہے ہیں۔ میری ماں جس نے جنگل سے نکل کر وہ جادو اور باجبروت طاقت دیکھی جسے فرعون کہتے تھے اور پھر اسی کے محل کی کنیز بن کر رہ گئی۔ زمانہ گزرتا رہا اور پھر فرعون رامیسس (۱) کی بہن شہزادی بوران کی شادی وقت کی طنابیں کھینچ لینے والے شہنشاہ سیناشرب سے ہوئی جس نے دریائے دجلہ کے دہانے پر آباد بابل کو زیر کیا اور پھر بابل کو دجلہ کے پانی سے دھو ڈالا۔ پھر بابل کی سلطنت کا ایک بچا کھچا شہزادہ دخت زر آیا۔ وہ سیناشرب اور بوران کی بیٹی مینا متی کو انتقاماً لے اڑا اور دور بہت دور مشرق میں دریاؤں کی سرزمین پر چلا گیا جہاں گھنے جنگلوں کے بیچوں بیچ اس نے مینا

متی کو قید کر دیا۔ بوران نے درباری ساحر مردوقش سے سحر کا علم سیکھا اور وہ مینا متی کے اس مدفن تک جا پہنچی جہاں اس کو زندہ ممی بنا دیا گیا تھا۔ مگر دیوتاؤں کی مرضیاں کچھ اور تھیں۔ مینا متی کے باپ نے ہزار سال پرانا دیوتاؤں کا شہر بابل برباد کیا تھا۔ سو مینا متی کو سزا کے طور پر چار ہزار سال قید میں رہنا تھا۔ وہ اب ایک نجات دہندہ کی منتظر ہے اور وہ نجات دہندہ تو ہے۔"

"جامش! تو اتنی باتیں کیسے جانتی ہے؟ جس عہد کی تو بات کرتی ہے وہ تاریخ کے اندھیروں کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ پھر تجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟ میں تیری بات نہیں مانتا، میں کیسے تیرا یقین کر لوں؟" میں نے کہا۔

"اعتبار کرنا سیکھ، دیکھ ہمیں اعتبار کرانا بھی آتا ہے۔"

اس کے چہرے پر برہمی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ غصّہ سے اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک بڑھ گئی اور دوستی کی جو فضا پیدا ہوئی تھی میرے ایک بے یقین جملے کے اظہار نے اس میں شگاف ڈال دیے۔ وہ جلدی سے اپنی داہنی طرف مڑی، کڑھاؤ کے نیچے اس نے آگ تیز کی اور پھر کوئی رقیق سا مادّہ ڈال دیا۔ جس سے آگ اُبھر آئی۔ پھر کسی ہڈی کو اس نے کڑھاؤ کے اوپر کی آگ میں جھونک ڈالا۔ بس چشم زدن میں کڑھاؤ میں نہ آگ رہی نہ تیل رہا۔ بلکہ ایک خشک ناہموار ریتلی سطح نظر آنے لگی۔

اب جامش کی آواز گونجی "دیکھ! جاتے دنوں کو واپس آتا دیکھ!"

اور پھر میری آنکھوں نے تاریخ کے اندھیروں میں حقائق کی چمک دار روشنیاں دیکھیں، سچائیاں دیکھیں اور عجیب و غریب مناظر دیکھے۔ میں نے دیکھا کہ:

اس ناہموار ریتلی زمین پر کئی ہزار لوگ پیدل چل رہے ہیں۔ ان کے جسموں پر پتّیوں اور خشک جھاڑیوں کے لباس سجے ہیں۔ ہاتھوں میں موٹے اور بھدّے پتھروں کے بدوضع ہتھیار ہیں۔ کوئی نوک دار پتھر کا ٹکڑا یا کوئی درخت کی ہموار سی موٹی ٹہنی کسی کے ہاتھ میں ہے۔ کہیں کہیں کسی کے سر پر درختوں کی خشک چھال کی ٹوپی جسم کو دھوپ کی تمازت سے بچائے ہوئے ہے تو کسی نے لمبی لمبی بڑے پتوں کی بیلیں، اپنے جسم سے باندھ رکھی ہیں۔ ان کے قویٰ سخت اور جسم پتھر کی طرح ٹھوس ہیں۔ ان سب کے ساتھ کچھ عورتیں بھی ہیں جن کی کمروں اور کندھوں پر بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی بڑا قافلہ ہے جو شاید بہت دور سے چلتا ہوا آ رہا ہے۔ ایک دریا کے قریب آ کر یہ سب لوگ رک گئے

اور دریا کے کنارے اُگے ہوئے جنگلات سے پھل پھول توڑنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی منظر میری نگاہوں کے سامنے بدلتے گئے۔ ایک منظر میں نے یہ دیکھا کہ اس دریا کے قریب بستی آباد ہو گئی ہے۔ پھر یہ بستی بڑھتی گئی۔ عظیم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے چاروں طرف ایک عظیم دیوار بن گئی۔ دیوار کے ساتھ ہی ساتھ قریباً سو فٹ چوڑا مٹی اور پتھروں کا ایک لمبا پُشتہ ہے جس کی ڈھلوان پر ایک چوڑی سی سڑک ہے جس کے اوپر مکان اور گھر بنے ہوئے ہیں۔ اور اس سڑک کے اختتام پر کسی بادشاہ کا مکان ہے۔ اسی محل کے دونوں طرف مٹی کی اونچی اونچی پہاڑیاں سی تھیں جو شاید دو تین سو فٹ بلند تھیں اور ان پر ہزارہا آدمی درختوں کو پانی دے رہے تھے۔ دریا سے پانی ایک حوض میں آرہا تھا اور حوض سے لوگ مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں پانی اٹھا اٹھا کر درختوں تک لے جا رہے تھے۔ یہ ایک مصنوعی پہاڑی پر باغ ہے۔ عظیم شاہراہ، عظیم محل اور عظیم باغات بھی تھے۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی بستی تھی اور اس جگہ سروں پر لٹکے ہوئے باغات بڑے عجیب سے تھے۔

جاشش نے میرے کان میں سرگوشی سی کی "دیکھا! یہ بابُل تھا، اس عظمت کے زمانے میں کوئی شہر اس شہر کی ہمسری کا دعویدار نہ تھا۔"

پھر ایک طرف سے ایک شور و غوغا سا بلند ہوا۔ ایک فوج آتی دکھائی دی۔ یہ سنہرے جسموں والے جوان تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لوہے کے ہتھیار تھے۔ کلہاڑیاں، تیر اور تلواریں، عموماً سب لوگ پیدل ہی چل رہے تھے۔ بہادر، جفاکش اور سخت پٹھوں والے قد آور فوجی جوان تھے، پُرعزم اور گویا درندگی کی حد تک خوں آشام آنکھوں والے۔ ان کے آگے آگے چٹان جیسے جسم والا اور چیتے جیسی پھرتی والا ایک شخص چل رہا تھا۔ اس کے سر پر بھی لوہے کی ایک چیز ٹوپی جیسی تھی۔ یہ ہر طرف آ جا کر اس مجمع کو باقاعدہ اور منظم رکھ رہا تھا۔ گویا وہ اس پورے جتھے کو ہانک کر لے جا رہا تھا۔ دریا کے قریب اس آبادی کے پاس آ کر یہ مجمع رک گیا۔ کچھ فوجی اس شہر کی فصیل کے اندر سے نکلے اور پھر جنگ شروع ہو گئی۔ ہزاروں انسان زخم پر زخم کھانے لگے۔ زخمی، مردہ ہوتے، خون بہاتے ہوئے، دم توڑتے ہوئے، ایڑیاں مسلتے ہوئے، لڑتے ہوئے، اور جان بچاتے ہوئے بھاگتے ہوئے ہر طرف انسان ہی انسان تھے۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ لوگ گر رہے تھے۔ مر رہے تھے، ہر طرف ہڈیاں، گوشت کے ٹکڑے، جسمانی اعضا، سر، ہاتھ، پیر۔ پنجے، دھڑ اور لاشیں بکھری تھیں۔

اب جان بچا کر ایک گروہ شہر کی فصیل کی طرف بھاگ رہا تھا اور انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اندر پہنچ کر دروازہ بند کر لیا اور پیچھا کرنے والے اس بڑے دروازے پر زور آزمائی کرنے لگے۔

یکایک وہی چوڑی چھاتی والا شخص شیر کی طرح دھاڑتا ہوا آیا۔ اس کے پیچھے پوری فوج دوڑنے لگی۔ ہتھیار ہاتھوں میں اٹھائے اور نعرے لگاتے ہوئے سب اس کے پیچھے چلنے لگے۔ اس سردار کے ایک اشارے پر ہزاروں آگ کی دہکتی ہوئی مشعلیں ہاتھوں میں آ گئیں اور فصیل کے دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے کسی سے آگ لے کر اس دروازے پر ڈال دی اور پھر ہزارہا مشعلیں دروازے پر گریں اور اس دروازے کو جلانے لگیں۔ دروازہ دھڑا دھڑ جلنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر دروازہ گر جاتا ہے۔ خوں خوار آدمیوں کا اژدہام اب اندر جا پہنچتا ہے اور پھر چیخ و پکار کا سلسلہ ہے، ہتھیاروں کے ٹکرانے کی آوازیں ہیں اور زندگیاں ہتھیاروں سے گلے مل مل کر رخصت ہو رہی تھیں۔ خون بہہ بہہ کر دروازے سے باہر آنے لگا ہے۔ اس کشت و خون میں بس ایک ہی آواز گونج رہی ہے جو تمام زخمیوں کی چیخوں اور تمام مرنے والوں کی آہ و بکا پر بھاری ہو گئی ہے۔

سینا شرب............!

سینا شرب............!

باہر آگ لکڑی کے برجوں کو جلا رہی ہے اور اندر موت کا کھیل جاری ہے۔ پھر وہی چوڑی چھاتی والا سردار باہر نکل آتا ہے۔ اب اس کے چہرے پر وحشیوں کا سا انتقامی جنون ہے۔ اس کے شاید کوئی زخم لگا ہے۔ چہرہ خون سے تر بتر ہے۔ اپنے ساتھ بہت سے جوانوں کو لے کر وہ دریا کی طرف دوڑ رہا ہے اور لو، اب وہ سب کے سب دریا کے بند تک پہنچ گئے اور وہ سب کے سب مل کر بند کو توڑ رہے ہیں۔ سب اس کام میں ایسے محو ہیں گویا یہ دریا کا بند ہی ان کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے بند کو توڑ دیا ہے۔ دریا کی بندشیں ختم ہو گئی ہیں اور اب پانی کا ریلا اس شہر کی طرف جا رہا ہے۔ میدان میں پڑی ہوئی لاشیں اور زخمی پانی میں ڈوب رہے ہیں۔ جلتے ہوئے شہر اور انگارے سب راکھ بن کر پانی میں بہہ رہے ہیں۔ پھر پانی ہی پانی اس منظر پر چھا جاتا ہے۔ ہر طرف پانی ہے، شہر کے اندر بھی پانی پھیل گیا ہے۔ فاتح سردار اور اس کے ساتھی ناچتے گاتے شہر میں سیلاب کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ دونوں بندوں کے درمیان کی شاہراہ اب ایک نہر میں بدل گئی

نے۔

پھر یہ منظر بھی بدل جاتا ہے۔ اور اب پھر وہی ریت ہے، وہی گڑھاؤ ہے، اب گڑھاؤ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ خالی، خشک اور چٹیل میدان کی طرح وہاں اب صرف گڑھاؤ کی سطح باقی ہے اور بس۔ بیچوں بیچ وہی ہڈی پڑی ہوئی ہے۔

میں نے آنکھیں ملیں، کیا یہ خواب تھا، یا صرف میرے ذہن کی کارفرمائی تھی۔ کیا میرے تخیل کو مہمیز دی گئی تھی؟ یہ آگ، خون اور پانی کا کھیل کیسا تھا، سینا قرب کس دور میں گزرا، جو قافلہ پہلے گزر گیا یہ کون تھے؟ کیا یہ وسطی ایشیا سے آنے والے آریائی تھے جو نقلِ مکانی کر کے ایران، شمالی ہندوستان، عراق اور یورپ تک آئے یا یہ کریٹ اور روڈھس وغیرہ کے مسافر تھے جو مشرق کی طرف چلتے رہے یہاں تک کہ یہ لوگ دجلہ کی وادیوں میں جا اُترے؟ نہ معلوم یہ کس زمانے کا منظر تھا اور یہ علاقہ کون سا تھا جہاں دریا کا بند توڑا گیا۔ یہ شہر کون سا تھا۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ جامش کی آواز اُبھری۔

"سن! یہ گزرے ہوئے زمانے بار بار تیری نگاہوں کے سامنے فرش کی طرح بچھ جائیں گے۔ ماضی تجھ سے ہوا کے جھونکے کی طرح ٹکرائے گا۔ تجھے کئی ہزار سال پیچھے کی طرف لوٹ جانا ہے۔ تجھے لکڑی اور پانی والے نوجوان کے ساتھ دور تک چلنا ہے۔ تجھے یہ سب کچھ بہت جلد اور بار بار دکھایا جائے گا تاکہ تو ان نگاہوں کو جان لے جو صدیوں سے تیری راہ تک رہی ہیں۔"

"جامش! مجھے اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ ہڈی اور رومال کس کا ہے اور مجھے کیوں دیا گیا ہے؟ اس کا راز کیا ہے؟"

"جب دختِ زر نے مینا متی کے ساتھ مشرق کا سفر شروع کیا تو کئی سال تک جنگل، دریا اور پہاڑوں کی وسعتیں ناپنے کے بعد وہ ایک قدیم دریا کی وادی میں جا پہنچا جسے سندھو ندی کہتے تھے اور تھوڑی مدت وہاں قیام کر کے وہ پھر مشرق کی طرف عازمِ سفر ہو گیا۔ ان تمام سالوں میں مینا متی کا باپ سینا قرب اور ماں بوران پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر انہوں نے رامیسیس فرعون کے دربار سے عظیم ساحر مردوقش کو بلوایا کہ وہ مینا متی کا کچھ حال بتا سکے۔ مردوقش نے اپنا علم بوران کو بھی بخشا۔ وہ کئی ماہ تک سینا قرب کے دربار میں رہا۔ اس نے اپنے علم کے زور پر مینا متی کو سفر کرتا ہوا بھی دکھا دیا تھا اور شاید وہ اپنے علم کے زور سے مینا متی اور دختِ زر کو بوران کے پاس کھینچ

بھی لاتا مگر دیوتاؤں کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ انہی دنوں اُسے فرعون رامیسیس نے بلا بھیجا۔ ان ہی دنوں فرعون کے دربار میں لکڑی اور پانی والے نوجوان کا بڑا تذکرہ تھا۔ یہ لکڑی کے تختوں پر بہتا ہوا بچّہ فرعون کو مل گیا تھا جو جوان ہو کر فرعون کی خدائی کے مقابل آ گیا اور مردوقش کے سحر کو اور فرعون کی عظمت کو تاراج کر کے ویرانوں میں نکل گیا۔ اگر مردوقش کا علم اس کے ہاتھوں نہ چھن جاتا تو میناماتی اتنی طویل مدّت قید نہ رہتی۔ یہ ہڈی مردوقش نے بوران کو دی تھی اور یہ رومال بوران کا اپنا رومال تھا۔ یہ ہڈی اور بوران کا رومال دنیائے قدیم کے سحر کی ایک لافانی اور بے مثال دولت ہیں۔ ہر دور میں نسلوں نے اس سرمایہ کی حفاظت کی ہے۔ ہم سیاہ حبشی جو مردوقش سے سحر کا علم لے کر چلے اور دنیا میں پھیل گئے آج بھی مردوقش کی لونڈیاں اور غلام ہیں۔ مردوقش نے ہمیں حکم دیا تھا کہ یہ ہڈی جس کے پاس بھی ہو اس وقت تک امانت رہے گی جب تک کہ میناماتی کا نجات دہندہ اُس سے نہ آ ملے۔ اس کی پہچان یہ تھی کہ اس کے ماتھے پر تین ستارے روشن ہوں گے، ہاتھ گھٹنوں سے لمبے ہوں گے اور ہتھیلی پر لکیروں کا ایسا جال ہو گا جس کے بیچوں بیچ تاج بنا ہو گا۔ جیسا کہ ماضی کے دُھندلے نقوش، کبھی جب آسمان تاریک ہو گا اور برستے بادلوں کی ایک سیاہ شام ہو گی تو یہ نوجوان خود ہی کسی غلام یا کنیز کے پاس جا پہنچے گا تو امانت والے کو امانت دے دی جائے گی۔"

پھر جامش خود بھی جیسے سحر میں ڈوب گئی اور اس کی اپنی آواز بھی مدھم مدھم سی ہو گئی۔ تب میں نے سناوہ کہہ رہی تھی۔

"اور پھر ایک سُرمئی شام کے بادلوں نے جب آسمان کو ڈھانپ لیا تھا، دن رات میں بدل گیا تھا تو پانی میں شرابور جنگلوں میں بھٹکتا ہوا تو مجھ تک آ پہنچا۔ صدیوں سے جامش کے آباؤ اجداد نے ہمیشہ ایسے موسم میں اپنے دروازے کھلے رکھے کہ نہ جانے تو کب آ جائے۔ اب مردوقش اور بوران کے تمام غلام اور تمام کنیزیں خوش ہیں کہ نجات دلانے والا آ گیا ہے۔"

پھر وہ بلند آواز سے کہنے لگی۔

"جب دریاؤں کی وادی سے میناماتی اُبھر آئے گی تو مردوقش بھی جی اٹھے گا۔ اس کا سارا علم اسے واپس مل جائے گا۔ پھر مردوقش کا مقابلہ کسی ایسے شخص سے ہو گا جو ہزار سال سے غائب ہو کر لوٹے گا۔ اُس کی طاقت اور اس کا علم ویسا ہی ہو گا جیسا کہ لکڑی اور پانی والے

نوجوان کا تھا۔ اگر اس مقابلے میں مردوقش اور اس کے ساتھی جیت گئے تو تمام دنیا میں مردوقش کا سر ہوگا اور دیوی دیوتاؤں کی حکومت ہوگی اور اگر وہ نوجوان غالب آگیا تو پھر دیوی دیوتاؤں کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ آسمان کا ان دیکھا خدا اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اس دنیا کو اپنے لیے محفوظ کر لے گا۔ مگر اس سے قبل قحط پڑیں گے۔ زمین جلے گی، نیلے شعلوں کی جنگ ہوگی، کروڑوں آدمی مکھی اور مچھر کی طرح مریں گے، ہولناک تباہیاں آئیں گی۔ تب کچھ فیصلہ ہوگا۔" میں کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا مگر جاشش نے ہاتھ اُٹھا دیا۔

"بس بس۔ اب میرے پاس تیرے لیے کچھ نہیں ہے۔ جا اب واپس لوٹ جا! دنیا بھر میں مردوقش کے غلام تجھ سے ملنے کے آرزومند ہیں۔ سب کو معلوم ہو چکا ہے۔ سب تجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ گستاخی اور بے ادبی مردوقش اور بوران کو پسند نہیں ہے۔ اس ہڈی اور رومال سے رہنمائی حاصل کر۔ تجھے بہت جلد اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر بہت دور جانا ہوگا۔ جنگ شروع ہو چکی ہے۔ اب ہم سب اپنا اپنا کام کریں گے۔ مجھے اپنا کام کرنا ہے اور تو اپنا کام کرے گا۔"

میں ایک بار پھر اس کوٹھری سے تشنہ تشنہ نکل آیا۔ یسوع مسیح، پاک مریم! مجھ پر رحم کرنا۔ میں نہ معلوم کس جال میں پھنس گیا ہوں۔ میرے گرداگرد مضبوط جال بنے جا رہے ہیں۔ رسیاں تنگ کی جا رہی ہیں۔ نہ معلوم کون کون سی اور کتنی قدیم طاقتیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ کیا مجھے واقعی مشرق کی طرف سفر کرنا ہوگا، کیا مجھے واقعی اپنے ماں باپ کو چھوڑ دینا ہوگا؟ میری پیاری ماں اور میرا شفیق باپ، یہ گھر، یہ اسکول، یہ چھوٹا سا کالج، یہ بائرن کا قصبہ، یہ جنگل، میری شکاری بندوق، یہ کرکٹ کا شوق۔ کیا یہ سب کچھ مجھ سے چھن جائے گا؟ کیا مجھے اپنی ماں کو یہ سب کچھ بتانا چاہیے کہ میں ان کے پاس اب چند ہی دنوں کا مہمان ہوں؟ کیا مجھے اس سیاہ فام حبشی عورت کا جو اپنا نام جاشش بتاتی ہے یقین کر لینا چاہیے؟ کیا اُس نے جو کچھ بتایا ہے اور تاریخ قدیم کے جس دور کی طرف اشارہ کیا ہے اسے محض ایک مذاق سمجھا جائے یا اس کو واقعی کوئی حقیقی دور سمجھا جائے۔ بہت سے خیال آئے مگر ایک فکر جو ہر سوچ پر بھاری پڑ گئی وہ ماں اور باپ کو چھوڑ کر جانے کی فکر تھی۔ ماں میرے لیے کیا تھی! مجھے یاد آیا کہ میری ماں نے ہمیشہ مجھے ایک ننھے پودے کی طرح دنیا کی تند و تیز ہواؤں سے محفوظ رکھا ہے، میری تربیت اور میری پوری تعلیم پر بھرپور

وجہ دی ہے۔ میری عادتوں اور میرے کردار کی تعمیر میں نہایت سخت اصولوں کی پابندی کی ہے۔ میرا مطالعہ، میرا کھیل، گفتگو کے طریقے، دوستوں سے ملنے جلنے کا انداز گھر میں خاندانی ورثوں کی حفاظت کا جذبہ، ملک اور قوم سے مربوط رہنے اور ایک عظیم قوم کا فرد ہونے کا احساس، بہادری اور ذمہ داریاں اٹھانے کا خیال اور شوق سب کچھ میری ماں نے ہی مجھے دیا ہے۔ میرے دوستوں کے انتخاب تک میری ماں میری مدد و معاون رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ اس وقت سوتی تھیں جب میں سو چکا ہوتا تھا۔ جب تک میری مصروفیات اور مشغلوں پر تفصیلی گفتگو مجھ سے نہ کر لیتی تھیں میرا دن ختم نہ ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف میری پیاری ماں تھیں بلکہ میری ایک مخلص اور سچی غم گسار اور ہمیشہ اچھا مشورہ دینے والی بزرگ ہستی بھی تھیں۔ کیا میں یہ سب چھوڑ سکوں گا؟ کیا میں اپنے باپ کو بھول جاؤں گا، ان کو چھوڑ سکوں گا۔ میرے ڈیڈی جو گھر آتے ہی مجھے پوچھتے ہیں، میری پیشانی چومتے ہیں۔ جب میں چھوٹا سا تھا اور رات کو ان سے کہانیاں سنتا تھا تو وہ بار بار میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے رہتے تھے۔ میری پیشانی پر میرے بالوں پر اپنا لمس محسوس کرتے رہتے تھے۔ ان کی انگلیاں جیسے گرم دوپہر میں درختوں کی شاخوں کا سایہ تھیں۔ وہ مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیتے تھے۔ مجھے فخر سے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے دوستوں سے ملاتے تھے۔ میرے لیے تحفے لاتے، میری چھوٹی سی لائبریری بھی انہوں نے خود بنائی تھی۔ میرے ٹکٹوں کے البم میں ٹکٹ بھی انہوں نے چپکائے تھے۔ میرے والد اور میری والدہ میری محبتوں کا مرکز تھیں۔ میں ان کا ارمان اور ان کا غرور تھا۔ میری عمر میں وہ اپنی گزرتی ہوئی زندگی کا عکس دیکھتے تھے۔ وہ میرے تھے اور میں ان کا تھا۔ کیا میں ان سے الگ ہو سکوں گا۔ کیا وہ مجھے خوشی سے علیحدہ ہو کر ایک ان دیکھی دنیا کے سفر کی اجازت دے دیں گے؟ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ یہ ایک جاں گسل معاملہ تھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ مجھے اس واقعے کو جو مجھ پر گزر رہے تھے اپنے والدین کو بتا دینا چاہیے یا نہیں۔ آج تک میں نے ان سے کچھ چھپایا نہ تھا اور نہ ہی کبھی جھوٹ بولا تھا۔ میں ان کے لیے ایک کھلی کتاب کی طرح تھا۔ مگر اب مجھے اپنے ماں باپ سے کچھ چھپانا پڑ رہا تھا وہ بھی اس لیے کہ ایک تو یہ معاملہ ایسا حیران کن تھا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کیا بتاؤں اور کیا چھپاؤں اور پھر یہ خبر جس قدر صحیح تھی اُسی قدر اس کو ماں باپ کو سنانا مشکل تھا۔ اس سے ان کا اُداس ہونا لازمی تھا۔ سوچتے سوچتے میں نے آخر یہ طے کیا کہ

میں پہلے تو یہ معلوم کروں گا کہ مصر میں خوفو اور رامیسیس نام کے کون بادشاہ گزرے ہیں اور پھر کوئی ایسا شہر تھا یا نہیں تھا؟ شاید ابتدائی مطالعہ ہی یہ بات ثابت کردے گا کہ جو کچھ جاش کے کرداؤ میں میں نے دیکھا وہ محض فریبِ نظر تھا یا واقعی اس کی کچھ حقیقت بھی تھی۔

اسی سوچ بچار میں غلطاں و پیچاں میں گھر لوٹ آیا۔ گھر والوں نے مجھ سے میچ کے بارے میں کوئی سوال بھی نہ کیا کیوں کہ جب میں گھر پہنچا تو ہماری خادمہ نے بتایا کہ برمنگھم سے اطلاع آئی تھی کہ میرے حقیقی چچا جان چارلس میلکم کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ میری ممی اور میرے ڈیڈی فوراً برمنگھم چلے گئے ہیں۔ میرے لیے یہ پیغام چھوڑ گئے ہیں کہ وہ تین دن بعد آئیں گے اور میں برمنگھم نہ جاؤں بلکہ گھر پر ہی رہوں۔ واپسی میں ممکن ہے چچی جان اور ان کے بچے کچھ دن رہنے کے لیے ہمارے گھر آ جائیں۔ چنانچہ فوری طور پر خدا نے مجھے جھوٹ بولنے سے محفوظ رکھا اور جب ممی اور ڈیڈی واپس آئے تو ڈیڈی کئی دن تک اتنے اداس اور مضمحل رہے کہ وہ کچھ بولتے ہی نہ تھے۔ ان کی ہنسی، ان کا مذاق سب ختم ہو گیا تھا اور ان کی عادتوں میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی تھی جیسے کسی چنگاری کو بجھا دیا جائے یا جیسے بارش کا قطرہ آہستہ آہستہ زمین میں جذب ہونے لگے جو اپنے وجود کو بچانا بھی چاہے مگر جذب ہونے پر مجبور ہو۔ یا چنگاری جو بجھنا اور راکھ بننا نہ چاہتی ہو مگر راکھ بن جائے۔ یہ میرے ڈیڈی تھے جو ان دنوں غموں میں جذب ہو گئے تھے۔ دوسری طرف میں نے اپنے اسکول کی لائبریری میں قدیم مصری تاریخوں اور دجلہ و فرات کی تہذیبوں پر کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ مصر میں اہراموں میں سب سے بڑا اہرام خوفو کا ہے جو ۲۶۰۰ ق م میں تعمیر ہوا۔ اس کے قریب ہی وہ انسانی چہرہ اور شیر کے جسم والا بت ہے جسے چٹان سے تراش کر بنایا گیا تھا اور جسے ابوالہول کہتے ہیں۔ خوفو کا یہ عظیم الشان اہرام سات ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور اس میں ایک کروڑ بیس لاکھ مکعب فٹ پتھر لگے ہیں جن میں بعض بعض پتھر تیس تیس ٹن کے بھی ہیں اور ان کی ساخت، سائز اور ہر پتھر کی یکسانیت ایک جیسی ہے۔ اس اہرام کی بلندی ۷۷ء۲ فٹ ہے۔ یہ اہرام تقریباً ایک لاکھ مزدوروں نے دس سال مستقل کام کرنے کے بعد تیار کیا۔ آج کل اس اہرام کے پاس مصر کا شہر غزہ واقع ہے اور یہ بھی ان ہی کتابوں سے معلوم ہوا کہ قدیم مصری لوگ روحانیت کے قائل تھے اور ان کا خیال تھا کہ موت صرف انسانی جسم کو چھو کر گزر جاتی ہے

مگر روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ انہیں اس روح کے دنیا میں دوبارہ واپس آنے کا صد فی صد امکان تھا۔ وہ اسی لیے ہمیشہ اپنی توجہ اس بات پر مرکوز رکھتے تھے کہ جب روح لوٹ آئے تو اس کو اپنا جسم اچھی اور عمدہ حالت میں ملے تاکہ وہ اپنے حقیقی جسم کو پہچان لے اور جب یہ جسم دوبارہ زندہ ہو تو اسی تزک و احتشام کی زندگی حاصل کرے جس میں وہ ختم ہوا تھا۔ چنانچہ اس قدیم دور میں اپنے مردہ جسم کو صحیح سالم رکھنے کے لیے انھوں نے ایک عجیب و غریب محلول دریافت کیا جو تارپین کے تیل کے آمیزے سے تیار ہوتا تھا۔ وہ اس جسم کی آلائش نکال کر صرف باہر کی کھال اور چہرے کو باقی رکھتے تھے اور ان اجسام کو ممی بنا کر اس میں دفن کر دیتے تھے۔ اس دور میں ہر مصری کی قبر اسی طرح بنتی تھی۔ مگر غریبوں کے اہرام چھوٹے اور امیروں کے بلند و بالا ہوتے تھے۔ ساتھ ہی ان کتابوں میں یہ بھی تحریر تھا کہ یہ تعمیرات اور جسم کو محفوظ کرنے کا طریقہ اور روح کے جسم میں لوٹ آنے کا تصوّر ہندو مت، بدھ مت، قدیم چینی فلسفے اور قدیم میکسیکو کے باشندوں میں مشترک تھے۔ یہ ایک عالمی تصوّر تھا جب کہ ذرائع آمد و رفت اتنے محدود اور ناقص تھے کہ مصریوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دریائے نیل کہاں سے نکلتا ہے اور کہاں جا گرتا ہے مگر اس تصوّر کی ہمہ گیریت ایک عجوبہ سے کم نہیں ہے۔ ان ہی کتابوں میں یہ بھی روایتیں درج تھیں کہ بہت سے ایسے شواہد بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین پر ان دنوں کسی آسمانی سیارہ کی مخلوق کی آمد و رفت تھی جس نے اس فلسفے کو اور اہرام کی تعمیر میں تعمیراتی علوم کو اس دور کے باشندوں میں عام کرایا۔ مگر اس پر کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔

دجلہ و فرات کی تہذیبوں پر کوئی عالمانہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔ مگر ایک کتاب میں یہ ضرور ملا کہ قدیم زمانے میں وادیٔ دجلہ کا مشہور ترین شہر بابل تھا اور اس کے اندر ایک عجوبۂ روزگار اور محیر العقول تعمیر وہاں کی تین سو فٹ اونچی مصنوعی پہاڑیاں تھیں جو مٹی کے تودے سے بنائی گئی تھیں۔ ان پر باغات اگائے گئے تھے جن میں پانی دینے کا نظام چرخیوں کے ذریعے بنایا گیا تھا۔ یہ پہاڑیاں شہر کے گرداگرد موجود تھیں اور شہر کی فصیل کے اتنی قریب تھیں کہ معلوم ہوتا تھا یہ درخت سروں پر آ رکیں گے۔

میں ایک عجیب سی الجھن میں گرفتار تھا۔ کبھی دل کہتا تھا کہ جاشی کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا جائے۔ کبھی خیال آتا بھلا اس دور میں مجھ جیسے پڑھے لکھے

گھرانے کا فرد ان لغو بات پر کان دھرتا ہے۔ عجیب گومگو کا عالم رہتا تھا۔ کسی طرف دل لگتا تھا نہ سکون ملتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ طے کیا کہ قبل از مرگ واویلا کیا، جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ پھر ڈرنا اور گھبرانا کیوں! اور پھر مشرق کا سفر ہم برطانویوں کے لیے کوئی ایسی انوکھی اور غیر معمولی چیز تو نہیں ہے۔ ہماری سلطنت نے تو مشرق و مغرب ایک کر دیے ہیں۔ سو میں نے طے کیا کہ فی الحال مجھے اپنی تمام تر توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کرنی چاہیے اور اس کے بعد ہی کسی اور چیز کے بارے میں سوچا جائے گا۔

امتحان قریب آ رہے تھے۔ میں اب پڑھائی پر توجہ دینے لگا۔ اسکول میں میں نے باقاعدہ اسپورٹس میں حصہ لینا شروع کیا۔ کتابیں، اسکول، گھر اور وہی پرانے مشغلے پھر سے میرے ساتھ تھے گویا اب میں وہی پہلا جان میلکم تھا جو اس غیر معمولی کرکٹ میچ سے قبل تھا۔ میں نے اس رومال اور ہڈی کو ضائع کرنے یا پھینک دینے یا اس کے متعلق بات کرنے کی پھر کبھی کوشش نہیں کی بلکہ ہمیشہ میں اس کو اپنے ساتھ پرس ہی میں رکھتا تھا۔ یوں بھی یہ ایک چھوٹی سی ہڈی تو تھی ہی، بس تقریباً ایک شلنگ کے سائز کی۔

اس طرح میں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ تاریخ کے موضوع سے مجھے خاص شغف تھا اور میں اپنے اساتذہ کا چہیتا بھی تھا۔ شاید ذہین بھی تھا کیونکہ میری پوزیشن کلاس میں اول یا دوئم سے نہیں گرتی تھی اور تاریخ میں میرے مطالعہ اور میرے نمبروں نے تو اسکول میں ایک دھوم مچا رکھی تھی۔ متواتر تین سال میں اسکول کی ہسٹری سوسائٹی کا جنرل سیکریٹری چنا جاتا رہا۔

تین سال بعد میں نے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کر لیا۔ تاریخ میں مجھے خصوصی انعامات ملے جن میں ایک سونے کا تمغہ بھی شامل تھا۔ میرے ماں باپ میری کامیابی پر پھولے نہ سماتے تھے۔

میری عمر اب سترہ سال کی ہو چکی تھی۔ میں نے آکسفورڈ سے گریجویشن کرنے کے لیے وہاں داخلہ لے لیا تھا۔ میرے مستقبل کے لیے میری ممی اور میرے ڈیڈی بے حد محتاط تھے اور اپنے اعزا اور رشتہ داروں سے میرے بارے میں اکثر و بیشتر مشورے کرتے رہتے تھے۔ میرے ماموں جارج میکلے سڈنی میں آسٹریلیا کے ڈپٹی گورنر کے عہدے پر تعینات تھے۔ انہوں نے ممی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے آکسفورڈ سے فارغ ہونے پر آسٹریلین رائل سول سروس میں داخل کرا دیں گے۔ جس کے بعد میں بھی ایک نہ ایک دن گورنری کے

عہدے تک جا ہی پہنچوں گا۔ میرے گھر والے بھی اصولی طور پر اس تجویز کو قبول کر چکے تھے اور میں نے بھی یہ بات مان لی تھی مگر مجھے آکسفورڈ میں داخل ہوئے ابھی صرف چھ ماہ گزرے تھے کہ ماموں جارج میکلے ایک حادثہ کا شکار ہو کر سڈنی ہی میں وفات پا گئے اور یہ پروگرام بھی بیچ ہی میں رہ گیا۔

میرے والد مجھے شاید اپنے تصور ہی تصور میں کسی کالونی کا وائسرائے بنا چکے تھے اور ان کی یہ خواہش کچھ ایسی لایعنی اور بعید از عمل بھی نہ تھی۔ ان دنوں اکثر خاندانوں کے بیشتر افراد سلطنتِ برطانیہ کے مقبوضات میں اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے بلکہ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں داخل ہو جانے کا مطلب ہی کسی نہ کسی علاقہ کا گورنر یا فوج اور پولیس کے اعلیٰ عہدے کے لائق بن جانا تھا۔ جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں یعنی ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ، اس وقت تاجِ برطانیہ کی اقبال مندی کا یہ عالم تھا کہ ہر برطانوی فرد جو اپنے ملک سے باہر تھا کسی نہ کسی حیثیت میں اپنے علاقے کا حکمران تھا۔ برطانوی اقتدار سورج کی طرح حکومت کر رہا تھا۔ ہم دنیا کی ایک سربلند قوم تھے۔ انگریزوں کی زبان، انگریزوں کا تمدن، ان کی ثقافت، تہذیب، چال چلن، کردار سب کی سب ہی اعلیٰ ترین خیال کی جاتی تھیں۔ لندن میں پارلیمنٹ کے فیصلے ان کروڑوں افراد کو متاثر کرتے تھے جنھوں نے ان ممبران کی صورت دیکھنی تو کجا ان کی آواز بھی نہ سنی تھی۔ ہمارے اقتدار کے خمار کا زمانہ تھا۔ عزت، دولت، قوت، اقتدار، جاہ و حشم، کبریائی، قہرمانی سب کچھ ہمیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ سمندروں پر ہمارا پرچم لہراتا تھا۔ ملک ملک کی زمین ہمارے قدموں تلے پائمال ہوتی تھی۔ دنیا بھر کی تجارت، صنعت، و حرفت سب کچھ ہمارے دم سے سانس لیتی تھی۔ سلطنت و اقتدار کی یہ وسعتیں آج تک کسی حکمران اور کسی قوم کو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی اور نہ شاید آئندہ کبھی ہو سکیں گی۔

خیر، میرا آسٹریلیا کا پروگرام فی الوقت کچھ ملتوی سا ہو گیا تھا۔ یوں بھی میری تعلیم مکمل ہونے کے لیے ابھی تین سال باقی تھے۔ سو، مستقبل کے کسی بھی پروگرام کے لیے ابھی کافی وقت موجود تھا۔

باب نمبر ۳

۹، جنوری ۱۹۰۰ء کو ہمارے کالج کے نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس لگا کہ سر جان ماشل آکسفورڈ آ رہے ہیں اور وہ ایک مقالہ پڑھیں گے۔ سر جان مارشل کی ذات محتاج تعارف نہ تھی۔ وہ ایک عظیم تاریخ داں تھے۔ ان کے اکثر مقالے لندن ٹائمز میں شائع ہوتے تھے۔ انھوں نے قدیم کھنڈرات کی کھدائیوں میں حصہ بھی لیا تھا اور ان سے ملنے والی نادر اشیاء کے بارے میں اپنی تحقیقات بھی سپرد قلم کرتے رہتے تھے۔ مجھے چوں کہ تاریخ کے مضمون سے خصوصی دلچسپی تھی اس لیے میں اُنے ان کے تمام مضامین نہ صرف پڑھے تھے بلکہ انھیں اخبار کے تراشوں کی صورت میں محفوظ کر لیے تھے۔ اُن سے میرا غائبانہ تعارف حاصل ہو چکا تھا۔

اتفاق کی بات تھی کہ سر جان مارشل کے مقالے کا عنوان بھی وادیٔ نیل اور وادیٔ سندھ کی تہذیبوں کی نشو و نما اور مشترک اقدار پر تحریر کیا گیا تھا۔

سر جان مارشل آئے اور انھوں نے مقالہ پڑھا۔ سر جان مارشل نے اہرامِ مصر کے متعلق ایسی عجیب و غریب باتیں کیں جو شاید ہمارے لیے اور ہمارے اساتذہ کے لیے یکساں طور پر حیران کن تھیں مثلاً یہ کہ اہرامِ مصر پانچ ہزار سال قبل مسیح سے لے کر دو ہزار سال قبل مسیح کے دوران تعمیر ہوئے اور پرانے رومی مورخین کا خیال تھا کہ اہرام دراصل غلہ کے وہ گودام ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر کو قحط سے بچانے کے لیے ہی تعمیر کیے گئے تھے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ حضرت نوحؑ کے طوفان سے قبل تمام زمین پر جگہ جگہ جن یا ان سے ملتی جلتی کوئی دوسرے سیارے کی مخلوق زمین پر آتی جاتی تھی۔ جن کا سائنسی علم اور ذہنی ترقی بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ اس مخلوق نے ان جسیم عمارتوں کو تعمیر کیا تھا۔ سرجان نے کہا کہ اس بات کے واقعی کافی ثبوت موجود ہیں کہ زمین پر کسی دوسرے سیارے کی مخلوق آتی جاتی رہی ہے۔ ان لوگوں کے قد عموماً سولہ سترہ فٹ کے ہوا کرتے تھے اور یہ چمک دار تیز رفتار سواریوں میں بیٹھ کر اڑ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً ہندوستانی، یونانی اور مصری دیومالائی کہانیوں میں اکثر دیوتاؤں کے زمین پر اُتر آنے اور لوٹ جانے کے قصے موجود ہیں۔ علاوہ ازیں یہ نظریہ کہ اہرام کسی ایسی مخلوق نے

تعمیر کیے جو سائنسی لحاظ سے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی یا جس کا تعلق ستاروں سے تھا اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ ستاروں کی رفتار کی حساب دانی کے اصول اہرام کی تعمیر میں عام طور پر مستعمل تھے۔ مثلاً ہر اہرام کی بنیاد کا رقبہ اس کے دائراتی رقبہ کے درمیانی فاصلے سے دوگنا ہوتا ہے اور جو فاصلہ زمین سے سورج کا ہے اسی فاصلے کے تناسب سے۔ مگر شاید اس فاصلے کا اربواں حصہ کے تناسب سے اہرام کی اونچائی بنیاد سے بلندی تک ہے۔ اس کی بنیاد میں ہمیشہ مختلف سائز کے ۳۶۵ پتھر ہی استعمال ہوتے تھے جو زمین کے سورج کے گرد مدار میں ایک چکر لگانے کے برابر کا وقفہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اہرام کی دو دیواروں اور ان میں استعمال ہونے والے پتھروں کا رخ شمال کی طرف دس درجہ پر ہے اور اہرام کی تیسری دیوار ہمیشہ اس زاویہ پر بنائی جاتی تھی جو زمین کے اپنے شرقاً غرباً جھکاؤ کا زاویہ ہے۔ یہ تمام چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جس تمدن نے اہرام جیسی عمارتوں کو جنم دیا وہ ایک اعلیٰ تمدن تھا۔ اگر پانچ ہزار سال ق۔ م میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ قوم وادیٔ نیل میں اتنی عظیم الشان عمارت بنارہی تھی تو پھر وہ یکا یک تاریکی میں کیوں چلی گئی؟ یہ کون لوگ تھے اور ان کا علم اندھیروں میں کیوں ڈوب گیا؟ سر جان مارشل نے وادیٔ سندھ اور وادیٔ نیل کا تقابل کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وادیٔ سندھ میں بھی چند مقامات پر کھدائی کا مسئلہ زیرِ غور ہے اور ان کے خیال میں یہ ایک اہم بات تھی کہ وادیٔ سندھ میں بھی بدھ مذہب سے قریباً دو ہزار سال قبل کے تمدن کے نشانات ملنے کی امید تھی۔

یہ لیکچر نہایت دلچسپ اور پُرمغز تھا۔ شعبۂ تاریخ کی سوسائٹی نے سر جان کو شام کی چائے پر مدعو کیا تھا۔ جس میں مجھے ہی ان کی میزبانی کرنی پڑی کیوں کہ میرے اساتذہ نے میرا تذکرہ نہایت خاص انداز سے کیا تھا۔ سر جان نے جانے کے دوران آکسفورڈ سے تین دوسرے لڑکوں کو اور مجھے بطورِ خاص گویا کل چار طلبہ کو اس بات کی دعوت دی کہ موسم گرما کی چھٹیوں میں جون کے ماہ میں ان کی ایک ٹیم جو ابتدائی مطالعاتی دورے کے لیے مصر، عراق اور ہندوستان جانے والی تھی اس میں اپنے خرچ پر ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لے چلیں۔ میں نے بابی بھرلی اور پھر میری ممی اور ڈیڈی نے بھی اجازت دے دی۔ سر جان مارشل کے ہمراہ کسی مطالعاتی دورے پر جانا کچھ کم اعزاز کی بات نہ تھی۔ ساری یونیورسٹی میں میری دھوم مچ گئی کیوں کہ سر جان نے بطورِ خاص مجھے ذاتی دعوت دی تھی۔

سامانِ سفر بندھا تو وہی ہڈی اور کھال کا رومال حسبِ دستور میرے پرس میں میرے ساتھ تھا۔ اس دوران مجھے کسی لمحہ یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ یہ سفر وہی خاص سفر ہوگا جس کا اشارہ مجھے مل چکا تھا۔ جون ۱۹۰۰ء ہماری تیاریوں کی نظر ہوگیا اور ہم کل سات آدمی، چار طلبا اور تین سر جان مارشل کے ساتھ ۲۷، جون کو ڈوور سے روانہ ہوئے جہاں سے ہم لوگ لزبن اور جبل الطارق ہوتے ہوئے نیپلز کی بندرگاہ پر پہنچے اور غالباً ۱۱- جولائی کو ہمارا جہاز اسکندریہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ اسکندریہ ایک عظیم تاریخی شہر ہے۔ مشہور ہے کہ اس شہر کو یونان کے عظیم جنرل سکندرِ اعظم نے ۳۴۸ ق-م میں تعمیر کیا تھا۔ ہم لوگ مصر پہنچنے سے قبل ہی مصریات کے متعلق بہت کچھ جان چکے تھے۔ سر جان مارشل دورانِ سفر اکثر علمی اور تعلیمی ماحول پیدا کر دیتے تھے۔ ہمیں قرآن، زبور اور توریت کے متعلق وہ اکثر کچھ نہ کچھ سناتے رہتے تھے۔ اسکندریہ کے متعلق بھی انہوں نے ہمیں بہت کچھ بتایا مثلاً یہ کہ دنیا کے چار عظیم جرنیل سکندر اعظم، قتیبہ بن مسلم، ہنی بال اور چنگیز خان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سکندر اعظم کی عمر اگر وفا کرتی تو وہ مشرق و مغرب کے درمیان افہام و تفہیم کی راہداریاں مستقل طور پر پیدا کر دیتا۔ ان ہی نے ہمیں بتایا تھا کہ سکندر مقدونیہ سے نکلا تو مصر کی جس بندرگاہ پر وہ لنگر انداز ہوا اس کو اپنے نام ہی سے موسوم کیا اور وہ بندرگاہ اب تک اسی کے نام پر آباد ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہاں چپے چپے پر تاریخ بکھری پڑی ہے۔ یہ پیغمبروں کی زمین ہے اور یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات صرف اسی علاقے میں ہیں۔ سر جان مارشل کا خیال تھا کہ یہ تین مذاہب گو آج کل اپنے اعتقادات کی بنیاد پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں مگر پھر بھی ان الہامی کتابوں کے قصے اور دوسری بہت سی باتیں ان کے مشترک ماخذ کی دلالت کرتی ہیں۔ اسی زمانے میں عراق کے قریب ایک قدیم شہر "اُر" کی دریافت بھی ہو چکی تھی اور اُدھر جرمنی کے ایک ماہر شلیمان نے "ٹرائے" کا شہر بھی سلطنت عثمانیہ کی حدود میں ترکی کے قریب دریافت کر لیا تھا جس میں اس کو بے اندازہ سونا اور جواہرات ملے تھے۔ اسی علاقے میں یعنی مشرقِ وسطیٰ میں یہودیوں کے بہت سے پیغمبر اُتارے گئے تھے۔

غرضیکہ اسی طرح کی علمی محفلوں میں ہمارا وقت گزرتا رہا۔ لزبن سے ہم لوگ مارسیلز پہنچے۔ وہاں سے ہمارا رخ اسکندریہ کی طرف تھا۔ لندن سے چودہ دن کے سفر کے بعد ہم اسکندریہ جا پہنچے۔ بندرگاہ پر ہمارا استقبال ہمارے ملک کی سیاسی اقبال مندیوں کا مرہون

احسان تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل جب سوئز کنال بن رہی تھی تو ہمارے مدبرین نے بحیرۂ روم اور بحیرۂ ہند کی اس آبنائے کی اہمیت کو اس قدر سمجھ لیا تھا جو شاید مصریوں کے لیے ابھی پچاس سال اور ممکن نہ ہو۔ اب شنگھائی سے لندن تک ہمارے لیے سمندروں کی وسعتیں سمٹ کر ایک جھیل کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ مصری گو ابھی تک استنبول کے اسلامی خلیفہ کے ماتحت تھے اور اپنے آپ کو خلافتِ ترکیہ کا ایک جزو سمجھتے تھے مگر ہم نے ان مصریوں کے اندر قومی آزادی اور خلافتِ ترکیہ سے بیزاری کی چنگاریاں سلگا دی تھیں۔ آنچ ابھی مدھم تھی۔ ہمارے تجارتی دفاتر اور مذہبی مبلغ ہمارے سیاسی اقتدار کا ہراول دستہ تھے جو امن و آشتی کا رجز پڑھتے ہوئے مصری ثقافت اور سماجی اداروں میں عمل دخل بڑھاتے جا رہے تھے۔ صبح کو جب ہمارا جہاز لنگر انداز ہوا تو بندرگاہ پر کسٹم اور شہر کے بڑے افسران موجود تھے۔ ہمیں جہاز سے اُتار کے ایک فٹن بگھی میں فوراً ریلوے اسٹیشن لے جایا گیا۔ وہاں سے ہم لوگ قریباً تین بجے سہ پہر قاہرہ پہنچے۔ قاہرہ دریا کے دائیں طرف واقع ہے اور دوسرے کنارے پر ایک اور شہر آباد ہے جسے مقامی آبادی غزہ اور یورپین گنیزہ کہتے ہیں۔ یہی وہ شہر ہے جہاں ابوالہول کا نصف انسان اور نصف شیر کی شکل والا مجسمہ اور خوفو کا عظیم الشان اہرام موجود ہے۔ ہمارا قیام غزہ ہی کے ایک ریسٹ ہاؤس میں کرایا گیا۔ وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہمیں اہرام اور ابوالہول دونوں ہی نظر آتے تھے۔

سر جان کو دو دن بعد جامعہ الازہر میں قدیم مصری تہذیب پر ایک سیمینار میں شرکت کرنی تھی اور ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ چنانچہ وہ تو اسی کی تیاری میں لگ گئے اور ہم لوگ غزہ کی سرگشت کو نکل کھڑے ہوئے۔ دو گھنٹے شہر کی اطراف اور دریائے نیل کے کنارے گھومنے کے بعد میرے ساتھی ریسٹ ہاؤس کی طرف لوٹ گئے میں نے ذرا دیر اور دریا کے قرب اور شام کا لطف اٹھانے کے خیال سے وہیں رُکنے کا فیصلہ کیا۔

شام کے ملگجے اُجالے سیاہی میں بدلتے گئے۔ چادرِ آبِ رواں پر لہریں ہلکورے لیتی رہیں۔ کنارے پر بُلبلے بنتے اور بگڑتے رہے۔ نیل بہتا رہا اور میں دور اُفق پر اس تکونی اونچی عمارت کو دیکھتا رہا جسے اہرام کہتے ہیں۔ پھر مجھے کچھ شوقِ تجسس نے اور کچھ میرے جذبہ سیاحت نے اُبھارا تو نہ جانے کب میں اہرام کی طرف چلنے لگا۔ آہستہ آہستہ دریا دور ہوتا گیا، شاید ایک میل دور کر میں نے اپنے آپ کو اہرام کے دامن میں پایا۔

اب چاند نکل آیا تھا۔ آدھے مہینے کا پورا چاند شفاف نیلے آسمان پر سونے کا دائرہ،

جگمگاتا، کرنیں، بکھیرتا ہوا چاند، اس ویرانے میں دور دور تک میرے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ صحرائی ہواؤں کی بے نام خوشبو تھی اور ریت کے ذرّوں پر چاندنی کا انعکاس تھا۔ ماحول بڑا شاعرانہ اور ساحرانہ قسم کا تھا مگر اس وقت اس صحرا میں میرے علاوہ اور کوئی ذی رُوح نظر نہ آتا تھا۔ میں یوں ہی اہرام کے چاروں طرف گھومتا رہا۔

اہرام کی سیاہی مائل سلوں میں نو، دس انچ کے فاصلے سے زینہ سا بنا ہوا تھا۔ پتھروں کے کنارے ٹوٹے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں جنگلی جھاڑیاں اور چھوٹی چھوٹی خشک صحرائی گھاس بھی اُگی ہوئی تھی۔ میں ایک سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ ذراستانے اور دم لینے کے لیے۔ شاید ماحول کی کیف آوری نے اور مُسافت کی تھکن نے غنودہ ذہن کو کچھ اور تھپکیاں دینی شروع کر دی تھیں کہ مجھے ایکاایکی یوں لگا جیسے کہیں سے کوئی میری طرف بڑھ رہا ہو۔ میں گویا یکایک جاگ گیا۔ قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ۔ آہستہ آہستہ، متواتر اور مستقل، ایک قدم، دوسرا قدم، ماحول کی جادوگری، پانچ ہزار سال قدیم مقبروں کا قرب، جنگل، بیابان، تنہائی، رات اور پھر کسی کے پیروں کی ہلکی ہلکی دھمک۔ میں چونک پڑا، آخر یہ کون ہو سکتا ہے؟ قدموں کی آواز بالکل قریب آ چکی تھی اور پھر دفعتاً بالکل معدوم ہو گئی۔ مجھے نہ پہلے کوئی نظر آیا نہ اب۔

شاید یہ میرا واہمہ تھا یا خیال کی پیکر آرائی تھی۔ بھلا یہاں میرے علاوہ اور کون ہو گا؟ ہاں بھلا یہاں اور کوئی کیوں آئے گا؟ یہ خود کلامی سے زیادہ بکھرتے ہوئے اعصاب اور ٹوٹتی ہوئی طاقتوں کو گرفتار کرنے کی موہوم سے کوشش تھی۔

چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ مجھے پھر کسی کی ہلکی سی چاپ سنائی دی جیسے کوئی باریک کپڑا ہوا کی سرسراہٹ لیے بدن سے مس ہو رہا ہو، پھر رفتہ رفتہ سرسراہٹیں قدموں کی چاپ میں بدل گئیں۔ شاید کوئی میری طرح اس صحرا میں گھوم رہا تھا۔ میرے بے حد قریب، میرے اطراف میں۔

"کون ہے........؟"

"تم کون ہو.....؟"

میں نے دہشت زدہ ہو کر چیخ کر پوچھا۔ مگر میری آواز صحرا کی گونج بن کر لوٹ آئی۔ میری آواز میرا جواب تھی۔ اب دل میں ڈر اُبھرنے لگا۔ فوری طور پر جو خیال ذہن میں ابھرا وہ یہ تھا کہ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ میرے پیر، میری ٹانگیں سب کانپ رہی

تھیں اور میں پورا کا پورا اب ایک عجیب ذہنی تفرقہ کا شکار تھا۔ جسم، ہاتھ، پیر کچھ قابو میں نہ تھے۔ بہیں بمشکل کھڑا ہوا ہی تھا کہ میری نظروں کے سامنے اہرام کی ایک سِل ہٹی اور آہستہ آہستہ کئی انچ اُوپر سرک گئی۔ خوف اور دہشت کی سرد لہریں میری ریڑھ کی ہڈی سے گزر رہی تھیں۔ میرے دل کی دھڑکن بے حد تیز تھی۔ میرے اندر کا شور باہر کی آوازوں سے کہیں زیادہ تھا مگر میں ایک ہپناٹائزڈ معمول کی طرف بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اہرام کی کالی پتھریلی سِل اب کچھ اور بلند ہو چکی تھی اور پھر ایک حنوط شدہ لاش، سارے جسم پر پٹیاں لپیٹے، چہرہ کھولے رفتہ رفتہ اس مقبرے سے باہر نکلی۔ نہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی اور نہ گوشت پوست کا انسان۔ اس کے ہر قدم اٹھانے سے ہڈیوں کے چڑچڑانے کی آواز نکلتی تھی۔ اس کی آنکھیں چہرے پر موجود نہ تھیں مگر ان کی جگہ دو تاریک سے گڑھے تھے لیکن بھنویں، پلکیں، چہرہ مہرہ سب تروتازہ تھا۔ سر پر تاج جیسی کوئی چیز پہنے وہ لمبے قد کی کوئی مردانہ ہیئت کی لاش تھی۔ پتھر کی سِل اسی طرح اپنی جگہ سے اُبھری ہوئی تھی اور ماحول اسی طرح جادو اور سحر کا ماحول تھا۔ لاش آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔

میں ایک سحر میں گرفتار تھا۔ نہ ہٹ سکتا تھا نہ ہل سکتا تھا۔ نہ چیخنے کی تاب تھی نہ نظر ہٹانے کا یارا تھا آواز گلے میں اٹک گئی تھی، حواس منجمد ہو چکے تھے۔ سوچنا بھول گیا تھا۔ میں میں نہیں تھا۔ شاید قریب پڑے ہوئے پتھروں کی طرح جذبات سے عاری ایک شے تھا۔ میرا عدم اور وجود اب برابر تھا۔ شاید یہ میرے تمام احساسات سمٹ کر اب اس حنوط شدہ، کپڑوں میں لپٹی لپٹائی لاش کا روپ دھار چکے تھے جو قدم بہ قدم میری سمت بڑھ رہی تھی۔ چاندنی اور ریت اور صحرائی ہواؤں کی سرسراہٹوں میں اب کڑکڑاتی ہوئی ہڈیوں کی دبی دبی چیخیں بھی شامل ہو چکی تھیں۔

میری نگاہیں اس کی دونوں بے نور آنکھوں کی گہرائیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں زندگی کی کوئی چمک اور شعاع نہ تھی۔ کوئی قندیل روشن نہ تھی۔ سر سے لے کر پاؤں تک سفید سفید پٹیاں اُس کے جسم پر ایسے لپٹی ہوئی تھیں جیسے کوئی ماہر جراح ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے بعد ڈریسنگ کر دیتا ہے۔ جیسے جیسے وہ لاش میرے قریب آتی جا رہی تھی میری سونگھنے کی حس پر کافور کی بو کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ لاش یا ممی، آپ جو کچھ بھی اُسے کہیں، میرے بالکل سامنے قریب آ کر رک گئی۔ پٹیوں سے لدا پھندا ہاتھ کسی مشین کے

لیور کی طرح اُٹھا اور میرے کندھے پر آکر رک گیا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں..... میرے خدا! اگر میں ان کو انگلیاں کہہ سکتا تھا، ہڈیوں کے پنجرے سے نکلتی ہوئی میرے کندھے پر موجود تھیں۔ اس نے مجھے اہرام کے شگاف کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ایک سحر زدہ معمول کیطرح اس کے پیچھے پیچھے میں چلتا گیا۔ اس وقت میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ مجھ میں قوتِ مدافعت موجود نہ تھی۔ میرا ذہن خالی تھا۔ گویا میں خواب میں چل رہا تھا۔

آہستہ آہستہ اہرام کی سیڑھیوں سے قدم بہ قدم چڑھتا ہوا میں اور وہ دونوں اس شگاف تک آ گئے۔ وہ لاش آگے بڑھ کر اس شگاف میں اُتر گئی۔ میں نے بھی اس کے ساتھ ہی ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ذرا جھک کر اندر کی طرف دیکھا۔ گھپ اندھیرا، مگر پھر بھی لاش سیڑھیوں سے اترتی نظر آئی۔ چند انچ کا فاصلہ اور ایک قدم اور..... فاصلہ طے ہو چکا تھا۔ میں اہرام کے اندر تھا اور میرے پیچھے ایک اور لاش بھی اہرام کے کھلے ہوئے شگاف میں داخل ہوئی۔ شاید یہ وہی ہیولیٰ تھا جس کے قدموں کی چاپ میں باہر اہرام کے اطراف میں سن رہا تھا۔

جیسے ہی اندر داخل ہوا اہرام کی وزنی اور لمبی بڑی سل پھر آہستہ آہستہ نیچے کی طرف آتی گئی اور یک لخت ایک ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ یہ شگاف پھر بند ہو گیا۔

اب میں شاید خواب سے جاگ رہا تھا۔ میرے حواس پر جو برف کی طرح سفید سا غبار چھا گیا تھا وہ ہٹ رہا تھا۔ جیسے شبنمی قطرے علی الصبح مکڑی کے جالوں پر اٹکے ہوئے نظر آئیں اور پھر سورج کی ابتدائی کرنوں کی حدّت سے فضا میں جذب ہوتے جائیں، میرے ذہن کی تاریکیاں بھی اسی طرح چھٹ رہی تھیں۔ احساسات میں ملگجے اُجالے پھیل رہے تھے۔ سحر زدگی کی کہر صاف ہو رہی تھی۔ تب چند لمحے میں بے حس و حرکت ہی سیڑھی پر کھڑا رہا جہاں آکر رک گیا تھا۔ اب مجھے نہ آگے جانے والی لاش نظر آتی تھی اور نہ پیچھے داخل ہونے والی۔ میں اس گھپ اندھیرے ماحول میں اکیلا کھڑا تھا۔

آکسفورڈ کا طالبِ علم، آسٹریلیا کی گورنری کا خواب دیکھنے والا، مردو قش کی ہڈی اور بوران کے رومال کا امین، جان میلکم شاید تمام زندہ انسانوں کے جمِ غفیر کا وہ واحد شخص تھا جو پانچ ہزار سال پرانے اہرام کے ماحول میں زندہ داخل ہوا تھا اور سانس بھی لے رہے تھا۔

میں جانتا تھا کہ اہرام میں نہ معلوم ہڈیوں کے کتنے ڈھانچے ادھر ادھر بکھرے ہوئے

ہوں گے۔ اب ہڈیوں کے یہی ڈھانچے میرے ساتھی تھے۔ باہر جانے کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ اندر کی زندگی موت کے پنجے میں پھنس چکی تھی۔ میرے خدا، میں کہاں آ پھنسا ہوں! یسوع مسیح! پاک مریم! کیا میرا خاتمہ یوں ہی ہونا تھا! میں پیچھے ہٹا اور پھر زور لگا کر اس سل کو اٹھانا چاہا جس کے شگاف سے میں اندر داخل ہوا تھا مگر اس کوشش سے خود کو تھکا لینے کے علاوہ اور کیا حاصل تھا۔ اب مجھے یہ پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ میں اس وسیع و عریض قبر میں قید ہو چکا ہوں۔

آپ جو اس وقت یہ سطور پڑھ رہے ہیں اور سرسری طور سے شاید اس مرحلہ سے گزر گئے ہیں ایک ایسے شخص کے جذبات و احساسات کو پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکتے جو تن تنہا ایک ایسے مقبرے میں قید ہو جس کے اوپر آسمان، ستارے، چاند، بادل، سورج سب چھٹ گئے ہوں اور کچھ نظر آنے کی امید نہ ہو۔ جہاں روشنی کی ایک ہلکی سی کرن بھی داخل نہ ہو سکے۔ جہاں کی ہوا صدیوں سے محبوس ہو اور جس کی اطراف میں ایسی لاشیں موجود ہوں جو دنیا کے لیے راز ہوں۔

میں اہرام میں بند تھا۔ مجھے اندر لانے والی دونوں ممیاں اب کہیں پھر سے بے حس و حرکت ہو کر جا سوئی ہوں گی۔ میرا رابطہ باہر کی دنیا سے کٹ چکا تھا۔ سر جان مارشل میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور شاید اب ہمیشہ کرتے ہی رہیں گے۔ میرے والدین میرا چہرہ تو درکنار، میری لاش بھی اب کبھی نہ دیکھ پائیں گے۔ شاید سارا اسکاٹ لینڈ یارڈ اپنی تمام جاسوسی ٹیموں اور تمام ماہرین کے سر پٹخنے کے باوجود کبھی یہ نہ معلوم کر سکے گا کہ میری گم شدگی کن حالات میں ہوئی۔ ذہن میں نہ معلوم کیا کیا آ کر گزر گیا۔

میں ایک چوہے کی طرح قید تھا۔ میں رویا، چیخا اور نہ معلوم کب تک چیختا رہا۔ میری آواز، میری چیخیں، میری سسکیاں اور میرے آنسو صرف میرے لیے تھے۔ کون تھا جس تک میری آہیں جاتیں اور کون تھا جو میری مدد کو آتا۔ حالات کی سنگینی اور اپنی بے چارگی کا مجھے یقین ہوتا گیا۔ میں اپنی شفیق ماں اور اپنے پیارے باپ کو یاد کرتا رہا، اور بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا رہا۔ اب امید دم توڑنے لگی تھی۔ کیا کبھی سر جان مارشل یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ میلکم دریائے نیل کے ساحل سے اٹھ کر کس طرف گیا تھا؟ کیا مصری پولیس میرے قدموں کے نشانات تلاش کرتی ہوئی اہرام تک آئے گی؟ کیا حکومتِ برطانیہ ایک شخص کی زندگی کے لیے اہرام کو توڑ کر مجھے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش

کرے گی؟ اب محرومی اور یاس میرا مقدر بن چکی تھی۔ میں روتا روتا اب چپ ہو گیا۔ تن بہ تقدیر..... اب مقدس باپ ہی میری نجات کا ذریعہ تھے۔

مجھے یاد آیا کہ یہ مقبرہ جہاں میں قید تھا خوفو کا اہرام تھا۔ جابر و قہار، نوعمر اور کم سن بادشاہ جو نوجوانی میں مر گیا تھا۔ اس کے ساتھ نہ معلوم کتنے غلام، کتنی کنیزیں، شراب و شباب کے لوازمات، ساقی گری کے ظروف، موسیقی کے آلات، فوجی اسلحہ، اور سونا چاندی، ہیرے جواہرات کے صندوق اور نہ معلوم کیا کیا دفن کیے گئے ہوں گے۔

آنکھیں اب کچھ کچھ دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ دور دور تک مجھے کمرے ہی کمرے نظر آ رہے تھے۔ بیچوں بیچ ایک بڑا سا ہال تھا۔ اس ہال میں ایک تخت سا بچھا ہوا تھا اور چھت بہت اونچی سی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اب دس بج رہے تھے۔ گویا ساحلِ دریا سے چلے ہوئے مجھے اب تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ بھوک نے بھی ستانا شروع کر دیا تھا۔ اور ناامیدی اور موت کا خوف بھی مجھ پر طاری تھا۔ بھوک اور خوف نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ پژمردگی اور موت کا سایہ مجھے مغلوب کیے جا رہے تھے۔ اور وہی تاریکی اور گمبھیر سی خاموشی میری اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔

یکایک کسی ہلکی سی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ دور بہت دور ایک روشنی جھلملاتی سی نظر آئی اور پھر یکے بعد دیگرے ان روشنیوں کی قطار سی بن گئی۔ ان سب کا رخ اسی بڑے وسیع و عریض ہال کی طرف تھا جہاں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ اسی تخت کے اردگرد یہ مشعلیں آ کر رک گئیں۔ نہ معلوم کہاں کہاں سے اور کیسے کیسے نشستیں جمنے لگیں۔ ماحول سجنے لگا۔ شاید کسی دربار کا اہتمام تھا۔ میں اس سے کافی دور اندھیرے میں اُسی سل پر بیٹھا ہوا تھا جس کے اوپر کی سل کے شگاف سے اندر داخل ہوا تھا۔ سو ذرا اونچائی پر تھا اس لیے وہاں سے دیکھ بھی سکتا تھا اور سُن بھی سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ عجیب و غریب وضع قطع کے لوگ اندھیروں سے نکل نکل کر لمبے لمبے چغے پہنے اور رنگ برنگے کپڑے لپیٹے آ آ کر نشستوں پر بیٹھتے گئے۔ چند لمحوں میں دربار جم گیا۔ ہتھیار لگائے ہوئے سپاہی دو رویہ نشستوں کی اطراف میں آ کھڑے ہوئے۔ محافظ چتر نما کوئی چیز اٹھائے تخت کی پشت پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر کچھ غلغلہ سا اُٹھا، شور بلند ہوا، روشنیاں حرکت میں آئیں اور رات دن سے بدل گئی۔ اندھیرے بکھرے تو روشنی نے ایک وجیہ پیکر تراشا، ایک لمبا سا شخص وجاہت کی شبیہ لیے، امارت کا لباس پہنے، چند فوجی سالار نما امراء کی معیت میں مجمع میں

داخل ہوا۔ لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے اور شاہانہ وقار سے نپے تُلے قدم اُٹھاتا ہوا یہ شخص دربار میں بچھے ہوئے تخت پر آ بیٹھا۔ چند لمحے توقف کے گزرے تو شاہی تخت کے قریب ہی ایک شخص کھڑا ہوا اور پکار کر اعلان کرنے لگا۔

"شہنشاہوں کے شہنشاہ، دیوتاؤں کے دیوتا، خداؤں کے خدا، سورج مثال، بلند اقبال، رمیسیس اعظم اس پانی اور لکڑی والے نوجوان کو پیش کرنے کی اجازت دی جائے ...!"

"اجازت ہے" شاہی نشست سے جواب اُبھرا۔

پھر ایک سمت سے ہلکا ہلکا شور بلند ہوا۔ کچھ لوگ اپنے پہرے میں ایک نوجوان کو لیے آگے بڑھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک معمولی سی چھڑی تھی جیسے بکریاں چرانے والے درختوں کی صاف شاخ توڑ کر ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ اس نوجوان شخص کے چہرے کے گرد نور کا ایک ہالہ سا روشن تھا۔ پیشانی سے کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ اس کے قدموں میں استقلال کی استقامت تھی۔ ڈر اور خوف اس کی کسی بات سے ظاہر نہ تھے بلکہ اس کی ہر جنبش میں سکون و سکوت کی گہرائیاں اور اطمینان کی عظمتیں جلوہ گر نظر آتی تھیں۔ سارے دربار کی خشم گیں نظریں اس نووارد پر مرتکز تھیں۔ بادشاہ رمیسیس کی نگاہوں میں بھی استہزاء اور تاسف دونوں ہی شامل تھے لیکن وہ نوجوان بجائے خود سبھوں سے بے نیاز تھا۔

جب محافظوں کے دائرے میں یہ نوجوان تخت شاہی کے سامنے آ کر رک گیا تو رمیسیس نے رعب دار آواز سے پکار کر کہا

"اس کے جرائم کی نشاندہی کی جائے!"

"خداوند رمیسیس کی لافانی عظمتیں لازوال رہیں۔ آسمانی قوتوں کے محافظ شہنشاہ! یہ وہی شخص ہے جسے نیل کے پانیوں پر بہتے ہوئے صندوق سے نکال کر اس وقت زندگی دی گئی تھی جب ہر بچے کو قتل کر دیے جانے کے احکامات موجود تھے۔ یہ وہی بچہ ہے جس کو خداوند کے محل میں پرورش کر کے حرب و ضرب کی تعلیم دی گئی۔ اس شخص پر خداوند رمیسیس کے بے شمار احسانات تھے مگر یہ پھر بھی خداوند کی عظمتوں کا منکر رہا۔ اس نے کبھی معبدوں کا رُخ نہیں کیا۔ ہمارے مظاہرِ قدرت کی نشانیوں کو... بتوں کو سجدہ نہیں کیا۔ خداوند کو کبھی خداوند نہ جانا۔ اس کے برعکس یہ ایک ایسی آسمانی طاقت کو اپنا رب

جانتا ہے اس کو خداوند کہتا ہے جس کو کسی نے آج تک نہ دیکھا نہ سُنا۔ یہ شخص نہ جادو گروں کی عزت کرتا ہے اور نہ دربار کے امراء کا ادب کرتا ہے۔ چند سادہ لوح سر پھرے جاہل قبطیوں اور کسانوں کا سردار بن بیٹھا ہے۔ اس کی جماعت کا ہر فرد اب اسی رنگ میں رنگ گیا ہے۔"

خداوند! یہ سب کچھ تو بہت عرصے سے چل رہا تھا لوگ اس لیے چپ رہے کہ یہ شاہی محل کا فرد تھا۔ مگر اب یہ شخص قبطیوں کو جو ہمارے غلام ہیں ورغلانے لگا ہے، ان کی بے جا طرف داری کرتا ہے۔ کل شام دربار کا ایک امیر شاہی چوک میں اپنے غلام کو ہاتھ پیر کاٹنے کی سزا دینے والا تھا کہ یہ شخص وہاں جا پہنچا اور غلام کو اس نے زبردستی آزاد کرا ڈالا اور جب امیر نے مداخلت کی تھی تو اس نے اس قدر زور سے اس امیر کو گھونسہ مارا کہ وہ مر گیا۔ اب امیر کے اہل خانہ انصاف کے طالب ہیں اور جان کے بدلے اس شخص کی جان چاہتے ہیں۔"

شاہی تخت سے رمیسیس اوّل نے غضب ناک نظروں سے اس نوجوان کو گھورا اور گرج کر بولا۔

"بدقسمت شخص! تو نے ہمارے محل میں رہ کر بھی فرعون سے وفاداری کرنا نہیں سیکھی؟ تجھے موت کا خوف نہیں ہے؟ بتا کیا تجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟"

اب اس نوجوان کی نظریں آہستہ آہستہ اوپر اٹھیں۔ بے خوف نگاہیں اور چمک دار آنکھیں۔ لب ہلے اور رم جھم سے الفاظ برسنے لگے۔

"فرعون رمیسیس! میں تیرے ملک میں نہیں رہتا۔ یہ میرے خدا کی زمین ہے۔ میں تیرے محل میں قیام کے لیے تیرا احسان مند نہیں ہوں۔ یہ میرے خدا کی نوازش ہے کہ اس نے تیرے محل کو میری جائے قیام بنایا۔ میں تیرے جادو گروں اور تیرے بتوں کی پرستش نہیں کرتا کہ یہ خود بے فیض، کمزور اور بے نشان ہیں۔ میں نے قبطی غلام کے آقا کو نہیں مارا، اس ظلم کو کچل ڈالا ہے جو کمزور پر قہر بن کر ٹوٹ رہا تھا۔ دیکھ! میں تیری دولت، تخت و تاج، حکومت و اقتدار کا رقیب نہیں ہوں۔ میرے رب نے مجھے ان سب سے بے نیاز کر دیا ہے۔ میں اسی کو اپنا خدا مانتا ہوں جو ہر قوت سے عظیم تر ہے۔"

فرعون رمیسیس اب اور بھی غضب ناک ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ غصّہ سے سُرخ ہو چکا تھا، گردن تن گئی تھی۔ وہ بڑے جلال میں للکار کر بولا۔

"بتا، نیل کے بہتے ہوئے پانی پر اور اس کی اطراف کی خشکیوں پر تجھے ہماری طاقت سے بڑی اور کون سی قوت نظر آتی ہے؟ ہم ہی تو زندگی دیتے ہیں اور ہم ہی زندگی چھین لیتے ہیں۔ ہمارے جوان موت کے بیٹے ہیں۔ ہماری فوج کڑکتے ہوئے بادلوں کی بجلیاں ہیں اور ہمارا کرم لہلہاتی ہوئی شاداب کھیتیاں ہیں۔ ہم ہی زمین کے خدا ہیں، ہم ہی خداؤں کے خدا ہیں۔"

"فرعونِ مصر سن! تو نخوت اور کبر میں بلند بانگ دعوے نہ کر، تو عاجز ہے اور کمزور، کیا تو اپنی پشت کی طرف دیکھ سکتا ہے؟ کیا تو بہ یک وقت دونوں پیر اُٹھا کر کھڑا ہو سکتا ہے؟ اور موت.... تو کیا کسی کو موت دے گا! موت تو تیری پیشانی کے بالوں سے چمٹی ہوئی ہے۔ سُن! ابھی موقع ہے۔ اعمال نامے کھلے ہوئے ہیں۔ قلم چل رہے ہیں۔ تیرا بدن تندرست و توانا ہے، زبان آزاد ہے، عمل قبول کیے جا سکتے ہیں۔ توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تجھے غرور نے بھٹکا دیا ہے اور خواہشات نے بہکا دیا ہے۔ تو میرے رب کی اطاعت کر، میں تجھے نجات اور کامرانی کی بشارت دوں گا۔ جھوٹی اُمیدوں سے سجی ہوئی اس دنیا کے فریب میں نہ آ۔ اُس لم یزل اور لایزال رب کو پہچان جو تیری عزت اور ذلت پر قادر ہے۔"

باب نمبر ۴

"اس گستاخ کو فی الفور قتل کر دیا جائے۔" ایک ساتھ کئی آوازیں اُبھریں اور کئی چھوٹے بڑے نیزے اور خنجر بلند ہوئے اور چند لوگ غصّے میں اپنی نشستوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھ جاؤ اور اپنے خدا کو انصاف کرنے دو!" فرعون رمیسیس گویا ہوا۔

شور تھم گیا۔ سب لوگ بیٹھ گئے۔ ہتھیار سرنگوں ہوئے۔ خاموشی چھا گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس نوجوان پر اس شور و غوغا کا ذرا بھی اثر نہ تھا اور وہ اسی شانِ تمکنت اور بے نیازی کے ساتھ بے خوف کھڑا تھا۔

"شاہی ساحرِ اعظم شمعون کو حاضر کیا جائے!" رمیسیس نے حکم دیا۔

بادشاہ کے حکم پر فوراً ایک بدہئیت، مکروہ صورت شخص کہیں سے نمودار ہوا اور ہاتھ جوڑ کر تختِ شاہی کے سامنے جھک کر سجدہ ریز ہو گیا۔ پھر سر اُٹھا کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

فرعون نے نوجوان کو دیکھ کر کہا۔

"تو نے آن دیکھے خدا کو میرا ہمسر بنایا ہے۔ میں تجھے آن دیکھی طاقتوں سے سزا دلواؤں گا۔" پھر جادوگروں کی طرف رُخ کر کے بولا۔ "شمعون! یہ تیرا قیدی ہے۔ اپنے شاگردوں کو بُلا۔ اسے اپنے سحر میں گرفتار کر۔ اس کی زندگی تیری مرضی کی تابع ہے۔ چاہے جتنی مرتبہ مار اور چاہے جتنی مرتبہ زندہ کر۔ مگر یاد رکھ۔ یہ شاہی وقار کو للکارنے کا مجرم ہے۔ اس کی سزا بھی عبرت ناک ہونی چاہیے۔"

پلک جھپکتے ہی شمعون نے تالیاں بجائیں اور کوئی درجن بھر بوڑھے جہاں دیدہ، کمر خمیدہ، تجربوں اور ریاضتوں کی دھوپ میں بالوں کی سفیدی لیے ادھر اُدھر سے نمودار ہوئے۔ اور شمعون کے رو برو ہاتھ باندھ کر آ کر رک گئے۔ دربار دم بخود تھا، نوجوان کے گرد شمعون کے ایک اشارے پر اب انہوں نے ایک تنگ دائرہ بنا لیا۔ مگر اس تقدس مآب نوجوان کی استقامت اور اس کا اطمینان قابلِ رشک تھا۔ شمعون کے شاگردوں نے ہلکی ہلکی سرگوشیاں کیں۔ پھر کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔ ان کے قدموں کے نیچے زمین سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ جادوگر منہ سے پھونکیں مارتے جاتے تھے اور شعلے یوں آگے

بڑھتے جاتے تھے جیسے بے زبانوں کو زبان مل گئی ہو۔ اب یہ آگ ایک دائرے کی شکل میں نوجوان کے گرداگرد روشن تھی۔ لپٹیں بلند ہوتی جاتی تھیں اور تپش جذبات کی صورت اُمنڈ رہی تھی مگر یہ شعلے ایک مقام پر آ کر رک گئے تھے۔ ہزار پھونکیں اور منتر جنتر اس آگ کو آگے بڑھانے سے معذور تھے۔ آگ کی سُرخی میں پہلے زردی آئی اور پھر مُردنی چھاتی چلی گئی اور وہ نوجوان زمین پر نظریں جمائے، عجز سے سر جھکائے اب بھی اسی طرح کھڑا تھا۔

شاید یہ سب کچھ دربار کی مرضی اور توقع کے خلاف ہوا تھا۔ وہ جو اس تنہا شخص کو انتقام کی ذلتوں میں گھسیٹ لینے پر تُل گئے تھے پھر سے کچھ داؤ آزمانے لگے۔ شمعون ٹکٹکی باندھے اسی شخص کو گھور رہا تھا کہ اُس کے شاگردوں نے پھر کچھ پڑھا۔ زمین پر جھکے، سجدہ کیا، مٹی کو چوما، مٹھی بھر خاک اٹھائی اور پھر اُسے زمین پر دے پٹخا۔ اب تو گویا زلزلہ سا آ گیا۔ جس جگہ وہ نوجوان کھڑا تھا وہاں زمین اس طرح کانپنے لگی جیسے تارِ نظر کے لمس گریزاں سے پلکوں کے حجاب تھر تھرائے ہوں یا ہوا کے جھونکے خشک پتوں کو ادھر اُدھر دندناتے پھر رہے ہوں۔ لگتا تھا کہ اب کوئی دم میں زمین کی کھنچی ہوئی طنابیں کٹ جائیں گی اور سب کچھ اس زلزلہ کی نذر ہو جائے گا۔ سب کچھ کہیں جا گرے گا۔ مگر اس عالم ہاؤ ہو میں بھی اس نوجوان کے قدموں میں کوئی لغزش نہ آئی۔ کوئی گھبراہٹ نمودار نہ ہوئی۔ اپنی ایڑیوں اور پنجوں کے نشانوں پر وہ اب بھی عجز کے اسی کرّوفر سے کھڑا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ زمین پھر رک گئی۔ زلزلے ساکت ہو گئے۔

اب تیسری مرتبہ قدرے جھنجھلا کر پھر ان بوڑھے گدھوں نے ہاتھ اُٹھا کر کچھ پڑھنے کی کوشش کی تو شمعون نے انگلی کے اشارے سے ان سب کو روک دیا۔ دربار میں پھر ایک گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ اب اپنے وقت کا عظیم ترین جادوگر، فرعون رمیسیس کے دربار کا تاج نوجوان کو سزا دینے کے لیے مقابل آ پہنچا تھا۔

شمعون گویا ہوا......

"بے شک نوجوان تو کچھ نہ کچھ ساحری جانتا ہے۔ ورنہ بھڑکتی آگ کو سرد کر دینا اور لرزتی زمین پر قدم جمائے رکھنا ایسا آسان تو نہ تھا۔ مگر تو کب تک مقدّر سے لڑے گا۔ خداوند رمیسیس کی نافرمانی کی سزا انسانی طاقتوں سے ٹل نہیں سکتی۔ اب تو اپنے انجام کے لیے تیار ہو جا"

یہ کہہ کر اس نے اپنے سر کے چند بال توڑے، پھر ان پر کچھ پڑھا اور زمین پر پھینک دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے شاگردوں نے بھی اپنے سروں سے چند بال توڑ کر زمین کی طرف اچھال دیے۔ آن کی آن میں یہ سب بال سانپوں کی شکل اختیار کر گئے اور بیسیوں سانپ پھنکاریں مارتے، دُمیں ہلاتے، شائیں شائیں کرتے، پھن اٹھائے ہوئے اس نوجوان کی طرف لپکنے لگے۔ جب یہ سانپ نوجوان کے قریب پہنچ گئے تو اس کے لب ہلے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"خدا کی پناہ سب سے عمدہ پناہ گاہ ہے۔ بلاشبہ کوئی موت وقت سے ایک لمحہ پہلے نہیں آئے گی۔ میرا رب ہر لمحہ پر قادر ہے۔ وہی میری حفاظت کرنے والا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے شمعون کی طرف رخ کیا اور ایک عجیب بے خودی کے انداز میں بولا:

"دیکھ اپنی اس بے جان مخلوق کا حشر دیکھ!"

اب اُس نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی معمولی سی چھڑی کو زمین پر پھینک دیا۔ اس کا زمین پر گرنا تھا کہ اس پتلی سی خشک لکڑی نے بڑی تیزی سے بڑھنا شروع کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس میں بجلیاں کوند رہی ہوں۔ وہ بار بار کروٹیں بدلتی تھی اور اپنا حجم اور جسامت بڑھا لیتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک جسیم اژدہے کی صورت اختیار کر گئی۔ اس کی پھنکار کے ساتھ شعلے نکل رہے تھے۔ اس کے پھن سے اس کی زبان سلسلاتی ہوئی باہر نکل آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گویا تیز اور جلتی ہوئی چنگاریاں اُبھر رہی تھیں۔

شمعون کے جادو سے بنے ہوئے تمام سانپ اب اپنی پھنکاریں بھول گئے تھے۔ وہ آگے نہ بڑھتے تھے۔ اس پُرہیبت سانپ نے اب ان کی طرف رُخ کیا۔ جو سانپ بھی اس کے قریب آجاتا تھا وہ اپنے پھن سے مار کر اُسے گرا دیتا اور پھر مُنہ میں لے کر نگل جاتا تھا۔ شمعون یہ کیفیت دیکھ کر ایک پاگل کی طرح سراسیمہ اور ہونق سا ہو گیا تھا۔ وہ نہ جانے کیا کیا پڑھتا تھا اور نہ جانے کون کون سے داؤ آزما رہا تھا مگر اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ تمام سانپ آنِ واحد میں اس اژدہے نے نگل ڈالے۔ اب وہاں اس پھنکارتے ہوئے اژدہے کے سوا کوئی ناگ موجود نہ تھا۔ اس کے جوش اور اس کی سرمستی کا اب تک وہی عالم تھا۔ اسی طرح پھنکاریں مار مار کر دائیں بائیں، آگے پیچھے جھوم رہا تھا۔ اور پھر وہ اسی طرح جھومتا ہوا تختِ شاہی کی طرف چلا۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ وہ جادوگر اور وہ درباری

ساحرِ اعظم بھی کسی کونے میں جا دبکا۔ فرعون اپنے تخت پر بیٹھا کانپ رہا تھا۔ اس کے محافظ بھاگ چکے تھے۔ صرف پشت پر کھڑے ہوئے فوجی میان سے تلواریں سونت رہے تھے۔ کچھ نیزے بھی اژدہے پر مارے گئے، کچھ تیر بھی چلے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔
اژدہے اور فرعون کے تخت کے درمیان فاصلہ ہر لحہ گھٹ رہا تھا کہ فرعون چلایا۔
"موسیٰ ہم نے تجھے معاف کیا۔ اپنے خدا سے کہہ کر اس عفریت سے ہمیں نجات دلا۔"
یہ سنتے ہی اس نوجوان نے آگے بڑھ کر اس اژدہے پر بے جھجک ہاتھ ڈال دیا اور وہ پھنکارتی ہوئی مخلوق ذرا سی دیر میں پھر سمٹ سمٹا کر اسی پہلے جیسی لکڑی کی شکل میں آ گئی۔

اور پھر آن کی آن میں وہ سارے منظر کہیں دھندلا گئے، نہ وہ دربار رہا، نہ وہ نشستیں جمی رہیں، نہ آوازیں، نہ روشنیاں، اب وہ پھر گھپ اندھیرا تھا۔
میں ابھی اس گزرے ہوئے منظر کے نقوش تصور میں دیکھ ہی رہا تھا کہ چند افراد بھاگتے دوڑتے دریا کے اس خشک راستے پر اتر پڑے جہاں سے ابھی وہ چھوٹی سی جماعت گزر کر دوسری طرف گئی تھی۔ فرعون آگے آگے جا رہا تھا اور اس کے پیچھے پوری فوج اور اس کا گروہ تھا۔ وہ سب ہوا کی طرح دوسرے کنارے پر پہنچ جانے کے لیے بے قرار تھے۔
یکایک پھر آسمان پر بجلی کڑکی، دریا کی بے قرار موجیں سانس لینے لگیں، بہاؤ جاگ اٹھا، لہریں پھر لہروں سے گلے ملنے لگیں، اب یا تو دریا کی سرپٹختی موجیں تھیں یا غرق ہونے والوں کی چیخیں یا آسمان پر گرجتے ہوئے بادلوں کی گڑگڑاہٹیں، آن کی آن میں آدمی، گھوڑے، ہتھیار، سوار، پیدل، فوجی، امراء بادشاہ سب کے سب پانی نے ہڑپ کر ڈالے۔ اور پھر سب کچھ ہی غائب ہو گیا جیسے یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ یہ منظر بھی دھندلا سا ہو کر کہیں گم ہو گیا۔

سب یک لخت گم ہو گئے۔ ہاں، البتہ دریا، ریت، کچھ جھاڑیاں ابھی تک اس منظر میں موجود تھیں کہ میں نے دیکھا کہ مچھیرے ایک جال کو مشکل سے کھینچ کھینچ کر کنارے تک لا رہے ہیں۔ تعداد میں یہ لوگ چھ ہیں اور وضع قطع وہی ہے جیسی ان مفلوک الحال، کمزور اور لاغر قسم کے لوگوں کی تھی جو اس لکڑی والے نوجوان کے ہمراہ ابھی ابھی دریا کو عبور کر کے دوسری طرف جا پہنچے تھے۔ اس جال میں قوی ہیکل جسم زرق برق لباس میں ملبوس موت کی نیند سو رہا تھا۔ سب کے سب اس لاش کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر اسے

جال سے نکال کر ریت پر لٹا دیتے ہیں۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی ہیں۔ چہرے پر خوف اور تعجب بکھرا ہوا ہے۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ساتھیوں سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ اور پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں۔ سب کے سب اس لاش کو عزت و احترام سے وہاں سے اٹھا کر سامنے بنی ہوئی ایک پہاڑی کے دامن میں لے جاتے ہیں۔ دریا کے ساحل کے قریب ہی یہ ایک عجیب وضع کی پہاڑی ہے جس پر کچھ سنگ تراش کام کر رہے ہیں اور انہوں نے ایک پر ہیبت شیر کا پیر تراش لیا ہے اور اب اس کے خدوخال نمایاں کر رہے ہیں۔ سنگتراش بھی اپنے کام چھوڑ کر نیچے آ گئے ہیں۔ سب مل کر نہایت ادب و احترام کے ساتھ اس لاش کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور پھر قریب ہی بنے ہوئے ایک مکان میں چلے جاتے ہیں۔ یہ کچا سا مکان ہے جیسے ان ہی مچھیروں میں سے کسی کے رہنے کا ٹھکانہ ہو۔ اب کچھ نظر نہیں آتا۔ تجسس اور شوق مجھے اپنی جگہ سے اٹھاتا ہے۔ اور میں سیڑھیاں اُتر کر آہستہ آہستہ اُس مکان کے دروازے پر پہنچ جاتا ہوں۔ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ میں اندر داخل ہو جاتا ہوں۔ کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔ اس مکان میں کچھ اور لوگ بھی عجیب قسم کے چھوٹے بڑے ہتھیار اُٹھائے ہوئے اندر آ جاتے ہیں۔ ایک بوڑھا سا شخص آگے بڑھتا ہے اور چاقو ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے ایک بڑا سا طشت قریب کھینچ کر لاش کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے جھک کر تین بار زمین پر سجدہ کیا اور پھر لاش کے قریب دو زانو بیٹھ کر آہستہ آہستہ کچھ پڑھنے لگا۔ اس کے تین چار ہمراہی اور بھی موجود ہیں۔ وہ بھی اس کی تقلید میں کچھ پڑھتے جا رہے ہیں اور بار بار سجدہ کرتے ہیں۔ اب ان سب نے مل کر بڑی آہستگی سے لاش کو سیدھا کیا۔ اب تک اس کا چہرہ زمین کی طرف تھا۔ اب جو اُس کا چہرہ اوپر کی طرف اُٹھا تو میں چونک گیا۔ یہ تو وہی فرعون رمیسیس اوّل تھا جس کو پہلے میں تخت پر براجمان اور پھر اس دریا میں ڈوبتا دیکھ چکا ہوں۔

اب لکڑی کے بڑے بڑے ڈبے لائے گئے۔ ان کو کھول کھول کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ سب لوگ اس طرح اپنے کام میں منہمک تھے جیسے کسی مقدس فریضہ کی ادائیگی کی جا رہی ہو۔ ان لکڑی کی پیٹیوں میں سیاہ رنگ کی ایک پلاسٹر نما کوئی چیز تھی۔ کچھ ڈبوں میں سفید سفید پٹیاں اور روئی بھری ہوئی تھی۔ ایک بڑے ڈبے میں کسی خاص قسم کا تیل یا کوئی اور مرکب محلول موجود تھا۔

جب یہ سب اشیاء ترتیب سے جا کر سلیقہ کے ساتھ ایک طرف رکھ دی گئیں اور اس دوران میں ان بوڑھوں کی عبادت کا سلسلہ بھی ختم ہوا تو جس شخص کے ہاتھ میں چاقو نما ایک اوزار تھا وہ آگے بڑھا اور اس نے جھک کر ایک بار مردہ بادشاہ کی طرف نظر ڈالی۔ پھر قریب بیٹھ گیا اور بڑے سے طشت کو کھینچ کر لاش سے ملا دیا۔ تب اس نے چاقو سے لاش کی بائیں جانب پسلیوں کے قریب ایک بڑا سا شگاف ڈالا۔ خون تو اس مردہ لاش میں کہاں تھا جو نکلتا۔ البتہ کچھ پانی اور آنتیں ضرور باہر نکل آئیں۔ یہ سب پانی وغیرہ اور آنتیں باہر کھینچ کر نکال لی گئیں اور ان کو اس طشت میں ڈال دیا گیا۔ پھر تیل سے بھرے ہوئے پیپوں میں سے کوئی تیل نکال کر اس سوراخ میں ڈالا گیا۔ دوسری طرف دوسرے لوگوں نے جلدی جلدی اس کے چہرے پر سیاہی مائل کولتار جیسی پلاسٹر چڑھا دی۔ اس کا چہرہ آنکھیں، کان، ناک، سب ہی بند ہو گئے۔ اور اس سیاہی میں چھپ گئے۔ تب اس شخص نے چاقو ایک طرف رکھا اور لاش کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اچھی طرح ہلایا تاکہ تیل پورے جسم میں ہر جگہ جا پہنچے اور پھر احتیاط سے لاش کو واپس رکھ دیا۔

چند لمحوں کے بعد ایک سوئی سے دھاگہ کے ساتھ اس شگاف کو بند کر دیا گیا اور اس پر وہی سیاہی مائل محلول پھر چڑھا دیا گیا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ اس پلاسٹر کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ اندر سے تیل اور محلول باہر نہ نکلے اور باہر کی غلاظت، مکھیاں وغیرہ اس کے جسم کے شگاف میں داخل نہ ہوں۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے مشین کی تیزی اور اختصار کے ساتھ دوسرے لوگوں نے لکڑی کے ڈبوں سے پٹیاں نکال نکال کر اس کے سارے جسم پر لپیٹ دیں۔ ہر پٹی کے نیچے روئی کی تہیں جمائی گئیں اور پھر پٹی لپیٹی گئی اور پھر اُس کے اوپر دھاگہ سے گرہیں باندھی گئیں کہ پٹیاں کھل نہ جائیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر لاش کو لکڑی کے ایک صندوق میں کھڑا کر دیا گیا اور اس کو باہر سے تھوڑا بند بھی کر دیا گیا کہ سر کا حصّہ چھاتی تک کھلا رہے اور لاش باہر کی طرف نہ گر پڑے۔ پھر ایک بار سب کے سب سجدہ ریز ہوئے اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ سنگ تراش اور مچھیرے آگے بڑھ آئے تو ان جرّاحوں نے ان سے کہا:

"ساٹھ دن تک خداوند میسیس اسی مقام پر رہیں گے۔ پھر اس سیاہ پلاسٹر کو چہرے سے اُتار کر سیڈار کا تیل جسم سے نکالا جائے گا۔ اس کے ساتھ جسم کے تمام اندرونی اعضا گل

کر پانی کی طرح باہر نکل آئیں گے۔ تب خداوند رمیسیس ہلکے پھلکے ہو کر آسمانوں کی سیر کو چلے جانے کے لیے تیار ہو چکے ہوں گے۔ مگر ان کے خدام تو سب کے سب ان کے ساتھ دریا میں چلے گئے تھے۔ ان کو شاید اکیلے ہی جانا پڑے گا۔ اب اس کو راز ہی رکھنا اور ان کو اس پہاڑی شہر کے قریب دفن کر دینا۔"

سنگ تراش اور مچھیرے ان باتوں کو یوں غور سے سنتے رہے جیسے یہ بھی ان کے مذہب کا کوئی وعظ تھا۔ اب یہ سب لوگ لکڑی کے صندوقوں میں اوزار سمیٹ رہے تھے۔ میں بھی واپسی کے لیے مڑا تو ایک چاقو نما کوئی چیز میرے پیر سے ٹکرائی۔ یہ کھلا ہوا خنجر سا تھا۔ یہ اس قدر تیز تھا کہ میرے پیر میں اس کی دھار چبھ گئی۔ اب جو میں اُسے اُٹھانے کے لیے جھکا تو دھار سے میری انگلی بھی کچھ کٹ گئی۔ خنجر میں نے اُٹھا لیا تھا مگر اس کی تیز دھار کی رگڑ اور گرفت کی وجہ سے میری ہتھیلی کی کھال کٹ گئی تھی جس سے ایک طرف تو خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور دوسری طرف میری ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔ اس ہلکی سی آواز نے گویا ایک قیامت ڈھا دی۔ وہ سب ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگے مگر جیسے بجلی کوند جاتی ہے یا کوئی ستارہ ٹوٹ جاتا ہے یا جیسے ایک لمحہ بیت سا جاتا ہے۔ آن کی آن میں اس ایک چیخ کی بدولت وہ منظر گم ہو گیا۔ نہ مکان، نہ لاش، نہ لوگ، نہ اوزار، نہ مچھیرے، نہ سنگ تراش..... کچھ نہ باقی رہا۔ پہاڑی مجسمہ وغیرہ سب کے سب غائب ہو گئے۔ اب میں اہرام کی سیڑھیوں کے قریب پھر تنہا کھڑا تھا۔ سیاہی، تاریکی اور تنہائی پھر میرے گرداگرد جال پھیلا رہی تھی۔ اب اہرام کی ویرانیوں میں میرے سانسوں کی آوازیں تھیں، دل کے دھڑکنے کی صدائیں تھیں اور میں تھا۔

یہ دور بھی غالباً لمحاتی تھا کہ میری پشت پر پھر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی سفید سفید پٹیوں میں لپٹی ہوئی ایک ممی جو مجھے یہاں لا کر غائب ہو گئی تھی میرے پیچھے موجود تھی۔ اس نے اب آگے چلنا شروع کیا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"خداوند رمیسیس کو اپنا اہرام نہیں مل سکا تھا۔ وہ دریا میں ڈوب جانے کے بعد آسمانوں کے سفر پر روانہ نہ ہو سکا۔ ہزاروں سال سے یوں ہی بھٹک رہا ہے۔ ہمیشہ اسی طرح کسی نہ کسی اہرام میں جا داخل ہوتا ہے۔ تمہاری طرح اور بھی زندہ انسان کئی بار اس کے دربار میں لائے گئے کہ کوئی اس کے مقصد کو پا لے مگر سب یہاں آتے ہی خوف سے مر گئے۔ تم ابھی تک زندہ ہو۔ تمہاری قوتِ برداشت شاید اس کی نجات کا باعث بن

جائے۔ آج خداوند رمیسیس اور میں تمہیں یہاں لاکر بے حد خوش ہیں۔!"

باتیں کیا تھیں، صرف بھنبھناہٹ سی تھی۔ گویا کوئی کان میں سرگوشیاں کر رہا ہو۔ میں چُپ چاپ اپنی زخمی ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ سے دبائے خون کو بہنے سے روکتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلا جارہا تھا اور شاید میری پشت پر پھر وہی دوسری لاش چل رہی تھی جو ہمارے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔

سیڑھیاں چڑھ کر ہم چھت تک جاپہنچے اور ایک بار پھر ممی کے اشارے پر پتھر کی سِل اُبھر آئی۔ باہر کی ہوا اندر داخل ہوئی، آسمان نظر آیا، چاند کی چھنکی ہوئی چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی دکھائی دی۔ ویرانہ، صحرا، ہوائیں..... پھر سے وہی سب کچھ سامنے آگیا۔ مردوں کی دنیا اور زندوں کی دنیا کے بیچوں بیچ آکر میں نے سِل کے نیچے سر جھکا کر قدم آگے بڑھایا۔ پیچھے نظر ڈالی تو اہرام کی تاریکیاں اسی طرح تھیں۔ پھر ایک نظر ان تاریکیوں کو دیکھا، پیچھے چلنے والی اور آگے جانے والی لاش کو دیکھا اور باہر نکل آیا۔ ان دونوں میں سے ایک شاید فرعون رمیسیس کی اور دوسری اس کے کسی خادم کی تھی۔ اب وہ دونوں بھی موجود نہ تھیں۔ اہرام کا وہ سوراخ جس سے میں اندر گیا اور پھر واپس لوٹ آیا وہاں موجود نہ تھا۔ اہرام اسی طرح مکمل، باوقار، تنہا اور چپ چاپ ہمیشہ کی تنہائیوں اور ویرانیوں میں ایستادہ تھا۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ گویا میں اس اہرام میں تقریباً سات آٹھ گھنٹے محبوس رہا۔ میرے خدا! جان میلکم کو دوسری زندگی ملی تھی۔ ان سات گھنٹوں کی روداد کیسی بھیانک، جان لیوا اور کیسی عجیب و غریب تھی۔ میں نے کتنے لمحے مرتے جیتے گزارے۔ کتنی بار زندگی سے مایوس ہوا۔ اور ان سات گھنٹوں میں، جب میرا تعلق زندوں کی دنیا سے کٹ گیا تھا، مجھے دنیا میں سے کون کون یاد آیا۔ میں نے خدا اور مقدس مریم کو کتنا یاد کیا۔ اپنے چھوٹے بڑے سب گناہ یاد آئے، دنیا کے ماہ و سال جو گزارے تھے کس کس طرح ایک ایک کر کے تصویر کی طرح سامنے آتے گئے۔ گویا ہر ایک واقعہ اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ذہن کے کسی گوشے میں نقش ہوتا جاتا تھا اور پھر وہ تصویر بن کر سامنے آجاتا تھا۔

میں پھر اب اہرام سے نیچے اُتر کر ایک گہری پتھریلی اور سیاہ سڑک پر چل رہا تھا جو مجھے دریا سے قریب کیے جاتی تھی اور میں پھر رفتہ رفتہ اپنے ہوش و حواس میں لوٹ رہا تھا۔

ریسٹ ہاؤس پہنچ کر میں نے ڈیوٹی کلرک کو اپنا نام بتایا۔ سرجان مارشل کا حوالہ دیا تو جیسے وہ سوتے سوتے چونک پڑا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔
"آپ جان میلکم ہیں، سرجان مارشل کی ٹیم کے ممبر! آپ کی گم شدگی اور آپ کی تلاش کے لیے تو والیٔ مصر تک پریشان ہیں۔ آپ کے سفارت خانے کا عملہ محل میں پہنچ چکا ہے۔ پولیس کا خیال تھا کہ آپ کسی زیرِ زمین تشدد پسند گروہ کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ معاف کیجیے! صرف ایک منٹ کی مہلت دیجیے گا۔"
یہ کہہ کر وہ قریب کھڑے ہوئے ایک خادم کی طرف بڑھا۔ اس کے کان میں جھک کر کچھ کہا۔ وہ فوراً دروازے کی طرف دوڑا اور زینے سے اوپر کی جانب چڑھتا چلا گیا۔ پھر اس نے کسی جگہ اور دو چار آدمی بھیجے۔ میں حیران و پریشان کاؤنٹر سے لگا کھڑا تھا۔ خون ہتھیلی پر جما ہوا تھا اور کسی حد تک کمزوری بھی موجود تھی۔ ہاتھ میں وہی اوزار بھی موجود تھا جو مجھے اہرام سے ملا تھا اور جو میرے پاس ابھی تک محفوظ تھا۔
سرجان مارشل نائٹ گاؤن پہنے جلدی جلدی سیڑھیوں سے نیچے اترتے نظر آئے اور اوپر کی سیڑھی سے پکارنے لگے۔
"میلکم! یہ تم ہو! ارے یہ تمہاری داڑھی اتنی بڑھی ہوئی کیوں ہے، اور ہاتھ میں کیا لیے ہوئے ہو؟ ارے، تم تو زخمی بھی ہو۔ میلکم تم کہاں رہے، خیریت سے تو ہو....؟"
وہ مجھے فرطِ شفقت سے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی نمی سے جذبات کا تلاطم ظاہر تھا۔ وہ بے حد خوش تھے مگر یہ انہوں نے میری داڑھی کے بارے میں کیا کہا ہے۔ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا، واقعی داڑھی دو تین انچ بڑھی ہوئی تھی۔
"میلکم! تم کہاں چلے گئے تھے؟ برطانوی سفیر تک تمہاری گم شدگی سے پریشان تھا۔ میں نے تو یہ طے کر لیا تھا کہ اگر تم کو کوئی گزند پہنچی یا تم نہ ملے تو میں بطورِ احتجاج اپنا یہ پیشہ ہی ترک کر دوں گا۔ میں خود ہی ہونہار نوجوانوں کو لے کر نکلا ہوں۔ اگر میری معیت میں تم کو کوئی تکلیف پہنچی تو یہ میری ذمہ داری ہوگی مگر میلکم کیا تمہاری داڑھی کل بھی اتنی بڑی تھی؟ اور یہ زخم کیسا ہے؟ .... یہ تمہارے ہاتھ میں کیا دبا ہوا ہے؟"
"سرجان! میں ایک ناقابلِ یقین حادثہ سے دوچار ہوا ہوں۔ اگر میں آپ کو کچھ بتاؤں گا تو آپ کو اپنی سماعت پر اور میری ذہانت پر شبہ ہونے لگے گا۔ ایسی جگہ سے لوٹ کر آیا ہوں جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت، برطانوی تاج کی پوری قوت بھی مجھے باہر نہیں نکال

سکتی تھی۔"

"مگر کہاں؟..........کیوں..........اور کیسے....؟"

"سر! میں خونو کے اہرام میں سات گھنٹے مقید رہا ہوں۔ میرے جاگتے حواسوں اور میری کھلی آنکھوں کو قدیم زمانے کے خواب دکھائے گئے ہیں۔ اور میں نے رمیسیس اول کو دریا میں ڈوبتے اور حضرت موسیٰ کو دربار میں جادوگروں کو زک پہنچاتے دیکھا۔ میں نے رمیسیس اوّل کی لاش کو ممی بنتے اور اسے دفن کیے جانے کی جگہ متعین ہوتے دیکھا.... میں آپ کو کیا بتاؤں....ہاں، یہ اوزار مجھے ممی بنانے والے جراحوں کے صندوق سے گرا ہوا ملا اور اسی نے میری ہتھیلی کو کاٹ کر زخمی کیا ہے۔"

جیسے جیسے میں بولتا جا رہا تھا، میرے گرداگرد لوگوں کا مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ سرجان کی آنکھیں اوپر کی طرف کھلتی جا رہی تھیں۔ میرے اور ساتھی بھی میرے قریب آکر کھڑے ہو چکے تھے۔ ہر ایک میری طرف اس حیرت اور اچنبھے سے دیکھ رہا تھا جیسے میں خود کوئی عجوبہ ہوں یا جیسے میں ان میں سے نہیں ہوں بلکہ کسی اور دنیا کی مخلوق کا نمائندہ ہوں۔

اس چھوٹے سے مجمع کو میں نے اپنی کہانی مختصراً سنا ڈالی۔ سرجان اس دوران ایک لفظ بھی نہ بولے تھے۔ بے حد سنجیدگی سے ساری باتیں سن رہے تھے۔ البتہ دوسرے لوگ شاید اسے کوئی من گھڑت کہانی سے زیادہ اہمیت دینے کے موڈ میں نہیں تھے۔ سرجان نے کہا کہ اس وقت میں اوپر اپنے کمرے میں جا کر آرام کروں۔ پھر کسی وقت اس موضوع پر دوبارہ باتیں ہوں گی۔ انہوں نے کاؤنٹر پر ڈیوٹی کلرک سے درخواست کی کہ غزہ پولیس کو، برطانوی سفارت خانہ کو اور قاہرہ میں والیٔ مصر کے محل میں اس بات کی اطلاع پہنچا دی جائے کہ جان میلکم صحیح وسلامت واپس ریسٹ ہاؤس آگئے ہیں۔

زینہ پر میرے ساتھ اوپر چڑھتے ہوئے سرجان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میلکم! میں تمہارے بیان پر صد فی صد یقین رکھتا ہوں۔ یہ تمہاری روداد عجیب و غریب ضرور ہے مگر بے حد غیر معمولی نہیں ہے۔ یہ مصر کی سرزمین ہے، رازوں کی سرزمین، اسرار کی دنیا، یہاں اس قسم کے واقعات کا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ تمہاری چند گھنٹوں میں بڑھی ہوئی داڑھی، ہاتھ کا زخمی ہونا اور پھر یہ اوزار، یہ سب

تمھاری صداقت کا ثبوت ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ رمیسیس اوّل کون تھا۔ اس کا اہرام آج تک کہیں نہیں مل سکا ہے۔"

"تم نے بے خبری میں سلسلۂ فراعین کی ایک اہم کڑی تک رسائی حاصل کر لی ہے، مگر کیا تم اس جگہ کو پہچان سکو گے جہاں تم نے اس لکڑی کے صندوق میں لاش کو دیکھا تھا؟ اگر تم یہ کر سکے تو راتوں رات شہرت کے اس مقام تک جا پہنچو گے جو بڑی مشقت سے ملتا ہے۔"

"سر! میں کچھ زیادہ پُرامید نہیں ہوں، مگر میں اس مقام کی تلاش میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

باتیں کرتے کرتے سرجان مجھے میرے کمرے تک لائے اور بستر پر لٹا کر لوٹ گئے۔ باہر یہ ہدایت کر گئے کہ جب تک میں خود نہ اُٹھوں مجھے جگایا نہ جائے۔

میں اس قدر کمزوری سی محسوس کر رہا تھا کہ کچھ پھل کھانے اور دودھ پینے کے بعد ہی سو گیا اور پھر اگلے دن شام سات بجے تک سوتا رہا اور صرف رات کو کھانے کے لیے اُٹھا۔ اُس وقت میرے دوستوں نے میرے ہی کمرے میں کھانا کھایا اور طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے۔ داڑھی میں نے صاف کر لی تھی مگر مجھے معلوم ہوا کہ چند اخباری رپورٹر میری تصویریں لے چکے ہیں۔ کچھ اور میرے کمرے کا طواف کر رہے تھے۔ برطانوی سفیر بھی مجھ سے ملنے کے خواہش مند تھے اور قاہرہ کی پولیس نے میرے تمام ساتھیوں کے بیانات لیے تھے اور سرجان کا بیان بھی نوٹ کیا گیا تھا۔ سب لوگوں کو دو باتوں پر بے حد تعجب تھا۔ ایک تو یہ کہ میری داڑھی کیسے بڑھی اور دوسرے یہ کہ میرے ہاتھ میں عجیب و غریب اوزار کہاں سے آیا۔ میرے تینوں ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ جو اوزار مجھے ملا تھا وہ قاہرہ یونیورسٹی کے شعبہ کیمیا کو کیمیائی تجزیہ کے لیے اور اس کی قدامت کا اندازہ لگانے کے لیے تجربہ گاہ بھیجا گیا تھا اور اس کی رپورٹ آج ہی سرجان مارشل کو مل گئی تھی۔ سرجان مارشل قاہرہ یونیورسٹی کے پروفیسر حسن سعیدی اور روزنامہ الاہرام کے ایڈیٹر سعید دمشقی کے ساتھ رہے تھے۔ یہ لوگ کئی گھنٹے تک اسی بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ رات کو کھانے پر وہ سعید دمشقی کے گھر مدعو تھے۔ انھوں نے میرے لیے پیغام چھوڑا تھا کہ صبح ناشتے پر ساڑھے آٹھ بجے وہ میرے منتظر ہوں گے۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر پروفیسر حسن سعیدی، الاہرام کے مدیر سعید دمشقی اور ایک

پولیس افسر کمال نعمانی اور میں سب لوگ بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے۔ سیاست، صحافت، جرائم، تاریخ اور آثار قدیمہ وغیرہ کے موضوعات ناشتے کے دوران زیر بحث آئے۔ مجھے یہ جان کر تعجب ہوا کہ سر جان مارشل ایک ماہ تک اب شاید قاہرہ ہی میں قیام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور قاہرہ کے بعد "اُر" کے شہر میں جو بغداد سے پچاس میل کے فاصلے پر دریافت ہوا تھا کچھ تحقیقات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد غالباً ان کا رُخ ہندوستان کی طرف ہوگا۔

باب نمبر ۵

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم سب لوگ گیلری میں آ بیٹھے۔ ہوا میں صبح کی خنکی ابھی تک رچی بسی تھی اور شیشوں کے اس پار دور اہرام کا ہیولیٰ سا نظر آ رہا تھا۔ میری نظر اسی طرف جمی ہوئی تھی اور اس اہرام کے نظروں میں آ جانے کے بعد پھر وہ ساری باتیں ذہن میں جمع ہونے لگی تھیں جو ایک دن قبل مجھ پر گزر چکی تھیں کہ سرجان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"میلکم! کیا تم ہمارے معزز مہمانوں کی موجودگی میں ان تمام واقعات کے دُہرانے کی زحمت گوارا کرو گے جو تم نے کل صبح مجھے بتائے تھے۔ میں نے اپنے دوستوں سے تمہاری رُوداد کا تذکرہ کیا تھا مگر یہ لوگ سب کچھ تمہاری زبان سے سننے کے مشتاق ہیں۔"

میں دور سے اہرام کو دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ فاصلے سمٹنے لگے۔ میں شاید اہرام کے قریب جا پہنچا تھا۔ اہرام کی جادوگری مجھ پر چھائی جا رہی تھی۔ میرے تصور نے گزرا ہوا وقت پھر پلٹا دیا۔ وہی تنہائی، وہی سکوت، وہی چاندنی کی نغمہ ریزی پھر لوٹ آئی۔ میں اسی ماحول میں جا پہنچا اور ان مناظر کا ایک ایک حصّہ پھر میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ خود فراموشی کے عالم میں ان ہی احساسات میں ڈوب کر جب میں نے اپنی کہانی سنائی تو کسی نقطہ کو بھی نہیں چھوڑا۔ جزئیات کے ساتھ سب کچھ بیان کر دیا۔ بیان کے خلوص اور اظہار کے جذبوں کی جو پذیرائی ہوئی وہ ظاہر ہے کہ وہی تھی جس کے وہ مستحق تھے۔ میں نے بلا کم و کاست، بغیر کچھ چھپائے اور بغیر کچھ اضافہ کیے سب ہی کچھ ان کے گوش گزار کر دیا تھا۔

ایک خاموشی سی چھائی تھی۔ میرا بیان ختم ہوا تو میں نے دیکھا کہ کمال نعمانی اپنی پولیس ڈائری میں کچھ نوٹ کر رہا تھا اور سعید وثقی بھی کچھ لکھ رہے تھے۔ چند لمحوں تک سب ہی چُپ رہے۔ سرجان مارشل اہرام کی طرف دیکھتے ہوئے خلاؤں میں کچھ گھور رہے تھے اور پولیس افسر میری نگاہوں میں یوں گھور رہا تھا جیسے ان میں اُتر کر صحیح اور جھوٹ کی تفریق کرنے کے لیے بے قرار ہو۔ اس کے چہرے پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی، بے

یقینی اور مذاق اڑانے والی مسکراہٹ۔ مگر وہ خاموش تھا۔ سب سے پہلا سوال مجھ سے الاہرام کے ایڈیٹر نے پوچھا کہ خوف و دہشت کی اس فضا میں چند گھنٹے گزارنے پر میرے احساسات کیا تھے۔

کمال نعمانی نے فوراً کہا:

"جناب! ابھی ہم نے بیان کی شہادتیں نہیں لیں اور ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ہم نے آخر کیسے یہ مفروضہ قرار دے لیا کہ جو کچھ انہوں نے کہا سب ہی سچ ہوگا۔ میرے خیال میں تاثرات کے بارے میں آپ کا خیال ذرا قبل از وقت ہے۔"

میں نے ہاتھ اُٹھا کر اس پولیس افسر کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا اور پھر سعید وثقی کے سوال کا جواب دیا۔

"مجھے یاد ہے کہ اہرام اندر سے نہایت وسیع و عریض ہیں۔ اتنی وسیع چھتوں والی عمارت میں نے آج تک کہیں اور نہیں دیکھی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آپ کسی کرہ نما تکونے پنجرے میں بند ہیں۔ ان کی چھتیں بے حد بلند ہیں۔ اس اہرام میں چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ سیاہی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ اور ان پتھروں سے بنے ہوئے کمروں کا رنگ بھی سیاہ ہی نظر آتا تھا۔ اہرام کے چوگرد بنے ہوئے کمرے کے بیچوں بیچ ایک وسیع و عریض ہال تھا جیسے کہ دربار ہال ہوتا ہے۔ باہر سے اہرام فقط پُرشکوہ اور تنہا نظر آتا ہے مگر اندر سے یہ پرشکو بھی ہے اور پرہیبت بھی۔ یہ احساس کہ آپ ۵ یا ۶ ہزار سال قبل کے مُردہ ڈھانچوں کے درمیان موجود ہیں اور باہر کی دنیا سے آپ کٹ چکے ہیں ایک جان لیوا اور شدید قسم کی ذہنی بے چارگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

کمال نعمانی سے پھر بھی ضبط نہ ہوا اور وہ بولا۔

"مسٹر جان! آپ اس اہرام میں بند رہے۔ آپ کا بیان ہے کہ سل اور وہ شگاف جس سے آپ اندر داخل ہوئے تھے بند ہو چکا تھا۔ تازہ ہوا کے اندر آنے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اور اندر کی ہوا پانچ چھ ہزار سال سے قید ہے۔ آخر آپ اس نکتے کی وضاحت کیوں کر کریں گے کہ اس مسموم ہوا میں جس میں مردہ جسموں کی سڑاند اور غلاظت بھی شامل تھی آپ کیسے زندہ رہے۔ آپ زہریلی ہوا میں کئی گھنٹے سانس لیتے رہے اور پھر بھی چاق و چوبند، تندرست و توانا باہر نکل آئے۔ کیا میڈیکل سائنس کی روشنی میں آپ کے بیان کی تائید ہو سکتی ہے؟"

میں نے کہا "جناب! آپ نے ایک بے حد اہم بات پوچھی ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ اہرام کے اندر کی ہوا میں مجھے کسی آلودگی، بدبو اور کسی زہریلی غلاظت کی علامت قطعاً محسوس نہیں ہوئی۔ نہ ہی مجھے ہوا کے دباؤ اور بھاری پن کا پتہ چلا۔ نہ مجھے سانس لینے میں کوئی دقت ہوئی۔ بلکہ مجھے وہاں کھلی فضا جیسی تازگی محسوس ہوئی۔ اس نکتہ کی بابت میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر یہ یقیناً ایک اہم بات ہے جس کا عقلی جواز میری سمجھ سے باہر ہے۔"

پروفیسر حسن سعیدی نے میری طرف سے وضاحت کرتے ہوئے کہا "کمال صاحب! اگر آپ نے مصریات اور اہرام کا علمی مطالعہ کیا ہوتا تو آپ یہ سوال نہ پوچھتے۔ دراصل اہرام کی ساخت اور بناوٹ میں اور اس کو ایک خاص زاویہ پر تعمیر کرنے میں ہوا کی تازگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اہرام اس طرح بنائے گئے ہیں کہ زمین کی کشش ثقل ہوا کے لیے ہر طرف سے یکساں دباؤ ڈالتی ہے اور ہوا کا دباؤ اندر گھری ہوئی فضا کے لیے چاروں طرف ایک جیسا ہی ہوتا ہے مگر اس کے باوجود ہوا متحرک رہتی ہے۔

کمال نعمانی کی آنکھیں کچھ حیرت سے کھل گئیں۔ مگر اس نے کہا "پروفیسر صاحب! میں کچھ نہیں سمجھا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔"

پروفیسر حسن سعیدی پھر بولے "ہموار چھتوں والے مکانوں پر ہوا کا دباؤ چھت پر ہوتا ہے اور جب بھی کوئی زلزلہ یا حادثہ ہوتا ہے تو سب سے پہلے چھت گرتی ہے۔ مگر برف باری والے علاقوں میں چھتیں ڈھلوان بنائی جاتی ہیں۔ اس طرح ہوا کا دباؤ ڈھلوان چھتوں پر تقسیم ہوجاتا ہے اور برف کے وزن سے چھتیں گر نہیں جاتیں۔

"اہرام میں ہوا کا دباؤ اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ اوپر کی جانب نوکیلے حصوں کی سمت کم سے کم ہوتا جاتا ہے۔ یعنی اوپر کم ہے اور پھر بتدریج چاروں طرف پھیلتا جاتا ہے اور یہ ہوا جو اندر محبوس ہے اپنی گردش اور غلاظت کو نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے کی سمتوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے تازگی اور ہوا کی ستھرائی باقی رہتی ہے۔ پچاس پچاس ٹن وزنی پتھر کی سلوں سے بند ہوجانے کے بعد INSULATION بھی مکمل ہے۔ اندر کی ہوا آج بھی اتنے ہی درجہ گرم ہوگی جو اہرام کو بند کرتے وقت تھی اور اندر کی ہر چیز اسی طرح اور اس کیفیت میں ہوگی جیسی کہ پہلے دن تھی۔"

سر جان بیچ میں بولے "پروفیسر صاحب! غالباً یہی وجہ ہے کہ ان تمام محلول اور

دواؤں کے علاوہ جو اس زمانہ قدیم کے جراحد لاش اور ممی کے لیے استعمال کرتے تھے جس کی بدولت بیرونی جسم کے عضلات محفوظ رہتے تھے، بڑی وجہ اہرام کی تازہ ہوا بھی تھی۔ اور یہ سب کچھ ہوا کی تازگی کی بدولت ہی ممکن تھا۔ آپ کو شاید یاد ہوگا کہ ایمن را کے اہرام سے گندم اور کپاس کے جو بیج ملے جب ان کو بویا گیا تو پانچ ہزار سال قدیم یہ بیج پھوٹ پڑے اور ان میں باقاعدہ بالیاں تک نکلیں۔ علاوہ ازیں جب رمیسیس دوئم کے اہرام کو توڑا گیا اور اس کی ممی کو لیبارٹری میں بھیجا گیا تو اس کے جسم کی رگیں اور اس کے پٹھے خشک ضرور ہو چکے تھے مگر ان کے تمام جسمانی خلیات اسی طرح صحیح و سالم تھے۔ فقط ان میں زندگی کی حرارت مفقود ہو چکی تھی۔ پروفیسر حسن سعید! اس سے بھی اہم نکتہ کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آٹھ گھنٹے میں میلکم کی داڑھی تین چار انچ بڑھ گئی۔ اس کی توجیہہ کی جا سکتی ہے؟"

کمال نعمانی نے پھر کہا "اس کا کیا ثبوت ہے کہ داڑھی بڑھی تھی، اب تو یہ کلین شیو ہیں۔"

"تمہارے پیشے کی بنیاد شک پر ہے۔ تمہاری نظر میں ہر وہ شخص مشتبہ ہے جو ایماندار اور سچا ثابت نہ ہو جائے مگر ہماری نظر میں ہر شخص ایماندار اور راست گو ہے جب تک وہ مشتبہ ثابت نہ ہو۔ تم کو یقین اور اعتماد کرنا بھی سیکھنا چاہیے۔ سرجان ایک عظیم علمی شخصیت ہیں۔ جان میلکم آکسفورڈ کا طالب علم ہے۔ ایک متمدن اور مہذب نوجوان جو سر جان مارشل جیسی عظیم ہستی کا ہم سفر ہو ایسی کرداری خامیاں نہیں رکھے گا جو تم اپنی روز مرہ کی زندگی میں مجرموں میں دیکھتے ہو۔ ڈیوٹی کلرک نے جس سے جان میلکم نے اہرام سے واپسی پر ملاقات کی اس کا تذکرہ کیا تھا کہ جان میلکم کی اس وقت بے ہنگم سی داڑھی تھی، ہاتھ پر خون جما ہوا تھا اور اسی خون آلود ہاتھ میں ایک عجیب وضع قطع کا ہتھیار بھی موجود تھا۔ اسی کا یہ بھی بیان ہے کہ سر جان مارشل جب ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر میلکم سے ملنے آ رہے تھے تو بے اختیاری طور پر بڑھی ہوئی داڑھی سے متعلق استفسار کرنے لگے تھے۔ بعد میں میلکم کا وہ ساتھی جو اُس شام کو ان کے ساتھ دریائے نیل کے ساحل پر موجود تھا اس کا گواہ بنا۔ میلکم کی عادت ہے ہر روز صبح سویرے غسل کے بعد شیو کرتا ہے۔ چنانچہ اس شام کو بھی میلکم کی داڑھی صاف تھی۔ اب ظاہر ہے کہ یہ داڑھی جو آگی ہے وہ اس وقفہ میں بڑھی جب میلکم نیل کے ساحل کی سیر کے بعد اہرام کی طرف

گئے اور صبح چار بجے ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ کئی اخباری فوٹو گرافروں نے سوتے میں کئی تصویریں اُتاری ہیں جن میں ان کی داڑھی موجود ہے۔ اب تم مطمئن ہو گئے ہو یا نہیں؟"

کمال نعمانی نے بے چارگی سے سر جھکالیا۔

تب سر جان مارشل نے دوبارہ پروفیسر سعیدی سے کہا "پروفیسر! میں آپ کی رائے سننے کا منتظر ہوں۔"

"سر جان، اس کی کوئی علمی توجیہہ قطعی طور پر ممکن نہیں ہے۔ اگر علمی فضا کی جگہ عوامی مزاج کا ماحول ہوتا تو لوگ کہہ دیتے کہ اہرام کی روحوں نے جان میلکم کی داڑھی بڑھا دی ہے۔ مگر میں اس بات کو خالص سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ میری توجیہہ غلط ہو بہرحال پھر بھی میرا خیال یہی ہے کہ اہرام کے اطراف میں اور اہرام کے اندر جو بایو کوسمک قوت کام کرتی ہے وہی اس کی وجہ بھی ہے۔ یہ بایو کوسمک قوت وہی ہے جو فضا کی بلند ہواؤں کے مرکبات کے اثرات کو زمینی فضا کے اثرات سے متعارف کراتی ہے۔ دراصل کوسمک فضا زمینی فضا سے مختلف ہے۔ کائنات کی فضائے بسیط کا وہ حصّہ جس میں چاند، سورج، ستارے موجود ہیں کوسمک کہلاتا ہے۔ اس فضا کے ماحول اور اثرات ہماری زمینی فضا کے ماحول سے بالکل مختلف ہیں لیکن اہرام کے بنانے میں چوں کہ ستاروں کی رفتار، ان کی حرکت کے دائرے اور شعاعی رفتار کی حساب دانی کے بے شمار فارمولے استعمال ہوئے ہیں اس لیے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کوسمک فضا کے اثرات بھی اہرام کے اطراف میں موجود ہوں گے۔"

الاہرام کے ایڈیٹر نے اس بحث میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا "مگر پروفیسر صاحب، اس نظریہ کا جان میلکم کی داڑھی سے کیا تعلق ہے؟"

پروفیسر سعیدی نے پیشانی کو رگڑتے ہوئے کہا "بہت گہرا تعلق ہے وشتی صاحب، ذرا سوچیے کہ نوری سال کی نوعیت کیا ہے؟ فضائے بسیط کے تمام سیاروں میں وقت کا معیار الگ الگ ہے۔ ہماری زمین کا سورج کے گرد ایک چکر ۳۶۵ دن میں مکمل ہوتا ہے لیکن بہت سے سیارے ایسے بھی ہیں جو اپنے سورج کے گرد ایک چکر ۲۱ سال میں پورا کرتے ہیں۔ گویا ان سیاروں کی گردش سے بننے والا ایک سال ہمارے کرۂ ارض کی گردش سے بننے والے سال سے ۲۱ گناہ بڑا ہوگا۔ گویا ان کا ایک دن ہمارے اکیس دنوں کے برابر ہوگا، گویا ان کا ایک گھنٹہ ہمارے ۲۱ گھنٹوں کے لگ بھگ ہوگا۔ اب آپ آئیے اس نظریہ کی

طرف کہ اہرام کے اندر و باہر کو سمک فضا کے اثرات ہیں۔ گویا ان اہراموں کے اندر وقت کا تعین اسی ترتیب سے ہوتا ہے جو فضائے بسیط میں وقت ناپنے کا معیار ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جان میلکم کے آٹھ گھنٹے تقریباً آٹھ دن کے برابر ہو جاتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی داڑھی اسی طرح بڑھی جیسی کہ آٹھ دس دنوں میں بڑھنی چاہیے۔"

مئی ۱۹۷۶ء میں برازیل کے ایک اخبار میں عجیب و غریب خبر شائع ہوئی تھی۔ برازیل کے ایک دور افتادہ کھیت میں دو کسان کام کر رہے تھے کہ انھوں نے ایک چمک دار آگ کے گولے جیسی چیز کو برق رفتاری سے سامنے آتے دیکھا اور پھر یہ چمک دار گول پلیٹ کی طرح کا جہاز ان کے قریب اُتر گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس مشین نما گول کرے سے دو افراد باہر نکلے۔ ان کا جسم اور چہرہ عجیب و غریب پلاسٹک جیسے لباسوں میں چھپا ہوا تھا۔ انھوں نے ان دونوں کسانوں کو اپنی طرف بلایا۔ ایک تو ڈر کر وہیں رک گیا اور دوسرا ان کی طرف چلا گیا۔ وہ دونوں اُسے پکڑ کر اپنی مشین کے اندر لے گئے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد اس کو باہر نکالا تو اس کے تمام بال سفید ہو چکے تھے اور داڑھی کئی سال کی بڑھی ہوئی لگتی تھی۔ باہر نکلتے ہی وہ بے ہوش کر گر پڑا اور یہ چمک دار جہاز تیزی سے اڑ کر ہوا میں غائب ہو گیا۔ (جوزف میلکم، اپنے والد کے والد جان میلکم کی سرگزشت لکھنے والا)

سر جان کچھ پر خیال انداز میں سوچتے ہوئے بولے۔

"ممکن ہے پروفیسر صاحب، آپ کا نظریہ صحیح ہو۔ مگر فی الحال فقط ایک تصیوری ہی ہو سکتی ہے۔ غور کرنے کے لیے اس نکتہ کے کئی اور پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔"

کمال نعمانی نے ایک بار پھر تجویز پیش کی کہ ہم سب لوگوں کو اہرام کی طرف چلنا چاہیے تاکہ جائے واردات کا معائنہ کیا جا سکے اور جان میلکم کے بیان کی مختلف طریقوں سے مزید جانچ پڑتال کی جا سکے۔ سر جان مارشل نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا اور مجھے مستعد پا کر اس تجویز کی تائید کرنے لگے۔ چنانچہ اونٹوں پر سوار ہو کر ہم سب اہرام کی طرف روانہ ہو گئے۔

ذرا دیر بعد ہم اس سیاہی مائل پتھریلی سڑک پر چل رہے تھے جو سیدھی دریا سے خوفو کے اہرام تک جاتی تھی۔ پروفیسر سعیدی ہمیں بتا رہے تھے کہ سڑک دریا سے لے کر اہرام تک اہرام کی تعمیر کے وقت ہی بنائی گئی تھی۔ یہ سیاہی مائل گرینائٹ پتھروں سے بنی تھی جو تقریباً چھ سو میل دور اسوان کی پہاڑیوں سے یہاں تک لائے گئے تھے۔ یہ سڑک

چھ سو گز لمبی اور اسی فٹ چوڑی تھی۔ یہ سڑک آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی تھی۔ اور اس کا آخری سرا پہلے سرے سے کوئی سّر فٹ بلند تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پتھر کی لمبی چوڑی سلوں کو دریا سے کشتیوں کے ذریعے ساحل تک لایا جائے اور پھر اس سڑک سے کھینچ کر اہرام کے معماروں کو مہیا کیا جا سکے۔ ایک لاکھ مزدوروں نے یہ سڑک دس سال میں تعمیر کی تھی۔

پروفیسر کے بیان کے ساتھ ساتھ ہی ہم آہستہ آہستہ اہرام کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ یہ سارا علاقہ ریتیلا تھا۔ اہرام کے قرب و جوار میں ریت کے چھوٹے بڑے بہت سے ٹیلے تھے۔ کہیں کہیں خود رو اور چھوٹی بڑی جھاڑیاں بھی تھیں۔ اہرام اس ویرانے میں اکیلے درخت کی طرح تنہا کھڑا تھا۔ دور سے اس کا رنگ سُرخی مائل زرد نظر آتا تھا مگر قریب سے وہ سیاہی مائل سُرخ ہوتا گیا۔ اہرام کے قرب و جوار میں اور کافی دور پر کچھ اور چھوٹے بڑے اہرام نظر آ رہے تھے۔

پولیس آفیسر نے مجھ سے پوچھا "مسٹر جان! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ اس اہرام کے کس طرف موجود تھے جب کہ آپ نے مختلف قسم کے قدموں کی چاپ بھی سنی تھی؟"

"جناب! وہ وقت کچھ عجیب سرشاری اور مدہوشی کا سا تھا۔ میں یوں ہی بے مقصد گھوم رہا تھا۔ خالی الذہن اور بلا ارادہ۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں کس کس طرف گیا اور کہاں کہاں پہنچا۔ یوں بھی وہ رات کا وقت تھا اور ارضِ مصر میں وہ پہلی رات تھی میری۔ ہاں مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ جس جگہ میں بیٹھ گیا تھا وہاں کچھ پتھر ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔ اور اہرام کی اس پتھر کی سل پر جہاں میں بیٹھا تھا کچھ کرچیں سی پڑی تھیں۔"

کرال نعمانی نے کہا "شہنشاہ خوفو کا یہ اہرام تیرہ ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں وہ پتھر ڈھونڈنا جس کی کرچیں ٹوٹی ہوئی ہوں ایک سخت مشکل مرحلہ ہے۔"

اب اہرام قریب آ گیا تھا۔ سر جان اور ہم سب لوگ متجسانہ انداز میں نگاہیں ادھر اُدھر گھما رہے تھے کہ سر جان مارشل ایک دم اپنی سواری سے کود پڑے اور رک کر بولے۔

"دیکھیے آفیسر، یہ دیکھیے۔ یہ قدموں کے نشان ہیں۔"

میں بھی اُتر کر ان نشانوں کو دیکھنے کے لیے بڑھا تو میرے پیچھے آتے ہوئے الاہرام کے ایڈیٹر سعید دتقی بولے "دیکھیے، یہ نشانات واضح طور پر اسی جوتے کے ہیں جو اس وقت بھی جان میلکم کے جوتے سے بن رہے ہیں۔"

سب لوگ اسی طرف متوجہ ہو گئے۔ میرے قدموں کے نشانات پندرہ بیس مرتبہ اسی لائن پر آنے اور جانے کے تھے۔ گویا میں یہاں پر بہت دیر ٹہلتا رہا تھا۔ اور پھر اہرام کے اوپر کی طرف قدموں کے نشانات جا رہے تھے۔ اور ایک پتھر کے قریب جا کر یہ نشانات رک گئے تھے۔ شاید یہاں میں تھک کر سانس لینے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔ یہاں جوتے کے سول کا پورا نشان تھا۔ بلکہ ایڑی کے نشانات بھی تھے۔ اور پھر ایڑیوں کے گھسنے کی لائنیں بنی ہوئی تھیں۔ گویا میں بے خیالی میں پاؤں پسار کر اس طرح بیٹھا تھا کہ زمین سے میری ایڑیوں کے سرے لگ رہے تھے۔ یہیں پتھروں پر نوکیلے پتھر سے کچھ لائنیں کھنچی ہوئی تھیں۔ شاید یہ بھی میں نے بغیر ارادہ یوں ہی لکیریں سی کھینچ دی تھیں۔ اس جگہ کے قریب ہی پھر پورے جوتے کے نشانات تھے۔ اور دونوں پیروں کے نشانات تھے۔ گویا میں پورے وزن سے سارا زور صرف قدموں پر ہی لے کر کھڑا ہوا تھا۔ یہ اس کا ثبوت موجود تھا۔ پھر یہ قدم آگے کی طرف بڑھتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ دس بارہ فٹ اونچائی پر جانے کے بعد ایک پتھر کی سل کے قریب آ کر صرف ایک پتھر پر پیر کا نشان موجود تھا۔ گویا دوسرا قدم اس پتھر کے علاوہ کہیں اور رکھا گیا تھا جس کا کوئی اثر و نشان ظاہر نہیں تھا۔ اسی سل کی دوسری طرف واپسی کے قدموں کے نشان تھے۔ اس کے قریب ہی جمے ہوئے سیاہی مائل خون کے قطروں کے نشانات بھی موجود تھے۔ نشان جس پتھر کی سل پر جا کر شروع اور ختم ہوتے تھے وہاں، اس بات کا کوئی اور نشان موجود نہ تھا کہ یہ پتھر ہٹایا گیا ہو یا اپنی جگہ سے ہلا کر دوبارہ پیوست کیا گیا ہو۔ قدموں کے نشانات البتہ میری کہانی کا واضح ثبوت تھے۔

"قطعاً افسانوی، ناقابلِ توجیہہ، نہایت ڈرامائی .... مسٹر جان میلکم! نہ چاہنے کے باوجود بھی میں آپ کا اعتبار کرنے پر مجبور ہوں۔" کمال نعمانی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

سر جان مارشل پولیس آفیسر کی طرف دیکھ کر بولے "ابھی تو ڈرامہ کی ابتداء ہے، سنیے، اس سے بھی حیرت ناک اطلاع آپ کے لیے یہ ہے کہ جو لوہے کا اوزار جان میلکم کو اہرام کے اندر سے ملا ہے وہ تقریباً سات ہزار سال پرانا ہے۔ اور پگھلائے ہوئے فولاد سے بنایا گیا ہے۔ اس پر آج بھی اس قدر تیز دھار، موجود ہے کہ آپ کسی بڑے جانور کی سخت ہڈی تک کو مکھن کی طرح کاٹ سکتے ہیں۔ یہ اس زمانے کا ہتھیار یا اوزار ہے جب تاریخ میں پتھر

کا دور چل رہا تھا، لوگ غاروں میں رہتے تھے، جانوروں کی طرح کھاتے تھے اور پتھروں کے ہتھیار اپنے دفاع کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پھر یہ ہتھیار کیسے آیا اور کس بھٹی میں اسے ڈھال کر فولاد بنایا گیا، لوہے کو کیسے کر پگھلایا گیا اور کس طرح اس پر دھاری رکھی گئی۔ بہت حیرت ناک ہے۔"

"مگر یہ سب کچھ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟" پولیس آفیسر نے سر جان سے پوچھا۔

"قاہرہ یونیورسٹی کے شعبہ کیمیا کی رپورٹ پر۔ وہ اب بھی میرے پاس موجود ہے۔"

سر جان مارشل نے نکال کر وہ رپورٹ کمال نعمانی کو پڑھنے کے لیے دے دی۔ کمال نعمانی اس رپورٹ کو پڑھتا جاتا تھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹتی جاتی تھیں۔ اس رپورٹ کو ابھی تک الاہرام کے ایڈیٹر نے نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے بھی پڑھا اور حیرت زدہ رہ گئے۔ کیمسٹری میں کسی بھی قدیم پتھر، لاش اور درخت اور چٹانوں وغیرہ کی قدامت ناپنے کا ایک مشہور و معروف طریقہ رائج ہے کہ کاربن کی تہوں سے جو اس شئے پر موجود ہوتی ہے اس کی قدامت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

قاہرہ کی یونیورسٹی جامعہ الازہر میں بھی پگھلائے ہوئے لوہے کے اس اوزار کی قدامت جانچنے کے لیے جب کاربن کی تہوں کا شمار کیا جانے لگا تو اس کی صحیح عمر کا حساب نکل آیا۔ اس کی قدامت، اس کی دھار کی تیزی، اس کا نیا پن، یعنی ساری علامتیں تعجب خیز اور حیرت انگیز تھیں۔ اس رپورٹ کے آخر میں ایک نوٹ یہ لکھا گیا تھا کہ فولاد کے اس اوزار میں لوہے کے جو اجزاء شامل ہیں وہ بھی پوری دنیا میں پائے جانے والے کسی جگہ کے لوہے میں موجود نہیں ہوتے۔ اس میں فولاد کے ساتھ ہی ساتھ لوہے سے بھی زیادہ سخت اور سونے کی طرح چمک دار کسی نامعلوم دھات کے اجزاء شامل تھے۔ یہ کون سی دھات تھی۔ اس کا سائنس دانوں کو کچھ علم نہ تھا۔ اسی رپورٹ میں یہ بھی سوال کیا گیا تھا کہ یہ اوزار ہماری دنیا سے تعلق رکھتا ہے....؟"

پروفیسر سعدی کہنے لگے "جان میلکم! تم نے ایک عظیم شئے دریافت کر لی ہے۔ تمہاری دریافت بے شک ایک پُراسرار مرحلے سے گزر کر ہوئی ہے اور اس میں تمہاری اپنی کاوشوں کو بہت کم دخل ہے۔ مگر اس معمولی سی لوہے کی چھری نے تمہیں بتائے دوام عطا

کر دی ہے۔ صرف اس لیے کہ اس دریافت سے یا تو پتھر کا زمانہ اب شاید دس بارہ ہزار سال قبل ہی ختم ہو جائے گا یا پھر لوہے کے استعمال کا عہد جسے ہم لوگ اس وقت تقریباً چار ہزار قبل مسیح سے شمار کرتے ہیں اب شاید اس ایک دریافت سے اپنی عمر سے دگنا ہو جانے گا یعنی کہ لوہا آٹھ ہزار سال قبل بھی استعمال ہو رہا تھا۔ اس تبدیلی کا سہرا اور اس نئی دریافت کا ماخذ تم ہی سے منسوب ہوگا۔ علمی دنیا میں دریافت ایک زلزلہ سے کم نہ ہوگی۔

میں نے سر جان مارشل کی طرف دیکھ کر کہا "مگر ایک بے حد اہم نکتہ یہ ہے جس کی طرف جامعہ الازہر کے شعبہ کیمیا نے توجہ دلائی ہے کہ پگھلائے ہوئے لوہے کے اس ہتھیار میں لوہے کی ساخت اور اجزائے ترکیبی ہماری دنیا کے لوہے سے بہت مختلف ہیں اور میرے اس واقعے کی حقیقت و اصلیت کی طرف یہ بالکل واضح اشارہ اور اس کی صحت کا ایک بین ثبوت ہے۔"

(بعد کے محققین نے اس اوزار کو "اوپا" کا نام دیا۔ آئی وان سنڈرسن جس کا حوالہ اس کتاب میں بھی دیا گیا ہے۔ جوزف میلکم)

خوفو کے بڑے اہرام کے قریب ہی دو اور اہرام ہیں جن کو اہرام شیفرون اور اہرام مصری نس کہا جاتا ہے۔ ہم ان کے قریب ہی آ چکے تھے اور سلسلہ گفتگو ابھی جاری تھا۔

سر جان کہنے لگے "دراصل ایک قدیم تاریخ کے علماء کا ایک خاصا پڑھا لکھا اور باوقار طبقہ اس نظریہ کا حامل ہے کہ اہرام مصر اور اس سے ملتی جلتی بہت سی ایسی عمارتیں اور شہادتیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا میں کسی اور سیارہ کی مخلوق آتی جاتی رہی ہے جو ہماری دنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور سائنس کی ٹیکنالوجی میں بے حد آگے تھی۔ ۱۸۵۹ء میں لندن کے ایک اخبار نویس جان ٹیلرز نے اہرام مصر پر ایک کتاب لکھی جس میں یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ اہرام پیغمبر نوح نے بنائے تھے جن کی مدد کے لیے ایک آسمانی مخلوق موجود رہتی تھی۔ طوفان نوح کا زمانہ لگ بھگ ۲۵۰۰ قبل مسیح کا ہے۔ یعنی اب سے شاید ۵۵۰۰ ہزار سال قبل طوفان آیا تھا۔ شروع میں یورپ میں اس نظریہ کو فقط افسانوی حیثیت دی گئی مگر چند سال بعد مشہور منجم جو اسکاٹ لینڈ کی شاہی انجم شناس سوسائٹی کا ممبر بھی تھا جس کا نام چارلس پیازی اسمتھ تھا اس نے بھی نظام فلکی کے بہت سے پیمانوں اور رفتار سیارگان کی پیمائش کے حساب سے یہی نتیجہ اختیار کیا کہ اہرام مصر کی تعمیر میں اس کی سمت کے متعین کیے جانے میں جغرافیہ دانی اور نظام فلکی کے وہ اصول

استعمال کیے گئے ہیں جو اُس کے دور کے وحشی انسانوں کے علم میں آنے ممکن نہ تھے۔ یہ انکے بس کی بات ہی نہ تھی۔ چنانچہ اس کا نظریہ بھی یہی ہے کہ یہ کسی آسمانی سیارے سے آنے والی مخلوق کی سائنسی مہارت کا کمال تھا کہ اہرام جیسی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اسلام کے مشہور مؤرخ المسعودی نے بھی یہی نظریہ قائم کیا کہ اہرام طوفانِ نوح سے تین سو سال قبل تعمیر ہوئے۔ (حضرت نوح کی عمر نو سو سال کی ہوئی اور طوفانِ نوح کے بعد تین سو سال مزید زندہ رہے) گویا اہرام تین ہزار نو سو سال قبل مسیح میں بنے۔ المسعودی کا خیال تھا کہ حضرت نوحؑ نے اپنی الہامی قوتوں سے کام لے کر اس قسم کی عظیم عمارتوں کی تعمیر کی تاکہ سیلاب سے وہ عظیم تمدن بچ جائے جو اُس وقت وہاں موجود تھا اور انہوں نے اہرام کے پتھروں پر وہ الہامی اشارے لکھ دیے جس کی بدولت مصر میں جو کچھ ماضی میں پیش آیا تھا یا مستقبل میں پیش آنے والا تھا سب کے علم میں آ جائے۔ اس طرح المسعودی کے بیان کے مطابق بھی اہرام کی تعمیر میں آسمانی امداد کا تصور شامل تھا۔"

پروفیسر سعیدی کہنے لگے "سر جان! میں آپ سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ صرف ایک طاقت ور اور بلحاظِ علمیت نہایت فاضل تاریخ دانوں کا گروہ اہراموں کی تعمیر کو دوسرے سیارے کی مخلوق کی فنِ تعمیر کا نمونہ بتاتا ہے بلکہ خود فراعینِ مصر کی پرانی روایتوں کے مطابق بھی مصر کی متمدن حکومتوں کا سلسلہ آسمان سے اترنے والے شہنشاہ ایمن را سے ملتا ہے۔"

سعید دمشقی اب اس موضوع میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ انہوں نے پروفیسر کی طرف دیکھ کر کہا "کیا آپ ایمن را کی روایت پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں!" پروفیسر نے ہامی بھر لی "کہانی یہ ہے، اب سے بہت ہی قدیم وقتوں میں نیل کے اطراف میں آدم خور انسانوں کے گروہ آباد تھے جو وحشی جانوروں کی طرح جنگلوں میں رہتے تھے اور شیروں، بھیڑیوں اور ہاتھیوں کی طرح اپنے اپنے جھنڈ بنا کر جنگل جنگل گھومتے تھے۔ یہی زمانہ تھا کہ شہنشاہ ایمن را ایک سنہرے تخت پر جو بادلوں کی بجلیوں سے چلتا تھا سوار ہو کر دریائے نیل کی وادی میں اتر آیا جسے لوگوں نے دیوتا ایمن را کے نام سے پکارنا شروع کیا۔ سب ہی اس کی عبادت کرنے لگے اور اس کا حکم ماننے لگے۔ ایمن را کچھ عرصہ تک زمین پر رکا اور پھر اپنے بیٹے اُسیرس کو اپنی جگہ دیوتا اور بادشاہ بنا کر آسمانوں کی طرف اڑ گیا۔ اسیرس کے ہمراہ اس کا بھائی سیت بھی رہتا تھا۔ وہ

اُسیرس کے دیوتا اور بادشاہ بن جانے سے اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ اُسیرس نے مصر کے لوگوں کو ہتھیار اور اوزار دیے، ان کو زراعت اور کاشت کاری کے طریقے بتائے، ان کی آدم خوری کو ختم کیا، گندم سے غذا، کپاس سے کپڑا، اور انگور سے شراب بنانا سکھایا، اور اپنی سلطنت کو بے حد طاقتور بنا لیا، طاقت اور عظمت میں دور دور تک اُسیرس کا کوئی مقابلہ نہ تھا مگر اس کے بھائی سیت نے ایک دن موقع پا کر اپنے حسد اور غصے کے سبب اُسیرس کو قتل کر دیا اور اس کی لاش کے ٹکڑے کر کے دریائے نیل میں بہا دیے۔ مگر اُسیرس کی بیوی اسیس نے اپنے شوہر کی لاش کے ٹکڑے جمع کیے اور اپنے علم کے زور پر اسے اپنے آسمانی وطن لے جانا چاہا۔ بدقسمتی سے لاش کا ایک ٹکڑا کوئی مگرمچھ کھا چکا تھا جو نہ مل سکا اور جب تک لاش کا جسم مکمل نہ ہوتا آسمانی سفر شروع کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اسیرس کی بیوی اسیس نے ایک دوسرے آسمانی حکیم انوبیس کو بلایا۔ اس نے نامکمل جسم ہی کو ہمیشہ ہمیشہ باقی رکھنے کے لیے اُسیرس کے جسم کو ممی کی صورت میں ڈھال دیا۔ اب اُسیرس زندہ تو نہیں تھا مگر موت اس کو مزید کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اسیرس جب تک دنیا میں رہا وہ زندہ انسانوں کا شہنشاہ تھا اور جب وہ مر گیا تو مردوں کی سلطنت کا شہنشاہ بن گیا۔ انوبیس کا خیال تھا کہ جب بھی اُسیرس کے جسم کا حصہ مل جانے لگا وہ اپنی زندگی پھر سے پا لے گا۔ رفتہ رفتہ مصریوں میں یہ رواج پھیلتا گیا کہ مرنے والوں کی لاشیں محفوظ کر لی جائیں تاکہ جب کبھی اُن کے جسم میں زندگی لوٹ آئے تو ان کو اپنے جسم ہی ظاہری طور پر صحیح حالت میں مل جائیں اور انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس روایت میں بھی آسمانی مخلوق کے آنے اور مصر کے وحشی آدم خور قبائل کو ہتھیار اور اوزار دینے کا ذکر ہے۔ گویا اس طرح یہ بات کچھ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ مصر میں کسی خلائی سیارہ سے آنے والی مخلوق نے اس وقت کے باشندوں کو کچھ ہتھیار اور مختلف دھاتوں کے اجزاء مہیا کر دیے ہوں چنانچہ لوہے یا فولاد کا جو ہتھیار جان میلکم کو ملا اس میں زمین سے ملنے والے لوہے کے اجزاء سے مختلف ایسے اجزاء شامل ہو سکتے ہیں کہ وہ ہماری اس دنیا سے متعلق نہ ہوں۔ بہرحال، اب یہ دریافت اس دور کے اور مستقبل کے مورخوں اور سائنس دانوں کے تجربوں کا حصہ بن جائے گی اور اس پر نئے نئے زاویوں سے روشنیاں ڈالی جائیں گی۔ بے شک جان میلکم کا نام ایک لحاظ سے علمی دنیا میں اس نادر الوجود دریافت کے ساتھ ساتھ ہمیشہ منسلک رہے گا۔"

اب ہم لوگ باتیں کرتے کرتے اس طرف واپس لوٹ رہے تھے جہاں ہمارے اونٹ کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ سورج کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی اور صحرا کی گرم ہوا نے بھی تپش کو آہستہ آہستہ بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ جب ہم واپس لوٹنے لگے تو سرجان مارشل نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا "آج کا دن تو تفتیش کی نذر ہو گیا ہے مگر کل ہم لوگ اس مقام کی تلاش میں آئیں گے جہاں تم نے رمیسیس اول کو دفن ہوتے دیکھا ہے۔ یہ دریافت اس فولاد کے اوزار کی دریافت سے بھی عظیم تر ہو گی۔

اگلے دن مصر کے مشہور اخبار الاہرام میں اور تقریباً قاہرہ سے نکلنے والے تمام اخباروں کی شہ سرخیوں میں میرا ہی تذکرہ تھا۔ اہرام میں مقید ہونے اور نکل آنے کی داستان تھی۔ داڑھی کے بڑھ جانے کا ذکر تھا، اس فولاد کے ہتھیار سے متعلق باتیں تھیں جو اہرام سے ملا تھا۔ جامعہ ازہر کے شعبہ کیمیا کی رپورٹ تھی اور پروفیسر سعیدی کا ایک چھوٹا سا بیان تھا جس میں میرے بیان کی صداقت کو علمی نقطۂ نظر سے جانچا گیا تھا۔ اور اسی مضمون میں انہوں نے جامعۂ ازہر کے شعبۂ مصریات اور تاریخ قدیم کے شعبے کی طرف سے ایک اعزازی انعام کا مستحق قرار دیے جانے کی سفارش بھی کی گئی تھی۔

مصر کے والی خدیو توفیق اور ان کے بیٹے شہزادہ عباس علی نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور میں دربار میں ان سے ملا۔ مجھ سے تمام تفصیلات کئی کئی بار پوچھی گئیں اور میں بتاتا گیا۔ مجھے اگلے دن جامعہ ازہر کے شعبہ تاریخ میں مدعو کیا گیا اور جامعہ کی تا حیات فیلوشپ کا اعزاز عطا کیا گیا۔ اخبارات اور رسائل میں میرے خاندان، میری تعلیم، میرے والدین اور سرجان مارشل کے متعلق ان چار پانچ دنوں میں بہت تفصیل سے لکھا گیا۔ گویا یہ چھ سات دن اسی ہنگامے کی نذر ہو گئے اور ہم لوگ اپنے مشن کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکے۔

مصر پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد کی بات ہے کہ میں ایک دعوت سے رات کو واپس لوٹا تو ریسٹ ہاؤس کے اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ کسی نے میرے سامان کو الٹ پلٹ دیا ہے۔ اٹیچی کیس کی مختلف اشیاء اور مطالعہ کی کتابیں وغیرہ بھی سب کی سب ادھر سے اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ کمرے کی حالت دِگرگوں دیکھ کر مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے فی الفور ڈیوٹی کلرک کو بُلا کر کمرے کا حال دکھایا اور اس سے وضاحت طلب کی۔ اس کی سٹی گم ہو گئی کیوں کہ اب میں فقط ایک نوجوان طالبِ علم یا سرجان مارشل کی ٹیم کا ایک

میں ہی نہ تھا بلکہ یہ سات دن میری حیثیت کو قطعی طور پر بدل چکے تھے۔ سچ پوچھیے تو میں اب قاہرہ میں سرجان سے بھی زیادہ متعارف شخصیت تھا۔ والیِ مصر خدیو توفیق میرے مہربان دوستوں میں شامل تھے چنانچہ کسی ایسی ابھرتی ہوئی شخصیت کے سامان کی تلاشی اور کمرے کی زبوں حالی ریسٹ ہاؤس کے اسٹاف کو پریشان کر دینے کے لیے بہت بڑی بات تھی۔

کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کس نے کیا اور کیوں کیا؟ ڈیوٹی کلرک اور ریسٹ ہاؤس کا تمام سینئر اسٹاف ادھر آ گیا اور سب نے قسمیہ کہا کہ انھوں نے کسی کو اس طرف آتے نہیں دیکھا اور وہ لوگ اس حادثے سے بالکل لاعلم ہیں۔ میں نے اپنے سامان کا جائزہ لیا سب کچھ صحیح سلامت تھا۔ کوئی چیز کم نہ تھی۔ میں نے بھی اطمینان کا سانس لیا کہ چلو بلا ٹلی۔ میں کافی تھکا ہوا تھا اور پھر اس وقت سرجان کو اطلاع دینا بھی مناسب نہ تھا کیوں کہ بہرحال میرے سامان کی تلاشی لینے والے ان لوگوں نے میری سب سے قیمتی چیزیں وہ ہڈی اور رومال کے علاوہ بھی جو اس حبشی ساحرہ نے مجھے دی تھیں اور جو ہمیشہ میرے پاس رہتی تھیں، دوسری چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں چرائی تھی۔ چنانچہ میں نے ریسٹ ہاؤس کے اسٹاف کو تھوڑی سی سرزنش اور تنبیہ کے بعد واپس کر دیا اور زیادہ حفاظت اور ذمہ داری سے کام کرنے کی ہدایت کی۔

رات کو میں نے حسبِ معمول پہلے اپنی ڈائری لکھی اور پھر اپنی ممی کو اب تک پیش آنے والے واقعات سے متعلق ایک خط لکھا جس میں اپنی شہرت اور جامعہ ازہر کی اعزازی فیلوشپ کے علاوہ اخبارات کے تراشے اور خبریں جو مجھ سے متعلق تھیں سب ہی منسلک کر دیں۔ ڈاک کا انتظام یہ تھا کہ مصر میں ۱۸۶۶ء سے نہر سوئز تعمیر ہو جانے کے بعد سوئز کی بندرگاہ سے برطانوی جہاز روز ہی گزرتے تھے۔ ڈاک برطانوی قونصل کے حوالے کر دی جاتی تھی اور وہاں سے بحری جہاز یا بھاپ سے چلنے والی کشتیوں اور اسٹیمر وغیرہ کے ذریعے لندن پہنچ جاتی تھی۔ چنانچہ بارہ دن کے اندر اندر خطوط برطانوی مملکت کے اندر قصبوں اور کاؤنٹیوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے۔

اس کام سے فارغ ہوتے ہوتے رات کے بارہ بج گئے۔ پورے ریسٹ ہاؤس میں شاید ابھی تک تنہا میں ہی جاگ رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا اور کوئی بھی کلرک یا محافظ شاید بیدار نہیں تھا کیوں کہ کوئی آہٹ یا کسی قسم کے پاؤں کی چاپ تک سنائی نہ دیتی تھی،

اتفاق سے میرا کمرہ بھی راہداری کے کونے پر تھا اور پہلی منزل پر تھا جس کی بلندی زمین سے بمشکل بیس فٹ تھی۔ کمرے سے باہر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ٹکراتے تھے تو عجیب سی موسیقی پیدا ہونے لگتی تھی۔ صحرائی راتیں چوں کہ بڑی خوش گوار ہوتی تھیں اس لیے ہم سب لوگ عموماً کھڑکیاں کھول کر سوتے تھے۔ میں نے کمرے کی روشنی گل کی، خطوں کو سرہانے رکھا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میں تھکا ہوا تو تھا ہی، جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔ شاید تین بجے کا وقت تھا کہ کسی نے مجھے ہلکے سے جھٹکے سے جگانے کی کوشش کی۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ تین لمبے تڑنگے افراد سیاہ نقاب سے اپنے چہروں کو چھپائے، ہاتھوں میں خنجر تھامے کھڑے ہیں۔ انھوں نے فوراً میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور میرے ہاتھوں کو ریشم کی رسی سے باندھ دیا۔ خنجر کی نوک میری پشت پر لگا دی گئی۔ ایک نقاب پوش آگے آگے، دوسرا دائیں جانب اور تیسرا پیچھے کی طرف چلنے لگا۔ کھڑکی کے قریب آکر انھوں نے مجھے رسی کے ذریعے بلا کسی آواز کے نیچے اتار دیا، خود بھی اتر گئے اور ایک اونٹ پر بٹھا کر تیز رفتاری سے ریسٹ ہاؤس سے دور نکل گئے۔

میرے ہم سفر تو شاید اونٹوں کی سواری کے عادی تھے اور پھر ان کے ہاتھ پیر، چہرہ، آنکھیں سب ہی آزاد تھے مگر مجھے ایک تو یہی علم نہ تھا کہ میں کن لوگوں میں پھنس گیا ہوں اور نہ ہی ان کے ارادے کا پتہ تھا۔ اور پھر ہاتھ پیر رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ اونٹ دوڑ نہیں رہا تھا بلکہ ہچکولے کھا رہا تھا میری ہڈیاں اور جسم کا ایک ایک حصہ اس بری طرح دکھنے لگا تھا کہ اونٹ کا ہر قدم میرے لیے ایک عذاب سے کم نہ تھا۔ جس طرح پھوڑا دکھتا ہے اسی طرح میرا جسم دکھنے لگا تھا۔ میرے لیے اس وقت سے زیادہ اہمیت اس بات کی تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ سفر ختم ہو اور میں اس اونٹ کی سواری سے نجات حاصل کروں۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور میں کچھ دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ یوں بھی مصر میرے لیے ایک نیا ملک تھا۔ میں اگر اپنی کھلی آنکھوں سے بھی اس راستے کو دیکھ لیتا تو بھی اندھیری رات میں اس کو دوبارہ پہچاننا میرے لیے کچھ آسان کام نہ ہوتا۔

باب نمبر۶

شاید ایک گھنٹے تک اونٹ اسی طرح دوڑتے رہے اور پھر آخر کار دونوں اونٹ ٹھہرائے گئے میرے تینوں محافظوں نے اونٹ بٹھلائے اور وہ اپنے اونٹوں سے اُتر گئے۔ مجھے بھی اونٹ کی پشت سے گھسیٹ لیا گیا۔ میرے ہاتھ کھول دیے گئے، پیروں کو آزاد کر دیا گیا۔ منہ سے کپڑا بھی نکال دیا گیا مگر آنکھوں پر پٹی ابھی اسی طرح برقرار تھی اب ایک آدمی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے نے خنجر کی تیز دھار سے ہتھیار کو میری پشت پر لگا دیا۔ چند ہی قدم آگے بڑھنے کے بعد مجھے بہت سے آدمیوں کے چلنے پھرنے اور بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں کچھ اور آگے چلنے کے بعد مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا گیا اور میرے رکتے ہی میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔

ہر طرف روشنی ہی روشنی دیکھ کر آنکھیں کئی لمحوں تک کچھ دیکھنے کے قابل نہ ہو سکیں۔ آہستہ آہستہ میں نے دیکھنا شروع کیا یہ ایک وسیع و عریض غار تھا جس کی پشت پر پہاڑی چٹانوں کے آڑے ترچھے سرے اِدھر اُدھر نکلے ہوئے تھے بہت سے لوگ خنجروں، نیزوں اور بندوقوں سے لیس اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔

"سردار اشرف بیگ کو رعدی کے مشن کی کامیابی کی اطلاع دو...!" میرے محافظ نے کسی سے مخاطب ہو کر حکمیہ لہجے میں کہا۔

میں نے ان کی طرف دیکھا تو انھوں نے ابھی تک اپنے چہرے نقاب سے چھپائے ہوئے تھے اور جسم پر فوجی وردی کی طرح یونیفارم پہنی ہوئی تھی۔ یہاں غار میں اکثر لوگ اسی قسم کی وردی میں ملبوس نظر آتے تھے۔

یہ لوگ چال ڈھال اور وضع قطع سے کسی فوجی یا نیم فوجی تنظیم کے ارکان معلوم ہوتے تھے۔ میں سمجھ نہ سکا کہ میرے جیسے غیر فوجی، غیر سیاسی اور ناتجربہ کار شخص کی ان کے لیے کیا اہمیت تھی اور یہ لوگ مجھے اغوا کر کے یہاں کیوں لائے تھے؟ کیا یہ لوگ کسی زیرِ زمین تشدّد پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے؟ جب میں اہرام میں چند گھنٹے گزار کر ریسٹ ہاؤس میں واپس آیا تھا تب بھی ڈیوٹی کلرک نے میری اچانک گم شدگی سے

متعلق یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ شاید میں کسی گروہ کے ہاتھ پڑ گیا تھا۔ اس کا مطلب فقط یہی تھا کہ مصر میں اس قسم کی سرگرمیاں کچھ ضرور جاری تھیں۔ ممکن ہے کچھ کا علم سرکاری اہلکاروں کو بھی رہا ہو۔ شاید اس وقت میں اسی طرح کے کسی گروپ کے جال میں پھنس چکا تھا۔

ابھی تک میرے ساتھ ان کا رویہ جارحانہ نہیں تھا۔ جو لوگ مجھے یہاں تک لائے تھے انھوں نے بھی شاید تھوڑا بہت تشدد صرف احتیاطی تدابیر کے طور پر کیا تھا مگر مجھے نہتا اور دھان پان سا کم عمر لڑکا دیکھ کر کچھ زیادہ پیش بندی نہیں کی تھی۔ یہاں پہنچ کر بھی فی الحال مجھے ان کے رویے سے جان کا خطرہ نہیں تھا۔ مگر پھر بھی یہ سوچ کر ایک گونہ پریشانی تھی کہ یہ لوگ کون ہیں اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔

کھٹا کھٹ کی آواز آئی اور بندوقوں کے بٹ زمین پر لگے۔ فوجی جوانوں کی ایڑیوں سے زمین پر ایک دھمک پیدا ہونے لگی اور کسی نے اعلان کیا۔ "سردار اشرف بیگ...!"

میرے محافظوں نے بھی جو میرے ارد گرد کھڑے تھے اپنے سر جھکا کر آنے والے کی تعظیم کی۔ اب میں نے غار کے ایک کونے سے یا دوسرے بغلی غار کے دروازے سے ایک لمبے چوڑے، وجیہہ اور قد آور شخص کو نکلتے دیکھا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے کم نہ تھا۔ بدن کی ہڈیاں چوڑی اور مضبوط تھیں، چہرے سے ذہانت اور سفاکی دونوں عیاں تھیں، رنگ صاف، چہرہ سرخ و سپید اور جسم پر فوجی وردی پہنے، ایک طرف خنجر لگائے، دوسری طرف ریوالور اور گولیوں کی پیٹی کمر سے باندھے نپے تلے قدم رکھتا ہوا میرے بالکل سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک لفظ بولے بغیر میری طرف گہری نظروں سے دیکھا، چند لمحوں تک میرا جائزہ لیا اور پھر یکایک میرے قریب آکر میرے رخسار پر ایک بھرپور تھپڑ مارا۔ ایک تو میں کسی حملہ کے لیے تیار نہ تھا اور پھر اس کے تن و توش کا مجھ سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ یہ زناٹے کا تھپڑ اس قدر شدید تھا کہ میرا منہ پھر گیا اور منہ سے خون نکلنے لگا۔ میں نے مدافعت کی ذرا سی کوشش ہی کی تھی کہ میرے پہلو میں خنجر کی دھار چبھنے لگی۔ دونوں محافظ چوکنے ہو کر یوں تیار ہو گئے جیسے چیتا شکار پر جھپٹنے کے لیے جسم تولتا ہے۔ میری آنکھوں میں اپنی اس ذلت اور اذیت سے آگ سی دہکنے لگی مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔ پھر بھی مجھے اپنے اوپر کنٹرول رکھنا تھا۔ میں ایک عظیم قوم کا فرد تھا۔ قومی وقار سے گر کر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے دل و دماغ کی ساری کڑواہٹ ایک جملہ میں

انڈیل دی۔ "...... مسٹر اشرف بیگ میں آپ کے حسن انتظام پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں......"

اس لمحہ اشرف بیگ نے اپنے ہولسٹر سے پستول نکالا اور گھوم کر سامنے موم بتی کی لو پر فائر کیا۔ موم بتی کم از کم بیس گز کے فاصلے پر تھی۔ ایک دھماکہ سا ہوا اور میں نے دیکھا کہ موم بتی کے اس شعلہ کو گولی نے بجھا دیا۔ اسی طرح اس نے برابر کی دوسری موم بتی پر فائر جھونک مارا۔ گولی نے اس موم بتی کو بھی ختم کر ڈالا۔ میں اس کے نشانے کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"سنو لڑکے! تمھاری قوم کے لیے یہی ہمارا پیغام ہے۔ ہم تمھیں قید بھی کر سکتے ہیں اور ہمارے نشانے کبھی نہیں خطا ہوتے۔ ہم اپنے دشمن کو پہچان لیتے ہیں۔ تم نے محمد علی پاشا اور خلیفۂ اسلام کو آپس میں لڑایا۔ تم نے ترکی میں اسلامی حکومت کی جڑیں کاٹنے کے لیے جال بچھائے، اب تک حجاز میں شریف حسین کو اقتدار کی خوشبو سونگھا رہے ہو مگر یاد رکھو اشرف بیگ جیسے شیر ابھی کچھاروں میں گرج رہے ہیں۔ ہم ہر قدم پر تمھیں روکنے کے لیے خون بہائیں گے۔ جس دن سے تمھارا جہاز سویز کی بندرگاہ میں داخل ہوا تھا اسی دن سے ہم نے تمھاری ایک ایک لمحہ کی رپورٹ جمع کی ہے۔ تم نے اہرام کے اندر جانے اور لوٹ آنے کا جو ڈرامہ رچایا ہے اس سے تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو؟ تم آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کی روشنی میں کون سی درپردہ سازشوں کو شہ دینا چاہتے ہو؟ بتاؤ تمھارا مشن کیا ہے ...؟"

میں چپ رہا کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا اور نہ ہی کسی بھی طریقے سے اپنے قریب کھڑے ہوئے خنجر بکف، خوں چشم اشرف بیگ کو کسی بحث میں الجھا سکتا تھا۔

میں خاموش ہی تھا کہ پھر اشرف بیگ کی آواز گونجی۔ "...... سنو جان میلکم! میں تمھیں سچ بولنے اور سوچنے کے لیے دو گھنٹے دیتا ہوں سات بجے صبح کو تمھیں سچ یا جھوٹ اور زندگی یا موت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا اور سنو! یہاں سے بھاگنے کی کوشش تمھیں آخری سانس کے بے حد قریب کر دے گی تمھیں فی الحال کوئی سزا نہیں دی جا رہی ہے۔ تم ہمارے بارے میں جس قسم کی بھی معلومات حاصل کرنا چاہو تمھیں مل جائیں گی مگر جس دن تم نے ان معلومات کو ہمارے خلاف استعمال کرنا چاہا، تم جہاں کہیں بھی ہو گے موم بتی کے اس شعلہ کی طرح بجھ جاؤ گے...."

یہ کہہ کر وہ شخص گھوم گیا اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس چلا گیا۔ میرے قریب کھڑے ہوئے تینوں آدمیوں کی جگہ اور پانچ آدمی آ گئے اور مجھے غار کے ایک دوسرے کونے میں جو کمرہ نما تھا پہنچا دیا گیا اور ایک پلنگ پر گرا کر اس کے اطراف میں یہ لوگ چاروں کونوں پر ذرا دور دور بیٹھ گئے اور پانچواں آدمی دروازے کی طرف مستعدی سے کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر بعد میرے ہوش و حواس بجا ہوئے لیٹنے سے تکلیف کم ہوئی جسم کی دُکھن جو اونٹوں کے سفر کی وجہ سے سارے جسم کو ایک درد میں مبتلا رکھے ہوئے تھی ذرا گھٹ گئی تو میں نے خاموشی سے اپنے ذہن میں آج رات پیش آنے والے واقعات کا ازسرِ نو جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک ہفتہ ہی کے اندر اندر مصر کے تمام اخبارات و رسائل نے میرا نام دھا اچھال دیا تھا۔ بہت سے لوگوں کو میرے حلیہ، میرے گھر بار، میرے ماں باپ کا نام تک معلوم ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس ایکا ایکی شہرت سے بعض لوگوں نے یہ سوچا ہوگا کہ آخر راتوں رات اس طرح پبلسٹی ہو جانے کی کوئی خاص وجہ ضرور ہوگی۔ مصر کے حالات، خصوصاً سیاسی نقطۂ نظر سے، بے حد اہمیت کے حامل تھے مجھے ان سے زیادہ واقفیت نہیں تھی کیوں کہ اس سفر پر آنے سے قبل جو کچھ میرا مطالعہ تھا وہ صرف ہندوستان کے قدیم معبدوں، مذاہب اور ثقافتی اور تہذیبی رشتوں سے متعلق رہا تھا۔ میں مصر کو صرف اس لحاظ سے اہمیت دیتا تھا کہ وہاں سے بحرِ روم کو بحرِ ہند سے ملانے والی سوئز کنال ۱۸۶۶ء میں فرانس کے ایک انجینئر الیپ کے منصوبے سے شروع ہوئی تھی اور اب اس آبنائے نے مشرقِ بعید اور ہندوستان وغیرہ آنے جانے کی بے حد آسانی فراہم کر دی تھی اور اب مصر نہ صرف اپنی قدیم تاریخی اہمیت کی بنا پر بلکہ نہر سوئز کی بدولت بھی مقبوضات رکھنے والی تمام مغربی طاقتوں کے اقتدار کی کش مکش کا ایک اکھاڑہ بن چکا تھا۔ مگر برطانوی مفاد کو چونکہ ان مقامات کی اہمیت کا بے حد احساس تھا اس لیے جبرالٹر سے سنگاپور تک تمام بحری راستوں پر اس کا کنٹرول قائم رہنا نہایت فطری امر تھا اور یہی وجہ تھی کہ نپولین کے حملے کے بعد مصر میں طوائف الملوکی بڑھی تھی تو آہستہ آہستہ برطانوی اثرات بھی بڑھتے چلے گئے۔ مصر جو پہلے خلافتِ عثمانیہ کا حصہ تھا اب ایک آزاد ملک تھا۔ سب کچھ کیسے اور کیوں کر ہوا اور کون لوگ ہیں جو اس وقت مصر اور برطانیہ کے تعلقات کو اپنی مصلحتوں کے خلاف سمجھتے ہیں اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ نہ ہی محمد علی پاشا کے متعلق کچھ زیادہ معلومات

تھیں۔ بس یہ معلوم تھا کہ محمد علی پاشا مصر پر چالیس سال حکومت کرنے کے بعد ۱۸۵۳ء میں وفات پا گیا تھا اور اب اسی کی اولاد مصر پر حکمراں تھی۔ اشرف بیگ بھی نام سے ترک لگتا تھا مگر میں اس کے متعلق بالکل اندھیرے میں تھا۔ میں نے سوچا کہ سب سے پہلے مجھے اپنے دشمن کے متعلق پورا علم ہونا چاہیے۔ تب ہی میں اس کے آئندہ اقدامات اور اپنے لائحہ عمل کے متعلق کچھ طے کر سکوں گا۔

"کیا تم مجھے محمد علی پاشا کے متعلق کچھ بتا سکو گے اور یہ بھی کہ اشرف بیگ نے اس وقت خلیفۂ ترکی، اور مصر اور برطانیہ کے حوالے کیوں دیے ہیں.... اور یہ بھی کہ اشرف بیگ کون ہے؟"

"جان میلکم! چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم تاریخ کے طالب علم رہے ہو۔ کالج اور اسکول میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوتے رہے ہو۔ تم مصر میں ایک ہفتہ سے مقیم ہو۔ سلطان مصر سے بھی ملاقات کر چکے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم اتنے بے وقوف ہیں کہ یہ یقین کر لیں گے کہ تمھیں اتنی معمولی باتوں کا بھی علم نہ ہوگا...."

"میں یسوع مسیح کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ واقعی مجھے ان باتوں کا کوئی علم نہیں ہے۔ میں تاریخ کا ایک اچھا طالب علم ضرور ہوں مگر قدیم تاریخ کا جدید تاریخ کا نہیں، برائے مہربانی مجھے میرے سوالوں کا جواب ضرور دو۔ جب تک مجھے ان باتوں کا علم نہیں ہو جائے گا میں تم سے کسی قسم کا تعاون کرنے سے معذور ہوں۔"

اب ان لوگوں نے عربی میں ایک دوسرے سے کچھ بات چیت کی اور پھر ایک نے مجھے مخاطب کر کے کہا.....

"سردار اشرف بیگ نے ہمیں اس بات سے منع نہیں کیا ہے اور یوں بھی دو گھنٹے تمھارے پاس ہیں، اس لیے ہم تمھیں اپنے بارے میں ضرور بتائیں گے۔"

اور پھر انھوں نے مجھے واقعی مصر اور خلافتِ عثمانیہ کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ محمد علی پاشا اور اس کی اولاد اور اس کے بعد مصر کے حالات کے بارے میں بھی اطلاعات مجھے دیں۔

مختصراً ان کے بیان سے مجھے یہ پتا چلا کہ مصر ۱۸۰۰ء تک خلافتِ عثمانیہ کا ایک جزو تھا اس کے بعد اس علاقے میں نپولین بوناپارٹ نے حملہ کیا اور غزہ کے اہرام تک اس کی رسائی ہوئی۔ وہ کافی دنوں یہاں رہا۔ مگر اس کا ارادہ مصر میں مستقل طور پر فرانسیسی قبضہ

برقرار رکھنے کا نہیں تھا۔

۱۸۰۵ء میں جب نپولین بونا پارٹ واپس لوٹ کر فرانس میں اپنی شہنشاہیت کو مضبوط کر رہا تھا، مصر میں پریشان حالی اور ابتری کی صورت پیدا تھی۔ اس لیے کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کے خلاف یہاں نفرت کے بیج بو گیا تھا۔ خلافت مصریوں کے تحفظ میں ناکام رہی تھی۔ چنانچہ یہی عدم تحفظ کا احساس مصریوں کی قومیت کا جواز بن گیا۔ پھر خلافتِ عثمانیہ کے ترک غلام جن کو مملوک کہا جاتا تھا اور جو ایک لمبی مدت سے فوج کے عہدوں پر فائز تھے، آہستہ آہستہ اپنے حسنِ قابلیت سے مصر میں ایک زبردست قوت بن گئے تھے۔ مملوک زیرک اور شجاع بھی تھے اور سفاک اور لالچی بھی۔ انھوں نے مصر کا انتظام خلیفہ کے نائبین کی حیثیت سے سنبھالا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خود سر اور بڑی حد تک مطلق العنان بن گئے تھے۔ مقامی مصری آبادیوں کو جن میں ۱/۱۵ قبطی عیسائی تھے اور ۱۴/۱۵ مسلمان تھے انھوں نے بے حد دبایا، فلاحین (مزارعوں) کو غلاموں سے بھی بدتر کر دیا، ان کے حقوق اور ان کے اختیارات ختم ہو چکے تھے اور مملوک سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے تھے۔

یہی زمانہ تھا یعنی ۱۸۰۵ء کے لگ بھگ کا کہ محمد علی پاشا خلیفۂ ترکی کی فوج کے کپتان کی حیثیت سے مصر پہنچا۔ محمد علی ۱۷۷۰ء میں البانیہ کے ضلع کاولا میں پیدا ہوا۔ وہ ایک معمولی کاشتکار کا بیٹا تھا۔ تنومند، جفاکش اور ستاروں پر کمند ڈالنے کے خواب دیکھنے والا۔ جب اس کا دل کھیتوں اور کھلیانوں سے اُچاٹ ہو گیا تو البانیہ میں جو اس وقت سلطنت ترکی کا ایک حصہ تھا فوجی بھرتی کے دفتر جا پہنچا اور وہاں عارضی فوج کے دستوں میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ تیر و تلوار، توڑے دار بندوق، طمنچہ، گھوڑے کی سواری، نشانہ بازی اور مردانہ کھیلوں میں اس کا انہماک مثالی تھا۔ خطروں میں کھیلنے سے اُسے لطف آتا تھا۔ دوستوں کا احسان مند رہتا تھا۔ غرور و تکبر اسے چھو تک نہیں گیا تھا۔ شروع شروع میں اپنی ذات کے علاوہ اُسے دنیا کی ہر چیز سے اُلفت تھی کچھ کر جانے اور کچھ کر کے مر جانے کی آرزو تھی۔ اُسے لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لینے کے ہُنر آتے تھے۔ انسانی جذبوں کو سدھانے اور ان کی تربیت و تنظیم کی خداداد صلاحیت تھی۔ اُسے اقتدار کا شوق تھا۔ وہ خود کو دوسروں سے بلند سمجھتا تھا اور حکم دینے اور حکم منوانے کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ بروقت فیصلے کرتا تھا، معاملہ فہم تھا اور بہت دور تک کی سوچ لیتا تھا۔ البانیہ کے مسلمان

چونکہ حکمران ترکوں کے محکوم تھے اس لیے روم کی کے دروازے اسی وقت ان پر کھلتے تھے جب بابِ عالی یعنی شاہی محل کے مکین ان پر مہربان ہوتے تھے۔ محمد علی نے بھی خلافت کا قرب قسمت آزمائی کے لیے اختیار کیا تھا۔

محمد علی کی مقناطیسی اور سیماب صفت طبیعت نے اُسے بہت جلد دوسروں سے ممتاز کر دیا۔ جوہر شناس نظروں نے اس کی پیشانی پر عزم وہمت اور کامرانی وخوش نصیبی کی جھلک دیکھ لی تھی وہ ہمیشہ جان ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا۔ جو مہم اور جو مرحلہ دوسروں کو ناممکن نظر آتا تھا محمد علی اُسے اپنی قوت اور تدبر سے بڑی آسانی سے حل کر لیتا تھا۔ جوں جوں وہ شاہی محل کی نظروں میں بلند تر ہوتا گیا، اس کے گرد بہت سے لوگ جمع ہوتے گئے چڑھتے سورج کی پوجا یوں بھی عام ہوتی ہے مگر محمد علی واقعی وہ سورج تھا جو ترانوے سال کی عمر تک بڑی تابندگی سے جگمگاتا رہا۔ ۱۸۸۳ء میں اس کا انتقال ہوا تو وہ اس وقت ایک مطلق العنان بادشاہ بن چکا تھا۔ ایک معمولی سپاہی کے درجے سے مصر کی بادشاہی تک اس کے عروج کی داستان گویا افسانوی حد تک ڈرامائی تھی۔

نپولین کے حملوں کے بعد مصر کی ابتری کو مملوک افسروں اور فوجیوں نے اور بڑھا دیا، بددلی عام ہو گئی زراعت پیشہ فلاحین اپنی زمینوں پر اگائے ہوئے اناج کے ایک ایک دانے کو ترستے تھے مگر ان کو کچھ نہ ملتا تھا۔ گندم اور کپاس مصر کی بہت پرانی اور اہم فصلیں تھیں مگر ان کی پیداوار گھٹ کر کم سے کم ہو گئی اور مملوک اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے ملک کو غربت کے سمندر میں ڈوبتا دیکھتے رہے۔ بابِ عالی میں روزانہ گمنام خط پہنچتے اور کانوں کان اور سینہ بہ سینہ چلتی ہوئی شکایات آخر کار خلیفہ تک جا پہنچیں مگر مملوک سے ٹکر لینا ممکن ہی نہ تھا۔ یہ آذربائیجان، ترکستان اور افریقہ کے حبشی قبائل کے آزاد کردہ غلام تھے جو شجاعت میں بے نظیر تھے اور خلیفۂ اسلام کے بازوئے شمشیر زن کا کام کرتے تھے۔ ان کو ناراض کرنا خلیفہ کے لیے خود اپنی سلطنت کی بنیادیں ہلا دینے کے مترادف تھا۔ آخر کپتان محمد علی کو البانیہ کے ایک دستے کے ساتھ مصر بھیجنے کی تجویز طے کی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ آہستہ آہستہ مصر میں مملوک کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے گروپ بنا دیے جائیں تاکہ مملوک ادھر اُدھر الجھے رہیں اور پھر اسی مناسب موقع پر بدنام افسروں کو قرار واقعی سزا دینے میں کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔

کپتان محمد علی مصر پہنچا تو اس کے ساتھ تین ہزار البانوی مسلمان فوجیوں کا ایک

دستہ بھی ہم رکاب تھا۔ محمد علی نے سب سے پہلے نہایت شائستگی اور نرم روی کا مظاہرہ کیا اور مملوک افسروں سے دوستانہ تعلقات پیدا کیے۔ وہ ان کی ہر بات کو تسلیم کر لیتا تھا اور ان کے احکام کو مان لیتا تھا اس نے اپنی پوزیشن پر ان کے اقتدار کو کوئی چیلنج نہ کیا۔ دو تین سال کے اندر ہی اندر مملوک اس پر بے حد اعتماد کرنے لگے۔ وہ اس کی شجاعت، اس کے حوصلوں اور تدبر کی قدر کرتے تھے مملوک نے کئی بار اس بات کی کوشش کی کہ محمد علی کے البانوی فوجی منقسم ہو کر مملوک کے دستوں کے ساتھ مختلف چھاؤنیوں میں بٹ جائیں مگر محمد علی اس پر کبھی تیار نہ ہوا لیکن ساتھ ہی اس کا رویہ ہمیشہ نہایت دوستانہ اور منکسرانہ رہا۔ لوگ اس پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کرتے گئے۔

اب محمد علی سلطانِ ترکی اور مملوک کے درمیان پوری طرح حائل ہو چکا تھا۔ دونوں قوتیں اس کی اہمیت پہنچاننے لگی تھیں۔ فلاحینِ مصر بھی اس کے گرویدہ ہو چکے تھے کیوں کہ اس نے کئی بار اپنے خاص خزانے سے فلاحین کی مدد کی تھی۔ وہ ان کے واجبات بھی اکثر ادا کر دیا کرتا تھا۔ مصر کا والی جسے پاشا کہا جاتا تھا وہ بھی بڑی حد تک محمد علی کی اہمیت، قوت، انسان دوستی اور اس کی شجاعت کا معترف ہو چکا تھا۔ روز و شب یوں ہی گزرتے گئے اسی دوران محمد علی نے کچھ زرخیز علاقوں کی ضلع داری بھی حاصل کر لی تھی جہاں وہ پاشا کے نمائندے کے طور پر ٹیکس جمع کرتا تھا اور شاہی خزانہ کو باقاعدہ پوری رقم کا حساب دیا کرتا تھا۔ اس کے زیرِ انتظام علاقوں میں فلاحین کی حالت سدھرنے لگی، زراعت کی طرف توجہ اور کاشتکاروں کی لگن اور محنت نے بہت جلد ان علاقوں کو مصر کی خوش حال ترین آبادی بنا دیا۔ محمد علی کا رویہ انصاف کے معاملے میں سخت گیر اور انتظامی معاملات میں ہمدردانہ تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی فوجی طاقت بھی بڑھا ڈالی اور قاہرہ کے قرب و جوار میں ایک وسیع علاقہ میں اپنے ہمدرد اور ساتھیوں کی ایک منظم جماعت پیدا کر لی۔ آخر مملوک اسے اپنا حریف گرداننے لگے کیوں کہ ان کے زیرِ انتظام علاقوں سے لوگ محمد علی کے علاقوں کی طرف جوق در جوق منتقل ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے پاشا کے کان محمد علی کے خلاف بھرنے شروع کر دیے مگر محمد علی نے کبھی بھی پاشا کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا بلکہ مملوک کے اقتدار کے خلاف پاشا کو محمد علی ہمیشہ ایک مضبوط سہارا نظر آتا تھا۔ چنانچہ پاشا نے محمد علی کو اعتماد میں لیا۔ وہ خود بھی مملوک افسروں اور فوجیوں کے غرور و تکبر سے تنگ آ چکا تھا۔ سارا مصر جانتا تھا کہ حکومت پاشا کی نہیں بلکہ مملوک کی

ہے۔ چنانچہ پاشا بھی ان سے چھٹکارا پانے کی تدابیر سوچ رہا تھا۔ محمد علی اس کا بہترین جرنیل تھا اور ساتھ ہی اس کو عوام کی مقبولیت بھی حاصل تھی۔ چنانچہ قاہرہ کے قریب ایک پہاڑی قلعہ میں مملوک فوجیوں نے ایک بڑی میٹنگ کا اہتمام کیا۔ جس میں پاشا اور محمد علی سے بیک وقت چھٹکارا پانے کی کچھ تجاویز زیر غور آنے والی تھیں۔ ۱۸۱۲ء میں یہ تاریخ ساز واقعہ رونما ہوا تھا۔ محمد علی کو پاشا کی حمایت حاصل تھی ہی، اس نے نہایت جرأت و بیباکی سے اس پہاڑی قلعے کی طرف کوچ کیا اور تن تنہا اس قلعے کی فصیل تک جا پہنچا۔ اس کے تمام ساتھی بظاہر نہتے تھے اور وہ صلح کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے۔ محمد علی مملوک کی اس کاؤنسل کے سامنے جا پہنچا اور وہاں اس نے اپنی دوستی کا اعادہ کیا۔ اپنی رقابت اور اپنی خدمات یاد دلائیں۔ مملوک زمینداروں اور فوجی افسروں کو مخاطب کر کے کہا۔

"اگر آپ لوگ مجھے اپنا حریف سمجھتے ہیں تو یہ میری بد قسمتی ہے۔ کتنی جنگیں میں نے آپ کے دوش بدوش لڑیں اور کس جگہ میں نے آپ کے احکامات سے سرتابی کی ہے۔ میں اپنے دوستوں کو کھونا نہیں چاہتا اگر آپ مجھے کوئی خطرہ سمجھتے ہیں تو میں واپس البانیہ جانے کے لیے تیار ہوں۔"

مملوک تو خدا سے یہی چاہتے تھے۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ بغیر خون خرابے کے ان کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ چنانچہ بچھڑے ہوئے گلے ملنے لگے، پرانے قصے اور پرانی باتیں دوہرائی جانے لگیں، فوجی کاؤنسل ایک محفلِ رقص و سرور میں بدل گئی اور جب یہ محفل ناؤ نوش اور مجلس چنگ و رباب اپنے عروج پر تھی، خم لنڈھائے جا رہے تھے تو محمد علی کے ایک اشارے پر چھپے ہوئے خنجر نکل آئے اور آن کی آن میں مملوک اپنے پچاس مقتدر فوجیوں، افسروں اور جاگیرداروں کو خاک و خون میں تڑپتا دیکھ رہے تھے محمد علی کے البانوی دستے جو باہر چھپے تھے وہ بھی اندر گھس آئے اور لاشوں پر لاشے گرنے لگے۔ شراب نے حواس معطل کر ہی دیے تھے، مقابلہ کیا خاک ہوتا، مملوک کا اقتدار صرف چند گھنٹوں میں تہس نہس ہو گیا۔ جو مملوک اِدھر اُدھر بچ رہے تھے وہ محمد علی کی قوت سے بے حد مرعوب ہو چکے تھے اور امان طلب کر رہے تھے۔

چند ہی ماہ میں مصر کے عوام اور پاشا نے یہ محسوس کیا کہ اب مملوک تو موجود نہ تھے مگر وہاں محمد علی جیسا ایک لائق منتظم اور بہادر شخص موجود تھا جو لب اقتدار کا دیوانگی کی

حد تک بھوکا ہو چکا تھا۔ حالات محمد علی کے حق میں تھے۔ محمد علی مملوک جیسے طاقتور گروپ کو ختم کر چکا تھا تو پاشا اس کے سامنے ایک حقیر تنکے سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ ۱۸۱۳ء میں محمد علی نے پاشا کو برطرف کر دیا اور مصر کے پاشا اور خلیفۂ ترکی کی طرف سے مصر کا والی مقرر ہو گیا۔ اس کا پورا دور مصر کی ترقی و خوشحالی اور عروج کا دور تھا۔

محمد علی نے بحری فوج کو ترقی دی۔ نپولین کی تنظیم کی طرح اپنی فوج کو منظم کیا۔ اسکندریہ میں شپ یارڈ تعمیر کرائے۔ اپنی فوج کی تعداد کو کئی گنا بڑھایا اور فلاحین پر سے غیر ضروری ٹیکس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ ان کی پوری سرپرستی کی اور ایک سخت نظامِ عدل قائم کیا۔

قاہرہ میں ایک پہاڑی پر ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرنے کے علاوہ بہت سے فلاحی کام کئے۔

اب محمد علی کی بڑھتی ہوئی قوت سے خود سلطان ترکی خوف زدہ تھا۔ محمد علی اب خلیفہ کے احکامات کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس چپقلش میں خلیفہ کی سرحدی فوجوں کی ایک پلٹن محمد علی کے گشتی دستے سے اتفاقاً ٹکرا گئی۔ محمد علی کو تو جیسے بہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اپنی فوجوں کو فلسطین کے راستے شام پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ ایک امنڈتا ہوا سیلاب تھا۔ محمد علی نے فلسطین، شام، لبنان اور اُردن اور ایشیائے کوچک کے تمام علاقوں سے خلیفۂ ترکی کی فوجوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ اب اس کی فوجیں قسطنطنیہ کی فصیلوں پر پہرہ دے رہی تھیں۔ شہر ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ صرف ایک حملہ محمد علی، کو بابِ عالی کا مکین بنا سکتا تھا۔ ایسے وقت میں روس، برطانیہ اور فرانس نے محمد علی کو الٹی میٹم دیا کہ اگر قسطنطنیہ پر حملہ کیا گیا اور صدیوں کی اسلامی خلافت کو تاراج کرنے کی کوشش کی گئی تو محمد علی کو ان تینوں بادشاہوں کی متحدہ فوجوں سے بیک وقت مقابلہ کرنا ہوگا۔ محمد علی نے اس دھمکی کے اثرات کو سمجھ لیا۔ چنانچہ وہ اناطولیہ سے واپس لوٹ گیا۔ ایک معاہدہ قرار پایا جس کی رُو سے محمد علی کو خلیفہ نے خلافت کے موروثی وزیر کی حیثیت دے کر نوبیا، مصر، سینائی، خوردوخان اور دارفور کے علاقوں کی ولایت بخش دی اور یورپ کی منڈیوں سے صنعت و حرفت کی اشیاء پہنچنے کے لیے کارخانے لگوائے۔ لمبے ریشے کی کپاس کی کاشت شروع کی۔ نہروں کے جال بچھوائے۔ مصرِ جدید کے بانی کی حیثیت سے محمد علی بڑی شان و شوکت سے حکومت کرتا رہا۔ اس کا تمام عہد خوش حالی، جنگی فتوحات اور ارضِ مصر کی زرعی اور صنعتی ترقی کے لیے بے مثال تھا۔ اپنی زندگی ہی میں محمد علی نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو اپنا جانشین بنا دیا تھا اور اُسے خدیو کے خطاب سے نوازا تھا۔ لیکن ابراہیم پاشا

محمد علی پاشا کے انتقال سے سات ماہ قبل ۱۸۵۳ء میں وفات پا گیا اور اس کے بعد محمد علی کا پوتا عباس اول تخت نشین ہوا۔ مگر محمد علی کے انتقال کے بعد محمد علی کے سب سے چھوٹے فرزند محمد سعید نے سازش کر کے عباس اول کو قتل کرا دیا۔ محمد سعید نے نو سال تک حکومت کی۔ اس کے بعد محمد سعید کے بھتیجے اور ابراہیم کے بیٹے اسماعیل نے تاج پہنا۔ یہی وہ پاشا ہے جس کے زمانے میں سوئز کنال کی تعمیر ہوئی۔ قصرِ عابدین بھی اس نے تعمیر کیا۔ جو بعد میں شاہ فاروق کی عیاشیوں کا مرکز بنا اور اسی بنا پر بہت مشہور ہوا۔ اسماعیل کا انتقال ۱۸۹۵ء میں جلاوطنی کے دوران ہوا اور یہی وہ زمانہ ہے جب مصر کی مالی قوت گھٹ گئی اور مصر نے ادھر اُدھر سے قرضہ لینا شروع کیا۔ اسماعیل کی شاہ خرچیاں مشہور تھیں اس کی اقتدار، دولت اور جنس کی بھوک کبھی کم نہ ہوتی تھی۔ اس کے حرم میں تین ہزار سے زائد داشتائیں تھیں اور غلاموں اور کنیزوں کی فوج اس کے علاوہ تھی۔ جب سوئز کنال کی افتتاحی تقریب منعقد ہو رہی تھی تو اسماعیل پاشا نے بے شمار دولت خرچ کی۔ اس نے گیسا پوردی کو ایک ڈرامہ لکھنے کے لیے ایک بھاری رقم دی جس نے آئیضا کے نام سے ایک مشہور اوپیرا لکھا۔ اس اوپیرا کو افتتاحی تقریب کے موقع پر پیش کرنے کے لیے ایک خاص اوپیرا مغربی طرز پر تعمیر کرایا گیا اور اس کا ورلڈ پریمیئر کیا گیا۔ جس میں دنیا کی مشہور شخصیتوں کو مدعو کیا گیا۔ فرانس کی ملکہ یوجینا کو بطورِ خاص مدعو کیا گیا۔ اسماعیل پاشا اس کے حسن سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے ملکہ یوجینا کے قیام کے لیے ایک علیحدہ محل تعمیر کرایا۔ اس کے علاوہ اس محل سے غزہ کے اہرام تک جانے کے لیے ایک عمدہ سڑک الگ سے تعمیر کرائی گئی۔ قصرِ عابدین میں ایک نیا ونگ تعمیر کرایا۔ اس میں مہمانوں کے ٹھہرنے کے لیے وسیع و عریض کمرے، مختلف ہال اور کھیلوں کے میدان نیز نہانے کے تالاب بنائے گئے۔ اس مہمان خانے میں دنیا جہان سے زیبائش و آرائش کی چیزیں لا کر رکھی گئیں اور یہ تمام تعمیرات جن پر اُس وقت کے بیس لاکھ مصری پاؤنڈ یعنی اس وقت کے ایک کروڑ ڈالر خرچ ہوئے۔ مہمانوں کے لیے صرف ایک ہفتہ استعمال کی گئیں۔ اس کے محل میں عورتوں کا عمل دخل اس قدر بڑھ گیا تھا کہ نظامِ حکومت عورتوں کی آپس کی رقابتوں اور سازشوں سے بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اسماعیل پاشا کی گرفت حالات پر کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ مگر اس کے اخراجات میں کوئی کمی نہ آئی۔ افتتاحی تقاریب کے بعد سوئز کنال کی کھدائی وغیرہ شروع ہوتے والی تھی۔ نہر کی تعمیر کا معاہدہ اسماعیل

کے پیش رو، محمد علی کے بیٹے، محمد سعید پاشا کے دور میں ہوا تھا۔ فرانس کے پولیٹیکل ایجنٹ کا بیٹا ڈی لیسپ محمد سعید کا عزیز دوست تھا۔ دونوں بچپن ہی سے ساتھ رہے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں جب سعید خدیو مصر بنا تو اس وقت تک ڈی لیسپ اپنی تعلیم مکمل کر کے دوبارہ مصر واپس آ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں اس نہر کا منصوبہ بہت پرانا تھا اور جب بھی وہ اسکندریہ کی بندگاہ پر آتا تھا تو محمد سعید سے کہا کرتا تھا کہ تمہارے پاس دنیا کو مختصر کرنے کی کنجی ہے مگر تمہاری قوم اس طرف دھیان نہیں دیتی۔ یہ ایک ایسا خزانہ ہوگا کہ تم اس کو کبھی خالی نہ کر پاؤ گے۔ شروع شروع میں تو محمد سعید اس کی باتوں پر ہنستا تھا اور دو سمندروں کو باہم ملا دینے کی بات مذاق میں اڑا دیا کرتا تھا۔ وہ ڈی لیسپ سے اکثر کہا کرتا کہ مسلمانوں کے پہلے گورنر عمرو بن العاص نے اس قسم کی نہر کی تعمیر کے لیے حضرت عمرؓ کو تجویز پیش کی تھی۔ انہوں نے یہ کہہ کر اس تجویز کو رد کر دیا تھا کہ اگر یہ نہر بن گئی تو افرنگ تمہاری عورتوں اور بچوں کو خانہ کعبہ سے اٹھا کر لے جایا کریں گے۔

جب محمد سعید بادشاہ بن گیا تو اس نے اپنے دوست ڈی لیسپ کو اپنا مقرب خاص بنا لیا جو اس وقت تک ایک تعمیراتی انجینئر بن چکا تھا۔ اب اس نے اس پروجیکٹ پر باقاعدہ سروے کیا اور اس کا مکمل منصوبہ محمد سعید کو پیش کیا۔ شروع میں برطانوی حکومت نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور اپنے حلیف خلیفۂ اسلام پر زور ڈالا کہ اس کی تعمیر کی اجازت نہ دے کیونکہ برطانوی حکومت کا خیال تھا کہ اس نہر کی تعمیر سے مصر فرانس کی نوآبادی بن جائے گا اور اس کے زیر اثر چلا جائے گا۔ یہ کشمکش کئی سال تک چلتی رہی۔ آخر کار خلیفہ نے ۱۸۶۶ء میں اس کی منظوری دے دی۔

ایک معاہدہ کی رو سے جو اس کینال کی تعمیر کے وقت پیش آیا کینال کی زمین اور اس کے اطراف کی زمین پر ننانوے سال کی لیز حکومتِ مصر کی جانب سے کمپنی کو عطا ہوئی۔ یہ لیز ۱۹۶۵ء میں ختم ہوئی تھی۔ اس کمپنی کو نہر کی تعمیر کے لیے مزدوروں اور غلاموں کی تعداد کا ۴/۵ حصہ حکومتِ مصر کو مہیا کرنا تھا اور بعد میں پندرہ فیصد آمدنی اس کو حاصل ہونی تھی۔ پچھتر فی صد کمپنی کے مختلف شیئر ہولڈرز کو جانا تھی۔ بقیہ دس فیصد کمپنی کے پروموٹرز (بنیادی منصوبہ ساز افراد) کو حاصل ہونے تھے۔ نہر بننے کے بعد ہی برطانوی حکومت کو اندازہ ہو گیا کہ اس نے تعمیراتی کمپنی کے حصص نہ خرید کر ایک عظیم غلطی کی تھی۔ برطانیہ اب اس تاک میں تھا کہ کسی طرح مساوی کنٹرول حاصل کیا جائے

جس کے لیے ضروری تھا کہ نہری کمپنی کے کچھ حصے ضرور خرید لیے جائیں۔ ادھر جب اسماعیل کی شاہ خرچیاں بڑھنے لگیں اور خزانہ خالی ہونے لگا تو برطانوی سفیر نے یہ تجویز پیش کی کہ اسماعیل کینال کے اپنے حصص حکومتِ برطانیہ کو ایک خطیر رقم کے عوض فروخت کر دے۔ ادھر فرانس کے بینکرز نے بھی اسماعیل کو تجویز پیش کی کہ وہ اپنا پندرہ فی صد سالانہ آمدنی کا حصہ فرانسیسی بینکروں کو بیچ دے۔ اسماعیل پاشا جو شاہ خرچیوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور جس کو اپنی جھوٹی شان و شوکت قائم رکھنے کے لیے ہر وقت دولت کی ضرورت تھی اس تجویز کو فوراً مان گیا اور دس کروڑ مصری پاؤنڈ کے عوض فرانس اور برطانیہ کو اپنے پورے اختیارات دے بیٹھا۔ اس طرح مصر کو جس نے نہر کی تعمیر میں پچاس فیصد سے زیادہ حصہ لیا تھا اور زمین بھی فراہم کی تھی اب نہر کے تمام اختیارات دوسروں کو دینے پر مجبور ہونا پڑا۔

برطانوی اور فرانسیسی حصہ داروں نے رقم ادا کر دی اور ساتھ ہی ساتھ شاہ اسماعیل کو اخراجات پورا کرنے کے لیے ایک خطیر رقم بطورِ قرض بھی پیش کی۔ جب قرضہ مصر پہنچا تو اس کے ساتھ ہی نہر کی حفاظت کے لیے برطانوی فوجی مشن اور سینکڑوں افراد کا عملہ بھی مصر جا پہنچا۔ برطانیہ اور فرانس کی دلیل یہ تھی کہ اب یہ نہر اُن کی ملکیت ہے۔ لہٰذا اس ملکیت کی حفاظت بھی ان ہی کا فرض ہے۔ جب مصر میں غیر ملکی فوجی آنے لگے تو اسماعیل کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے اس کی سخت مخالفت کی مگر اب تو معاہدہ ہو چکا تھا اور برطانیہ نے شہہ مات دے دی تھی۔ چنانچہ معاملہ خلیفۃ المسلام سلطانِ ترکی کے سامنے پیش ہوا جس نے برطانوی اور فرانسیسی اثرات کے تحت ان ہی کے حق میں فیصلہ دیا۔ برطانوی سیاست بھی اب مصر میں سرگرم ہو گئی۔ اسماعیل کو تخت سے اُتار کر اس کے بیٹے توفیق کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ اور اسماعیل کو جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ ۱۸۹۵ء تک قسطنطنیہ میں سلطانِ ترکی کے مہمان کی حیثیت سے مقیم رہا اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔

اب توفیق کی یہ بدقسمتی تھی کہ ملک میں غیر ملکی عناصر کے خلاف بہت سی محبِ وطن تحریکیں شروع ہو گئیں اور ایک قومی انقلاب کی کوشش بھی کی گئی۔ جس کے لیے اس نے برطانوی فوجوں سے جو سوئز کے علاقوں میں مقیم تھیں مدد لی۔ ان کی مدد سے یہ انقلاب کچل دیا گیا۔ اور بظاہر مصر کی قومی تحریک ختم ہو گئی۔ دوسرا کامیاب انقلاب کرنل ناصر کے زمانے میں ۱۹۵۵ء میں آیا تھا۔ اب توفیق کی مستقل حفاظت کے لئے

برطانوی حکومت نے سر اولین بیرنگ کو جو بعد میں لارڈ کرومر کے نام سے مشہور ہوا بھیجا۔ یہ برطانیہ کا قونصل جنرل تھا۔ محل کے قریب ہی رہتا تھا۔ اس کی پشت پر برطانوی فوجی طاقت تھی اور مصر کے سیاہ وسفید پر اس کا اختیار تھا۔ اس نے مصر کے معاملات کو اپنی انتظامی صلاحیتوں سے چلانا شروع کیا۔

گو یہ شخص ایک غیر ملکی تھا مگر اس نے مصر میں فلاح عامہ کے بہت سے کام کیے۔ اسوان پر پہلے بند کی تعمیر کی۔ نہری نظام کو درست کیا۔ مصری انجینئروں کی ایک ایسی ٹیم تیار کی جو پانی کی نکاسی اور استعمال کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ اس نے کوردی (جبری محبت) کو ختم کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ جبری محنت اور ٹیکس کی وصولی کے لیے کورباش (کوڑوں کی سزا) کو بھی موقوف کر دیا۔ اس نے کپاس کی فصل میں تین گنا اضافہ کیا۔ گنے اور شکر کی پیداوار دس گنا بڑھا دی۔ جب یہ شخص ریٹائر ہوا تو اس وقت مصر کی سالانہ آمدنی تین کروڑ نوے لاکھ پاؤنڈ سے بڑھ کر اکتیس کروڑ پچاس لاکھ پاؤنڈ تک جا پہنچی تھی اور مصر کے تمام قرضے ختم ہو چکے تھے۔ توفیق کے بعد اس کا بیٹا عباس حلیمی ۱۹۱۴ء میں تخت نشین ہوا تھا۔

میرے محافظ مجھے سناتے رہے اور میں سب کچھ سنتا رہا۔

مجھے یہ سب کچھ انہی محافظوں کے ذریعے معلوم ہوا تھا۔ مصر کے متعلق اور جدید مصر کے بانی محمد علی پاشا کے متعلق ان کے جذبات نہایت دلچسپ تھے۔ انہوں نے محمد علی کو ایک بت بنا کر اپنے تصور میں بٹھا لیا تھا۔ گو اس کے انتقال کو پچاس سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا مگر ابھی تک وہ ان کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ مصری لوگ خلیفۂ لسلام اور باب عالی یعنی سلطان عبداللہ کے شاید خلاف تھے۔ مگر ان کا اندازہ یہ تھا کہ خلیفۂ لسلام کے گرداگرد جو لوگ اور جو درباری جمع ہیں وہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ویسے وہ بذات خود کچھ ایسا برا بھی نہیں ہے۔

باب نمبر ۷

میں اس گفتگو سے یہ اندازہ تو لگا چکا تھا کہ برطانوی اقتدار، برطانوی اثرات، ڈپلومیسی جس انداز سے مصر میں داخل ہوئی وہ سب کچھ مصر کے عوام کو ناپسند تھا۔ سلطنت ترکیہ سے محمد علی پاشا نے نجات دلوادی تھی مگر اس کے وارث مصر کی خوش حالی اور ترقی کی رفتار کو برقرار نہ رکھ سکے اور سوئز کنال کے بن جانے کے بعد برطانیہ کا دائرہ کار مصر کے دربار اور معاشیات پر بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ جب برطانیہ نے نہر کی کمپنی کے حقوق خریدے تو اس کا عمل دخل بہت بڑھ گیا اور جذبۂ قومیت جسے محمد علی نے ہوا دی تھی پھر سے سلگنے لگا۔ شاید اشرف بیگ بھی اس سلگتی ہوئی آگ کی کوئی چنگاری تھا۔ جو کہیں کہیں چنائیں دیکھا رہی تھی۔

"کیا تم اشرف بیگ کے بارے میں کچھ اور بتا سکو گے؟"

"ادب سے نام لو.... سردار کہو۔ سردار اشرف بیگ...."

"ہاں.... سردار اشرف بیگ...."

پھر ان محافظوں نے مجھے اشرف بیگ کے متعلق بھی بہت سی باتیں بتائیں۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ سردار اشرف بیگ اور اس کے بھائی کو کم عمری ہی سے سلطان عبدالحمید نے محل میں پرورش کے لیے بلالیا تھا وہ شروع ہی سے ایک ہونہار بچہ تھا۔ اس کے ماں باپ کاکیشیا کے رہنے والے تھے۔ جب جنگِ بلقان شروع ہوئی تو روسی علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں پر بہت مظالم ڈھائے گئے۔ کیوں کہ شبہ یہ تھا کہ یہ لوگ خلافتِ عثمانیہ کے حلیف ہیں۔ اسی ظلم و ستم سے تنگ آکر بہت سے قدیم ازبکی اور کاکیشی قبیلے سلطنتِ ترکیہ کے مختلف علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ اشرف بیگ اور اس کا بھائی استنبول میں آکر بس گئے۔ بابِ عالی میں باریابی ہوئی۔ اشرف بیگ کا باپ اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ سلطان عبدالحمید نے اُسے عزت و اکرام سے نوازا اور اسے اپنے پرند خانے کا ناظم بنادیا۔ اشرف بیگ کی آمد و رفت محل میں شروع ہوگئی۔ اشرف بیگ سات سال کا تھا۔ اس نے روزہ رکھا۔ اس کے باپ نے اس دن بھی حسبِ معمول اس کو گھوڑ سواری اور

پستول کے نشانے کی تربیت دی۔ سلطان کو اطلاع ملی کہ اشرف بیگ نے پہلا روزہ رکھا ہے تو اس نے حکم دیا کہ اشرف بیگ کو پہلا روزہ شاہی محل میں افطار کرایا جائے۔ اشرف بیگ باوجود اس بات کے کہ وہ بچہ تھا اور دن بھر فوجی مشق کر چکا تھا اور شاہی مہمان بھی تھا، کمال صبر و تحمل اور نہایت استقامت کے ساتھ وقت گزارتا رہا اس نے خلیفہ کے حضور میں باپ کے حکم پر نذر پیش کی۔ پہلے تمام روزہ داروں کے سامنے افطار رکھی اور پھر اس دوران شہزادوں کی تکریم اور حسبِ مراتب ان کی میزبانی بھی کرتا رہا اور خدام اور نوکر غلام سب کو روزہ افطار کرنے سے قبل ان کا حصہ پہنچا دیا اور تب اپنے افطار کا سامان اٹھایا اور روزہ کھولا۔ سات سال کے بچے کی یہ خوبیاں خلیفہ کی نظر میں رچ گئیں وہ بھانپ گیا کہ اس میں خدمت اور ایثار، صبر و تحمل، ضبط اور استقامت کی بنیادی خوبیاں موجود ہیں۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ اس ہیرے کی تراش و خراش وہ خود کرے گا۔ سردار کا بیٹا اشرف بیگ پیدائشی سردار تھا۔ محل میں اس کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ شہزادوں کے ہمراہ اُسے تعلیم دی جانے لگی۔ پہاڑیوں کا بیٹا، سنگلاخ چٹانوں سے اُگے ہوئے جنگلی پھل اور پہاڑیوں سے پھوٹتے، بہتے، گنگناتے جھرنوں کا پانی پینے والے قبیلے کا سردار اپنے بیٹے کی اس پذیرائی پر پھولا نہ سماتا تھا۔ اس اثناء میں ایک دن گھوڑسواری کی مشق کے دوران ایک شہزادہ کا گھوڑا ایک بار الف ہو گیا۔ اشرف بیگ اس وقت صرف گیارہ سال کا تھا مگر تن و توش اور جسامت کے اعتبار سے پندرہ سال سے کم کا لڑکا نہ لگتا تھا۔ اس نے بگڑتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کی زد میں آ کر گھوڑے کے منہ میں لگی ہوئی لگام تھام لی اور اس کو اتنا جھکایا کہ گھوڑے کو زمین پر بیٹھنا پڑا۔ اس نے شہزادے کو اتار کر گھوڑے کو اپنے قابو میں کیا اور کئی گھنٹے تک اتنا دوڑایا کہ گھوڑے کے کس بَل نکل گئے۔ پسینہ اس کے جسم سے پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اشرف بیگ جب تک گھوڑے کی پیٹھ پر رہا جما رہا مگر جب اُترا تو اتنا تھک چکا تھا کہ خود بیٹھ کر دوبارہ کھڑا نہ ہو سکا اور تین چار دنوں تک سواری کرنے کے قابل نہ رہا۔ اس دوران میں اس کی عیادت کے لیے نہ صرف شہزادے اس کے گھر پہنچے بلکہ خود سلطان نے بھی آ کر مزاج پُرسی کی اور یہ اعزاز دیا کہ پانچ سواروں کا منصب دار مقرر کیا۔ اس کے باپ کو بھی انعام و اکرام سے نوازا اور حکم دیا کہ اشرف بیگ خلیفہ کو روزانہ ہر صبح قرآن بھی سنایا کرے گا۔ غالباً خلافت کی پوری تاریخ میں اشرف بیگ وہ پہلا شخص تھا جسے گیارہ سال کی عمر میں چند سواروں کا سالار مقرر کیا گیا تھا۔ لوگ اس کی طرف رشک سے دیکھتے تھے اور اپنے

بچوں کو اس کی مثال دیا کرتے تھے۔ اشرف بیگ نے خلیفہ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے دل میں اسلام کا درد تھا۔ وہ اپنے اس منصب جلیل کی ذمہ داریاں سمجھتا تھا۔ اس کو علم تھا کہ عالم اسلام اس کی طرف پرامید نگاہوں سے دیکھتا ہے کعبہ کے بعد مسلمانوں کا مو وہی تھا۔ مگر یورپ کی تین بادشاہتوں روس، فرانس اور برطانیہ نے اپنی سیاست سے اسے یکے بعد دیگرے ان حالات میں الجھا دیا تھا کہ وہ لامحالہ اپنی خلافت کو بچانے کے لیے بعض اوقات مجبوراً غلط فیصلے کرتا تھا۔ پھر اس کا سابقہ غدار امیروں اور درباریوں سے تھا جو محض دولت کے لالچ میں ان بادشاہتوں کے مفادات کو عزیز رکھتے تھے۔ خلیفہ دل کا نرم اور طبیعت کا نیک تھا۔ اس میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ وہ ان خود غرض اور لالچی درباریوں کا قلع قمع کر سکتا۔ چنانچہ وہ ان کے جال میں الجھتا گیا اور اس کے صحیح ہمدرد جاں نثار، مخلص و وفادار اور دردمند امراء اس سے دور ہوتے گئے۔ سردار اشرف بیگ بھی جوانی ہی میں پانچ ہزار سواروں کا سردار بن گیا تھا مگر محلاتی سازشوں اور خود غرض اُمراء کے مجمع میں زیادہ دیر تک ٹھہرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ چنانچہ وہ بابِ عالی سے علیٰحدہ ہو گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ درپردہ ان سازشوں کا پتہ چلایا جائے جو خلافتِ اسلامیہ کی جڑوں کو کھوکھلا کیے دے رہی تھیں۔ دربار میں ہر روز اس کے خلاف سلطان کے کان بھرے جا رہے تھے کہ سردار اشرف بیگ کی نظریں تختِ خلافت پر پڑ رہی ہیں اور وہ چھپ کر ایک زبردست فوج تیار کر رہا ہے کہ کوئی مناسب وقت آئے تو تخت پر قبضہ کر لے حالاں کہ سردار اشرف بیگ خلیفہ کو یاد کرتا تھا تو اس کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ باپ کے انتقال کے بعد جو شفقت خلفیہ نے اس کو دی تھی اور جس قدر وہ اس کو عزیز رکھتا تھا اس کی ایک ایک تفصیل اشرف بیگ کو یاد تھی۔ وہ مزے لے لے کر سناتا تھا کہ ایک دن اس نے خلیفہ کو قرآن سناتے وقت کسی جگہ تلفظ اور لہجے کی غلطی کر دی تھی تو سلطان نے اس کو خوب پیٹا مارا تھا۔ خلیفہ اس کو بالکل بیٹوں کی طرح رکھتا تھا اور شہزادوں سے کہتا تھا کہ ازبکستان سے خدا نے تمہارا ایک اور بھائی تمہارے لے بھیج دیا ہے۔

بابِ عالی سے نکل کر اشرف بیگ اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا کچھ دنوں تک اس نے شام کی طرف آئے یورپی تاجروں کے قافلوں کو لوٹا، اپنا ایک جتھا بنایا اور اس میں اسلحہ تقسیم کیا۔ ان کی سخت تربیت کی اور پھر جب خلیفہ کی فوجوں نے ناکہ بندی کر کے شام کے علاقوں کی طرف پیش قدمی کی تو وہ روپوش ہو گیا تاکہ آپس کے جھگڑوں میں مسلمانوں

کا خون نہ ہے۔ وہ کسی صورت میں، مسلمانوں کی طاقت کو کمزور کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی اصل دشمنی خلیفہ یا خلیفہ کے امیروں اور درباریوں سے نہ تھی بلکہ وہ برطانیہ، روس اور فرانس کو اپنا حقیقی حریف سمجھتا تھا۔ شام سے نکل کر اشرف بیگ مصر آ پہنچا۔ یہاں لارڈ کرومر کا ڈنکا بج رہا تھا اور ترکی سے زیادہ مصر میں ریشہ دوانیوں کا زور تھا۔ چنانچہ اشرف بیگ یہاں جم گیا اور یہیں اس نے ایک زیر زمین تحریک شروع کی۔ قاہرہ کے محلات میں اس کا تذکرہ رہتا تھا اور عام مصری اس کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ وہ ایک سچا مسلمان تھا اور مصری قومیت کا خول اتار کر اس کی جگہ اسلامی حکومت سے رابطہ اور تعلق پیدا کرنے کا خواہاں تھا اس راستے میں اس کے لیے ضروری یہ تھا کہ پہلے بیرونی اثر و نفوذ کو کم کیا جائے۔ پھر مسلمان آپس میں مل کر اپنی سمجھ کے مطابق ایک دوسرے کی حکومتوں سے برادرانہ تعلقات قائم کریں۔ چنانچہ اس نے بہت جلد اپنا ایک منظم جاسوسی کا نظام قائم کیا۔ اپنا ایک مختصر مگر بے حد مستعد گروہ بنایا۔ جو بھی برطانوی جہاز سوئز سے گزرتا تھا اس کی تمام اطلاعات اشرف بیگ کو مل جاتی تھیں۔ وہ ہر وقت چوکنا رہتا تھا۔ مصر کے متعلق اس کی معلومات اس قدر بروقت اور مکمل تھیں کہ شاید پاشا کو بھی نہیں ہوں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اشرف بیگ کے آدمی نہ صرف محل میں موجود تھے بلکہ بندرگاہوں، کارخانوں اور کاشتکار وغیرہ کے علاقوں میں بھی پھیلے ہوئے تھے اور وہ لوگ اسے ہر وقت کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ وہ ایک ذہین آدمی تھا اور اس نے اپنے گروہ کے دل میں اپنے لیے واقعی عزت اور احترام پیدا کر لیا تھا۔

ان تمام باتوں کے سننے کے بعد میں نے سوچنا شروع کیا کہ میرا اقدام کیا ہونا چاہیے۔ اشرف بیگ ایک سمجھ دار آدمی تھا اس کا مقصد میرا قتل کرنا نہیں ہوگا ہر چند کہ وہ برطانوی شخص کو اپنا حریف ضرور سمجھ سکتا تھا لیکن ہر برطانوی فرد کو وہ قتل نہیں کر سکتا تھا۔ نہ قتل کر دینا کسی مسئلہ کا حل تھا شاید وہ مجھے صرف خائف کرنا چاہتا تھا۔ شاید مجھے خائف کرنے کا مطلب یہ بھی ہو کہ میں یہ داستان جب واپس جا کر والی مصر، برطانوی سفیر اور اخباری نمائندوں کو سناؤں گا تو اشرف بیگ کو ایک دم شہرت مل جائے گی۔ اس کی تحریک اگرچہ زبردست تھی مگر ملک گیر شہرت کی حامل نہ تھی اور اب وہ یکبارگی عوام کی توجہ کا مرکز بن جائے گی۔ غالباً اس طرح اشرف بیگ کو ایک خوف اور دہشت کا تاثر قائم کرنے میں بھی کامیابی حاصل ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ یہ تاثر برطانیہ کے مفادات کے خلاف

ڈھکے چھپے جذبات کو منظم کرنے میں اس کے کام آسکے یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ میرے بارے میں جو خبریں الاہرام اور دوسرے اخباروں نے شائع کی ہیں اشرف بیگ کو ان پر بالکل ہی یقین نہ ہو اور وہ اس فکر میں ہو کہ اس پوری اسکیم کے پیچھے جو کوئی بڑی سازش ہے اسے بے نقاب کیا جائے بہر صورت میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اشرف بیگ نے جو مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی ہے وہ فضول ہی ہے۔ وہ میرے آنے کے اصل مقصد کو معلوم کرنا چاہتا ہے اور شاید اپنی پبلسٹی بھی۔ میں نے اب ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ جہاں تک اپنے سفر اور قاہرہ میں جو کچھ گزرا ہے میں اس سے متعلق ہر چیز صحیح صحیح اور سچ بتا دوں گا مگر اس کو پبلسٹی ہر گز نہ دوں گا۔ چنانچہ جب صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی اور ساڑھے چھ بج گئے تو مجھے بستر سے اٹھا کر کھڑا کر دیا گیا۔ محافظوں نے اپنی پوزیشن لے لی وہ بالکل چاق و چوبند نظر آنے لگے۔ اب مجھے شاید پھر اشرف بیگ کا سامنا کرنا تھا مگر ان دو گھنٹوں میں میری حالت سدھر چکی تھی اور میرے جسم کا درد اور چہرے کا اضطراب دونوں دور ہو چکے تھے اب مجھے اشرف بیگ سے کوئی خوف نہ تھا۔

خنجر کی نوک میرے پہلو میں آلگی اور مجھے غار کے ایک دوسرے کونے میں لے جایا گیا جسے ایک پارٹیشن سے علیحدہ ایک کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ لیکن یہاں میرے سامنے اشرف بیگ نہیں بلکہ ایک اور بزرگ نما شخص موجود تھا۔ جس کا چہرہ نورانی اور داڑھی سفید تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک تسبیح تھی اور اس سے دانے بارش کے قطروں کی طرح نیچے گر رہے تھے اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ میرے محافظوں میں سے ایک نے اس سے سردار اشرف بیگ کے متعلق پوچھا۔

"اشرف بیگ نے اسے کیوں بلایا تھا...؟" اس بزرگ نے الٹا ان ہی سے سوال کر دیا۔ اس بزرگ کی آواز گونج دار تھی۔

"یا شیخ سباعی! یہ وہی نوجوان ہے جس کے بارے میں آج کل اخبارات بے تکی کہانیاں شائع کر رہے ہیں یہ کہتا ہے کہ اس نے اہرام مصر کے اندر جا کر چار گھنٹے گزارے ہیں اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس نے فرعون رمیسیس کی جگہ بھی دیکھی ہے اور فرعون کے جادوگروں اور موسیٰ کا مقابلہ بھی دیکھ لیا ہے۔ سردار اشرف بیگ کو اس کی کہانیوں پر کوئی یقین نہیں تھا۔ انہوں نے اسے یہاں اٹھوالیا ہے تاکہ سچ اور جھوٹ کی پہچان ہو سکے۔"

اس بوڑھے شخص نے میری طرف غور سے دیکھا چند لمحے گھورتے رہنے کے بعد وہ

محافظوں سے بولا "اشرف بیگ نے ابھی چہرے پڑھنے کا فن نہیں سیکھا۔ زبان جھوٹ بول سکتی ہے مگر چہرے سچ بولنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں تم لوگ جاؤ۔ اسے میرے پاس تنہا چھوڑدو۔ جاؤ باہر انتظار کرو۔"

پھر شیخ سباعی نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا، میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگے مجھ سے میرے بھائی بہن اور گھر والوں کے بارے میں پوچھتے رہے پھر میری تعلیم کے متعلق پوچھا، پھر مذہبی تعلیم اور اسلام سے میری واقفیت کے متعلق سوالات کیے اور مرجان مارشل سے میری ملاقات اور اس سفر کے بارے میں پوچھتے رہے۔ کافی دیر تک نجی زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اہرام کے متعلق میری ساری روداد سے صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ میں نے حضرت موسیٰؑ کے خدوخال اور چہرے کو کیسا پایا۔ ان کی شکل وصورت کیسی تھی۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا بیان کر دیا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ شخص نہ تو کسی مکروفریب کا شکار ہے، نہ ہی دوہرے پن کا۔ مجھ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ واقعی جو کچھ اس کے ذہن میں ہے وہی مجھ سے پوچھ بھی رہا ہے ذہن شناسی، زود فہمی اور دوسری دماغی صلاحیتوں کی چمک اہرام سے واپس آنے کے بعد میرے اندر پیدا ہو گئی تھی کہ اس کے باعث میں نہایت واضح طریقے سے اپنے سامنے والے شخص کے ارادوں اور خیالات تک کو سمجھ جاتا تھا۔ چوں کہ میں نے اس کو سادہ طبیعت، شفیق، رحم دل اور مذہبی شخص پایا اسی لیے میں نے ہر چیز بلا کم وکاست اس سے بیان کر دی بہت دیر تک شیخ سباعی سے ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے ماحول کو کسی عقوبت خانہ کی بجائے ایک اپنائیت، بے تکلفی اور صاف دلی کی مانوس فضا میں ڈھال دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ شیخ سباعی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر شاید کوئی مصلحت اسے روک رہی تھی۔ اس کی کیا فکر تھی، کیا سوچ رہا تھا اور کیا بات اس کی زبان پر آ کر رک رہی تھی میں نہیں جانتا تھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اب صبح کا ملگجا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ اشرف بیگ کی دوبارہ آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ وہی چاق وچوبند پھرتیلے انداز، وہی جائزہ لینے والی گہری نظریں اور وہی سفاک نگاہیں۔ میں اب اس کے جثہ اور قویٰ سے کافی حد تک مرعوب ہو چکا تھا مگر اس کا اظہار کچھ ضروری نہ تھا۔ سو میں بھی اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ اشرف بیگ نے شیخ سباعی سے کچھ گفتگو عربی میں کی جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ چند منٹ تک سوال جواب ہوتے

رہے۔ شیخ سباعی آگے بڑھا اور اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور خود میرے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اشرف بیگ لب تیز تیز بولنے لگا تھا مگر آخر کار شیخ سباعی نے اس کو ایک دو جملے کہہ کر خاموش کر دیا۔ اشرف بیگ پھر ایک قدم آگے بڑھ کر میرے پاس آیا اور بہت ہی سرد اور گمبھیر لہجے میں بولا۔

"اس وقت شیخ سباعی نے تمھیں اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ تم قسمت کے دھنی ہو ورنہ اشرف بیگ کے پنجے سے نکل جانا آسان نہیں ہوتا۔ تم ہماری پناہ گاہ کا حال جان چکے ہو۔ تمھارا زندہ لوٹنا ایک معجزہ ہے مگر تمھارا ایک بھی غلط جملہ اور افشائے راز کا ذرا سا اشارہ تمھیں دوسری دنیا پہنچا دے گا۔ تم سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے مگر تمھاری قوم کی مکروہ مکاریوں کے لیے میرے دل میں نفرت اور خالص نفرت بھری ہوئی ہے۔"

شیخ سباعی سب کچھ سنتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ اشرف بیگ چند ساعتوں تک کھڑا رہا۔ پھر یکایک واپس چلا گیا۔ شیخ سباعی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک کونے میں لے گیا۔ شیخ نے مجھ سے کہا۔

"میلکم بیٹے! تم جب بھی اس غار کو یا ہمارے گروہ کے متعلق کچھ بھی کبھی یاد کرو تو یہ ضرور سوچنا کہ ہم اس قوم کے افراد ہیں جس کے سپہ سالار صلاح الدین ایوبی نے میدانِ جنگ میں تمھارے بیمار رچرڈ شیر دل کے خیمے میں جا کر اپنے دشمن کا علاج کیا تھا۔ ہم نے رواداری کی عظیم الشان مثالیں قائم کیں۔ ہم نے عہدِ فاروقی میں بیت المقدس فتح کیا اور وہاں یہودیوں اور عیسائیوں سب کو عبادت کی اجازت دی۔ ہم نے خیبر فتح کیا اور یہودیوں سے باز پرس نہ کی۔ سوچو کہ جو قوم خیبر کے قلعے سے بیت المقدس تک فتح کے جھنڈے گاڑے، رُوم اور ایران کی ہزار سالہ سلطنتوں کو قدموں تلے روند ڈالے، صلیبی جنگوں میں اپنی شجاعت کی دھاک بٹھا دے اور پھر عثمانی خلافت میں آدھے یورپ کو زیرِ نگیں کر لے اس میں غیرت، حمیت، شجاعت، رواداری، انتظامی صلاحیت اور موت کو گلے لگانے کی تمنا کس قدر ہو گی اتنے شاندار ماضی کی وارث، روادار اور فیاض قوم آج کیوں تشدد پر اُتر آئی ہے۔ کیا بات ہے کہ ہم آج انتقام انتقام پکار رہے ہیں اور پھر ہم تمھاری قوم ہی سے نہیں ان تمام قوموں سے انتقام لینا چاہتے ہیں جو ہمیں سماجی برائیوں، موت اور غلامی کے گہرے پانیوں میں دھکیل دینا چاہتی ہیں۔"

میں نے کہا "شیخ! جو تھوڑا بہت علم تاریخ کا مجھے ہے وہ یہی سکھاتا ہے کہ کوئی قوم

باہر کی طاقتوں کی یلغار سے مغلوب نہیں ہوتی بلکہ اندرونی خلفشار اور اپنی نااہلی سے دوسروں کو اپنے اوپر غلبہ حاصل کرنے کی راہ پیدا کر دیتی ہے۔ ہم اس لیے آج دنیا پر چھا رہے ہیں کہ ہم میں اتحاد ہے، قومی جذبہ ہے اور تم اس لیے پستیوں میں گر رہے ہو کہ تم مرکزیت کو فراموش کر چکے ہو اور پھر یہ تو اس دنیا کا معمول ہے... کل تم تھے، آج ہم ہیں، کل کوئی اور ہوگا پھر قوموں سے انتقام کیسا اور کیوں.....؟"

"میلکم! تم نے کچھ باتیں سچ کہیں۔ آج ہم مرکزیت کھو بیٹھے ہیں مگر یہ مرکزیت خلافتِ نہیں ہے، نہ کبھی تھی اور نہ کبھی ہوگی۔ خلافت صرف ہمارے سیاسی مزاج کا ایک رخ ہے، ہماری مملکت کے طور طریقوں کا ایک پہلو ہے۔ ہم نے خود کئی اسلامی خلافتیں مٹتی اور بنتی دیکھی ہیں۔ سیاسی اقتدار بھی ہمارا مطمحِ نظر نہیں ہے۔ ہمارے دین کا مزاج شاہانہ ہے نہ جلالی۔ نہ ہمیں خون بہا کر طمانیت حاصل ہوتی ہے، نہ تاج سجا کر عروج چاہتے ہیں۔ ہمارا مذہب ان باتوں سے بے حد بلند ہے۔ ہمارا مطمحِ نظر اور ہمارے دین کی روح انسانی شعور کے ارتقاء میں ہے۔ بدی کی طاقتوں پر غلبہ پانے میں انسان کی مدد کرنے میں ہے۔ ہماری قوتیں سب کی سب خیر کی طرف اور بھلائی کی سمت لے جانے والی ہیں۔ مثبت کردار کی تعمیر ہمارا نظریۂ حیات ہے اور مثبت انسانی مزاج کی تخلیق ہی ہمارے مذہب کا اہم ترین جز ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے ہمیں اسلامی حکومت چاہیے جس کی سوچ درست اور خیر کی طرف ہو۔ جو انسان میں طاغوتی قوتوں کے ایما پر مسلسل پیش بندی کرتی رہے۔ ہم پستی میں جا رہے ہیں اور تم اوپر چڑھ رہے ہو۔ ہمیں تم سے کوئی پرخاش نہیں۔ دشمنی کی بات یہ ہے کہ تم اپنے سیاسی اقتدار کے ساتھ افریقہ اور وسطِ عرب میں ہمارے جاہل عوام کو اپنے مذہب کے فریب دے رہے ہو اور انھیں اسلامی اقدار و روایات سے دور کرتے جا رہے ہو۔ یہی ہمارے اور تمھارے درمیان اختلاف کی وجہ ہے۔ آج تم نے مسلمانوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا ہے۔ آج کا مسلمان ہر تیر انداز کا نشانہ اور ہر کھانے والے کا لقمہ ہے۔ ان کی عقلیں سلب اور دانائیاں خام ہیں۔ چنانچہ ہمارے اور اشرف بیگ کے مشن کے یہی دو پہلو ہیں۔ ایک تو ان کو سوتے سے جگایا جائے تاکہ وہ سمجھ سکیں کون ان کا دوست ہے اور کون دشمن ہے اور دوسرے یہ کہ ان میں بھلائی اور اچھائی، نیکی، ریاضت اور تقویٰ پیدا کیا جائے۔ ہم اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ہم خود کو نیک بنالیں تو ہمارا خدا ہمیں پھر سرفراز کرے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری قوم کے گناہ اس سرکش گھوڑے کی

مانند ہیں جن پر سواریوں کو سوار کر دیا گیا ہو اور باگیں بھی اتار دی گئی ہوں اور تقویٰ وہ سواری ہے جس کی باگ سوار کے ضمیر کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ افسوس اسی کا ہے کہ لوگ گمراہی میں جیتے ہیں اور جہالت میں مر جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی ہدایتیں ان سے اتنا قریب ہیں جتنا سانس سے زندگی۔ خیر، میلکم! تم اب جاؤ ہم صرف اپنا بھلا نہیں چاہتے، تمہارا بھلا بھی چاہتے ہیں اور اس کا حل یہی ہے کہ تم اپنی قوم کی ہوس اقتدار کو روکنے میں ان کی مدد کرو۔ جاؤ، خدا حافظ!" پھر کہنے لگا۔ "میں تم سے دو دن بعد پھر ملوں گا اور اس وقت ہم مذاہب پر گفتگو کریں گے۔"

اس نے آنکھوں کو بوسہ دیا۔ ہم باہر نکلے ایک چٹان کے پاس ٹھہرے مگر سامنے کا منظر دیکھ کر میری حالت غیر ہو گئی۔ بڑے پتھروں سے بندھے دو نوجوان قوی ہیکل شخص کھڑے تھے۔ خون ان کے سینے سے بہہ رہا تھا اور گردن ڈھلک چکی تھی۔ شاید چند لمحہ قبل موت اپنا کام کر گزری تھی۔ پیشانی پر ایک چھوٹا سا کاغذ چسپا تھا۔ اس پر لکھا تھا "غداری کا انجام۔" میرا کانپ گیا۔ واقعی مجھے نئی زندگی ملی تھی۔ اشرف بیگ اندازے سے زیادہ بے رحم اور قاہر شخص تھا۔ شیخ سباعی نے مجھ پر الوداعی نظر ڈالی اور بولا۔

"خدا حافظ بیٹے! تمہیں پردیس میں شفقت مل گئی اور مجھے اللہ نے ایک بیٹا دے دیا۔ میں تم سے دوبارہ ضرور ملوں گا۔ تب میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہم اور تم دونوں ہی اپنی قوم کو سیدھی سوچ پر لگانے کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں...... خدا حافظ!"

مجھے اس شخص کا کردار گھنے سایہ دار درخت کی مانند لگا جو ظلم کی جلتی دھوپ میں سختیاں اپنے چہرے پر اور کرم اپنے قدموں میں رکھتے ہیں۔ میں آگے بڑھا ہی تھا کہ محافظ سیاہ نقاب پہنے اور اونٹ لیے کھڑے نظر آئے انھوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی، مجھے اونٹ پر بٹھایا اور میرے ہاتھ پشت پر ہلکی سی نیلی ڈوری سے باندھ دیے۔

پھر وہی اونٹ کا تکلیف دہ سفر شروع ہو گیا۔ اونٹ برق رفتاری سے دوڑتے رہے کچھ دیر چلنے کے بعد ایک سنسان جگہ پر انھوں نے مجھے اتار دیا ایک شخص بولا۔

"جاؤ۔ سامنے باغ ہے۔ اس کے سامنے تمہارا ریسٹ ہاؤس ہے۔ آج رات کے سفر کا کسی پر اظہار نہ کرنا۔ اگر کوئی پوچھے تو صرف یہ کہہ دینا کہ صبح چہل قدمی کر کے لوٹ رہے ہو۔ تم جانتے ہو کہ شیخ سباعی نے اشرف بیگ سے تمہیں صرف اس دلیل پر رہا کرا دیا ہے کہ جن آنکھوں نے ایک پیغمبر کا رُخِ انور دیکھا ہو ان کی روشنی کو بجھانا ہمارے لیے کبھ

ثولب نہ ہوگا۔ جاؤ آج رات جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ اور کسی کو اس کی اطلاع نہ کرو ورنہ جان لو کہ زندگی دوبارہ نہیں ملتی۔"

یہ کہہ کر وہ لوٹ گئے۔ میری آنکھیں بدستور بند تھیں، ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ مگر یہ شاید دفع الوقتی کے طور پر تھا میری ذرا سی جدوجہد سے ہاتھ کھل گئے اور پھر میں نے پٹی بھی آنکھوں سے اتار لی باغ موجود تھا۔ اس کا چکر کاٹ کر جب میں دوسری طرف نکلا تو ریسٹ ہاؤس نظر آ رہا تھا۔ میں اندر جا پہنچا۔

یہاں ابھی زندگی کا کوئی ہمہمہ نہیں تھا۔ اکا دکا نوکر ادھر سے اُدھر آ جا رہے تھے مگر نہ تو کسی نے میرے آنے کو کوئی خاص اہمیت دی اور نہ ہی ان کے کسی انداز سے اس بات کا اظہار ہوا کہ میرے اغوا کے متعلق کوئی علم تھا میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچ گیا اور وہاں جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا میں ایک فوری خطرے سے نکل آیا تھا۔ اونٹ کے سفر، نیند کے طویل وقفے اور ذہنی پریشانی نے مل جل کر میرے اعصاب کو بالکل کمزور کر دیا تھا۔ چنانچہ میں دیر تک بیداری اور غفلت کی درمیانی حالت میں رہا۔ دماغ کچھ سوچنا چاہتا تھا اور اعصاب سونا چاہتے تھے۔ آخر کار نیند نے آ دبوچا۔

میں دن بھر سوتا رہا۔ شاید شام کو میری آنکھ کھلی، ریسٹ ہاؤس میں میرے دوستوں میں سے کوئی نہ تھا سب لوگ قاہرہ میں کسی ڈرامہ کا شو دیکھنے گئے تھے۔ سرجان مارشل بھی موجود نہ تھے میں نے سوچا خنک شام کی صحرائی ہواؤں کا لطف لینے کے لیے ذرا چہل قدمی ہی کر لی جائے میں نے کلرک سے کہا کہ ریسٹ ہاؤس کے اطراف ہی میں ذرا گھومنے جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔ رات کا کھانا مجھے تنہا ہی کھانا تھا کیوں کہ میرے تمام دوست رات کو دیر سے لوٹ کر آنے کے متوقع تھے۔

ریسٹ ہاؤس سے نکلا تو کچھ دور پر ہی اہرام نظر آئے۔ دوسری طرف فاصلے پر دریائے نیل بہتا تھا میں نے نیل اور اہرام دونوں کو چھوڑ دیا۔ بلکہ ریسٹ ہاؤس کے سامنے کھجوروں والے باغ کی طرف چلنے لگا۔ یہ باغ ریسٹ ہاؤس سے زیادہ دور نہیں تھا اور میں بھی ریسٹ ہاؤس سے زیادہ دور جانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ باغ قطعاً ویران تھا۔ یہاں کوئی مالی، رکھوالا یا کوئی مالک یا اس کی کوئی کوٹھری وغیرہ نہیں تھی۔ البتہ باغ سے کافی فاصلے پر درختوں کا ایک جھنڈ اور ایک دو کچے کچے گھر بلکہ جھونپڑیاں سی نظر آ رہی تھیں۔ یہ وہی باغ تھا جس میں اشرف بیگ کے شتر سوار مجھے آج ہی علی الصبح چھوڑ گئے تھے۔

میں اب اشرف بیگ اور اس کے ساتھیوں اور بزرگ شیخ سباعی کے متعلق سوچ رہا تھا اس دنیا میں ہمارے جیسے انسانوں کے ہر گروہ میں ظالم اور رحم دل، سفاک اور کریم سب ہی قسم کے لوگ ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔ ظلم کرنے والا اپنے مظالم اور اپنی نخوت کے سامنے یہ نہیں دیکھتا کہ جس پر ظلم ہو رہا ہے وہ بھی اس جیسا ہی ایک انسان ہے اور جو ظلم کر رہا ہے وہ بھی ایک فانی انسان ہی ہے۔ اس کے دبدبہ اور شان و شوکت کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ چند ماہ، چند سال اور پھر وہی قبر کے گڑھے، وہی ہڈیوں کے ڈھانچے اور وہی ایک انجام۔ مگر انسان اپنی نیک مزاجی اور کم عقلی میں اپنے ظلم کی زندگی اور اپنے طنطنے کی عمر کو پہچانتا ہی نہیں ہے اُسے یہ یقین ہی نہیں آتا کہ زمانے کی فتح مندی کے خواب دیکھنے والا اور دنیا کو اپنی ٹھوکروں میں سمجھنے والا شخص کبھی خود بھی اسی طرح بے یار و مددگار ہو کر دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر خاموشی کے اس عظیم سمندر میں گم ہو جائے گا جسے موت کہتے ہیں۔ میں نے اشرف بیگ کو دیکھ کر، اس کے غاروں میں چند گھنٹے گزار کر اور اس کے ساتھیوں سے گفتگو کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ برطانوی اقتدار کم از کم مصر کی سرزمین تک ایک نہایت خود غرضانہ اور محدود ذاتی اغراض و مقاصد کی بار آوری تک پھیلا ہوا ہے۔ ہماری قوم کے فخر و افتخار کے بلند میناروں کی بنیادوں میں کتنی محکوم اور مجبور قوموں، گروہوں، ملکوں اور انسانوں کی چیخیں سسکتی ہیں۔

میں نے آج تک اپنی قوم کا فقط ایک رخ دیکھا تھا مگر مصر آکر اور خصوصاً اشرف بیگ کے منظم گروہ میں چند گھنٹے گزار کر میں نے اپنی حکومت کے سیاسی اقتدار کا وہ رخ بھی دیکھا۔ جو گھناؤنا اور مکروہ تھا۔ کرۂ ارض پر جب سکندر اعظم کی سلطنت نہ رہی، قیصرِ روم کی شوکتیں خاک میں مل گئیں، اسلامی اقتدار کا سورج گہنا گیا، چنگیز خان اور تیمور فنا ہو گئے اور ترکیہ کی عثمانی خلافت کمزور ہو کر اپنی حدود میں سمٹ گئی تو آخر برطانوی سلطنت کو بھی ایک نہ ایک دن زوال آنا ہی ہوگا۔ یہی قدرت کا قانون ہے۔ اشرف بیگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ برطانوی اقتدار کے جلتے ہوئے چراغوں کو بجھانے کے لیے جم کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کی جرأت واقعی قابل داد تھی، اس کا حوصلہ قابل رشک تھا۔ مسلمان قوم کے اس جرأت مندانہ جذبوں کو ماضی کی ترقی کی بنیاد سمجھتا تھا۔ حالانکہ اس خوبی کے سوا مسلمان قوم کو میں ہمیشہ ایک جنونی قوم سمجھتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ان کی تاریخ میں جنگ و جدل، خوں آشامی اور آپس کے جھگڑوں کے علاوہ اور کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے۔

دستوری ارتقاء دستوری حکومت کا تصور، قانون کی پاس داری اور عوام کے ہاتھ میں اقتدار کو بدلنے اور درست کرنے کی طاقت مسلمانوں کی تاریخ میں کبھی موجود نہیں رہی۔ میں نے صلیبوں کی جنگ میں مسلمان بادشاہوں اور فوجوں کے کارنامے ضرور پڑھے تھے، ان سے مرعوب بھی ہوا تھا اور ان کی بہادری اور ہمت کی داد بھی دی مگر یہ بہادری ان کی وقتی مذہبی جوش اور جذبہ پر مبنی تھی۔ میری نظر میں مسلمانوں کی بحیثیت مجموعی قومی کمزوری مذہب پرستی تھی۔ یہی مذہب پرستی جب کبھی کسی سمجھ دار اور قسمت کے دھنی شخص کے ہاتھ میں آگئی تو اس نے اس مذہبی جوش کو سلطنتوں کی وسعت کا ذریعہ بنالیا اور جب کبھی سلطنت میں مذہبی جوش نے آپس کے جھگڑوں کو ہوا دے دی تو بغداد پر ہلاکو کی تباہیاں امڈ آئیں، غرض کہ میرا اندازہ یہ بھی تھا کہ ایسی ذہنی قوم کو جو صرف مذہب کی ہتک پر جان پر کھیل جائے اور اس کے علاوہ کسی بے عزتی اور کسی محکومی پر کوئی ردِ عمل نہ پیدا کرے، اس کو غلام رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مذہبی پندار کو زک پہنچانا کوئی خوش آئند بات نہ ہوگی۔ برطانوی حکومت کو یہ حقیقت سامنے رکھنی چاہیے کہ مصر ہو یا کوئی دوسری اسلامی حکومت وہاں ان کے مذہبی اقدار اور عقیدوں کو کسی رکھ رکھاؤ سے بھی ٹھیس نہ پہنچائی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ جھگڑے مصریوں اور برطانویوں کے نہ ہوں گے بلکہ اسلام اور عیسائیت کی پرانی رقابتوں کا روپ دھار لیں گے اور اس طرح مسلمان آپس کے جھگڑوں کو بھلا دیں گے، متحد ہو جائیں گے اور ایک مستقل خطرہ بن جائیں گے۔ یہ خطرہ یورپی طاقتوں کے لیے اور بھی شدید ہوگا۔ کیوں کہ یورپ کے شمال میں قطب شمالی ہے۔ انسانوں سے آباد علاقہ تو جنوب میں ہے اور ان علاقوں کے گرداگرد اسلامی آبادی اور نیم خود مختار ریاستوں کا حصار پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ برطانوی اقتدار جو مشرقِ بعید اور افریقہ میں ہے اس وقت تک اپنے مقبوضات میں جم نہیں سکتا جب تک اس حصار میں رخنے نہ ڈال دیے جائیں۔ ترکی اور مصر کی رقابت کو جنم دینا ایک اچھا فیصلہ تھا۔ عربوں اور ترکوں کے درمیان عداوتیں پیدا کرنا بھی اچھا ہے مگر اس انداز سے یہ کام ہونا چاہیے کہ مسلمان ان کی پشت پر موجود برطانوی ڈپلومیسی کو سمجھ نہ سکیں اور اپنی قوت کا ادراک نہ کر سکیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان میں مذہبی یگانگت اور یک جہتی کا احساس درہم برہم ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے مختلف گروہوں میں معمولی شکایات کو بڑا بنایا جائے، رواداری کی بجائے علاقہ کی محبت اور علاقہ میں رہنے والوں کی پاسداری کو

بنیاد بنایا جائے۔ عصبیت کو ہوا ہی نہ دی جائے بلکہ اس کو دبایا جائے۔ مگر اس تمام تگ و دو میں ان کے مذہبی جذبات کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ میں نے سوچا کہ مصر آکر میں نے جو کچھ تجربہ حاصل کیا ہے وہ میں ایک خط کے ذریعے براہِ راست برطانوی وزیر اعظم اور دارالعلوم میں حزب اختلاف کے لیڈر کو لکھ کر بھیج دوں گا۔ ممکن ہے کہ اس طرح سے غیر ممالک میں برطانوی سیاست کو کسی حد تک درست رکھنے میں مدد مل سکے۔

باب نمبر ۸

انہیں خیالات کی رو میں، میں کافی آگے نکل چکا تھا۔ اندھیرا بھی کچھ بڑھنے لگا تھا باغ کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ البتہ سامنے کھجور کے دو تین درختوں کا جھنڈ اور ان میں بنی ہوئی ایک جھونپڑی نظر آرہی تھی۔ ابھی میں واپسی کے لیے اپنی سمت کا اندازہ لگا ہی رہا تھا کہ اس گھاس پھوس کی جھونپڑی سے ایک ادھیڑ عمر، مضبوط قد کاٹھ کا سیاہ فام حبشی اچانک نکلا اور میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ شخص کچھ عجیب وضع قطع کا تھا کم از کم مصر میں جن حبشیوں کو میں سڑکوں پر، بازاروں میں اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھتا تھا ان سے اس کی مطابقت نہ تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد چمکدار تھیں اور ان میں ایک عجیب قسم کی مقناطیسیت تھی۔ اس کے قریب آتے ہی مجھے ایسی بدبو سی آئی جیسے لاشوں کے تعفن سے اٹھتی ہو۔ مگر یہ تو چلتا پھرتا ایک زندہ سلامت آدمی تھا۔ اس کی ہیئت دیکھ کر میرا دل یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے دور ہی رہے۔

میرے قریب آکر وہ شخص جھکا اور میرے قدموں پر تقریباً دوہرا ہو گیا۔ پھر اُٹھا اور بولا۔

"ملکہ لوران اور شہزادی مینا متی کے خادم تیرے منتظر ہیں۔ ہم سب تیری راہیں دیکھ رہے ہیں مگر تو راستوں پر آآکر پلٹ جاتا ہے۔ ہم تجھے راستہ دکھانے کی جُرأت تو نہیں کر سکتے مگر صرف درخواست کر سکتے ہیں کہ تو اپنی منزل کھوئی نہ کر...."

"میں نہیں جانتا تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"آقا! غلاموں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ ایک میں ہی نہیں اس تاریک براعظم میں نہ معلوم کتنے سانس لیتے ہوئے غلام اپنی آخری گھڑیوں تک تیرے انتظار میں ختم ہو گئے۔ ہم سب تیرے منتظر رہے اب تو آگیا ہے تو سب کی آنکھیں تجھ پر لگی ہوئی ہیں۔ وقت کو برباد نہ کر۔ تجھے بہت دور جانا ہے، دریاؤں کی سرزمین میں گہرائیوں میں دفن مینا متی نہ جانے کب سے تیری منتظر ہے۔"

"مگر تمہیں ان باتوں سے کیا تعلق؟ میں جب تک چاہوں گا اور جب چاہوں گا رکوں گا اور جب چاہوں گا مصر سے نکلوں گا تم میرے معاملے میں دخل دینے والے کون ہو؟"

"آقا! تو بھول رہا ہے۔ تو آج نہیں صدیوں پہلے فرعون رمیسیس کے شاہی درباری ساحر مردوقش اور ملکہ لوران کی خواہش پر مینا متی کا نجات دہندہ منتخب ہو چکا ہے کیا ہامش نے تجھے کچھ نہیں بتایا تھا؟ کیا لوران کا رومال اور مردوقش کی ہڈی جیسا متبرک تحفہ تجھے کچھ یاد نہیں دلاتا؟"

"ہامش! ہاں ہامش! یہ وہی ساحرہ تھی جو برطانیہ میں میرے وطن ماٹرن کے قریب ایک ندی کے پاس ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتی تھی۔ جس کے پاس اپنے اسکول کے زمانے میں اتفاقاً میں جا پہنچا تھا اور جس نے مجھے ایک چھوٹی سی ہڈی اور کپڑے کا رومال دیا تھا اور کہا تھا کہ میں ہی وہ نجات دہندہ ہوں جو سینا قرب کی بیٹی مینا متی کو جسے بابل کا ایک شہزادہ وخت زر لے اڑا تھا، نجات دلاؤں گا۔" اب مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس دن سے لے کر اب تک کی تمام تفاصیل نظروں میں گھوم گئیں۔

میں قاہرہ آ کر بالکل ہی بھول چکا تھا کہ اس حبشن ساحرہ نے مجھ سے کہا تھا کہ تین برف باریوں میں تین بہاروں کے بعد دیوتا مجھے اپنی طرف کھینچ لیں گے۔ شاید یہی وہ سفر تھا اور شاید یہ محیر العقول واقعات اسی سفر کے ابتدائی معرکے تھے۔ اب مجھے سب کچھ یاد آنے لگا تھا مگر ہمیشہ کی طرح یہ خیال دل میں کلبلانے لگا کہ یہ سب کچھ افسانوی باتیں ہیں میرا وہم اور میرا تخیل ان میں رنگ آمیزی کرتا ہے۔ ورنہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی ہستی بقول ہامش کے جو کئی ہزار سال پہلے بابل سے اغوا کر کے مشرق میں کہیں دفن کر دی گئی اب تک سانس لیتی ہوگی! اور جو میرے انتظار میں راہیں تک رہی ہوگی! کیا آج کا پڑھا لکھا کوئی شخص اس قسم کی لغو باتوں کو قبول کر لے گا، فریب! اور وہ بھی خود فریبی کا۔ جاگتی اور دیکھتی، زندہ اور سانس لیتی زندگی کا کوئی فرد ایسی سوتی ہوئی مردہ اور گم شدہ ہستیوں کی تلاش کر سکتا ہے!

"آقا! تمہارے دل میں جو کچھ ہے وہ زبان تک کیوں نہیں آتا؟" حبشی کی آواز گونجی۔ "تم نے اپنے آپ کو ٹٹول کر نہیں دیکھا ورنہ تم زندہ اور مردہ کا فرق نہیں کر پاتے۔ تم پر اب تک جو کچھ گزرا ہے وہ سب کیا خواب تھا؟ ہامش کے کرشماؤ میں تم نے بابل کی تباہیاں دیکھیں اور اسے وہم سمجھا۔ سفید عتاب رات کی تاریکیوں میں مردوقش کی

ہڈی اور لوران کا رومال تمہارے چہرے پر پھینک گیا اور تم اسے خواب سمجھے؟ اہرام میں چند گھنٹے گزارے، فرعون رمیسیس کی ممی بنتی ہوئی دیکھی وہ سب کچھ بھی صرف خیال کے دائروں تک محدود تھا؟ مالک! تمہاری دنیا میں اب بار بار ایسے واقعات آئیں گے جن کی کوئی شخص توجیہہ نہیں کر سکے گا مگر یہ حقیقتیں ہوں گی اس دنیا کی حقیقتیں نہیں، کسی اور دنیا کی جس کا ادراک تمہیں آہستہ آہستہ ہوگا۔ جو ہم سے پہلے اس دنیا سے گزر گئے ان کا علم اب اُس دنیا کے رموز خوب سمجھتا ہے۔ مگر تم ابھی لاعلمی کے گہرے کہر میں ملفوف ہو جب ذہن میں اجالا پھیلے گا، دبیز چادریں اٹھیں گی تو ادراک تمہارے سامنے آگاہی کے ایسے جال بنے گا جیسے چاند کی کرنیں درختوں کی شاخوں سے چھن کر زمین پر گل بوٹے بنا دیتی ہیں۔ وہ وقت بہت جلد آئے گا۔ تم دیوتاؤں کا خواب ہو، لوران کا مان ہو، میناستی کا انتظار ہو۔ تمہیں آخر کار وہیں پہنچنا ہے۔ جلدی چاہو تو جلدی اور دیر میں چاہو تو دیر میں مگر تم اس مقام تک ضرور کھینچ لیے جاؤ گے جو صدیوں سے تمہارے مقدر میں ہے۔"

"میں ایک عام گوشت پوست کا انسان ہوں۔ شاید دوسروں سے زیادہ نحیف اور کمزور۔ میں نہیں جانتا کہ وہ طاقتیں جن پر لوران اور شمعون مل کر غلبہ نہ پا سکے اور ان کے قبضہ سے وہ میناستی کو چھڑا نہ لا سکے کس طرح مجھ سے مغلوب ہو جائیں گی؟ میں کس طرح میناستی کو اگر واقعی وہ کوئی ہستی ہے تو آزاد کرا کے لے آؤں گا...؟"

"آقا! تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اہرام رمیسیس سے واپس آنے کے بعد تم میں کیا کیا تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ تمہاری قوتیں بڑھائی جا رہی ہیں، تمہیں پرانے مناظر دکھلائے جا رہے ہیں اور بار بار دکھلائے جائیں گے۔ ماضی کے متعلق تمہارا علم اور تمہاری آگہی تمام حدود سے ماورا ہوگی۔ تمہاری حسی طاقتوں کی صیقل کی جا چکی ہے۔ تمہارے احساس دھار دار بنائے جا چکے ہیں۔ تمہاری سونگھنے، سننے اور چکھنے کی تمام قوتیں عام انسانوں سے کہیں زیادہ معتبر ہو چکی ہیں۔ تمہارے احساس کی زد میں آ کر ہر شے اپنا باطن اس طرح کھول دیتی ہے جیسے چاقو کی نوک بدن سے مساموں کو چیر دیتی ہے۔ ہر چیز تمہیں اپنا صحیح ذائقہ، صحیح خوشبو، صحیح آواز اور صحیح صورت دکھانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ تم نے اپنی تبدیلیوں پر غور ہی نہیں کیا۔ فرعون رمیسیس کی محفل میں چند گھنٹے گزار کر تمہارا ذہن اس قدر حساس ہو چکا ہے کہ تم چہرے دیکھ کر خیالات پڑھ سکتے ہو۔ ہزاروں خوشبوؤں میں سے ایک منتخب خوشبو کو پہچان سکتے ہو۔ جلد ہی تم میں یہ صفت بھی پیدا ہو جائے گی کہ

جس راستے سے گزرو گے یوں لگے گا جیسے تمہارا پہلے ہی سے دیکھا بھالا ہے۔ واقعہ کے رونما ہونے سے پہلے ہی تمہیں اس کے واقع ہونے کا پتہ چل جایا کرے گا۔ تمہاری تصوّرانہ قوتِ صنامی تمہیں ہر عہد کی تصویریں بنا بنا کر پیش کرے گی جو کبھی ہوا کریں گی۔ آقا! تم خود کو پہچانو، دنیا کے عام انسانوں پر نہ جاؤ، تم کو ان سے بہت بلند کر دیا گیا ہے، تم اپنی قوت کا ادراک کرو.....!"

"شاید تم سچ ہی کہتے ہو۔ مجھے اپنے اندر اس قسم کی تبدیلیوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ لگتا ہے کہ میں اپنی عمر سے بہت بڑا ہو چکا ہوں اور عام لوگوں سے کچھ مختلف بھی محسوس کرتا ہوں۔"

"آقا... !میری درخواست یہی ہے کہ اپنے سفر کو غیر ضروری طول نہ دو اور جلد از جلد مینامتی تک جا پہنچو۔ دیوتاؤں کا رحم اور دیوتاؤں کا قہر دونوں ہی بے پناہ ہوتے ہیں۔ تم خود کو ان کی امیدوں کا مرکز بنا رہنے دو۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے ارادوں کو وقت کی پابندیوں کی زنجیریں نہیں پہنائی گئی ہیں...."

اب اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ میں نے ذرا نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو محسوس ہوا کہ رات ہو چلی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے دیے ٹمٹمانے لگے تھے۔ مجھے اب واپس ریسٹ ہاؤس میں چلنا چاہیے تھا۔ جیسے ہی پھر میری نگاہوں نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد واپس آ کر اس حبشی کو الوداع کہنا چاہا تو اب مجھے کوئی وہاں نظر نہ آیا۔ میں وہاں تنہا کھڑا ہوا تھا البتہ وہی مرگھٹوں والی مردہ جسموں کی سی سڑاند اور بدبو ابھی تک میرے اطراف میں ضرور پھیلی ہوئی تھی۔

ریسٹ ہاؤس واپس آ کر میں نے دو طویل خطوط لکھے ایک اپنے ڈیڈی اور ممی کو، دوسرا وزیر اعظم اور ہاؤس آف کامنز کے لیڈر آف اپوزیشن کو، چوں کہ حکومت کی موجودہ پالیسیوں پر وہی سب سے بہتر نقاد ہو سکتا تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے کہ میں نے یہ خط اپنے وارڈ بوائے کو دیے کہ وہ صبح ڈاک کے سپرد کر دے۔ اسی اثنا میں میرے ساتھی اور دوست اور سرجان مارشل بھی واپس آ گئے تھے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میرے علاوہ چاروں لڑکے بھی بلائے گئے۔ سرجان نے کافی پلوائی اور ہم لوگوں کے ذمہ کچھ علمی کام سونپے۔ قاہرہ کی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ماتحت ایک مزید شعبہ DEPARTMENT OF PYRAMIDIOLOGY (شعبہ اہرامیات) کا اضافہ کیا جانے والا تھا

جس کے لیے افتتاحی تقریر سرجان مارشل کو کرنی تھی چنانچہ ہم چاروں طالب علموں کو سرجان نے اہرام مصر کے متعلق قاہرہ کی یونیورسٹی سے مختلف قسم کا مواد اکٹھا کرنے کا کام سونپا۔ ایک ہفتہ کے بعد یہ افتتاحی تقریر سرجان مارشل کو کرنی تھی۔ ہم لوگوں کا اکٹھا کیا ہوا مواد سرجان کو خود ہی صحیح طرح تالیف کرنا تھا اور اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ بھی تھا جیسا کہ ہمارے ہاں برطانوی پارلیمنٹ میں رائج تھا۔

ایک ہفتہ تک اس دوران میں ہم لوگ ہر روز ہی اپنی رپورٹ سرجان مارشل کو پیش کرتے تھے اور ہر دن ان سے اہرام کے متعلق کافی بحث ہوتی تھی۔ سرجان نے اس دوران میں لوہے کے اس عجیب و غریب ہتھیار یا اوزار پر بھی کافی تحقیق کی تھی جو مجھے اہرام مصر کے اندر ملا تھا۔ اس پر قاہرہ یونیورسٹی کے شعبۂ کیمیا کی رپورٹ بھی زیر مطالعہ رہی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ یہ فولاد کا اوزار ڈھلے ہوئے لوہے سے بنایا گیا ہے اور جس قسم کا یہ فولاد تھا اور جتنی شدید حرارت میں اس قسم کے لوہے کو پگھلا کر فولاد بنایا جا سکتا تھا اس کا تصور بھی بغیر کسی جدید طرز کے اعلیٰ اسٹیل فونڈری کے ممکن ہی نہ تھا۔ اس کو پگھلانے کے لیے فولاد کی بڑی بڑی بھٹیاں بنائی گئی ہوں گی اور ان بھٹیوں میں حرارت کا انتظام عام قسم کے ایندھن یعنی لکڑی اور کوئلہ سے تو ممکن نہ تھا بلکہ بجلی یا ایٹمی توانائی (جس پر آج کل امریکہ اور جرمنی میں تحقیقات ہو رہی تھیں) ہی کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ پانچ ہزار سال قبل یہ اسٹیل مل کہاں تھا، لوہے کی وہ کانیں کہاں تھیں جن سے لوہا آتا تھا، وہ جہاز کہاں تھے جو خام لوہے کے ٹکڑے لاد کر لاتے تھے، توانائی پیدا کرنے کا انتظام کہاں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ لوگ کون تھے جن کی سائنسی معلومات آج کی موجودہ دنیا سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ سرجان جس رپورٹ پر نہایت حیرت زدہ تھے وہ یہ تھی کہ آج کل کی تمام کانوں سے نکلنے والے لوہے میں جو کیمیاوی عناصر عام طور پر ابھی تک دریافت ہوئے ہیں یہ ان سے بالکل مختلف قسم کے کیمیاوی عناصر کا مرکب تھا۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ لوہا بھی اس دنیا کی موجودہ قسم کے لوہے سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ یہ لوہا کہاں سے آیا اور اسے کون لایا۔؟ یہ ہی وہ سوال تھے جس پر سرجان مارشل اکثر و بیشتر سوچتے رہتے تھے۔ اس دوران میں کئی بار انھوں نے ہم لوگوں کی رائے بھی لی، مباحثے بھی ہوئے اور بڑی اچھی علمی اور تحقیقی فضا قائم رہی۔

سرجان روز نئی نئی لائبریریوں کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ ریسٹ ہاؤس واپس

آکر بھی ان کے سامنے کتابیں کھلی رہتی تھیں۔ وہ سوچتے رہتے تھے یا پڑھتے رہتے یا لکھتے رہتے تھے یا پھر ہم لوگوں کے فراہم کردہ مولو کا مطالعہ کرتے۔

تین دن گزرے تھے کہ مجھے ایک خط ملا جس پر بھیجنے والے کا کوئی نام و پتہ درج نہیں تھا۔ لفافہ کھولا تو خط کے انداز سے معلوم ہوا کہ شیخ سباعی کی تحریر تھی یا ان کے ایماء پر کسی نے لکھا تھا۔ اس میں فقط دو باتیں تحریر تھیں۔ "برطانوی وزیراعظم اور حزب اختلاف کے لیڈر کے نام آپ کے دونوں خطوط ہم نے پڑھے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح اپنی اور ہماری قوم کی بھلائی کے لیے ان کو مشورے دیتے رہیں گے۔ اپنے شفیق باپ سے جب بھی ملنا چاہو ریسٹ ہاؤس کے باہر ایک پرچہ اس قسم کا لگا دو۔ ہمیں پیغام مل جائے گا۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ اشرف بیگ نے جو کچھ کہا تھا واقعی وہ سچ تھا۔ میں ابھی تک اس کی نظروں میں تھا اور وہ مجھ سے جہاں چاہتا اور جس جگہ چاہتا مڈبھیڑ کر سکتا تھا۔ میرے خطوط بھی اس کی عقابی نظروں سے نہیں بچ سکے۔ یہ چوکنا، چاق و چوبند شخص نہ صرف چالاک اور عیار تھا بلکہ عمدہ منتظم بھی تھا۔ اگر ہماری قوم میں ہوتا تو ہمارا ایک عظیم سرمایہ بنتا۔ خیر شیخ سباعی نے دو دن کے بعد جو ملنے کا وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ ہوا۔ شیخ نہ آتے، مجھے بلوایا شاید اشرف بیگ نے ان کو پناہ گاہ سے باہر نہ آنے کا مشورہ دیا ہوگا۔

دن گزرتے گئے اور آخر ۲۷ مارچ کو ہم لوگ اس جلسہ میں شریک ہوئے جو جامعہ الازہر میں منعقد ہوا تھا۔ وائس چانسلر کی اور شعبہ اہرامیات کے نامزد کردہ صدر کی تقاریر کے بعد مہمان عالم سرجان مارشل کا افتتاحی مقالہ پڑھا گیا جو بلاشبہ ہماری اپنی توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر نہایت پُرمغز اور ایک معرکتہ الآرا علمی مقالہ تھا۔

اس مقالے میں سرجان مارشل نے اہرام کی تاریخ، اس کی ساخت، اس کے متعلق نظریات اور اس کی چھان بین سے پیدا ہونے والی کئی صدیوں پر محیط تاریخی تگ و دو کا جائزہ لیا تھا۔ پھر دنیا کے مختلف علاقوں میں برآمد ہونے والی تاریخی عمارتوں، شہروں اور اہراموں پر بحث کی تھی اور پھر اہرام کی تعمیر سے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا تھا۔

یہ نظریہ اگر سرجان جیسے علمی دنیا کے مقتدر تاریخ داں کی بجائے کوئی اور پیش کرتا تو لوگ چٹکیوں میں اڑا دیتے مگر موضوع کی اہمیت، تحقیقاتی توازن، اس کے ماحصل اور بھرپور علمی استدلال نے لوگوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

سرجان نے مقالہ کوئی ساڑھے پانچ گھنٹے تک پڑھا اور کبھی کبھی اس دوران میں کچھ

سوالات بھی ہوئے جن کی تشفی سرجان فوراً ہی کر دیتے تھے۔ بعد میں اس مقالہ کو عربی میں اہرام الجمہوریہ اور انگریزی میں روزنامہ رائیل غزہ نے قسط وار اپنے اخباروں میں شائع کیا یہ لگ بھگ ۱۲۰ صفحے کا مقالہ تھا۔ اس کے کچھ حصے اس طرح تھے۔

"ایک مدت سے دنیا بھر کے تاریخ دانوں کے سامنے یہ سوال موجود ہے کہ خوفو کا اہرام اور غزہ کا مجموعی اہرامی حلقہ کیا کسی کھوئی ہوئی ترقی یافتہ قوم کے سائنسی علم کا شیرازہ ہے جو مصر اور دنیا کے دوسرے ممالک میں بکھرا پڑا ہے۔ غزہ کا اہرامی حلقہ خوفو کے اہرام اور اس کے برابر خوفو کے دو وارثوں کیفران اور منکیور کے اہراموں اور پھر قریب بنے ہوئے چھ دوسرے اہراموں پر مشتمل ہے جو عام خیال کے مطابق خوفو کی بیویوں اور بیٹیوں کے اہرام ہیں۔ مصر میں اور بھی اہرام ہیں یہ اہرام حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ساٹھ ہزار سال سے لے کر دو ہزار سال قبل تک کی مدت میں تعمیر ہوئے۔ حضرت موسیٰ جو حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً پندرہ سو برس قبل مصر میں آئے تھے یہودیوں کے سلسلے کے مشہور پیغمبر تھے جو حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اسحٰقؑ کی نسل سے تھے اور یہودی حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے زمانے میں مصر پہنچے اور پھر ۲۵۰ سال تک ارضِ مصر میں رہے پھر حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں مصر سے نکل کر سینائی اور شام تک پہنچے یہودیوں کی کہانی، ان کے بارہ قبیلوں کی داستانیں توریت اور زبور کی بگڑی ہوئی شکلیں، یہود کی طاقت کے مظاہر سب کے سب ایک الگ باب میں سموئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ بات طے ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ یہودیوں کو لے کر ارضِ مصر سے چلے تو فراعین کی حکومت موجود تھی اور فراعین مصر کئی ہزار سال تک اس علاقہ کے حاکم رہے۔ اہرام ان ہی کے زمانے میں تعمیر ہوئے فراعین کے اس عہد کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا گیا ہے جو مختلف سلاطین فراعین کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ خوفو کا اہرام ایک عام اندازے کے مطابق خوفو کے عہد میں تعمیر ہوا۔ لیکن چھ ہزار سال قبل کیا اسے خوفو ہی نے تعمیر کرایا تھا اور کیا اتنی عظیم عمارت اسی کی زندگی میں تعمیر ہو گئی تھی؟ آج تک کوئی اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ خوفو کے اہرام کی ہر مہر، ہر تحریر خوفو کا حوالہ دیتی ہے۔ ماہرین کا نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ اہرام بہت لمبے عرصہ قبل تعمیر ہوئے ہوں گے اور خوفو کے عہد میں اس بادشاہ کے کارناموں کی تشہیر کے لیے اس کی زندگی میں ان کی تفصیل اس اہرام پر کندہ کر دی گئی ہوگی اور اس طرح بعد میں آنے والی نسلوں نے اسی مناسبت سے اسے

خوفو کے اہرام کا نام دے دیا ہو گا۔ تھیلز یونان کا وہ پہلا ماہر جیومٹری تھا جس نے چھ صدی قبل مسیح میں اہرام کا تذکرہ کیا۔ وہ یونان سے مصر پہنچا اور ان اہراموں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ مگر وہ اس ذکر کے علاوہ کہ اہرام بہت مضبوط ہیں، سخت پتھر سے بنائے گئے ہیں اور الٹے تکون کی صورت میں تعمیر کیے گئے ہیں اور کچھ نہیں بتایا۔ مگر یہ تمام باتیں بھی ایک سفر نامہ کے طور پر تھیں اس لیے زیادہ کارآمد نہیں ثابت ہوئیں۔ تھیلز کے بعد مشہور مورخ ہیرڈوٹس جس نے ۴۴۰ ق۔ م میں مصر کے اہراموں پر سیر حاصل تبصرہ لکھا۔ اس کے زمانے میں اہرام عمدہ حالت میں تھے، ان پر سنگِ مرمر کی تہیں تھیں اور نہایت نفیس قسم کے چونے سے استرکاری کی ہوئی تھی۔ پھر ایک مدت تک اہراموں کا تذکرہ تاریخ سے غائب رہا یہاں تک کہ ۸۱۳ء میں مصر کے ولی عبداللہ المامون نے تخت نشیں ہونے کے بعد ۸۲۰ء میں اہرام کی تفتیش کے لیے ستر جغرافیہ دانوں، حساب دانوں اور بحری سفر کرنے والوں کی ایک جماعت مقرر کی۔ عام خیال یہ تھا کہ اہراموں میں دنیا بھر کے علوم کے حقائق پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو تجارت کے لیے دنیا کے ایک مصدقہ نقشے کی تلاش تھی جس کے لیے اہرام کو توڑ کر اس کے اندر سے یہ علوم حاصل کرنے کی جدوجہد کی گئی۔ مگر ان کو کوئی راستہ اہراموں کے اندر جانے کا نظر نہ آیا۔ چنانچہ انھوں نے اہرام کے اندر جانے کے لیے سرنگ کھودی مگر آٹھ فٹ موٹی دیوار میں سوراخ کرنے کے بعد بھی انھیں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی تو یہ کوشش ترک کر دی گئی۔ اگلے چار سو سال تک مسلمانوں نے اہراموں کو بہت نقصان پہنچایا۔ ۲۱ ایکڑ کے رقبے پر سو انچ موٹی پتھروں کی تہہ جو اہرامی بنیادی رقبہ کی جگہ تھی وہ تمام کی تمام توڑ دی گئی۔ مسلمانوں نے ان فولاد جیسے پتھروں کو اکھاڑ اکھاڑ کر الخیرہ نامی شہر کی تعمیر میں استعمال کیا۔ دریائے نیل پر دو پل فقط اس مقصد کے لیے بنائے گئے کہ ان پتھروں کو گھسیٹ گھسیٹ کر الخیرہ تک لے جایا جا سکے۔ فوج کے افسروں اور حکومت کے بڑے بڑے عہدہ داروں نے اپنے ذاتی مکانوں تک کے لیے یہ پتھر بے دریغ استعمال کیے۔ ۱۶۳۸ء میں جان گریوز جو آکسفورڈ میں جیومٹری کا طالب علم تھا مصر آیا اور کئی سال تک اہرام پر تحقیق کرتا رہا۔ اس نے خوفو کے اہرام کی ۲۰۷ سیڑھیاں شمار کیں اور اس کی کل بلندی ۴۸۱ فٹ ناپی۔ اس طرح سے ابتدائی اعداد و شمار حاصل ہو گئے۔ مصر کے مسلمان جغرافیہ داں ہمیشہ سے اہراموں کے متعلق یہ نظریہ رکھتے تھے کہ یہ اہرام فقط مردہ بادشاہوں کے مقبرے نہیں ہیں بلکہ ان میں علومِ فلکیات اور

زمین کی جغرافیہ دانی کے علم پوشیدہ ہیں۔ مگر انھوں نے اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے کچھ زیادہ تحقیقی کام نہیں کیے حالانکہ بعد کی صدیوں کی عرق ریزیوں نے یہ نظریہ صحیح ثابت کیا۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ برطانوی ماہر نجوم رچرڈ اے۔ پروکٹر نے اپنی کتاب "اہرام عظیم، تجربہ گاہ، مقبرہ اور عبادت گاہ" میں یہ نظریہ پیش کیا کہ ماہرین علوم فلکیات ستاروں کی گردش اور رفتار معلوم کرنے کے لیے ایک ایسے تصوراتی عرض البلد کے متلاشی تھے جس کے کسی حصہ کو نقطہ مان کر اسے سورج کے نصف النہار کا پیمانہ اور اپنے علم و حساب کا مرکز بنائیں۔ اہرام ایسے ہی دائرہ کے مرکز میں تعمیر کیے گئے تھے اور یہی وہ نقطہ تھا جس کے اوپر سے چاند، سورج، زہرہ، مشتری وغیرہ کی گزرگاہ کا حساب رکھا جاتا تھا۔ یہ حساب کس طرح رکھا جاتا تھا اہرام والوں نے اس کا کوئی نشان یا طریقہ نہیں چھوڑا تھا اور اگر چھوڑا ہے تو وہ مل نہیں سکا ہے۔ مسلمان مورخوں کا جن میں ابراہیم بن ابن وثوف شاہ کا نام قابل ذکر ہے یہ خیال تھا کہ غزہ کا اہرام خوفو کا نہیں بلکہ طوفان نوح سے تین سو سال قبل حکومت کرنے والے شہنشاہ سرید کے زمانے کا تعمیر شدہ ہے لیکن عیسائی مورخوں کے خیال کے مطابق ۲۷۲۰ ق۔ م سے ۲۷۴۲ ق۔ م کے درمیان تعمیر ہوا تھا اور اس طرح اہرام کی تعمیر کا قطعی سال نہ معلوم ہو سکا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ سب کی سب فقط قیاس آرائیاں ہی ہیں۔

اب دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہرام کس نے بنائے ہیں۔ عام خیال اور عمومی روایتیں کچھ اور کہتی ہیں اور دماغ کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خوفو کے عظیم اہرام میں ۱۲ سے لے کر ۲۰ ٹن وزن تک کے پتھر ۲۶ لاکھ لگے ہیں، جو ۴۹۰ فٹ کی بلندی تک لے جائے گئے ہیں۔ ان کا مجموعی وزن تقریباً ۶۵ لاکھ ٹن ہے۔ خیال ہے کہ دو لاکھ آدمیوں نے بیس سال کی مدت میں اسے تعمیر کیا ہوگا۔ یہ اہرام چودہ ایکڑ کی ایسی پہاڑی سطح پر تعمیر کیا گیا ہے، جس کو پہلے بالکل ہموار کیا گیا۔ یعنی سینکڑوں ہزاروں اونچے نیچے پتھروں کو کاٹ چھانٹ کر یکساں کیا گیا ہوگا۔ پھر اس اہرام کی تعمیر کی گئی ہوگی۔ اہرام بالکل خطِ نصف النہار پر تعمیر ہوا ہے، جہاں سے تمام دنیا کے سمندروں اور خشکی کے حصوں کو بیچوں بیچ تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہی جگہ دنیا کی کشش ثقل کا مرکز تسلیم کی جاتی ہے۔ اگر اہرام کی اونچائی کو ایک ہزار ملین یعنی ایک ارب سے ضرب دیا جائے تو وہ عدد نکلتے ہیں، جو زمین سے سورج کا فاصلہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ پتھر جو چھ سو میل دور

اسوان کے علاقے سے لائے گئے، کس طرح لائے گئے ہوں گے۔ ان پتھروں کو کس طرح اٹھایا گیا ہوگا، کس طرح تراشا گیا ہوگا۔ ان میں موٹائی، لمبائی اور چوڑائی کس طرح سوئی کے برابر صحیح لائی ہوں گی۔ دو لاکھ آدمیوں کے لیے جن میں فلاحین، غلام، دستکار، مزدور سب ہی ہوں گے۔ ہر روز کا راشن، پانی، لباس، رہنے سہنے کا انتظام، سماجی ضروریات کے اجتماع، ان کی تنظیم، ان کے اوزاروں کی سپلائی، پرانے اوزاروں کی مرمت کا کام سب کا سب کس طرح چلا ہوگا۔ قدیم زمانے میں اتنے بڑے شہر نہیں ہوتے تھے، جن کی صرف مزدوروں کی آبادی دو لاکھ ہو۔ بڑے سے بڑا شہر پانچ دس ہزار افراد کی آبادی کا ہوتا تھا، اور پھر یہ کہ ایک بادشاہ بیس سال تک اپنے ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ صرف اہرام کی تعمیر پر لگاتا ہے تو آخر اس کی دولت کتنی ہوگی، اس ملک کی پیداوار کتنی ہوگی۔ ذرا حساب لگائیے کہ دو لاکھ آدمی اگر ہر روز آدھ سیر آٹا بھی استعمال کریں تو ایک سال میں فی کس ساڑھے چار من آٹا ضروری ہوگا۔ گویا ایک سال میں کل مزدوروں کے لیے نو لاکھ من آٹے کی ضرورت ہوگی۔ اتنی بڑی فراہمی کس طرح ممکن تھی، جبکہ ابھی پیے بھی ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ باربرداری کا کام کسی نے سیکھا بھی نہ تھا۔ مواصلات اور ذرائع رسل و رسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ آخر کس طرح یہ پوری فوج منظم کی گئی اور پھر یہ کہ اتنی بڑی عمارتیں کیوں بنائی گئیں، جو قوم اپنے بادشاہوں کے مقبرے اتنے عظیم الشان بنا سکتی تھی اس نے اپنے بادشاہوں کے مقبرے اتنے عظیم الشان بنا سکتی تھی اس نے اپنے بادشاہوں کے محل کتنے شاندار بنائے ہوں گے مگر وہ محل کیوں باقی نہیں ہیں؟ صرف مقبرے ہی کیوں رہ گئے۔ سر جان مارشل نے اس موقع پر ایک یہ بھی بات بتائی کہ اہرام بنانے کا کام صرف مصر میں نہیں ہوا بلکہ دنیا کے اور بھی ممالک میں قدیم زمانے کے بنائے ہوئے اہرام ملے ہیں۔ ان سب کا جائزہ لینے کے بعد یہ طے کرنا چاہیئے کہ اہرام کب اور کیوں بنائے گئے تھے۔

مصر کے علاوہ اہرام یا اہرام سے ملتی جلتی تکونی عمارتیں، جن میں ممیاں بھی ملی ہیں۔ فرانس، چین، پیرو (جنوبی امریکا) برطانیہ میں بھی موجود تھیں۔ فرانس میں چار اہرام آج تک باقی ہیں، جو پلے روش، کارنک، فلی کون اور کوہار میں ہنوز موجود ہیں۔ فرانس کے ایک قدیم تاریخ کے محقق چاروکس کا خیال ہے کہ شارلیمان کے زمانے میں بھوت پریت، جادو اور جنات کے متعلق عام عقائد پھیل جانے کی وجہ سے اس قسم کی تمام بوسیدہ اور پرانی عمارتیں شاہی حکم کے ذریعے مسمار کر دی گئیں۔ ممکن ہے بہت سے قدیم

اہرام بھی اس زد میں آگئے ہوں، جو چار اہرام فرانس کے ان قصبات میں باقی رہ گئے، وہ شاید اپنے دور افتادہ محل وقوع کی بدولت آج تک کھڑے ہیں۔ یہ اہرام ستر اسی فٹ بلند ہیں مگر ان کا انداز تعمیر اسی طرح تکون کے ساتھ ہے، جو مصر میں ہے اور ان کے پتھر اتنے موٹے اور ضخیم بھی نہیں ہیں، جتنے مصر کے اہرام کے ہیں۔

اسی طرح برطانیہ میں برٹینی کے قصبہ میں بھی ایک اہرام نما عمارت موجود ہے، جو بعض مؤرخوں کی رائے میں خوفو کے اہرام سے بھی زیادہ قدیم ہے۔

"اسی طرح جنوبی امریکا میں کئی مقامات پر نہایت عظیم الشان عمارتیں ملی ہیں"۔ عمارت اب وہاں موجود ہے نہ اہرام ہے اور نہ ہی کوئی احاطہ ہے۔

یوں تو اہراموں کی تفصیل بیان کرنا ایک عجیب سی بات ہے مگر سر جان مارشل نے اس عنوان پر بڑی سیر حاصل بحث کی تھی۔ انہوں نے جنوبی امریکا، مشرق وسطیٰ، ایشیا کے دور افتادہ علاقے، یورپ اور افریقہ سب ہی جگہ کی قدیم تاریخ کو گویا کھنگال ڈالا تھا اور ان سب علاقوں میں پائی جانے والی قبروں اور ممیوں کا مصر کے اہراموں سے موازنہ کر کے بتایا تھا کہ اہرام بنانے کا فن اور لاش کو محفوظ کرنے کا طریقہ صرف مصریوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ یہ ایک عالمگیر عمل تھا۔ ہاں، البتہ یہ بات واضح ہے کہ اہراموں میں عظیم ترین اہرام مصر کے خوفو کے اہرام ہی کو کہا جاسکتا ہے۔

عراق کے شہر حلوان سے پانچ میل کے فاصلے پر چار ہزار سال قبل مسیح کے چھوٹے بڑے کوئی پانچ ہزار مقبرے ملے ہیں، جو مصر کے فراعین کی پہلی سلطنت (۴۰۰۰ ق م) کے لگ بھگ بنائے گئے تھے۔ ان میں کسی کسی میں ممیاں بھی رکھی ہوئی ملیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ممی بنانے کا کام کافی پرانا تھا۔

پروفیسر امیری نے قاہرہ سے کچھ دور سقارا کے مقام پر ایک بہت بڑا مقبرہ دریافت کیا، جس کے اردگرد چھوٹے بڑے ۲، اسی طرح کے اور مقبرے تھے، جو چوبیس چوبیس کی تین قطاروں میں بنائے گئے تھے۔ ان میں بہتر ڈھانچے ملے، جن میں ۶۴ مردوں اور آٹھ عورتوں کے تھے۔ ان کی ہڈیوں پر کسی قسم کے ضربات کے نشان نہیں ملے اور نہ ہی کسی قسم کے تشدد کی کوئی اور علامت نظر آئی، جس سے یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ ۲، انسان اس بادشاہ کے نوکر، مصاحب، دوست اور خادم تھے، جو خود ہی رضاکارانہ طور پر بادشاہ کے ساتھ زندگی کے سفر کے لیے روانہ ہونے پر تیار ہوئے تھے۔ گویا ان کو امید تھی کہ

ایک نہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا، جبکہ موت زندگی میں بدل جائے گی اور زندگی دوبارہ شروع ہوگی اور اسی لیے لامحدود زمانوں کو زندگی کی آرزو میں جان پر کھیل گئے اور جیتے جی موت کو گلے لگا کر سو گئے۔ آخر کیوں؟ یہ سوال بار بار ذہن میں اٹھتا ہے کہ کیوں، آخر کیوں؟ موت کے بعد زندگی کا تصور اور ایک دوسری دنیا کے لیے عازم سفر ہوتے کا خیال ان کے ذہنوں میں جم گیا تھا؟ اور پھر یہ تصور ایک عالمگیر تصور کس طرح بن گیا۔ یہ بات کچھ مصر کے اہراموں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ آج سے پانچ ہزار سے لے کر چالیس ہزار سال کے عرصے میں جبکہ ذرائع آمدورفت محدود تھے، لوگوں کو سفر کی آسانیاں مہیا نہ تھیں، براعظموں کا علم نہ تھا، پہاڑوں کے پیچھے اور آگے رہنے والے ایک دوسرے سے لاعلم تھے، یہ تصور کس طرح پھیلا؟

منگولیا کے سرحدی پہاڑی علاقے میں کرگان سے پچاس میل دور روس کے ایک تاریخ دان روڈینکو نے ایک قبر دریافت کی، جو ایک مصنوعی پہاڑی کی طرح تھی۔ اس میں اندر کی طرف لکڑیاں لگا کر اس کے دروازے کو بند کیا گیا تھا۔ اندر برف بھری ہوئی تھی۔ اس پہاڑی علاقے میں یوں بھی اکثر برفباری ہوتی رہتی تھی اور وہاں کا درجۂ حرارت ہمیشہ سرد رہتا تھا۔ چنانچہ اندر جمع کی ہوئی ٹنوں برف کو جب باہر سے بالکل بند کر دیا گیا اور مٹی اور پتھروں سے اس کو اس قدر مسدود کر دیا گیا کہ ہوا تک اندر جانے کا کوئی راستہ نہ رہا تو اندر کی جمع کی ہوئی برف ہمیشہ اپنے درجۂ حرارت کو نقطۂ انجماد سے گرا ہوا رکھنے پر مجبور ہوئی یعنی یہاں برف ہمیشہ جمی رہی۔ اس مقبرے کے اندر دوائیں اور مختلف قسم کے خوشبودار تیل لگی ہوئی دو لاشیں، جو ایک مخصوص کمرے میں، جس کے چاروں طرف فرش، چھت اور دیواروں پر برف کی موٹی تہیں جمادی گئی تھیں، حفاظت کے ساتھ شاہانہ انداز سے رکھی ہوئی تھیں۔ برف کی منجمد کر دینے والی فضا میں لاشیں بالکل تروتازہ تھیں۔ ان کے قریب ہی وہ تمام اشیاء رکھی ہوئی ملیں، جن کی ایک زندہ آدمی کو اس کی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے، مثلاً کھانے پینے کی چیزیں، پلیٹیں، چمچے، دیگچیاں، کپڑے، گلدان، شمع دان، باجے، ہیرے جواہرات اور نجانے کیا کیا۔ ہر چیز اپنی صحیح اور عمدہ حالت میں تھی۔ ان لاشوں پہ مصر کی ممیوں کی طرح کپڑے اور پٹیاں بھی نہیں تھیں بلکہ یہ برہنہ حالت میں تھیں۔ ان میں گوشت پوست، بھنویں، پلکوں اور سر کے بالوں تک کو ان کی اصلی اور صحیح حالت میں پایا گیا۔ قبر کے کمرے کے برابر ایک اور کمرے میں چار چوکور خانوں کی چھ قطاروں

میں بنی ہوئی یعنی چوبیس چوکور خانوں پر مشتمل ایک لکڑی کی ڈرائنگ بھی ملی۔ اس کے ہر خانہ میں کسی نہ کسی قسم کی صورتیں کھدی ہوئی تھیں۔ اس طرح کل چوبیس خانے اور چوبیس تصویریں بنی ہوئی ملیں۔ ایک تصویر میں ایک ایسا بیل نما جانور بنا ہوا تھا، جس کے پر بھی بنے ہوئے تھے۔ اس کے لمبے لمبے سینگ تھے اور اس پر ایک آدمی بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا اور تصویر کے انداز سے یوں لگتا تھا، جیسے یہ آدمی اور اس کی سواری اڑنے کی لیے پر تول رہے ہوں۔ زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسی قسم کی ایک تصویر عراق میں بابل کے قریب نینوا کی کھدائی کے دوران بھی برآمد ہوئی تھی۔ عراق اور منگولیا کا زمینی فاصلہ آٹھ ہزار میل سے کم نہ ہوگا۔ پھر یہ مماثلت یہ نقل کس طرح ممکن ہوئی اور پھر برف سے جسم کو یا اشیاء کو محفوظ رکھنے کا فن ان کو کس نے سکھایا، جبکہ فریج اور ڈیپ فریزر جیسی اشیاء کے ذریعہ کھانے پینے کی چیزوں کو محفوظ رکھنے کا طریقہ ابھی ہماری سائنس کے ابتدائی تجرباتی مرحلوں میں ہے۔

امنگولیا ہی کی طرح چین کے ایک گاؤں دوچوان میں ایک مستطیل کمرہ نما مقبرہ ملا ہے، جو ۳۹ فٹ چوڑا اور ۴۵ فٹ لمبا ہے۔ اس میں ایک قطار میں سترہ مردوں اور ۲۴ عورتوں کے ڈھانچے ملے ہیں۔ ڈھانچوں کے مطالعے سے کسی تشدد کا سراغ نہیں ملتا اور نہ کسی ہنگامی موت کا پتہ چلتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ ۴۱ افراد قطاروں میں لیٹ کر شاید موت کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ مقبرہ بھی کم و بیش تین ہزار سال قبل مسیح کا تعمیر کردہ ہے۔

برف کے مقبرے، منگولیا کے علاوہ، سائبیریا میں بھی ملے ہیں اور جنوبی امریکا کے انڈیز کے پہاڑی سلسلوں میں بھی دریافت ہوئے ہیں۔

گویا ممیاں بنانے کا فن کوئی مصر ہی تک محدود نہ تھا بلکہ یہ ایک عالمگیر فن تھا۔

صحرائے گوبی میں کارا کوتا کے مشہور آثارِ قدیمہ کے کھنڈرات کے قریب روسی پروفیسر کوس لوڈ نے ایک مقبرہ دریافت کیا ہے، جو قریباً ۱۲ ہزار سال قبل کا تعمیر کردہ ہے۔ اس میں سے دو ممیاں ملیں، جو اپنی صحیح حالت میں تھیں اور ایک مرد اور عورت کی تھیں۔ یہ دونوں تابوت میں رکھی ہوئی تھیں، جن میں پہیوں کی طرح دو گول دائرے بنے ہوئے تھے۔ گول دائروں کے نشان کو بیچ میں سے ایک لکیر بنا کر کاٹ دیا گیا تھا۔ کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ اس نشان کا مفہوم کیا تھا اور اس کو بیچ میں سے کاٹ کر آیا زندگی کے دو حصوں کی طرف نشاندہی کی گئی تھی یا یہ کسی اور طرف اشارہ کرتا تھا اور یہ بیچوں بیچ گزرتا

ہوا نستان مونیٹر کی طرح آسمان کی طرف اشارہ کرتا ہوا کس سمت کی اور کیوں نشاندہی کرتا تھا۔

ان تمام باتوں سے سرجان مارشل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ موت کے بعد زندگی کے سفر پر جانے کی خواہش ایک عالمگیر خواہش تھی۔

اور اس عالمگیر خواہش کی بنیاد یہ فلسفہ تھا کہ موت کے بعد ہی ایک لامتناہی زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ایسا سفر جس میں مرنے والے انسان کو اپنی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر قدیم زمانے میں یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ موت کے بعد زندگی ملنے کا ایک ہی راستہ ہے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ مرنے والے کے جسم کو محفوظ رکھا جائے اور اس کی تمام ہڈیاں اور سر سلامت رہیں۔ اسی لیے تمام دنیا کی قدیم آبادیوں میں سرمایہ دار اور حکومت کرنے والے دولتمند افراد جسم کو صحیح طور پر باقی رکھنے کے لیے کوشش کرتے تھے۔

یہ فلسفہ ایک گنجلک فلسفہ تھا۔ اس کا اظہار موجودہ زمانے کے تمام مذاہب میں بھی کسی نہ کسی طور پر موجود ہے۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان زندگی بعد الموت پر یقین رکھتے ہیں۔ ہندو آواگون کو مانتے ہیں۔ افریقہ کے وحشی قبائل بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مرنے والوں کی روحیں باقی رہتی ہیں۔ غرضیکہ آج بھی زندگی بعد الموت کا نظریہ تقریباً ہر جگہ موجود ہے۔

قدیم مصریوں نے اس نظریے کو اس طرح تشکیل دیا تھا کہ ان کے سماجی، فوجی اور ملکی ذرائع سب کے سب اسی نظریے کی تفصیل میں صرف ہوتے تھے۔

قدیم مصریوں کے مطابق موت کوئی انجام نہ تھی بلکہ ابتداء تھی؛ ایک مکمل شاداب و کامیاب زندگی کی۔ موت ایک دروازہ تھی، جس سے گزر کر انسان کو بقائے دوام مل جاتی تھی۔ اس بقائے دوام کے لیے جسم کی بقا بھی ضروری تھی۔ کیونکہ اس دوسری زندگی میں بھی جسم کی ضرورت ہوتی تھی۔ دوسری زندگی میں داخل ہونے اور کامیابی سے داخل ہونے کے لیے قدیم مصری بڑی تیاری کرتے تھے۔ زندگی کے تمام لوازمات اور ضروریات مصری اپنے مُردوں کے ساتھ دفن کر دیتے تھے تاکہ آئندہ زندگی میں مرنے والوں کو کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔

موت اور زندگی کے اس تصور کی پشت پر ایک مکمل فلسفہ موجود تھا۔ مصریوں کے

خیال کے مطابق زندگی تین عناصر سے مل کر بنی تھی۔ جسم موت کے بعد ختم ہوجاتا تھا۔ اگر اس کو محفوظ نہ رکھا جائے تو گوشت پوست ہڈیاں سب مٹی بن جاتی تھیں۔ دوسرا جز "کا" اور تیسرا "با" کے نام سے مشہور تھا۔ یہ "کا" اور "با" نہ صرف مستقل اور ابدی تھے بلکہ ان کی مادی ہئیت بھی موجود تھی۔

"کا" انسان کی تغیر پسند انا تھی۔ وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کی انا بدل جاتی تھی۔ یہی انا یعنی "کا" اس کی تمام خوبیوں اور خصوصیات کی عکاسی کرتی تھی۔ انسان کی انانیت دراصل دوہری شخصیت کا ایک رخ تھا۔ اس دوسری شخصیت کا بھی ایک اپنا مزاج، اپنا کردار تھا اور مصریوں کے فلسفہ کے مطابق "کا" کا ایک اپنا جسم بھی ہوتا تھا جیسے پہلی اور ظاہری شخصیت کا ایک جسم، مزاج اور کردار ہوتا تھا، اسی طرح اس دوسری شخصیت کی بھی ایک مادی ہئیت موجود تھی۔ یہ شخصیت مرتی نہ تھی بلکہ ہمیشہ باقی رہتی تھی۔ ظاہری جسم مرجاتا تھا۔ موت اس کو ختم کردیتی تھی مگر شخصیت یا فرد کی انا، جس کو قدیم مصری "کا" کہتے تھے، ایک ابدی زندگی رکھتی تھی۔ یہ "کا" موت کے بعد "با" سے مل کر ہیشگی پالیتی تھی۔ "با" دراصل جسم کے اندر ایک قوت تھی، جسے ہم روح کہہ سکتے ہیں۔ مصریوں کے خیال کے مطابق "با" کو قوتِ پرواز حاصل تھی۔ وہ ہر رات کو سورج کی طرف اپنے سفر پر جاتی تھی۔ اس لیے آدمی اس کی غیر موجودگی میں سوجاتا تھا اور پھر صبح سورج نکلنے کے ساتھ ساتھ "با" لوٹ آتی تھی تو آدمی پھر سے جاگ اٹھتا تھا "کا" اور "با" دونوں عناصر ابدی تھے مگر ان کو ایک جسم کی ضرورت ہوتی تھی، جہاں یہ دونوں رہ سکیں اور یہ جسم ہلکا ہو۔ غیر ضروری عضلات سے مبرا ہو۔ چنانچہ موت کے بعد اسی لیے جسم کی آنتیں، دماغ، دل اور پھیپھڑے وغیرہ سب نکال دیے جاتے تھے تاکہ آسانی سے جسم کی ممی بنائی جاسکے اور جس میں "کا" اور "با" ہمیشہ کے لیے باقی رہیں اور جب چاہیں یہ ممیاں آسمان کی طرف کوچ کر جائیں۔

باب نمبر۹

"یہ بات معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ آخر مصر میں ممی بنانے کا اور موت کے بعد زندگی حاصل کرنے کا خیال کیوں اور کیسے پیدا ہوا؟ آج کا انسان زمین کھود کھود کر قدیم زمانے کے آثار برآمد کر رہا ہے اور اپنی علمیت سے اپنے حال سے ماضی کے رشتوں کو گہرا اور گہرا تر کرتا چلا جا رہا ہے مگر اس وقت تک تمام تاریخ دانوں نے ماضی کے دھندلکوں سے اپنے آباؤاجداد کی تہذیب اور تمدن کا عکس حاصل کرنے کے لیے صرف اور صرف مٹی میں دبی ہوئی بستیوں کو باہر نکال کر تحقیق کرنے کے راستے کو اپنایا ہوا ہے۔ اس کے سوا عام اور مستند محقق کسی اور طرف دھیان نہیں دیتے۔ حالانکہ ماضی سے رشتہ جوڑنے کے لیے ایک اور بھی راستہ ہے، جو اتنا واضح اور شفاف تو نہیں۔ پھر بھی اس راستے کچھ راہیں نکل ہی آتی ہیں۔ یہ راستہ ہے کسی مخصوص علاقے میں قدیم لوک کہانی کے طور پر پھیلی ہوئی دیومالائی داستانوں پر تحقیق کرنے کا۔ کئی جگہ جہاں ماہرین آثارِ قدیمہ اٹک جاتے ہیں، وہاں انہی دیومالائی داستانوں سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

دیومالائی داستانیں لغو بھی ہیں، افسانوی بھی، جھوٹ بھی اور بعید از قیاس بھی۔ مگر ہر کہانی میں دو پہلو ضرور نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کئی کئی ہزار سالوں سے یہ کہانیاں زندہ اور سلامت ہیں اور دوسرے یہ کہ صرف مخصوص علاقوں ہی میں یہ پھیلی رہی ہیں۔ یعنی ان کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی یہ کہانیاں مخصوص جغرافیائی حدود سے باہر نہیں نکلتیں۔ کہانیوں کی اتنی طویل زندگی اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ ان کی تہہ میں کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی سچائی ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ اب جس طرح ہر ریت میں سونے کے چمکدار ذرے ضرور شامل ہوتے ہیں، اسی طرح دیومالائی کہانیوں سے بھی حقیقت کو کھوج نکالنا صبر آزما ہوتا ہے۔

اس قدر تفصیل اور تاریخی پس منظر بتانے کے بعد سر جان مارشل ایک اور پہلو کی طرف بڑھ گئے۔

مصر کی دیومالائی داستانوں میں ایک داستان کچھ عجیب سی ہے۔ اس کی تفصیلات اور اس کا اعادہ مصر کے اکثر قدیم کھنڈرات اور اہراموں سے برآمد ہونے والی مختلف معلومات سے ہوتا رہا ہے۔ یہ کہانی دراصل ایک ایسے ماخذ کی طرف اشارہ کرتی ہے، جس میں مردہ

لاشوں کی ممی بنانے اور پھر انہیں زندگی کے آسمانی سفر پر لے جانے کی تیاریاں کرنے کی وجوہات کا پتہ چلتا ہے اور اسی کہانی سے ہمیں مصریوں کے فلسفہ "کا" اور "با" کا بھی ماخذ معلوم کرنے میں مدد مل جاتی ہے۔

قدیم مصریوں کے آسمان سے آنے والے دیوتا کا نام آمن را تھا۔ یہ دیوتا آسمان سے اترا۔ اس نے مصر کے وحشی قبائل کو تہذیب سکھائی اور ان کو اجتماعی زندگی گزارنے کے ڈھنگ بتلائے۔ ایک مدت قیام کے بعد آمن را مر گیا اور پھر ابدی زندگی حاصل کرنے کے لیے اسے آسمان پر بھیج دیا گیا، جہاں اس کو اپنی دوسری زندگی گزارنی تھی۔ آمن را کے بعد اس کا بیٹا دیوتا آسیریس مصر پر حکومت کرنے لگا۔ آسیریس کا پہلا کام یہ تھا کہ اس نے اپنی رعایا کو زراعت سکھائی اور ان سے آدم خوری کی عادت ختم کرائی۔ اس نے انگور اور گندم کی کاشت کا طریقہ بتایا اور گندم سے روٹی اور انگور سے شراب بنانے کا فن سکھایا۔ آسیریس نے اپنے ملک میں دولت بنانے کا فن سکھایا۔ آسیریس نے اپنے ملک میں دولت، خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ پیدا کر دیا، جس سے اس کی عظمت بہت بڑھ گئی۔ آسیریس کا ایک بھائی سیت تھا۔ اس سے آسیریس کا یہ عروج نہ دیکھا گیا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے بھائی کو قتل کر دیا اور اس کی لاش کے چودہ ٹکڑے کر کے دریائے نیل کے مختلف علاقوں میں پھینک دیے تاکہ کوئی اس کی لاش کو تلاش نہ کر سکے مگر آسیریس کی بیوی اسی اس نے دریا کو کھنگالنا شروع کر دیا اور ایک طویل کوشش کے بعد لاش کے تیرہ ٹکڑے حاصل کر لیے مگر ایک ٹکڑے کو دریائے نیل کے ایک کیکڑے نے، جس کا نام آکسی رنج تھا، نگل لیا۔ یہ کیکڑا ایک شیطان کی شکل میں دریائے نیل میں رہتا تھا اور اس کی آسیریس سے دشمنی تھی۔ جیسے ہی اس کو آسیریس کی لاش کا ٹکڑا نظر آیا، اس نے اپنے بغض اور حسد میں اس کو نگل لیا۔ اگر اسی اس کو یہ ٹکڑا بھی مل جاتا اور لاش کا جسم مکمل ہو جاتا تو آسیریس دوسری ابدی زندگی پا جاتا مگر چوں کہ جسم مکمل نہ تھا، اس لیے اسی اس نے اس کی لاش کو ممی بنا کر مردوں کی دنیا کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ دیودار اور تارپین کا تیل لایا گیا۔ دماغ سے مغز، پیٹ سے انتڑیاں اور جسم کے دیگر حصوں سے دوسرے اعضاء نکال لیے گئے۔ پھر لاش کو ممی بنا کر چالیس دن تک ایک جگہ پر محفوظ رکھا گیا اور پھر اسی، اس کو آمن را کے پاس آسمانوں میں اڑا کر لے گئی۔ کہانی کے مطابق یہ پہلی ممی تھی، جو دنیا میں بنائی گئی۔ مصریوں نے چونکہ آمن را کو دوسری زندگی پاتے اور

آسمانوں کی طرف واپس جاتے دیکھ ہی لیا تھا اور اسی اس نے دوسری ممی ان کے سامنے بنائی تھی، جس میں جسم کی کمی رہ گئی تھی اور اسی بنا پر اسے ابدی زندگی نہیں حاصل ہوسکی۔ چنانچہ مصریوں میں یہ خیال پختہ ہوگیا کہ اگر جسم مکمل ہو اور اس کی صحیح طریقے سے ممی بنائی جائے تو دوسری زندگی مل ہی جاتی ہے۔ پھر اس کہانی کے مطابق عام لوگوں کو بھی دیوتاؤں کی ادبی زندگی اور موت کے بعد حیات حاصل کرنے کا راز معلوم ہوگیا اور وہ بھی اپنے مردوں کی ممیاں بنانے لگے"۔

سرجان مارشل نے اس موقع پر تھوڑا توقف کیا، تھوڑا سا پانی پیا، کچھ دم لیا اور پھر لیکچر کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے کہ اس کہانی سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ قدیم مصر میں آسمان سے کچھ لوگ نیچے اترے اور انہوں نے مصریوں کو تعلیم دی اور ان پر حکومت کی اور پھر لوٹ گئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اس کہانی کو محض تصوراتی مان لیں تو جو سچ اس میں سے ابلا پڑ رہا ہے، اسے کہاں چھپائیں گے اور پھر یہ کہ قدیم مصریوں کے یہاں جو دیوتا آمن را اور آسیریس کا تذکرہ بار بار ہوا ہے، اس کو کہاں لے جائیں گے؟ آسمانوں سے دیوتاؤں کے زمین پر اترنے کی یہ پہلی کہانی نہیں ہے۔ کئی جگہ تو اس کے آثار تک مل گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسرے سیارے سے آنے والی مخلوق کی آمدورفت زمین پر مستقل تھی۔ انہوں نے قدیم انسانوں کو وہ تعلیمات دیں، جن کی بدولت ان کا سائنسی علم آج کے ترقی یافتہ دور کے انسان سے بھی بلند ہوچکا تھا۔ ان ترقی یافتہ قوموں میں وادی دجلہ کے سمیری اور جنوبی امریکا کے انکا اور مایا قبیلہ بہت ممتاز ہیں۔

اس سے قبل کہ چین میں دیوتاؤں یا خلائی مسافروں کے زمین پر آنے کا حال بتاؤں، یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دنیا میں مصر کے علاوہ ہر جگہ ایسے شواہد بکھرے ہوئے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے سیاروں سے آنے والے بھی نہ صرف آتے تھے بلکہ اپنی علمیت اور تکنیکی مہارت کے نشانات چھوڑ جاتے تھے، جو دنیا کے مختلف ممالک کے کھنڈروں سے دستیاب ہو جاتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کے جدید انسان سے کہیں زیادہ آگے تھے۔

ہوا سے چلنے والی گول پہیوں کی ڈرائنگ جو جیوے پٹی میں ملی، اس کی قدامت کا اندازہ چھ ہزار سال قبل مسیح لگایا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ ہزار سال قبل کا انسان ہوا کی طاقت کو سمجھتا تھا اور اس سے آجکل کی مروجہ عام ہوائی چکیوں کی طرح سے کام لیتا تھا۔ یہ ہوا سے انرجی (طاقت) پیدا کرنے کا علم اسے کس نے سکھایا۔ کیا اس دنیا کی کوئی قوم تھی یا خلائی استاد تھے؟

پتھروں کو آگ میں تپا کر مختلف سائز میں ڈھالنے کا کام آج سے چالیس ہزار سال قبل لوگوں میں عام تھا۔ کئی جگہ اس کی شہادتیں ملیں۔ خصوصاً کار کوبے اور باراد وشیاں میں اس قسم کے کئی پتھریلے، پتھروں سے آگ نکالنے اور پھر آگ سے پتھروں کے پگھلانے اور طرح طرح کے اوزار، بلاک اور مختلف اشیائے استعمال کا سراغ لگا۔ اسی طرح بیشی اشباب میں تیرہ ہزار سال پرانے ایسے پتھروں کے مقبرے اور پتھروں کے اوزار ملے، جو پتھروں کو تراش کر نہیں بلکہ پگھلا کر بنائے گئے تھے۔ ایران اور عراق کی سرحد پر کرسر شہر میں پتھروں پر کھدی ہوئی تصویریں اور پتھروں کی بنی ہوئی مختلف چیزیں دستیاب ہوئیں۔ بردا بالکا کے علاقہ سے بھی اس قسم کی چیزیں ملیں۔ سب سے زیادہ سنسنی خیز دریافت دو ڈھانچے تھے، جو شاندیار، عراق کے غاروں سے ملے۔ اس کی قدامت پینتالیس ہزار سال قبل مسیح متعین کی گئی۔

زیادہ تر یہ دریافت اس علاقہ میں ہوئیں، جسے تاریخ داں سمیری تہذیب کا مرکز سمجھتے ہیں۔ یعنی عراق اور شام (دجلہ اور فرات کی وادی) کے ممالک۔ یہ ہی وہ علاقے ہیں، جہاں سمیری تہذیب پھلی اور پھولی اور اس تہذیب کے ذریعے بابل، نینوا اور ار جیسے شہر آباد ہوئے مگر سوال یہ ہے کہ سمیریوں کو یہ علم کس طرح ملا اور پھر یہ سمجھنا کہ سمیری تہذیب صرف عراق اور شام کے علاقوں ہی تک محدود رہی، صحیح نہیں ہے کیونکہ حیرت زدہ کر دینے والی دریافتیں افریقہ کے شمالی ساحل سے عراق کی وادیوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لبنان میں ٹیک ٹائیٹ نام کی کچھ چٹانیں ملی ہیں، جن میں شیشے کی طرح چکنی صاف شفاف اور آر پار دیکھی جانے والی خصوصیات موجود ہیں۔ جب ان چٹانوں کے ٹکڑوں کا تجربہ گاہوں میں تجزیہ کیا گیا تو ان میں ایٹمی تابکاری کے ایلومونیم آئیسولوپ ملے۔ یہ ایٹمی تابکاری کبھی بھی قدرتی نہیں ہوتی بلکہ پیدا کی جاتی ہے۔ کن انسانی ذہنوں اور کن انسانی ہاتھوں نے ایٹم کی یہ گنجلک گتھی سلجھائی اور کس نے ایٹم سے ایٹمی تابکاری پیدا کی۔ مصر اور عراق میں شیشے کے ایسے لینس ملے ہیں، جو کئی ہزار سال پرانے ہیں۔ یہ عدسہ (لینس) اس وقت تک نہیں بن سکتے، جب تک شیشہ کو بجلی اور کیمیائی عمل سے نہ گزارا جائے۔ یعنی جب تک کہ کیلشیم آکسائیڈ کا استعمال نہ کیا جائے،

لینس بن ہی نہیں سکتے۔ الیکٹرو پلیٹنگ کا کام بذاتِ خود ایک اعلیٰ سائنسی اور فنی معلومات کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ اس سے قبل نہیں۔ یہ علم اور مہارت غاروں میں رہنے والے وحشی انسان سے کیونکر متوقع ہوسکتی ہے۔ عراق میں حلوان کے علاقے میں ایک مقبرے سے کپڑے کا ایک ایسا نفیس باریک اور عمدہ ٹکڑا ملا ہے، جو کسی جدید ٹیکسٹائل فیکٹری ہی میں بنایا جاسکتا ہے۔ وہ بھی ایسی فیکٹری میں، جہاں اعلیٰ فنی مہارت کے کاریگر اور باریک تار بنانے والی مشینیں لگی ہوئی ہوں۔

بغداد کے عجائب گھر میں قدیم کھنڈرات سے برآمد ہونے والی بہت سی ایسی بیٹریوں کے سیل بھی آپ کو نظر آجائیں گے، جو آج کل بیٹریوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسی عجائب گھر میں بجلی کے ایسے ایلیمنٹ بھی مل جائیں گے، جن میں تانبے کے الیکٹروڈ اور ایک نامعلوم دھات آج تک ایک راز ہے کہ یہ کس قسم کی دھات ہے اور کہاں پائی جاتی ہے۔ اس کی خصوصیات بھی مختلف ہیں اور ہماری آپ کی دنیا میں پائی جانے والی کسی دھات سے مماثلت نہیں رکھتی۔

پگھلائے ہوئے پلاٹینیم سے بنے ہوئے زیورات جنوبی امریکا کے ملک پیرو کے علاقے کے کھنڈرات سے دستیاب ہوئے۔ پلاٹینیم کے پگھلانے کے لیے ۱۸۰۰ درجہ سنٹی گریڈ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حرارت لکڑی جلا کر یا کوئلہ دہکا کر پیدا نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ باقاعدہ مشینی ذرائع سے یا ایٹمی ذرائع سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ گویا ایک اعلیٰ درجہ کی فزکس یا کیمسٹری کی معلومات کے بغیر اور پیچیدہ مشینوں کی موجودگی کے بغیر پلاٹینیم کے پگھلانے اور اس سے زیورات بنانے کا تصور بھی ناممکن ہے۔

اسی طرح ینگ جین (چین) کے علاقے میں ایک قبر سے ایک ڈھانچہ برآمد کیا گیا، جس کی کمر میں ایک پیٹی بندھی ہوئی تھی، جو کہ ایلومونیم سے بنی ہوئی تھی۔ یہ ڈھانچہ بھی لگ بھگ چار ہزار سال قدیم تھا۔

نئی دہلی میں مسجد قوت الاسلام قطب الدین ایبک کی بنائی ہوئی سرزمین ہند کی پہلی بڑی مسجد ہے۔ اس کے صحن میں ایک لاٹ نصب ہے، جو لگ بھگ ساڑھے تین ہزار سال قبل کی خیال کی جاتی ہے اور اس لاٹ کو اشوک کے زمانے میں کسی جگہ سے لاکر اجودھیا میں نصب کیا گیا۔ پھر مسلمانوں نے اپنی عظمت کے اظہار کے طور پر مسجد قوت الاسلام کے ایک کونے میں لگادیا۔ یہ لاٹ بیس فٹ کے لگ بھگ اونچی ہے اور اس میں

ایسا لوہا اور تانبا استعمال کیا گیا ہے، جس میں سردی، گرمی، برسات، ہوا یا سلفر یا فاسفورس وغیرہ کچھ اثر نہیں کرتا۔ آخر یہ کون سا مرکب تھا اور کس طرح اس کی دریافت ہوئی۔ یہ سب انسانی ذہن کو ایک عجیب طرح کی پیچیدگی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں سے اس بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے کے انسانوں کو فزکس کا، کیمسٹری کا اور انجینئرنگ کا بڑا اچھا علم تھا۔ ان کو مختلف تیزاب، ان کی خصوصیات، مختلف مرکبات، ان کے عناصر اور آئسوٹوپس، سب ہی کا علم تھا اور وہ نہ صرف ان کا علم رکھتے تھے بلکہ ان کا استعمال بھی جانتے تھے۔

غرضیکہ ان ساری چیزوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو جاہل، وحشی اور غاروں میں رہنے والا درندہ نما انسان کہتے ہیں ہم قدیم انسان کو تو ان کے زمانے میں کوئی بے حد ذہین مخلوق بھی کرۂ ارض پر موجود تھی، جو ان وحشیوں سے روابط رکھے ہوئے تھی اور جو ان کو آج سے بھی زیادہ جدید علوم سکھاتی تھی۔

سرجان کا نظریہ یہ تھا کہ یہ مخلوق باہر کسی خلائی مسافر کے طور پر آسمانوں سے اترتی تھی۔ کم از کم ایک جگہ یعنی چین اور تبت کے سرحدی پہاڑی علاقہ بایان کارا اولا میں اس قسم کے ثبوت ملے ہیں کہ خلا سے آنے والے زمین پر اترتے تھے۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب کہانی ہے۔ اس کہانی سے یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو گئی کہ بارہ ہزار سال قبل یا اس کے لگ بھگ اس کرۂ ارض پر خلا سے آنے والی مخلوق کا باقاعدہ ایک رابطہ قائم تھا اور وہ اس دنیا میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔

"چین میں بایاں کارا اولا" کے سلسلہ کوہ میں جو چین اور قدیمہ جی پہوٹے نے ان پہاڑوں کے ڈھلوانوں کے ایک پہلو میں درختوں، پتھروں اور مٹی سے اٹا ہوا ایک غار دریافت کیا۔ اس غار کو جب صاف کرایا گیا تو اس میں قطاروں میں بنی ہوئی کئی قبریں نظر آئیں۔ جب ان قبروں کو کھودا گیا تو ان میں انسان جسم کے ڈھانچے سات آٹھ سال کے بچوں جیسے چھوٹے جسم کے تھے مگر ان کے سر کے خول آجکل کے تندرست اور توانا انسانوں کے سر سے بھی بڑے تھے۔ اسی غار سے گرینائیٹ کی بنی ہوئی تاش کے پتوں جیسی دو سینٹی میٹر موٹی سات سو سولہ پلیٹیں بھی نکلیں۔ ان تمام سنگی پلیٹوں کے بیچوں بیچ ایک سوراخ تھا اور اس سوراخ کے گرداگرد گول گول دائروں جیسی کھدائی تھی، جیسے آجکل گراموفون ریکارڈوں میں ہوتی ہے۔ یہ گول دائروں کی تحریر یا لکیریں ان

پلیٹوں کے آخری سرے تک جاتی تھیں۔ ان پلیٹوں کے علاوہ اس غار کی دیواروں پر چٹانی ڈرائنگ بھی بنی ہوئی تھی۔ ان تصویروں میں اسی چھوٹی مخلوق کو ہیلمٹ جیسی گول ٹوپیاں اوڑھے ہوئے دکھایا گیا تھا اور مٹر کے دانوں جیسے نقطوں کی لائن بنا کر ان لوگوں کا رخ چاند اور سورج کی طرف دکھایا گیا تھا۔ اس دریافت کو شروع شروع میں کوئی اہمیت نہ دی گئی بلکہ یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ چینی اور تبت کے سرحدی پہاڑوں اور صحرائی علاقوں میں ایک زمانہ میں ڈروپا اور کھام قبائل آباد تھے۔ ان کے قد پانچ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ خیال کیا گیا کہ ان قبائل کے زمانے میں کوئی جتھا ان پہاڑوں کی طرف آنکلا ہوگا، جس نے اس قسم کی پتھریلی پلیٹیں بنائیں اور فارغ وقتوں میں پہاڑوں اور غاروں میں بیل بوٹے بنائے اور پھر اپنے مرنے والوں کو دفن کرتے رہے مگر اس نظریہ میں دو باتوں کو بالکل اہمیت نہیں دی گئی۔ ایک تو یہ کہ ان ڈھانچوں کے سر اور کھوپڑیاں اتنی بڑی کیوں تھیں اور یہ کہ ان کے سروں پر ہیلمٹ کیوں دکھائے گئے تھے۔ اسی طرح ان پلیٹوں پر بھی کوئی خاص ریسرچ نہیں کی گئی، نہ ہی ان تحریروں اور لکیروں کو توجہ سے دیکھا گیا، جو ان پلیٹوں پر کھدی ہوئی تھیں۔ حد تو یہ ہے کہ اس نکتہ پر بھی غور نہ کیا گیا کہ گریناٹیٹ کی ایک بھی قسم ان پہاڑوں کے اردگرد موجود نہ تھی۔ یہ صحرائی بنجر اور چٹیل پہاڑی سلسلہ کچی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ستم ظریفی اور تن آسانی کی حد تو یہ ہے کہ چینی تاریخ دانوں نے بھی اس دریافت پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ حالانکہ تاریخ دانی اور آثار قدیمہ کا فن دو مختلف فنون ہیں۔ انہوں نے یہ نظریہ بھی قائم کر لیا کہ ڈروپا اور کھام کے جن قبیلوں کی یہ قبریں ملی ہیں۔ دراصل وہ پہاڑی گوریلوں کی ایک ختم شدہ نسل کا وہ سلسلہ ہیں، جن کی ترقی یافتہ شکل بعد میں ڈروپا اور کھام کے قبیلوں کی صورت میں اجاگر ہوئی ہوگی مگر ظاہر ہے کہ یہ نظریہ قابل قبول نہ تھا۔

اس دریافت پر بیس سال تک لوگ سر کھپاتے رہے۔ آخر کار پروفیسر میٹم اوم نوئی، جو پیکنگ کی اکیڈیمی آف پری ہسٹارک ریسرچ (ما قبل تاریخ کی تحقیقاتی اکیڈمی) کا سربراہ تھا۔ اس نے ان پلیٹوں کی تحریروں کے کچھ حصوں کو پڑھنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جیالوجسٹ اور علم فزکس کے ماہرین کے ساتھ مل کر اس نے یہ دریافت کیا کہ ان سنگی پلیٹوں میں اعلیٰ درجہ کا کوبالٹ کا عنصر اور دھاتوں کے اجزا شامل ہیں اور یہ کہ ان پلیٹوں پر لکھی ہوئی تحریروں کو بجلی کی برقی رو کی لے پر لکھا گیا ہے، جیسے کہ

گراموفون کے ریکارڈ کو بجلی کی برقی رو کی لہروں سے تحریر کیا جاتا ہے لیکن اس قسم کے سخت پتھروں پر بجلی کی لہروں سے کھدائی کرنے کے لیے ان پلیٹوں کو بجلی کی بڑی دولٹیج سے گزارا گیا ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ پتھر بنے بنائے نہیں تھے بلکہ بنائے گئے تھے۔ لکیروں سے جو آوازیں شناخت ہوئیں ان سے یہ الفاظ اور یہ کہانی بنی۔ (جوزف میلکم)

اس تجزیہ کے بعد ان تحریروں کی طرف توجہ کی گئی اور گراموفون کی سخت سوئیوں کے ذریعہ ان پلیٹوں میں بند آوازوں کو سننے کی کوشش کی گئی۔ تمام الفاظ اور آوازیں ناقابل فہم تھیں مگر ان میں ایک مخصوص کیفیت تھی، لہجہ کا اتار چڑھاؤ تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ کچھ لہجہ بار بار دہرایا جاتا تھا۔

یہاں سنگی پلیٹوں کی کہانی ختم ہو گئی مگر ان خلابازوں کی داستان ابھی باقی ہے۔

"اندھیرا پھیلا، رات آئی مگر یہ رات ایسی تھی جس کے بعد ان بدنصیب خلائی مسافروں کو نئی صبح دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ نہ اُجالے کی کوئی ایسی کرن چمکی جو اُن کی قسمت کے اندھیروں کو زندگی کی روشنی میں بدل دیتی۔ قرب و جوار کے قبیلوں کے جنگ جو اور مذہبی جنون والے تشدّد پسند جنہوں نے ان خلائی مسافروں کی آمد کو منحوس قرار دیا تھا، آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے اور انہوں نے چن چن کر ان تمام لوگوں کو مار ڈالا اور پھر اس خیال سے کہ یہ زرد چہرے والے بدہئیت انسان اپنی نحوست ان قبیلوں تک نہ پھیلادیں ان کی لاشوں کو بھی وہیں زمین میں دفن کر دیا اور ان کی پلیٹوں کو بھی وہیں چھوڑ کر غار کو مٹی اور پتھروں سے پاٹ دیا۔

داستان کا باقی حصّہ فقط خیالی ہے تحریری نہیں۔ مگر اس کی سچائی کا علاوہ اس کے اور کوئی ثبوت نہیں کہ قبریں، پلیٹیں اور ڈھانچے بارہ ہزار سال کے بعد پھر مل گئے ہیں۔ ایک اور ثبوت بھی ہے اور وہ یہ کہ اس علاقہ یعنی بایان کارااولا کے قرب و جوار میں ایک دیو مالائی کہانی آج تک لوک کہانیوں کے طور پر لوگوں میں موجود ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ آسمانوں کے دیوی دیوتا اس علاقے میں آیا جایا کرتے تھے۔ آگ کی سواریوں میں بیٹھ کر وہ پہاڑوں پر اُترتے اور پھر واپس چلے جاتے تھے۔ ایک بار ان کی آگ کی سواری دیوتاؤں کے نوکروں اور غلاموں نے چُرالی اور پہاڑوں کی سیر کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ جب آگ کو پتہ چلا کہ دیوتا کی بجائے غلام اس پر حکم چلا رہے ہیں تو آگ کی سواری نے ان کو زمین پر پھینک دیا۔ یہ ملازم بڑے بدصورت اور ڈراؤنے تھے۔ نحوست ان کے چہروں

پر لکھی ہوئی تھی۔ اسلئے تالی بجانے مہب ملانے کے لوگوں نے ان کو دیکھا تو ایک رات مل کر کے سب کو پتھروں سے کچل ڈالا۔ اور ان کے گھر کو مٹی اور پتھر سے بھر دیا کہ ان کے جسم اور ان کی روحیں کبھی باہر نہ نکل سکیں۔

نوٹ:۔ اس پوری کہانی کو بعد میں "سنگی ساسوں" کا نظریہ کہا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر والے شاسلیو نے اس نظریہ کو مشہور رسالہ "SPUTNIK" میں شائع کیا۔ یہ پوری کہانی پیکنگ اکیڈمی اور تائپے، فارموسا کی تاریخی دستاویزات کی لائبریری میں محفوظ ہے جہاں پلیٹیں اور ڈھانچے بھی رکھے ہوئے ہیں۔

سر جان مارشل نے کہا کہ اس پوری کہانی میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ تقریباً بارہ ہزار سال کی قدامت ہے یعنی دس ہزار سال قبل مسیح میں یا اس کے لگ بھگ آسمانی مخلوق زمین پر آتی جاتی تھی۔ اس سے قبل کہ آسمانی مخلوق اور ان سے متعلق ایسے مختلف ثبوتوں کے بارے میں بحث اور تفصیل شروع کرتے سر جان مارشل نے ایک اور چونکا دینے والا شوشا چھوڑا۔ انھوں نے ہیروڈوٹس کا حوالہ دیا۔ ہیروڈوٹس نے جو قبل مسیح کا پہلا مستند مصری سیاح اور تاریخی وقائع نگار تسلیم کیا جاتا ہے اپنی کتاب میں جو ۴۸۴ قبل مسیح کی تحریر کردہ ہے لکھتا ہے کہ جب ہیروڈوٹس اہرام کے قریب کسی قدیم مصری کاہن سے ملا تو وہ اس کو اپنے مندر میں لے گیا۔ وہاں ہیروڈوٹس نے دیکھا کہ مختلف صورتوں کے سینکڑوں بُت ایک بڑے کمرے میں رکھے ہوئے ہیں۔ جب ہیروڈوٹس نے پجاری سے پوچھا کہ یہ کس کے بُت ہیں تو اس نے کہا یہ مندر نیل کی وادی کا سب سے بڑا اور سب سے پرانا مندر ہے اور اس کا پجاری تمام پجاریوں کا مہاشن مانا جاتا ہے۔ یہ بت کُل ۳۸۴ ہیں اور ہر بت اپنے وقت کے مہان پجاری کا بُت ہے جو وہ اپنی زندگی ہی میں بنواتا تھا۔ خود اس نے ہیروڈوٹس کو اپنا بت بھی دکھایا جو اس کی زیرِ نگرانی تراشا گیا تھا۔ گویا اس طرح ۳۸۴ پجاریوں کی نسلیں اپنا اپنا وقت گزار چکی تھیں۔ ہیروڈوٹس نے پوچھا "پجاری اپنے بُت کیوں بنواتے ہیں اور ان کی حفاظت کیوں کی جاتی ہے؟"

مہان پجاری نے جواب دیا "تین سو چوراسی پجاریوں کی زندگی سے قبل آسمانی دیوتا وادیٔ نیل میں آتے جاتے تھے۔ یہاں علم سکھاتے تھے اور ہماری رہبری کرتے تھے۔ پھر وہ اپنا کچھ علم ہمیں سونپ گئے اور انہیں نے ہمیں اپنا نمائندہ بنا کر حکم دیا کہ ان کے بتلائے ہوئے طریقوں پر زندگی گزاریں اور ان کے سکھلائے ہوئے علوم کی حفاظت کریں۔ ایک

دن وہ پھر آسمانوں سے لوٹ آئیں گے۔ چنانچہ آج تک اسی طرح کیا جاتا ہے اور ہر پجاری اپنا بُت بنا کر محفوظ کر جاتا ہے کہ دیوتا جب یہاں آئیں تو ان کو معلوم ہو جائے کہ ان کے حکم اوران کے علم کی کس کس نے پیروی کی۔ ہیروڈوٹس نے اندازہ لگایا کہ اگر ہر پروہت کا زمانۂ اقتدار اوسطاً پچیس سال بھی لگایا جائے تو ۴۸۴ قبل مسیح تک یعنی ہیروڈوٹس کے زمانے تک نو ہزار چھ سو سال گزر چکے تھے اور اگر اسی مدت میں قریباً ڈھائی ہزار سال اور بھی شامل کر لیں جو ہیروڈوٹس کے زمانے سے آج تک کا عرصہ ہے تو یہ کُل مدت بارہ ہزار ایک سو سال کے قریب بنتی ہے۔ یعنی آج سے تقریباً بارہ ہزار سال قبل آسمانی مخلوق وادی نیل میں بھی آتی جاتی تھی اور گزر بسر بھی کرتی تھی۔ ان ہی کو اقتدار حاصل تھا اور وہی مقامی وحشی انسانوں کو علم سکھاتے تھے اور یہی وہ زمانہ ہے جو بایان کارا اولا کے غار سے دریافت ہونے والی سنگی پلیٹوں کے معائنہ اور اُس غار کی چٹانی تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح چین سے لے کر مصر تک خلا سے آنے والوں کے آثار موجود ہیں۔ خواہ وہ کسی صورت میں موجود ہوں مگر ان کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

اب مصر اور چین کے ان آثار سے الگ ہٹ کر سر جان مارشل نے ایک سیر حاصل تبصرہ جنوبی امریکہ کے مختلف ملکوں پر کیا۔ ان میں پیرو، برازیل اور ارجنٹائن کے ممالک شامل ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ قدیم نسلوں کے کیسے کیسے تحیر خیز مظاہر ان ممالک میں بکھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پیرو اور ارجنٹائن میں (سات سو) سولہ ہزار سال قبل نہایت ترقی یافتہ قوموں کی آبادی کی نشانیاں ملی ہیں جن میں ان کا مایا قبیلہ یا نسل کے لوگوں کی بنائی ہوئی تحیر خیز عمارتیں شامل ہیں۔ یہ عمارات آکسل، چیچن اتصا اور یوکتان کے قدیم کھنڈرات میں دریافت ہوئیں۔ مگر ان کی حالت بہت عمدہ ہے۔ خصوصاً آکسل میں پایا جانے والا اہرام جسے جادوگر کا اہرام کہا جاتا ہے بے حد عمدہ حالت میں موجود ہے۔ آکسل میں چھوٹے بڑے تیس چالیس اہرام موجود ہیں۔ ان میں اور مصری اہراموں میں فقط ایک فرق ہے کہ مصر میں اہرام کی اوپری تکون کو چورس نہیں کرتے تھے جب کہ آکسل (جنوبی امریکہ) میں تمام اہراموں کی چھت چبوترہ نما ہے۔ مایا اور انکا دوایسی پُراسرار قومیں جنوبی امریکہ میں اپنے تمدّن کا خاکہ چھوڑ گئی ہیں جن کے متعلق سوچ سوچ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مایا قوم نے صفر ایجاد کیا جو ان کے حساب و کتاب اور تخمینہ لگانے میں بے حد مدد و معاون ثابت ہوتا تھا۔ مایا کیلنڈر اپنے ۳۶۵ دنوں کے

حساب میں اس قدر صحیح تھا کہ آج کل کے موجودہ کیلنڈر میں بھی ایک سال میں سترہ سیکنڈ کا فرق نکلتا ہے مگر ان کا کیلنڈر سیکنڈوں کے ایک ہزارویں حصہ تک بالکل درست تھا۔ جنوبی امریکہ ہی کی ریاست پیرو میں آکسل کے قریب کوزکو کے مقام پر ایک بہت بڑی آبادی کے آثار ملے ہیں اور اس آبادی میں مُردوں کو دفن کرنے کا رواج تھا۔ یہاں بے شمار کھوپڑیاں ملی ہیں جن کے سروں پر مختلف حصوں میں ایک چاندی کا شلنگ یا روپیہ کے برابر سوراخ ملے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں پیرو میں دماغ کے آپریشن کا نازک عمل عام تھا اور اس آپریشن سے لوگ بچ بھی جاتے تھے۔ اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ جن مقامات پر ہڈیاں کاٹی گئیں ان ہی جگہوں پر نئی ہڈیوں کے بڑھنے اور دوبارہ پیدا ہونے کے نشانات بھی ملے ہیں۔ یہ دماغی سرجری فقط پیرو ہی میں نہیں بلکہ چلی کے علاقہ ٹالکا میں بھی عام طور پر مستعمل تھی۔ ٹالکا میں جتنی کھوپڑیوں میں سوراخ ملے یعنی جن کا آپریشن کیا گیا ان میں سے پچاس فی صد ایسی ہیں جن میں ہڈیوں کے سیل (خلیہ) دوبارہ نشوونما پاگئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام دماغی آپریشن میں سے ۸۵ فیصد لوگ صحت یاب ہو جاتے تھے۔ صحت یابی کا یہ اوسط اتنا عمدہ ہے کہ آج بھی دماغی سرجن اس اوسط کو نہیں پہنچ پاتے۔ اس بات کے بھی واضح امکانات ملے ہیں کہ جنوبی امریکہ کے مایا اور انکا سرجن دماغ کی ایک کھوپڑی سے دوسری کھوپڑی میں منتقلی کا کام بھی کرتے تھے۔ اسی طرح دل کا آپریشن، اس کی تبدیلی اور منتقلی بھی اس علاقے میں عام تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی امریکہ ہی سے علاج معالجہ اور آپریشن اور سرجری کی سائنس دنیا کے دوسرے حصوں میں پہنچی۔ یہ قوم چار ہزار تا پانچ ہزار سال قبل مسیح یکایک معدوم ہو گئی۔ کوزکو کے قریب ہی دو اور کھنڈر ہیں جو انکا تہذیب کے نمائندے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام سکساہومان اور دوسرے کا نام لیکا ہے۔ ان علاقوں میں پتھروں کے بڑے بڑے بلاک بلکہ چٹانوں کی سائز کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر بڑے بڑے قلعے، مکان اور مقبرے بنائے گئے۔ اسی طرح پہاڑوں پر جو بارہ ہزار فٹ یا اس سے زیادہ اونچے تھے آبادیوں کے آثار ملے ہیں۔ جن میں اولیا ٹاٹا مبو اور درے چوبی جی کے نام کی دو آبادیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کہ ان میں پوری پوری پہاڑیوں کو اس طرح کاٹ دیا گیا ہے جیسے تیز چھری سے صابن کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ یہ پہاڑوں کو کاٹ دینے کا فن اور بڑی بڑی چٹانوں کو تراش کر قلعوں اور مقبروں میں لگانے کا طرزِ تعمیر کسی نہ کسی طرح

اہرام کے طرزِ تعمیر سے منسلک نظر آتا ہے۔ وہاں بھی بیس پچیس ٹن کے پتھروں کو ہموار کاٹ کر ۲۸۱ فٹ کی بلندی تک، جیسا کہ خوفو کے اہرام میں ہے لے جایا گیا۔ ان کا اہر مایا قبیلہ دونوں کے دونوں آج کل کی تہذیب سے زیادہ مہذب تھے۔ ان کا علم الابدان، علم تعمیرات اور علمِ سرجری نہایت ترقی یافتہ تھا۔ ان کے علاقے سے جو باقیات ہم تک پہنچی ہیں ان میں یوں تو سوچنے اور غور کرنے کے لیے بہت سی چیزیں ہیں مگر دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو بڑے بڑے پتھروں کو کاٹ کر اونچائیوں تک لے جانے اور ان کو استعمال کرنے کا فن اور دوسرا ان کی عمارتوں میں نظامِ شمسی اور علمِ نجوم اور علمِ فلکیات سے تعلق کا عکس جو قریب قریب ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

جنوبی امریکہ کی مایا تہذیب والی قومیں بے حد ذہین اور عالم و فاضل لوگوں پر مشتمل تھیں۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ سیارہ وینس کا ایک سال ۵۸۴ دنوں کا ہوتا تھا۔ ان کو زمین کی گردش کے سال کا وقفہ بھی معلوم تھا جو اُن کے خیال میں ۳۶۵،۲۴۲۰ دنوں پر مشتمل تھا۔ آج کی موجودہ تحقیقات کے مطابق یہ مدت ۳۶۵،۲۴۲۲ دنوں پر شمار کی گئی ہے۔ گویا ہم پانچ ہزار سال میں ۰۰۰۶ء دن یعنی سال بھر میں صرف سترہ سیکنڈ کا فرق معلوم کر سکے ہیں جو ممکن ہے کہ پانچ ہزار سال میں زمین کی گردش کی کسی تبدیلی کی وجہ سے ہو گئی ہو۔ مایا قبیلہ میں جو زمین کی گردش کے حساب سے کیلنڈر متعین کیا گیا تھا وہ چونسٹھ لاکھ سالوں کے لیے مستعمل ہو سکتا تھا۔ بلکہ بعد میں جو تحریریں اور کتبے ملے ہیں ان کے حسابات سے دوسرے کیلنڈر تقریباً چالیس کروڑ سال کے لیے کارآمد رکھے گئے تھے۔ فقط یہ بات ہی کہ پانچ ہزار سال قبل کسی قوم کو چالیس کروڑ تک کی گنتی معلوم تھی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ قوم حساب دانی میں کتنی ماہر تھی۔ اتنی لمبی گنتی کا علم آج فقط برقی دماغ یا کمپیوٹر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس دور میں بھی کمپیوٹر کی قسم کے کچھ ایسے آلات موجود رہے ہوں جو حساب و کتاب کی بالکل صحیح صورت سامنے لے آتے ہوں۔ ان ہی لوگوں نے چاند، سورج اور وینس کی گردش کا ایک ایسا فارمولا بھی ایجاد کیا تھا جس کے مطابق ۳۷۹۶۰ میں ان تینوں کی پوزیشن پھر ایک ہی نقطہ پر آ جاتی تھی۔ وہ فارمولا یہ تھا:

چاند ۳۷۹۶۰ : ۷۳ × ۴ × ۲۶۰ : ۱۳ × ۲۰

سورج ۳۷۹۶۰ : ۷۳ × ۵ × ۱۰۴ : ۱۳ × ۸

وینس   ۵ × ۱۳ : ۶۵ × ۸ × ۷۳ : ۲۷۹۶۰

اس فارمولے کی بنیاد یہ ہے کہ زمین کی گردش کا عرصہ سورج کے گرد جو ۳۶۵ دنوں کا ہے ۷۳ کے ہندسہ سے پانچ مرتبہ تقسیم ہوسکتا ہے۔ وینس کی گردش کا وقفہ ۵۸۴ دنوں کا ہے۔ یہ بھی ۷۳ کے ہندسہ سے آٹھ مرتبہ تسسیم ہوتا ہے۔ یہ حساب دانی ظاہر ہے کہ ترقی یافتہ دماغوں سے آئی ہے۔ پانچ ہزار سال قبل کے وحشی اور غاروں میں رہنے والے نیم جانور اور نیم درندہ انسانوں سے اس کی توقع مشکل ہے۔

مایا اور انکا کے جو اہرام ملے ہیں ان میں بھی اسی قسم کی حساب دانی کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً چیچن اتصا (میکسیکو) میں انکاسٹی لو کے مقام پر جو اہرام ملا ہے اس کے چاروں طرف سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ ہر ایک سمت میں ان سیڑھیوں کی تعداد ۹۱ ہے۔ گویا ۴ × ۹۱ = ۳۶۴۔ چاروں طرف کی سیڑھیوں کو ملا کر ایک سال کے ۳۶۴ دنوں کا حساب رکھا گیا ہے اور سب سے اوپر چھت کی طرف ایک چبوترہ بنایا گیا ہے جہاں چاروں سمتوں کی سیڑھیاں آ کر مل جاتی ہیں۔ اس کو بھی ایک سیڑھی شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح ۳۶۵ دنوں کا حساب مکمل ہو جاتا ہے۔ زمین کی گردش کا حساب کیوں رکھا گیا اور خاص طور سے سیارہ وینس ہی سے زمین کا تعلق کیوں پیدا کیا گیا؟ کیا قدیم انسانوں کا وینس سے کوئی تعلق تھا؟ کیا وہاں سے ان کو کسی قسم کی رہنمائی ملتی تھی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو فوری طور پر دماغ میں آتے ہیں مگر ان کا کوئی حتمی جواب نہیں ملتا۔

جنوبی امریکہ کا پورا براعظم جس میں گوئٹے مالا، پیرو اور ارجنٹائن کے ممالک خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ایک عجیب و غریب پُراسرار فنِ تعمیر کا مظہر بھی ہے جس کی کوئی توجیہہ نہیں ہوسکتی۔ جنوبی امریکہ مصر ہی کی طرح ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی گم شدہ جنت ہے۔ اس کے ایک ایک گوشہ میں قدیم قوموں اور ان کے بادشاہوں کے ایسے عجیب و غریب اسرار پوشیدہ ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ امریکہ کی اونچی اونچی عمارات اب نیویارک کی اسکائی اسکریپر کی شکل میں موجود ہیں مگر ان کی تعمیر سے قبل جنوبی اور شمالی امریکہ کی بلند ترین عمارت گوئٹے مالا کی ٹکال کی عبادت گاہ کو کہا جاتا تھا جو ۲۱۲ فٹ بلند تھی۔ اس عمارت کو اب صرف ٹکال چہارم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ ایک اہرام نما مینار کی صورت میں موجود ہے جسے اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی میں جنگلوں سے ڈھکی ہوئی وادی سے برآمد کیا گیا ہے۔ یہ علاقہ مدتوں غیر آباد رہا۔ درختوں، گھنے جنگلوں اور

زہریلے کیڑے مکوڑوں کی بہتات کی بدولت صدیوں تک انسانی قدم یہاں تک نہ پہنچ پائے۔ تکال کی عبادت گاہ کی تعمیر تین ہزار سال قبل خیال کی جاتی ہے۔ اسی طرح بولیویا کی مشہور جھیل ٹی ٹی کاکا کے قریب عظیم الشان پتھروں سے تعمیر کیے ہوئے شہر ٹیاہوانا کو کے آثار ملے جو تیرہ ہزار فٹ کی ایک بے آباد اور نسبتاً ویران پہاڑی پر کوئی چھ ہزار سال قبل مسیح بسایا گیا تھا۔ یہ شہر یا آبادی جو نام بھی آپ اسے دینا چاہیں اتنی بلندی پر ہے کہ یہاں پر کوئی غلہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلیاں زندہ نہیں رہ سکتیں، سفید فام عورتوں کی زچگی نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود یہاں اور اس جگہ کے قریب ہی چھوٹی بڑی پندرہ بیس آبادیوں کے نشانات برآمد ہوئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں پر کافی بڑی آبادی موجود تھی۔ علاوہ اس بات کے اس علاقے میں رہنے بسنے والے لوگوں کو غلہ کس جگہ سے فراہم ہوتا تھا۔ اور ضروریات زندگی کس طریقے پر مہیا ہوتی تھی آج تک ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ پہاڑوں پر جانے کے لیے سڑکیں، گزرگاہیں اور راستے وغیرہ کچھ نہیں ہیں۔ اور غذا کی فراہمی کے بغیر کسی بڑی آبادی کا تصور بھی محال ہے۔ پھر کیوں اور کس طرح لوگ یہاں آباد ہوئے؟ کس طرح زندہ رہے؟ کس طرح گزر بسر کرتے رہے؟ آج تک تاریخ دان اس مسئلے کا سراغ نہیں لگا سکے۔ پھر دوسری بات جو کہیں زیادہ تعجب خیز ہے وہ یہ ہے کہ یہاں بنے ہوئے مکان مٹی، گارے اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کے نہیں بلکہ بہت لمبے چوڑے اور بڑے پتھروں سے بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض پتھروں کا وزن پچاس سے لے کر دو سو ٹن تک شمار کیا گیا ہے۔ خصوصاً جو پتھر بڑے مکانوں اور عبادت گاہوں کی بنیاد میں استعمال کیے گئے ہیں ان کا وزن کا تخمینہ کم و بیش دو سو ٹن سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ وہ لوگ کون تھے جو دو سو ٹن کے پتھروں کو معمولی اینٹوں کی طرح استعمال کرتے تھے؟ اور آخر ان بڑی بڑی چٹانوں کو کون اور کس طرح کھینچ کھینچ کر ترتیب وار ایک قطار میں جماتا تھا اور پھر ان کو تراش کر ایک چکنی اور صاف سطح میں تبدیل کرتا تھا؟ ایک عام آدمی حد سے حد سو کلو گرام یعنی ڈھائی من کا بوجھ بڑی مشکل سے اٹھا پاتا ہے اور ایک ٹن میں ایک ہزار کلو گرام تقریباً ۲۶ من کے برابر وزن ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف ایک ٹن وزن اٹھانے کے لیے نہایت تنومند، تندرست اور صحت مند گیارہ آدمی درکار ہوں گے اور دو سو ٹن اٹھانے کے لیے دو ہزار سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہوگی تب اس جیسا صرف ایک پتھر اپنی جگہ پر رکھا جا سکے گا۔ کیا عقل اس بات کو تسلیم کر

سکتی ہے کہ جو مکان ایک آدمی سے آسانی سے اٹھائے جانے والے کم وزن پتھر سے بن سکتا ہے اسے اتنی عظیم الشان چٹانوں سے بنانے کی ضرورت تھی؟ اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ اس زمانے کے لوگ ہم سے بہت زیادہ تنومند اور طاقت ور تھے تب بھی زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر دو ہزار نہیں تو ایک ہزار آدمیوں نے مل کر ایسی مہیب چٹانیں اٹھائی ہوں گی، مگر پھر یہ مسئلہ آتا ہے کہ ایسی چٹانیں ایک دو نہیں، ہزارہا ہیں تو ان کی تراش خراش، صفائی اور تمام کاموں کے لیے ہزارہا کاریگروں اور مزدوروں کی ضرورت پڑی ہوگی۔ ان سب کے لیے غذا کا انتظام ضرور ہوا ہوگا۔ تیرہ ہزار فٹ پر کھیت اور کھلیان نہیں تھے، قرب و جوار کا علاقہ پہاڑی اور کاشت کے لیے غیر موزوں، پھر ان کو ضروریات زندگی کس طرح ملی ہوں گی؟ ان سوالوں کا جواب آج تک نہیں مل سکا ہے۔

ہاں، جب اسپینی فوجیں چودھویں اور پندرھویں صدی میں اس علاقے میں داخل ہوئیں اور پہاڑوں سے نیچے ان کو دو قبیلوں کی آبادیاں نظر آئیں تو اسپینی ان کے ساتھ گھل مل گئے۔ ان قبیلوں کے نام قوئی شوا اور آئی مارا تھے۔ ان کے یہاں عموماً یہ کہاوت مشہور تھی کہ پہاڑوں کے اوپر عظیم الشان مکانوں میں دیوتا رہتے ہیں۔ وہ آسمان سے آتے ہیں اور آسمان ہی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ قوئی شوا اور آئی مارا دونوں ہی قبیلوں میں سے کبھی کوئی ان پہاڑوں پر نہیں گیا تھا اس لیے کہ اوپر جانے کے لیے پہاڑی راستہ بے حد دشوار گزار اور کٹھن تھا اور یہ کہانی کہ پہاڑوں پر دیوتا رہتے ہیں ان کی نسلوں میں سینہ بہ سینہ چلی آتی تھی۔ ظاہر ہے اس کہانی میں سچائی موجود ہے۔ مگر دیومالائی داستانوں کی کیچڑ سے سچائی کے اجزاء برآمد کر لینا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کہ کسی بھرے ہوئے گندے نالے میں گرے ہوئے لوہے کے ایک ٹکڑے کو ڈھونڈ نکالنا۔ حالانکہ ڈھونڈنے والے کو یہ یقین ہوگا کہ اس لمبے چوڑے نالے میں وہ لوہے کا ٹکڑا جو اس کے ہاتھ سے ابھی ابھی گرا ہے کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوگا۔ دیومالائی داستانوں پر بھی راویوں کے اپنے خیالات، انداز بیان اور طریق ادائیگی کی گرد جمی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اصلیت اور حقیقت انداز بیان کی رومانیت کی نظر ہو جاتی ہے۔

اور پھر یہ پہاڑوں کو کاٹ کر چٹانوں کو اینٹوں کے طور پر استعمال کرنے کا فن صرف گوئٹے مالا اور پیرو تک محدود نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں سینکڑوں ایسے مقامات ہیں جہاں عقل کو دنگ کرنے والے واقعات اور نہ معلوم کیسے کیسے عجائب بکھرے پڑے ہیں۔

پیرو ہی میں مارکا ہوسی نامی سطح مرتفع پر کئی جگہ بڑی بڑی چٹانوں کو تراش خراش کر انسانی صورتیں بنائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ شیروں، اونٹوں، بڑے بڑے مگرمچھوں اور قدیم زمانے کے ڈائنوسار (جو شاید آج کل کنگرو سے سوگنا بڑا ہوتا تھا اور جس کی نسل قریباً ایک لاکھ سال قبل معدوم ہو چکی تھی) کے مجسے تراشے گئے ہیں۔ پہاڑوں کو کاٹنے اور چٹانوں کو موم کی طرح تراش لینے کا فن اس زمانہ کے لوگوں کو کیسے آیا؟ اور کیوں انہوں نے اس پر محنت کی؟.... یہ ایسے سوالات ہیں جو بار بار ذہن میں اُبھرتے ہیں۔

مارکا ہوسی سطح مرتفع پر تراشے ہوئے جانوروں اور انسانی چہروں میں ایک اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی صحیح صورتیں ہر وقت واضح نظر نہیں آتیں بلکہ صرف ایک مخصوص وقت میں جب کہ سورج کی شعاعیں ان پر ایک خاص زاویہ سے پڑ رہی ہوں تو ان کے جسموں کی ساخت واضح ہو جاتی ہے۔ ورنہ وہ عام پہاڑوں سے مختلف نظر نہیں آتیں۔ تین چار ہزار سال قبل مسیح کے لوگوں میں سورج کی شعاعوں کے زاویوں کو ناپنے اور اس کے استعمال کا باریک اور سائنسی علم کس طرح پہنچا اور انہوں نے اس فن اور علم کو کہاں کہاں استعمال کیا؟

پیراگوئے، جنوبی امریکہ میں ایک پہاڑی زلزلہ کے بعد ایک پہاڑ کا لمبا حصہ بیچ میں سے شگاف ہو گیا اور اس طرح کوئی ایک میل لمبی اور ۱۲۰ فٹ گہری دراڑ پڑ گئی۔ جس کے اوپر سے چوڑائی کوئی چار پانچ فٹ تھی۔ زلزلے کے اثرات جانچنے کے لیے جب پیراگوئے کی مختلف یونیورسٹیوں سے پروفیسر اور طالبِ علم یہاں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس پہاڑی شگاف کے ایک طرف کی دیوار پر بیل بوٹے، نقش و نگار اور مختلف قسم کی ڈرائنگ اوپر سے پوری ایک میل کی پہاڑی پر کھدی ہوئی تھی۔ سائنس دانوں نے کہا کہ یہ زمین کے جغرافیائی عمل کے فطری نشانات ہیں مگر کیا تاریخ دانوں کے ذہن میں یہ سوال آج بھی پیدا نہیں ہوتا کہ دنیا میں کسی اور جگہ کیا زلزلے نہیں آتے اور کیا کہیں شگاف نہیں پڑتے مگر کیا ہر جگہ فطرت کا جغرافیائی عمل اسی طرح بیل بوٹے بناتا ہے؟ اس طرح کے نقش و نگار بنتے ہیں؟ اس کا جواب بھی سائنس دان نہیں دے سکے اور یہ مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکا کہ یہ بیل بوٹے ہیں یا کسی قسم کی کوئی تحریر، اگر یہ تحریر ہے تو ایسی کہ جس کو آج تک پڑھا نہیں جا سکا۔

افریقہ میں رہوڈیشیا کے ملک میں زمباوی عمارتی سلسلہ کے نام سے کچھ عمارات

بنی ہوئی ہیں جو کسی محل سے اور اس کے اطراف میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانات سے ملتی جلتی ہیں۔ یہ کئی عمارتوں پر مشتمل ہے کوئی اسے حضرت سلیمانؑ کے خزانوں کا قلعہ کہتا ہے، کوئی عبادت گاہ، کوئی محل اور کوئی قلعہ، مگر اس کی اصلیت کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ کیوں کہ اس جگہ سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی جو ان عمارات پر کچھ روشنی ڈالتی۔ مگر جو چیز ان عمارات میں قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ ان میں جو پتھر استعمال ہوئے ہیں وہ وزن میں تو غالباً ایک ٹن سے زیادہ نہیں ہیں یعنی گوئٹے مالا اور پیرو یا مصر میں استعمال ہونے والے پتھروں کا سوواں حصہ بھی نہیں ہیں مگر ان کی جسامت اور ان کا سائز بے حد متناسب اور یکساں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کسی مخصوص مشین سے تمام پتھروں کو ایک سائز، ایک ہی طریقہ اور ایک ہی حجم پر کاٹا گیا ہے اور پھر اتنی ہی صفائی سے دیواروں میں چن دیا گیا ہے۔ ان پتھروں کی ساخت اور بناوٹ بالکل اسی طرح کی ہے جیسے کہ آئرلینڈ کے ایک قدیم قلعہ اٹلانٹک فورٹ میں استعمال ہونے والے پتھروں کی۔ رہوڈیشیا کے عمارتی سلسلے کی بنیادی منصوبہ بندی بھی بالکل اسی طرح کی ہے جیسی کہ آئرلینڈ کے اٹلانٹک فورٹ کی ہے۔ آئرلینڈ اور رہوڈیشیا کا فاصلہ کم و بیش گیارہ ہزار میل ہے۔ چار پانچ ہزار سال قبل مسیح میں کسی تمدن کا ایک دوسرے سے اتنے فاصلے کے باوجود اتنی قربت رکھنا ایک جادوگر کی سی بات نظر آتی ہے مگر ایک بات یقینی ہے کہ تقریباً چھ ہزار سال قبل مسیح یعنی طوفانِ نوح سے کوئی ہزار سال قبل تک جنوبی امریکہ، افریقہ، یورپ، ایشیا اور تبت و چین تک کے علاقے ایک دوسرے کی تہذیب سے بے حد متاثر تھے۔ ان میں اعلیٰ درجے کا سائنسی علم موجود تھا۔ ان کے یہاں نہ صرف لوہے کا استعمال باقاعدہ ہوتا تھا بلکہ ان کو سول انجینئرنگ اور میکینیکل انجینئرنگ میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ان کا تمدن آج کے ترقی یافتہ تمدن سے بھی کہیں زیادہ آگے تھا۔ نہ صرف یہ کہ ان کو پہاڑوں کو کاٹ دینے کی کافی مہارت تھی بلکہ ان کے پاس کوئی اس قسم کی بھی تکنیک موجود تھی جس کے ذریعے وہ وزن کو ہلکا کر دیتے تھے۔ وہ پتھروں کو نہ صرف کم وزن کر دیتے تھے بلکہ آسانی سے ان کو اوپر تک اٹھا کر کسی بھی بلندی تک لے جا سکتے تھے۔ یہی فن اور یہی علم مصر کے اہراموں کی تعمیر میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ کیا تکنیک تھی، کون سا فارمولا تھا، اور کون سے طریقے تھے جن کی بدولت اتنی عظیم الشان عمارتیں بنتی تھیں۔ یہ بات آج تک راز ہی میں ہے اور کسی جگہ سے بھی اس راز سے پردہ اٹھانے والی کوئی چیز نہیں ملی

آگ نکلتی ہے۔ اسی طرح سمیریوں کی ایک اور دیوی رنانا تھی جس کا کام یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ فضا میں گھومتی رہتی ہے اور جب کبھی اُسے کوئی دشمن نظر آجاتا ہے وہ تیز اور چمک دار بجلیوں کے ذریعے ایسی شعاعیں پھینکتی ہے کہ یا تو دشمن ہلاک ہو جاتا ہے یا اندھا ہو جاتا ہے۔ سمیریوں ہی کے زمانے میں کتبوں پر ایسی ڈرائنگ بھی ملی ہے جو ایک ایسے بنکر (خندق) کی طرح ہے جیسے پری فیبریکیٹیڈ مکان کی ہے جس میں غار نما دہانہ ہے اور جس میں جانے کا چھوٹا سا راستہ ہے جیسے کسی جنگ میں بچاؤ کے لیے میدانِ جنگ ہی میں سپاہی بنکر بنا لیتے ہیں۔ سمیری تہذیب کے چند نمائندہ شہر جو زمین کھود کر نکالے جا چکے ہیں بغداد سے ۹۵ میل دور تینور شوپک (یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت نوحؑ رہتے تھے اور ان کے والد لامیش اور ان کے دادا مہدی الصالح کی زندگی گزری تھی) اور اس کے علاوہ اری دو، بدطبریہ، لاراک، ست پر اور اُر وغیرہ تھے۔ اُر میں ان کا نمائندہ مقام بابل تھا۔ یہ تمام شہر عراق کے ملک میں موجود ہیں۔

آئس لینڈ اور ناروے میں بھی اسی قسم کی داستانیں ہیں کہ ان کے دیوتا ہواؤں میں اُڑتے پھرتے تھے۔ ناروے کی قدیم داستانوں میں ایک دیوی فرگ کا تذکرہ آتا ہے جس کی ایک خادمہ گنا تھی۔ گنا کو اس کی مالکہ ایک ایسے گھوڑے پر سوار کرا کے جو زمین سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور ہواؤں میں چلتا تھا، مختلف دنیاؤں میں بھیجتی تھی ایسے ہی ایک فضائی سفر کے دوران ایک عجیب شخص سے ملاقات ہوئی جو آدمی اور دیوتا دونوں ہی سے مختلف تھا اور جس دنیا سے وہ آیا تھا وہ چمکتے ہوئے ستاروں سے بھی بہت پیچھے آباد تھی۔

اسی طرح جرمنی میں زمانۂ قدیم کے عظیم عالم اسنوری اسٹورل سن نے ۱۲۰۰ء میں ڈنمارک اور جرمنی کی پرانی تصویروں، پہاڑوں کی ڈرائنگ اور عام گیتوں یا نیم مذہبی گیتوں کو جمع کر کے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں درج ان گیتوں میں عام طور پر آگ دیوتا اور ستاروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک لوک کہانی میں زمین کو گول پلیٹ کہا گیا ہے۔ ایک اور گیت میں دنیا اور انسانوں کی تخلیق سے متعلق باتیں ہیں۔ دنیا کو ایک ایسی پلیٹ سے تعبیر کیا جاتا تھا جو آگ سے بھری ہوتی تھی۔ اس علاقے میں پرانے وقتوں کا سب سے بڑا دیوتا تسور رہتا تھا جو خداؤں کا خدا سمجھا جاتا تھا اور جن جن پہاڑوں پر اس کی تصویریں ملی ہیں ان سب میں اس کو ایک ہتھوڑا لیے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شاید وہ دیوتا سے زیادہ ایک مکینیکل انجینئر کی صورت میں لوگوں کے ذہن

میں جم گیا تھا۔ سنسکرت میں اور ڈنمارک کی زبان کے بعض الفاظ میں حیرت انگیز مشابہت ہے مثلاً "تھور" کی جگہ ایک لفظ "گور" سنسکرت میں استعمال ہوتا ہے جس کا ترجمہ گرج دار آواز ہے۔ عربی میں اسی لفظ کا ہم آواز لفظ "صور" کے نام سے ہے۔ جس کا مطلب صور یعنی آواز (صورِ اسرافیل) لیا جاتا ہے۔

باب نمبر ۱۰

تبت اور ہندوستان کا ذکر سرجان مارشل نے کافی تفصیل سے کیا تھا۔ جس میں ہندوؤں کی میراثی کتابیں وید اور مہا بھارت شامل تھیں۔ اسی طرح تبت کی قدیم کتاب "ڈزیان" کا ذکر بھی کافی لمبا تھا۔ دونوں ہی کتابیں اپنے اپنے طور پر بے مثال ہیں۔ ڈزیان ایک افسانوی درجہ اختیار کیے ہوئے ہے اس کی حفاظت ہر دور میں ہوتی رہی اور آج تک کوئی اصل نسخہ نہیں دیکھ سکا۔ ڈزیان ایک عجیب کتاب ہے اس میں اشارے ہیں اور استعاراتی نشانات ہیں۔ دنیا میں کوئی نہیں جانتا کہ یہ کتاب کب لکھی گئی اور کس نے لکھی؟ ڈزیان کے عالم کہتے ہیں کہ یہ کائنات کی تخلیق سے زیادہ قدیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اصل کتاب میں ایسی مقناطیسی قوت موجود ہے کہ اگر اس کو پڑھنے والا جو حقیقی معنوں میں اس کے علم کا طالب ہو وہ اس کتاب کو ہاتھ میں لے کر اس پر نظر ڈالے گا تو ان تمام واقعات کو نہ صرف پڑھنا بلکہ دیکھنا بھی شروع کر دے گا جو اس میں لکھے ہوں گے۔ اس کے برعکس یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ ڈزیان کا علم جاہلوں کے لیے خطرناک بھی ہوسکتا ہے چنانچہ ڈزیان کی حفاظت کسی خزانے کی طرح کی جاتی تھی۔ اب اس دور میں کسی کو علم نہیں کہ ڈزیان کا اصل ٹیکسٹ اب کہاں موجود ہے اور آیا اب موجود بھی ہے یا نہیں مگر ڈزیان کی تعلیمات اور اس کا علم ہر دور میں تبت کے بھکشوؤں کا سب سے قیمتی علمی سرمایہ رہا ہے اور یہ علم سینہ بہ سینہ، عہد بہ عہد نسلوں کو منتقل ہوتا رہا ہے۔ جاپان، ہندوستان، چین اور کوریا تک کے علاقوں میں ڈزیان کے عالم موجود رہے ہیں اور اس کی تعلیمات پر مشتمل روایات جنوبی امریکہ تک میں پائی گئیں۔ ڈزیان کے عالم اپنے آپ کو دوسروں سے مخفی رکھتے تھے، اپنے آپ کو چھپائے پھرتے تھے۔ چین کے سلسلہ کوہ کُن لُن کے دشوار گزار دروں میں، بے آب و گیاہ گھاٹیوں میں اور مغربی چین کے درۂ الٹائن ٹاک کے غاروں میں ڈزیان کے عالم زندگی گزارتے تھے وہ اپنا تعلق اس دنیا سے کم و بیش توڑ لیتے تھے اور ان کا تعلق کسی اور آسمانی مخلوق سے قائم ہو جاتا تھا۔

جب عیسائیت یورپ کے راستے روس ہوتی ہوئی وسطی ایشیا میں داخل ہوئی اور دوسری طرف سے مشرق بعید سے مغربی عناصر نے وسعت اختیار کی تو چرچ کے بااختیار افراد

نے اپنے مبلغین کے ذریعے اس بات کی کوشش کی کہ ڈزیان کے علم کو، جو ہر طرف پھیلا ہوا نظر آتا تھا، زائل کیا جائے مگر یہ سب کچھ بے سود رہا۔ ڈزیان کے قدیم ترجمے سنسکرت میں ہوئے اور سنسکرت سے دنیا بھر کی دوسری زبانوں میں ترجمے کیے گئے مگر کوئی نہیں جانتا کہ ان کا اصل کہاں پر ہے اور یہ کہ اس کی صداقت کا ثبوت کیا ہے۔ بہرحال تبتیوں کی یہ کتاب دنیا بھر کی بہترین کتاب شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں دنیا کی تخلیق کے متعلق عجیب و غریب اشعار موجود ہیں۔

اس کتاب میں یہ تفصیل کس نے لکھی؟ کس کو ان نسلوں کی ترقی اور تنزلی کا علم ہوا؟ کس کو کائنات کی تخلیق سے قبل کی زندگی اور حالات کا پتہ چلا؟ یہ سب ڈزیان کے راز ہیں مگر ان سب باتوں کے علاوہ اچنبھے کی بھی باتیں ڈزیان میں ہیں، جو اب آہستہ آہستہ سچ ہوتی جا رہی ہیں، مثلاً، یہ کہ ڈزیان بتاتی ہے کہ ۹۵۶۴ ق م میں ایک براعظم سمندر میں غرق ہو گیا تھا۔ اس سمندر کی تفصیلات بھی ڈزیان میں مل جاتی ہیں۔ آج کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امریکہ میں کیوبا اور فلوریڈا کے نزدیک واقعتاً ایک ڈوبے ہوئے براعظم کے نشانات موجود ہیں۔ گہرے پانی میں غوطہ خوروں کو مکانات، شہر کی پتھریلی فصیلیں، قلعوں کے دروازے اور کبھی کبھی پختہ سڑکیں تک نظر آ جاتی ہیں اور ان تمام اشیاء کی تحقیقات سے اب ماہرین یہ اندازہ لگانے لگے ہیں کہ ایک براعظم اٹلانٹس نام کا روئے زمین پر موجود تھا، جو زمین کی کسی جغرافیائی تبدیلی کی بدولت سمندر میں غرق ہو گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈزیان کے لکھنے والے کیا اس دنیا کے لوگ تھے؟ اگر تھے تو ان کو یہ علم کہاں سے ملا؟ ان کو یہ معلومات کس طرح مہیا ہوئیں؟ کیسے ان کو کائنات کی تخلیق اور زندگی کی نشوونما کا پتہ چلا اور یہ آگ کے بیٹے کون تھے؟ کیا یہ آگ سے بنائی ہوئی کوئی مخلوق تھی، جس کی کتاب کا نام ڈزیان ہے یا یہ جنوں کا کوئی قدیم علمی نسخہ تھا، جو انسانوں تک پہنچ گیا؟ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کتاب آخر ہزاروں سال پہلے کس نے لکھی اور لکھنے والا اتنا باخبر کیسے تھا؟ اگر لکھنے والا حقیقتیں نہیں لکھ رہا تو بھی ماننا پڑے گا کہ جس نسل کے ادب کا تخیل ایسا آفاقی اور کائناتی ہو اس دور کے علم و فضل کا آخر کیا معیار ہو گا اور وہ نسل کتنی ترقی یافتہ ہو گی۔ یہ ترقی یافتہ نسل آخر کہاں سے آئی تھی؟ اور اگر پانچ چھ ہزار سال قبل کا انسان واقعی اس قدر ترقی یافتہ تھا تو اس کے ہم عصر غاروں میں کیوں رہتے

تھے؟ پتھروں کے ہتھیار کیوں استعمال کرتے تھے اور نیم وحشیوں کی سی زندگی کیوں بسر کرتے تھے؟ یہ سب باتیں اسرار و رموز کی باتیں ہیں، جو کچھ سمجھ میں نہیں آتیں۔

ڈزیان ہی کی طرح ایک اور قدیم کتاب ہے، جس کا نام ہے قبالہ۔ اس کو شاید پہلی بار تحریر کی شکل میں ۱۲۰۰ء میں لایا گیا ہے مگر اس کا اصل ٹیکسٹ بھی تین چار ہزار سال قبل مسیح کا سمجھا جاتا ہے۔ قبالہ بھی ایک مذہبی کتاب ہے اور اس کے ماننے والے اسے ایک آسمانی صحیفہ سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ آسمان سے نازل ہونے والے افراد اسے آسمانی ستاروں سے تحفہ کے طور پر لائے تھے، جو انہوں نے علم پھیلانے کی غرض سے دنیا کے لوگوں کو دیا تھا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جس نے قبالہ سے مکمل علم حاصل کرلیا، اس نے گویا معجزے دکھانے کی قوت حاصل کرلی۔ اس کو ہر چیز پر جیسے انسان، درخت، جانور بلکہ چاند اور سورج پر بھی قدرت حاصل ہوجاتی ہے اور وہ ان کو جس طرح چاہے، استعمال کرسکتا ہے۔

اس کتاب میں اکثر جگہ دنیا کی تخلیق پر تبصرے ملتے ہیں۔ یوں تو ہر آسمانی صحیفہ اور مذہبی کتاب میں کسی نہ کسی حد تک اس کائنات کی پیدائش پر ضرور کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔ جیسے توریت کا بیان ہے کہ اللہ نے چھ دنوں میں دنیا بنائی اور ساتویں دن، جو سبت کا دن تھا، آرام کیا۔ اسی طرح انجیل بھی کہتی ہے کہ دنیا کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے سات دنوں میں کی اور قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی تخلیق پلک جھپکتے ہوگئی۔ کُن (ہوجا) کہا اور فیکون (ہوگیا)۔ دنیا وجود میں آگئی۔ مہابھارت، وید، گرنتھا، توریت، زبور، انجیل، ڈزیان اور قبالہ سب کی سب کتابیں تخلیقِ عالم کے متعلق کچھ نہ کچھ کہتی ہیں مگر قبالہ کو جو فوقیت حاصل ہے، وہ خصوصاً اس بات سے ہے کہ اس نے اس دنیا کے علاوہ سات مختلف دنیاؤں کے بارے میں تفصیل سے حالات بیان کیے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اس کتاب کا لکھنے والا ان تمام ساتوں دنیاؤں کے بارے میں پوری واقفیت رکھتا ہے، جس کا وہ تذکرہ کر رہا ہے۔ یہ ساتوں دنیا کہاں ہیں اور ان میں کون کون رہتا ہے اور ان کی طرزِ زندگی کس قسم کی ہے، یہ سب کچھ قبالہ کے مختلف موضوعات ہیں۔

سب سے اول یعنی پہلی دنیا کا نام "تی" ہے۔ یہاں کے رہنے والے نباتات اگانا جانتے ہیں۔ ان کی خوراک فقط وہ پودے ہیں، جو زمین سے اگتے ہیں مگر ان کو گندم یا دوسری اجناس کا کوئی علم نہیں۔ اس زمین میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور یہاں عام طور

پر بڑے بڑے جانور پائے جاتے ہیں۔

دوسری دنیا کا نام "تازیہ" ہے۔ یہاں کے رہنے والے بھی جھاڑیاں اور دوسرے پودے کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ ان کی ناک کی جگہ دو سوراخ ہوتے ہیں، جن سے وہ سانس لیتے ہیں۔ ان کی یادداشت نہیں ہوتی۔ یہ کام کرتے ہی کرتے بھول جاتے ہیں کہ کیا کام کر رہے ہیں۔ ان کی دنیا میں ایک سرخ رنگ کا سورج چمکتا رہتا ہے۔

تیسری دنیا "تازیہ" ہے۔ اس دنیا کی مخلوق زمین کے اوپر نہیں بلکہ زمین کے اندر رہتی ہے۔ وہ زیرِ زمین آبی راستوں کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس دنیا کے باشندے خوبصورت ہیں اور ان کے بڑے بڑے شہر موجود ہیں۔ ان میں دولت کی بہتات ہے۔ ان کے علاقے میں زمین کی اوپری سطح ویران اور خشک ہے مگر زمین کے نیچے پانی موجود ہے۔ ان کی دنیا میں دو سورج چمکتے ہیں اور روشنی پھیلاتے ہیں۔

چوتھی دنیا کا نام "وابیل" ہے۔ یہاں کے باشندے اپنی تمام خوراک پانی سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی نسل تمام دوسری مخلوقات سے افضل ہے۔ ان کی دنیا مختلف علاقوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر علاقے کے لوگ صورت، شکل، رنگ اور چہرے مہرے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے یہاں موت نہیں ہے۔ یہ اپنے مردوں کو دوبارہ زندہ کر لیتے ہیں اور ان کا علم بے مثال ہے۔ ان کی دنیا کا سورج کروڑوں میل دور سے روشن ہے اور وہ دنیا ہماری دنیا سے اربوں کھربوں سال کی مسافت کے فاصلے پر واقع ہے۔

پانچویں دنیا ارض کہلاتی ہے اور اس دنیا میں اولادِ آدم بستی ہے مگر یہ ہماری دنیا نہیں ہے۔ یہ وہ دنیا ہے، جہاں آدم نے اپنا ابتدائی وقت گزارا تھا۔

چھٹی دنیا کا نام "آدامہ" ہے۔ جب آدم نے ارض میں تنہائی محسوس کی اور "ارض" کی دنیا انہیں بے رنگ نظر آئی تو وہ "آدامہ" میں چلے گئے۔ "آدامہ" کے رہنے والے کاشت کرتے ہیں، پودے کھاتے ہیں۔ چھوٹے جانور بھی ان کی خوراک بن جاتے ہیں۔ اس دنیا کے رہنے والے عموماً رنجیدہ رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔ اس دنیا میں دن اور رات ہوتے ہیں اور یہاں سے بہت سے ستاروں کی چال نظر آتی ہے۔ ماضی میں "آدامہ" میں "وابیل" کے رہنے والوں کی آمد و رفت کافی تھی۔ اب بھی "وابیل" کے بہت سے باشندے "آدامہ" میں رہتے ہیں مگر ان کی یادداشت ختم ہو چکی ہے اور وہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں سے آئے تھے۔ وہ "وابیل" کے متعلق کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔

ساتویں دنیا کا نام "ارقعہ" ہے۔ یہاں کے باشندوں کے چہرے زرد رنگ کے ہوتے ہیں۔ انکا علم وسیع ہے۔ وہ کاشت کرتے ہیں، ان کی سائنسی ترقیاں بے مثل ہیں۔ وہ ساتوں دنیاؤں کا سفر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تیز رفتار سواریوں میں بیٹھ کر ہر جگہ جاسکتے ہیں۔ یہ زبان سے نہیں، ذہن سے بولتے ہیں اور ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔

قبالہ کے عالم یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ نے اس دنیا میں آدم پیدا کرنے سے قبل بھی مخلوق پیدا کی تھی مگر یہ مخلوق انسان کی صورت میں نہ تھی بلکہ زمین پر رینگنے والے کیڑوں مکوڑوں کی طرح تھی۔ آہستہ آہستہ اس مخلوق کی نشوونما کی گئی۔ ان کی بدصورتی کو صاف کیا گیا اور پھر اسی مخلوق کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ شکل کا نام انسان رکھا گیا۔

قبالہ کا ایک مشہور باب "کتابِ زہر" کے نام سے شہرت یافتہ ہے، جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس کو ایک یہودی عالم ربی شمعون یوس نے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انتقال کے ستر برس بعد پیدا ہوا اور ۱۳۰ء میں فوت ہوا، مرتب کیا یا تحریر کیا تھا مگر اس سے بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پیشتر قبالہ کے عالم اور اس کے جاننے والے موجود تھے۔ یعنی ربی شمعون یوس نے شاید کچھ اضافہ کیا ہو مگر وہ اصل ٹیکسٹ کا لکھنے والا نہیں ہے۔

اسی کتابِ زہر میں ایک عجیب و غریب مکالمہ بھی تحریر ہے، جو ربی شمعون یوس نے کسی سے سن کر یا کسی زندہ جاوید واقعہ کو تازہ کرنے کے لیے لکھا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اسی دنیا میں، جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں اور جس کا نام قبالہ میں "آولمہ" کہا گیا ہے، ایک بار آسمان سے بے تحاشا آگ برسی۔ یہ کوئی ایٹم بم تھا یا کسی سیارہ کے ٹوٹ کر گرنے کا حادثہ، اس کی کچھ تفصیل نہیں ہے مگر اس آگ نے دور نزدیک کی ہر چیز کو جلادیا۔ پھر بھی ایک شخص کسی نہ کسی طرح اس آگ سے بچ گیا۔ ربی شمعون یوس سے اس کی ملاقات ہوئی اور یہ دونوں گھومتے ہوئے اس جگہ جانکلے، جہاں آگ نے ہر چیز کو جلادیا تھا۔ وہاں ایک چٹان جیسی سخت اور بڑی چیز سے۔ (جو ممکن ہے کوئی لوہے کی مشین ہو) ایک شخص نکلا، جس کا چہرہ اور رنگ اور جسم آدمیوں سے مختلف تھا، اب باقی واقعہ ربی شمعون اپنی زبانی لکھتا ہے کہ وہ اس اجنبی کے پاس گیا اور اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو اور یہاں کیسے پہنچے ہو؟"

"میں ارقعہ کی سرزمین کا باشندہ ہوں۔" اجنبی نے بتایا۔

"ارقعہ کہاں ہے؟" ربی شمعون یوسی نے پوچھا۔

"ارقعہ یہاں سے دور ستاروں میں آباد ایک اور دنیا کا نام ہے۔"

"کیا وہاں ستاروں پر بھی لوگ رہتے ہیں؟"

"ہاں جب میں نے دور سے تم کو آتے ہوئے دیکھا تو میں اپنے جہاز سے باہر نکل آیا تاکہ پوچھ سکوں کہ میں کس دنیا میں آ پہنچا ہوں۔ ہم بہت سی دنیاؤں میں آتے جاتے رہتے ہیں اور وہاں کے لوگوں سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔"

"تم اپنی دنیا کا کچھ حال ہمیں بھی بتاؤ۔" ربی شمعون یوسی نے کہا۔

"وہ دنیا تمہاری دنیا سے مختلف ہے۔ وہاں ہم فصل اگاتے ہیں مگر ہماری فصلیں کئی کئی سال میں پک کر تیار ہوتی ہیں۔ ہماری دنیا کے سورج اور چاند الگ قسم کے ہیں۔ ہماری دنیا سے ستارے اس طرح نظر نہیں آتے جس طرح یہاں سے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے دن اور ہماری راتیں بڑی لمبی ہوتی ہیں اور تمہاری زندگیاں ہمارے ایک دن سے بھی چھوٹی ہوتی ہیں۔"

اس طرح اس اجنبی نے اپنی دنیا کی مکمل تفصیل بتائی۔ جو لوگ نجوم کا علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ستاروں کے فاصلے، ان کی گردشیں، ان کے سورج اور ان کے چاند سب الگ الگ ہوتے ہیں۔ ہماری اس دنیا کا ستارہ سورج ہے اور زمین اور چاند اس کے سیارے ہیں جو ایک دوسرے کے گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ اسی گردش سے ماہ و سال اور دن رات بنتے ہیں۔ اگر زمین کی گردش کا راستہ بدل جائے، پھر دن اور رات کی لمبائی بھی بدل جائے گی۔ چنانچہ یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی کہ کسی سیارہ میں رہنے والوں کے دن اور راتیں ہماری دنیا کے دن اور راتوں سے ہزار گنا طویل ہوں۔ یا وہاں ایک سورج کی بجائے دو سورج چمکتے ہوں۔ چنانچہ ارقعہ کے باشندے نے جو کچھ کہا وہ آج کی سائنسی دنیا کے لیے کچھ ایسا لغو اور غلط نہیں ہے مگر اصل حال لکھنے والا کون تھا اور اس کو ان دنیاؤں کا حال کیوں کر معلوم ہوا اور اس تحریر کی سچائی کا ثبوت کیا ہے؟ اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔

سر جان مارشل کہنے لگے کہ آپ کو ایک نظریہ سے روشناس کراتا ہوں۔ نظریہ صاف اور واضح نہیں ہے مگر اس میں صداقتیں ضرور موجود ہیں۔ اب آپ خود ہی صداقتوں کو تلاش کریں اور اس نظریہ کو آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ دیں۔

سر جان نے کہا میں نے ابھی مہابھارت کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ میں نے ابھی

تک آپ کو صرف دو باتیں بتائی ہیں۔ پہلی یہ کہ دنیا کے مختلف ممالک میں محیر العقول عمارات موجود ہیں جو کسی زیریں مخلوق کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور دوسری یہ کہ دنیا کے تمام ممالک میں ایسی دیومالائی داستانیں موجود ہیں جو آسمان سے کسی دیوی دیوتا کے اُترنے اور واپس جانے کا تذکرہ کرتی ہیں۔ اسی طرح قدیم کتابیں بھی دوسری دنیاؤں کا حال بیان کرتی ہیں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ہماری دنیا میں دوسرے سیاروں سے مخلوق آئی تھی اور رہتی تھی اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اہرام مصر بنائے، ممی بنانے کا فن سکھایا، جنوبی امریکہ کے مختلف علاقوں میں ان کے آثار ملے ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی مہیب عمارتیں آج بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ اس دنیا کی مخلوق نہ تھے۔ یہ یا تو ASTRONAUTS خلائی مسافر تھے یا پھر کسی اور سیارے کی مخلوق تھے جو زمین پر آ کر آباد ہوئے۔ یہاں رہے اور پھر یکایک معدوم ہو گئے۔ ان کے آثار دنیا کے تمام براعظموں میں موجود ہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو دیوی اور دیوتا کہا گیا تھا اور یہی وہ ہیں جن کو بعض کتابوں میں جنات کہا گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں باتیں درست ہوں کہ اس دنیا میں جنات بھی رہتے ہوں اور دوسری دنیا سے آنے والی مخلوق بھی بستی ہو۔ بہرحال یہ تمام باتیں جب تک مکمل طور پر تحقیق کے بعد سامنے نہیں آ جاتیں۔ صداقت کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔

اس موقع پر جامعہ الازہر کا ایک طالب علم کھڑا ہوا اور اس نے ایک سوال کرنے کی اجازت چاہی لیکن پروفیسر سعدی وغیرہ جو اسٹیج پر ہی بیٹھے تھے اس کو بیٹھ جانے کا اشارہ کرنے لگے۔ شاید وہ اس دخل اندازی کو ناپسند کر رہے تھے۔ سر جان مارشل نے کہا۔

"ہر چند میں اپنے مقالہ کے بعد آپ کے تمام سوالوں کا جواب دوں گا مگر چونکہ کوئی بات آپ کے ذہن میں کلبلا رہی ہے جو آپ کی توجہ کو زائل کر دے گی اس لیے آپ اپنا سوال ابھی پوچھ لیجیے۔"

لڑکے نے کہا۔

"جناب: میں ایک مسلمان ہوں اور انجیل، توریت اور قرآن پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں فی الحال قرآن کا حوالہ نہیں دوں گا مگر انجیل میں بھی تخلیق کے نام سے ایک مکمل باب موجود ہے جس میں تذکرہ ہے کہ انسانوں کی اولادوں کے جدِامجد آدم ہیں جو جنت سے اُتار کر اس دنیا میں بھیجے گئے۔ اس میں تفصیل موجود ہے کہ آدم کس طرح بلوغ یمن سے

نکلے اور ان کی پیدائش سے قبل دنیا کس طرح تاریکی میں گھری ہوئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ ستارے، سورج، چاند، کہکشاں، محور، گردشیں سب کی سب ساکن اور ثابت تھیں۔ پھر فضا میں ارتعاش کی کیفیت پیدا ہوئی، روشنی کی لہریں اٹھیں، تاریکی سمٹنے لگی، ہواؤں کی دبیز غبار آلود تہیں رفتہ رفتہ صاف ہوتی گئیں۔ زندگی سانس لینے لگی اور نباتات و حیوانات کی دنیا آباد ہونے لگی۔ آدم زمین پر آگئے اور پھر نسلِ آدم کی ابتدا ہوئی۔ گویا انجیل کے مطابق آدم پہلے آدمی تھے جو اس دنیا میں آئے اور جن سے نسلِ آدم چلی۔

سر! نوحؑ کا طوفان قریب قریب چھ ہزار سال قبل مسیح کا واقع ہے۔ یسوع مسیحؑ سے موسیٰؑ پیغمبر تک تقریباً پندرہ سو سال کا زمانہ ہے۔ موسیٰؑ سے نوحؑ تک ساڑھے تین سے ساڑھے چار ہزار سال کا وقفہ ہے۔ خود نوحؑ کی عمر نو سو سال ہوئی یعنی ان کی عمر چھ سو سال تھی کہ طوفانِ نوح آیا۔ اور طوفان کے بعد وہ مزید تین سو سال تک زندہ رہے۔ ان سے پہلے ان کے والد لامیش اور پھر ان کے دادا مہدی الصالح نے بھی تقریباً اتنی ہی عمریں پائیں اور مہدی الصالح کے اجداد میں شیثؑ پیغمبر تھے جو چند نسلوں بعد حضرت آدمؑ تک جا پہنچتے تھے۔ اس طرح اندازاً حضرت آدم سے آج ۱۹۰۲ء تک کا یہ کُل وقفہ نو دس ہزار سال سے زیادہ کا نہیں ہے۔ آخر یہ تیس ہزار سال قبل کی انسانی رہائش، چٹانی تصویریں، آبادیوں کے آثار اور مختلف تہذیبوں کے امکانات یہ سب کیا اس بات کی نفی نہیں کرتے کہ یا تو عیسائی، یہودی اور مسلمان عقیدہ کے خلاف آدم پہلے انسان نہ تھے یا پھر یہ کہ ان تینوں مذاہب کی الہامی کتابیں زندگی کی تاریخی اور تحقیقی آزمائش پر پوری نہیں اُترتیں۔"

سر جان مارشل نے جواب دیا۔

"آپ کے جواب کو میں تین حصّوں میں تقسیم کروں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مذہب نے سوچ بچار کا دروازہ بند نہیں کیا کسی مذہب نے بھی تحقیق و جستجو کی مذمت نہیں کی ہے۔ مذہب یہی چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والے دنیا کے حالات پر غور کریں۔ کیونکہ ہم جتنا بھی فکر کریں گے، جس قدر بھی سوچیں گے اسی قدر اس پوری دنیا کا کارخانہ بنانے والے کی غیر مرئی قوت کا ادراک کرتے جائیں گے۔ دراصل کائنات کی تنظیم نہایت عمدہ سائنسی بنیادوں پر استوار ہے۔ ہر شئے کا دوسری شئے سے ایک مربوط اور مکمل رشتہ قائم ہے چنانچہ اس کائنات کو چلانے والا ایک مقتدر ضرور موجود ہے۔ یہی عقل کہتی ہے اور یہی تحقیق کہے گی۔ اسی لیے مذہب میں عقل کا استعمال کسی جگہ بھی ممنوع

نہیں کہا گیا ہے۔ ہاں، مذہب نے عقل کو خدا کی ذات کی ابتدا، اس کی پیدائش، اس کی زندگی اس کی شکل و صورت کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے سے ضرور روکا ہے۔ کیونکہ عقل لاکھ کوشش کرے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتی، چنانچہ یہ ساری جستجو لاحاصل اور بے سود نظر آنے لگتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ ہی کے اسلام میں ایک نہایت عالم و فاضل شخصیت گزری ہے جن کے مقولے، وعظ اور خطوط ہم اپنی لائبریریوں میں پڑھتے ہیں اور ان کی علمیت پر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ آپ کے یہاں انہیں حضرت علیؓ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان سے ایک بار کسی نے پوچھا تھا کہ جب آدم نہ تھے اس وقت کیا تھا؟

حضرت علیؓ نے جواب دیا "آدم"۔

پھر اس نے پوچھا "آدم سے پہلے بھی آدم تھے؟"

انہوں نے کہا "ہاں آدم۔"

اس شخص نے پھر پوچھا۔ "اور ان سے قبل کی دنیا میں کون تھا؟"

حضرت علیؓ نے پھر کہا "آدم"

وہ شخص حیران تھا کہ یہ کیسا جواب ہے۔ تب حضرت علیؓ نے کہا۔

"آدم سے پہلے بھی آدم تھے اور اُس آدم کی نسلیں بھی دنیا میں اسی طرح پھیلیں اور ان کی نشو و نما بھی اسی طرح ہوئی جس طرح ہماری ہوتی ہے۔ اس آدم کی نسل نے بھی ترقی پا کر اپنے پیدا کرنے والے رب کو بھلا دیا تو پھر اُس آدم کی نسل بھی ختم کر دی گئی۔ اس طرح ستر آدم آئے اور گئے۔ اس طرح موجودہ نسل بھی ایک آدم ہی کی نسل ہے اور یہ نسل بھی اپنی ایک عمر کو پہنچ کر سربلند ہو گی، پھر نافرمان بنے گی اور پھر غارت ہو جائے گی۔"

اس شخص نے پھر ایک اور سوال کیا "یہ بتائیے کہ ایک آدم سے دوسرے آدم تک کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟"

"بارہ ہزار سال" حضرت علیؓ نے جواب دیا۔

اس گفتگو سے آپ نے دو باتوں کا اندازہ لگایا ہوگا۔ ایک تو یہ کہ دنیا کی کہانی بہت لمبی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ سب اسرار و رموز کی باتیں ہیں کہ جن آدم کا تذکرہ مذہبی کتابوں میں ہے کہ وہ دنیا میں آئے وہ کون سے آدم تھے۔ پہلے یا آخری، کسی کو بھی اس کا

کچھ علم نہیں ہے۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ تمام الہامی مذہبی کتابیں آدم کی تخلیق اور جنت کے چھوٹ جانے کا واقعہ بیان کرتی ہیں۔ پھر یہ بھی کہ آدم اس دنیا کے انسان تھے، وہ آسمان سے لائے گئے تھے۔ گویا وہ کسی اور دنیا کے انسان تھے۔ یہ جنت کہاں ہے، آسمان پر؟ اور آسمان کیا ہے؟ ..... خلاء یعنی خلی۔ اب کوئی پوچھے کہ یہ خلی فضا کتنی بڑی ہے تو اس کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لیے بھی گنتی کو بڑی دور تک لے جانا ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ روشنی کی کرن ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر طے کرتی ہے۔ یعنی ایک گھنٹے میں لگ بھگ ۶۷ کروڑ میل کا فیصلہ طے کرتی ہے۔ اس طرح ایک دن میں نوری کرن سولہ ارب بائیس کروڑ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس فاصلہ کو یا اس تعداد کو اگر ۳۶۵ سے ضرب دیں گے تو ایک نوری سال کا فاصلہ معلوم ہو جائے گا۔ اب سنیے کہ خلاء کی وسعت اور زمین سے ستاروں کی دوری ناپنے کے لیے یہی پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس فاصلے کے ناپ کو ہم نوری سال کہتے ہیں۔ کہکشاں کا فاصلہ زمین سے پچھتر ہزار نوری سال کے برابر ہے یعنی اگر ہم روشنی کی رفتار سے کہکشاں کی طرف سفر کریں تو پچھتر ہزار سال میں کہکشاں پہنچیں گے اور ستاروں کے دوسرے سلسلہ نیبولا پر پہنچنے کے لیے بائیس لاکھ پچاس ہزار سال لگیں گے اور پھر کچھ معلوم نہیں کہ اس کے آگے اور کتنی دور تک ستاروں کی دنیا آباد ہے۔ اس فاصلے کے نام سے اور ان اعداد و شمار سے آسمان کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اب اس وسیع و عریض خلاء میں جنت کہاں ہے اس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔

آپ پھر یہ سوچیے کہ آسمان میں جو ستارے بکھرے پڑے ہیں کیا خدا نے انہیں صرف چمکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے اور پھر ان کی چمک سے کیا فائدہ ہے؟ خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔ پھر آخر یہ جو کروڑوں ستارے آسمان میں جھلملاتے ہیں کیا ان میں سوائے بے جان ہواؤں کے کچھ نہ ہوگا؟ کروڑوں، اربوں، کھربوں نوری سالوں کے فاصلے کی حدود میں پھیلی ہوئی اس کائنات میں کیا صرف زمین ہی ایک ایسی دنیا ہے جس میں زندگی موجود ہے، اور کہیں نہ ہوگی، ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ آج تک جن ستاروں کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات ہیں ان کی تعداد بھی کم و بیش پانچ کروڑ کے قریب ہے اور یہ ستارے اپنی جسامت میں ہماری زمین سے کروڑوں گنا بڑے ہیں۔ پھر کیا یہ سب کے سب بے جان، زندگی سے مبرا اور مخلوق سے خالی ہوں گے؟ صرف زمین کا خالی ہو جانا تو خدا کے لیے بہت چھوٹی سی بات ہے۔ خدا اس تمام فضا اور ستاروں کا خدا ہے۔ بے جان

ستاروں کا خدا نہیں بلکہ جانداروں کا خدا ہے!

اب اس پس منظر میں دیکھیے کہ کائنات کی وسعت کیا ہے اور اس کی عمر کیا ہوگی یا کتنی طویل ہوگی۔ اور یہ کائنات اپنے اندر کتنی گمبھیر تا لیے ہوئے ہے۔ کائنات کی وسعت کا اندازہ کرنے کے بعد پھر اسی موضوع کی طرف آئیے کہ آدم آسمان سے اُتارے گئے تھے۔ الہامی کتابیں جنت کے محل وقوع اور اس کی دنیا سے دوری کے بارے میں بالکل خاموش ہیں اور اس کی بابت کچھ معلوم نہیں کہ یہ جنت جس میں آدم رہتے تھے زمین سے کس فاصلے پر تھی اور کس ستارے کے قریب آباد تھی یا آباد ہے۔ اس کی مختلف تفسیریں ہیں اور اس کے بہت سے مفہوم ہیں، مگر کیا ممکن نہیں کہ آدم کسی اور ستارے میں پیدا کیے گئے اور پھر نافرمانی کے باعث زمین پر بھیجے گئے؟ اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جب آدم اس دنیا میں آئے تو دسیوں بیسیوں برس جنگلات میں مارے مارے پھرتے رہے کیا ان کی زمین پر آمد سے قبل ہی نباتات کی صورت میں زندگی زمین پر موجود تھی۔ نباتات تھے تو کیڑے مکوڑے بھی ہوں گے، جانور بھی ہوں گے، مچھلیاں بھی ہوں گی۔ اس طرح زندگی حیوانات کی شکل میں موجود تھی۔ مگر آدمی موجود نہ تھے۔ آدم پہلے آدمی تھے جو اس دنیا میں آئے۔ اس کا مطلب ہے کہ آدم سے قبل بھی زندگی کرۂ ارض پر موجود تھی مگر اس صورت کی نہ تھی جو آدم کی شکل میں ہوئی۔ اب دو ہی باتیں رہ جاتی ہیں کہ یا تو آدم سے قبل زندگی اور ذہانت، عقل اور سمجھ جانداروں میں کسی اور شکل و صورت کی تھی اور یا یہ مخلوق کسی اور کُرہ سے آتی تھی اور یہاں رہتی بستی تھی اور اپنے نشانات چھوڑ کر واپس لوٹ جاتی تھی۔

تیسری بات یا آپ کے سوال کے جواب کا تیسرا پہلو خود حضرت نوح کے زمانے کی ایک روایت ہے جو قدیم مذہبی کتابوں میں موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوح کے زمانے میں واقع خلائی مسافروں کا آنا جانا اس دنیا میں ہوتا تھا اور وہ یہاں کی عورتوں سے مل کر نسل کی پیدائش بھی کرتے تھے۔

حضرت نوحؑ کا قصہ حضرت نوحؑ کی پیدائش سے متعلق ہے۔ حضرت نوحؑ کے والد کا نام لامیش تھا اور ان کے دادا جو اپنے وقت کے نہایت نیک، ذہین اور سربرآوردہ لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ مہدی الصالح کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ لوگ ان سے ہر مشکل مرحلہ پر مشورہ کرتے اور ان سے مدد مانگتے تھے۔ انہوں نے ۹۲۹ سال کی عمر پائی

تھی۔
حضرت نوح کے والد ایک بار کسی طویل سفر سے واپس آئے تو انہوں نے اپنی بیوی کی گود میں ایک خوبصورت، چمکدار رنگ والا چھوٹا سا بچہ دیکھا تو انہوں نے بیوی سے پوچھا "یہ بچہ کون ہے؟"

بیوی نے کہا "یہ بچہ آپ کے سفر پر رخصت ہونے کے چند ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔ یہ آپ کا بیٹا ہے۔"

لامیش نے کہا "یہ ہرگز میرا بیٹا نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا چہرہ مہرہ مجھ سے نہیں ملتا۔ اس کا رنگ چمکدار ہے اور اس کے چہرے سے روشنی پھوٹتی ہے۔ یہ میرا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟"

جب بات حد سے زیادہ بڑھی تو بیوی نے مشورہ دیا کہ تم جاؤ اور اپنے باپ مہدی الصلاح کے سامنے سارا معاملہ پیش کرو۔ ان کے فیصلے کو ہم دونوں صحیح مانیں گے۔

باب نمبر ۱۱

دونوں فرودیک سے (یہی وہ گاؤں تھا جہاں حضرت نوحؑ پیدا ہوئے تھے اور اسی گاؤں میں انہوں نے اپنی کشتی بنائی تھی۔ یہ جگہ زمین سے کھود کر نکالی گئی ہے۔ اور فرودیک کے آثار بغداد سے ۷۰ میل کے فاصلے پر ملے ہیں) مہدی المصالح کے پاس پہنچے۔ بچہ ساتھ تھا اور دونوں کے دلوں میں نفاق موجود تھا۔ دونوں بے اعتمادی کی فضا میں ساتھ ساتھ سفر طے کر رہے تھے۔ جب یہ لوگ مہدی المصالح کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان کو عزت و احترام سے بٹھایا۔ پھر مہدی المصالح کو ان کے بیٹے نے ساری بات بتائی کہ وہ دو سال تک سفر میں رہے، لوٹے تو یہ بچہ اپنی بیوی کے پاس دیکھا۔ اس کی صورت و شکل اس کی ولدیت پر چغلی کھاتی تھی۔ وہ اس بچے کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ نوحؑ کی والدہ نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ بچہ اس کے شوہر کا ہے۔ اس نے کہا یہ کسی آسمان سے آنے والے مسافر سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس کا رنگ جو چمک دار اور نور والا ہے اس کا اسے کوئی علم نہیں کہ ایسا کیوں ہے۔

مہدی المصالح نے بچے کو قریب بلایا اور اسے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ دیکھا، اس کی پیشانی اور آنکھیں دیکھیں اور پھر اس کو بہت پیار کیا۔ پھر لامیش سے کہا۔

"بیٹے! یہ نور ہے جو تمہارے گھر میں اُتر آیا ہے۔ یہ تمہارا ہی بیٹا ہے مگر تم سے مختلف ہے۔ عام طور پر اولاد اپنے باپ سے نسبت رکھتی ہے۔ اس کی شہرت باپ کے نام سے ہوتی ہے مگر اس کی شہرت اس کے اپنے نام سے ہوگی بلکہ تمہیں اس کے نام سے شہرت ملے گی۔ یہ تمہاری قسمت ہے کہ یہ بچہ تمہارے گھر پیدا ہوا ہے۔ یہ وہ ہے جس سے نسلِ انسانی ختم ہوگی اور یہ وہی ہے جس کی بدولت نسلِ انسانی دوبارہ چلے گی۔ جو اس کے ساتھ رہے گا وہ فلاح پائے گا اور اس کے دشمن صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔"

پھر مہدی المصالح نے تفصیل سے بتایا کہ نوحؑ کے زمانے میں طوفان کس طرح آئے گا، کس کس جگہ پانی پہنچے گا اور کون کون سے پہاڑ اس میں ڈوب جائیں گے (حضرت نوحؑ کے طوفان کا پانی کم و بیش چودہ ہزار فٹ اونچا ہو گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے

کہ کوہ ارارات جس پر حضرت نوحؑ کا جہاز جا کر ٹھہرا تھا سترہ اٹھارہ ہزار فٹ بلند ہے! اس طرح تفصیلات بتانے کے بعد مہدی الصالح نے اپنے بیٹے کو تاکید کی کہ تم نوحؑ کی ہر طرح حفاظت کرنا اور اس کے بارے میں کسی قسم کی تہمت اور بُرائی کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔

یہ سارا واقعہ جو حضرت نوحؑ کی پیدائش سے متعلق تھا صرف ایک جملہ کو بتانے کے لیے سنایا گیا۔ حضرتِ نوحؑ کی والدہ نے اپنے شوہر سے کہا تھا۔

"یہ بچہ کسی آسمان سے آنے والے مسافر سے پیدا نہیں ہوا۔" یعنی اس زمانے میں آسمان سے آنے والے آتے تھے اور پھر ان سے نسلیں بھی چلتی تھیں۔

۱۔ مذہب نے سوچ بچار کا دروازہ بند نہیں کیا۔ کیوں کہ آپ جتنی تحقیقات کریں گے اتنی ہی مذہب کی سچائی آپ پر ظاہر ہوتی جائے گی اور تمام مذاہب کے نقطۂ آغاز بھی ایک دوسرے مذہب سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔

۲۔ آدم سے قبل بھی زندگی اس کرہ پر موجود تھی اور شاید کئی بار نسلِ انسانی کا سلسلہ منقطع ہوا، لوگ آئے، بسے، آباد ہوئے، ترقی کی، مذہب سے سرتابی کی اور صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے۔

۳۔ انسانی تاریخ کے جو آثار مل رہے ہیں وہ یا تو ان انسانوں ہی کی قدیم نسلوں کے ہیں یا پھر آسمان کی وسعتوں سے آنے والے مسافروں کے ہیں جو یقیناً ہم سے زیادہ ذہین اور ایک متمدن علمی تہذیب کے مالک ہیں۔

سوال و جواب کے اس مرحلے کے بعد سر جان مارشل نے پھر اسی موضوع کی طرف رخ کیا اور یہ بتانا شروع کیا کہ دنیا کے مختلف تمدنوں اور تہذیبوں میں کائنات کی تخلیق اور اس کی فضا اور خلاء سے تعلق کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ اور کائنات کی تخلیق سے متعلق تمام قصوں کہانیوں میں یہ حقیقت بار بار دہرائی جاتی رہی ہے کہ روشنی سے تخلیق کی ابتدا ہوئی۔ ایسے دور دراز کے جزیروں میں بھی جہاں موجودہ دور کے ترقی یافتہ انسانوں کے قدم ذرا دیر ہی میں پہنچے تھے اس قسم کے قصوں اور موضوعات کو بار بار دہرایا جاتا تھا جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ قدیم انسانوں کو کائنات کی ابتدا کا جو کچھ بھی علم تھا اس کی بنیاد یہی تھی کہ تاریکی سے روشنی میں آنے کی وجہ سے کائنات کی ابتدا ہوئی۔

سوئیڈن کے بحری نباتاتی علوم کا ماہر بینٹ ڈینلسن اپنی بنائی ہوئی کشتی پر دنیا

کے گرد بحری سفر کرتے ہوئے جب وہ بحرِ اوقیانوس کے راروریہ نامی جزیروں کے جھنڈ پر پہنچا تو اسے ان ویران اور تقریباً غیر مہذب جزیروں میں چند بوڑھے جادوگروں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ جزیرہ تاہیٹی سے شمال مشرق میں چار سو میل دور واقع ہے۔ بوہنٹ ڈینلسن نے بعد میں اپنے سفر کے تجربات پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی جس میں اس جزیرہ کے احوال بھی لکھے۔

ڈینلسن کے سفرنامہ میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ یہ جادوگر جو قبیلوں کے نہایت سربرآوردہ اور عالم افراد میں شمار ہوتے تھے، شیروں کی کھال میں ملبوس ہوتے تھے اور بہت کم گفتگو کرتے تھے۔ ایک دن ڈینلسن نے ان کے مذہب اور ان کے آباؤاجداد پر گفتگو شروع کی تو بات اس کائنات کی ابتدا تک جا پہنچی۔ اس عالم یا جادوگر نے جس کا نام تیہ پوہنگ تھا نہایت فلسفیانہ گفتگو کی اور اس نے ڈینلسن کو بتایا۔

"شروع شروع میں ہر طرف ایک خلا تھا۔ نہ روشنی تھی، نہ تاریکی اور نہ زمین تھی نہ پانی، نہ دھوپ

جہاں کے پتھروں سے ان مجسموں کو بنایا جاتا تھا وہاں بھی سامان اس طرح بکھرا ہوا پڑا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں کے کاریگر اک دم کام چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پتھروں کے قریب قریب ہی کہیں کہیں جلے ہوئے کوئلے اور ہڈیوں وغیرہ کے نشانات بھی ملے ہیں جن کے متعلق یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ کم از کم چار سو سال قبل مسیح کے نشانات ہیں مگر جہاں تک پتھروں سے بنائے ہوئے مجسموں کا معاملہ ہے ان کی تاریخ چھ سات ہزار سال سے کم نہیں ہے۔ یہ جزیرہ ہر قسم کی تہذیب سے اور متمدن براعظموں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہے اور اس کی کل آبادی دو ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ قریب پاس کوئی جزیرہ یا آبادی نہیں ہے۔ یہاں کی زمین بنجر اور ناقابلِ کاشت ہے۔ پھر یہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے مجسمے بنانے والے لوگ جو یقیناً ہزاروں کی تعداد میں رہے ہوں گے جنہوں نے چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر دور دراز تک لے جانے کا کام انجام دیا ہوگا۔ آخر کس طرح یہاں رہے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کیوں کر ہوا ہوگا۔ ہاں، مقامی آبادیوں میں اس طرح کی کہانی آج بھی موجود ہے کہ اس جزیرے میں دیوتا آ کر رہتے تھے اور اپنے مجسمے خود بناتے تھے اور پھر ایک دن سارے دیوتا کام چھوڑ کر ایکا ایکی آسمان کی طرف اڑ گئے اور یہ مجسمے اسی طرح پڑے رہ گئے۔ یہاں بھی آسمان سے آنے والے دیوتاؤں کا تذکرہ موجود ہے۔ گویا

کوئی نہ کوئی راز ضرور ہے جس کی وجہ سے آسمانوں کی طرف آنے اور جانے والوں کا تذکرہ ہر ملک اور ہر تہذیب میں کسی نہ کسی طرح ضرور کیا جاتا رہا ہے۔ مصر میں یہی تصور موجود تھا۔ قدیم مصری اپنے مُردوں کی ممی بناتے وقت یہ گیت گاتے تھے۔

اے گول دُنیا سن!
میں اکسوں سالوں کی عُمر والا ہورس ہوں،
میں ہی تاج و تخت کا مالک ہوں،
میں برائیوں سے پاک ہوں،
میں خلاؤں میں اور فضاؤں میں سفر کرتا ہوں،
ان خلاؤں میں جس کی کوئی حد نہیں ہے۔

یہاں بھی خلاؤں اور فضاؤں کا تذکرہ موجود ہے۔ نہ صرف موجود ہے بلکہ دیوتا ہورس کے نام سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ میں ان فضاؤں میں اڑتا پھرتا ہوں۔ آخر یہ اُڑنے والے لوگ کون تھے.....؟ اور وہ کہاں سے آئے تھے؟

قدیم مصریوں کے کتبوں پر مشتمل ایک تحریر جو کئی اہراموں سے جابجا دستیاب ہوئی، کتاب رفتگاں، (BOOK OF DEAD) مرنے والوں کی کتاب کہلاتی ہے۔ یہ کوئی کتاب کی شکل میں مجتمع کتاب نہیں ہے بلکہ مصری اہراموں سے پائے جانے والے کتبوں کی تحریروں اور پیپرس (قدیم مصری دریائے نیل کے کنارے کی ایک خود رو گھاس سے تیار کرتے تھے، ایک طرح کا کاغذ جس کو (PAPRIUS) کہا جاتا تھا۔ اسی لفظ سے یونانیوں نے لفظ پیپر (کاغذ) کا نام حاصل کیا) پر تحریر کردہ اشاراتی زبان کے مجموعے کا نام، "کتابِ رفتگاں" ہے، اہراموں کی دیواروں پر اندر کی طرف مختلف شکلوں، تصویروں اور اشاروں سے اُن مرنے والوں کے لیے جو ان اہراموں کی دیواروں پر اندر کی طرف مختلف شکلوں، تصویروں اور اشاروں سے اُن مرنے والوں کے لیے جو ان اہراموں میں دفن ہیں مختلف ہدایتیں، قصے، دیوی دیوتاؤں کے لیے گیت اور مختلف مذہبی روایات کا خاصا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ سب سے بڑا ذخیرہ اور سب سے زیادہ تحریریں فرعون عناس کے اہرام میں ملتی ہیں۔ جن علما اور محققین نے ان تحریروں پر تفتیشی کام کیا ہے انہوں نے ان اشاروں کے واضح مفہوم بھی مقرر کر لیے ہیں۔ چند اشاروں اور تصویروں کے مفہوم یہ ہیں:۔

زندگی کا نشان جس سے مراد اہرام کی
تصویروں میں آدمی مرد اور عورت ہوتا ہے۔
تین لہریہ دار متوازی لکیریں جو پانی کو ظاہر
کرتی ہیں یعنی دریا، جھیل یا پانی کسی بھی
شکل میں ہو، آج پانچ ہزار سال گزرنے کے بعد
بھی جغرافیہ داں اور مصور اس تصویر سے پانی
ہی مراد لیتے ہیں۔
تین اس طرح یعنی نو کے ہندسوں سے بنی ہوئی
تصویروں سے مراد دیوتا یا خدا ہے۔
تین اوپر نیچے کے دائروں کو دو ترچھے ستون پر
ایستادہ دکھایا جاتا ہے تو اس کا مفہوم ابدیت
یا آسمانی زندگی یا دیوتاؤں کی زندگی مراد لی
جاتی ہے۔

بہت سے مصری تحریر شناس عالموں نے اس قسم کی تمام تحریروں کو وہ جن جن اہراموں سے بھی دستیاب ہوئیں ملا کر ایک باقاعدہ تحریر کے طور پر اس کتاب کی تالیف کی اور اس کو، کتابِ رفتگاں، BOOK OF DEAD کا نام دیا۔ اس کتاب کی تمام تحریروں کا کوئی ایک مستقل یا قطعی ماخذ موجود نہیں ہے۔ مگر عام طور پر یہ تحریریں قریب قریب پانچ چھ ہزار سال قدیم نظر آتی ہے۔ اس میں بعض مرتبہ ایک ہی لفظ اور ایک ہی قسم کی بات کو مختلف طریقوں سے دہرایا جاتا ہے۔ پھر مختلف عہد کے تعمیر کردہ اہراموں میں ان جملوں اور سالوں کے فرق کے ساتھ کتابِ رفتگاں کے مفہوم میں تبدیلی آ گئی۔ آخر کے عہد میں تعمیر ہونے والے اہراموں میں بہرحال یہ تحریریں ایک مخصوص نظم و ضبط کے ساتھ ملتی ہیں۔

کتابِ رفتگاں میں جو موضوعات عموماً موجود ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے جیسے فضا میں کسی خلائی مسافر کو بھیجنے سے قبل ایک "کوڈ بک" دی جا رہی ہے جس میں اس کے سفر کی وجوہات اور اس کی مختلف علاقوں سے گزرنے کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔ اس کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ کس کس قسم کے لوگ اس کو سفر میں ملیں گے اور ان کا عہدہ یا

رتبہ کیا ہوگا۔ اس کتاب میں وہ تمام قسم کے گیت، بھجن اور دعائیں بھی موجود ہیں جو ایک مردہ جسم کو ممی بنتے وقت پجاری اور جراح پڑھا کرتے تھے۔ جب مردہ جسم پر پٹیاں باندھ کر مرنے والے کے بدن کو ململ سے چھپا دیا جاتا تھا تو اس کے بیرونی اعضاء کی حفاظت اور ممی بنانے کی تیاری اس طرح کی جاتی تھی جیسے ایک خلانورد کسی طویل فضائی سفر پر روانہ ہونے سے قبل اپنے سفر کی تیاری کرتا ہے۔ قدیم مصری یہ خیال کرتے تھے کہ اس مردہ جسم سے جس کی آلائش کو مرنے والا اسی دنیا میں چھوڑ کر جاتا ہے ایک نیا جسم پیدا ہوگا اور وہ دوسرے جہان کو پرواز کر جائے گا۔ اس نئے جسم کا نام "ساہو" ہوتا تھا۔ شاید مصریوں میں یہ خیال تھا کہ جسم کی موت کے بعد بھی کچھ عرصہ تک جسمانی خلیہ زندہ رہتے ہیں اور ان خلیوں کو اگر صحیح فضا اور صحیح تناسب کی روشنی اور طاقت میسر آجائے تو وہ پھر نشوونما پاتے رہتے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے ماں کے پیٹ میں ایک خلیہ یا ایک جرثومہ صحیح مقام اور متناسب حرارت، روشنی، آکسیجن اور غذا پانے کے بعد ایک بچہ کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی لیے ماں کے پیٹ کی طرح قدیم مصری بھی اپنے مردوں کو اہراموں کی تنہائیوں میں مقید کر دیتے تھے اور یقین کرتے ہوئے کہ ممی کیا ہوا مردہ اہرام کے اندر نشوونما پائے گا پجاری دعائیہ گیت یوں گاتے تھے جو کہ کتاب رفتگاں میں درج ہے۔

"میں زندہ ہوں، میں زندہ رہوں گا۔ میں ایک پودے کی طرح بڑھوں گا۔ میرا گوشت نشوونما پائے گا۔" اس جملے سے بھی اس بات کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ مصریوں میں یہ یقین بڑا واثق تھا کہ انسانی جسم کے ساتھ ہی ساتھ کوئی اور چیز اور بدن کی کوئی طاقت ایسی ضرور ہے جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور اگر مناسب طریقے پر جسم کی نگہداشت کی جائے تو اس کو ابدیت، ہمیشگی اور کبھی نہ فنا ہونے والی زندگی مل جاتی ہے۔ یہ چیز اور جسم کی یہ طاقت روح کے علاوہ کوئی اور چیز تھی۔

قدیم مصریوں کے ان گیتوں میں ایک نہایت حیرت انگیز گیت وہ ہے جس میں دیوتاؤں کی طرف منسوب کرکے چند ایسے جملے کہے گئے ہیں کہ یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کے دیوتا کسی دور دراز کے سیارے سے آئے تھے جو ان میں رہے، ان کے درمیان رہ کر کچھ سکھاتے رہے اور پھر اپنے ان ہی دور دراز کے سیاروں کی طرف لوٹ گئے۔

مصری اپنے مردوں کو ویسے ہی طویل سفر کے لیے تیار کرتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کے طریقوں پر عمل کرکے دیوتاؤں کی طرح مرنے والے کو بھی پھر سے

جوان کیا جاسکتا ہے اور ان میں حیاتِ ابدی پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ خیال دیوتاؤں کے گیت سے لیا گیا تھا۔

"میں پھر سے جوان ہو جاؤں گا۔ میں اپنے شہروں میں پہنچ کر دوبارہ جوانی حاصل کر لوں گا، میری منزل یہاں سے نظر نہیں آسکتی، میں نے اپنے مادہ سے اپنا تعلق توڑا نہیں ہے۔ میں لاکھوں سالوں پر پھیلے ہوئے عرصہ کا دیوتا ہوں۔ میں نے اپنا گھر آسمان کی دور دراز تنہائیوں میں بنایا ہے۔"

یہ جملے اور یہ گیت قدیم مصریوں کی انشا پردازی کے کارنامے نہیں ہو سکتے۔ یہ خیالات کسی ادیب اور کسی شاعر کے قلم کا کمال نہیں ہیں۔ اُس زمانے میں کسے معلوم تھا کہ آسمان کے دور دراز سیاروں میں سال و مہینے ہمارے سالوں اور مہینوں سے بہت طویل ہوتے ہیں۔ ان کے ایک دن اور رات میں ہماری زمین کے ہزاروں سال بیت جاتے ہیں۔ ماہ و سال کے یہی فرق ہیں جن کی وجہ سے گیت میں یہ جملہ کہا گیا ہے کہ "میں لاکھوں سالوں کے عرصے پر پھیلے ہوئے زمانے کا دیوتا ہوں۔"

اہراموں کے اندر تحریر کردہ اشاراتی زبان میں دیوتاؤں ہی کی طرف سے منسوب کی ہوئی تحریروں کے ایسے ٹکڑے بھی مل جاتے ہیں جن میں کائنات کی تخلیق اور دنیا کے ابتدائی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ کائنات کی ابتدا کا علم ان لکھنے والوں کو کیوں کر ہوا؟ کس طرح انہوں نے یہ تمام باتیں معلوم کیں یہ ایک راز ہے۔ مگر بہرحال جس طرح "قبالہ" کی کتاب میں اور جس طرح تبتیوں کی کتاب میں کائنات کی ابتدا پر رائے زنی کی گئی ہے اسی طرح قریب قریب مصریوں کی اس "کتاب رفتگاں" میں بھی ایسے ہی بیانات سے مماثلت مل جاتی ہے۔

ان ہی اہراموں میں لکھا ہوا دیوتاؤں کا ایک گیت اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"میں جو نشو و نما کا پیدا کرنے والا ہوں اور میں نے ہی خود کو نمودار کیا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو ترقی دی اور بہت سی ترقیوں کے بعد میں نے اپنے آپ کو مکمل کر لیا۔

اُس وقت تک آسمان نہیں بنائے گئے تھے، نہ کوئی زمین تھی، نہ کوئی فضا تھی اور نہ ہی زمین پر رینگنے والے جانور موجود تھے۔ پھر میں نے ان کو پانی ملے ہوئے ایک ننھے سے مادے سے تشکیل دیا۔

میرا کوئی ساتھی نہ تھا، کسی نے میرے ساتھ کوئی کام نہیں کیا تھا۔ میں نے ہر چیز

کی بنیاد اپنے ارادے سے رکھی اور پھر اسی طریقے پر اس کی نشوونما ہوتی گئی۔"

ہندوؤں کی مشہور کتاب رگ وید میں بھی سر جان مارشل کے مطابق کائنات کے ابتدا کا تصور تخلیق کے گیت کے نام سے موجود تھا اور چینیوں کی کتاب "تاؤ کنگ" میں بھی اسی قسم کے تصورات تحریر ہیں کہ اس دنیا کی ابتدا ہماری زمینی فضا سے کہیں دور ہوئی ہے اور وہیں سے اس دنیا کا دوسری دنیا سے تعارف ہوا ہے۔

ہندوؤں ہی کی ایک کتاب مہا بھارت ہے۔ اس کتاب کا موضوع وہ عظیم جنگ ہے جو ہندوستان کی قدیم جنگوں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ جنگ کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان لڑی گئی تھی۔ مہا بھارت میں اور بھی بہت سی چھوٹی جنگوں کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں کُل اسی ہزار اشعار ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب اصل جنگ سے بہت دنوں بعد تصنیف کی گئی ہے۔ کتاب کی شکل میں مہا بھارت ۱۵۰۰ ق م میں وجود میں آئی۔ مگر یہ جنگ جس کا تذکرہ مہا بھارت کا موضوع ہے ۷۰۱۶ یا ۲۶۰۴ ق م میں لڑی گئی۔ تاریخوں کے اس قدر خصوصی تذکرے کی وجہ یہ ہے کہ ستاروں کی چال، ان کا مقام اور ان کے جن جھگڑوں کا تذکرہ کتاب میں موجود ہے وہ ان ہی دو سالوں میں ممکن ہو سکتے ہیں۔ ہندو خاص طور سے ستاروں کے علم میں دل چسپی رکھتے تھے اور ہر قدم پر ستاروں کی چال سے شگون لیتے تھے۔ چنانچہ ان کی مقدس کتابوں میں بھی ستاروں کی صورت حال کا بار بار تذکرہ آتا تھا۔ اسی نجوم کے حساب سے مہا بھارت کی جنگ ان ہی دو سالوں میں سے ایک سال میں لڑی گئی ہوگی۔ اس کتاب کے موضوع کا پہلا بیان کرنے والا دیاسا نام کا ایک شاعر تھا۔ مگر موجودہ صورت میں اسے سوتی نے سنایا تھا۔

ہندوؤں کی اس کتاب میں مہا بھارت میں برہما یعنی آسمانی طاقت کا ذکر ملتا ہے۔ آسمانی سالوں کی تفصیل یہ ہے کہ آسمان کے بارہ سو سال زمین کے چھتیس ہزار آٹھ سو سال کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ برہما ایک عظیم طاقت کا نام ہے جس کی مدد کے لیے اندرا اور اسی جیسے درجۂ دوئم کے بہت سے دیوتا موجود رہتے تھے۔

مہا بھارت افسانوی اور حقیقی واقعات کے درمیان کی چیز ہے۔ سر جان مارشل چونکہ سنسکرت سے بھی بخوبی واقف تھے اور انہوں نے اس کتاب کو اصل سنسکرت میں پڑھا تھا اس لیے اس کتاب کا تذکرہ انہوں نے ذرا تفصیل سے کیا۔ اس کتاب میں ارجن اور رام چندر جی وغیرہ کی پوری کہانی درج ہے اور اس میں بیان کیا گیا ہے کہ کائنات کی اصل شکل

کیا تھی اور پھر کس طرح یہ کائنات اچھے اور بُرے لوگوں سے بھرتی چلی گئی۔ خیر اور شر کی ازلی جنگ میں ایک طرف رام چندر جی، سیتا جی اور ارجن وغیرہ تھے جو نیک، وعدے کے پابند، شریف اور بہادر لوگ تھے۔ دوسری طرف کورو تھے جو چال باز، شیطان صفت اور دھوکے باز لوگ تھے۔ رام چندر جی کی پشت پر آسمانی طاقتیں تھیں۔ انہوں نے رام چندر کی ہر ہر قدم پر مدد کی۔ آسمانی مدد کے لیے دیوتا اڑنے والی چمک دار مشینوں میں بیٹھ کر آتے تھے اور رام چندر جی کے دشمنوں کو تہس نہس کر جاتے تھے۔ اس کتاب کی ابتداء میں برکمو جو ایک عقل مند اور عالم شخص ہے اور بہت سے سوالوں کے جواب دیتا ہے، کائنات کی ابتداء کے بارے میں کہتا ہے۔

"خلاء لامحدود وسعتوں کا نام ہے۔ اس میں نیک لوگوں کی آبادیاں ہیں۔ یہ ایک حسین فضا ہے جس میں جگہ جگہ لوگ رہتے ہیں۔ مگر اس خلاء کو ناپا نہیں جاسکتا۔ اس فضا کے اوپر قوتیں موجود ہیں۔ اور اس کے نیچے سورج اور چاند نظر نہیں آتے۔ اس فضا میں دیوتاؤں کی اپنی روشنیاں ہیں جو سورج سے زیادہ چمک دار ہیں۔

اس خلاء کے اوپر دور بہت دور تک لامحدود فضا ہے جو چمکتی ہوئی آگ کی طرح روشن آدمیوں سے آباد ہے۔"

سر جان مارشل نے کہا کہ سنسکرت کا سب سے بڑا ادارہ سنسکرت کی بین الاقوامی تحقیق کی اکیڈمی میسور میں موجود ہے جس میں سنسکرت کا سب سے بڑا عالم مہارشی بھار دوایا کو کہا جاتا ہے۔ اس ادارہ اور سنسکرت کے اس عالم نے دمیانا (جو مہا بھارت میں دیوتاؤں کی سواری کے لفظی معنی کے طور پر استعمال ہوئی ہے) یعنی رتھ کی تشریح یوں کی ہے۔ چوں کہ جنگی رتھوں کا تذکرہ بار بار آیا ہے اس لیے ان رتھوں کی خصوصیات کا سمجھنا ضروری ہے۔ یہ عام رتھوں سے علیحدہ اور مختلف تھے۔ دمیانا کی خصوصیات جو مہا بھارت کے مطالعے سے سامنے آئی ہیں یہ ہیں۔

ایک ایسی مشین جو تباہ نہیں ہو سکتی۔

جس کا راز معلوم نہیں کیا جاسکتا،

یہ ایک ایسی مشین ہے جس کو بے حرکت کھڑا کیا جاسکتا ہے اور جس کو نظروں سے غائب کیا جاسکتا ہے،

اس مشین کے اندر بیٹھ کر دشمنوں کی جنگی چال دیکھی جاسکتی ہے اور باتیں سنی

جاسکتی ہیں،

اس مشین سے دشمنوں کی اسی قسم کی مشین کا اندرونی حال دیکھا جاسکتا ہے اور ان کے اڑنے کا راستہ معلوم کیا جاسکتا ہے، اور

اس مشین سے دھواں نکالا جاسکتا ہے جس سے دشمنوں کو فی الفور بے ہوش کیا جاسکے۔

سرجان مارشل نے کہا "اب ذرا آپ لوگ ایک لمحہ کے لیے سوچیں کہ سات ہزار سال قبل مسیح میں مہا بھارت کی جنگ میں استعمال ہونے والی دیوتاؤں کی اس مشین کا تذکرہ آج کل کی ایجادوں سے اور مختلف قسم کی گیسوں اور مہلک ہواؤں کے تذکرے سے کس قدر ملتا جلتا ہے۔"

مہا بھارت میں بعض پیراگراف محیرالعقول ہیں مثلاً یہی بات کہ مہا بھارت میں اس مشین کا تذکرہ ہے جسے دمیانا کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مشین ہے جس میں بیٹھ کر آسمانی دیوتا بھیم اور رام چندر جی کی مدد کرنے آیا تھا۔ یہ مشین نہایت تیز رفتار تھی اوپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر طرف آسانی سے اڑ سکتی تھی۔ ایک جگہ اسی مہا بھارت میں لکھا ہے:۔

"بھیم اپنی دمیانا کے ساتھ اڑا ایک چمک دار کرن پر سوار ہو کر۔ یہ چمک دار مشین سورج کی طرح نگاہوں کو اندھا کر دینے والی تھی اور جب یہ اوپر کی طرف اٹھتی تھی تو اس میں سے طوفان کی گرج کی طرح سے آوازیں نکلتی تھیں اور یہ نہایت سرعت سے اوپر کی طرف اڑ جاتی تھی۔"

دمیانا کے ساتھ ہی ساتھ مہا بھارت میں اُڑنے والی سواریوں کا تذکرہ ہے جو گھوڑا گاڑی کی طرح ہوتی تھیں۔ یہ سواریاں دو طرح کی تھیں، ایک وہ جو اُڑ سکتی تھیں اور ایک وہ جو زمین پر ہی رہتی تھیں۔ مہا بھارت ہی میں یہ بھی مذکور ہے:۔

"رام کے حکم پر ہی شاہی سواری اوپر کی طرف اٹھی۔ اس کے اوپر اٹھتے وقت دھوئیں کا پہاڑ اٹھ رہا تھا اور دور دور تک ایک خوفناک چنگھاڑ سنائی دے رہی تھی۔"

مہا بھارت میں اڑنے والی مشین کے علاوہ چند مہلک ہتھیاروں کا بھی تذکرہ موجود ہے جو اس جنگ میں آسانی طاقتوں نے استعمال کیے تھے۔ ان میں بعض ہتھیار ایسے بھی تھے جو پوری کی پوری آبادی کو ایک لمحہ میں تہس نہس کر سکتے تھے اور ایسے ہتھیار بھی

تھے جن کے استعمال سے پورا علاقہ آن کی آن میں ایک بنجر زمین بن سکتا تھا اور پھر اس زمین میں بارہ سال تک ایک پودا بھی نہیں اگ سکتا تھا۔ یہ ایسا ہتھیار تھا جو بچوں کو رحم مادر میں فنا کر سکتا تھا۔ یہ ہتھیار اور یہ گاڑیاں آسمانی دیوتا خود نہیں لائے تھے بلکہ مہا بھارت کا ہیرو ارجن جو ہزار تکلیفیں اور دقتیں اٹھا کر دیوتاؤں کے پاس پہنچا تھا اور جس نے وہاں دیوتاؤں سے ملاقات کر کے ان کو رام چندر جی کی مدد کرنے پر تیار کیا تھا، تو دیوتا ہتھیار لے کر اس کی مدد کرنے آئے تھے۔ مہا بھارت میں مذکور ہے کہ ارجن نے ایک طویل مسافت طے کی اور مصیبتیں اٹھاتا ہوا اندرا دیوتا کے ٹھکانے پر جا پہنچا اندرا کے ساتھ اس کی رانی ساشی بھی بیٹھی تھی۔ ان دونوں نے ارجن کو شرف ملاقات بخشا اور یہ ملاقات کس جگہ ہوئی؟ یہ ملاقات آسمان پر لڑنے والی جنگی رتھوں میں ہوئی اور ان رتھوں میں دیوتاؤں نے ارجن کو آسمان کی سیر کرائی۔ مہا بھارت کے آٹھویں باب میں درج ہے کہ اندرا ایک بار پھر زمین پر نمودار ہوتا ہے اور پورے روئے زمین سے صرف ایک شخص یدھشٹرا کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے فانی جسم کے ساتھ آسمانوں کی جنت میں داخل ہو سکتا ہے۔ اسی باب میں ایک ایسے ہتھیار یا بم کا تذکرہ ہے جو گورکھا نے اپنے جنگی رتھ سے زمین پر پھینکا تھا۔ اس بم نے جو ایک زوردار آواز کے ساتھ پھٹا اور جس کے ساتھ ہی چمک دار دھوئیں کا سیلاب اٹھا اور آن واحد میں دشمنوں کے تین قریب قریب کے آباد شہروں کی ہر شئے کو نیست و نابود کر دیا۔ وہاں راکھ کے سوا اب کچھ موجود نہ تھا۔

مہا بھارت میں اس واقعہ کو یوں لکھا گیا ہے۔ (سر جان مارشل نے یہ تمام اقتباسات این۔ دت کے انگریزی ترجمہ سے لیے تھے جو ۱۸۸۹ء میں لندن میں شائع ہوا تھا۔)

"اور پھر یوں لگا جیسے آگ، ہوا، پانی اور مٹی کا ایک دوسرے سے تعلق ختم ہو گیا ہے۔ زمین کی گردش اور تیز ہو گئی۔ اس ہتھیار سے خارج ہونے والی آگ کی تپش سے ہر چیز جلنے لگی۔ دشمنوں کے ہاتھی اس گرمی سے گھبرا گھبرا کر ادھر سے اُدھر بھاگتے تھے مگر انہیں کہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔ ندی نالوں کا پانی اُبلنے لگا تھا۔ جانور مرنے لگے، بڑے بڑے درخت جھلس کر زمین پر آ رہے۔ دشمن کٹی ہوئی گھاس کی طرح زمین پر بے جان پڑا تھا۔ زمین مرتے ہوئے ہاتھیوں کی چیخوں سے گونج رہی تھی۔ گھوڑے اور جنگی رتھیں سب کی سب جل کر کوئلہ بن چکی تھیں۔ ہزاروں رتھیں بھسم ہو چکی تھیں۔ گہرے سمندر کی سی خاموشی ہر طرف چھائی جا رہی تھی۔ یہ ایک ہولناک نظارہ تھا۔ تب ایسے میں

گرم ہوا چلنی شروع ہو گئی اور زمین تپتے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہونے لگی۔ لاشیں اس طرح کٹی پھٹی پڑی تھیں کہ وہ انسانوں کی لاشیں معلوم ہی نہ ہوتی تھیں۔ اس سے پہلے انسانوں نے ایسے ہتھیار کبھی نہ دیکھے تھے اور نہ کبھی اس سے پہلے انسانوں نے ایسے کسی ہتھیار کے بارے میں سنا تھا۔"

یاد رہے کہ یہ تفصیل ان تین شہروں کی تباہی کے علاوہ ہے جو جنگ کے میدان کے قرب و جوار میں تھے اور یک بیک ختم ہو گئے تھے۔ جو علاقے ذرا فاصلے پر تھے وہ بھی تباہی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ یعنی یہ تباہی ایک وسیع علاقے پر ایک دم نازل ہو گئی تھی۔ سرجان مارشل نے کہا "اس بیان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی خطرناک قسم کا بم تھا جو آسمان سے آنے والے خلانوردوں نے ارجن کی حمایت میں اس کے دشمنوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔ مہا بھارت میں جس طرح کی تفصیل ان بموں کی تباہ کاریوں کے متعلق دی ہوئی ہے وہ دماغی اختراع نہیں ہے اور نہ ہی تصور و تخیل کا کارنامہ ہے بلکہ سمجھنے والی عقلیں سمجھ سکتی ہیں کہ یہ حقیقی مناظر کی تصویر کشی ہے"۔

سرجان مارشل نے مجمع سے سوال کیا کہ مہا بھارت کی جنگ سات ہزار سال قبل مسیح لڑی گئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انسان حجری دور میں تھا۔ آج کی تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ یہ زمانہ طوفان نوح کے قریب کا زمانہ ہے۔ لوگ اس تمدن کو وحشی تمدن کہتے ہیں۔ دنیا کے اکثر علاقوں میں ابھی تمدن کی ابتدا بھی نہ ہوئی تھی۔ پھر اس قسم کے ہتھیار، ایسی الٹرا موڈرن گاڑیاں (رتھیں) اور ایسے نقصان رساں بم کس طرح بنے اور کس نے بنائے؟ اور ایک مہا بھارت ہی میں اُڑنے والی گاڑیوں کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ بائبل میں بھی اس قسم کی گاڑیوں یا راکٹ جیسی سواریوں کی آمد و رفت کا تذکرہ موجود ہے۔

اگر بائیبل والے یا اسی طرح یہودی اپنے ذہنوں سے فرشتوں کا تصور نکال دیں تو اس طرح کے آنے جانے والے آسمانی خلانورد خلائی مسافر ہی کہے جائیں گے۔ مگر چوں کہ اس دور کے حبشی لوگوں کا علم محدود تھا اور وہ آج کے مقابلے میں سائنس کی موشگافیوں کو سمجھنے کے اہل ہی نہ تھے اس لیے ان کے واسطے آسمان سے آنے والا ہر فرد دیوتا تھا۔ بعد کے مذہبوں نے ان کو فرشتوں کا نام دے دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرشتوں کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔ بے شک ان کا وجود ہے اور وہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں کے پاس آتے رہے ہیں مگر بسیم، گورکھا اور ساشی یقیناً فرشتے نہ تھے بلکہ کسی آسمانی ستارے کی

مخلوق تھے۔ وہ ستارہ جس میں انسانی آبادی کی ابتدا بہت پہلے ہو چکی تھی، جس کا تمدن اور علم زمینی باشندوں کے مقابلے میں نہایت عظیم اور برتر تھا اور یہ لوگ زمین کی طرف آتے جاتے رہتے تھے۔ یہاں کے لوگوں کو تربیت اور تعلیم کے ذریعے اچھا اور بہتر بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ساری دنیا میں غیر متمدن اور وحشی انسان ان کو اپنا محسن مانتے تھے اور ان کو دیوتا کا درجہ دیتے تھے۔ ان دیوتاؤں کے پاس راکٹ قسم کی تیز رفتار گاڑیاں تھی جو دھواں چھوڑتی ہوئی تیزی کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھتی تھیں۔ اسی طرح لیزر بیم جیسی روشنی کی طاقت ور شعاعیں ہوتی تھیں جو اپنے مدمقابل کو جلا کر بھسم کر سکتی تھیں۔ چوں کہ یہ لوگ اوپر کی طرف سے آتے تھے اس لیے اپنی رعایا یا اپنے ماننے والوں کے علم کے بغیر یکایک کسی جگہ بھی نمودار ہو جاتے تھے اور پھر اسی طرح برق رفتاری سے اِدھر اُدھر سے اڑ بھی جاتے تھے۔ شاید ان کے پاس بموں کی کوئی خطرناک قسم تھی جس سے یہ تمام دشمنوں کو فی الفور ختم کر دیتے تھے۔

جس طرح میدانِ جنگ کی تباہی کا حال مہا بھارت میں مذکور ہے اسی طرح ایک اور تباہی کا حال بائیبل میں ملتا ہے۔ سرجان مارشل نے کہا میں ایک سچا عیسائی ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ بائیبل ایک آسمانی صحیفہ ہے اور میں اس میں بیان کردہ مختلف واقعات پر بھی ہمیشہ غور کرتا رہتا ہوں تو کبھی کبھی یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ شاید کہیں کہیں فرشتوں سے مراد آسمانی یا خلائی مسافر تو نہیں تھے بائیبل یوں بھی آج اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔ اس میں جو قصے سنائے گئے ہیں وہ توریت اور زبور میں بھی موجود ہیں اور کچھ کچھ قرآن میں بھی ملتے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بائیبل کو جمع کر کے کتاب کی صورت میں تشکیل کرنے والوں نے اپنے دور کے جانے پہچانے قصوں اور واقعات کو بھی ان میں سمونے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ آج جو بائیبل ہمارے سامنے ہے وہ کوئی مکمل آسمانی صحیفہ نہیں ہے جب کہ قرآن ایک مکمل کتاب ہے اور انجیل مسخ شدہ شکل میں موجود ایک کتاب ہے۔ اس کتاب میں مہا بھارت سے ملتا جلتا ایک قصہ حضرت لوطؑ پیغمبر کا ہے۔

انجیل میں تحریر حضرت لوطؑ کا قصہ یہ ہے کہ جس علاقے میں رہتے تھے اس قصبے کا نام "سدوم" تھا اور اس کے قریب ہی ایک اور بڑا مشہور شہر "گمورہ یا جمرہ" تھا۔ اس جگہ کے رہنے والے لوگ بڑے عیار، دولت مند، بڑے بڑے محلوں کے مالک اور تمام شیطانی

عادتوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان میں جنسی تعیش، ہم جنس پرستی بھی عام تھی۔ چنانچہ ہم جنس پرستوں کو آج تک اسی قوم لوط کی مناسبت سے لواطی کہا جاتا ہے۔

حضرت لوطؑ کے پاس فرشتوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ حضرت لوطؑ غریب اور مفلوک الحال تھے اور شہر سے دور ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہا کرتے تھے۔ شہر کے غنڈے، بدمعاش ان کو ایک بے ضرر غریب شخص سمجھ کر ان سے کوئی تعرض نہ کرتے تھے مگر ان کو کسی نہ کسی طرح یہ اطلاعات بھی ملنے لگیں کہ نوعمر حسین و جمیل جوان (فرشتے) ان کے پاس آتے ہیں۔ چنانچہ ان خبروں نے ان کی آتشِ ہوس کو بھڑکانا شروع کر دیا۔

انجیل کے قصے کے مطابق ایک شام دو فرشتے حضرت لوطؑ کے پاس آئے اور رات کو ان ہی کے مہمان رہے۔ کسی طرح یہ اطلاع پھر سدوم کے اوباشوں میں گشت کرنے لگی کہ آج رات لوط کے پاس پھر دو حسین و رعنا جوان پہنچ گئے ہیں۔ شہر والے ان کو کسی صورت فرشتے تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ لوطیوں کا ایک بڑا مجمع ان کے گھر پہنچا اور حضرت لوطؑ سے مطالبہ کیا کہ ان نوجوانوں کو ایک رات کی شب باشی کے لیے مجمع کے سپرد کر دیا جائے۔ حضرت لوطؑ نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ یہ آسمان سے آئے ہوئے لوگ ہیں اور پھر ان کے مہمان بھی ہیں۔ وہ یہ بے عزتی کیسے برداشت کر لیں گے کہ ان کو مجمع کے حوالے کر دیں۔ حضرت لوطؑ نے یہاں تک کہا کہ ان کی دو کنواری، جوان اور خوبصورت لڑکیاں موجود ہیں وہ ان کو مجمع کے حوالے کرنے کو تیار ہیں مگر اپنے آسمانی مہمانوں کو ان کی ہوس کا نشانہ نہ بننے دیں گے۔

جب بات حد سے بڑھنے لگی تو حضرت لوطؑ نے ایک شب کی مہلت مانگی اور یہ طے ہوا کہ اگر لوط نے صبح تک ان کے حق میں فیصلہ نہ کیا اور یہ دونوں نوجوان ان کے حوالے نہیں کیے تو پھر ان کو تباہی سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ حضرت لوطؑ کے مہمان اندر سے یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ انھوں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر دیا کہ اب اس قوم کو نیست و نابود ہی کر دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے لوط کو حکم دیا (بائیبل-۱۹ باب تخلیق)

"اے لوط! تم اپنے آپ کو، اپنی بیوی کو، اپنے لڑکوں کو، اپنے لڑکے کے بچوں کو، اپنی لڑکیوں کو اور ان کے شوہروں کو لے کر جتنا جلد ہو سکے اس شہر سے باہر نکل جاؤ۔ مگر لوط کے خاندان والوں نے یوں بغیر وجہ کے ایکا ایکی گھروں کو چھوڑ دینے سے انکار کر دیا۔ اور جب صبح ہوئی تو پھر فرشتوں نے لوط کو تاکید کی اور جلد از جلد پہاڑوں کی طرف بھاگ

جانے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا شہر میں ایک زبردست تباہی آنے والی ہے۔ جو یہاں رہے گا نیست و نابود ہو جائے گا۔ تب لوط نے ذرا عجلت کی۔ اس نے اپنے لڑکوں کا ہاتھ پکڑا، اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا، اپنی دونوں بیٹیوں کا ہاتھ پکڑا اور سب بچوں اور عورتوں کو ساتھ لیا اور پہاڑوں کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ خدا ان پر مہربان تھا۔ فرشتوں نے پھر ان کو تیز بھاگنے کے لیے کہا۔ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگو اور خبردار مڑ کر نہ دیکھنا اور میدانوں میں ہرگز نہ رکنا۔ سامنے کے پہاڑوں کے پیچھے چھپ جانا ورنہ تم سب ہلاک ہو جاؤ گے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمھیں بھی کوئی تباہی سے نہ بچا سکے گا..."

اور پھر جب حضرت لوطؑ پہاڑوں میں پہنچ چکے تو انھوں نے ایک زبردست چنگھاڑ کی آواز سنی کسی کو پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہ ہو سکی مگر لوط کی بیوی نے مڑ کر جلتے ہوئے شہر کو دیکھنا چاہا تو وہ فوراً وہیں راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ خدا نے ان دونوں شہروں پر پتھروں اور آگ کی بارش برسا دی تھی اور آن کی آن میں ہر چیز تہس نہس ہو کر رہ گئی۔ پھر اگلے دن لوط نے دیکھا کہ ان آبادیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہر چیز ایک سپاٹ بنجر میدان میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ان علاقوں سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا، ایسا گرم دھواں جیسا کہ گرم بھٹیوں سے اٹھتا ہے۔ نہ آبادیاں باقی تھیں نہ مکان، نہ محلات نہ گھر اور نہ سڑکیں سب کے سب غائب جیسے کوئی ہوا میں اڑا کر لے گیا ہو مگر سدوم اور گمورہ کی آبادیاں کہیں نہیں گئی تھیں۔ زمین میں دفن کر دی گئی تھیں۔

اپنے سامعین سے سرجان مارشل نے کہا کہ چند لمحوں کے لیے یہ بھول جائیے کہ لوط کی کہانی خدا کی زبانی سنائی ہوئی آسمانی صحیفہ کی کہانی ہے۔ پھر یہ بتائیے کہ جس وقت فرشتے لوط کے گھر پہنچے اور ان کو یہ معلوم ہوا کہ مقامی آبادی ان کو لے جانے کے لیے مصر ہے تو وہ اسی وقت اپنے خدا کی طرف پرواز کیوں نہ کر گئے؟ کیا یہ ضروری تھا کہ فرشتے صبح سے قبل واپس نہیں جا سکتے تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ اگلی صبح کو سدوم اور گمورہ تباہ ہو گئے تو کیا خدا اور اس کے فرشتے کسی ٹائم ٹیبل کے پابند تھے جو لوط کو بھاگنے کی مہلت بھی مشکل ہی سے مل رہی تھی؟ اور یہ دھمکی کیوں دی جا رہی تھی کہ لوط اگر تم نہ بھاگے تو تباہ ہو جاؤ گے؟ گویا خدا اس تباہی سے کسی کو محفوظ رکھنے سے عاجز تھا؟ پھر لوط سے یہ کیوں کہا گیا کہ خبردار پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا؟ اس حکم کا جواز کیا تھا؟ اور جب لوط کی بیوی نے پیچھے مڑ کر دیکھ ہی لیا تو اس کی فوری موت کیوں واقع ہو گئی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ کے پاس فرشتے تو

آتے ہی تھے مگر ان کے پاس خلاء سے انسان سے ملتی جلتی کوئی اور مخلوق بھی آتی تھی۔ اس مخلوق کا بھی ان کے پاس آنا جانا تھا۔ ان کے پاس مہلک ہتھیار بھی ہوتے تھے۔ جب انھوں نے قومِ لوط کے مطالبے سنے تو انھوں نے فوراً ان کو سزا دینے کا تہیہ کرلیا اور ان کے لیے ایک وقت مقرر کیا مگر چوں کہ حضرت لوط سے ان کے اچھے مراسم تھے اس لیے ان کو بچانے کی کوشش کی۔ شاید یہ کوئی بم تھا جس میں تابکاری اثرات موجود تھے۔ پہاڑوں اور چٹانوں سے تابکاری شعاعیں گزر نہیں سکتی تھیں چنانچہ پہاڑوں کی پناہ گاہ سب سے زیادہ محفوظ تھی۔ مگر آنکھیں ان تابکار شعاعوں کو دیکھنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھیں۔ اسی لیے تاکید کردی گئی تھی کہ مڑ کر نہ دیکھا جائے اور یہ بم اس قدر طاقتور تھا کہ اس نے آن کی آن میں ہر چیز کو جلا کر راکھ کردیا اور پورا شہر ایک گڑھے میں دفن ہوگیا۔

سرجان مارشل نے کہا۔ "ممکن ہے یہاں بیٹھے ہوئے عیسائی برادران مجھ پر اعتقادات سے بغاوت کا فتویٰ لگائیں مگر جو کچھ کہا ہے وہ فقط ایک مفروضہ ہے کہ آپ قومِ لوط کی تباہی کو اس زاویہ سے بھی پرکھیں تو ممکن ہے سوچنے اور سمجھنے کے لیے عقل کو کچھ مواد مل جائے۔

سرجان مارشل نے بائبل ہی سے ایک اور پیغمبر الزاخیل کے اس بیان کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے اپنی قید کے زمانے میں ایک آسمانی گاڑی کو اترتے دیکھا اور چشم دید گواہ کے طور پر پورا واقعہ بیان کیا۔ یہ بھی بائبل میں پورا کا پورا موجود ہے۔

"..... میری قید کا تیرہواں سال تھا اور چوتھے مہینے کا پانچواں دن تھا اور میں دریائے شیار کے کنارے قیدیوں کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا جیسے آسمان کے پردے کھل گئے شمال کی طرف سے ایک بگولہ اٹھتا نظر آیا۔ ایک بہت بڑا بادل اور ایک آگ جو حرکت کررہی تھی اور ایک چمکدار ہالہ سا تھا جو اس آگ کے بیچوں بیچ روشن تھا اور اس ہالہ کے درمیان میں چار زندہ انسانوں جیسے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس مخلوق کی شکل انسانوں سے ملتی جلتی تھی۔ مگر یہ انسان نہ تھے۔ ہر ایک کے چار چار چہرے تھے اور سب کے چار چار پروں جیسی کوئی چیز بازوؤں کے ساتھ تھی اور ان کے پیر بالکل ہی سیدھے تھے اور ان کے پنجے گائے کے بچھڑے کی طرح تھے اور ان کے چہرے آگ میں تپتے ہوئے تانبے کی طرح تھے۔"

پھر الزاخیل نے اس مخلوق کے زمین پر اترنے کا حال بیان کیا ہے کہ خلائی مشین

جس سے دھواں اور آگ کے شعلے نکلتے تھے کس طرح زمین پر آکر رک گئی۔ اس کا حال خود بائیبل کی زبان میں یہ تھا۔

"..... میں نے اس مخلوق کو قریب سے دیکھا۔ اس نے اس مشین کا ایک پہیہ زمین پر ٹکا دیا اس مخلوق کے چار چہرے تھے۔ ان کی مشین کا رنگ سنہرا چمک دار تھا۔ ان چاروں کے چہرے بالکل ایک جیسے تھے۔ ان کی مشین میں کئی طرف چار پہیے سے لگے ہوئے تھے۔ جب یہ مشین اٹھتی تھی تو اس کے چاروں پہیے ایک ساتھ اٹھ جاتے تھے اور کسی جگہ جا کر اندر گم ہو جاتے تھے۔ یہ پہیے مشین کے ساتھ نہیں چلتے تھے اور اس مشین کے کچھ ٹکڑے اتنے اونچے تھے کہ ان کو دیکھ کر ڈر محسوس ہوتا تھا اور اس مخلوق کے چہرے پر گول گول دائرے تھے جو چاروں چہروں پر ہر طرف موجود تھے۔ شاید ان کی آنکھیں تھیں جن سے وہ ایک ساتھ ہر طرف دیکھ سکتے تھے۔ تب ایکاایکی ہم سب قیدیوں نے یہ آواز سنی "انسانوں کے بیٹو! اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" پھر میں نے اپنی پشت پر ایک تیز آواز سنی کوئی کہہ رہا تھا "خدا کی نعمتیں تم پر اتاری جائیں گی"۔ میں نے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز بھی سنی اور ایسی آواز جو پہیوں کو حرکت کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔"

لزاخیل کا بیان خاصا طویل ہے جو بائیبل میں موجود ہے (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بیسویں صدی کے کسی راکٹ یا جہاز یا اڑن طشتری کی آنکھوں دیکھی تفصیل بیان کی جارہی ہے)

"...... اور پھر وہ ان ہی میں سے ایک آدمی سے کچھ بات کرتا رہا۔ اس نے کہا تم دونوں پہیوں کے درمیان جاؤ اور قرو بیم (جگہ جگہ اس مشین کا نام بائیبل میں قرو بیم لیا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس زمانے میں قرو بیم سے کیا مراد لی جاتی تھی) کے نیچے جا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے کوئلہ جیسے آگ کے پتھر بھر دو اور پھر وہ آدمی میری نظروں کے سامنے سے ہٹ گیا۔

قرو بیم گھر کی دائیں طرف کھڑی ہوئی تھی جیسے ہی وہ آدمی اندر گیا، دھوئیں کے بادل جیسی ہوا سے اس گھر تک صحن بھر گیا۔ تب پھر میرے خدا کی شان اور بڑھی۔ یہ قرو بیم گھر کی دہلیز تک آگئی اور سارا کا سارا گھر اسی غبار جیسے بادل سے بھر گیا اور سارا صحن بھی بادلوں سے بھر گیا اور سارا گھر میرے خدا کے نور سے چمک اٹھا اور قرو بیم کے پروں یا

پنکھوں کی آواز ہر طرف سنائی دینے لگی اور جب یہ مشین اوپر اٹھی تو اس کے پہیے بھی اوپر اٹھ گئے اور میری نظروں کے سامنے یہ اوپر اٹھتی گئی۔"

نوٹ: یہ بیان ۱۸۰۱ء میں سرجان مارشل نے قاہرہ یونیورسٹی میں لیکچر کے دوران پڑھ کر سنایا تھا۔ اس وقت تک رائٹ برادرز کے جہاز ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ راکٹ اور جیٹ بھی وجود میں نہیں آئے تھے مگر آج ۱۹۷۸ء میں کیا بائبل کا یہ بیان کسی جہاز یا ہیلی کاپٹر جیسی مشین کے حال سے مشابہ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بیان بائبل میں دو ہزار سال قبل کا لکھا ہوا ہے۔

اس بیان کے علاوہ یہودیوں کی مشہور کتاب اپوکرائی فکل میں جسے کتابِ ابراہیم بھی کہا جاتا ہے اسی قسم کی گاڑیوں کا تذکرہ موجود ہے۔ ایک مقام پر حضرت ابراہیم کے نام منسوب کردہ چند جملے اشعار دس باب میں یوں پیش کیے گئے ہیں۔

"..... اس مخلوق کی پشت پر میں نے ایک رتھ جس کے پہیے آگ کے تھے اور ہر پہیے میں جا بجا آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور ان پہیوں کے اوپر ایک تخت بچھا ہوا تھا جس کے چاروں طرف آگ گردش کر رہی تھی....."

سرجان نے کہا کہ یہ کتاب بھی آج سے کم و بیش تین ہزار سال قبل تحریر کی گئی تھی۔ گویا اس وقت بھی غیر معمولی قسم کی گاڑیاں کہیں کہیں نظر آجایا کرتی تھیں۔ اس کتاب کو ملا کر یہودیوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں میں مختلف رتھوں، مشینوں، مہلک ہتھیاروں وغیرہ کے ایسے تذکرے موجود ہیں جن سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ کسی نہایت ذہین مخلوق کو ہماری زمین پر آتے رہنے اور زندگی گزارنے کا موقع ملا ہے اور انھوں نے نہ صرف نشانیاں چھوڑی ہیں بلکہ اپنی آمد سے متعلق تذکرے بھی اپنے ہم عصروں کی تحریروں اور کہانیوں کے طور پر چھوڑے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کہانیوں کی بجائے ماورائی داستانوں کی شکل اختیار کر گئے اور چوں کہ بعد میں اس ذہین مخلوق یا آسمانی مخلوق کا زمین سے تعلق ختم ہو گیا اس لیے ان کہانیوں اور قصوں کو غیر حقیقی اور افسانوی سمجھا جانے لگا۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ جیسے ہر افواہ کی پشت پر کوئی نہ کوئی سچائی ضرور ہوتی ہے اسی طرح ہر دیومالائی داستان کے لیے اس کے اندر کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور پوشیدہ ہوگی۔

سرجان مارشل نے کہا کہ میں اپنا لیکچر ختم کرنے سے پہلے ایک بار پھر آپ سب کی

توجہ آج کی دنیا میں پائی جانے والی ان چیزوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جن کی آج
تک کوئی سائنسدان بھی مناسب طور پر تشریح نہیں کر سکا ہے یہ آثار روس، امریکہ، چین،
یورپ کے ممالک اور غرض ہر جگہ موجود ہیں۔

امریکہ کے صحرائے نویدا (نویدا امریکہ کی ایک ریاست ہے) میں خاصا بڑا بنجر اور
ریتیلا صحرا موجود ہے اس صحرا میں ایک جگہ ہے جسے موت کی وادی کہتے ہیں یہ نام ریاست
ہائے متحدہ کے امریکیوں کا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ ریڈ انڈین بھی اس جگہ کو اسی نام سے
پکارتے تھے۔ اس موت کی وادی کے قریب کوئی آتش فشاں پہاڑ زندہ یا مردہ موجود نہیں
ہے مگر یہاں پگھلی ہوئی چٹانیں آج بھی نظر آجاتی ہیں۔ اس علاقے میں آج بھی گھاس
کا ایک تنکا نہیں اگتا یہاں جگہ جگہ ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کبھی
چٹانوں کو جلایا گیا ہوگا۔ کون مان سکتا ہے کہ پچاس پچاس سو من کی چٹانیں جل سکتی ہیں۔
اس صدی تک کسی کو یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا مگر اب سائنسداں جانتے ہیں کہ اگر
سورج کی شعاعوں کو یک جا کر کے ایک تناسب سے مضبوط اور طاقتور شعاع میں تبدیل کر
لیا جائے تو ایک ایسے ہتھیار کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جس کو لیزر بیم کہا جاتا ہے، جس کے
ذریعے زمین میں سوراخ ہو سکتا ہے، جنگلوں میں آگ لگائی جا سکتی ہے، صحرائے نویدا
کی، موت کی وادی، میں چٹانوں کو اسی لیزر بیم کے ذریعے پگھلایا گیا ہے اور سائنسدان اس
نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ عمل کم و بیش چار ہزار سال قبل عمل میں آیا تھا۔ یہ عمل کس نے کیا
تھا اور وہ کون لوگ تھے جن کی سائنسی معلومات اتنی وسیع تھیں۔

روس میں ماہرین آثار قدیمہ نے ایک ایسا کتبہ دریافت کیا جو تانبے کا بنا ہوا ہے اور
اس پر ایک انسانی تصویر بنی ہوئی ہے جس کو ایک نہایت بھاری اور چاروں طرف سے بند
سوٹ پہنے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ گردن کے قریب آکر وہ بالکل بند ہو گیا ہے۔ اس تصویر کے
سر پر خود یا ہیلمٹ رکھا ہوا ہے اور اس کے ہاتھوں میں موٹے موٹے دستانے ہیں اور اس
کے جوتے بھی بالکل بند اور بھاری بھاری ہیں۔ (سر جان مارشل کی تقریر کے پورے ۶۸
سال بعد ۱۹۶۹ء میں جب نیل آرمسٹرونگ پہلی بار چاند پر اترا تو وہ بھی ایسا ہی خلائی لباس
پہنے ہوئے تھا) روس کے ماہرین تاریخ کے اندازے کے مطابق یہ پلیٹ کم از کم ۱۷۰۰ ق م
کی ہے اور جن کھنڈرات سے یہ برآمد ہوئی ہے وہ دو سے تین ہزار سال قبل مسیح تک پرانے
ہو سکتے ہیں۔ دو ہزار سال قبل مسیح میں آخر اس قسم کے دستانوں، خود اور جوتوں یا لباس کا

رواج کہاں تھا؟ اور اگر نہیں تھا تو یہ تصویر کس کی ہے؟

چین کے صوبہ یونان کے مرکزی شہر "کن منگ" میں زلزلہ آیا اور اس زلزلہ کے بعد جب زمین پھٹ گئی تو وہاں جمیل کن منگ کی تہہ سے ایک اہرام کے آثار ملے۔ جب اس اہرام کی کھدائی کی گئی تو قریب قریب تین ہزار سال قبل مسیح کی تہذیب کے آثار نظر آئے۔ اس مقبرہ سے لکڑی پر نقاشی کا ایک بڑا پر پیچ اور عجیب خاکہ ظاہر ہوا۔ اس خاکے پر سلنڈر کی لمبوتری شکل کی راکٹ کی طرح ایک نقش نکلا۔ اس لکڑی پر ایک راکٹ جیسی مشین کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ مشین کیا تھی اور کس قسم کی تھی اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ظاہر ہے کہ کسی نے اس مشین کی تصویر اصلی مشین دیکھ کر ہی بنائی ہوگی۔ وہ اصل مشین تین ہزار سال ق م میں کہاں سے آئی تھی؟

یونان میں ایتھنز کے قومی عجائب خانہ میں ۱۸۹۹ء میں ایک کتبہ یعنی لوہے کی ایک پلیٹ کا اضافہ ہوا۔ یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے عجائب خانہ میں لوہے کی یہ پلیٹ آج بھی شیشے کی ایک الماری میں الگ رکھی نظر آئے گی۔ اس پر لکھا ہے، "انٹک تھیرا کی مشین"۔ یہ مشین کیا ہے؟

اس مشین کی کہانی یوں ہے کہ یونان کے ساحل کے قریب یونانی غوطہ خوروں نے ایک ڈوبے ہوئے جہاز کا سراغ لگایا یہ جہاز چوں کہ ساحلی شہر انٹک تھیرا کے قریب ملا تھا اس لیے اس جہاز کا نام انٹک تھیرا ہی پڑ گیا۔ اس جہاز میں قریب قریب ۸۲ ق م کے بنے ہوئے کانسی اور سنگ مرمر کے مجسمے بھرے ہوئے تھے جب اس کی تمام اشیاء کو ساحل پر لے آیا گیا تو کیچڑ اور مٹی سے بھرا ہوا ایک گولہ بھی سامنے آیا جو بعد میں جہاز کی تمام دولت سے زیادہ قیمتی ثابت ہوا۔ جب اس مٹی کے گولے کو توڑا گیا تو اس میں سے ایک سولہ انچ لمبی اور نو انچ چوڑی کانسی کی پلیٹ نکلی جس پر ایک مشین کی مکمل ڈرائنگ بنی ہوئی تھی اور جگہ جگہ مختلف ستاروں کی تشبیہات بنی ہوئی تھیں اس مشین میں گیارہ چھوٹے چھوٹے ڈائل تھے اور بیس مختلف سائز کے پہیے تھے۔ ایک گراری سے تمام پہیے ایک دوسرے سے منسلک تھے اور تمام پہیوں کے نیچے دو گیئر اور ایک کراؤن وھیل قسم کا اوزار تھا۔ یونانی سائنسدانوں نے اس پلیٹ کو سامنے رکھ کر ایک مکمل مشین کا ماڈل تیار کیا جو میوزیم کی اسی الماری میں موجود ہے۔ اس میں کسی زبان میں کچھ حروف بھی کھدے ہوئے ہیں جو آج تک سمجھے اور پڑھے نہیں جا سکے ہیں۔ یہ مشین کوئی ایسی پیچیدہ اور خود کار مشین ہے

کہ اپنے ڈائل کے ذریعے ہی سب کچھ اظہار کرتی ہے۔ یہ مشین ۸۲ ق م سے بھی تقریباً ایک ہزار سال زیادہ قدیم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانسی اور سنگ مرمر کے یہ مجسمے اور یہ مشین جو یقیناً قدیم، نایاب اور شاید مقدس بھی ہو کسی بادشاہ کو تحفہ میں بھیجی جارہی ہو کہ جہاز ڈوب گیا اور سب کچھ پانی کے دامن میں جذب ہوگیا۔ یہ مشین کسی مصور کا کمال نہیں ہے بلکہ کسی خاصے ذہین اور عملی طور پر یہ کام کرنے والے میکینیکل انجینئر کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ کون تھا جس نے یہ مشین بنائی اور یہ کس کے لیے بنائی گئی۔

سر جان مارشل نے کہا یہ سب باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ہمارے اس کرۂ ارض پر آسمان کے مختلف سیاروں اور ستاروں سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور ان کا تعلق یہاں کے باشندوں سے بہت گہرا تھا۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے جنوبی امریکہ میں "انکا اور مایا" تہذیبوں کو اعلیٰ ترین ارتقاء تک پہنچایا۔ ان ہی نے پتھروں کو کاٹ دینے کا فن سکھایا۔ انھوں نے ہی اہرام بنانا سکھایا اور انھوں نے ہی علم و دانش اور عقل و خرد، تمدن و تہذیب کی ابتدا کرائی اور یہ لوگ ستاروں سے آتے تھے اور ستاروں کو لوٹ جاتے تھے۔ زمین کے باشندے چوں کہ دولت، قوت، عقل، سمجھ، ذہن اور تمدن غرض کہ ہر چیز میں اُن سے پیچھے تھے۔ بلکہ لاکھوں سال پیچھے تھے۔ اس لیے وہ ان کو دیوتا کا درجہ دیتے تھے اور ان کے ہر قول کو اپنے مذہبی گیتوں کا اور ان کے ہر عمل کو مذہبی رسم کا درجہ دے لیتے تھے۔ ان کی آمد و رفت کو اپنی مقدس کہانیاں بنا لیتے تھے اور اسی لیے ان کو ہر علاقے میں دیویوں اور دیوتاؤں کا درجہ حاصل رہا ہے اور تمام مذہبی کتابوں کا تذکرہ موجود ہے اور ان کی دی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بنائے ہوئے اصول قدیم زمانے سے آج تک کسی نہ کسی صورت میں مستعمل رہے ہیں مثلاً یہ کہ قدیم مصری اہرام بناتے تھے اور اپنے مُردوں کو ہر طرف سے بند اس اہرام میں رکھ دیتے تھے۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان اپنے مُردوں کو قبر میں جو ہر طرف سے بند ہوتی ہے چھپا دیتے ہیں۔ قدیم مصری ممیاں بناتے تھے اور ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ دیتے تھے۔ یہودی، مسلمان اور عیسائی اپنے مُردوں کو کفن یا کسی اسی طرح کے ملتے جلتے لباس میں لپیٹ کر دفن کرتے ہیں۔ قدیم مصری کہتے تھے کہ ممی بن جانے کے بعد یہ مُردے دیوتاؤں کے ہم سفر بننے کے قابل ہوجائیں گے اور آسمان کی طرف دیوتاؤں سے ملنے جا پہنچیں گے۔ یہودی، مسلم اور عیسائی یہ کہتے ہیں کہ مُردوں کی روحیں عالم بالا کی طرف پرواز کر جاتی ہیں۔ ہندو سمجھتے ہیں کہ روحیں آسمانی طاقت برہما کی روح

میں جا کر مل جاتی ہیں۔ قدیم مصری کہتے تھے کہ جسم مر جاتا ہے مگر جسم کا ایک خاص عنصر زندہ رہتا ہے اور اگر اسے صحیح حالت میں رکھا جائے تو وہ جسم کو پھر سے زندہ کر سکتا ہے۔ آج کے دوسرے مذہب یہ سمجھتے ہیں کہ جسم مر جاتا ہے مگر روح زندہ رہتی ہے قدیم مصریوں کا خیال تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا جب میاں جی اٹھیں گی۔ چنانچہ اچھی اور آرام دہ زندگی گزارنے کے لیے اسی قسم کی مسرونیات اور مشغولیات فراہم کرنی چاہئیں جن کے وہ زندگی میں عادی رہ چکے تھے۔ آج کے دوسرے مذاہب سمجھتے ہیں کہ ایک معین وقت (قیامت) تمام مُردے پھر سے جی اٹھیں گے اور جیسی کچھ ان کی زندگی میں کیفیات تھیں اس وقت وہ سب کی سب اچھی ہوں یا بُری ظاہر ہوں گی۔ غرض کہ قدیم مصری قصوں کی بازگشت آج بھی کم و بیش ہر مذہب میں سنائی دیتی ہے۔ بس وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ ان باتوں کے کرنے اور ان کو بیان کرنے کا ڈھنگ بدل گیا ہے۔

سر جان مارشل نے کہا کہ میرا یقین ہے کہ آسمانی مخلوق کا زیادہ گہرا تعلق ڈوبے ہوئے براعظم اٹلانٹا کے رہنے والوں سے تھا۔ ممکن ہے وہاں ان کی بڑی آبادیاں بھی رہی ہوں مگر جب وہ براعظم ڈوب گیا اور اس میں کچھ بچے کھچے لوگ جنوبی امریکہ میں جا پہنچے تو وہاں بھی ان کا تعلق خلائی مسافروں سے دوبارہ قائم ہو گیا۔ یہیں پر شاید، "انکا اور مایا" تہذیبیں وجود میں آئیں اور پھر اس براعظم سے بچنے والوں کی ایک شاخ جن کو سمیری کہا جاتا ہے ہمارے براعظموں یعنی ایشیا اور یورپ کی طرف آ گئیں چنانچہ ان کی ذہنی، علمی اور سائنسی ترقی کے آثار ہمیں دجلہ، فرات اور نیل کی وادیوں میں بہ کثرت اور ان کے علاوہ باقی سب علاقوں میں بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔

براعظم اٹلانٹا کہاں تھا؟ کیسا تھا اور کب تباہ ہوا یا غرق ہوا اس کا حتمی جواب دینا مشکل ہے مگر قدیم یورپ کے اکثر قصے کہانیوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کوئی براعظم تھا یا چند جزیروں پر مشتمل کوئی خشکی کا ٹکڑا تھا لیکن دو باتیں یقیناً ہیں۔ ایک تو یہ کہ بحر اوقیانوس یعنی اٹلانٹک میں واقع تھا اور جبل الطارق سے لے کر فلوریڈا (ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست) کے ساحل کے درمیان موجود تھا۔ بعض قدیم کتابوں میں اس کا نام اٹلانٹس اور بعض جگہ انٹیلا اور بعض جگہ اٹلانٹا کہا گیا ہے۔ کہیں کہیں اس کو نیکوں کا جزیرہ اور کہیں خوشیوں کی سرزمین کا نام دیا گیا ہے۔

اٹلانٹا کے بارے میں ہمارے پاس پہلا مکمل بیان افلاطون کا ہے جو پانچویں صدی

قبل مسیح میں یونان کا ایک مشہور فلسفی تھا۔ اس نے اپنے دو مشہور مکالمے میں جن میں کری ٹیاس، ارسطو اور ٹی موئیس وغیرہ سے گفتگو ہوئی ہے اس براعظم کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ گم شدہ براعظم کے متعلق یہ بیان اور افلاطون کے یہ مکالمے آج ڈھائی ہزار سال سے مستقل موضوع بحث بنے ہوئے ہیں کچھ لوگ ان کو فقط ایک تصوراتی شہر کی نقشہ کشی سمجھتے ہیں اور کچھ اس کو ایک حقیقی براعظم کا حال جانتے ہیں۔ افلاطون نے اپنے ان مکالموں میں لکھا ہے کہ اٹلانٹا کی سڑکیں چوڑی، چمک دار اور سخت پتھروں کی تھیں۔ مکان کئی کئی منزلہ تھے۔ صاف پانی اور گندے پانی کا الگ الگ انتظام تھا۔ ان کی سواریاں جانوروں کی بجائے بے جان تھیں اور ان کی رفتار پلک جھپکنے کے عرصے میں طویل فاصلہ طے کرنے کے قابل تھی۔ ان کے شہروں میں سونے چاندی کے درخت تھے اور ان کے یہاں بیماریاں اور مصائب موجود نہ تھے۔ غرضیکہ افلاطون نے اس کو ایک جنت ارضی سے تعبیر کیا ہے۔ افلاطون بڑے دکھ سے کہتا ہے کہ یہ دنیا کی جنت اب گہرے پانی میں دفن ہو چکی ہے۔ فطرت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے تباہ و برباد کر دیا اور صرف کچھ ہی لوگ تھے جو اپنے تیز رفتار جہازوں میں بیٹھ کر ادھر اُدھر بھاگ کر جان بچا سکے۔ افلاطون نے دعویٰ کے ساتھ یہ بات لکھی ہے کہ اس ڈوبے ہوئے براعظم کے بارے میں جو باتیں اس نے بیان کی ہیں وہ ان تحریری دستاویزات سے پڑھ کر بتائی ہیں جو سائیس کے مصری پجاریوں کے پاس اس نے خود دیکھا تھا۔ افلاطون نے مکانوں کے طرز تعمیر کا، ان کے ڈیزائنوں کا، ان کے میدانوں، پہاڑوں کی اونچائی اور دریاؤں کا حال، ایک شہر سے دوسرے شہر کے فاصلے، ذرائع آمد و رفت، ان کے رسوم و رواج کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔

افلاطون کے بعد تاریخ دانوں کو اس جزیرہ یا اس براعظم کی تلاش برابر رہی مگر قدیم کتابوں کے حوالوں کے علاوہ اس کا کوئی نشان نہ ملا۔ مثلاً لفظ اٹلانٹک بذاتِ خود اسی نام سے اور اسی حوالے سے مشہور ہوا ہے۔ شمالی افریقہ میں اٹلس نام کا پہاڑ موجود ہے جہاں مراکش اور الجزائر کے بربر قبیلے آباد ہیں۔ ان کی زبان اٹل یا اٹلس کے معنی ہی پانی کے ہیں۔ چنانچہ خیال کیا جاتا ہے کہ اٹلانٹا کی مناسبت ہی سے اس پہاڑ کا نام اٹلس قرار پایا۔

جب پندرہویں صدی میں اسپینی باشندے جنوبی امریکہ پہنچے اور وہاں کے مقامی باشندوں سے ان کی جنگیں ہوئیں اور پھر میل ملاپ کے بعد تجارت اور کاروبار شروع ہوا تو ان کو یہ دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی کہ ان مقامی باشندوں کے خدوخال بڑی حد تک اسپینیوں

سے ملتے جلتے تھے (اٹلانٹا کا براعظم بھی تمام خیالوں کے مطابق جبل الطارق یعنی اسپین کے قریب ہی کہیں واقع تھا) اور جب اسپینیوں نے ان قبائل سے ان کی قدیم تاریخ کے بارے میں معلومات کیں تو انھوں نے کہا کہ وہ مشرق میں پانیوں سے گھری ہوئی زمین، ازٹلان، سے آئے تھے۔ اس قبیلے کا نام بھی "آز" تھا اور ان کا ایک مذہبی رہنما جسے یہ لوگ اپنے طور پر پیغمبر کا درجہ دیتے تھے (دیوتا کا نہیں) مشرق ہی کی طرف سے ایک ڈوبتی زمین سے ان کی طرف آگیا۔ اس کے علاقے کا نام ۔ٹولن" یا "ٹلاپان" تھا اور خود اس سفید رنگت والے رہنما کا نام "قزل کوٹل" تھا۔ اس رہنما کا ان قبیلوں میں بڑا احترام تھا اور جا بجا اس کے بُت رکھے ہوئے تھے۔

اسی جنوبی امریکہ میں اسپینی توسیع پسندوں اور جنگ جو باشندوں کو جزائر کناری میں ایک اور قدیم نسل سے واسطہ پڑا جن کو بعد میں انھوں نے چن چن کر تہ تیغ کیا۔ ان جزائر کے قریب "ازور" نامی ایک سطح مرتفع بھی ہے جو دور تک سمندر کے اندر چلی گئی ہے۔ یہ قدیم نسل ایک الگ تھلگ ویران جزیرے میں گزر بسر کرتی تھی اور اپنے آپ کو اسی ڈوبی ہوئی پہاڑی علاقے کی زمین کے ابتدائی اور پرانے باشندوں میں شمار کرتی تھی۔ ان کی لوک کہانیوں میں زمین کے ڈوبنے کے قصے اور حوالہ جات ایک بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں ان ہی پرانے قصوں اور کہانیوں کی بنیاد پر بہت سے غوطہ خوروں کی جماعتوں نے اس علاقے میں خزانے تلاش کرنے کی کوششیں کیں اور کافی کامیابیاں بھی انھیں حاصل ہوئیں۔ شہر، گلیاں، مکان، سڑکیں، اور مجسمے تک نظر آئے اور خزانے بھی ملے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جزائر کناری کے قبیلے جو اپنے آپ کو ڈوبے ہوئے براعظم اٹلانٹا کی باقی ماندہ نسل سمجھتے تھے اور جن شہروں، طوفانوں اور غرقابی کا تذکرہ ان کے یہاں ملتا تھا وہ سب سچ اور صحیح تھا۔ آج تک، آزور کے جزیرے کے آس پاس اس قسم کی اشیاء کا دستیاب ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں ہے جس سے اس جزیرے کے قریب کسی ڈوبے ہوئے شہر کا ثبوت ملتا ہو۔

براعظم امریکہ ہی کے قریب، "بہاما" کے جزائر میں ایک شوقیہ کشتی راں نے ایک غوطہ خوری کی مہم کے دوران ایک سیڑھیوں کا اہرام دریافت کیا جو تقریباً ۲۱ فٹ پانی کے نیچے تھا بعد میں اس کی مزید تحقیقات ہوئی تو اس کے چاروں طرف ایک تین سو فٹ لمبی دیوار بھی ملی اور خود اس ڈوبے ہوئے اہرام کی لمبائی ۱۸۰ فٹ اور چوڑائی ۱۴۰ فٹ ناپی گئی۔

امریکہ کے ایک کیمیائی ماہر نے جب اس کے کاربن کی عمر کے متعلق تفتیش کی تو اسے بارہ ہزار سال قدیم پایا۔ یعنی یہ چہار دیواری اور یہ اہرام جو اوپر سے چورس ہے کوئی بارہ ہزار سال قبل بنا تھا۔ جس جگہ یہ اہرام دریافت ہوا اس کے قرب و جوار کی مزید تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ یہاں آتش فشاں لاوے کی سطح موجود ہے مگر یہ لاوے کی سطح بھی زیادہ قدیم نہیں ہے یعنی کوئی پانچ ہزار سال پرانے لاوے کی مٹی ہے۔ اس تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اس علاقے میں سطح سمندر کے نیچے جو آتش فشاں پھٹا اور جس سے لاوا پھیلا اور فقط پانچ ہزار سال قبل کی بات ہے۔ اس سے پہلے لاوے کے نیچے چکنی مٹی موجود تھی جس کو اس زیرِ آب اہرام کی تعمیر میں استعمال کیا گیا تھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بحرالکاہل میں بھی اسی قسم کے ڈوبے ہوئے شہروں کے آثار ملے ہیں جن میں پتھروں کی کچھ سڑکیں پانی سے اُبھرے ہوئے جزیروں سے سمندر کے اندر جاتی نظر آتی ہیں۔

اٹلانٹک کے سمندر میں آج بھی کچھ ایسے جزیرے موجود ہیں جہاں کے باشندے سال کی ایک مخصوص تاریخ کو سمندر کی طرف رخ کر کے اپنے آباؤ اجداد کے نام پر قربانی کی چیزیں سمندر میں پھینکتے ہیں۔ "یاپ" اور "ٹرک" کے جزیرے خاص طور پر ان رسموں کو بڑے اہتمام سے پورا کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے آباؤ اجداد پانی کے نیچے بنے ہوئے شہروں میں رہتے ہیں اور ہر سال ان کی قربانی کی چیزوں کا انتظار کرتے ہیں۔

غرضیکہ اٹلانٹس نامی برِاعظم کا وجود اب افسانوی نہیں ہے بلکہ اسے ایک حقیقی اور مکمل جیتی جاگتی تہذیب شمار کیا جاتا ہے جو کسی عظیم قدرتی آفت کے سبب زیرِ سمندر جاسوئی ہے۔

سر جان مارشل نے کہا کہ اب دوسری طرف سمیری تہذیب ہے جو شمالی افریقہ اور پھر عراق میں دجلہ اور فرات کی وادیوں میں یکایک نمودار ہوئی۔

کوئی نہیں جانتا سمیری کون تھے اور کہاں سے آئے تھے مگر ان کا تمدن شاید اس علاقہ کے رہنے والوں سے کئی ہزار سال زیادہ آگے تھا۔ ان کی تحریر مختلف تھی، ان کے دیوتا الگ تھے اور ان کے یہاں عمریں بھی الگ الگ اور بے حد طویل تھیں۔ شاید یہی وہ لوگ تھے جن کا حقیقی تعلق آسمانی خلانوردوں سے قائم تھا اور شاید یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے براعظم کے ڈوب جانے کے بعد ان علاقوں کی طرف دھیان دیا جو آج مشرقِ وسطیٰ کے علاقے کہے جاتے ہیں۔ شاید ان ہی کے بچے کھچے اور ساتھی تھے جو دوسری طرف جنوبی

امریکہ تک جا پہنچے اور جنہوں نے وہاں ایسی نادرالوجود اور بے مثال تہذیبوں کی بنیاد رکھی جو آج بھی "انکا" اور "مایا" تہذیبوں کے نام سے یاد کی جاتی ہیں اور ان ہی سمیریوں نے غالباً خلائی مخلوق کے تعاون سے اور ان کے مشوروں سے مصر کے اہرام جیسی عمارتیں تعمیر کیں ان کو اپنا علم تعمیر بخشا۔

سرجان مارشل نے اپنے طویل مقالے کا اختصار آخر میں یوں پیش کیا:۔

○۔ تمام دنیا میں پراسرار عمارتیں، چٹانی تصویریں، مجسمے، تحریریں اور ایسے آثار موجود ہیں جو عقل و سوچ اور غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور اہرام مصر ان میں سے اہم آثار ہیں۔

○ ان تعمیروں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فن تعمیر اُس دور کے وحشی انسانی قبائل کے بس کا کام نہ تھا۔

○ ان آثار میں کسی ذہین مخلوق کا دخل معلوم ہوتا ہے جس کا تعلق آسمان کے ستاروں اور سیاروں سے تھا۔ دوسری طرف ہر زبان میں، ہر قوم اور ہر قدیم کتاب میں آسمانی دیوتاؤں کے تذکرے موجود ہیں اور ان کے آنے جانے کی مشینوں اور ان کے ہتھیار وغیرہ کے تذکرے بھی مل جاتے ہیں۔ چنانچہ دیوتاؤں یا آسمانی خلائی مسافروں کے تذکرے افسانوی نہیں، حقیقی ہیں۔

○ مشرقِ وسطیٰ میں سمیری تہذیب اور جنوبی امریکہ میں، مایا اور انکا تہذیبیں خصوصاً اپنے زمانے میں بہت آگے تھیں اور انکی صفحۂ تاریخ میں آمد بالکل حادثاتی نظر آتی ہے کیونکہ یہ ایکا ایکی نمودار ہوئیں اور سب سے الگ تھلگ تھیں اور بے حد ترقی یافتہ تھیں۔ ان کی آمد اور ان کی نکاس کو اٹلانٹک میں ڈوبے ہوئے جزیرے یا براعظم، اٹلانٹا سے منسلک کرکے دیکھا جائے تو ایک زیادہ آسان بات سمجھ میں آتی ہے کہ سمیری اور انکا اور مایا تمدن اسی غرق شدہ براعظم کی باقیات میں سے ہے اور اس گم شدہ براعظم کی اعلیٰ ترقی بدولت خود آسمانی مخلوق کے دم قدم سے تھی۔ اٹلانٹک کے دونوں طرف یعنی شمالی افریقہ میں نیل کی وادی میں اور ادھر جنوبی امریکہ کے براعظم میں (میکسیکو، پیرو اور ارجنٹائن میں) اہرام، ممیاں، اعلیٰ تہذیب و تمدن، پتھروں کو موم کی طرح کاٹ دینے کا فن گویا بڑی یکسانیت کے ساتھ موجود ہیں۔ چنانچہ اس علم اور اس تمدن میں کوئی نہ کوئی ربط ضرور تھا اور یہ ربط اور تعلق اسی گم شدہ براعظم کی تہذیب سے آیا تھا جو کوئی دس ہزار سال قبل مسیح

کسی زبردست جغرافیائی عمل کی بدولت تباہ و برباد ہو گیا تھا۔

سرجان مارشل نے آخری جملہ یوں کہا۔

○ مصر کے اہراموں کی تحقیق مصر کی سرزمین سے شروع ہوتی ہے۔ مگر اس کے آخری سرے اسی گم شدہ غرق آب براعظم کے تمدن میں دبے ہوئے ملیں گے۔

اس لیکچر میں سرجان مارشل نے اور بھی کافی طویل علمی موشگافیاں کیں تھیں جو خشک اور بے حد پر مغز تھیں۔ (ہم نے وہ تمام تفاصیل چھوڑ دی ہیں)

باب نمبر ۱۲

سر جان مارشل نے اپنا طویل مقالہ پڑھا اور اسے ختم کر کے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔ بہت دیر تک تالیاں بجتی رہیں اور ان کی علمیت کو واقعی خراج پیش کیا گیا۔ پھر جامعہ الازہر کے ریکٹر (وائس چانسلر) نے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اگر اس مقالے کے کسی بھی نکتہ کے بارے میں یا کسی اور پہلو پر کسی صاحب کو سوالات کرنا ہوں تو سر جان مارشل بخوشی ان سوالوں کے جواب دیں گے۔"

اس اعلان کے بعد یکایک کئی طرف سے لوگ کھڑے ہو گئے اور ایک ساتھ کئی سوال ہوئے۔ تب ریکٹر نے ایک وقت میں ایک ہی شخص کو سوال کرنے کی ہدایت دی۔ چند دل چسپ سوال و جواب اس طرح کے ہوئے۔

ایک طالب علم نے پوچھا:۔

"سر! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ خلائی مسافروں کے دوبارہ اس کرۂ ارض پر آنے کے امکانات ہیں یا نہیں؟"

"بے حد روشن ہیں جناب!" سر جان مارشل نے کہا "خلائی مسافروں نے میکسیکو میں تحیین الفضا کے مقام پر ایک پیغام چھوڑا ہے جو ستاروں کی گردش کے متعلق ہے۔ اس کے حساب سے ۲۲، دسمبر ۲۰۱۱ء کو آسمان سے خلائی مخلوق پھر کرۂ ارض پر آئے گی۔"

"سنہ ۲۰۱۱ عیسوی، دسمبر کی ۲۲، تاریخ یعنی آج سے صرف ایک سو دس سال بعد!"

"شاید کرسمس میں شرکت کی وجہ سے یہ تاریخ رکھی گئی ہو!"

"اچھا مذاق ہے!"

"ناممکن!"

"یہ تو فقط قیاس آرائی ہے!"

"کون جانتا ہے کہ واقعی اس تاریخ کو کسی آسمانی سیارہ سے کوئی مخلوق مغربی امریکہ کے مغربی ساحل پر اُتر آئے گی!"

غرض جتنی زبانیں تھیں اتنی ہی رائیں تھیں۔ مجمع آپس میں ہی گفتگو اور کانا

پھوس میں معروف تھا۔ اتنی دیر سے سب لوگ مکمل خاموشی اور بالکل حیرت واستعجاب کے ساتھ ساتھ ہمہ تن گوش سماعت تھے۔ اس لیے وہاں ہر طرح ایک مکمل سکوت طاری تھا اور اب وہ سکوت یکایک ٹوٹ گیا تھا۔ جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں کسی کنکر کے گرنے سے ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ لہریں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔

اس ہلکے ہلکے شور میں سر جان مارشل کی آواز پھر گونجی اور آہستہ آہستہ پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ کہہ رہے تھے:

"ہم میں سے بہت سے لوگ آج سے ۱۱۰ سال بعد سنہ ۲۰۱۱ عیسوی میں زندہ نہیں ہوں گے مگر میرا یقین ہے کہ اس تاریخ کو آسمانی سیاروں سے مخلوق ہمارے کرۂ ارض پر اتر آئے گی۔ کیوں کہ جنوبی امریکہ کے انکا کے مندروں میں جو کلینڈر استعمال ہوتا تھا وہ پانچ ہزار سال کی مدت کا تھا۔

اب سے پانچ ہزار سال قبل ان کے درمیان آسمانی مخلوق کی آمد و رفت جاری تھی۔ اور اب یہ کیلنڈر سنہ ۲۰۱۱ء میں اپنا پانچ ہزار سال کا چکر پورا کرے گا۔ چنانچہ پھر سے آسمانی مخلوق کی آمد و رفت اس طرح ضرور شروع ہو جائے گی۔"

تب کسی نے ایک اور سوال اٹلانٹس کے متعلق کیا۔

سر! آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ اٹلانٹس ایک چٹانی جزیرہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت تھا۔ افلاطون نے جس جزیرہ کا ذکر کیا اس کے شاگرد ارسطو نے خود اسے محض ایک خوابی علاقہ سے تعبیر کیا۔"

سر جان بولے:

"جناب! آپ نے ذرا نامکمل بات کی ہے۔ یوں کہیے کہ افلاطون کا شاگرد ارسطو تک اس بات کا قائل نہ تھا کہ ایسا کوئی براعظم کہیں موجود بھی تھا جو اس کے زمانے سے تقریباً نو ہزار سال قبل سمندر میں غرق ہو گیا تھا۔ لیکن افلاطون کی موت کے بعد سے آج پچیس صدیوں تک یہ بحث اسی طرح قائم ہے کہ اٹلانٹس تھا کہ نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا کوئی براعظم کبھی موجود ہی نہیں رہا۔ کچھ کا خیال ہے کہ سسلی کے قریب ایک ترقی یافتہ جزیرہ تھا جس کو افلاطون نے براعظم سمجھ لیا کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کوئی قطعۂ زمین تھا جو اسپین کے مغرب میں اٹلانٹک سمندر میں دو یا تین سو میل دور واقع تھا۔ یہاں ایک ترقی یافتہ قوم آباد تھی۔ اس کا تذکرہ افلاطون نے یوں کیا کہ اس براعظم میں بحری آبی

راستے تھے۔ ان بڑی بڑی نہروں پر عظیم پل تھے۔ ان آبی راستوں میں جہازوں کی آمدورفت پلوں کے نیچے سے ہمیشہ جاری رہتی تھی۔ خشکی پر بڑی طویل اور چوڑی چوڑی شاہراہیں تھیں جن پر تیز رفتار سواریاں دوڑتی تھیں۔ ان شہروں کے گرد دائروں کے اندر دائروں کے طرز پر فصیلیں ہوتی تھیں۔ یعنی پورے شہر گول دائروں میں آباد ہوتے تھے اور دائروں کی شکل میں کئی کئی حفاظتی دیواریں ہوتی تھیں جو ایک کے بعد ایک مسلسل ہر شہر کے اطراف میں تعمیر کی جاتی تھیں۔ شہروں میں ان کی بنائی ہوئی بلند و بالا عمارتیں ہوتی تھیں۔ ان کی سڑکیں سونے کی طرح چمکدار دھاتوں سے بنائی جاتی تھیں۔ افلاطون نے اس تہذیب و تمدن کا نقشہ اس قدر تفصیل سے کھینچا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سیاح کا سفرنامہ پڑھا جارہا ہے۔

افلاطون کے بعض ناقدین کا خیال تھا کہ ایسا تمدن کسی خیالی دنیا میں ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ ایسا افسانوی علاقہ اور ایسی افسانوی تہذیب فقط خوابوں ہی میں نظر آسکتی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ افلاطون کا ذہن بڑا زرخیز تھا اور وہ ایسے تصورات کی منظر کشی کا ماہر تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ذہن میں موجود کسی تصوراتی مملکت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

افلاطون کے ماننے والے اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ افلاطون کے کسی نظریئے کو آسانی سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک بے مثال فلسفی تھا۔ اس کی ہر تحریر اپنی جگہ وزنی ہے۔ اس کے یہاں عقل، منطق اور فلسفہ کا نقش غالب رہتا ہے۔ اس پایہ کے فلسفی سے کسی طفلانہ تحریر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر ہم افلاطون کے کسی اور نظریہ کو رد نہیں کرسکتے تو اٹلانٹس ہی کے نظریہ کو کیوں رد کردیں۔

حقیقت یہ ہے کہ افلاطون کے پاس مصری سیاح بھی آتے جاتے تھے۔ سسلی اور بحیرۂ روم کے بہت سے چھوٹے چھوٹے جزائر سے بھی لوگ آتے جاتے تھے۔ ان ہی میں سے کسی سیاح نے یا کسی مذہبی عالم نے اس سے کسی ایسے ہی براعظم کا تذکرہ کیا تھا جو بحراٹلانٹک میں واقع تھا اور جسے کئی ہزار سال قبل کسی تباہ کن زلزلہ یا سمندر کے کسی بڑے آتش فشانی عمل نے یا کسی اور نامعلوم آفت نے نیست و نابود کردیا تھا۔ افلاطون کے علاوہ مصر میں قدیم مندروں میں ایسے بہت سے عالم موجود تھے جو ایک مدت تک اٹلانٹس کے قصے لوگوں کو سناتے رہتے تھے۔ اس کی تہذیب اور اعلیٰ تمدن کی بازگشت قدیم مصریوں میں اور بعض قدیم مندروں میں تصویری کہانیوں کی صورت میں ہمیشہ باقی رہی ہے۔

اور آج تک یہ ذکر باقی ہے۔ کچھ حقیقت تھی، تب ہی تو یہ بات زندہ ہے ورنہ کیوں نہ ختم ہوجاتی۔

آج جب سائنس تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہے، طویل اور چوڑی چوڑی شاہ راہیں بن رہی ہیں۔ بڑے بڑے پل تعمیر ہو رہے ہیں۔ ایلومینیم جیسی سستی دھات بھی دریافت ہوچکی ہے تو کیا کسی دھات کی بنی ہوئی سڑکوں اور عظیم پلوں کا تصور حقیقت نہیں بن گیا ہے۔

اس کے علاوہ طبقات الارض GEOLOGY کے علوم، سمندری نباتات کا علم، تاریخ اور جغرافیہ کے علوم سب کے سب یہ بات ثابت کرتے چلے جا رہے ہیں کہ بحر اٹلانٹک میں کبھی بہت بڑا قطعۂ زمین سطح سمندر کے اوپر واقع تھا اور وہ آباد تھا۔ بلکہ اب تو بحر الکاہل میں بھی ایسے ہی ایک براعظم کا سراغ لگ چکا ہے جو اٹلانٹس سے بھی زیادہ قدیم تھا۔

جہاں تک اٹلانٹس کا سوال ہے کئی ایسے چھوٹے اور بے آباد جزیرے آج بھی بحر اوقیانوس میں موجود ہیں جن میں بڑی بڑی شاہراہوں کے نشانات موجود ہیں جو سمندر کے اندر کی طرف جاتی ہیں۔ امریکہ میں مشرقی ساحل پر پچاس ساٹھ میل دور بے شمار ایسے زیرِ آب مکانات، فصیلیں اور چوڑی چوڑی دیواروں کے نشانات مل رہے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ زیرِ آب کوئی نہ کوئی آبادی موجود رہی ہے۔ حال ہی میں مشرقی ساحل پر ایک شوقیہ کشتی راں نے جو اپنی ٹیم کے ساتھ ایک تفریحی سفر پر تھا زیرِ آب غوطہ خوری کے دوران ایک ایسا چبوترہ دریافت کیا جو اوپر سے مربع یعنی چوکور اور نیچے تکون کی طرح پتلا ہوتا چلا گیا تھا۔ یہ کوئی پہاڑی نہ تھی۔ بعد میں اس جگہ پر کئی ماہرین نباتات اور کئی جیالوجسٹ MICROBIOLIST بھی پہنچے اور انہوں نے اسے غیر فطری یعنی انسانی ہاتھوں کی تعمیر قرار دیا۔ اس کی کاربن ڈیٹنگ کی گئی تو یہ تعمیر جو سمندر میں پچانوے فٹ کی گہرائی میں ڈوبی ہوئی تھی کوئی بارہ ہزار سال قدیم نکلی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جنوبی امریکہ کے اہرام کی طرح کا کوئی مقبرہ ہے جو اوپر سے چبوترہ اور نیچے سے چار طرفہ سیڑھیوں کا بنایا جاتا تھا۔"

سر جان مارشل نے کہا:

"پھر یہ بات بھی مد نظر رکھنی چاہیے کہ صرف افلاطون ہی نے نہیں بلکہ کئی اور قدیم کتابوں میں بھی سمندر پار دیوتاؤں کی کسی آبادی کے قصے مشہور ہیں مثلاً ہندوؤں کی

مقدس کتاب رگ وید میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ خود مہا بھارت کی جنگ ہمیں بتاتی ہے کہ ارجن سمندروں کو پار کر کے ایک ایسے علاقے میں گیا جو پانی کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ ہزاروں تکالیف اٹھاتا، مصائب جھیلتا اور طوفانوں سے لڑتا بسرتا جب ارجن وہاں آتا ہے تو اس کی ملاقات دیوتاؤں سے ہو جاتی ہے، جو اس کو آسمانوں کی سیر کو لے جاتے ہیں۔ یہی دیوتا بعد میں ارجن کی مدد کرنے کے لیے اپنی آسمانی گاڑیاں اس کی جنگ میں استعمال کرتے ہیں۔ گویا اس قصہ میں بھی کسی دور دراز کے سمندر پار قطعۂ زمین کا تذکرہ ہے جس کی تہذیب بڑی عظیم تھی، جن کے پاس آسمانوں کا سفر کرنے والی مشینیں بھی موجود تھیں۔"

اسی قسم کے تذکرے سمیریوں کے قصے کہانیوں میں ملتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ اتنا بشم نام کا ایک دیوتا سمندر کی طرف سے علم و حکمت سکھانے آتا تھا۔ جنوبی امریکہ کے انکا اور مایا قصوں اور کہانیوں میں بھی ایک ایسے سفید فام دیوتا کا ذکر ملتا ہے جو سمندروں کی طرف سے ان کے پاس آیا تھا جسے بعد میں ان کی تہذیب نے دیوتا کا درجہ دیا۔ شمالی افریقہ میں ہائی کسوس HYKSOS قبیلہ جو شاید اہرام مصر کی تعمیرات سے بھی کئی ہزار سال قبل مصر میں وارد ہوا اور عراق میں سمیری جو کسی زندہ یا مردہ تہذیب سے متعلق نظر نہیں آتے فقط یہی دونوں اس نظریہ میں کسی حد تک فٹ ہوتے ہیں کہ وہ اس گم شدہ براعظم کا باقی ماندہ قافلہ تھے جسے ہم اٹلانٹس کہتے ہیں۔ اس طرح نہ معلوم کتنے ایسے شواہد اور ثبوت موجود ہیں جو دلالت کرتے ہیں کہ افلاطون نے کسی خیالی دنیا کا تصور پیش نہیں کیا بلکہ کسی زندہ تہذیب کی طرف اشارہ کیا تھا جو فنا ہو چکی تھی۔"

سرجان نے کہا:

"یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اٹلانٹک کے دونوں براعظموں پر ہی اہرام اور ممی بنانے کا فن ابھرا۔ یعنی جنوبی امریکہ اور شمالی افریقہ ہی میں اہرام اور ممی بنانے کا فن مقبول ہوا اور زیادہ ترقی یافتہ شکل میں نمودار ہوا۔ یوں تو اہرام دنیا کی ہر آبادی میں کسی نہ کسی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں مگر افریقہ اور جنوبی امریکہ میں ان کی تعمیر کے طریقے، پتھروں کا نفاست سے چناؤ کا انداز ان کی تعمیر میں مختلف ستاروں اور سیاروں کی گردشوں کا حساب و کتاب، ان کا مذہبی رسوم سے متعلق ہونا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اتنے بڑے پروجیکٹ میں جیومیٹری کے جس علم اور جس اختصار اور صحیح پن کی حاجت ہوتی ہے وہ

سب کا سب انتہائی کمال کے ساتھ ان دونوں براعظموں کی قدیم تہذیبوں اور تمدنوں اور اہراموں میں موجود ہے۔"

نوٹ: جوزف میلکم، جان میلکم کے پوتے کا بیٹا، اس سرگرمی کا مدیر ۱۹۷۵

"چوں کہ اس گم شدہ براعظم اٹلانٹا کے بارے میں آپ سب لوگوں کی خواہش مزید کچھ معلومات حاصل کرنے کی ہوگی اس لیے میں آپ لوگوں سے گزارش کروں گا کہ آپ اکلاک کوئی شانہ کی انگریزی زبان میں لکھی ہوئی کتاب "THE ULTIMATE FRONTIER" کا مطالعہ ضرور کریں۔ اس کتاب میں نہ صرف قدیم اٹلانٹا کے متعلق آپ کو معلومات ملیں گی جو بحراوقیانوس یا بحر اٹلانٹک میں غرق ہوگیا تھا بلکہ اس کے علاوہ بحر الکاہل میں غرق شدہ ایک اور قدیم براعظم یا کسی بہت بڑے جزیرہ کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے جو براعظم موMU کے نام سے مشہور تھا۔ یہ دو ہزار چھ سو سال قبل غرق ہوا۔ جس بڑے سمندری طوفان کے باعث براعظم مو غرق ہوا اس سے سمندر کے پانی کی سطح بلند ہوگئی تھی۔ چنانچہ اوقیانوس میں واقع براعظم اٹلانٹس، یورپ، افریقہ، امریکہ اور بہت سے اور حصے ایک دوسرے سے الگ الگ ہوئے پھر اٹلانٹس خود بھی گیارہ ہزار سال قبل سمندر کی طوفانی لہروں یا کسی مہیب زلزلہ یا کسی اور ہمہ گیر آفت کا شکار ہوگیا۔ اور سمندر میں چلا گیا۔ اور آج اس براعظم کو محض ایک افسانوی شئے کہا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ ایک زندہ جاوید جیتا جاگتا تمدن تھا جو کئی ہزار سال تک بڑی آب و تاب سے علم و ہنر، ٹیکنالوجی، سائنس اور ایجادات میں اس وقت کی باقی آباد دنیا سے کئی ہزار سال آگے تھا۔

جب بحر الکاہل کا جزیرہ مو لونی لی میریا تہذیب کے ساتھ غرق آب ہوا تو اس کے تہذیب و تمدن کو کم از کم باون ہزار سال تک ترقی کرتے رہنے کا وقفہ ملا تھا مگر ان کی ترقی زیادہ تر کردار کی خوبیوں اور ثقافت کی ترقی تھی۔ اس میں لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد، کام آنے والے، محبت کرنے والے، شریف النفس، نیک اور سچ بولنے والے تھے۔ ان کے یہاں جنگ و جدل، لڑائی جھگڑا، رشک و حسد، کبر و غرور، طاقت و قوت کا اظہار، کمزوروں کو پامال کر دینے کی خواہش، نخوت، جھوٹ، اور بدی کا اظہار بالکل نہ تھا۔ گویا لی میریا تہذیب و تمدن نے سائنس اور علم و ہنر میں وہ بے مثال ترقی نہیں کی تھی جو بعد میں اٹلانٹس کے حصے میں آئی مگر پھر بھی ان کی ترقی انسان کے نیک جذبوں کی ترقی تھی۔ یہ تہذیب جو آج سے پچھتر ہزار سال قبل شروع ہوئی تھی تقریباً باون ہزار سال تک براعظم

موکی لی میریا تہذیب، اس کے معاشرہ، اس کے تمدن کے طور پر بغیر کسی جنگ و جدل، قتل و قتال کے انسانی ترقی کے معاون کی حیثیت سے جاری رہی۔ چنانچہ ان کی تہذیب اور ان کا تمدن فرشتوں کی سی معصومیت کا تمدن تھا۔ جب یہ تہذیب ختم ہوگئی اور براعظم مو بحرالکاہل میں ڈوب گیا تو اس تہذیب کے نمائندے کچھ قریب قریب کے جزیروں اور دوسرے زمینی حصوں میں پھیل گئے۔ اس کے باقی ماندہ کچھ لوگ براعظم اٹلانٹس کی طرف بھی نکل آئے اور انہوں نے ادھر آ کر علم و ہنر اور تیز رفتار سواریوں، علم تعمیرات اور سورج کی شعاعوں سے حرارت پیدا کرنے کے طریقوں کو بھی اپنایا۔ اور بڑی برق رفتاری سے ٹیکنالوجی میں ترقی کی مگر براعظم موکی غرقابی کے صرف چودہ ہزار سال بعد یہ براعظم بھی اپنی تمام ترقیوں کے ساتھ سمندر کے شور میں جا بسا مگر اٹلانٹس کی علمی ترقی کا سراغ اور اس کے نشانات اس براعظم کے دائیں اور بائیں دونوں طرف ملتے ہیں۔ ایک طرف تو بحر روم کے علاقوں میں اوسیرس نام کی تہذیب بھی براعظم کے بچے کچھے لوگوں کی مرہون منت قرار پائی دوسری طرف ہندوستان میں رودھا تہذیب جو آریاؤں سے بھی قبل کی تہذیب ہے اسی کی بدولت نمودار ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اٹلانٹس کے بالواسطہ اثرات مشرقی افریقہ میں بائی کسوس نامی قبیلوں کی آمد سے بھی ظاہر ہوئے۔ قدیم تاریخ کے علماء کے مطابق یہ بائی کسوس ہی تھے جنہوں نے اہل مصر کو علم و ہنر سکھایا اور علم تعمیرات کے گر بتائے۔ ستاروں کی چال کو سمجھنا سکھایا۔ اسی بائی کسوس کی ایک شاخ کو جو علم و ہنر میں ان ہی کی طرح طاق تھی اور سیریوں کے نام سے مشہور ہوئی وادی دجلہ اور فرات کی پراسرار قوم کہا جاتا ہے کیونکہ سیریوں کی زبان، رسم الخط، دیوتا، علم نجوم، اور علم مادیات اس زمانے کے لوگوں سے کئی ہزار سال زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ دوسری طرف اٹلانٹا کے تہذیب و تمدن کے اثرات جنوبی امریکہ کی ساحلی آبادیوں تک جا پہنچے جن کو آج پیرو، یوراگوئے، ارجنٹائن اور میکسیکو کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں انکا اور مایا تہذیب کی نشوونما اسی اٹلانٹا کے باشندوں کی وجہ سے ہوئی۔

بائی کسوس کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کتنے عرصہ تک وادی نیل میں مقیم رہے؟ انہوں نے مصری تمدن کی نشوونما کس طریقہ پر کی؟ ان کی سلطنت کی وسعت کہاں تک ہوئی اور پھر وہ یکایک کہاں غائب ہوگئے؟ کس طرف واپس چلے گئے؟ یہ سب کے سب سوال ایک راز کی مانند بے زبان اور بے نشان ہیں۔ جس طرح سمیری تہذیب یکایک

مشرق وسطیٰ میں وادی دجلہ میں ابھری اور پھر ایک دم ہی غائب ہو گئی اسی طرح ہائی کسوس کا معاملہ بھی ہے۔ ان کے آنے اور جانے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بس یہ ضرور ہے کہ عراق کے جن علاقوں میں سمیری تہذیب کے آثار ملے ہیں یا وادی نیل میں جہاں ہائی کسوس کا نشان ملتا ہے ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قومیں اپنی ہم عصر مہذب اور متمدن قوموں سے کئی ہزار سال آگے تھیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وادی نیل اور وادی فرات میں اس دور میں جب دوسرے تمدن ابھی پتھروں کے دور سے گزر رہے تھے یہ ترقی یافتہ تمدن آخر کہاں سے آیا؟ سمیریوں کو ستاروں کی گردش کا حال کیسے معلوم ہوا تھا؟ ان کے دیوتاؤں کے نام آخر مختلف سیاروں کے نام پر کیوں رکھے گئے تھے اور ان کو علم تعمیرات، علم اجسام فلکی، علم البدن آخر کس نے سکھایا؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کا آج تک کبھی صحیح اور مدلل جواب نہیں مل سکا۔"

سر جان مارشل نے کہا:

"میرا نظریہ بھی صدفی صد یح اور قطعی سچائیوں پر مبنی نہیں ہے مگر بہرحال میرا اپنا مطالعہ اور میرا علم مجھے یہ نظریہ قائم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ سمیری اور ہائی کسوس دونوں اسی گم شدہ جزیرہ اٹلانٹس کے بچے کھچے لوگ تھے۔ وہ یکایک یعنی اس براعظم کی اچانک غرقابی کی بدولت افریقہ اور پھر مشرق کی زرخیز وادیوں میں نمودار ہوئے۔ اور انہوں نے عظیم تمدن اور اعلیٰ تہذیبوں کے نشانات چھوڑے اور پھر تاریخ کے اندھیروں میں گم ہو گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جن کا تعلق اٹلانٹا میں خلائی مخلوق سے قائم ہو چکا تھا اور اجسام فلکی کے دوسرے خلانوردوں کی تلاش میں تھے اور ان کے پرانے تعلقات کی بنا پر ان ہی کی وجہ سے ایشیا، جنوبی امریکہ، پھر مصر میں نیل کی وادیوں میں اور عراق میں وادی فرات میں بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ اور مقامی آبادیوں کے افراد جو آسمانی مخلوق کے اس خلط ملط اور میل جول سے سخت حیران تھے اپنے طور پر ان آسمانی مسافروں کو دیوتا اور خدا کا درجہ دینے لگے اور ان ہی مذہبی تقدس کے جذبات میں ملفوف دھاتوں نے دیوتاؤں اور دیویوں کا تصور پیدا کیا جو بعد میں بت پرستی تک جا پہنچا۔ یہی خلانورد اس دور کے پسماندہ انسانوں کو سمیریوں کے ذریعے وہ علم سکھاتے رہے جس کے نتیجے میں اہرام مصر جیسی عالی شان عمارات وجود میں آئیں"۔

سر جان اپنے اس نظریہ کو بیان کرنے کے بعد بھی کافی دلائل اس کے حق میں دیتے

رہے۔ مختلف کتابوں کے حوالے اور مختلف عمارتوں کی تصاویر سے ہر بات سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔

سرجان مارشل سے لوگ مستقل سوالات کرنے کے درپے تھے اور سرجان حتی الامکان ان کے سوالوں کے جوابات دے بھی رہے تھے مگر چار پانچ گھنٹے کے پر مغز مقالہ کے بعد کم و بیش ایک گھنٹہ سوالات کا عرصہ کسی بھی چاق و چوبند نوجوان آدمی کو تھکا دینے کے لیے کافی تھا جب کہ سرجان تو لگ بھگ پچاس سال کی عمر کے تھے۔ وہ مضمحل ہونے لگے اس لیے یہ معرکۃ الآرا لیکچر آخر کار ختم ہوگیا۔

بعد میں جامعہ الازھر کے ریکٹر نے اور پھر نئے قائم شدہ شعبۂ اہرامیات کے پروفیسر انچارج نے ان کا بڑی گرمجوشی سے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد پھر ایک ہلکی پھلکی مگر بڑی سجی سجائی میز کی طرف ہم سب کو مدعو کیا گیا۔ اور وہاں بھی وہی علمی فضا قائم رہی۔ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے کا نام نہ آتا تھا۔ آخر کار شام کو قریب پانچ بجے ہم لوگ ریسٹ ہاؤس واپس آئے۔

چند دن اسی طرح بغیر کسی خاص واقعہ کے گزر گئے کہ ایک صبح کو پھر سرجان مارشل نے مجھے بلا کر کہا کہ اس ماہ سے ہمیں وادی نیل کے ساتھ ساتھ سو دو سو میل کے علاقہ میں سیاحت کرنے کی تیاری کرنی چاہیے۔ اونٹ کی سواری کی عادت ڈالنے اور ریگستان کی گرمی سہنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ دوران سفر تکلیف نہ ہو۔

میں سمجھ گیا تھا کہ سرجان مارشل اہرام میں میرے مقید ہونے کے دوران مجھ پر بیتے ہوئے واقعات کو ابھی تک نہیں بھولے ہیں اور وہ حقیقتاً بے چین ہیں کہ رمیسیس اوّل کے دفن ہونے کی جو جگہ میں نے اہرام میں دیکھی ہے اس کو ہم تلاش کرنا شروع کردیں۔ ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ کے دور کے اس فرعون کی ممی ہاتھ لگ جائے چنانچہ میں بھی اس سفر کی تیاری میں مشغول ہوگیا۔

اشرف بیگ کے آدمیوں نے جب مجھے اغوا کیا تھا تو اونٹ کی تکلیف دہ سواری کو زندگی میں پہلی بار برداشت کرنا پڑا تھا۔ وہ ایک اذیت ناک تجربہ تھا۔ اس لیے میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور میں نہایت لاچارگی سے اونٹ پر بیٹھا ہوا بلکہ بندھا ہوا مسافت طے کر رہا تھا۔ بہرحال اس تجربہ کے باوجود میں نے ہمت نہ ہاری اور تین چار ہفتے تک صبح و شام دو دو گھنٹے اونٹ کی سواری کی مشق کرتا رہا

یہاں تک کہ مئی ۱۹۰۰ء تک میں اونٹ کی سواری میں خاصا مشاق ہوگیا تھا میں اب اونٹ پر خوب جم کر بیٹھ سکتا تھا۔ اس کو تیز رفتاری سے دوڑا سکتا تھا۔ اپنی مرضی سے اس کو ادھر ادھر دائیں بائیں موڑ سکتا تھا۔ زبان سے مختلف آوازیں نکال کر اس کی رفتار کو آہستہ یا تیز کر سکتا تھا۔ بٹھا سکتا تھا، اٹھا سکتا تھا۔ اس دوران میں میں نے ایک ہی اونٹ اپنی سواری میں رکھا تھا جو نسبتاً جوان اور کم غصیلا تھا۔ میں اس کی غذا اور پانی کا خود ہی خیال رکھتا تھا چنانچہ وہ جلد ہی مجھ سے مانوس ہوگیا تھا اور میں نے اس کا نام ڈکنز رکھ دیا تھا۔ میں اس اونٹ کو اسی نام سے پکارتا تھا۔ اور کبھی کوئی ہنٹر یا چابک وغیرہ استعمال نہ کرتا تھا۔ صرف زبان کی آواز کے اشاروں سے اس کی رفتار کو سست یا تیز کر دیتا تھا۔

ادھر اس عرصہ میں سرجان نے اس عظیم اور خونفو کے اہرام کے کنارے کنارے دریا کے سروے کی دستاویزات اور نقشے دیکھنے شروع کر دیئے تھے اور خصوصاً ان نقشوں کو زیادہ غور سے دیکھتے جاتے تھے جہاں پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے نشانات لگائے گئے تھے۔ سرجان مارشل نے سروے کے اس محکمہ سے بڑی وسیع اور مفید معلومات حاصل کرلیں جو نہر سوئز کی تعمیر کرنے والی کمپنی کے پروجیکٹ کا ایک اہم حصہ تھا۔ نہر کی تعمیر کے لیے یہ بات معلوم کرنی بہت ضروری تھی کہ نیل کے ارد گرد سیلاب کے اندیشے کس علاقے میں زیادہ ہوتے ہیں۔ یعنی کسی وجہ سے اگر نہر سوئز اور نیل کو ایک دوسرے سے ملانا پڑ جائے تو کیا اثرات مرتب ہونگے؟ پھر یہ سروے اس لیے بھی کیا گیا تھا کہ ایک وقت میں سوئز تعمیر کرنے والی کمپنی کا خیال تھا کہ اگر بحر روم سے دریائے نیل میں ہزار میل تک جہاز رانی کی جا سکے تو پھر نیل ہی کو ایک شاخ نکال کر بحیرہ قلزم سے ملا دیا جائے۔ مگر سروے کے بعد جب اس کے اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا تو نیل کو گہرا کرنے کا کام اور بھی زیادہ اخراجات کا حامل نظر آیا۔ پھر پورے مصر کی زرعی زندگی کا تمام دارومدار ہی نیل پر تھا۔ اگر اس کو سمندر کے کھارے پانی سے ملا دیا جاتا تو زراعت کے لیے میٹھا پانی ملنا ناممکن ہو جاتا۔ چنانچہ نیل جو مصر کے ریگستان کے لیے قدرت کا ایک تحفہ تھا، ایک بے فیصلہ دریا بن جاتا اور مصر ایک ریگستان میں تبدیل ہو کر رہ جاتا۔ بہرحال اس منصوبے پر تو کام ملتوی کر دیا گیا تھا اور پھر نہر سوئز کے اگلے منصوبے پر عمل شروع ہوا جس کی شروع سے اسکیم مرتب کی گئی تھی۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ نیل ویلی سروے ڈیپارٹمنٹ کو وادی نیل کے سروے سے بڑا مکمل اور معلوماتی مواد حاصل ہوگیا تھا جس سے سرجان مارشل استفادہ کر

رہے تھے۔

مہم پر روانہ ہونے سے قبل ایک ماہ ان ہی تمام کاموں میں گزرا۔ ہم نے یوں تو وادی نیل کے ساتھ ہی ساتھ رمیسیس اول کی دفن شدہ ممی کو تلاش کرنے کا منصوبہ بنایا تھا مگر سرجان کے سروے کے محکمہ کی تفتیش نے یہ بات ظاہر کی کہ کھلی میدانی وادیوں میں نیل کا دریا تقریباً ہر پچاس سال میں ایک میل اپنا رخ تبدیل کر دیتا ہے۔ چنانچہ چار ہزار سال قبل دریائے نیل کی گزرگاہ موجودہ راستے سے اسی میل کے فرق سے ہونی چاہیے تھی یعنی حضرت موسیٰ کے دور میں جو راستہ نیل کی گزرگاہ تھی وہ اب ریگستان تھا۔ یعنی ہمیں اب ریگستان کے سفر کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے تھا۔ چنانچہ اونٹ کی سواری کے ساتھ ساتھ پیاس برداشت کرنے کی عادت، کم سے کم پانی پینے کی عادت، سر کو ڈھانپنے اور کھلے ہوئے سوتی کپڑے قبا اور تہبند وغیرہ کے پہننے کی عادت بھی ڈالنی ضروری تھی۔ ادھر انگلینڈ سے میرے ساتھ جو تین اور لڑکے اس مہم میں ساتھ آئے تھے ان میں سے دو تو واپس جا چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سرجان کا ہندوستان پہنچنے کا منصوبہ اب کچھ مزید وقت لے گا اور شاید ایک سال ابھی اور وہ مشرق وسطیٰ میں گزاریں گے کیونکہ مصر کے بعد ان کا ارادہ عراق میں کچھ قدیم مقامات کی کھدائی میں حصہ لینے کا بھی تھا۔ پھر بمبئی کے قریب اجنتا اور ایلورا کا دورہ کرنے کا اور پھر وادی سندھ میں موئن جوڈارو کی کھدائی اور سیاحت کا پروگرام تھا۔ اس طرح ہمارے دوستوں کا خیال تھا کہ سرجان مارشل کی معیت میں گزارا ہوا ایک سال یوں تو ہر لحاظ سے ایک یادگار عرصہ ہوگا مگر تعلیمی لحاظ سے یہ سال ضائع ہو جائے گا۔ ان کو گریجویشن کے لیے مزید ایک سال خرچ کرنا پڑیگا۔ بہرحال، اب سرجان مارشل، میں اور ایک میرا ساتھی روسی جو اسکول ہی سے میرا ہم جماعت تھا قاہرہ میں رہ گئے تھے۔ اور ہم تینوں ہی کو اس مہم پر روانہ ہونا تھا۔

اب جولائی ۱۹۰۰ء کا زمانہ تھا۔ پانچ ماہ ہمیں قاہرہ میں گزر چکے تھے۔ ہم تینوں نے خیمہ اکھاڑنے اور لگانے کی بھی مشق کر لی تھی۔ کچھ کچھ عربی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ ایک درجن کے قریب ایسے بدو جو دور دراز کے نخلستانوں میں رہتے تھے اور ان ریگستانوں کا اکثر و بیشتر سفر کرتے رہتے تھے ہم نے ملازم رکھ لیے تھے۔ ان کو ہم اپنے رہبر اور مددگار کے طور پر بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے کیونکہ یوں تو ہمارے ساتھ ہر قسم کے نقشے موجود تھے اور ہم نے قطب نما بھی خرید لیا تھا مگر پھر بھی علم تجربہ سے کم تر ہوتا ہے۔ گو ہمیں سو میل کے

اندر اندر کے تمام نخلستانوں، چھوٹی چھوٹی آبادیوں، کنوؤں اور چشموں کا حال معلوم تھا۔ ان کے صحیح محل وقوع کا علم تھا مگر پھر بھی ریت کے طوفانوں، ہوائی جھکڑوں اور گرم تپتے ہوئے ریگستان کی ہیبت اپنی جگہ مسلم تھی۔ ہم پر خوف کا بھی غلبہ تھا۔ اور اسی لیے ہم تیاری کا کوئی گوشہ خالی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے اپنی اس مہم کو حتی الامکان خفیہ رکھا تھا مگر چوں کہ بعد میں قاہرہ یونیورسٹی یعنی جامعہ للازہر کے تین اسسٹنٹ پروفیسر ہمارے ہمراہ جانے کے لیے تیار ہوگئے تھے اس لیے یہ بات کسی نہ کسی طرح مشتہر ہو ہی گئی کہ سرجان کا مشن اب ریگستان اور وادی نیل میں رمیسیس اول کی ممی کو تلاش کرنا ہے۔

قاہرہ کے اخباروں نے اس خبر کو جلی سرخیوں سے شائع کیا۔ اس طرح ایک بار پھر میرا اور سرجان کا نام اخباروں کی زینت بننے لگا۔ اور میرے اہرام میں چند گھنٹے گزارنے کی کہانی پھر دہرائی جانے لگی۔ سرجان کے لیکچر کو چند اخبارات قسط وار شائع کر چکے تھے۔ وہ پھر سے اس کا خلاصہ، تتمہ اور تبصرے شائع کرنے لگے۔ مختلف مذہبی حلقوں میں یہ بحث بھی چھڑ گئی کہ آیا قرآن مجید یا بائیبل میں اس فرعون کی لاش کا کوئی تذکرہ موجود ہے جو دریائے نیل میں غرق ہوا تھا یا اس کا تذکرہ غرقابی کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ آیا تاریخ میں یا کسی اور ذریعہ سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس فرعون کی لاش کی بعد میں ممی بنائی گئی تھی یا سرجان مارشل فقط جان میلکم کی اہرام کے اندر مفروضہ قید کے تجربہ کی بنیاد پر اس مہم کو شروع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بحث کئی دنوں تک موضوع گفتگو بنی رہی اور ایڈیٹر کے نام اس سلسلے میں کئی خطوط آئے مگر سرجان نہ تو بذاتِ خود اس بحث میں الجھے اور نہ ہم لوگوں کو اس کی اجازت دی کہ اپنی رائے پیش کریں اور اس مہم کی کامیابی اور ناکامی پر قبل از وقت کوئی تبصرہ کریں یا اپنی رائے کا اظہار کریں۔ ان کا خیال تھا کہ کامیابی ہوگی تو سب کو معلوم ہی ہوجائے گا۔ وہ ایک جملہ بار بار دہراتے تھے کہ چاند نکلتا ہے تو سب دیکھ لیتے ہیں۔ یعنی آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

بہرحال دن گزرتے رہے۔ اس دوران میں دو اہم واقعات ہوئے۔ ایک تو یہ کہ قاہرہ میں مقیم برطانوی ریزیڈنٹ نے سرجان مارشل اور ہم لوگوں کو بطور خاص ایک دن اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ سرجان کی اس مہم کی کامیابی کے لیے سوئز کنال کمپنی کے برطانوی ڈائریکٹر سے بیس ہزار مصری پاؤنڈ جو آج کل کے حساب سے غالباً بیس لاکھ روپے کے برابر ہوتے ہیں ہمیں بطور اعانت دلوادیئے اور ہماری مہم کے متعلق بڑی دلچسپی اور بہت

گہرے شغف کے ساتھ استفسار کیا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ برطانوی پارلیمان کے حزب اقتدار کے لیڈر یعنی وزیر اعظم اور حزب مخالف کے قائد کو جو خطوط میں نے اشرف بیگ کی قید سے آزادی پا کر تحریر کیے تھے ان کا جواب دونوں لیڈروں نے دے دیا تھا۔ انہوں نے اپنے خطوط قاہرہ میں مقیم برطانوی ریزیڈنٹ کے حوالے سے بھیجے تھے۔ یہ دونوں خطوط دونوں لیڈروں نے اپنے ہاتھوں سے مجھے تحریر کیے تھے۔ ریزیڈنٹ نے یہ خطوط میرے حوالہ کیے اور ساتھ ہی ایک اخبار کا تراشہ بھی مجھے دکھلایا جس میں ایک خبر اور ایک خط شامل تھا جو میرے ان دو دوستوں کی طرف سے برطانوی اخبار اسٹیٹسمین میں شائع ہوا تھا۔ وہ دونوں اپنی آکسفورڈ کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے سرجان کے مشن سے علیحدہ ہو کر واپس انگلینڈ جا پہنچے تھے۔ انہوں نے اخبار کے نام اپنے خط میں قاہرہ میں میرے اور خدیو پاشا کے درمیان محل میں ہونے والی ملاقات کا تذکرہ کیا تھا۔ جامعہ الازہر کے DEPARTMENT PYRAMIDOLOGY میں میرے اعزازی فیلو بنائے جانے کی خبر دی تھی اور مصر کے عربی اخبار "الاہرام" میں میرے متعلق چھپنے والے انٹرویو، تصاویر اور خبروں کے شائع ہونے کی تمام تفصیل لکھی تھی۔ گویا مصر کے اس قیام کے عرصہ میں جو فقط پانچ ماہ کا تھا مجھے اپنے ملک میں اور مصر میں بھی یکساں شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ یہ نہ صرف میرے لیے اور میرے ماں باپ کے لیے بلکہ میرے کالج اور میرے دوستوں کے لیے بھی باعث افتخار تھی۔ دوسرے خط میں جو سیاسی تھے مگر مختصر تھے میرے جذبۂ حب الوطنی کو سراہا گیا تھا اور تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔

یہ پر تکلف دعوت جو ایک سجے سجائے کمرے میں برطانوی تکلفات اور طریق طعام سے مزین پروگرام کی معیت میں شروع ہوئی کھانے کے بعد ایک بے تکلف بات چیت اور اپنائیت کے ماحول میں نصف رات کے قریب اختتام پذیر ہوئی۔

اس دن جب شام کے سات بجے ہم لوگ ریسٹ ہاؤس سے ریزیڈنٹ کی بھیجی ہوئی چار گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہو کر چلے تھے تو موسم ذرا خنک تھا، حبس تھا اور آسمان پر گرد و غبار کی ہلکی سی چادر تنی ہوئی تھی بلکہ صبح ہی سے ہوا بند تھی اور شام ہوتے ہوتے آسمان پر زرد رنگ کے مٹیالے بادل پھیل گئے تھے۔ غبار کے بگولے بھی کبھی کبھی فضا میں ہلکے ہلکے ادھر ادھر ڈولتے پھرتے تھے۔ شام کو ہم نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ البتہ بگھی کے کوچوان نے ہم سے چلتے وقت آسمان کی طرف دیکھ کر کہا تھا کہ آج

رات کو ریت اور گرد کی آندھی ضرور آئے گی لیکن ہم تینوں نے اس بات کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔

ریزیڈنٹ کے بنگلے سے باہر نکلے تو ہم نے محسوس کیا کہ اس وقت ہوائیں تیز چلنے لگی تھیں۔ آسمان پر پیلے رنگ کا چمکیلا غبار ابھی تک چھایا ہوا تھا۔ ریذیڈنٹ نے بھی رخصتی مصافحہ کرتے وقت سرجان مارشل سے کہا تھا۔

"آج شاید تیز آندھی آئے گی۔ یہاں گرمیوں میں صحرا کی طرف سے سخت آندھیاں اکثر چلا کرتی ہیں۔"

"اچھا ہے، ریگستان کے سفر سے قبل اس کا بھی کچھ تجربہ ہو جائے۔" سرجان مارشل نے جواب دیا تھا۔

پھر ریذیڈنٹ نے جھک کر سرجان کے کان میں سرگوشی کی۔ "سرجان! میں نے آپ کی بیس ہزار پاؤنڈ کی رقم بکس میں آپ کی سیٹ کے نیچے حفاظت سے رکھوا دی ہے۔ آپ کل صبح ہی اسے امپیریل بینک میں منتقل کرا دیجیے گا اگر آپ چاہیں تو دو سپاہیوں کو آپ کی گاڑی کے ساتھ بھیجا جائے اور صبح تک آپ کے ریسٹ ہاؤس پر ڈیوٹی دینے کے لیے تعینات کر دیا جائے۔"

"کیا اس رقم کی اطلاع آپ کے عملوں میں سے کسی کو ہے؟" سرجان نے پوچھا۔

"نہیں۔ کوئی نہیں جانتا۔ صرف میں اور میرا اسیکریٹری اس سے آگاہ ہیں۔"

"تو پھر خواہ مخواہ سپاہیوں کو متعین کر کے لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

یہ گفتگو اتنی آہستہ ہوئی تھی کہ کوئی اور نہ سن سکتا تھا میں اور روسی اور سرجان مارشل البتہ یہ سب کچھ ضرور سن رہے تھے۔

"خدا حافظ سرجان! میں آپ سب کی مہم کی کامیابی کا متمنی ہوں۔"

"خدا حافظ! انشاء اللہ ہم آپ کی توقعات پر پورے اتریں گے۔"

باب نمبر ۱۳

ریتلی ہوا کے جھونکے اب تیز چلنے لگے تھے۔ ہمارے بگھی بان نے تو پہلے ہی ریت سے بچنے کے لیے اپنا سارا چہرہ رومال سے چھپایا ہوا تھا۔ ہم لوگوں نے بھی رومال نکال کر چہروں پر باندھ لیے اور بگھی میں بیٹھ گئے۔ کوچوان بھی بگھی کا دروازہ بند کر کے اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا اور گاڑی چل دی۔

ریذیڈنسی سے ریسٹ ہاؤس کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ آتے ہوئے ہم آدھ گھنٹہ میں ادھر آ گئے تھے۔ بگھی بھی ریذیڈنٹ ہی نے ہمیں لانے کے لیے بھجوائی تھی۔ چار گھوڑوں کی بغیر چھت کی ایسی بگھیاں قاہرہ کے اکثر پاشاؤں کے پاس موجود تھیں۔ متوسط طبقہ کے کچھ لوگ سواریوں میں اونٹ استعمال کرتے تھے۔ کہیں کہیں سوڈان کے ہاتھی بھی سواریوں کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ عام لوگ گھوڑے، گدھے، خچر باربرداری کے لیے رکھتے تھے۔

پانچ دس منٹ کے سفر کے بعد ہی ہم نے محسوس کیا کہ آندھی پوری شدت سے چلنا شروع ہو گئی تھی۔ ہواؤں کے ہر جھونکے کے ساتھ ریت کی مٹھیاں چہرے پر آ کر لگتی تھیں۔ ہر طرف غبار کا کہر چھانے لگا۔ رومال کے باوجود ریت کے باریک باریک ذرے دانتوں اور ناک تک پہنچ کر کل کل سی پیدا کرنے لگے۔ آسمان پر پہلے غبار اور ریت کا شامیانہ اب آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔ ہوا کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ شہر کی روشنیاں ابھی دور تھیں۔ ہمیں نیل کو پار کر کے غزہ کے ریسٹ ہاؤس پہنچنا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانچ سات میل کا یہ سفر شاید ہمیں ریت کے سیلاب میں غرق کر دے گا۔ ریت اور اندھیرا دونوں ہی کافی بڑھ گئے تھے۔

بگھی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی اور اندھیرے میں اب کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہم نے اپنے چہرے بھی ہاتھوں سے چھپا لیے تھے۔ آدھی رات کے قریب یوں بھی قاہرہ میں صرف نائٹ کلب اور پہرہ دار ہی جاگتے تھے۔ باقی سارا شہر جلد ہی سو جاتا تھا اسی لیے کسی آنے جانے والی سواری کی آہٹ بھی نہ آتی تھی اور نہ ہی اندھیرے میں اب روشنیاں ہی

نظر آتی تھیں۔ نہ راستے کا صحیح اندازہ ہوتا تھا۔

طوفان میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی اور ہر لمحہ ہواؤں کے جھونکوں کی تندی اور تیزی بڑھتی جا رہی تھی۔ ریت چاروں طرف سے برس رہی تھی اور اب ہواؤں کی سائیں سائیں کی آواز تھی یا پھر درختوں کے پتوں کے بجنے کی آوازیں یا کھجور کی لمبی لمبی شاخوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کے چھناکے کے شور تھے۔ ہوا کے جھونکوں کی شدت میں بگھی کی چھن چھن اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی گونج بھی دب کر رہ گئی تھی۔

ہم تینوں نے اپنے چہرے ابھی تک رومالوں سے چھپائے ہوئے تھے اور آنکھیں بھی بند ہی کر رکھی تھیں کیوں کہ ریت کے باریک اور مہین مہین ذرے جو پہلے ہی پلے میں پلکوں اور آنکھوں تک آ گئے تھے جلن اور سوزش پیدا کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آنکھ ذرا بھی کھولی تو یہ مرچوں جیسی جلن پیدا کرنے والی ریت پھر سے آنکھوں تک جا پہنچے گی۔

راستہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ لگتا تھا کہ آج کا سفر کبھی اپنے اختتام کو نہ پہنچے گا اور ریت کے کوڑے یوں ہی ہمارے چہروں پر برستے رہیں گے اور آندھی کی شدت یا ہواؤں کی رفتار کبھی کم نہ ہوگی۔

سرجان نے ذرا چہرے سے رومال ہٹا کر کن انکھیوں سے بگھی کے باہر دیکھا تو دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ نہ دریا کے ساحل کی لالٹینیں نظر آ رہی تھیں اور نہ ہی مکانوں، دکانوں یا شہری آبادی کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

"غبار اتنا گہرا ہے کہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔" سرجان نے سرگوشی کی۔

میں نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھا تو پتہ چلا کہ ہمیں ریذیڈنسی سے روانہ ہوئے پینتالیس منٹ ہو چکے ہیں اور طوفان اور آندھی کے باوجود گھوڑے سرپٹ دوڑتے رہے تھے یعنی اس رفتار سے ہمیں آدھ گھنٹے سے بھی پہلے ہی اپنے غزہ والے ریسٹ ہاؤس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ پھر میں نے دل کو خود ہی تسلی دی کہ ممکن ہے کہ کوچوان نے کھلی سڑک کے علاوہ کوئی زیادہ محفوظ راستہ اختیار کیا ہو جس کی وجہ سے ہمیں زیادہ وقت لگ گیا ہو۔ لیکن شاید روسی اور جان مارشل دونوں ہی وقت کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگا رہے تھے اس لیے کہ چند منٹ بعد ہی دونوں نے اپنی اپنی گھڑی نکال کر ٹائم چیک کیا۔

"روسی نے کہا "کیا ہم نے دریا کا پل پار کر لیا ہے؟"

"نہیں" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"تو پھر ہمیں پل کے بعد بھی دو میل اور جانا ہوگا یعنی پل پار کرنے کے بعد ریسٹ ہاؤس تک پہنچنے میں پندرہ بیس منٹ اور لگیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہمیں سفر کرتے ہوئے اتنا طویل وقت نہیں لگنا چاہیے تھا۔" سر جان مارشل نے پہلی بار کسی شبہہ کا اظہار کیا۔

ابھی ہم لوگ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دور بہت سی لالٹین کی روشنیاں مدھم مدھم چراغوں کی طرح نظر آنے لگیں اور کچھ درختوں کے قریب مکانوں اور آبادی کا بھی جتھہ سا نظر آیا۔ بگھی کا رُخ اسی طرف تھا۔ چند ہی لمحوں میں ہم اُس آبادی کے درمیان پہنچ گئے۔ کوچوان نے بگھی کو ٹھہرا دیا اور اُترتے ہوئے بولا۔

"میری آنکھوں میں ریت گھس گئی ہے۔ ذرا میں منہ دھو کر ابھی آرہا ہوں۔" اور پھر وہ اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔

کوچوان کے بگھی ٹھہراتے ہی مکانوں سے اور ادھر اُدھر سے کئی لوگ نکل کر ہمارے قریب آ پہنچے اور کسی نے گھوڑوں کی باگوں پر ہاتھ ڈالا اور کسی نے دروازہ کھول کر ہمیں دیکھا اور کسی نے کوچوان کو پوچھا اور کسی نے تجاہل عارفانہ کے انداز میں ہم سے کہا کہ ہم لوگ بگھی کے اندر کیوں بیٹھے ہیں۔ اس طوفان میں ان کے گھر کے اندر چل کر آرام کریں۔ ہم تینوں نے اس غیر متوقع پڑاؤ اور میزبانی میں خطرے کی کچھ کچھ بو سونگھ لی تھی مگر پھر بھی ہم اپنی بگھی ہی میں بیٹھے رہے اور نیچے نہیں اُترے۔ نہ ہی ہم نے ان کو اپنے کسی جملے سے مشتعل کرنے کی کوشش کی۔ نہ ہی ان کی کسی بات کا جواب دیا۔

"آپ تینوں بگھی سے اُتر آئیں۔ آپ رات بھر یہیں ٹھہریں گے۔ طوفان ختم ہو جائے تو واپس جاسکتے ہیں۔" اس بار جملہ میں بھی حکم تھا اور حکم میں معنی بھی پوشیدہ تھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ! لیکن ہمارا اپنی قیام گاہ پر ابھی پہنچنا ضروری ہے۔" سر جان نے ہم سب کی ترجمانی کی۔

"بحث فضول ہے۔ نیچے اُتر آؤ۔"

اس بار لہجے میں کرختگی بھی تھی اور تندی بھی۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جان نے آہستہ سے کہا۔

"جہنم رسیدہ یہ ایک مکمل سدشن معلوم ہوتی ہے۔ نیچے اتر آؤ۔"
اور پھر ہم تینوں بگھی سے نیچے اُتر آئے۔ چار پانچ آدمی ہمارے اِدھر اُدھر سے آکر آگے پیچھے چلنے لگے۔ سب کے چہرے رومالوں یا دوسرے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ریت کے طوفان کی اور ہواؤں کی شدت میں ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ باہر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہاں قریب قریب کے مکانوں میں کئی جگہ لالٹین اور بتیاں جل رہی تھیں۔ جوں ہی ہم روشنی کے قریب آئے ہم نے ان کے ہاتھوں میں کھلے چاقوؤں اور ننگے خنجروں کی چمک بھی دیکھ لی تھی۔
ہمارے گرد آنے والوں نے ہمیں ایک کچے سے مکان میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ اندر روشنی بھی تھی اور طوفان اور ریت سے بچاؤ بھی۔ کمرے کے اندر ایک لمبی سی میز بچھی تھی جس کی چوڑائی والے سرے پر بیچ میں ایک شخص عربی وضع قطع کا لباس پہنے اور چہرہ چھپائے بیٹھا تھا اور اس کے دائیں بائیں چار پانچ افراد اور بھی اسی طرح چہرے ڈھانپے ہوئے بیٹھے تھے۔ ہمیں اس لمبی میز کے دوسرے سرے کے قریب کھڑا کر دیا گیا۔ پھر تین مسلح آدمی جن کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ہمارے قریب آئے اور وہ ہماری تلاشی لینے لگے۔ ہمارے پاس علاوہ جیبی گھڑیوں کے تھا ہی کیا جو نکلتا۔ بہرحال ان کو اطمینان ہو گیا تو انھوں نے ہمیں میز کے دوسرے کنارے پر کھڑا کر دیا۔ سامنے بیٹھنے والے آدمی نے ہمیں ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو ہم لوگ بنچ پر بیٹھ گئے۔
میز کے وسط میں بیٹھے ہوئے آدمی کی آواز گونجی۔
مسٹر جان مارشل! آپ ضرور یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں گے آپ کو یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔؟"
ابھی تک سر جان مارشل نے اپنے چہرے بُشرے سے، حرکات و سکنات سے کسی طرح بھی کسی بے چینی یا خوف کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ان کو اپنے اعصاب پر بڑا کنٹرول تھا۔ بگھی سے کمرے تک وہ سب کچھ نہایت اطمینان سے برداشت کرتے رہے تھے بلکہ انہیں دیکھ کر ہمارے حوصلے بھی بلند تھے اور ہمیں کسی قسم کا خوف یا گھبراہٹ نہیں تھی۔ چنانچہ سر جان مارشل نے اسی متانت کے ساتھ نہایت اطمینان سے جواب دیا۔
"ظاہر ہے یہ تو فطری بات ہے۔"
"آپ کی حکومت کے وزیر اعظم اور حزبِ اختلاف کے لیڈر کی طرف سے دو خطوط

آپ کے ساتھی جان میلکم کے نام آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی اخبار کا ایک تراشہ بھی ہے جولب تک ریذیڈنٹ نے جان میلکم کو منتقل کر دیا ہوگا۔"

"جی ہاں! وہ میرے ساتھی کے پاس ہے۔" انہوں نے تعجب سے کہا۔

"سر جان! مگر آپ یہ نہیں جانتے کہ ریذیڈنٹ نے وزارت خارجہ کے انڈر سیکریٹری کی طرف سے میلکم کے بارے میں ریذیڈنٹ کے نام آنے والا خط آپ کو نہیں دکھایا جس میں کہا گیا ہے کہ میلکم پر کڑی نگرانی رکھی جائے کیوں کہ اس کے خط سے تاج برطانیہ کے مقبوضات سے متعلق پالیسی پر شدید اختلافات کا پتہ چلتا ہے۔"

اس انکشاف پر میں بھی چونکا اور سر جان مارشل کے چہرے پر بھی ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔

اب وہ شخص اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور اس نے اپنے چہرے سے رومال ہٹا دیا۔ چہرہ سامنے آگیا تو مجھے اس کے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔

"اشرف بیگ......!" میری زبان سے بے ساختہ نام نکلا۔

سر جان مارشل نے چونک کر میری طرف دیکھا کیونکہ ان کو حیرت ہوئی ہوگی کہ میں اس کو کیسے جانتا تھا۔ مگر پھر بھی انہوں نے کسی فوری جذبہ کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا۔

"میں نہیں جانتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور یہ سب مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں۔؟"

اشرف بیگ نے جیب سے ایک خط نکالا اور کھول کر اُسے میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے لفافہ پر تاج برطانیہ کی مُہر لگی ہوئی تھی اور اس پر ریذیڈنٹ کے نام کا پتہ درج تھا اور بالائی حصہ پر لکھا تھا۔ "خفیہ، ذاتی"

خط نکال کر میں نے پڑھا۔ چھ سات لائنوں کا مختصر بڑا معنی خیز خط تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"عزت مآب جناب ریذیڈنٹ صاحب، قاہرہ، مصر

منسلکہ خط عزت مآب وزیر اعظم، سلطنتِ برطانیہ کی طرف سے مصر میں موجود سر جان مارشل کی ٹیم کے نوجوان ممبر جناب جان میلکم کو پہنچا دیا جائے۔

تاج برطانیہ کے مقبوضات کی قومی پالیسی کے خلاف آکسفورڈ کے اس طالب علم کی سیاسی نکتہ چینیاں پریشان کن ہیں۔ اس پر کڑی نظر رکھی جائے اور اس کی ذہنی اصلاح کی

کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی غیر ضروری پبلسٹی بند کرادی جائے۔ سوئز کمپنی کے ذریعے سر جان سے مشن کی مالی اعانت کی آپ کی تجویز کو تاج برطانیہ کی نہ صرف حمایت حاصل ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی ہے۔

دستخط: نارمن ویلز

انڈر سیکریٹری

وزارتِ خارجہ، سلطنت برطانیہ

خط پڑھتے ہی میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ آج کا ڈنر اور ریذیڈنٹ کی اس قدر اپنائیت کی گفتگو اور سر جان کے ریگستان کے سفر پر جانے کے مشن کی مالی اعانت یہ سب کا سب ایک سوچے سمجھے اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کا ایک حصّہ تھا۔ گویا ریذیڈنٹ کا کام ہی یہ تھا کہ وہ ہمارے گروپ سے بے تکلفی پیدا کر کے ہم سے میل جول بڑھائے اور پھر غیر محسوس طریقہ پر میری ذہنی اصلاح کی کوشش کرے۔

میری ذہنی اصلاح کیا تھی اور کیوں ضروری تھی، بس اسی لیے نا کہ میں نے اشرف بیگ کے غاروں میں ایک رات کا کچھ حصّہ قید رہ کر اس نفرت کی آگ کو محسوس کر لیا تھا جو مصریوں میں برطانیہ کے خلاف بھڑک رہی تھی اور میں نے قوم کے ایک باعزت شہری کے طور پر اپنے ملک کے وزیر اعظم اور اپنی پارلیمنٹ کے قائد حزبِ اختلاف کو مصر کی صحیح صورتِ حال سے باخبر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ تو یہ تھی ہماری حکومت کی پالیسی، سچی اور بے لاگ تنقید کرنے والوں پر کڑی نظر رکھی جائے! دنیا بھر میں آزادیٔ افکار اور آزادیٔ اظہار کا ڈھنڈورا پیٹنے والی برطانوی حکومت کا باطن کس قدر مکروہ تھا۔ کہاں تھا آزادیٔ افکار کا ہیرو جان لاک؟ کہاں تھا اسٹیوارٹ مل جس نے کہا تھا کہ مرضی نہ کہ طاقت ریاست کی بنیاد ہے؟ کارلائیل اور میکلے۔ کیا یہ سب کے سب فقط کتابوں ہی کی حد تک محدود تھے؟

"میلکم کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟ یہ تو تمہاری حکومت کی مکاریوں کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ تمہاری حب الوطنی کے جذبے کو چوٹ تو لگی ہوگی مگر یہ سمجھ لو کہ مکار ہمیشہ خود غرض ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے سوا کسی کا مفاد عزیز نہیں ہوتا تم ان کے ہم وطن ہو مگر تم پر بھی اُن کی وہی بے اعتمادی ہے۔"

سر جان مارشل کو یہ ساری گفتگو بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ ان کو اشرف بیگ

کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ کچھ نہ جانتے تھے کہ اشرف بیگ کو جان میلکم سے کب دلچسپی پیدا ہوئی تھی اور کب ریسٹ ہاؤس سے اغوا کر کے اُسے چند گھنٹے غاروں میں رکھا گیا تھا۔ اس واقعہ کو لب قریب دو ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا مگر میں نے ان کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

سر مارشل ان خیالات سے اس وقت چونکے جب اشرف بیگ کی آواز دوبارہ گونجی۔

"سر جان مارشل! آج ہم نے آپ کو بے وقت تکلیف دی ہے جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ ایک بات تو یہ تھی کہ ہماری تحریک کو اس بیس ہزار کی رقم کی ضرورت تھی جو آپ کو برطانوی ریذیڈنٹ نے بہ طورِ تحفہ پیش کی تھی۔ اس رقم کو جو سوئز کمپنی کے فنڈ سے آپ کو مہیا کی گئی ہے ہم اپنی دولت سمجھتے ہیں۔ سوئز کنال مصریوں کی ہے۔ اس کی آمدنی بھی ہماری ہی ہے۔ اس لیے اس کے لینے پر ہم کسی قسم کی رسمی معذرت بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ آپ ان لوگوں سے اور رقم لے سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں آپ اپنی حکومت کو ایک خط لکھیں اور ان کو سمجھائیں کہ مصر سے اپنے اقتدار اور اپنے سیاسی اثرات کو بالکل ختم کر دیں ورنہ ہم اپنی جدوجہد کو آگ کی طرح ہر طرف پھیلا دیں گے اور پھر برطانوی مفادات اس آگ میں سوکھی گھاس کی طرح جل کر بھسم ہو جائیں گے۔"

سر جان نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

"میں کچھ کچھ آپ کی حیثیت سمجھتا جا رہا ہوں مگر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق سیاست سے ہے نہ کبھی تھا۔ میرے مشاغل خالص علمی ہیں اور میری دلچسپی مٹی کے ان کھنڈروں میں ہے جو قدیم تاریخ کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں خود کو برطانوی یا مصری مفادات کی چپقلش میں ڈالنا نہیں چاہتا اور اپنے آپ کو اس سے بالکل علیحدہ سمجھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ہم آپ کو مجبور نہیں کرتے مگر کل یا بہت جلد آپ کو حالات خود ہی مجبور کر دیں گے کہ آپ اپنی حکومت کو دانش مندانہ مشورہ دیں۔" اشرف بیگ اب کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ انسانی جذبوں اور انسانی آزادی کے قدرشناس ابھی کچھ جوان برطانیہ میں موجود ہیں۔ آپ نے برطانوی سیاست دانوں کو جو خطوط بھیجے ہم اس کے شکر گزار ہیں۔ مگر کیا آپ نے دیکھا کہ برطانوی وزیراعظم ایک طرف تو آپ کو شکریہ اور

ممنونیت کے خط لکھتا ہے اور دوسری طرف اپنی حکومت کے کارندوں سے آپ پر کڑی نگرانی کرانے کا حکم دیتا ہے۔ جو حکومت اپنوں پر بھی اعتماد نہیں رکھتی وہ ہم کو کیا انصاف دے سکے گی؟ اس کی حکمتِ عملی کی بنیاد ہی خود غرضی پر ہے۔"

"اشرف بیگ! ہماری حکومت ہم سے کیا چاہتی ہے یہ ہمارا اور ہماری قوم کی منتخب کردہ حکومت کا معاملہ ہے۔ تم اس معاملہ میں خواہ مخواہ فریق بننے کی کوشش مت کرو۔" میں نے کہا۔

"جان میلکم! اس دنیا میں کمزور ہونا سب سے بڑا جرم ہے اور کمزور شخص کو ہمیشہ اپنی بے عزتی برداشت کرنی پڑتی ہے مگر جوانی میں خود کو کمزور سمجھنا اور ہتک برداشت کر لینا نہ کسی کو زیب دیتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم کمزور نہیں ہو نوجوان ہو علم تمہاری طاقت ہے، اپنے ضمیر کو زندہ رکھو اور مظلوموں کی صف میں کھڑے ہو کر ظالموں کی طرف دیکھو تو تمہیں اپنی پشت پر مظلوموں کی عظیم طاقت نظر آئے گی۔"

"تم اس نوجوان کو اس کی قوم کے خلاف اکسا رہے ہو مگر یہ کوشش فضول ہے۔ ہماری عدالتیں اس قسم کی ذاتی بے عزتی کے خلاف ایک معمولی سے معمولی شخص کی درخواست بھی سماعت کے لیے منظور کر لیتی ہے اور پھر وہ یہ نہیں دیکھتی کہ فریق ثانی چپراسی ہے یا وزیر اعظم۔ اگر کسی فرد کے ساتھ سیاسی، سماجی یا نفسیاتی ظلم ہوا ہے تو ظلم کرنے والے کو سزا مل رہی ہے۔ اگر جان میلکم یہ سمجھیں کہ ان کی حیثیت کو مشتبہ بنا کر تاج برطانیہ کے انڈر سیکرٹری نے ان کی بے عزتی کی ہے تو جان میلکم اسے کسی وقت بھی عدالت میں گھسیٹ سکتے ہیں۔ جان میلکم کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے اس کا اختیار صرف جان میلکم ہی کو ہے۔" سر جان مارشل نے گویا اشرف بیگ کی راہ مسدود کر دی تھی۔

"سر جان مارشل! ہمیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ تم یا میلکم اپنی حکومت کی دوغلی پالیسی کو کس حد تک درست یا غلط سمجھتے ہو۔ ہاں جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم کھل کر تمہاری حکومت کے خلاف آ چکے ہیں۔ ہمارا نشانہ فی الحال سوئز کمپنی کے غاصب عہدے دار ہیں جنہیں ہم مصر کی سرزمین پر دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"مسٹر اشرف بیگ! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سیاست میرا میدان نہیں ہے نہ میں کسی سیاسی مقصد کے تحت مصر آیا ہوں نہ ہی سوئز کمپنی کے ڈائرکٹروں نے مجھے

بیس ہزار کم پاؤنڈ کی یہ رقم کسی سیاسی مقصد کے لیے دی تھی بلکہ صرف ایک علمی کاوش کی مدد کے لیے دی گئی تھی۔ مجھے خود مصری حکومت نے مالی امداد کی پیش کش کی تھی۔ ولی مصر توفیق پاشا خود اہرام اور مصر کے دوسرے تاریخی مقامات کی تحقیق پر کثیر رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"ہم یہ باتیں اپنے ذرائع سے بھی معلوم کر چکے ہیں چنانچہ اسی لیے ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے مگر یہ ضرور بتانا چاہتے ہیں کہ اب ہم کھلی جنگ لڑنا شروع کر چکے ہیں۔ آج ریذیڈنٹ اور سوئز کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اس کمپنی کا منافع ہمیں بھیج دیا ہے۔ اور اب برطانوی کتے ہر جگہ ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے اور ممکن ہے کہ اب تک ریذیڈنٹ کی گاڑی کا اصلی کوچوان بھی جھاڑیوں سے اٹھ کر ہوش میں آ چکا ہو اور اپنے مالک کو بتا چکا ہو کہ جان مارشل، جان میلکم اور روسی کو لے جانے والا بگھی کوچوان اصلی نہیں نقلی تھا۔"

"اشرف بیگ۔ اب جب کہ رقم آپ کے پاس آ چکی ہے خط کا مضمون آپ ہمیں سنا چکے ہیں تو ہمیں آپ کیوں روکے ہوئے ہیں؟" روسی نے پہلی بار زبان کھولی۔

"جب برطانوی ریذیڈنٹ کو ایک ہی رات میں دو خبریں ملیں گی کہ اس کی منافع کی رقم ڈوب گئی اور وکٹوریہ بھی ڈوب گیا اور سر جان مارشل اغوا کر لیے گئے تو اس کی ذہنی لذت کیا شاندار ہو گی؟ ہم چاہتے ہیں کہ وہ مصر میں اب ہماری میزبانی کا مزا چکھنا شروع کر دے۔ رہے آپ لوگ تو آپ طوفان تھمتے ہی رات کے کسی وقت غزہ کے پل کے قریب پہنچا دیئے جائیں گے۔ وہاں سے بگھی کو لے کر پل عبور کرنا اور ریسٹ ہاؤس تک واپس جانا آپ کا کام ہو گا اس لیے کہ پل پر شاہی شرطہ (شاہی پولیس) اور سوئز کنال کمپنی کے برطانوی محافظ ایک ایک بگھی کو چیک کر رہے ہیں۔"

رات کے آخری حصہ تک ہم لوگ اسی کمرے میں بند رہے۔ اشرف بیگ اور اس کے ساتھی ہمیں تنہا چھوڑ کر کہیں جا چکے تھے۔ صرف ایک دو مسلح محافظ ہماری چوکیداری کے لیے وہاں روک دیئے گئے تھے۔

تنہائی ملی تو میں نے سر جان مارشل اور روسی کو اپنی اور اشرف بیگ اور شیخ سباحی کی ملاقات کا حال تفصیل سے سنایا جس سے ان کو اندازہ ہوا کہ اشرف بیگ کون ہے اور اس کا مشن کیا ہے۔

رات کے شاید چار بجے ہوں گے کہ ہمیں کمرے سے نکالا گیا۔ اور بگھی میں سوار کر کے کوئی ساڑھے چار بجے کے قریب غزہ کے پل کی سمت لے جایا گیا۔ جب پل کی روشنیاں نظر آنے لگیں تو دریا کے کنارے کھجوروں کے ایک جھنڈ کی آڑ میں بگھی روک دی گئی۔ دونوں مسلح نقاب پوش جو بگھی کی کوچوانی کر رہے تھے بگھی سے اتر گئے اور گھوڑوں کی باگیں ہمارے ہاتھ میں دے کر خود اندھیروں میں گم ہو گئے۔

ریت کا طوفان اب ختم ہو چکا تھا۔ ہوا بڑی ٹھنڈی اور خواب آور سی تھی۔ یوں بھی ساری رات تو جاگتے ہی گزری تھی۔ آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں مگر ریسٹ ہاؤس تو بہر حال پہنچنا ضروری تھا۔ روسی نے باگیں تھامیں اور بگھی کو پل کی طرف لے کر چلا۔

جیسے ہی پل کے قریب بگھی پہنچی کئی مصری سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ایک دم بہت سی روشنیاں ہم پر پڑنے لگیں اور چاروں طرف مسلح فوجی جمع ہو گئے۔

"کون ہو اور کہاں سے آ رہے ہو؟"

"ارے یہ تو گورے ہیں۔"

"کمپنی کے افسر لگتے ہیں۔"

اتنے میں پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ آواز دینے والا شاید ان کا کوئی افسر تھا جو آہستہ آہستہ خود بھی ان ہی کی طرف آ رہا تھا۔ ایک سپاہی نے پیچھے جا کر اس کو بتایا کہ بگھی میں سوار تین گورے موجود ہیں۔ ایک گورا اس کو چلا رہا ہے۔ افسر یہ سن کر آگے بڑھا اور ہم سے ہماری قومیت اور اتہ پتہ پوچھنے لگا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ سر جان مارشل بگھی میں موجود ہیں تو وہ چونک اٹھا۔

"برطانوی ریذیڈنٹ اور کمپنی کے افسران آپ کو پوچھتے رہے ہیں۔ آدھی رات سے کمپنی کے فوجی دستے بھی حرکت میں آ چکے ہیں۔ آپ کسی حادثہ کا شکار تو نہیں ہوئے؟"

"نہیں، ہم لوگ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"مگر ریذیڈنٹ کے افسروں کا کہنا تھا کہ آپ کی گاڑی کو رات سوا بارہ اور ساڑھے بارہ بجے کے درمیان یہ پل پار کرنا چاہیے تھا لیکن اب تو ساڑھے چار بجے ہیں۔ یہ چار گھنٹے آپ نے کہاں گزارے؟"

"افسر! میں تمہاری ہر بات کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں مگر سب سے پہلے دو

بھی کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ کوتوالی (تھانہ) میں اپنے اور اپنے دو ساتھیوں کے اغوا کی رپورٹ درج کرانا چاہتا ہوں اور دوسری یہ کہ فوری طور پر ریذیڈنٹ سے ملنا چاہتا ہوں۔ سر جان نے کہا۔

"پل سے اترتے ہی بائیں جانب ایک سفید اور سرخ رنگ کی بڑی سی عمارت ہے یہ عزہ کی پولیس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ہمارا ایک سپاہی آپ کو وہاں لے جائے گا۔ آپ رپورٹ درج کرائیں اور ریسٹ ہاؤس جا کر آرام کریں۔ ریذیڈنٹ کو ہم خود اطلاع کرا دیں گے۔ وہ خود بھی آپ سے ملاقات کے لیے بے چین ہیں۔ ان کے آدمی اور کمپنی کے کئی سپاہی آپ کی تلاش میں دریا کے قریب قریب مارے مارے پھر رہے ہیں"۔

کوتوالی میں رپورٹ درج کراتے کراتے صبح کے ساڑھے چھ بج گئے تھے۔ ہمیں ریسٹ ہاؤس آئے ہوئے شاید دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ کمپنی کے کچھ اعلیٰ فوجی حکام اور ریذیڈنٹ ہمارے کمروں میں پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم سب ناشتہ کی میز پر جمع ہو گئے تھے اور بیڈ ٹی کے ایک ایک کپ نے ہمارے حواس کو مکمل طور پر بیدار کر دیا تھا۔

ریذیڈنٹ نے کہا۔

سر جان، آپ کو رخصت کرنے کے بعد میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں لیٹ گیا تھا کہ آدھ گھنٹے کے بعد بارہ بجے مجھے پھر اٹھایا گیا اور مجھے بتایا گیا کہ ہمارا بگھی بان لان کی پشت پر جھاڑیوں میں بے ہوش پڑا ہے۔ کسی وزنی چیز سے اس کے سر پر چوٹ ماری گئی تھی اور خون بہہ کر اس کے بالوں میں جم گیا تھا۔ ضرب شدید نہ تھی اور نہ ہی زخم گہرا تھا۔ اب مجھے فوری طور پر یہ فکر ہوئی کہ جب بگھی بان بے ہوش ہے تو پھر آپ کو لے کر جانے والا کوچوان کون تھا؟ چنانچہ، ہم نے رات ہی کو اسی طوفان میں چند سپاہی ریسٹ ہاؤس بھیجے کہ آپ کی خیریت کا پتہ چلے مگر وہاں نہ آپ تھے، نہ بگھی۔ پھر تو ہماری ساری رات اسی پریشانی میں گزر گئی۔

اس کے بعد سر جان نے ریذیڈنٹ کو تمام واقعات سنائے۔ جو کچھ گزرا تھا، سب ہی گوش گزار کر دیا۔ حتیٰ کہ جو خط برٹش گورنمنٹ کے انڈر سیکریٹری کا ریذیڈنٹ کے نام آیا تھا اس کا بھی ذکر کیا۔ اور میں نے دیکھا کہ خط کا حال سن کر ریذیڈنٹ کے چہرے پر ایکدم ایک رنگ آیا اور ایک رنگ گیا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ جب سر جان اپنا بیان ختم کر چکے تو اس نے کہا "آپ نے جو باتیں کہی ہیں، وہ سب سچ ہیں۔ اس خط کے متعلق بھی

جو کچھ کہا گیا، وہ سب سچ ہے مگر یہ خط ذاتی تھا اور فوری طور پر اس کو افشاء کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے میں نے آپ کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا مگر مجھے سخت حیرانی ہے کہ یہ لوگ اس قدر باخبر کیسے ہیں۔ ہمارے عملے میں سے یقیناً کچھ لوگ اس کے آدمی ہیں، جسے آپ اشرف بیگ کہتے ہیں۔ بہر حال، اس بارے میں بعد میں سوچا جائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی اعانت دی جانے والی رقم ان چوروں کے ہاتھ پڑ گئی۔ اس کی تلافی ہو جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔"

ابھی تک کمپنی کے فوجی سپاہیوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب ہیں۔ جیسے ہی ریذیڈنٹ چپ ہوا، ایک فوجی افسر بولا۔

"ہمیں ان فضول باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے بلکہ فوری طور پر اس جگہ کی نشاندہی کرنی چاہیئے، جہاں سرجان کو ان کے ساتھیوں سمیت لے جایا گیا تھا۔ سرجان نے کہا ہے کہ وہاں صرف چند مکانات ہی نظر آئے تھے۔ ممکن ہے کہ اندھیرے اور ریت کے طوفان کے باعث وہ جگہ کچھ زیادہ اچھی طرح نہ دیکھ پائے ہوں اور وہاں خاصی بڑی آبادی رہی ہو۔ پھر گھوڑا گاڑی پینتالیس منٹ میں کتنی ہی تیز رفتاری سے چلے، پندرہ بیس میل سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ ہمیں دریا کے قریب قریب پندرہ بیس میل کے فاصلے پر جتنے چھوٹے بڑے گاؤں ہیں، سب کھنگال لینے چاہئیں۔ ممکن ہے کہ اس گروہ کا کوئی گرگا ہی ہاتھ لگ جائے۔"

میں نے کہا، "یہ تجویز معقول ہے۔ اس پر فوری عمل ہونا چاہیئے۔"

چنانچہ، سب لوگ اس جگہ کی تلاش میں روانہ ہوئے، جہاں سرجان لے جائے گئے تھے۔ تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کی تلاش بسیار کے باوجود ہم اس قسم کے کسی بھی گاؤں، پڑاؤ یا آبادی کی تلاش میں ناکام رہے، جہاں یقینی طور پر کہا جا سکتا کہ یہ وہی جگہ تھی، جہاں ہماری بگھی کو روک لیا گیا تھا۔ دریائے نیل کے کنارے کنارے ہی دراصل سارے کا سارا قاہرہ آباد تھا۔ تمام ہوٹل، تفریح گاہیں، امراء کے محلات، سرکاری دفاتر، چھوٹی بڑی کشتیوں کے لنگر اندازی کے مقامات، گھاٹ، دخانی کشتیوں کی مرمت کے ورکشاپ، غرض کہ سب کچھ یہیں تھا، اور شہر کی آبادی سے آگے دریا کے ساحل کے ساتھ ساتھ گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا، جہاں بیچ بیچ میں کھیت کھلیان بھی ملتے تھے، وہاں کسانوں (فلاحین) کے چھوٹے بڑے، کچے پکے مکانوں پر مشتمل گاؤں بھی تھے۔ ان میں اکثر ایک جیسے ہی تھے۔

یعنی چار پانچ کچے مکان مل کر ایک معمولی سی آبادی بن جاتی تھی۔ اسے شاید ان کھیتوں میں کام کرنے والے فلاحین سورج کی حدت سے بچنے کے لیے اور دوپہر کے وقت لیٹنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

بہت سے ایسے کچے مکانات نظر آئے، جو کھیتوں کے درمیان تھے مگر وہ خالی نظر آرہے تھے۔ کئی گاؤں کی آبادیاں دس بارہ مکانوں پر مشتمل نظر آئیں مگر وہ سب کی سب سڑک سے دور اور کھیتوں کے بیچوں بیچ تھیں، جہاں بگھی کے پہیوں کے نشانات تک نہ تھے اور پھر ان میں سے اکثر کھیتوں میں پانی دیا ہوا تھا۔ چنانچہ، یہ ممکن ہی نہ تھا کہ رات جن سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی بگھی میں ہم تینوں نے سفر کیا تھا، وہ اس رفتار سے ان دلدلی مٹی والے کھیتوں سے گزر گئی ہوگی۔ بہرحال، گیارہ بجے کے قریب ہم سب لوگ واپس ریذیڈنٹ کے دفتر آگئے۔ ناکام و نامراد۔ اپنی دن بھر کی سخت تگ و دو کے فضول انجام پر ہم سب ہی غصہ سے کھول رہے تھے۔

یہاں ہمارے لیے ایک اور قیامت کی خبر منتظر تھی۔ گو کہ اشرف بیگ نے ہمیں اس خبر کی اطلاع رات ہی دے دی تھی مگر ہم اسے سمجھ نہ سکے تھے۔ دوران گفتگو ریذیڈنٹ یا ان فوجی افسروں سے اس کا تذکرہ کرنا بھی ہم لوگ بالکل بھول چکے تھے۔ یہ خبر اسکندریہ سے انیس میل دور کھلے سمندر میں ایک برطانوی کارگو جہاز وی دی وکٹوریہ کے ڈوبنے کی تھی۔

کمپنی کے ڈائریکٹر، جو رات ہی میں کسی وقت اس افواہ کو سن چکے تھے کہ سوئز کمپنی کا وہ دخانی جہاز جو کمپنی کی چھ ماہ کی منافع کی رقم ایک کروڑ پونڈ لے کر وطن واپس جا رہا تھا، اپنے اسٹاف میں کچھ ایسے لوگوں کو لے کر چلا ہے، جو نہ تو جہاز پر پہلے سے ملازم تھے اور نہ ہی جن کے متعلق کپتان کو علم تھا کہ یہ لوگ بھی جہاز پر سوار ہیں۔ ظاہر ہے یہ بات خطرناک تھی اور کسی سازش کا پیش خیمہ تھی۔ چنانچہ رات نو بجے ہی سوئز کمپنی کی رجمنٹوں کی کچھ بٹالین اسکندریہ کی طرف بھیجی گئی تھیں کہ کسی بھی ضرورت پر حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے فوجی جوان موجود رہیں۔ یہ فقط حسن اتفاق تھا کہ اس رات کمپنی کا کوئی جہاز یا کوئی دوسری تیز رفتار کشتی تک اسکندریہ میں موجود نہ تھی ورنہ دی وی وکٹوریہ کو فوراً ساحل پر واپس بلالیا جاتا۔

اب جو کمپنی کے جہاز کے لوٹے جانے اور غرق کیے جانے کی اطلاع ملی تو ریذیڈنٹ

اور ڈائریکٹران کے ہوش اڑ گئے۔ ان دونوں کو اپنی نوکریاں خطرہ میں نظر آنے لگیں۔ اس خبر کا مطلب ان کے کیریر کا خاتمہ تھا۔ ایک کروڑ پونڈ کی یہ رقم کچھ معمولی رقم نہ تھی۔ آج ۱۹۷۸ء میں کرنسی کی قیمت کے لحاظ سے یہ ایک ارب روپے کے برابر تھی۔

یہ اشرف بیگ کا ایک زبردست کارنامہ تھا۔ شروع سے آخر تک اس نے اس معرکہ کے ایک ایک جزئیات پر نظر رکھی تھی اور انتہائی رازداری اور مستقل مزاجی سے یہ پورا منصوبہ ترتیب دیا تھا اور جیسا کہ بعد کی اطلاع سے ظاہر ہوا۔ اس نے پورے ایک سال سے اس وقت کا انتظار کیا تھا۔

ایک سال قبل اس کے علم میں یہ بات آگئی تھی کہ کمپنی کے ڈائریکٹر سوئز کنال سے گزرنے والے جہازوں کی رائیلٹی کی آمدنی ہر چھٹے ماہ لندن بھیج دیتے ہیں۔ بیس فیصد حصہ اخراجات اور فوجی نظم و نسق کے خرچے کے لیے قاہرہ ہی میں روک لیا جاتا ہے، جو کہ امپیریل بینک میں جمع کرا دیا جاتا ہے۔ باقی اسی فیصد حصہ رقم لندن روانہ کر دی جاتی ہے۔ اشرف بیگ کو یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ ایسی کسی رقم کے بھیجے جانے کے لیے کسی خاص حفاظت کا اہتمام بھی نہیں کیا جاتا۔ عموماً یہ منافع وی وی وکٹوریہ کے ذریعہ برطانیہ بھیجا جاتا ہے۔ اس جہاز میں یعنی وکٹوریہ میں تین برطانوی آفیسر، کپتان، نائب کپتان اور انجینیر اور چودہ عرب یا مصری خلاصی (قلی) ہوتے ہیں، جو کوئلہ جھونکنے اور مال اتارنے اور چڑھانے پر مامور ہوتے ہیں۔ کمپنی کا یہ جہاز بار برداری کا کام بھی کرتا تھا اور اگر کچھ سامان مل جاتا تھا تو وہ بھی اپنے آنے جانے کے سفر میں لے کر چلتا تھا۔ ڈیوٹی کے سفر کے علاوہ اور دنوں میں یہ جہاز مدغاسکر، باب المندب، مشرقی افریقہ، بصرہ اور عرب کی ساحلی بندرگاہوں پر تجارت اور دوسرے برطانوی مقبوضات کا ضروری اسلحہ اور ساز و سامان پہنچاتا تھا۔

اشرف بیگ نے تمام معلومات اکٹھی کیں اور پانچ ماہ قبل اس جہاز سے پرانے خلاصیوں کو چار گنا زیادہ تنخواہیں دے کو نوکری سے الگ کروا دیا اور ان کی جگہ اپنے گیارہ آدمی، جن میں چار عرب، تین الجزائری اور پانچ مصری تھے، جہاز پر ملازم رکھوا دیے۔ وہ پرانے قلیوں سے زیادہ محنتی اور ان سے کہیں کم لالچی تھے۔ پانچ ماہ میں انہوں نے اتنی محنت اور لگن سے کام کیا کہ تینوں برطانوی افسروں کا دل جیت لیا۔ چنانچہ، وہ ان پر حد سے زیادہ اعتماد کرنے لگے۔

کمپنی کے منافع کی رقم چمڑے کی تھیلی میں یا تو سونے کی شکل میں بھیجی جاتی تھی یا مصری پونڈ کی شکل میں، جس کو بینک کے ذریعے برطانوی پونڈ میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ عام طور پر یہ تھیلے روئی کی گانٹھوں کے اندر دبا دیے جاتے تھے اور کسی کو شک تک نہ ہوتا تھا کہ ان گانٹھوں کے بیچ میں سونے کے سکوں سے بھرے ہوئے تھیلے بھی رکھے ہیں۔ مصری تاجر اپنی لمبے ریشے کی روئی کو لنکاشائر کے کارخانوں میں بھیجتے تھے اور کمپنی کا جہاز ان کا سامان لے جاتا تھا اور اس طرح کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی تھی کہ کمپنی کا منافع برطانیہ پہنچ جاتا ہے۔ یہ طریقہ پچھلے دس برس سے اسی طرح چل رہا تھا۔

اشرف بیگ نے یہ انتظام کیا کہ ایک تیز رفتار کشتی اسکندریہ سے ۱۹ میل دور کھلے سمندر میں موجود رہے اور جب جہاز ساحل سے کافی آگے بڑھ آئے تو اس جہاز سے روئی کی نشان زدہ گانٹھیں اتار دی جائیں اور اس کشتی میں لاد دی جائیں۔ اس طرح رقم اور سونے کے سکے، سب کے سب کشتی کے ذریعے ساحل تک آجائیں گے۔ مزید احتیاط اشرف بیگ نے یہ کی کہ جہاز پر اپنے موجودہ آدمیوں کے علاوہ سامان لادنے والے مزدوروں میں سے پانچ اور آدمی بھی سامان جہاز میں لے جانے کے بہانے اس جہاز پر منتقل کر دیے تھے، جس کی اطلاع جہاز کے روانہ ہونے کے بعد کمپنی کے افسران کو ملی کہ پانچ قلی، جو جہاز پر سامان چڑھانے گئے تھے، جہاز سے اس کے روانہ ہونے تک واپس نہیں آئے تھے۔ اس طرح کمپنی کے افسران کو کچھ شبہ سا تو ہوا مگر وہ واقعہ کی نوعیت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔

کھلے سمندر میں نکلتے ہی جہاز پر موجود اشرف بیگ کے تمام آدمیوں نے جن کی کل تعداد اب اٹھارہ ہو چکی تھی، نہایت سفاکی سے تینوں برطانوی افسروں کو قتل کیا۔ ان کی لاشیں سمندر میں پھینک دیں اور جہاز سے تمام ضروری سامان اس کشتی میں منتقل کر دیا، جو ان کے قریب ہی موجود تھی اور تمام سامان اور رقم لے کر ساحل پر آگئے۔ جاتے جاتے وکٹوریہ کو آگ لگا کر اسے سمندر میں غرق ہونے کے لیے چھوڑ گئے۔ جہاز کئی گھنٹہ تک جلتا رہا۔ جب تک ایک دوسرے آنے والے جہاز نے جو اس کے پاس سے گزرا تھا، اس کی رپورٹ آکر اسکندریہ میں نہیں دی یہاں لوگوں کو کچھ نہ معلوم ہو سکا تھا کہ وکٹوریہ کے ساتھ کیا گزری تھی۔

گویا اس رات نو بجے تک وکٹوریہ کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس کی قبر سمندر کی تہہ میں بن رہی تھی اور تینوں برطانوی افسران ابدی نیند سو چکے تھے مگر اس کی اطلاع

قاہرہ میں مقیم برطانوی ریذیڈنٹ کو یا کمپنی کے اعلیٰ افسران کو نہیں ہوسکی تھی۔ ان کو یہ ساری روح فرسا خبریں اگلے روز گیارہ بجے ملیں۔ برطانوی افسروں کے چہرے غم و غصے اور ناکامی کے احساس سے گویا جل رہے تھے مگر ان کی زبانوں پر اشرف بیگ کے لیے گالیوں اور دشنام طرازی کے سوا کچھ نہ تھا۔

"اشرف بیگ کون ہے؟"

"یکایک یہ اشرف بیگ کہاں سے آگیا؟"

"اس شخص نے کمپنی کی رسوائی کی ہے۔"

"اشرف بیگ قاتل ہے۔"

"اشرف بیگ چور ہے۔"

"اشرف بیگ کو گلوٹین (پھانسی کے شکنجے) میں کس دیا جائے۔

مگر اشرف بیگ کہاں تھا، جو ان کے ہاتھ آتا۔ وہ تو ایک چھلاوا تھا۔ اس کا کوئی ایک ٹھکانہ تھوڑا ہی تھا۔ وہ تو بجلی کی طرح ادھر سے ادھر نکل جاتا تھا۔ جب کبھی اشرف بیگ نے خود ہی چاہا کہ وہ کسی برطانوی افسر یا فرد سے ملے تو وہ ظاہر ہوگیا مگر اس کو ڈھونڈ نکالنا ممکن نہ تھا۔ وہ شاید کسی ایک مقام پر ٹکتا ہی نہ تھا۔ وہ جس قدر محتاط تھا، اس سے مجھے یہی امید تھی کہ وہ اب ان غاروں کو بھی چھوڑ چکا ہوگا، جہاں میری اور اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

کیا وہ کوئی چور یا ڈاکو تھا؟ اگر وہ چور تھا تو ہم برطانوی بھی کچھ کم نہ تھے۔ ہم نے بھی تو دنیا کے چپے چپے پر خوشحال علاقوں اور سرسبز زمینوں کو اپنے تصرف میں لے رکھا تھا۔ ہم ان پر قابض تھے اور فقط اپنی طاقت کے بل بوتے پر اس قبضہ کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اگر اشرف بیگ نے ہمیں آنکھیں دکھائیں تو کیا برا کیا تھا۔ اگر اس نے سوئز کمپنی کے منافع کی رقم لوٹ لی تھی تو وہ چوری تھی؟ یا اس نے ڈاکوؤں کے مالِ غنیمت سے اپنا حصہ نکال لیا تھا؟

ہاں، قتل، جو اس کے آدمیوں نے کیے۔ وہ ایک گھناؤنا جرم تھا۔ اسے یہ حق نہ تھا کہ سانس لیتے ہوئے جیتے جاگتے انسانوں کو موت کی نیند سلائے۔ آخر یہ تینوں افسر فقط برطانوی تو نہ تھے۔ یہ کسی ماں کے بیٹے بھی تھے۔ کسی باپ کے بڑھاپے کا سہارا بھی تو تھے، کسی بہن کو ان کی واپسی کا انتظار بھی تو رہا ہوگا، کوئی بھائی ان کی قوت کو اپنی طاقت

بھی تو سمجھتا ہوگا۔ انسانی زندگی کے ساتھ انسان کو صرف زندگی اور جسم ہی تو نہیں ملتا، اس کو جذبے اور احساسات بھی تو ملتے ہیں۔ قتل ان جذبوں کی روح تک کو کھینچ لیتا ہے۔ انسانی جسم کی موت ان تمام بے نام سے احساسات کو بھی سسکا سسکا کر مار دیتی ہے، جنکی تپش اور جن کی ٹھنڈک سے پوری زندگی کے ہر ہر سانس میں دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ میں اشرف بیگ سے اب اس لیے سخت متنفر تھا کہ اس نے تین انسانوں کی جان لے لی تھی۔ کاش! اسے کوئی سمجھا سکتا۔ کاش! یہ سہاری لونی شفقتوں کی کرنیں اس پر بکھیر سکتا اور کاش! جذبۂ حب الوطنی کے نام پر جو سفاکیت اشرف بیگ میں پیدا ہو رہی تھی، اس کو روکا جا سکتا۔ کاش! وہ ظالم بننے کے بجائے مظلوم بنے رہنے کو ترجیح دیتا۔ بہر حال، اب تو حقیقت یہ تھی کہ تین برطانوی افسر مر چکے تھے۔ وکٹوریہ غرق ہو چکا تھا اور ایک کروڑ پونڈ اشرف بیگ کے قبضے میں جا چکے تھے۔

کرنل گوور اب قاہرہ میں سب سے بڑا فوجی افسر تھا۔ چنانچہ اس نے عدن اور مالٹا سے کمک بھجوانے کا حکم صادر کیا۔ تیز رفتار قاصد بری اور بحری راستوں سے قرب و جوار کی برطانوی کالونیوں کو روانہ کیے۔ یمن، صلالہ، بحرین، کویت، صحرائے نجد، سوڈان، عراق اور شام کے علاقوں میں جہاں جہاں بھی برطانوی فوجی جس جس حیثیت میں موجود تھے سب کو طلب کرنے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ کرنل گوور کا خیال تھا کہ اگر نہر سوئز ہاتھ سے نکل گئی تو سوئز کے مشرق اور جنوب کے تمام برطانوی مقبوضات سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

کرنل گوور نے اپنے فوجی دستے سوئز کنال سے قریباً چالیس پچاس میل ہٹا کر تعینات کر دیئے تھے۔ یہ وقت تھا کہ مصر میں کوئی بھی طاقت ور سلطان ہوتا یا مصر میں کوئی قومی حکومت موجود ہوتی تو برطانوی اقتدار کو سنگین نتائج بھگتنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ اشرف بیگ کے آدمی مسجدوں اور بازاروں اور عوامی اجتماع کے مقامات پر تقریریں کرتے اور مصریوں کو جوش و غیرت دلا کر اس بات پر مجبور کر رہے تھے کہ فقط ایک جرأت رندانہ کی ضرورت ہے کہ مصر سے برطانیہ کو باہر نکالا جا سکتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اب مصر میں متعین کوئی بھی قابل ذکر برطانوی عہدہ دار یا بڑا افسر موجود نہ تھا۔ لے دے کر ایک کرنل گوور ہی تھا جو بڑی بہادری اور استقلال سے جان ہتھیلی پر رکھے ابھی تک اپنی سی کوشش کیے جا رہا تھا۔

ہم برطانوی اب صرف اس بات پر انحصار کیے ہوئے تھے کہ اگر سلطان توفیق والئی

مصر نے کوئی جرأت مندانہ اقدام کر دیا تو مصر سے برطانوی اقتدار کو ختم کرنا مشکل نہ ہوگا اور اگر سلطان اسی گومگو اور تذبذب یا برطانوی قوت کے رعب میں رہا اور چند ہفتے بھی اسی طرح گزر گئے تو پھر ظاہر ہے مصر کے چاروں طرف برطانوی فوجی قوت کی یلغار شروع ہو جائے گی۔ اور اشرف بیگ کی تحریک پیالی کے طوفان کی طرح بیٹھ جائے گی۔

یہ زمانہ بڑا شورش کا تھا۔ عوام گوروں کے خلاف ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا غصہ اور ان کا قہر بلت بلت پر ظاہر ہو جاتا تھا۔ اشرف بیگ کے آدمی ہر جگہ اس آگ کو بھڑکا رہے تھے۔ اور جہاں جہاں موقع ملتا تقریریں کرتے اور مصریوں کو ابھارتے کہ جس طرح ممکن ہو ایک قومی یا ملی فوج بنا کر برطانوی فوجیوں کو ملک سے باہر نکال دیا جائے۔

ہم لوگ عموماً اپنے ریسٹ ہاؤس ہی میں رہتے تھے۔ باہر نہ نکلتے تھے کیونکہ عوام کے جذبات بڑے مشتعل تھے۔ گوروں کے خلاف اکا دکا خنجر زنی اور اقدام قتل کی وارداتیں ہو چکی تھیں، اس لیے سر جان مارشل اور ہم لوگوں کو یہی ہدایت کر رکھی تھی کہ حتی الامکان عوامی اجتماعات کی جگہوں پر جانے سے اجتناب کیا جائے۔

ایک دن جمعہ کی نماز سے ذرا قبل مجھے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت شدید طور پر پیش آئی۔ دراصل تین چار دن سے مجھے بخار کی شکایت چل رہی تھی مگر بات معمولی تھی۔ اس لیے میں نے کوئی دوا وغیرہ ضروری نہیں سمجھی۔ جمعہ کی صبح ہی سے مجھے الٹیوں کی شکایت شروع ہوئی۔ جسم میں اینٹھن اور جوڑ جوڑ میں شدید درد سا سرایت کرنے لگا۔ چاروناچار میں نے جان پر بنتی دیکھی تو خود ہی ڈاکٹر کے پاس جانے کا سوچا۔ میں نے نہ تو روسی کو کوئی اطلاع دی اور نہ ہی جان مارشل کو اور تنہا ہی ڈاکٹر کی تلاش میں نکل گیا۔ ریسٹ ہاؤس کے ایک بیرے سے معلوم ہوا تھا کہ وہاں سے کوئی دو تین فرلانگ کے فاصلے پر ایک معالج کا مطب ہے۔ وہ اچھا ڈاکٹر ہے۔ میں نے اسی کی طرف جانے کا قصد کیا۔

میں گرتا پڑتا اس مطب کی طرف جا رہا تھا کہ ایک جگہ اس زور سے دل پر مالش سی ہوئی اور اس قدر سخت الٹی آئی کہ میرا سینہ اور آنتیں باہر نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں دیوار کا سہارا لے کر ایک مکان کی سیڑھیوں تک چلا۔ وہاں پانی کے دو تین نل لگے دکھائی دے رہے تھے۔ اندر جا کر معلوم ہوا یہ کوئی مکان نہ تھا بلکہ ایک بڑی احاطہ والی مسجد تھی۔ اس وقت مسجد میں کوئی نہ تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا۔ ہاتھ منہ دھویا۔ گندگی صاف کی اور وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ کچھ تو کمزوری اور کچھ متلیوں کی شدت نے ایسا نڈھال کیا کہ میں

فرش پر لیٹے لیٹے ہی بے سدھ ہو گیا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب ایک بڑا مجمع میرے گرد جمع ہو چکا تھا۔ اور نہ جانے کیا کیا میرے متعلق آپس میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ سن رہا تھا۔ انہی کے شور و شغب سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو پھر ایک متلی سی آئی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ دل جیسے بیٹھنے پر تل گیا ہو۔ ابکائیاں آتی تھیں اور بار بار پانی اور لعاب اور غذا کے غیر ہضم شدہ ریشے منہ سے نکل آتے تھے۔ میرے آس پاس کا فرش اور میرا جسم، سب کا سب، اس غلاظت سے آلودہ ہو چکا تھا۔

نمازیوں کا مجمع جو ویسے ہی میرے اس طرح لیٹنے پر غصہ تھا اب اس بے ادبی کے بعد مسجد کے فرش پر گندگی پھیلائے جانے کی وجہ سے اور بھی برافروختہ ہو گیا۔ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

"چل باہر نکل۔ تجھے گندگی پھیلانے کے لیے یہی ایک جگہ ملی تھی۔"

"غلیظ پانی کا غلیظ کیڑا۔"

"اسے کس نے مسجد میں گھس آنے دیا؟"

"غضب خدا کا، یہ کافر گورے اب ہماری مسجدوں کو بھی ناپاک کرنے لگے۔"

غرض کسی نے مجھے دھکا دیا اور کسی نے تھپڑ مارا، کسی نے گھونسا رسید کیا۔ اور اسی طرح رگیدتے ہوئے مجھے مسجد کے دروازے سے باہر نکال دیا۔ میں لاکھ کہتا رہا کہ میں ایک بیمار آدمی ہوں، ڈاکٹر کی تلاش میں نکلا تھا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ دروازے کے باہر بھی مجھے کسی نے دھکا دیا یا میں خود ہی لڑکھڑا کر گرنے والا تھا۔ شاید اس طرح میرا سر بھی پھٹ جاتا کہ سیڑھیوں سے اوپر آتے ہوئے کسی مہربان کے ہاتھوں نے مجھے سہارا دے کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو یہ شیخ سپاہی تھا۔ اشرف بیگ کے گروہ کا ایک اعلیٰ منصب دار۔ اسی نے ایک بار پہلے بھی میری زندگی بچائی تھی۔ اب بھی وہی رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ اس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا جو بخار سے تپ رہی تھی۔ جسم اور کپڑے تمام کے تمام غلاظت اور بدبو سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر اس حالت میں بھی وہ مجھے سہارا دے کر سیڑھیوں سے اوپر لایا اور پھر مجھے ایک طرف کونے میں لٹا دیا۔

مجمع میرے قریب پھر جمع ہو گیا۔ شیخ سپاہی کی موجودگی میں وہ سب کے سب

خاموش اور بالکل مؤدب کھڑے تھے مجھ سے شیخ نے پوچھا کہ یہ حالت کیسے ہوئی تو میں نے مختصراً سب کچھ اسے بتا دیا۔ میرے سر میں شدید درد اٹھ رہا تھا اور تھکان الگ بڑھ رہی تھی۔ مجھ پر غفلت یا بے ہوشی سی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اس عالم میں بھی اپنے حواس پر میں نے قابو رکھا شیخ سباعی کی باتیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ وہ مجمع سے کہہ رہا تھا۔

"مسلمانوں! نمازیو! تمہاری مسجد میں خدا کا ایک غریب الوطن بیمار بندہ داخل ہوا اور تم نے اس کو دھکے دے کر باہر پھینک دیا۔ یہ ظلم تم نے کیوں کیا؟ کیا یہ شخص تمہاری توجہ اور تمہارے رحم کا مستحق نہ تھا؟"

"اس شخص نے مسجد میں سو کر مسجد کی بے ادبی کی، پھر مسجد میں گندگی پھیلائی اور پھر جب کہ نمازی مسجد میں آ کر صفیں درست کر رہے تھے تو اس نے بے ہوش ہو جانے کی اداکاری شروع کر دی۔ یہ کافر طرح طرح کے ڈرامے رچا کر ہماری زندگی کے ہر شعبے میں ہماری ذلت پر تلے ہوئے ہیں۔"

"تم میں سے کسی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بھی دیکھا تھا یہ تو بخار میں جل رہا ہے، یہ تمہاری ہمدردی کا مستحق تھا۔" شیخ سباعی کے الفاظ تھے۔

"شیخ! تم ہی تو کہتے ہو کہ یہ گورے کسی ہمدردی کے مستحق نہیں، یہ غاصب ہیں، لٹیرے ہیں، انہوں نے ارض مصر میں ہم سے ہماری حکومت اور قوت چھین لینے کی سازش کی ہے۔ پھر ان کا تو قتل تک جائز ہونا چاہیے!"

"ہماری جنگ بیماروں، بچوں اور بغیر ہتھیار والوں سے نہیں ہوتی۔ ہم تو جنگ میں بھی ایسے لوگوں پر ہتھیار نہیں اٹھاتے جن کے ہاتھ میں ہتھیار نہ ہوں۔ یہ تو ایک نوجوان ہی ہے اور پھر بیمار ہے۔ اس سے ساری دشمنیاں نکالنا کہاں کی جوانمردی ہے۔ اسلام اتنا تنگ نظر نہیں ہے جتنا تم لوگ اسے ظاہر کر رہے ہو!"

"شیخ! اب نماز کی امامت کرو، وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اس قصہ کو ہم لوگ بعد میں دیکھیں گے۔"

شاید یہی آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ اور جب میں دوبارہ ہوش میں آیا تو اپنے ریسٹ ہاؤس والے کمرے میں تھا اور روسی اور سرجان دونوں میرے قریب موجود تھے مجھے بے حد کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور میں شاید اب

یک بخار میں مبتلا تھا۔

میلکم! خدا کا شکر ہے کہ تم ہوش میں آ گئے ہو۔ پورے ایک دن یہ ڈاکٹر صاحب تمہاری نگہداشت کرتے رہے ہیں۔ اب کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"نہیں اب میں کافی بہتر ہوں۔ مجھے یہاں کون لایا تھا؟"

"ایک بوڑھا شخص وہ تمہیں اپنا بیٹا کہتا تھا۔ بڑا ہی نیک اور رحم دل شخص معلوم ہوتا تھا۔"

"اچھا! شیخ سیاحی ہی نے مجھے یہاں پہنچایا ہوگا۔"

پھر میں آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتا چلا گیا۔ کئی دنوں کی تیمارداری کے بعد جب میں درست ہوا تو پتہ چلا کہ مجھے سخت قسم کا ہیضہ ہو گیا تھا۔ اور ڈاکٹر کا خیال تھا کہ میرا زندہ بچ جانا کسی معجزہ سے کم نہ تھا۔ اگر بروقت طبی امداد نہ ملتی تو بقول ڈاکٹر میری موت یقینی تھی۔

گویا اس بار پھر شیخ سیاحی نے مجھے موت کے منہ سے نکالا تھا۔ یہ اس کا مجھ پر دوسرا احسان تھا۔

مجھے ٹھیک ہونے میں کوئی دس بارہ دن لگ گئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا اس دوران برطانوی فوجیں بہت بڑی تعداد میں اسکندریہ میں آچکی تھیں اور سلطان توفیق نے معاہدے کے خلاف ایک ذرہ برابر بھی قدم نہ اٹھایا تھا گویا اشرف بیگ کی جیتی ہوئی جنگ سلطان توفیق نے ہار دی تھی۔

سلطان توفیق نے گویا محب وطن عناصر کی نہ ہمت افزائی کی اور نہ درپردہ کسی قسم کی کوئی مدد ان کو بہم پہنچائی۔ محسن بدری دبے دبے الفاظ میں اس سے کہتا تھا کہ برطانوی سامراج اپنے پنجے ارض مصر میں گاڑ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کے پنجے سے نکلنا مشکل ہو جائے ایک بھرپور جدوجہد کا آغاز کر دینا چاہیے۔ بلکہ، اس نے کہا کہ عوام نے آغاز تو کر ہی دیا ہے۔ اگر سلطان نے عوام کی امنگوں کے مطابق عمل کیا تو وہ مصریوں کا ہیرو بن جائے گا۔ مگر سلطان توفیق کو برطانوی طاقت سے ڈر ہی لگتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس نے ذرا سی بھی بے احتیاطی کی تو برطانوی ڈپلومیسی اس کی جگہ کسی اور کو ارض مصر کا تاج پہنا دے گی اور وہ اس آرام اور پرتکلف شاہانہ زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

اس کش مکش میں اس نے دس بارہ دن گزار دیے۔ نہ فوجیوں کو تیاری کا حکم دیا نہ

اشرف بیگ کو کسی قسم کی مدد پہنچائی۔ بس لے دے کر اس نے اسی پر اکتفا کیا کہ اشرف بیگ کو گرفتار کرنے کے لیے کوئی قابلِ ذکر سخت احکام جاری نہیں کیے۔

اگست ۱۹۰۰ء کا ہی زمانہ تھا کہ جب ہمیں سخت غیر اطمینان بخش حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسی ماہ میں گویا مصر میں برطانوی قوت و اقتدار کو نئی زندگی ملی تھی۔ اب جب کہ اردگرد کے تمام علاقوں سے ہماری فوجیں مصر پہنچنے لگی تھیں تو ہمارا دبدبہ اور ہماری شوکت و شان پھر سے مصریوں کو مرعوب کرنے لگی تھی۔ فوجوں کے مصر میں پہنچتے ہی کرنل گورز نے جو فوجی دستے اشرف بیگ کے الٹی میٹم پر نہر سوئز سے پچاس میل دور پیچھے ہٹا لیے تھے دوبارہ اپنی پرانی پوزیشن پر تعینات کر دیئے اور اس بار تین مزید چوکیاں قاہرہ کے قرب و جوار میں قائم کر دی گئیں۔

برطانوی فوجوں کے مصر آتے ہی اشرف بیگ کی نئے سرے سے تلاش شروع کر دی گئی۔ مصری سپاہی اور مصری فوجی کمپنی کے گوروں کے ساتھ مل کر جگہ جگہ چھاپے مارتے تھے مگر اشرف بیگ کو ان کے ہاتھ نہ آنا تھا نہ آیا البتہ دکھاوے اور عبرت کے لیے ہر چھاپے میں دس پانچ جوشیلے نوجوانوں کو پولیس ضرور پکڑ کر لے جاتی تھی۔ اور عقوبت خانوں میں ان پر سخت تشدد بھی کیا جاتا تھا۔ گورے فوجی افسر اس تشدد کے وقت موجود رہتے تھے۔ مگر کسی جگہ بھی سلطان توفیق کو سرخروئی حاصل کرنے کا موقع ہاتھ نہ آیا۔ بلکہ عوام میں سلطان کے خلاف نفرت اور بغاوت کے جذبات بڑھتے گئے اور لوگ کھلم کھلا اس کو بزدل، غدار اور برطانیہ کا مہرہ سمجھنے اور کہنے لگے تھے۔

باب نمبر ۱۴

ریذیڈنٹ نے فوری طور پر والئی مصر سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس ملاقات میں کیا گفتگو ہوئی، کن کن مراحل سے بات چیت گزری، اس کا تو کچھ علم نہ ہوسکا۔ البتہ اس نے والئی مصر کو دھمکی دے دی تھی کہ یا تو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر قاتلوں، چوروں اور وکٹوریہ کی غرقابی کے ذمہ دار ملزموں کو گرفتار کیا جائے یا پھر سوئز کمپنی کی حفاظت پر مامور برطانوی فوجیں خود ہی مصر میں پھیل جائیں گی تاکہ مجرموں کو ڈھونڈ نکالیں اور ان کو قانون کے مطابق سزا دی جاسکے۔ ریذیڈنٹ کی دھمکی اگلے روز "الاہرام" میں شائع ہوئی، جس سے ہمیں اس سنگین صورتحال کا اندازہ ہوا۔

اسی روز دوپہر کو تقریباً تمام اخبارات کے خاص ضمیمے شائع ہوئے، جن میں دو خبریں نہایت اہم تھیں۔ ایک تو ریذیڈنٹ کے الٹی میٹم کے اخباروں میں چھپنے کے صرف پانچ گھنٹے کے اندر اندر یعنی بارہ بجے دوپہر تک پورٹ سوئز پر مقیم برطانوی فوجیوں کے کیمپ میں دو بم پھٹے، جس سے کوئی ڈیڑھ سو فوجی مارے گئے اور بے شمار زخمی ہوئے۔ دوسری خبر یہ تھی کہ سوئز کمپنی کے تینوں ڈائریکٹر، جو قاہرہ میں مقیم تھے، ریذیڈنٹ کے الٹی میٹم کے فوراً بعد قتل کر دیے گئے اور تینوں کی لاشوں کے قریب اشرف بیگ کی طرف سے، ریذیڈنٹ کے نام خط لکھے ہوئے ملے، جن پر تحریر تھا کہ اگر دو گھنٹے کے اندر اندر ریذیڈنٹ نے والئی مصر سے مل کر اپنا الٹی میٹم واپس نہ لیا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

ادھر ریذیڈنٹ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پورٹ سعید سے اپنی فوجوں کو قاہرہ کی طرف مارچ کرنے کی اسکیم مرتب کر چکا تھا۔ اس نئی صورتحال نے اسے بالکل ہی سراسیمہ کر دیا۔ اب ڈائریکٹروں کے مارے جانے کے بعد وہ خود ہی کمپنی کے تمام معاملات کا، کمپنی کی فوج کا اور ان برطانوی شہریوں کا، جو مصر میں مقیم تھے، محافظ و منتظم تھا۔ اس کی اب بولی بھی بہت قیمتی تھی۔ پھر جان کسے پیاری نہیں ہوتی؟ اس کی پشت پر جو برطانوی فوجی طاقت تھی، وہ ساری کی ساری سوئز یا اسکندریہ میں مقیم تھی اور قاہرہ

میں فقط ایک چھوٹا سا دستہ حفاظت کے لیے موجود رہتا تھا۔ پورٹ سعید پر بھی کچھ برطانوی فوجی مقیم ہوتے تھے مگر چونکہ مصر کے سیاسی حالات یا عوام کی طرف سے کبھی کسی قسم کی جدوجہد کی یا کسی مخالفت کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی نہیں ملی تھی، اس لیے مصر میں مقیم برطانوی فوج کی کل تعداد تین چار ہزار کی نفری سے کبھی زیادہ نہیں رکھی گئی۔ اس میں سے بھی گورے فوجیوں کی تعداد فقط نصف کے قریب تھی۔ باقی مالٹا، جبرالٹر اور ہندوستان کے گورکھے تھے، جو اپنے آقاؤں کے حکم پر ہر وقت جان دینے اور جان لینے کے لیے تیار اور مستعد رہتے تھے۔

پورٹ سوئز پر برطانوی فوجیوں کے کیمپ میں بم پھٹ چکا تھا اور سراسیمگی اپنی انتہا پر تھی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ مصر میں ان کی مخالفت میں اتنا بڑا اقدام بھی ہوسکتا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا، جیسے کھلے ہوئے نیلے آسمان پر بادل کا صرف ایک ٹکڑا ہی آکر بارش برسا جائے۔ برطانوی فوجیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ ان کو جمع کرنا، منظم کرنا اور پھر فوری طور پر اشرف بیگ کے مقابلے کے لیے تیار کرنا اگر برق رفتاری سے بھی انجام دیا جاتا تو بھی بارہ چودہ گھنٹے سے کم کا کام نہ تھا۔ ریزیڈنٹ نے جس وقت والیٔ مصر کو چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دیا تھا اسی وقت اس نے پورٹ سوئز میں یہ اطلاع بھجوائی تھی کہ فوری طور پر قاہرہ میں ایک ہزار فوجی روانہ کیے جائیں۔ شام کو چار بجے ڈائریکٹروں سے اس نے اپنی میٹنگ طے کی تھی تاکہ اشرف بیگ کو گرفتار کرانے کے لیے جو صورتحال پیدا ہورہی تھی، اس پر مل کر غور کیا جاسکے مگر اب دوپہر کو ایک بجے تک صورت یوں تھی کہ ڈائریکٹر قتل ہوچکے تھے۔ چنانچہ کسی بھی میٹنگ کا اب کوئی انتظام نہ تھا۔ ادھر جو فوجی سوئز سے آنے والے تھے، ان کو بلانے کا فیصلہ بھی دانشمندانہ نہ تھا۔ کیونکہ بم پھٹنے کے بعد یہ ہی نظر آتا تھا کہ اشرف بیگ یا اس کے آدمی بیک وقت قاہرہ میں اور پورٹ سوئز پر یکساں طور پر مصروفِ عمل ہیں۔ ان کا دائرہ کار بہت پھیل گیا تھا۔ اس طرح سے پورٹ سوئز سے قاہرہ تک کے سفر میں فوجیوں کو ہر وقت خطرے کا سامنا تھا۔

صورتحال شاید اتنی خطرناک نہ ہوتی اگر برطانیہ کی فوجی قوت کو دشمن کے متعلق کچھ تھوڑی بہت معلومات بھی ہوتیں۔ اشرف بیگ کون تھا، کہاں سے آیا تھا، اس کی فوجی طاقت کتنی منظم تھی، اس کو اسلحہ کہاں سے مل رہا تھا۔ یہ سب کچھ ابھی مکمل تاریکی میں تھا اور برطانوی فوج کا اس بارے میں علم نہ ہونے کے برابر تھا۔

ریذیڈنٹ کو اپنے الٹی میٹم کے جواب میں اتنی سخت مدافعت کی کوئی امید نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ چوبیس گھنٹے گزرنے سے قبل ہی ولیٔ مصر خود اس کے پاس رابطہ قائم کرے گا اور مزید مہلت مانگے گا، جو دے دی جائے گی۔ اس دوران میں مالٹا اور جبرالٹر کے فوجی اڈوں سے برطانوی سپاہی بلا لیے جائیں گے۔ ولیٔ مصر پر دباؤ بڑھا دیا جائے گا اور اس کی فوج اور پولیس اپنی جان اور تخت و تاج کی حفاظت کی خاطر اشرف بیگ کو خود ہی فرور ڈھونڈ نکالیں گے۔

اشرف بیگ نے ولیٔ مصر کی طرف سے الٹی میٹم کا جواب دیا اور جس طرح دیا، وہ فقط زبانی تھا بلکہ ثبوت میں تین برطانوی ڈائریکٹروں کی لاشیں بھی پیش کی تھیں۔ ب صورتحال بالکل بدل چکی تھی۔ بازی کا رخ اشرف بیگ کے حق میں تھا۔ ولیٔ مصر بظاہر فوج اور پولیس کو اشرف بیگ کی گرفتاری کے لیے احکامات صادر کر چکا تھا، جس کی تعمیل میں اس کے وفادار کتے ہر طرف دوڑ رہے تھے مگر دل ہی دل میں وہ خوش تھا کہ کسی طرف سے سہی مگر اس کمپنی کی مخالفت میں کوئی آواز تو اٹھی۔ کمپنی نے ارضِ مصر میں اپنی فوجیں بلا کر گویا ایک متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ گورے فوجی شراب پی کر نائٹ کلبوں میں جاتے تھے اور اودھم مچاتے تھے اور بازاروں اور گلیوں میں پر ہجوم مقامات پر مصریوں سے الجھتے تھے اور ہر قدم پر یہ ثابت کرتے رہتے تھے کہ مصری ان کے سامنے ایک مفتوح قوم کے افراد میں سے ہیں۔ وہ متکبر، مغرور اور حد سے زیادہ بد دماغ تھے۔ چنانچہ ان کے خلاف نفرت عام تھی۔

ریذیڈنٹ نے برطانوی فوج کے کمانڈر کو جو قاہرہ میں مقیم تھا، اس سے صورتحال پر مشورہ کرنے کے لیے اپنے گھر مدعو کیا۔ تین بج چکے تھے اور اشرف بیگ کا دیا ہوا دو گھنٹے کا وقت گزر چکا تھا۔ برطانوی بریگیڈیر اور اس کا ایک کرنل ریذیڈنٹ سے معروفِ گفتگو تھے۔ یہ گفتگو چار بجے تک چلی۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ نے اس کانفرنس روم میں، جس کے باہر فوجی پہرا تھا، چائے طلب کی۔

باورچی خانے سے فوری طور پر تین ملازم اندر آئے۔ ایک نے بڑی میز کو صاف کرنا شروع کیا۔ دوسرے نے تین آدمیوں کے لیے چائے کے برتن لگانے شروع کیے اور تیسرے نے میز پر پھل اور خشک میوے سجانے شروع کیے۔ تینوں آدمی جیسے ہی میز لگا کر پلٹے کہ یکایک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہ تینوں ان افسران کے سروں پر جا پہنچے اور اپنی

تلواریں، جو ڈھیلی ڈھالی عباؤں میں چھپی ہوئی تھیں، نکال کر بریگیڈیر اور کرنل پر آزمائیں۔ ایک لفظ ان دونوں بدقسمتوں کے منہ سے نہ نکل سکا۔ گردنیں کٹ کر الگ ہو گئیں اور ساری میز کرسی اور قالین خون میں ڈوب گئے۔ ریذیڈنٹ کو اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا۔ اس کے سینے پر بھی تلوار کی نوک رکھی ہوئی تھی۔ اس نے چیخنا چاہا مگر تلوار کی نوک اس کے سینے میں ذرا سی اور اندر جا چکی تھی۔ خون نکلنے لگا تھا۔

"بالکل خاموش رہو اور غور سے سنو۔ جس طرح یہ دو آدمی مارے گئے ہیں، تم بھی ابھی ختم کیے جا سکتے تھے مگر سردار اشرف بیگ نے تمہیں زندہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔"

خوف اور دہشت سے ریذیڈنٹ کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل رہی تھیں اور عقل ماؤف ہو چکی تھی۔ دونوں آدمیوں نے تلوار کو صاف کر کے پھر عبا میں چھپا لیا تھا اور اب جیب سے رسی کو نکال کر ریذیڈنٹ کو اسی کی کرسی پر جکڑ دیا گیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔

"سنو تمہارے لیے سردار اشرف بیگ کا حکم یہ ہے کہ ابھی ایک گھنٹہ کے اندر اندر والیٔ مصر کے محل پہنچو۔ اس سے الٹی میٹم واپس لو معافی مانگو اور اعلان کر لو کہ کمپنی اور حکومتِ مصر کے درمیان یہ طے پایا ہے کہ پورٹ اسکندریہ، پورٹ سعید اور پورٹ سوئز سے برطانوی فوجیں ہٹ کر جنوب میں نحاس کے قصبہ میں جمع رہیں گی، جو سوئز کنال سے ۷۰ میل دور ہے اور یہ کام کل تک مکمل ہو جانا چاہیئے ورنہ کل جو برطانوی فوجی جہاں جہاں ہلاک ہوں گے، ان کا خون تمہاری گردن پر ہو گا اور اگر ایک گھنٹہ کے اندر اندر یہ اعلان شاہی محل سے جاری نہ کیا گیا اور تم نے بھی اپنی فوجوں کو یہ حکم نہ بھیجا تو تمہیں بھی قتل کر دیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ تینوں آدمی اسی طرح جانے کے قابل برتن اور پلیٹیں وغیرہ اٹھا کر کمرہ بند کر کے واپس چل دیے مگر جاتے جاتے وہ ریذیڈنٹ کے منہ میں خوب سا کپڑا بھرنا نہیں بھولے تھے۔

ریذیڈنٹ دو لاشوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ باہر اس کے فوجی تعینات تھے، جو بدستور پہرہ دے رہے تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ اندر کیا کچھ ہو گیا ہے۔ کچن کے ملازمین، جس طرح سر جھکا کر برتن لائے تھے، اسی طرح سر جھکا کر غلامانہ انداز سے واپس بھی جا چکے تھے۔

اشرف بیگ کا دیا ہوا ایک گھنٹہ بڑی سرعت سے گزر رہا تھا۔ ریذیڈنٹ کے سینے سے جہاں اشرف بیگ کے آدمی نے اس کی چیخ روکنے کے لیے تلوار کا دباؤ ڈالا تھا، خون رس رہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ باہر سے کوئی آدمی اندر نہیں آئے گا، جب تک اس کو حکم نہ ہو۔ ہائی پاور ڈیٹنگ کے درمیان کانفرنس روم میں جب تک سرخ بلب باہر جلتا رہتا تھا۔ صرف چائے یا کھانے کے لیے ملازمین اندر آسکتے تھے یا ریذیڈنٹ کا سیکریٹری اندر آسکتا تھا۔ وہ بھی اگر کوئی شدید نوعیت کی خبر یا فوری ضرورت کا پیغام پہنچانا مقصود ہوتا۔

ریذیڈنٹ کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ موت کس قدر قریب آکر گزر گئی تھی اور زندگی کیسی بے وقعت سی تھی۔ ابھی چند لمحے پہلے وردیوں میں ملبوس دو اعلیٰ فوجی افسر، جو اپنے تمغوں سمیت آئے۔ بہادری کے نشان سینوں سے لگائے سو رہے تھے۔ ابھی والیٔ مصر اور اشرف بیگ کو سزا دینے کے پر جوش الفاظ منہ میں ہی تھے۔ ان کی بازگشت بھی کمرے سے ماند نہ پڑی تھی کہ تلواروں کے بیک وقت دو نپے تلے ہاتھوں نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اشرف بیگ کا تیسرا آدمی اس کو بھی صرف ایک لمحہ میں ختم کر سکتا تھا مگر اس کی جان بخشی کر دی گئی تھی۔

کیوں..... کیوں.....؟ اس کو زندگی کیوں بخشی گئی؟ اب ریذیڈنٹ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ برطانوی فوجیں سوئز کنال سے دور ہٹا دی جائیں۔ سوئز کا کنٹرول مصریوں کے اپنے ہاتھ میں واپس آجائے۔ والیٔ مصر کے اقتدار اعلیٰ میں کوئی اور شریک نہ رہے۔ اگر بالفرض ایسا ہو بھی جاتا تو بھی کمپنی کے ڈائریکٹر، جو لندن میں تھے اور کمپنی کا معاہدہ، جو والیٔ مصر سے تھا اور کمپنی کی فوجیں، جو مصر میں تھیں، وہ سب کا سب ایک مکمل نظام تھا اور ایک مکمل معاہدے کے تحت عمل میں آیا تھا۔ یہ نظام کسی ایک فوری اور ہنگامی صورت حال میں ختم نہ کیا جا سکتا تھا۔ اگر فوری طور پر اشرف بیگ کے احکامات مان بھی لیے جاتے تو بھی کمپنی اپنی ساکھ کو دوبارہ پوری قوت سے نافذ کرا سکتی تھی۔

مگر..... فی الحال تو مسئلہ منہ میں شعلے ہوئے کپڑے کو باہر نکال کر آزاد ہونے اور والیٔ مصر کے محل میں پہنچنے کا تھا ورنہ پھر ایک گھنٹے کے بعد تو اشرف بیگ کے آدمی اس کی جان لینے کے لیے دیواروں اور چھتوں سے نکل آئیں گے۔ اشرف بیگ کیا بلا تھا؟ اشرف بیگ! اشرف بیگ! جیسے جیسے ریذیڈنٹ کے حواس درست ہو رہے تھے اور واپس لوٹ رہے تھے، اس کے دل و دماغ پر یہ نام اپنی پوری گھن گرج کے ساتھ ہتھوڑوں کی

طرح برس رہا تھا۔ یہ نادیدہ دشمن یقیناً بڑے دل گردے کا آدمی تھا۔ بڑا اچھا منصوبہ ساز تھا۔ اس آدمی نے صرف دو دن کے اندر ہی اندر تاجِ برطانیہ کو مصر میں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ اس نے سرجان مارشل کی ٹیم کے ایک ممبر کے بارے میں حکومتِ برطانیہ کی ایک خفیہ ہدایت کو اڑالیا اور اسے مجھے (جان میلکم کو) دکھا کر حکومتِ برطانیہ سے وفاداری کو مشکوک بنادیا۔ اس نے اسی رات کو سرجان مارشل کو سوئز کمپنی کی طرف سے دی گئی ایک عملی مہم کی رقم سے محروم کردیا۔ اس نے برطانیہ کی سوئز کمپنی کے جہاز وکٹوریہ سے چھ ماہ کی کمپنی کی منافع کی رقم پر ہاتھ صاف کردیا اور جہاز کو ڈبو دیا اور والیٔ مصر کے وقار کو بچانے کے لیے ریذیڈنٹ کے الٹی میٹم کے جواب میں تین ڈائریکٹروں اور دو اعلیٰ فوجی حکام کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ برطانیہ کے اقتدار کو شاید پچھلے پچاس سال میں بھی ارضِ مصر پر اس قدر شدید دھچکے نہیں پہنچے۔ برطانیہ کا خیال تھا کہ مصری ایک سست اور بزدل قوم ہے۔ اس کے امراء عیاش اور سیاسی بصیرت سے محروم ہیں۔ اس کی فوجیں ناکارہ ہیں اور جنرل اور اعلیٰ عہدے دار فقط قالینوں کو روندنے والے قدم رکھتے ہیں۔ وہ قدم نہیں رکھتے، جس سے میدانِ جنگ میں دھمک پیدا ہوتی ہے اور جن سے طوفانوں کے دل لرزتے ہیں۔ اسی سیاسی اور سماجی پس منظر میں برطانیہ نے مصر میں فقط دو بریگیڈ یعنی کل چار ہزار فوجی تعینات کیے تھے۔ جو بظاہر برطانوی کمپنی کی حفاظت اور نہرِ سوئز کی دیکھ بھال پر مقرر تھے۔ یہ ان کی ظاہری ڈیوٹی تھی مگر دراصل ان کا کام مصر اور سوڈان میں برطانوی اقتدار کے لیے راستہ ہموار کرنا تھا۔

آج پہلی مرتبہ ریذیڈنٹ کو مصر اور مصریوں کے متعلق اپنے اندازے غلط معلوم ہو رہے تھے۔ اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مصری قوم سوئی ہوئی نہیں تھی بلکہ شاید برطانوی قومیں ہی مصر میں خوابیدہ رہی تھیں۔ جب ہی تو وہ آج تک یہ نہ معلوم کر سکیں کہ مصریوں کی مدافعانہ قوتیں کس طرح منظم ہو رہی تھیں یا زیرِ زمین تحریکیں کس قدر تیزی سے ابھر رہی تھیں۔ بہر حال یہ سب کچھ تو اب ایک ثانوی معاملہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ کس طرح آزاد ہو کر والیٔ مصر کے محل تک پہنچے اور اپنا الٹی میٹم واپس لے۔ ورنہ اشرف بیگ کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ وہ اس کو ہر جگہ دبوچ سکتا تھا۔

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ پورٹ سعید جو آرمی کی ایک بٹالین برطانوی ریذیڈنٹ کے حکم پر قاہرہ کی طرف مارچ کر رہی تھی اس کا ایک ہراول سیکشن قاہرہ آ پہنچا تھا اور چونکہ

اس کے کرنل کو فوری طور پر ریذیڈنٹ کو رپورٹ کرنی تھی اس لیے وہ ریذیڈنسی میں پہنچ گیا تھا۔ ریذیڈنٹ نے جیسے ہی وکٹوریہ کی غرقابی کی خبر سنی تھی اس نے ایک طرف تو والئی مصر کو الٹی میٹم دیا تھا اور دوسری طرف اپنی دو بٹالین کو پورٹ سعید اور اسکندریہ کی پورٹ سے قاہرہ آنے کے احکامات بھی بھیج دیئے تھے۔ اسے امید تھی کہ حسبِ سابق والئ مصر کو اپنی فوجی طاقت دکھا کر وہ مرعوب کر سکے گا اور پھر والئ مصر اس کے قدموں پر ایک پالتو کتے کی طرح لوٹ رہا ہوگا۔

چنانچہ کرنل گومز کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے جب ریذیڈنٹ کا سیکرٹری اندر داخل ہوا تو ایک لمحہ کے لیے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کمرے میں خون، سر بریدہ لاشیں اور رسی سے بندھا ہوا اس کا افسر۔ یہ سب کچھ آخر معاملہ کیا تھا مگر پھر فوراً ہی اس نے کرنل کو اندر بلا لیا۔ اور گارڈ جو باہر ڈیوٹی پر تعینات تھے ان کو بھی آواز دی۔ ریذیڈنٹ کے منہ سے کپڑا نکال کر اس کی رسیاں کھول دی گئیں۔ کرنل گومز جس کی ماں پرتگالی اور باپ انگریز تھا ایک مستعد اور چاق و چوبند افسر تھا اس نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا تھا کہ قاہرہ میں مقیم اس کی بٹالین کا انچارج مارا جا چکا تھا۔ چنانچہ فوری طور پر اپنی پوزیشن کے مطابق اس نے احکامات جاری کرنے شروع کر دیے۔ اس نے گارڈز کو جو باہر تعینات تھے اندر بلا کر ان سے ہتھیار رکھوا لیے۔ اور ان کو گرفتار کر لیا۔ ان کے بیان کے مطابق اس دوران میں صرف تین خانساماں اور بیرے کچن سے چائے اور فروٹ وغیرہ لے کر آئے تھے۔ چنانچہ کچن کے ان تینوں ملازمین کی تلاش کی گئی تو وہ کچن سے ملحقہ گودام میں رسیوں سے بندھے ہوئے ملے۔ ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ مگر ظاہر ہے کہ کارروائی فقط ضابطے کی کارروائی تھی۔ بعد میں تحقیقات پر ان سب کو چھوڑنا پڑا۔ البتہ گارڈز کو کورٹ مارشل کے مراحل سے ضرور گزرنا پڑا۔

ریذیڈنٹ نے بغیر کسی لمحہ کو ضائع کیے ہوئے فوراً والئ مصر سے ملاقات کی۔ بارہ گھنٹے کے اندر اندر یہ اس کی دوسری ملاقات تھی۔ اس بار اس کی آواز میں نہ تو وہ گرج تھی جس کا اظہار ہمیشہ ہوتا تھا اور نہ ہی وہ طنطنہ تھا جس کا وہ ہمیشہ والئ مصر کو احساس دلانا ضروری سمجھتا تھا۔

اس نے والئ مصر سے اپنی پچھلی ملاقات کے دوران ہونے والی بات چیت پر ندامت کا اظہار کیا۔ اپنی شرمندگی کے ساتھ ہی اس نے اپنے سخت الفاظ پر معذرت کی۔

الٹی میٹم کو واپس لیا اور نہایت شستہ لہجے میں کہا۔
"ملک معظم! میں اپنے ان درشت الفاظ کی معافی چاہتا ہوں جو میں نے آپ کے حضور کہے تھے۔ کمپنی نے شدید مالی نقصان اٹھایا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ارض مصر میں ہمارے فرائض محدود ہیں۔ ہم فقط نہر سوئز کو ہر قسم کے ٹریفک کے لیے کھلا رکھنے پر مامور ہیں۔ اس کے سوا ہمارا مقصد کچھ اور نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ فقط آپ کی اعلیٰ ظرفی کی بدولت میں آپ کے حضور الٹی میٹم جیسی غلط بات کہنے کی گستاخی کر سکا۔ میں بطور خاص اپنے الفاظ واپس لینے اور اپنی ندامت کا اظہار کرنے کے لیے ذاتی طور پر حاضر ہوا ہوں۔"
"حکومت برطانیہ سے ہمارے جتنے قریبی مراسم ہیں ہم انہیں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ارض مصر میں آپ کی موجودگی کو ہم نے ہمیشہ نہر کی حفاظت کے فرض میں اپنے مددگار کی حیثیت سے دیکھا ہے اور آپ کی جان و مال کی حفاظت ہمارا بنیادی فرض ہے۔ چنانچہ کل اگر آپ بھی نہ آتے جب بھی ہم وکٹوریہ کی غرقابی اور اس بحری قزاقی کی خبر سن کر اس دہشت پسند گروہ کی سرکوبی کا حکم دیتے جو ہم نے آپ کی مدد کے بغیر دیا ہے"۔ والیٔ مصر نے کہا۔
"یور ایکسیلینسی! میں یہ بھی عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ کل سے اب تک یہ معاملہ فقط بحری قزاقی ہی پر محدود نہیں رہا ہے بلکہ اب تو نہ برطانوی سوئز کمپنی کی دولت محفوظ ہے اور نہ ہی ان کے افسران اور فوجیوں کی جانیں۔ اب تک بم پھٹنے سے ڈیڑھ سو فوجی ہلاک اور بے شمار زخمی ہوئے ہیں۔ دو فوجی عہدے دار اور کمپنی کے تین ڈائریکٹر بھی مارے جا چکے ہیں۔ خود میری اپنی زندگی بھی خطرے میں ہے۔ میں قاہرہ میں آج آپ سے انصاف کا طالب ہوں لیکن ممکن ہے کہ کل تاج برطانیہ اپنے ان قیمتی افسروں کا نقصان اتنی آسانی سے برداشت نہ کر سکے۔"
"مصر میں بدمعاملگی اور شورش پسندی اس حد تک بڑھ چکی ہے اس کا ہمیں آج سے قبل اتنا احساس کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ معاملہ ہر لحاظ سے سنگین ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی منظم قسم کی سازش ہے جو مصر اور برطانیہ کے قریبی تعلقات کو تہس نہس کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ بہت جلد آپ اپنے مجرموں کو ہمارے سامنے دیکھیں گے۔"

سر ریذیڈنٹ نے مختصراً والیٔ مصر کو سرجان مارشل کے اغوا سے لے کر دونوں کرنلوں کے مارے جانے تک کی روداد سنائی۔ اشرف بیگ کا جو حلیہ سرجان مارشل نے اور میں نے بیان کیا تھا بتایا اور دونوں افسروں اور تینوں ڈائرکٹروں کے قتل تک کی ہر تفصیل کو سلطان کے سامنے پیش کیا۔ لیکن نہ تو اس نے اشرف بیگ کے حکم کے بارے میں کچھ کہا اور نہ یہ بتایا کہ اسی کے جوابی الٹی میٹم پر وہ اس قدر بدحواس ہو کر بھاگا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ ہاں، اس نے اتنا ضرور بتایا کہ کمپنی کے ہیڈ آفس اور افسران کی حفاظت کے لیے کچھ سپاہی پورٹ سعید اور اسکندریہ سے ضرور بلائے گئے ہیں۔

ریذیڈنٹ اپنے فوجی دستے کی معیت میں اپنی شاہانہ بگھی میں سوار واپس لوٹ گیا تو سلطان نے اپنے وزیر اعظم اور تین دوسرے مشیروں کو طلب کیا۔ محمود بے، سعادت پاشا اور جلیل مدنی اور وزیر اعظم المحسن بدری کو اپنے عالی شان کونسل روم میں سلطان نے ریذیڈنٹ سے ملاقاتوں کا حال سنایا۔ اور وکٹوریہ کی غرقابی سے لے کر کمپنی کے فوجی اور سویلین کے قتل کی بھی تفصیل بتائی اور پھر ان سے مشورہ طلب کیا۔

وزیر اعظم المحسن بدری نے کہا۔

"سلطان معظم! جب آپ کے حکم پر میں قصر کی طرف آرہا تھا تو راستہ میں ایک شخص نے میرے بگھی بان کو پھولوں کا ایک گل دستہ اور ایک چھوٹا سا پیکٹ پیش کیا جس میں پھول بھرے ہوئے تھے۔ اس نے اچانک بازار میں بھیڑ سے نکل کر یہ میرے بگھی بان کے ہاتھ میں تھما دیئے اور بگھی یوں بھی مجمع کی وجہ سے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا...... آپ سلطان المعظم کو عوام کا یہ اظہار عقیدت شگفتہ پھولوں کے مرجھانے سے قبل پیش کر دیجیے گا..... چنانچہ اس سے قبل کہ ہم سنجیدہ اور اہم موضوع پر کوئی طویل گفتگو کریں میں آپ کے عوام کا یہ تحفہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔"

کونسل میں چند لمحوں کے لیے فضا کی سنجیدگی پیدا ہو گئی اور دوسرے مشیروں نے بھی سلطان کو عوام کا محبوب ہونے پر مبارک باد دی۔ سلطان نے پیکٹ کو کھولا تو ایک دم کہا۔

"بدری! ذرا یہ پھول اس میز پر تو الٹ دو۔ مجھے یہ لفافہ پھولوں کے وزن سے زیادہ وزنی معلوم ہوتا ہے۔"

لفافہ کو میز پر پلٹا گیا تو اس میں سے ایک اور چھوٹا لفافہ برآمد ہوا جس پر تحریر تھا۔

"صرف سلطان معظم کے ملاحظہ کے لیے"

لفافہ کے اندر سے جو خط نکلا وہ اشرف بیگ کی طرف سے تھا اور اس کے ساتھ ہی پچیس لاکھ مصری پونڈ کا ایک بینک ڈرافٹ تھا جو سلطان کے نام تھا۔ اس خط میں لکھا گیا تھا کہ یہ رقم وکٹوریہ جہاز سے حاصل کی گئی ہے۔ یہ جہاز اہل مصر کی آمدنی کی رقم لے کر جا رہا تھا اور چوں کہ نہر سوئز مصریوں کی ملکیت ہے اس لیے اس کے منافع کی ہر رقم کو ملکی دولت ہی شمار کیا جاسکتا ہے۔ برطانوی کمپنی نے اس رقم کو مصر سے برطانیہ منتقل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس چوری کا سدباب کر دیا گیا ہے۔ اور ملک کی رقم واپس لے آئی گئی ہے۔ اس رقم کا چوتھائی حصہ سلطان توفیق کی بارگاہ میں پیش کیا جارہا ہے اور بقیہ رقم محب الوطنوں کی تنظیم کے لیے رکھ لیا گیا ہے۔

اس خط میں سلطان سے استدعا کی گئی تھی کہ مصر میں برطانوی فوجی طاقت صرف چار ہزار کے لگ بھگ ہے جبکہ مصری فوجیں ان سے پچیس گنا زیادہ ہیں۔ چنانچہ کمپنی کی ان فوجوں کو ملک سے نکال دیا جائے۔ عوام بادشاہ کا ساتھ دیں گے کیونکہ برطانوی فوجی مصر میں سامراج کی نشانی کے طور پر ابھر رہے ہیں۔

خط کے آخر میں کہا گیا تھا کہ اگر سلطان بین الاقوامی وعدوں کے باعث یا ان معاہدوں کی وجہ سے جو حکومت برطانیہ سے کیے گئے ہیں، خود کمپنی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے میں عجلت نہ کرنا چاہتے ہوں یا کوئی مجبوری محسوس کرتے ہوں تو ایسی صورت میں محب وطن لوگوں کی جو بھی جدوجہد جہاں جہاں جاری ہے اس کو در پردہ پروان چڑھنے دیں۔ اس طرح برطانیہ کے فوجی خود ہی ملک چھوڑ کر چل دینے پر مجبور ہوجائیں گے اور بادشاہ پر کسی صورت معاہدوں کی تنسیخ کا الزام بھی نہیں آسکے گا۔

یہ خط جس جس نے بھی پڑھا اس نے یہی کہا کہ یہ مضمون کسی طرح بھی ایک باغی سردار کا نہیں ہے۔ یہ ایک محب وطن کی آواز ہے۔ وہ قومی درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس نے برطانوی استعمار کو مصر سے نکال باہر پھینکنے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی ہے۔ سلطان نے خود اس کے خط کے مندرجات پر اظہار اطمینان کیا۔ مگر آخر کار بحث تمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ بظاہر اشرف بیگ کی گرفتاری کے لیے ہر طرف پولیس کو چوکنا کر دیا جائے، اخبارات سے بھی اعلان کیا جائے مگر دراصل اشرف بیگ پر کسی طرح بھی ہاتھ نہ ڈالا جائے۔

سلطان توفیق ایک کمزور بادشاہ تھا۔ جو برطانیہ کے اقتدار سے خائف رہتا تھا۔ وہ خود کو ہر وقت کمپنی کے رحم وکرم پر سمجھتا تھا چنانچہ وہ کھل کر کسی طرح بھی اشرف بیگ کی حمایت نہ کرسکتا تھا۔ ہاں البتہ اشرف بیگ کے بھیجے ہوئے ۲۵ لاکھ پونڈ اس کو نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوتے تھے۔ مگر چوں کہ یہ رقم کئی آدمیوں کے سامنے اس کو ملی تھی اس لیے اس نے کمال سیاسی دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ رقم وزیر اعظم کو واپس کردی اور کہا کہ اس رقم سے بحریہ کے انجینیئروں کو جہازرانی کے فن سے آشنا کرنے کے لیے ایک اکیڈمی تعمیر کی جائے اور اس میں اسکو خرچ کردیا جائے۔

اب ہر طرف اشرف بیگ کا چرچا تھا۔ سوئز کنال میں برطانیہ کے ڈیڑھ سو فوجی بم کے دھماکے سے مرچکے تھے۔ کمپنی کے ڈائریکٹر اور کمپنی کی فوج کی اعلیٰ کمان قتل ہوچکی تھی۔ یہ سب کچھ اشرف بیگ کی بدولت ہی ہوا تھا۔ اس نے مصری عوام کا دل جیت لیا تھا۔ اس نے پوری قوم کا سر اونچا کردیا تھا۔ یہ اعزاز اشرف بیگ ہی کو حاصل تھا کہ اس نے جرأت اور بے باکی سے ریذیڈنٹ کے اس الٹی میٹم کا جواب دیا تھا جو اس نے والیٔ مصر کو بڑی رعونت سے دیا تھا۔ اشرف بیگ اب عوام کا ہیرو تھا۔ ہر طرف اشرف بیگ، اشرف بیگ کا غلغلہ بلند تھا۔

ادھر اگلے روز اشرف بیگ نے ریذیڈنٹ کو بھی قتل کرادیا تھا۔ کیوں کہ اس نے اپنی فوجیں سوئز کنال سے مقررہ حد تک ہٹانے کے لیے احکامات جاری نہیں کیے تھے۔ اس طرح اس نے اشرف بیگ کے حکم کا پاس نہیں کیا تھا۔ ریذیڈنٹ کا قتل بھی کچھ کم اہم بات نہ تھی۔ یہ ایک دھماکہ تھا جو ہوکر ہی رہا۔

سلطان توفیق نے برطانوی افسران کے قتل کی مکمل ذمہ داری اپنی حکومت پر ڈال دی تھی۔ اس نے قبول کرلیا تھا کہ اس کی غفلت کی وجہ سے اور اسی کی حکومت کی نااہلی کی وجہ سے کمپنی کے ڈائریکٹروں کی حفاظت اور ان کے جان و مال کے تحفظ کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا۔ اس نے قاہرہ کے شرطہ (پولیس) کمشنر کو برطرف کر کے فرائض سے غفلت کے جرم میں سات سال قید کی سزا دی اور بہت سے دیگر پولیس افسران کو بھی اسی نوعیت کی سزائیں دی گئیں۔ گویا بندر کی بلا طویلے کے سر ڈال دی گئی۔

برطانوی ڈپلومیسی اس شورش سے دوررس فوائد حاصل کرنے کی خواہاں تھی۔ اس نے سلطان توفیق سے وکٹوریہ کی غرقابی اور کمپنی کے منافع کی رقم کے لٹ جانے کا ہرجانہ

طلب کیا۔ ایک کروڑ بیس لاکھ مصری پونڈ پانچ سال کے عرصہ میں قسط وار سلطان توفیق کو شاہی خزانہ سے ادا کرنے تھے۔ دوسری طرف کمپنی نے سلطان توفیق کو ایک اور معاہدہ پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا جس کی رو سے برطانوی فوجوں کی کل تعداد اب چار/پانچ ہزار فوجی نفری سے بڑھا کر تین ڈویژن کر دی گئی۔ یعنی پورے شرق اوسط میں پھیلے ہوئے برطانوی مقبوضات کے لیے پورٹ سعید کو ہیڈکوارٹر بنا دیا گیا۔ علاوہ ازیں مصر کی تمام شمالی اور جنوبی بندرگاہوں پر برطانیہ کی نیوی کو فوجی مشقوں، پٹرولنگ اور اپنے فوجی یا سول بحری جہازوں کی آمد و رفت اور حفاظت کے لیے ESCORT کرنے یعنی ہر قسم کا تحفظ دینے کی اجازت بھی مل گئی۔ اس طرح سلطان توفیق عملاً اب اپنی فوجی طاقت سے، وہ چاہے بری تھی یا بحری تقریباً محروم ہی ہو گیا تھا۔ اور محسن بدری جس برے وقت سے سلطان کو متنبہ کرتا تھا وہ توقع سے کہیں جلد آ پہنچا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب پچھتانے سے کیا حاصل تھا۔ سلطان اب بس اس بات کا مشکور تھا کہ اس کا تاج و تخت سلامت تھا۔ برطانوی اقتدار کا اس پر بڑا احسان تھا یہ۔

عوام، فوج، اور امراء کا طبقہ سب کے سب سلطان کے خلاف ہو چکے تھے اس لیے اس نے بڑی ذلت آمیز شرائط پر کمپنی سے نیا معاہدہ کیا تھا لیکن اب عوام یا ملک کا کوئی طبقہ سلطان توفیق کو ہلا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اب اس کی حفاظت کے لیے برطانیہ کے چالیس پینتالیس ہزار فوجی ہر وقت مصر ہی میں موجود تھے۔ نیا ریذیڈنٹ اس بار ایک مصری عیسائی سلیمان آغانی کو بنا دیا گیا تھا گویا اس طرح مصر کی مذہبی یکجہتی کو بھی تقسیم کر دینے کی کوشش کی گئی تھی جو برطانوی اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔

پل نمبر ۱۵

اشرف بیگ کا طوفان بظاہر آکر گزر چکا تھا اور سر جان مارشل کا رمیسیس ثانی کی ممی یا مقبرہ کو تلاش کرنے کا منصوبہ جو بیچ میں رک گیا تھا پھر سے تازہ ہو گیا۔ کمپنی کے نئے عہدہ داروں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود سر جان مارشل کو مزید رقم عطا کی۔ اس بار پانچ ہزار پونڈ دیے۔ اور شعبہ اہرامیات نے بھی ازراہِ عنایت ایک ہزار پونڈ کا عطیہ دیا۔

اس طرح یکم ستمبر تک ہمارا قافلہ جس میں سر جان مارشل کے علاوہ روسی میں، ڈاہرہ یونیورسٹی کے تین اساتذہ اور کوئی بارہ قلی شامل تھے غزہ سے مغرب کی طرف صحرا میں چلنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنا تمام سامان باندھا۔ اونٹوں اور خچروں پر لاد دیا۔ غزہ سے بیس بائیس میل تک چھوٹے بڑے بہت سے نخلستان تھے۔ اس لئے پانی کا بھی زیادہ ذخیرہ ساتھ نہیں لیا تھا۔ یکم ستمبر کو ہم نے غزہ کا ریسٹ ہاؤس چھوڑا ساتھیوں کو الوداع کہا، ریسٹ ہاؤس کے ملازمین کو انعام و اکرام سے نوازا۔ خدا سے، یسوع مسیح سے، اور مقدس ماں سے کامیابی کی دعائیں مانگیں اور صحرا کی طرف روانہ ہوئے۔

چار دن میں ہم نے نہایت آرام سے سترہ میل کا سفر طے کیا۔ ہم ایک ایک نخلستان میں رکتے تھے۔ گویا کسی پکنک پر آئے ہوئے تھے۔ نہ سفر کی تکان تھی اور نہ ہی کسی قسم کی تھکاوٹ۔ موسم بھی اس دوران میں عمدہ رہا۔ ایک بار بارش بھی ہوئی۔ خچروں کو ہری گھاس اور اونٹوں کو پانی وافر مل جاتا تھا۔ ہم بھی جس جگہ قیام کرتے اس کے ارد گرد بارہ پندرہ میل کا چکر لگاتے اور ہر ٹیلہ، پہاڑی اور اونچی نیچی جگہوں کو بغور دیکھتے اور ہر جگہ کا معائنہ کرتے کہ کہیں یہیں تو ہمارا گوہرِ مراد چھپا ہوا نہیں۔

پانچویں دن جس نخلستان میں ہمارا قیام ہوا وہ غزہ سے بائیس میل کے فاصلے پر تھا اور یہ ہمارے نقشوں میں آخری نخلستان تھا۔ اس کے بعد کوئی پچاس میل تک دوسری آبادی یا پانی کا چشمہ نہ تھا۔ گویا اب وسیع العریض صحرا تھا اور ہم تھے۔ خشک و بیابان ریتیلا علاقہ تھا اور دور دور ریگستان پھیلا ہوا تھا جس میں دریائے نیل کی قدیم گزرگاہیں بھی موجود تھیں۔ پانی اور کھانے کے بغیر آبادی اور انسانوں سے دور بلکہ ان سے بالکل کٹ کر ابھی ہمیں پچاس میل اور آگے جانا تھا۔ ہمیں اس جگہ رک کر دو دنوں میں تمام تیاریاں مکمل

کرنی تھیں۔ غذا، پانی، جانور، قلی کو پھر سے منظم کرنا تھا۔ دس دس میل کے فاصلے پر پانچ پڑاؤ رکھنے تھے اور ہر پڑاؤ پر پندرہ میل کے دائرے میں اس پہاڑی کو تلاش کرنا تھا جس کے قریب میں نے رمیسیس اول کی ممی کو بنتے اور دفن ہوتے دیکھا تھا۔ گویا ساری مہم کا دارو مدار مجھ پر بلکہ میری یادداشت پر تھا کہ جس رات کی صبح کو ہمیں اس جگہ سے کوچ کرنا تھا اس شب کو نصف رات گزرنے کے بعد کسی نہایت گرم اور انگارے جیسی چیز کی تپش سے میری آنکھ کھل گئی۔ اپنے خیمہ میں اکیلا تھا۔ نیند میں گرمی کی جلن اتنی شدید تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ میں شعلوں میں گھر گیا ہوں مگر آگ کی قسم کی آنچ یا شعلے کہیں نظر نہ آتے تھے۔

تب مجھے ایک دم احساس ہوا کہ یہ کوئی آگ نہ تھی۔ کہیں آنچ نہ تھی، شعلے نہ اٹھے تھے۔ یہ تو میرے گلے میں پڑی ہوئی مردونش کی ہڈی تھی جو آگ کی طرح سرخ ہوتی جا رہی تھی اور مجھے جلائے جا رہی تھی میں نے اسے اپنے گلے سے اتار لیا اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے گرم تپتے ہوئے لوہے کی طرح سرخ اور انگاروں کی مانند دہکنے لگی۔

آنچ لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ہڈی جو اپنے سائز کے اعتبار سے بہ مشکل ایک شلنگ سے (پاکستانی چونی کے سکے کے برابر) زائد تھی اب ایک جلتا ہوا انگارہ بن گئی تھی اللہ رے اس کی سرخ آنچ اور اف وہ اس کی حدتیں! مگر یہ کیا؟ یہ آنچ اور گرمی، یہ شعلہ نفسی، یہ تپش یہ سب میرے لیے تو کچھ بھی نہ تھا۔ مجھ پر تو گرمی برائے نام بھی اثر انداز نہیں ہو رہی تھی انگارے جل رہے تھے مگر میرے لیے نہیں۔ آگ بھڑک رہی تھی مگر میرے وجود پر اس کی اثر پذیری کچھ بھی نہ تھی۔

اور اب پھر ہڈی کی تپش بھی آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ حدتیں معدوم ہونے لگی تھیں مگر ہڈی ابھی بھی اسی طرح سرخ تھی .... جیسے سرخ سرخ گلاب یا جیسے شفق پر سر شام کی لال بدلیاں یا جیسے کبوتر کی سرخ آنکھیں۔ میرے لیے یہ آگ ہمیشہ یوں ہی ٹھنڈی ہو جایا کرتی تھی۔ یہ مجھے جلاتی نہ تھی۔ مجھے نقصان نہ پہنچاتی تھی۔ اس کی گرمیاں، سرخیاں میرے لیے ایک انگشت صنائی کے تصور سے زیادہ اور کچھ نہ تھیں۔

اس ہڈی کی ایک عجیب خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں ایک بہت بڑے کینوس کی طرح پھیلے ہوئے مناظر کو سمیٹنے کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس کی وسعت بڑھ کر ایک مکمل اور طویل و عریض علاقہ کی زندگی، جیتی جاگتی زندگی کی عکاسی کر سکتی

تھی۔ ایک بار پہلے بھی اس میں ایسے ہی کچھ مناظر دیکھ چکا تھا۔ جامش کے گڑھا میں بھی جلتی آگ میں، میں نے اسی ہڈی کے ذریعے ہزاروں سال پہلے کے مناظر دیکھے تھے۔
میں نے دیکھا اس ہڈی پر ایک بڑے شان دار شہر کے مناظر ابھرنے لگے۔ پندرہ بیس ہزار کی آبادی کا یہ ایک بارونق شہر تھا۔ گلیاں، سڑکیں، مکان، محل، لوگ، دکان دار، اہل حرفت، کاریگر، قلی، فقیر، فوجی، امراء اور رؤسا سب ہی چل پھر رہے تھے۔ اس کی گلیاں، سڑکیں، راستے، شاہراہیں، نہریں، کھیت، باغات، محلات، مکان، جھونپڑے سب ہی میرے سامنے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں شاید آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ ہر منظر جیتا جاگتا منظر تھا۔ سانس لیتا ہوا اور زندگی سے بھرپور۔ سب کچھ میرے سامنے تھا ـــــ شناسائیاں حجاب اٹھا رہی تھیں، راز کھل رہے تھے، حقیقتیں ابھر رہی تھیں۔
میں نے دیکھا کہ اس بارونق شہر کے وسط میں ایک عبادت گاہ موجود ہے اور ایک بلند مینار ہے جو اس عبادت گاہ کے گول صحن میں ایستادہ ہے۔ سنہرے رنگوں سے مزین کیا ہوا یہ مینار بڑی آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ اس عبادت گاہ میں ایک ایسے بیل کے مجسے کی پوجا ہو رہی ہے جس کی پشت پر دو پروں والے بازو سے بھی بنے ہوئے ہیں۔ مینار کے چاروں طرف چار سمتوں میں بیل کے مجسے رکھے ہیں۔ چمکتے ہوئے پتھروں سے بنائے گئے ہیں ان مجسموں سے بھی رنگ برنگی روپہلی کرنیں سی پھوٹ رہی ہیں۔
مندر کے اندرونی حصوں میں کھلے صحن میں لوگ سر جھکائے عقیدت و احترام کے جذبے نچھاور کر رہے ہیں۔ کبھی پیشانیاں جھک جاتی ہیں، کبھی پلکوں کے دریچے بند ہو کر شبنمی قطرے آنکھوں سے ٹپکا دیتے ہیں۔ یہ عجیب کیف و مستی و سرشاری و بے خودی کا سماں ہے۔ پجاری، مہنت، داس اور داسیاں سب ہی ایک پرجوش کیفیت سے دوچار ہیں۔
مندر کے باہر ایک ہجوم ہے۔ ایک غلغلہ سا بلند ہوتا ہے اور پھر زرق برق لباس پہنے ایک بڑا پجاری شاہراہ سے گزر کر اسی عبادت گاہ تک پہنچتا نظر آتا ہے۔ اس کے ہمراہ ایک جم غفیر چل رہا ہے۔ اس کی پشت پر گھوڑ سواروں کا دستہ ہے جو اپنے نیزے اٹھائے، تنومند بازوؤں اور چٹانوں جیسے سینوں پر ہتھیار سجائے اس پجاری کے ہمراہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ اب ایک عظیم مجمع ہے۔ ایسا مجمع جو ان سواروں کو اپنے جلو میں لیے بھجن گاتا ہوا، عبارتوں کے اشلوک پڑھتا اس مندر کی طرف چل رہا ہے۔ ہر طرف صدائیں گونج رہی

ہیں۔
عظیم مردوقش - الوداع
ساحرِ اعظم مردوقش - الوداع!
ابدی مردوقش - الوداع!
لافانی مردوقش - الوداع!

یہی چند جملے ہیں جو سمجھ میں آتے ہیں اور ان ہی چند الفاظ کے نعرے بار بار دہرائے جا رہے ہیں۔

کوئی میرے قریب سے سرگوشی کرتا ہے۔ "یہ وادئ فرات کا شہر "ار" ہے۔ سمیریوں کا آباد کیا ہوا "ار" اور یہ ساحرِ اعظم سمیریوں کے دیوتا، مریخ کے بادشاہ مردوخ کا عکس ہے مردوقش روئے زمین پر اس سے بڑا کوئی جادوگر موجود نہیں ہے۔ سحر اس کی نسلوں میں ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتا جاتا ہے۔ موت و زندگی، کامرانیاں اور فتوحات سب اس کے قدموں سے لپٹ کر چلتی ہیں۔ یہ اب وادئ نیل کے بادشاہوں کے پاس جا رہا ہے اب "ار" پر اسیری بادشاہ حکومت کرتے ہیں۔ اس نے اسے رخصت کرنے کے لیے مندر تک بلایا ہے۔ یہاں سے اس کا سفر وادئ نیل کے شہنشاہ فرعون کے دربار تک جاری رہے گا اس طویل سفر میں شاہی فوج کا دستہ اس کے ہمراہ جائے گا اور اس کے خادموں کی حیثیت سے وادئ نیل میں اس کے ہمراہ مقیم رہے گا۔"

"مردوقش نے سحر کا علم کس سے سیکھا؟" میں نے کسی ان دیکھی اور نادیدہ ہستی سے سوال کیا۔

"جب آذر کا بیٹا ابراہیمؑ اسی شہر "ار" میں رہ کر ہمارے بتوں کا مذاق اڑاتا تھا، کبھی مندروں میں گھس کر بت توڑ دیتا اور کبھی ہمارے دیوتاؤں کو مٹی کے کھلونے قرار دیتا تو پھر اسی شہر ار کے والی نے اسے آگ میں جل کر مرجانے کی سزا دی تھی۔ مردوقش کے اجداد میں سے کسی نے اس زمانے میں جادو سیکھنے کی ابتدا کی تھی۔ وہ وقت بھی کیا وقت تھا۔ وہ آگ دہکتی رہی چالیس دن تک اس آگ کو جلایا گیا۔ دور دراز کے قبیلے تک بلائے گئے تھے۔ سب ہی آگ، لکڑی اور زیتون کا تیل لے کر آئے تھے۔ سب نے اس مقدس آگ کو دہکایا مگر پھر جب ابراہیم کو اس آگ میں پھینکا گیا تو آگ ٹھنڈی پڑ گئی۔ مردوقش کے دادا کا دادا اس وقت زندہ تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو بولا سب جادوگری ہے۔

میں بھی یہی کچھ کر دکھاؤں گا۔ اسی طرح آگ کو گلزار کر ڈالوں گا۔ پھر اس نے عالموں سے جادو سیکھا۔ ابراہیم تو اس شہر سے نکل کر حجاز کی طرف چلا گیا مگر ادھر مردوتش کے باپ دادا اس علم کو پروان چڑھاتے رہے اور آج ہر طرف دجلہ، فرات، نیل کی وادیوں میں اس خاندان کے ہزاروں شاگرد ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک سے ایک اپنے فن میں طاق ہے۔ مردوتش کا ایک ہونہار شاگرد شمعون ہے جو فرعونِ مصر کے دربار میں رہتا ہے"۔

اس شور و غل اور گہما گہمی میں رخصت کے الوداعی مناظر میری نگاہوں سے گزرتے رہے اور پھر یہ قافلہ سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے قدموں کی گرد میں غبار کارواں بن کر نظروں کی حد سے باہر نکل گیا۔

اب اس ہڈی پر ایک اور نیا منظر ابھرا۔ ایک حسین صورت، برق تپاں، شعلۂ طور، دشمن عقل و خرد، چمکتے چڑھتے چاند کا مدّوجزر نظروں میں لیے مجھے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ادھر اس کے ہونٹوں پر بجلیاں لرز رہی تھیں اور ادھر میں تنہائی میں شکست و ریخت کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ یہ ایک خلا کا سا ماحول تھا۔ لامکانیت اور لاہوتیت کا سماں۔

نہ اب کوئی شہر تھا نہ آبادیاں۔ نہ مینار، عبادت نہ ساحرِ اعظم نہ اب کوئی نظر تھی نہ نگاہ۔ بس فقط میں تھا اور وہ حسن کی بارگاہ! وہ گم سم سی تھی۔ چپ چاپ، التجاء، خاموشی اور نظروں کا لمس گریزاں۔ یہی عنوانِ ملاقات تھے۔ یہ پیامِ دید تھا یا حکمِ وصل۔ جو کچھ بھی تھا میرے لیے ہر لمحہ قیامت سے کم نہ تھا۔

یہ چہرہ کس کا تھا؟ مجھ سے شاید میرے ذہن ہی نے کہا تھا کہ یہ ملکۂ لوراں کی نوجوان بیٹی مینامتی تھی، دخت زر کی قیدی، بابل کی تباہیوں کا خراج جو شہزادہ دخت زر نے سینا شرب سے لوٹ لیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں سرور تھا اور چہرے پر جلال۔ اس نازک سی توجہ میں اور اس ہلکے سے تبسم میں اشاروں کے سینکڑوں ہی دفتر کھلے ہوئے تھے۔ التفاتِ نظر میں قیامت کے سحر تھے۔ یہاں ہم دونوں کے درمیان کوئی لہجہ نہ تھا، کوئی آہنگ نہ تھا۔ شاید درمیان میں صدیوں کی مہیب کثافتیں بھی شامل تھیں۔ مگر گفتگو کی ضرورت بھی کیا تھی؟ دلوں کی جراحتوں کے چمن مہک رہے تھے۔ ماورائے سخن بھی کوئی بات تھی جو بن کے

سنی اور سنائی جا رہی تھی۔ وہ گفتگو جس میں نہ لب ہلیں نہ فضا میں ارتعاش پیدا ہو۔ وہ دھڑکن جو آہٹوں کے بغیر دلوں میں اترتی جا رہی ہو اس ماحول میں رچی بسی تھی۔ اس ملاقات کا یہی عنوان تھا۔ یہی حدیثِ نظر کی تفسیریں تھیں۔

یہ چہرہ میری نظر کے سامنے تھا اور میں اپنے وجدان سے ہزاروں سال کے شب و روز بہ یک جنبش نظر طے کر گیا تھا۔ یہ چہرہ جو ہزاروں لاکھوں چہروں جیسا ہی ایک عام سا چہرہ تھا مگر کچھ تو تھا جس نے اس عمومیت میں بھی اس کو ایک امتیاز عطا کیا تھا۔ اس میں ایک جاذبیت تھی، ایک مقناطیسیت تھی، ایک کیف تھا، خمار تھا، توانائی تھی، کشش تھی۔ آنکھوں سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ شاید صدیوں کے خواب سے کوئی ابھی ابھی چونک کر بیدار ہوا ہے۔ اٹھتی اور جھکتی پلکوں میں ادھر جام و مینا کی شیشہ گری ہو رہی تھی اور ادھر گویا کوئی مجھ پر رک رک کر خنجر چلا رہا تھا۔ زخموں میں پھانسیں سی لگ رہی تھیں۔ میں سراپا ایک درد بن گیا تھا۔ شعلے میرے دامن سے لپٹ گئے تھے۔ میں ایک جلتا ہوا چراغ تھا جسے جلا کر گردابِ بے خودی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

مجھ سے کس نے کہا تھا کہ یہ مینا متی کا چہرہ ہے؟ کسی نے سرگوشی تک نہ کی تھی، کوئی بازگشت بھی مجھ تک نہ پہنچی تھی۔ کون کہتا؟ کون تعارف کراتا؟ اس شب و روز کے وسیع و عریض سمندر میں جسے وقت کہتے ہیں میں شاید ڈوب گیا تھا۔ وہاں اور کوئی نہ تھا۔ یہ بے آواز گزرتا ہوا وقت جس کا لمحہ لمحہ ان ستارہ آنکھوں سے گلے مل مل کر رخصت ہو رہا تھا مجھے ہر لحظہ زندہ کرتا تھا اور ہر لحظہ مار ڈالتا تھا۔ میری آنکھوں میں بھی جلتے بجھتے، ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی دیوالی سی ہو رہی تھی کوئی مجھے کہتا تھا:۔

یہ مینا متی ہے
اور اس کی بیٹی یہی ہے
سینا قرب کی لاڈلی یہی ہے
دختِ رز کی قیدی یہی ہے
تیری منزل بھی یہی ہے

اس نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ نہ میں نے کچھ کلام کیا۔ وقت کچھ یوں ہی گزرتا رہا یکایک جیسے کسی طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین لرزنے لگی۔ آن کی آن ہر طرف سینکڑوں نیزے، تلواریں، برچھیاں فضا میں لہرانے لگیں اور پھر ایک کاری

شیشہ و آہن کی ابتدا ہوئی۔ مچلتے ہوئے اس شعلہ کو، بپھرتی ہوئی اس موج کو جس کا نام مینا متی تھا سپاہیوں نے اپنے آہنی ہتھیاروں کے افق میں غروب کر ڈالا۔ لمحہ بھر پہلے جو نگاہیں تارِ نظر سے قلب فلک میں رفو کر رہی تھیں اپنی ہی چلمنوں کے اندھیروں میں ڈوب گئیں۔ سرحد حرماں سے قافلۂ غم گزر گیا۔ اب وہاں میری تہی دامنی تھی یا مرحلۂ چشم زار اور احتیاط نظر کی پشیمانیاں جیسے دل کو دھواں دھواں کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

یہ چھوٹی سی ہڈی لب بھر ویران تھی۔ نہ آگ، نہ حدتیں، نہ گرمیاں، نہ شدتیں اور میں چیخ رہا تھا۔

"مینا متی! میں آؤں گا۔

مینا متی! مجھے ساتھ لے چل۔

مینا متی! مینا متی!"

شدتِ کرب سے میں مچل رہا تھا۔ آرزوؤں کی گرفت میں بدن لوٹ رہا تھا کہ کسی نے مجھے پکارا

"جان!

جان میلکم!"

میری آنکھ کھلی تو سر جان مارشل میرے سرہانے کھڑے تھے اور مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ "میلکم کیا ہوا؟ میلکم آنکھیں کھولو!"

"میلکم! تم نے شاید کوئی چونکا دینے والا خواب دیکھا ہے۔ اٹھو بھی! کیا کمزور دل والوں جیسی حرکتیں کرتے ہو!" روسی نے بھی میرے پاس بیٹھ کر ذرا مذاق کرنا شروع کر دیا۔

"جان! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مینا متی نام کی کوئی لڑکی پوری آکسفورڈ یونیورسٹی میں نہیں تھی۔ پھر تم کس کا نام بار بار لے رہے تھے؟"

میں روسی کو کیا کہتا۔ نہ مجھے مذاق اچھا لگتا تھا اور نہ ہی میرا دل کسی سے بات کرنے کو چاہ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے کہا۔ "روسی! تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور سر جان! میں آپ سے بھی معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کی نیند خراب کی۔ میں آپ کے آرام میں مخل ہونے پر بے حد شرمندہ ہوں"۔

"جان! تم حد درجہ غیریت برت رہے ہو۔ اتنا تکلف مت کرو۔ یہاں کسی ندامت

کا اظہار ضروری نہیں۔ ہم سب لوگ ایک ٹیم کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ یہ بس اتفاق ہے کہ ہم لوگ سفید فام بھی ہیں۔ اور برطانوی نسل سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا غم اور ہماری خوشی ساتھ ساتھ ہے۔ تم خواب میں چونک گئے تھے کوئی بات نہیں ہے۔ اب تم سو جاؤ۔ صبح ریگستان کا اصل سفر شروع ہوگا۔ نیند پوری کر لو۔ ابھی صبح ہونے میں کافی دیر ہے۔"

"سر میں آپ کا مشکور ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"جان! یہ مصر کی سرزمین ہے۔ بے حد پراسرار اور حد درجہ سحر انگیز۔ یہاں ہزاروں سال کی تاریخ چپے چپے پر بکھری ہوئی ہے۔ آسیب، جن، بھوت، روحیں، قدیم معبد، مندر، پجاری سب کے سب اسی سرزمین کے اسرار ہیں۔ اور پھر تم تو اہراموں کے اندر جا کر خود اس پراسراریت کو دیکھ چکے ہو۔ اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر اس سفر کے دوران کسی پر بھی کوئی محیر العقول واقعہ گزرے تو اسے بالکل واضح طور پر بیان کرنا چاہیے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم مینامتی، مینامتی کیا پکار رہے تھے؟ کیا یہ کسی ہندو راج کماری کا نام ہے؟ کیا اس نام کی کوئی ہندو لڑکی تمہاری شناسا ہے؟"

"سر! یہ سب کچھ محض ایک خواب تھا۔ اس نام کی کوئی لڑکی میرے ساتھ کبھی نہیں رہی ہے۔"

کافی دیر تک سر جان مارشل اور روسی میرے قریب رہے ہمت بندھاتے رہے اور ذہن کو آرام دینے کی ہدایت کرتے رہے۔

معلوم نہیں کہ میں روسی یا سر جان کو مطمئن کر سکا یا نہیں مگر بہرحال تھوڑی دیر میں وہ اپنے اپنے خیموں میں ضرور واپس لوٹ گئے تھے۔ ہمارے گروہ کے باقی افراد سب کے سب سوتے رہے۔ ہم تینوں کے ٹینٹ ایک دوسرے سے منسلک تھے سو ہم ہی ذرا سی آواز پر جاگ اٹھے تھے۔

روسی اور سر جان تو لوٹ گئے تھے اور میں نے یہی بہانہ کیا تھا کہ میں بھی اب نیند بھر کر سوؤں گا، رات ابھی باقی تھی مگر اب میری آنکھوں میں نیند کہاں تھی؟ اب تو بار بار نگاہوں میں وہی ایک صورت گھوم رہی تھی۔ کیا چہرہ مہرہ تھا! کیا نقوش تھے! کیا سادہ و پرکار تصویر تھی! میں نے فقط اس کا چہرہ دیکھا تھا، اس کا سراپا نہیں دیکھا تھا۔

اس ہڈی پر مینامتی کا نقش صرف دو یا تین منٹ کے لیے ابھرا تھا مگر یہ دو تین

منٹ ہی میرا سرمایۂ حیات بن چکے تھے۔ ان مختصر سے لمحوں میں میں نے کائنات دیکھ لی تھی۔ ان لمحوں میں میرے لیے ایک دنیا آباد تھی۔ میں کیا سے کیا ہو گیا تھا!

یوں لگتا تھا کہ جسے ایک بار دیکھا ہے اب اسی کے دیکھنے کی ہوس رہے گی۔ مجھے اپنے گلے میں پڑی ہوئی یہ چھوٹی سی ہڈی بھی ایک رقیب کی مانند معلوم ہوتی تھی۔ تین چار سال گزرے یہ میری رفیق بنی۔ میں نے اسے پھینک دینا چاہا تو سفید عقاب رات کے اندھیروں میں پھر اسے میرے پاس واپس ڈال گیا۔ میں نے اسے اپنے اسپورٹ کٹ میں رکھ لیا تھا تو اس کی گرمی نے میرے کرکٹ کے تھیلے کی ہر چیز کو جلا کر خاکستر کر دیا مگر میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس ہڈی نے مجھ سے میرے ماں باپ چھڑا دیے، میں بے بس رہا۔ سرجان مارشل کے ساتھ میں مشرق کی سیاحت کو نکلا تو وہ بھی شاید اسی ہڈی کے طفیل، اور اس ہڈی سے میں نے کیا کیا نہ دیکھا بابل کی تباہیاں دیکھیں، سینا قرب کی فوجوں کو دجلہ کی موجوں کا سیلاب کشید کرتے دیکھا اور نہ جانے کیا کیا اس ہڈی پر مرتسم دیکھا مگر میں نے کبھی ایک بار دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی مگر آج میں اس دشمنِ عقل و خرد کو واقعی دل بھر کر دیکھنا چاہتا تھا تو میں نے خود کو کس قدر بے بس محسوس کیا۔ جلتے بجھتے مناظر، یہ سانس لیتا ہوا ماضی سب ہی کچھ میرے اختیار سے باہر تھا۔ یہ خود ہی ابھرتا تھا اور خود ہی ڈوب جاتا تھا۔ نہ جانے اب میں کب اس چہرے کو دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ کب؟ کب؟

میرے ذہن پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ یہ ہڈی مجھے اپنی رقیب نظر آتی تھی جس نے میرے محبوب کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ جی چاہا کہ اسے گلے سے اُتار کر کہیں دور پھینک دوں، توڑ دوں، کچل ڈالوں مگر پھر اس کا نقش کس جگہ اُبھرے گا؟ وہ چاند چہرہ پھر کہاں چمکے گا؟ وہ میری نظر کے دائروں میں کس طرح آئے گی؟ اس ہڈی کو میں خود سے جُدا نہیں کر سکتا تھا۔

صبح ہو گئی، ہمارے رفیق جاگ اُٹھے۔ قلی بھی چاق و چوبند ہو گئے۔ قاہرہ یونیورسٹی سے آئے ہوئے مصریالوجی کے شعبہ کے تینوں اسسٹنٹ پروفیسر بھی، روسی اور سرجان مارشل بھی، سب کے سب ہی مجھے ناشتے کی میز پر مل گئے۔ ناشتے کے دوران اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آج ہم چار آدمیوں کی ٹیم کو بیس بیس میل کے دائرے میں پھیل جانا تھا اور شام کو پھر انہی مقامات پر جمع ہونا تھا۔ دن بھر کی رپورٹ دینی

تھی اور پھر اگلے دن کا پروگرام تیار ہوتے تھے۔

ہماری ٹیم چار گروپس میں بٹ گئی۔ سر جان اور ڈیرو یونیورسٹی کے دو پروفیسر اور ایک ٹیم۔ بندوقیں، تھرموس، چھوٹا سا ٹینٹ، رسی اور بیٹری وغیرہ لے کر اُنگ چل دیے میں، روسی اور ایک مصری الگ سمت میں نکلے۔ دو دو مصریوں کی ٹولیاں اِدھر اُدھر پھیل گئیں۔ اونٹوں کی بجتی ہوئی گھنٹیوں نے دور تک ایک دوسرے کو الوداع کہا۔

صحرا کی وسعتوں میں سیر کا یہ پہلا دن تھا۔ ریگستان کی صبح بھی دھوپ کی شدت میں دوپہر کے برابر ہوتی ہے۔ سورج کے نکلتے ہی رات بھر کی خنکی، خنک ریت کی نمی اور صبح کی ٹھنڈی ہوائیں رخصت ہو جاتی ہے جیسے جسم سے جان نکل جاتی ہے۔ صبح کی پہلی کرن ریت کے ذروں میں نیزے کی انی کی طرح ترازو ہوتی ہے اور پھر شعاعوں کی یورش سے ریت کا ہر ذرہ آفتاب بنتا جاتا ہے۔ جوں جوں دن کی روشنی میں حدت آتی جاتی ہے اسی طرح تپش زمین اور آسمان میں یکساں پھیلتی جاتی ہے ایک آفتاب آسمان پر روشن ہوتا ہے تو ہزاروں آفتاب ریت کے چمکدار ذروں کے سینوں میں تڑپتے رہتے ہیں۔

صحرا میں نہ درخت تھے، نہ راستے، نہ پانی کا نشان اور نہ ہی کسی ذی روح کی موجودگی کا امکان۔ دور دور تک خموشی پھیلی ہوئی تھی۔ اس بے صدا اور خموش فضا میں فقط اونٹوں کے پیروں کی دھمک تھی۔ یا گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی جلترنگ۔ میرا اونٹ، دکٹر، بڑے استقلال سے ایک ہی رفتار سے چل رہا تھا۔ روسی اور ہمارے مصری دوست بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ دور دور تک ریگستان کی سطح اور اس کا ماحول ایک جیسا ہی تھا۔ چاروں طرف ریت ہی ریت۔ دور آسمان کی وسعتیں بھی اسی ریت میں جذب ہوتی نظر آتی تھیں۔ ہوا ساکن تھی۔ زندگی کے کوئی آثار کہیں بھی نظر نہ آتے تھے۔ ریت کی اونچی نیچی منڈیریں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر ہوا کی لرزش نے لہروں کے نشان سے بنا دیے تھے۔ لگتا تھا جیسے کسی ماہر مصور نے اپنے کاریگرانہ اور ماہر ہاتھوں سے صاف شفاف نکھرے نکھرے نقش ابھارے تھے۔ یہ صحرا کی ہواؤں کی شوخیوں کے نقوش پا تھے۔ یہ صحرا کا اپنا ایک الگ ہی ساز و ساماں پرور ماحول تھا۔

دھوپ کی تیزی بڑھتی گئی۔ آفتاب نصف النہار پر آ گیا تھا۔ حدت اور تپش اس قدر بڑھتی جا رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ آگ کے شعلے جسم اور جان کو جھلسا کر راکھ کر

دبی گے۔ ہم تینوں نے اپنے چہرے، سر اور سارا جسم کپڑوں سے لپیٹ رکھا تھا۔ صرف آنکھیں کھلی تھیں ان پر بھی ہم نے رنگین شیشوں کی عینکیں چڑھا رکھی تھیں۔ تاکہ ذروں کی چمک اور دھوپ کی چکا چوند سے آنکھیں محفوظ رہیں۔

دو بجے کے قریب ہم نے اونٹوں کی پشت سے چھولداری اتاری، چھوٹا سا خیمہ نصب کیا۔ کچھ سایہ ملا تو وہاں کھانا کھایا اور پانی پیا۔ دو گھنٹے وہاں رکے۔ اس دوران میں ہمارے اونٹ اسی گرم جلتی ہوئی ریت پر بیٹھے رہے، اور چار بجے سہ پہر کو پھر دوبارہ سفر شروع ہوا۔ شام کو ہم سب پھر جمع ہوئے۔ اگلے دن کا پروگرام وضع ہوا اور پھر اسی طرح دن گزر گیا۔ گیارہ دن یوں ہی گزر گئے۔ کسی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ ہم لوگ قاہرہ سے قریب قریب اسی میل مغرب کی جانب صحرا میں اندر آ چکے تھے۔ نہ کوئی ایسی پہاڑی نظر آئی جس پر شبہ بھی کیا جاسکتا تھا کہ یہاں فرعون رمیسیس کی لاش کی ممی بنائی گئی ہوگی۔ نہ ہی کوئی قابلِ ذکر چیز نظر آئی۔ راستہ میں ہاں البتہ کہیں کہیں ٹوٹے پھوٹے ایک ایک کمرہ کے کچے مکانات دو چار جگہ ضرور نظر آئے۔ شاید کبھی ایسی جگہوں پر کسی نے قیام کیا ہو۔ شاید کبھی کوئی قافلہ یا قبیلہ نقل مکانی کرتا ہوا ادھر سے گزرا ہو مگر ان کی تعمیر یا ان کے محل وقوع سے ہمیں اپنے کام کا کوئی سراغ ملتا نہ تھا۔ روز روز کے سفر کی مشقتوں سے دل گھبرانے لگا تھا۔ لگتا تھا کہ اس ریگستان میں ہم کسی تاریخی شئے کی تلاش نہیں کر رہے بلکہ کالے اندھیرے کمرے میں ایسی سیاہ بلی ڈھونڈ رہے ہیں جو وہاں موجود ہی نہیں ہے۔

مگر سر جان مارشل کا یقین اسی طرح پختہ تھا۔ انہیں سو فیصدی اعتبار تھا کہ میں نے اہرام کی قید میں جو کچھ دیکھا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ میں نے جس جگہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کے فرعون کی لاش کو دریا سے نکالتے اور کچھ لوگوں کو اس کی ممی بناتے اور دفن کرتے دیکھا تھا وہ سب حقیقت تھا۔ اس کی ممی کو اہرام کی بجائے کسی جگہ دفن کر دیا گیا تھا۔ اور اس عظیم و وسیع و عریض صحرا میں کہیں نہ کہیں وہ جگہ ضرور موجود تھی جہاں فرعون رمیسیس کی ممی دفن تھی۔ اس کو ہمیں ہر حالت میں ڈھونڈ نکالنا تھا۔

یہ گیارہ دن گیارہ سال کے برابر تھے۔ ہر روز میلوں کی سواری کر کے ہم لوگ واپس لوٹتے تو چہروں پر گرد اور ریت کے چھوٹے چھوٹے ذرّے جمے ہوتے۔ پسینے کی نمی سے بدن میں بدبو اٹھ رہی ہوتی۔ اور جسم اونٹ کی سواری سے تھکن کے مارے چور چور ہوتا۔ آنکھوں میں ناکامی اور دلوں میں اکتاہٹ بسی ہوتی۔ ایسے میں سر جان مارشل ہم سب کی

کافی کے گرم پیالوں سے تواضع کرتے اور اپنی عالمانہ گفتگو سے بہلاتے ہمت بندھاتے اور مسلسل پگھلاتے جاتے۔ یہاں تک کہ ہماری اکتاہٹیں دم توڑ دیتیں۔ اور ہم اگلے دن کے لیے پسر جوش و خروش سے تیاری کرنے لگتے۔

سرجان کہا کرتے تھے کہ ایک ماہر آثارِ قدیمہ کو مستقل مزاج، سخت کوش اور صابر ہونا چاہیے۔ اس کا کام ہی نہایت صبر آزما ہوتا ہے۔ وہ زمین کے اندر چھپے ہوئے ایسے چھوٹے چھوٹے مٹی کے ٹکڑے، ٹوٹے ہوئے برتنوں کے حصے، نامکمل مجسمے اور معمولی معمولی ایسے اوزار جنہیں دوسرے کوئی اہمیت نہیں دیتے ایک شدید مذہبی جذبے کے ساتھ اپنے مطالعہ میں لاتا ہے۔ جو ایک عام آدمی کے لیے ایک مجنونانہ کوشش کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

سرجان ہماری ہمتیں بڑھایا کرتے تھے اور ہمیں اپنے ہم عصر تاریخ دانوں اور آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی جرأت کے بے مثال قصے سنایا کرتے تھے۔ ان کی اس میدان میں پسندیدہ شخصیت جرمنی کے ہیزخ شلیمان کی تھی جس نے ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ سلطنت ترکی میں ہومر کے افسانوی شہر ٹرائے کو زمین سے برآمد کیا تھا۔ وہ ہماری ہمتیں بڑھانے کے لیے شلیمان کی محیر العقول جرأت اور مسلسل محنت کے قصے سنایا کرتے تھے۔

وہ ہمیں بتاتے تھے کہ ہیزخ شلیمان ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۰ء میں فوت ہوا۔ اس کا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ٹرائے کو زندہ کر دیا۔ ٹرائے کیا تھا؟ ہمیشہ سے ایک افسانوی نام جسے صرف شلیمان نے حقیقت بنایا۔ اس نے شاہ پریام کا شہر دریافت کیا اور لاکھوں بلکہ کروڑوں پاؤنڈ کے قدیم ہیرے، جواہرات سونے اور قیمتی پتھروں کے شاہی خزانے برآمد کیے۔

تین ہزار سال سے ایک قدیم یونانی شاعر ہومر کے لکھے گیت ٹرائے کی تاریخ کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ ٹرائے وہ شہر تھا جس نے متحدہ یونان کی ایک ہزار نفری فوجوں کو دس سال تک شہر میں گھسنے سے روکے رکھا تھا۔ اس شہر کی چوڑی دیواریں تھیں اور اس کے گرداگرد قلعہ جیسی فصیلیں تھیں۔ کوئی حملہ آور اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہومر نے اسی شہر کے لڑاکا بہادروں کی جرأت و عزم کے قصے سنائے تھے مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ ٹرائے نام کا کوئی شہر کہیں واقع بھی تھا یا فقط ہومر کے شاعرانہ تخیل کی پیداوار تھا۔

ٹرائے کہاں تھا؟ افریقہ میں، یورپ میں، مصر میں، اسپین میں، عراق میں؟

کوئی پتہ نہ تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ سرجان کہتے تھے شیلمان کا کام سخت ترین اور مشکل ترین تھا۔ اسے تین براعظموں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اس شہر کو تلاش کرنا تھا۔

ہومر نے اس شہر کی صرف نشانیاں بتائی تھیں ILLAIAD الیاڈ نامی ہومر کی نظم میں کہا گیا تھا کہ ٹرائے کے پاس دو چشمے تھے۔ جن میں ایک سے ٹھنڈا پانی نکلتا تھا اور دوسرے سے گرم گرم بھاپ نکلتی تھی۔ اور یہ بھاپ بھڑکتی ہوئی آگ کے دھوئیں کی طرح اس چشمہ سے معلق رہتی تھی۔ پھر ایک جگہ ہومر نے کہا تھا کہ ساحل سمندر پر کھڑے ہوئے جہازوں سے یونانی اس شہر تک کئی بار آیا جایا کرتے تھے۔ یعنی اس شہر سے سمندر زیادہ دور نہ تھا۔ ایک اور جگہ ہومر نے کہا کہ یونانی اور ٹرائے کے دو جنگجو سالاروں اکلیز اور ہیکٹر نے اس شہر کے گرد تین بار ایک دوسرے کا تعاقب کیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس شہر کے گرد زمین ہموار اور مسطح تھی۔ صرف یہ نشانیاں ہیرخ شلیمان کے سامنے موجود تھیں اور ہزاروں میل کا علاقہ تھا جس میں اس چھپے ہوئے شہر کو ڈھونڈ نکالنا تھا۔

ٹرائے کی کہانی اس وقت شروع ہوئی تھی جب ٹرائے کے بادشاہ پریام کے دو بیٹوں ہیکٹر اور پارس نے یونین کے شہر اسپارٹا کے بادشاہ مینی لاس کی بیوی ہیلین کو اغواء کر لیا تھا۔ اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے یونان کے سارے بادشاہ مل کر ہیکٹر اور پارس سے لڑنے آگئے تھے۔ انہوں نے ٹرائے کا محاصرہ کر لیا مگر نو سال تک یونانی اس شہر کا کچھ نہ بگاڑ پائے مگر آخر کار پریام کے شہر ٹرائے کو آگ لگا کر تباہ کیا گیا۔ ٹرائے کی فوج کا جنگجو ہیکٹر مارا گیا۔ پریام کا محل جلا دیا گیا اور ٹرائے کے کچھ جنگجو ہیرو جیسے اینیاس وغیرہ جان بچا کر بھاگ نکلے۔ یہ تھی مختصر سی کہانی جو ہومر نے ILLIAD میں بیان کی تھی۔

جوانی میں ایک بار شلیمان کی نظر کسی مصور کی ایک ایسی تصویر پر پڑی جس میں ٹرائے کے جلتے ہوئے شہر سے اینیاس کو باہر نکلتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس جلتے ہوئے شہر کی دیواریں بہت بڑی بڑی تھیں۔ بس اس دن سے شلیمان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جس شہر کی فصیل اتنی چوڑی ہوں تو ہزار آگ میں جلانے کے باوجود بھی شہر صفحہ ہستی سے بالکل نیست و نابود نہ ہوا ہوگا اور وہ کسی نہ کسی جگہ ضرور چھپا ہوا ہوگا۔

۱۸۷۰ء میں اس نے ترکی کے ایک شہر حصارلک کے قریب کھدائی کا آغاز کیا۔ برسوں کی جستجو نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اس مقام پر سکندر اعظم نے ایک ہزار بیلوں کی

قربانی دی تھی اور یہاں کسی زمانے میں ایک شہر نیا ٹرائے کے نام سے بھی موجود تھا۔ اور پھر جب شلیمان نے اس جگہ کھدائی شروع کی تو دس بارہ سال تک یہ کھدائی چلتی رہی۔ یکے بعد دیگرے شہروں پر شہر نکلتے رہے اور سات ٹرائے اوپر نیچے برآمد ہوگئے۔ اب کون سا ٹرائے ہومر کا ٹرائے تھا کسی کو معلوم نہ تھا لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس نے حقیقتاً ٹرائے کو ڈھونڈ نکالا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک عظیم خزانہ بھی برآمد کرلیا تھا جسے وہ حکومت ترکی سے چھپا کر اپنے ملک لے اڑا تھا۔

سر جان مارشل اس کی ہمت، استقلال اور جرأت کے بہت گن گاتے تھے کہ اس نے تین ہزار سال کے اس تصور کو حقیقت کا روپ دیا جسے سب لوگ ہومر کے تخیل کا کارنامہ کہا کرتے تھے۔ سر جان مارشل ہم سب کی ہمت بڑھانے کے لیے روز نت نئے قصے سنایا کرتے تھے۔

سر جان مارشل اپنے ہم عصر ماہرین آثار قدیمہ کے کاموں کو ہر جگہ مثال کے طور پر پیش کرتے تھے۔ ان میں فرانسیسی تاریخ داں پال امیلا بوتا تھا جس نے وادئ دجلہ و فرات میں اسور بنی پال (جس نے ۸۵۹-۸۸۵ ق - م کے دوران اسیریائی حکمرانوں کے طور پر حکومت کی تھی) کا محل تلاش کیا۔ اسٹین ہنری لیارڈ جس نے عراق میں نمرود نامی ٹیلہ سے کھدائی کر کے دوسرے اسیریائی بادشاہوں کے محلات اور کتبے تلاش کیے تھے۔

سر جان ڈاکٹر رابرٹ کولڈیوی کو بھی بہت قابلِ عزت سمجھتے تھے کیونکہ اس نے ۱۸۹۹ء میں بابل جیسا عظیم شہر دریافت کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جزیرہ کریٹ میں ۴۱ سال تک کھدائی اور تحقیقات کرنے والے برطانوی ماہر آثار قدیمہ سر آرتھر ایونیز کی بھی بڑی قدر کرتے تھے۔ جس نے کریٹ کی چار ہزار سالہ پرانی تہذیب کو زیرِ زمین تلاش کیا۔ جس نے کریٹ کے میناسپ شہنشاہوں کے عظیم الشان محل کو برآمد کیا۔ اور ایسی تہذیب کی نشان دہی کی جو ہومر کے ٹرائے بلکہ مصری فراعین کی سلطنتوں سے بھی زیادہ قدیم تھی۔

سر جان مارشل نے جس طرح ہیزخ شلیمان کی ٹرائے کی کہانی سنائی اسی طرح ایک شام کو کریٹ کا قصہ سنایا۔ کریٹ کا جزیرہ بھی نہایت اہم تاریخی تہذیب کا منبع رہا تھا۔ جان مارشل نے ہمیں بتایا کہ کریٹ کی تہذیب ایک عظیم الشان تہذیب تھی۔ اس جزیرہ کا تمدن رہن سہن، عمارات، سڑکیں، گلیاں، محلات، لباس، طرز بود و باش وغیرہ اس قدر ترقی یافتہ تھے کہ وہ بجائے خود ایک راز ہیں کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے اتنا عظیم الشان

اور ترقی یافتہ تمدن تعمیر کیا۔ بعض ثبوت ایسے تھے جن سے یہ تہذیب، مصری تہذیب سے بھی زیادہ پرانی لگتی تھی۔

تمدن واقعی مصری تہذیب سے بھی زیادہ قدیم تھا۔ یہ دنیا کے قدیم ادوار کا سب سے پرانا تمدن تھا اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ بھی۔ کریٹ کی عظیم الشان بحری قوت بھی تھی۔ ان کا سمندری جہازوں کا ایک زبردست بیڑا تھا۔ یہاں کے باشندے تجارت میں نہایت ترقی یافتہ تھے اور کھیل کود، جسمانی مقابلوں اور ورزشی کارگزاریوں میں بھی بڑے ہنرمند اور باصلاحیت تھے۔

کریٹ میں میناس کی کہانی بھی قدیم دیومالائی داستانوں کی ایک مشہور کہانی تھی۔ ایک قدیم یونانی مورخ تھیوکدائس نے جو پانچویں صدی ق۔م میں کریٹ کی تاریخ لکھ رہا تھا کریٹ کے عظیم بادشاہ میناس کے متعلق لکھتا ہے کہ میناس وہ پہلا حکمران تھا جس کے پاس اپنا بحری بیڑا تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو دور اور قریب کے تمام جزائر کا گورنر بنایا تھا۔ بحرۂ ایجین کے اکثر بے آباد اور ویران جزیروں کا آباد کار بھی وہی تھا۔ اس کے زمانے میں بحری قزاقوں سے سمندر بالکل پاک تھے۔

کریٹ میناس کی کہانی کچھ اس طرح سے تھی کہ میناس کا ایک بیٹا مینوتار تھا جس کا آدھا جسم بیل اور آدھا انسان کا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکلتے تھے اور وہ نہایت غصہ ور اور تند مزاج تھا۔ اس کی ہیئت اور فطرت کی بناء پر وہ ایک عجیب مخلوق تھا۔ کریٹ کے بادشاہ نے اس کے رہنے کے لیے ایک بھول بھلیاں بنوائی تھی جس میں اس کو قید کر دیا گیا تھا تاکہ وہ اس میں سے نکل نہ سکے اور نہ ہی کسی کو نقصان پہنچا سکے۔ اس کی خوراک بھی بھول بھلیاں میں ڈال دی جاتی تھی اور یہ خوفناک شیطانی مخلوق گوشت کی رسیا تھی۔

میناس کا ایک اور بیٹا بھی تھا جس کو ورزش، کھیل کود اور جسمانی مقابلوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ کریٹ سے ایک بار کھیلوں کے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے ایتھنز گیا۔ وہاں اس نے کھیلوں کے اکثر مقابلے جیت لیے۔ اس کے ساتھی بھی ہر کھیل میں یونانی حریفوں پر بھاری رہے۔ شاہ میناس کا یہ بیٹا اندروگیس اس لحاظ سے بدقسمت تھا کہ ہارے ہوئے یونانیوں نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے اس کو دھوکے سے قتل کر دیا تاکہ ایتھنز کے جوانوں کے ہارنے کا قصہ زیادہ بدنامی کا باعث نہ بن سکے۔

شاہ میناس کو جب اپنے فتح مند کھلاڑی بیٹے کے قتل کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی بحری بیڑے کو یونان پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ یونان کو جلد ہی شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ اب یونانی ایک محکوم اور غلام قوم تھے۔ کریٹ کے بادشاہ نے ان پر یہ شرط عائد کر دی کہ ہر سال وہ اپنے بہترین ایتھلیٹ اور سات حسین ترین دوشیزائیں کریٹ بھیجا کریں گے جہاں ان کو غضبناک مینوتار کے سامنے ڈال دیا جاتا جس کا آدھا جسم بیل کا اور آدھا جسم انسان کا تھا۔ یہ ایک طرح کا قصاص اور فدیہ تھا جو ایتھنز کے کھلاڑیوں کو سزا دینے کے لیے عائد کیا گیا تھا۔

چار سال تک ایتھنز والے ہر سال چودہ جوانیوں کا خراج دیتے رہے۔ تب ایتھنز کے بادشاہ ایگیوس کا بیٹا تھیسوس ایک طویل فوجی مہم سے واپس آیا تو اس نے شہر کو ایک عجیب سوگوار فضا میں ڈوبا ہوا پایا۔ سالانہ کھیلوں کے مقابلے کبھی کے بند ہو چکے تھے۔ کھیل کے میدان ویران ہو گئے تھے۔ خوشیوں اور قہقہوں کی جگہ اداسی نے لے لی تھی۔ شہر کے لوگ جب سات تنومند جوانوں اور سات حسین دوشیزاؤں کو سیاہ بادبانوں والے جہازوں میں بٹھا کر کریٹ کی طرف بھیجتے تھے تو سارا شہر دھاڑیں مار مار کر روتا تھا۔

تھیسوس نے اپنے باپ سے کہا۔ "اس بار کریٹ جانے والے جہاز میں مجھے بھی شامل کر دیجیے گا۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنی قوم پر سے یہ ذلت آمیز شرط ختم کرا کے دم لوں گا"۔

ایگیوس نے کہا۔ "بیٹا! انسان انسان سے لڑ سکتا ہے۔ دیوتاؤں کے غضب سے نہیں۔ تم مینوتار کے سامنے ڈالے جاؤ گے وہ ایک پھنکارتا ہوا غضبناک شیطان ہے۔ اس سے بچ کر نکل آنا ممکن نہ ہوگا۔"

تھیسوس نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں کامیاب ہو کر لوٹوں گا اور ان سیاہ بادبان والے جہازوں پر آئندہ کبھی یہ اداسی کا رنگ نظر نہ آئے گا"۔

تھیسوس کی مراد ان جہازوں سے تھی جو فدیہ کے جوان مرد اور جوان لڑکیاں لے کر کریٹ کے شہر کی طرف جایا کرتے تھے۔ ایتھنز والے ان جہازوں کے بادبانوں کو سیاہ رنگ سے رنگ دیا کرتے تھے۔ طے یہ ہوا کہ اگر شاہزادہ کامیاب واپس آئے گا تو وہ جہازوں پر سیاہ کی جگہ سفید بادبان لہرا دے گا۔

ہر سال کی طرح قیدیوں کے جہاز کریٹ پہنچے تو ان نوجوان مردوں اور عورتوں کو

مرد بھی کے دربار میں ملاحظہ کے لیے پیش کیا گیا۔ ان ہی میں شہزادہ بھی شامل تھا جو اپنے رنگ روپ، قد وقامت اور چال ڈھال سے سب قیدیوں سے الگ نظر آتا تھا۔ مونا اس کی بیٹی شہزادی ایریان نے تھیسوس کو دیکھا تو بس دیکھتی رہ گئی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس حسین نوجوان کو اس خوفناک بلا مینوتار سے ضرور بچالے گی۔ چنانچہ بھول بھلیاں میں بھیجے جانے سے قبل اس نے شاہزادہ تھیسوس کو ایک تلوار دے دی اور دھاگے کا ایک بڑا گچھا دیا کہ وہ جہاں جہاں سے گزرے اس دھاگے کو دیواروں سے لپٹاتا ہوا گزرے اور واپسی میں اسے کھولتا ہوا چلا آئے۔ اس طرح وہ بھول بھلیاں سے واپس آسکتا تھا۔ شہزادہ تھیسوس نے اسی ترکیب پر عمل کیا۔ وہ ایک بہادر اور جنگجو جوان تھا۔ چنانچہ ایک دل دہلا دینے والی زندگی اور موت کی جنگ کے بعد اس نے مینوتار کو مار ڈالا اور اپنے تمام ساتھیوں کو بھول بھلیاں سے نکال کر اور شہزادی ایریان کو ساتھ لے کر ساحل پر لنگر انداز اپنے جہازوں تک آپہنچا۔ اور وہاں سے تیزی کے ساتھ ایتھنز کی طرف روانہ ہوگیا۔ مگر اس خوشی اور فتح کے جوش میں وہ جہازوں کے بادبانوں کا رنگ بدلنا بھول گیا تھا اور سب کے سب جہاز پر اپنی قوم کی فتح کا جشن منانے میں لگے ہوئے تھے۔

ادھر شاہ ایگیوس ہر روز سمندر کے کنارے ایک برجے میں کھڑے ہو کر دور دور تک تلاش میں سفید بادبان والی کشتیوں کے آنے کا منظر دیکھا کرتا تھا۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ آخر ایک دن جہازوں کے واپس لوٹنے کی خبر ملی۔ بادشاہ نے دیکھا جہاز دور سے آتے ہوئے نظر آرہے تھے مگر ان کے بادبان سب کے سب سیاہ تھے۔ فرطِ غم سے بادشاہ کا دل پھٹنے لگا۔ اس کو یقین ہوگیا کہ اس کا نوجوان ہونہار بیٹا اپنی جان کا نذرانہ دے بیٹھا ہے۔ دنیا اس کو اندھیری لگنے لگی اور اب زندگی کی کیا اہمیت رہ گئی تھی۔ جب جوان بیٹا نہ رہا تو وہ جی کر کیا کرے گا۔ اس نے بھی سمندر میں چھلانگ لگا دی اور پانی میں ڈوب کر اپنی جان دے دی۔ اس طرح یہ خوشی غم میں بدل گئی اور اس دن سے سمندر کا نام سوگوار سمندر" بحیرۂ ایجین پڑ گیا۔

کریٹ سے جو دیواروں پر کھدی ہوئی تصویریں نکلیں اور جو نقش و نگار بنائے ہوئے بیل بوٹے اور جانوروں کی صورتیں برآمد ہوئیں ان سب میں اکثر کھلاڑیوں کو بیلوں سے لڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ بیل نما یہ مخلوق بعض جگہ دیوتاؤں کے غضب ناک روپ کی تصویر بن گئی تھی۔ بعض تصویروں میں اس بیل کے دو پر بھی دکھائے گئے تھے۔

باب نمبر۱۶

جب سرجان مارشل میرے سامنے یہ باتیں سنا رہے تھے تو مجھے ایک دم یہ خیال آیا کہ ابھی چند دن قبل جوہڈی پر میں نے ایک مینار کا منظر دیکھا تھا جہاں مردوقش کو الوداع کہنے کے لیے بابل کے شہری جمع ہوئے تھے۔ وہاں بھی اس عظیم الشان مینار کے قریب بیل کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ کیا یہ بیل کا مجسمہ مینوتار کا تھا؟ کیا بابل کے قدیم شہری بھی بیل نما کسی جانور کی پرستش کرتے تھے؟ کیا کریٹ کی تہذیب نے سمیریوں کے عظیم شہر بابل کو کچھ مذہبی رسومات بھی تحفہ میں ترسیل کی تھیں؟ سرجان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر کچھ بھی پوچھ نہ سکا۔

پتہ نہیں میرے دل میں کیوں اور کہاں یہ خوف چھپا ہوا تھا کہ اگر میں نے سرجان مارشل سے کچھ بھی پوچھا تو مینا متی کا وہ راز جو صرف میرے سینے میں محدود ہے سب کو معلوم ہوجائے گا۔ اور میں اب کسی کو بھی اس راز میں شریک بنانا پسند نہیں کرتا تھا۔ نہ جانے کیوں؟

ایک طرف تو یہ حسد تھا کہ کوئی میرے رازوں میں شرکت نہ کرے اور دوسری طرف یہ شوق بھی کہ مردوقش، سینا شرب، مینا متی اور بابل کے متعلق کچھ اور، کچھ اور معلومات حاصل ہوتی رہیں۔ روز اسی ادھیڑ بن میں گزر جاتا کہ سرجان سے کچھ پوچھوں یا نہ پوچھوں۔

ادھر کوئی دس دن اور نکل چکے تھے۔ روز ہمارے خیمے اور ہمارے کیمپ دس پندرہ میل ادھر اُدھر ہوجاتے تھے۔ کبھی مشرق میں کبھی مغرب میں۔ ہمارا جو کیمپ سب سے پیچھے تھا اس سے ہمیں کھانا، خوراک، پانی، دوائیں اور دوسری ضروریات کی اشیا ہر تیسرے روز پہنچتی رہتی تھیں۔ روز روز کی فضول تلاش سے اب طبیعت اکتا چکی تھی۔ میں اس وقت کو کوستا تھا جب میں اہرام کی قید سے نکل کر سرجان مارشل کو ملا تھا۔ اور میں نے بے کم و کاست سب کچھ ان کو سنا دیا تھا۔ نہ میں ان کو یہ سب کچھ کہتا نہ وہ اس بات کو اس قدر سنجیدگی سے قبول کر لیتے اور نہ ہم سب کو اس شدید گرمی اور دھوپ میں ریگستانوں کی

ناک جھانکنا پڑتی۔ ہمارے قافلہ میں سے لب دو مصری پروفیسر تو واپس جا چکے تھے اور ایک کم علیل تھے۔ ہم سب کے جوش ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ لب صحرا کی گرمی کو برداشت کرنا روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ آخر ہم سب کے اصرار کے سامنے سرجان مارشل کو ہتھیار ڈالنے پڑے مگر یہ طے پایا کہ ابھی ایک ہفتہ اور ہم اسی تلاش کو جاری رکھیں گے۔ اگر پھر بھی ناکامی ہوئی تو واپس قاہرہ کی طرف لوٹ جائیں گے۔ کون جانتا تھا کہ یہ ہفتہ ہمارے لیے واقعات سے اس قدر بھرپور ہوگا اور کون جانتا تھا کہ ہمارے قافلے کے کچھ ستارے اس ہفتہ غروب ہو جائیں گے۔

سرجان مارشل حسب معمول لونی ٹیم کی ہمت بندھانے میں معروف رہتے۔ زمین میں دفن تہذیبوں کے قصے ہمیں سناتے رہتے تھے۔ ان کی معلومات کا ذخیرہ کبھی نہ ختم ہونے والی ایک مستقل انسائیکلوپیڈیا کی طرح کا تھا۔ وہ دنیا جہاں کے قصے سناتے رہتے تھے، قدیم تہذیبوں، قدیم تمدنوں کے قصے جو لب آہستہ آہستہ زمین کی تہوں سے اوپر اٹھ رہے تھے۔

ایسے ہی کسی دن میں نے پوچھ لیا کہ سرجان کیا بابل میں کسی سینا قرب نامی بادشاہ کا بھی ذکر آیا ہے؟ تو اس دن سرجان نے بابل اور سینا قرب کی پوری تاریخ بتا ڈالی۔ انہوں نے بتایا کہ سینا قرب سارگان کا بیٹا تھا جو اسیری نسل کا ایک خوف ناک بادشاہ تھا۔ اس نے بابل کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔ سینا قرب نے ایک کتبہ جو ۷۰۰ ق۔م کا تحریر کردہ تھا اپنے بھیت ناک انتقام کی یادگار چھوڑا تھا: اس نے بڑے فخر کے ساتھ اس کتبہ میں لکھا تھا۔

بابل کا شہر، اس کے مکانات، اس کی بنیادیں اور دیواریں میں نے تباہ کر دیں۔ میں نے سب کچھ جلا ڈالا۔ دیوار اور فصیل شہر، مندر اور دیوتاؤں کے بت، اینٹوں اور مٹی سے بنے ہوئے مینار بابل میں جس قدر بھی تھے میں نے اٹھوا کر نہر اراحتو (یہ دریائے فرات کا پرانا نام تھا) میں پھینکوا دیئے۔ اس شہر کے بیچوں بیچ میں نے نہر کھودی اور میں نے اس شہر کی جائے وقوع کو سیلاب کی لہروں کی نذر کر دیا جو بنیادیں کہیں بچی تھیں ان کو بھی غرق کر دیا۔ میں نے یہاں اتنی مکمل تباہی پھیلائی کہ سیلاب کے تندریلے بھی نہ پھیلا سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ لب آنے والے دنوں میں اس شہر کی جائے وقوع اور اس کے عظیم مندر اور اس کے دیوتا مردوخ کو کوئی یاد بھی نہ کرے گا۔ میں

نے پانی کے ریلوں سے اسے مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا ہے اور اسے ہموار زمین کی ایک چراگاہ جیسا بنا دیا ہے۔ جب میں نے بابل شہر کو تباہ و برباد کر دیا تو میں نے وہاں موجود دیوتاؤں کو بھی توڑ پھوڑ دیا اور وہاں کے لوگوں کو بھی تہ تیغ کر دیا۔ اور جتنی زمین ہو سکتی تھی وہاں سے کھدوا کر دریا میں ڈلوا دی تاکہ دریا اس کو یہاں سے دور سمندر کی تہہ میں پہنچا دے۔

"بابل سے سیناقرب کو آخر ایسی کیا دشمنی تھی اور آخر یہ اسیریائی نسل کون سی تھی جو بابلی تہذیب کی اتنی سخت مخالفت پر آمادہ تھی؟"

"بابل دراصل ایک عظیم قوم سمیریوں کا عظیم شہر تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ سمیری کہاں سے آئے تھے۔ کیا وہ گم شدہ جزیروں اور غرقاب براعظموں کے بچے کھچے افراد تھے جو اٹلانٹا اور مو کے براعظموں سے بچ بچا کر نکل آئے تھے یا وہ وسطی ایشیا سے ابھرے تھے یہ آج تک ایک راز ہے۔"

سرجان کہہ رہے تھے اور ہم سب سن رہے تھے۔ سرجان نے کہا

"سمیری کوئی بھی تھے مگر لگ بھگ وہ پانچ ہزار سال قبل دجلہ اور فرات کی وادیوں میں قدم جما چکے تھے۔ ان کا پہلا عظیم بادشاہ جس نے ایک عظیم سلطنت قائم کی اس کا نام اناتا تھا اس کا اثر دور دور تک قائم تھا۔ سمیری بے حد ذہین لوگ تھے۔ پہیہ، ہل اور بادبانی کشتی ان ہی کی ایجادیں ہیں۔ انہوں نے زمین سیراب کرنے کے لیے نہروں کے جال بچھا دیئے۔ آبی ذخیرے تعمیر کیے۔ وہ تانبے اور پیتل اور لوہے کا بھی کام جانتے تھے۔ روغن، چمڑا، خوشبوئیں اور مختلف دواؤں کی تیاری میں بڑی بڑی فیکٹریوں میں کام کرتے تھے۔ ان کے شہر عظیم الشان تھے۔ وہ آج کل کے زمانے کے لوگوں کی طرح صناع اور بے حد رسا ذہن رکھنے والے لوگ تھے۔ ان کے سنگ تراش بڑے ماہرِ فن تھے۔ ان کا تخیل بڑا اچھوتا ہوتا تھا ان کے شہروں میں آلاتِ موسیقی اور اس کے مرقدوں تک میں گانے بجانے کے لیے باجے اور دوسری اشیا موجود ہوتی تھیں۔ ان کے یہاں ایک ہیرو گلگمیش تھا جسے طوفان نوح جیسے کسی طوفان سے واسطہ پڑا تھا۔

ان کے کئی دیوتا تھے۔

عنیفی	بارش کا دیوتا
منلیل	ہوا اور طوفان کا دیوتا

اِن	آسمان کا دیوتا

متی	زمین کا دیوتا

مردوخ	سورج کا دیوتا

ان سمیریوں کے شہر جو بڑے اور مشہور تھے پندرہ بیس کے قریب تھے۔ ار اریک، بمنوله بابل اور مشریک وغیرہ چند بڑے شہر تھے۔ سارے شہر آباد تھے۔ خوش حال، تجارت پیشہ اور زراعت پیشہ لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ غلامی کا رواج نہ تھا۔ لوگ خوش باش اور محنتی تھے۔

حضرت عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار سال قبل تک یعنی کوئی تین ہزار سال تک سمیریوں نے اس علاقہ پر بلاشرکت غیرے حکومت کی اور ایک تصویری رسم الخط سے مختلف اور ترقی یافتہ تحریر جسے پیکانی طرز تحریر کہتے ہیں ایجاد کیا۔ جو دراصل قدیم زمانے کی تحریر ہونے والی نہایت اولین زبانوں میں سے ایک شمار ہوتی ہے۔

سمیریائی ایک طویل عرصے تک دجلہ و فرات کی وادیوں پر حکومت کرتے رہے اور بابل ایک عظیم الشان سلطنت کا عظیم الشان شہر بنتا گیا۔ مگر پھر قرب و جوار کے وحشی قبائل جن میں اسیریائی زیادہ مشہور ہوئے اس شہر پر حملہ آور ہوتے گئے اسیریاؤں کا بڑا حملہ لگ بھگ ۲۵۰۰ ق۔م میں ہوا جس کی قیادت سارگان اول نے کی۔ اور پھر ایک طویل شکست و ریخت کا زمانہ شروع ہوا۔ سیناشرب کے باپ کا نام سارگان دوئم تھا جو سارگان اول کا نام اختیار کر کے اپنے ہم نام کے کم و بیش دو ہزار سال کے بعد تخت نشین ہوا تھا۔

اسیریائی بادشاہوں نے بھی بابل شہر کی رونقوں میں اضافہ ہی کیا تھا۔ شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان مینار جو سمیریوں کے وقتوں سے موجود تھا اب ایک بہت اونچا بڑا مینار بن چکا تھا۔ اس کے آخری حصہ پر مردوخ دیوتا کی عبادتیں ہوتی تھیں۔ اسیریائی بادشاہوں میں اکثر خونخوار اور ہیبتناک بادشاہ تھے جنہوں نے سمیریوں کی تخلیق کردہ تہذیب اور ان کے تمدن کو غارت کرنے میں فخر محسوس کیا مگر پھر بعد کے ادوار میں جب اسیری خود کچھ کچھ متمدن ہونے لگے تو ان کی تہذیب، ثقافت، مذہب، دیومالائی داستانوں، دیوتاؤں اور پرستش کے طور طریقوں پر مکمل سمیری تہذیب کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔

اسیریوں کی زبان سامی تھی۔ سام حضرت نوحؑ کے ایک بیٹے کا نام تھا جس کی نسل مشرق وسطیٰ میں پھلی پھولی تھی۔ اسیری سامی زبان ہی بولتے تھے۔ بعد میں یہ زبان

سمیریوں کی زبان کے ساتھ خلط ملط ہو گئی تھی۔ مگر اس خلط ملط زبان پہ بھی سمیریوں کی زبان کی گہری مہر لگی ہوئی تھی۔

اسیریائی حملہ آوروں کی پے بہ پے جنگی مہمات نے سمیریوں کا اقتدار ختم کر دیا تھا مگر رفتہ رفتہ سمیریوں کی مملکت بھی کئی قبیلوں میں بٹ گئی۔ عموماً ایک شہر ایک قبیلہ اور ایک بادشاہ ہی حکومت کا عنوان بن گیا۔ اس وقت کے بنتے بنتے شہروں پہ شہریوں یا قبیلوں کے نام سے حکومتیں قائم ہو گئیں مثلاً حکومتِ بابل، حکومت اکاش، حکومت اورسا اور حکومت اسن یعنی بابل، اکاس، اورسا اور اسن وغیرہ اسیریائی شہروں کے نام تھے۔

حکومتِ بابل کا نام ایک بار پھر تسمورابی کے زمانہ ۱۸۰۰ق-م میں وادیٔ دجلہ و فرات میں مشہور ہونا شروع ہوا۔ یہ قدیم شہنشاہوں میں سے پہلا مطلق العنان بادشاہ تھا جس نے اپنی رعایا کو قانون عطا کیا۔ جو کمزوروں کے لیے طاقتوروں سے بچاؤ کی خاطر ایک ڈھال کی حفاظت کا سا کام کرتا تھا۔ اس زمانہ میں بابل کی حکومت کی حدود پھر بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ بابل کی یہ عظمتیں کم و بیش پانچ سو سال تک قائم رہیں مگر پھر سلطنت بابلیہ دوسرے اسیریائی بادشاہوں کے سامنے جھکتی گئی۔ ایک ہزار سال قبل مسیح تک اسیریائی پھر سے ایک وحشی اور خطرناک حد تک ظالم قوم بن چکے تھے۔ ان کے ہیبت ناک بادشاہوں میں تگلاتھ ۱۱۰۰ق-م، اسورناصرپال ۸۸۵-۸۶۰ق-م سارگان دوئم ۷۰۵ق-م اور سیناخرب ۷۰۴-۶۸۱ق-م شامل تھے۔

سیناخرب نے قدیم بابلی حکومت کا نام و نشان مٹا دینے کے لیے بابل کو تباہ کر دیا تھا مگر پھر بابل کے دیوتاؤں نے سیناخرب کو سزا دی اور اس کے ظلم سے تنگ آ کر اس کے بیٹے اسارحادان نے سیناخرب کو قتل کر دیا اور بابل کو پھر سے تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ ۶۲۶ق-م بابل کے شہزادوں میں سے ایک شہزادہ نے جس کا نام نبوبولسر تھا سیناخرب کی اولاد کو باہر نکال دیا اور پھر اس کے بیٹے بخت نصر کے جانشین بابل کی حفاظت نہ کر سکے۔ چنانچہ پھر ایران کے مشہور شہنشاہ سائرس نے بابل کو ۵۳۹ق-م فتح کر لیا اس موقع پر شہر کے غداروں نے اس کی مدد کی تھی۔

سرجان نے بابل کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ڈھائی ہزار سال قبل بابل جو کچھ بھی تھا اس کی تفصیل ہیروڈوٹس نے لکھی ہے جو مشہور یونانی سیاح تھا اور ۵۰۰ق-م

بابل کی سیاحت کو آیا تھا۔ اس نے بابل کا حال لکھا ہے۔

اس وقت بابل شہر چھپن مربع میل کے احاطہ میں ایک عظیم فصیل کے اندر آباد تھا۔ یہ فصیل اسی فٹ چوڑی اور تین سو بیس فٹ تک اونچی تھی۔ اس میں تانبے کے سو دروازے جڑے ہوئے تھے۔ اندر کی طرف بھی اسی طرح کی ایک اور عظیم فصیل تھی اور اس میں ہر ایک سو ساٹھ فٹ کے فاصلہ پر حفاظتی مینار تھے جو تیس فٹ اونچے ہوتے تھے۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک ۷۵ فٹ چوڑی شاہراہ تھی جو اندرونی فصیل کے ساتھ ساتھ دور تک ایک کھلی ہوئی سرنگ کی طرح چلتی تھی۔ اس سڑک کے دونوں طرف دیواروں پر رنگ برنگ کے پتھروں سے سجاوٹ کی گئی تھی بادشاہ کے فتوحات کے جلوس، قربانیوں کے اجتماع، مردوخ دیوتا کے مندر میں جانے کے لیے، پروہتوں اور پجاریوں کے گاتے بجاتے جلوس اس شاہراہ سے گزر جاتے تھے۔

بخت نصر کے تعمیر کردہ شہر اور اس شاہراہ کے کنارے بہت سے ایسے پتھر ملے ہیں جن پر تعمیر کا حال لکھا گیا تھا۔ ایک پتھر پر بخت نصر نے یوں تحریر کیا تھا۔

"شاہ اعظم شاہ شاہان بخت نصر بادشاہ بابل جو نینو بولاسار شاہ اعظم شاہ شاہان شاہ بابل کا بیٹا ہے شاہراہ بابل تعمیر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ شاہراہ موٹی موٹی سلوں سے بنائی جائے گی اور اس کی سڑک سے مردوخ آقائے لافانی کی عبادتوں کے جلوس گزرا کریں گے۔"

سرجان نے بابل کے شہر اور اس کے ماضی کی تفصیل اس قدر عمدہ طریقے سے بیان کی مجھے یوں لگا جیسے میں نے بابل کو زندہ جاوید ایک جیتے جاگتے شہر کی حالت میں دیکھ لیا ہو۔ کئی سال پہلے جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور پہلی بار مجھے اور روسی کو ایک حبشی ساحرہ جاشی نے اپنے جال میں قید کیا تھا تو اس نے بھی سینا شرب کا نام لیا تھا اس نے کہا تھا کہ سینا شرب کی بیوی لوران جو دریاؤں کی بیٹی تھی اس فتح کے جشن میں شریک تھی۔ وہ اور سینا شرب خوش تھے۔ سینا شرب نے بابل کا نام و نشان مٹا ڈالا تھا مگر پھر بابل کا ایک شہزادہ دخت زر سینا شرب کی بیٹی مینا مستی کو اغواء کر کے دور مشرق کی طرف لے بھاگا تھا۔ جس کی تلاش میں مجھے بھی مشرق میں دریاؤں کی سرزمین کی طرف جانا تھا۔

اب یہ سارا قصہ اور ساری کہانی میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ میری نظر کے سامنے تاریخ اپنے اوراق پلٹ رہی تھی۔ میں اب اس ہدمی کی منظر کشی کے بغیر بھی اپنی چشم تصور سے اس پورے ہنگامے کو دیکھ رہا تھا۔ سرجان تاریخ بتا رہے تھے اور میں تاریخ دیکھ رہا

تھا وہ اور بھی کیا کیا کہہ رہے تھے مگر میں اپنی دنیا میں گم ہو چکا تھا۔ سرجان کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ انہوں نے اس واقعہ کی وہ ساری جزئیات نہیں بتائی تھیں جن کو میں خود ہی دیکھ رہا تھا۔ میں اسی چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ ایک وسیع و عریض میدان میں دور دور تک فوجیں صف باندھے کھڑی ہیں رنگ برنگے لباس ان کے جسموں میں سجے ہیں۔ ان کے اودھر ادھر کچھ چھکڑے ہیں جن پر سامان لدا ہوا ہے۔ کچھ گھوڑے سوار گھوڑے دوڑاتے ایک ایک کو حکم دیتے اور تیزی سے فوج کو منظم کرتے ہوئے ادھر سے ادھر آ جا رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ کسی بڑی فوج کی واپسی کا سفر شروع ہونے والا ہے کچھ گاڑیوں میں جنہیں بیل کھینچ رہے ہیں زخمی پڑے ہیں جو کراہ رہے ہیں۔ اور چیخ بھی رہے ہیں۔ میدان کی پشت پر لاشوں کا ایک ڈھیر ہے جس پر پانی ہی پانی سے زمین دلدل جیسی بن گئی ہے۔ یہ کل کا بابل ہے اور آج کا کھنڈر۔ ٹوٹا پھوٹا بابل جو سینا شرب کی ہیبت سے زمین بوس ہو چکا ہے۔

ایک بڑے خیمہ سے سپاہیوں اور جاں نثاروں کی جلو میں شہنشاہ سینا شرب اور اس کی اہلیہ ملکہ لوران باہر نکلتے ہیں۔ قہقہے، خوشیاں، مسرتیں ان دونوں کے چہروں سے پھٹی پڑ رہی ہیں۔ کیوں نہ خوش ہوں، انہوں نے بابل فتح کیا۔ شاہی خیمہ بھی لپیٹ دیا گیا ہے۔ شاہی خیمہ کے برابر ایک اور شاندار خیمہ ہے جس میں سے ایک بند رتھ نکل رہا ہے۔ شاید اس رتھ ہی میں وہ دشمن جاں سوار رہی ہوگی جو ملکہ لوران اور شہنشاہ سینا شرب کی بیٹی ہے جسے مینا متی کہتے ہیں۔ یہ رتھ بھی شاہی چتر کے ساتھ ساتھ فوجوں اور جاں نثاروں کی جلو میں روانہ ہو جاتا ہے۔

دن بھر کی تھکن کے بعد رات کو فوج اور بادشاہ ایک جگہ قیام کرتے ہیں۔ رات کے محافظ چوکس ہو جاتے ہیں۔ مشعلیں جل جاتی ہیں، خیمے نصب کر دیئے جاتے ہیں۔ کھانا اور ناؤ نوش کا دور شروع ہو چکا ہے۔ ہر سپاہی خوش خوش نظر آتا ہے۔ اتنی بڑی فتح جو حاصل کی ہے۔ اب کسی طرف سے بادشاہ سینا شرب کو کسی مداخلت کا خطرہ نہیں ہے۔

اور پھر جب خمار و مستی کی کیفیت سے سرشار فوجی اور سپاہی نیند سے ہم آغوش ہونے لگتے ہیں تو پھر یکایک کسی طرف سے خیموں میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ رونے، چیخنے اور چلانے کا شور بلند ہونے لگتا ہے۔ یہ دخت رز نے شبخوں مارا ہے۔ شہزادہ دخت رز بابل کے بادشاہ کا بیٹا تھا۔ شہر جب فتح ہوا تو وہ کسی طرف بھاگ نکلا تھا۔ اب جان ہتھیلی

میں لے کر سیتا فرب سے انتقام لے رہا ہے ہر طرف چیخ و پکار مچ رہی ہے۔ آن کی آن میں سینکڑوں لاشیں زمین پر گر چکی ہیں۔ سب شمعیں ایک ایک کر کے بجھا دی گئی ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ حملہ آور کتنے ہیں، کس طرف سے آئے ہیں اور کس طرف لڑ رہے ہیں۔ اور یہ تو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لڑتے بھڑتے، مارتے کاٹتے کسی طرف کو گم بھی ہو چکے ہیں۔

پھر وخت زر کے ساتھ اور بھی بچے کچھے لوگ آ کر شامل ہوتے گئے اور گروہ بڑھتا گیا۔ وہ بجلی کی طرح آتا، بادل کی طرح کڑکتا اور جھونکے کی طرح ادھر سے اُدھر نکل جاتا۔ فوجی آپس میں کہتے یہ کوئی انسان نہیں ہے۔ بابل کے مردوخ دیوتا کا قہر ہے۔ ہمارے بادشاہ نے مردوخ دیوتا کا مینار توڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اب مردوخ خود ہی سیتا فرب سے انتقام لے گا۔

یہ انتقام شروع ہو چکا ہے۔ ایسی ایک طوفانی برسات کی رات میں وخت زر سیتا فرب کی بیٹی کو اچک لے جاتا ہے۔ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر پاتا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس اندھیری رات اور طوفانی موسم میں کس طرف سے آیا اور کدھر نکل چکا ہے۔ ملکہ لوران اور بادشاہ سیتا فرب غم و غصہ سے اپنے ہونٹ کاٹ رہے ہیں۔ وہ غضب ناک اژدہے کی طرح پھنکار رہے ہیں۔ مگر اب ان کی لاڈلی بیٹی مینامتی کہاں ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔

جس سپاہی نے شہنشاہ سیتا فرب کو اس کی بیٹی کے اغواء کی اطلاع دی اس کا سر اسی وقت اڑا دیا گیا۔ بادشاہ کا قہر برس رہا تھا اور اس کے فوجی، سپاہی، وزیر و امیر سب کے سب خوف سے لرز رہے تھے۔ جن سپاہیوں کی حفاظت میں شہزادی میناامتی کا خیمہ تھا ان میں سے آدھے سے زیادہ وخت زر کا شکار ہو چکے تھے باقی کے پیروں میں کیلیں ٹھونک کر ان کو اسی خیمہ کے قریب قریب زمین میں جما دیا گیا ہے۔ یہ اس وقت تک ایسے ہی کھڑے رہیں گے جب تک شہزادی میناامتی واپس نہیں آجاتی۔ ان بد بختوں کے پیروں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ تکلیف اور خوف سے ان کی زبانیں منہ سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ ان کے عزیز، رشتے دار، ہمدرد اور حمایتی سب خاموش تھے۔ بادشاہ سے کچھ کہنا جان سے ہاتھ دھونے کے برابر تھا۔

بادشاہ سیتا فرب کے چہرے پر جلال برس رہا تھا۔ ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ وہ صبح

سے ایک لمحہ کے لیے نہیں بیٹھا تھا اور نہ اس کے ہاتھ سے تلوار الگ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں خون برسا رہی تھیں۔ فوج کے جو دستے دخت زر کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑائے گئے ان میں سے ابھی تک کوئی واپس نہ آیا تھا۔ سینا شرب کو انہیں کی واپسی کا انتظار تھا۔ سینا شرب کا بڑا بیٹا سارد ان بھی اسی فوجی دستے کے ہمراہ اپنی بہن کی کھوج میں گیا ہوا تھا۔

مگر دخت زر کو ہوا تھا۔ نہ معلوم اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اس کا کسی کو کوئی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کدھر چلا گیا۔ اگر دخت زر اس وقت کسی طرح سینا شرب کے سامنے آجاتا تو سینا شرب اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی ایک ایک بوٹی اپنی تلوار سے کر دیتا۔ شاید انسانی تاریخ کا سب سے بہیمانہ قصاص لیا جاتا۔ مگر دخت زر تھا کہاں؟ سینا شرب کی ساری فوج مل کر بھی اس کا کھوج نہ لگا سکی۔

ملکہ لوران نے رو رو کر اپنی آنکھیں سرخ کی ہوئی تھیں۔ بادشاہ کا تیسرا بیٹا کالاش فوجی دستوں کی ناکامی کے بعد اپنی ماں ملکہ لوران کے پاس پہنچا۔ اور اس نے کہا کہ کسی طرح کسی اچھے جادوگر سے مینا متی کا احوال معلوم کرنا چاہیے۔ بابل کا سب سے بڑا ساحر مردوقش تھا مگر وہ کیوں سینا شرب کی مدد کرے گا، وہ تو اسی بابلی مینار کے کھنڈر میں بیٹھ گیا تھا جس کے اوپر اس کے دیوتا مردوخ کا معبد تھا۔ جب سینا شرب نے اس مینار کو ڈھا کر زمین بوس کر دیا تھا تو مردوقش ایک لمحہ کے لیے بھی اس کھنڈر سے نہ ہلا تھا۔ جب کسی فوجی نے سینا شرب کے سامنے ہی اس ساحر کو قتل کرنے کے لیے اپنی تلوار اٹھائی تو سینا شرب نے اسے روک دیا تھا..... "نہیں اس کو زندہ رہنے دو۔ تاکہ ادھر سے گزرنے والے کو یہ بتایا کرے کہ سینا شرب نے اس کے دیوتاؤں کو شکست دے دی تھی۔

مردوقش نے کہا تھا۔ "میرا آقا مردوخ لافانی اور لازوال ہے۔ شکست سے ناآشنا ہے"۔
نہ معلوم اس جرأت مندانہ جواب کے باوجود سینا شرب نے اسے زندہ کیوں چھوڑ دیا تھا۔

سینا شرب نے کسی کو حکم دیا۔ "جاؤ وہ ملعون پاگل ساحر اسی کھنڈر پر بیٹھا ہوگا۔ جو کبھی بابل کا مینار اعظم تھا۔ اگر وہ اپنے پیروں سے چل کر نہ آئے تو اس کو سر کے بالوں سے کھینچ کر یہاں لے آؤ۔ ہم اس سے اپنی بیٹی کا حال معلوم کر کے رہیں گے۔"
آناً فاناً فوجیوں کے گھوڑے دوڑنے لگے اور فضا میں تہلکہ سا مچ گیا۔ اور پلک جھپکتے

میں ساحر مردوقش ان کے سامنے کھڑا تھا۔ شہنشاہ سینا شرب کی پشت پر ملکہ لوران غم سے بڑھال آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر زردی لیے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کالاش کے کندھے پر سر ٹکا رکھا تھا۔ سامنے فوجی، سپاہی، سالار اور بادشاہ کے محافظ کھڑے تھے۔

سینا شرب نے گرج کر کہا۔ "او جادوگر! اپنے علم کو کام میں لا۔ مجھے بتا کہ میری بیٹی شہزادی مینامتی کہاں ہے، قید میں ہے یا آزاد ہے، زندہ ہے یا مردہ ہے؟"

مردوقش نے آنکھیں بند کیں اور پھر چند لمحے ہر ایک پر گویا جان کنی کے سے گزرے۔ ہر شخص چپ چاپ تھا۔ نہ جانے یہ جادوگر کیا کہے گا؟ اگر جادوگر نے اچھی خبر نہ دی تو سینا شرب کی تلوار سے نہ بچ کر جا سکے گا۔

مردوقش نے چہرہ اٹھایا۔ آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا۔ "شہنشاہ سینا شرب مبارک ہو! تیری بیٹی زندہ ہے۔ میرا آقا مردوخ دیوتا لافانی ہے، لازوال ہے۔ اس نے تیری بیٹی کو تیرے جرم میں پکڑ لیا ہے۔ میرا دیوتا کہتا ہے کہ بادشاہ کو بتا دو کہ اب زندگی بھر وہ اپنی بیٹی کے غم میں تڑپتا رہے گا۔ مگر اسے دیکھ نہ سکے گا۔ مردوخ دیوتا کہتا ہے کہ جس نے میرے شہر بابل کو تاراج کیا ہے اسی کی اولاد سے میں پھر بابل کو عظیم الشان طور پر تعمیر کراؤں گا اور پھر بادشاہت تیرے گھر سے چھین لی جائے گی"۔

"کیا بکتا ہے؟ زبان کو لگام دے! اگر تیرا دیوتا ایسا طاقت ور ہے تو اس وقت کہاں تھا جب اس کا معبد اور اس کا بابل تباہ ہو رہا تھا۔"

"اس وقت دیوتاؤں کی مرضی کیا تھی اسے وہی جان سکتے ہیں۔ میں تو تجھے وقت کی آواز سنا رہا ہوں۔ میں ایک کمزور پجاری ہوں۔ میری طاقت میرے دیوتا کا مان ہے۔ جو کچھ مجھے کہا گیا ہے میں نے تجھے بتا دیا ہے۔"

سینا شرب میں اتنا سننے کی تاب کہاں تھی۔ اس نے ایک چنگھاڑتے ہوئے ہاتھی کی سونڈ کی طرح اپنی تلوار اٹھائی۔ "اس بدزبان جادوگر کا سر اس کے کندھوں پر باقی نہیں رہنا چاہیے۔"

مگر اسی وقت دلنجا ملکہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "بادشاہ اس کو یوں قتل نہ کر۔ اس کو حکم دے کہ ہمیں پہلے ہماری بیٹی دکھائے کہ وہ اس وقت کہاں ہے!"

کالاش، سینا شرب کا بیٹا، ولی عہد اور فوج کا جری سالار بھی باپ کے قدموں پر جھک گیا اور بولا۔ "اگر اس کو قتل کر دیا گیا تو پھر ہمارے پاس مینامتی تک پہنچنے کے لیے

کوئی راہ نہ رہے گی۔ اس جادوگر کو زندہ رکھ کر ہمیں اس سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔"
بادشاہ کا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ اور شہزادے نے اسے ایک نئی راہ دکھائی تھی۔ اس کا جوش غضب اور دہکتا ہوا جذبۂ انتقام بھی ایک لمحہ کے لیے ہوش و حواس کی لہروں کی زد میں آ کر ذرا سا معدوم ہوا تھا کہ اسی لمحہ دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں گونجنے لگیں، گرد اڑنے لگی اور فاتح بابل شہنشاہ سیناشرب کے فوجی دستے کے نعروں میں فضا گونجنے لگی۔ دختِ رز کی تلاش اور مینامستی کے تعاقب میں بھیجا جانے والا فوجی دستہ واپس آ رہا تھا۔
پسینے میں شرابور اور ہانپتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ سے کود کر دستہ کا سالار زمین بوس ہوا۔ اس کے جسم پر سجے ہوئے ہتھیاروں میں کھنکھناہٹ سی ہوئی۔
"شاہ شہاں شہنشاہ سیناشرب کا اقبال بلند ہو۔ ہمارے فوجی دخت رز کے پیچھے لگ چکے ہیں۔ شہزادہ لسارذہان بھی واپس لوٹ رہے ہیں۔ چند گھنٹوں میں شہزادی واپس آپ کے پاس آ چکی ہوں گی۔"
ولی عہد شہزادہ کیلاش آگے بڑھا اور بولا۔ "فاتح بابل کے لیے تفصیل بیان کرو۔"
ہم نے شہنشاہ کے حکم کے مطابق اپنے سپاہی چاروں طرف دوڑا دیئے تھے۔ ہم ہر طرف پھیل گئے۔ ہم نے راستہ کی بستیوں پر سختیاں کیں اور بہت سے سر اڑا دیے۔ بہت سے بچے کچھے بابلیوں کے قافلوں کو جو ہمیں راستے میں ادھر ادھر آتے جاتے ملے ہم نے بے جان جسموں کے انباروں میں بدل دیے۔ تو آخر کار ہمیں پتہ چل گیا کہ دخت رز شہزادی کو لے کر مشرق میں شردیک کی طرف گیا ہے۔ پھر ہم سب اسی راستہ پر پڑ گئے۔ ہم نے اس طرف کسی بستی کو باقی نہیں چھوڑا۔ جلے ہوئے مکان اور سلگتی ہوئی بستیوں کے نشانات کا ہر راستہ جو شردیک تک جاتا ہے کٹی پھٹی لاشوں اور مرے ہوئے یا سلگتے ہوئے زخمیوں سے بھرا پڑا ہے۔ جس راستے سے شہزادی قیدی بن کر گزری ہے ہم نے اس راستے کے ایک ایک کیوبٹ (یہ اسیریوں کے ہاں فاصلہ ناپنے کا پیمانہ تھا جیسے ہمارے ہاں میٹر یا گز ہوتا ہے) کو خون سے رنگ دیا ہے۔ اب ہمارے فوجی طوفان بن کر شردیک کے راستے پر دوڑ رہے ہیں۔ اور مجھے شہزادہ لسارذہان نے شاہ شہاں کے پاس اطلاع دینے کے لیے بھیج دیا ہے۔"
سیناشرب، ملکۂ لوران اور شہزادہ کیلاش کے چہروں پر آج دن بھر میں پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اب کیا ہے چند ہی لمحوں میں فوجی دستہ دخت رز کو قید کر کے لے

آنے لگا۔ مگر تقدیر ہنس رہی تھی۔ بابل کے ساحر اعظم مردوقش کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی مگر طنزیہ مسکراہٹ، استہزائیہ مسکراہٹ وہ جانتا تھا کہ اب زندگی میں کبھی بھی سیناشرب اپنی بیٹی کی جھلک بھی نہ پاسکے گا۔

ادھر سیناشرب قردیک کی طرف مزید فوجیں بھیج رہا تھا ادھر ملکہ لوران مردوقش سے کہہ رہی تھی

"جادوگر! تو مجھے ایک بار میری بیٹی کا چہرہ دکھادے میں تجھے منہ مانگا انعام دوں گی۔"

اسی رات کو جادوگر مردوقش نے جو دیوتا مردوخ کا پجاری تھا، جو دریائے نیل اور دریائے دجلہ کے درمیان کی وادیوں میں بادشاہوں کے درباروں میں ایک معزز مہمان کی حیثیت سے آتا جاتا تھا۔ خود کو رسیوں سے بندھا ہوا ایک قیدی پایا۔ اسے حکم دیا گیا کہ دخت زر اور میناماتی کی جھلک دکھلائے۔ اس نے اپنے جادو سے کڑھاؤ میں دکھادیا کہ دخت زر اپنے چند فوجی سپاہیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار سرپٹ بھاگ رہا ہے اسی گھوڑے پر میناماتی جس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور آنکھوں پر پٹی بندھی تھی دخت زر کے آگے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکن اور غم دونوں ہی نمایاں تھے۔ لوران نے جیسے ہی اپنی بیٹی کو دیکھا چلائی:۔

"میری بیٹی!!"

آناً فاناً یوں لگا جیسے یہ آواز میناماتی اور دخت زر دونوں نے سنی۔ دونوں نے ایک دم پلٹ کر دیکھا اور پھر مردوقش کے کڑھاؤ کا منظر ختم ہوگیا۔ اس نے پہلے ہی تاکید کر دی تھی کہ سب چپ رہیں گے۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکالیں گے۔ ملکہ نے آواز دے کر ادھر میناماتی کو متوجہ کیا ادھر کڑھاؤ کا ہر منظر ختم ہوگیا تھا۔

اس دن کے بعد سے کیلاش نے مردوقش سے دوستی بڑھانی شروع کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ فی الواقع اس کے باپ سیناشرب نے بابل کو تباہ کر کے اچھا نہیں کیا تھا۔ مردوخ دیوتا کے معبد کو ڈھا کر، اس کے عظیم مینار کو گرا کر اور کھنڈر بنا کر سیناشرب نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اب مردوخ کا انتقام ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ یہی خیالات بادشاہ کے دوسرے بیٹے اسارہدان کے بھی تھے۔

اور پھر یہی ہوا بھی تھا۔ روز فوجیں جاتیں اور روز ناکامی کی خبریں لاتیں۔ دخت زر

مشرق کی طرف سفر کر رہا تھا۔ وہ فارس سے نکل کر ہمالیہ کی ترائی میں جا پہنچا تھا۔ ہر روز رات کو مرودقش، ملکہ لوران اور شہزادی کیاش اور شہزادہ لسار دہان کو مینا ستی اور دخت زر کی جھلک دکھا دیتا تھا۔ مینا ستی زندہ تھی اور اب اس کے ہاتھ اور آنکھیں کھول دی گئی تھیں۔ ہمالیہ سے مینا ستی بنگال جا پہنچی تھی۔ یہی دریاؤں کی سرزمین تھی جنگلات سے اٹکی ہوئی۔ یہاں بارش خوب ہوتی تھی۔ اور جا بجا ندی نالے بہتے تھے۔ یہاں تک پہنچ کر دخت زر رک گیا تھا اور اس کا سفر بھی آگے نہ ہوا تھا۔ ان تمام ہنگاموں میں دو سال گزر چکے تھے۔

ادھر کیاش، لسار دہان اور ملکہ لوران پوری طرح مرودقش کے زیر اثر آ چکے تھے۔ کیاش نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ بابل کی دوبارہ تعمیر کرے گا، مگر بادشاہ بن جانے کے بعد۔ مرودقش کے ایما پر ایک دن کیاش اور لسار دہان نے سوناشرب کو قتل کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور پھر بابل کی تعمیر شروع کی۔ پھر چند سال بعد ہی دخت زر ہی کے خاندان کے ایک اور بادشاہ نبوبولسار نے کیاش کی حکومت ختم کر کے پھر سے بابلی شہنشاہیت کی داغ بیل ڈال دی تھی۔

سرجان، روسی اور ہمارے دوسرے مصری رفقاء اپنے اپنے خیموں میں جا چکے تھے اور سبھی سو رہے تھے۔ میں بھی اپنے خیمہ میں تھا۔ یہ مناظر، یہ تاریخ اور یہ مینا ستی اور یہ مرودقش کے عجائب میری آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح چل کر خود بخود ختم ہو گئے تھے۔ یہ میرا الوراک تھا یا میرے دماغ کی منظر کشی تھی۔ خدا جانے کیا تھا مگر پھر بھی یہ سب کچھ میرے ذہن میں کھب سا گیا تھا نہ معلوم رات کو کب تک میں جاگتا رہا اور کب سویا۔

اگلی صبح بھی آرام کا وقت تھا۔ کل ہی سرجان نے یہ طے کر دیا تھا کہ اب چوں کہ چاندنی راتیں شروع ہو گئی تھیں۔ اس لیے اب دن کو ہم لوگ اپنے خیموں میں رہا کریں گے۔ اور رات کو اونٹوں پر سفر کیا کریں گے۔ اس دن تمام وقت ہم لوگوں نے آرام کیا۔ آرام کیا تھا فقط خیموں کی چھت کے سایہ میں آنکھیں جھپکتی تھیں۔ گرمی اس شدت کی تھی کہ بدن سے پسینہ رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ہم لوگوں کے رنگ سنولانے لگے تھے اور جسم سے پسینہ کی بدبو آنے لگی تھی۔ نہانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ پانی جو کچھ تھا بہت احتیاط سے خرچ ہوتا تھا۔ پھر اونٹوں کو بھی پانی پلانا ہوتا تھا۔ ہر دوسرے یا تیسرے دن

پچھلے کیمپوں سے ہمیں پانی اور خوراک کی کھیپ مل جایا کرتی تھی۔

یہ اسی رات کے سفر کی داستان ہے جو سینا شرب اور میناشتی کے تصویری فلم کے بعد ہم پر گزری۔

یہ ہمارے سفر کے آخری ہفتہ کا چوتھا دن تھا۔ ہم سب مگن تھے کہ اب فقط تین دن کے بعد سرجان مارشل کے وعدہ کے مطابق ہم لوگ واپس قاہرہ کی طرف جانے والے تھے۔ سرجان نے یہی کہا بھی تھا۔ ہماری ٹیم کے دو تین مصری پروفیسر تو بیمار ہو کر واپس لوٹ بھی چکے تھے۔ صرف پانچ قلی جن میں دو حبشی تھے اور دو مصری جو قاہرہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے تھے ہمارے ساتھ تھے۔ اور تین ہم لوگ تھے یعنی روسی، سرجان مارشل اور میں۔ اس طرح ہمارا قافلہ کل دس افراد پر مشتمل تھا۔

سرجان ٹیم کے لیڈر تھے۔ وہ سفر شروع ہونے سے قبل اپنے ساتھ لائے ہوئے نقشے پھیلا کر بیٹھتے تھے۔ وادی نیل کے یہ مفصل اور مکمل نقشے انہوں نے سوئز کینال کمپنی کے سروے ڈیپارٹمنٹ سے حاصل کیے تھے۔ ہر شام کو ہم سب ان کے خیمہ میں جمع ہوتے تھے۔ وہ زمین پر نقشے پھیلا دیتے تھے اور جن جن علاقوں اور حصوں پر ہم سب جا چکے تھے، تلاش شروع کر چکے تھے، ان کو سرخ پنسل کا نشان لگا کر الگ کر دیتے تھے گویا اس علاقہ پر ہمیں مزید تلاش نہیں کرنا تھا۔ اور تلاش کیا تھی، دریائے نیل کی وادی میں ایک الگ تھلگ سی ایسی پہاڑی جس کے قریب چکنی مٹی یا دریا کی تہہ سے بنی ہوئی مٹی کے نشانات موجود ہوں۔ ایسی پہاڑی کے دامن میں کسی جگہ فرعون رامیسیس کی لاش کو ممی بنا کر دفن کیا گیا تھا۔ جس کو ہم وہاں سے نکال لینا چاہتے تھے۔ قدیم مصر کی تاریخ میں مذہبی لحاظ سے سب سے زیادہ اہم یہی فرعون رمیسیس تھا کیونکہ ماہرین تاریخ کے مطابق یہی وہ فرعون تھا جس نے حضرت موسیٰ پر فوج کشی کی تھی۔ اور ان کی قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ عیسائی، یہودی اور مسلمانوں تینوں ہی کی نظر میں اس فرعون کی بڑی اہمیت تھی۔ آج تک کسی جگہ ایسا مقبرہ یا کسی اہرام سے اس فرعون کی لاش نہیں ملی تھی۔ اگر ہماری ٹیم کو یہ ممی کہیں سے مل جاتی تو نہ صرف ہمارا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتا بلکہ یہ علم الاہرامیات اور علم مصریالوجی کے لیے بھی ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔ یہی جذبہ تھا جو سرجان مارشل کو مجنونانہ طریقہ پر اس تلاش میں مصروف رکھے ہوئے تھا۔

اس سفر میں جو قلی ہمارے ساتھ تھے ان میں سے دو ایسے تھے جو ذرا خصوصیت سے قابل ذکر تھے۔ ایک تو مصری قلی تھا جس کا نام خداعی تھا۔ یہ کچھ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ بے حد مستعد و نرم مزاج وہ ہر وقت ہم لوگوں کے قریب رہتا تھا۔ ہر خدمت کے لیے تیار۔ یہی ہمارے لیے کھانا وغیرہ تیار کرتا تھا۔ اور یہی ہم لوگوں کے لیے بستر، ٹرنک اور ذاتی سامان کا خیال بھی رکھتا تھا۔ اس کی ہمیشہ کوشش یہی ہوتی تھی کہ جب تک ہم لوگ سو نہ جائیں وہ ہمارے قریب ہی رہے۔ جب دن بھر کی تلاش کے بعد ہم لوگ واپس لوٹتے تھے تو ہمیں واپسی پر ہر چیز بستر، کپڑے، تولیہ وغیرہ سب کچھ قرینے سے رکھا ہوا ملتا تھا۔ اور سب خدمات خداعی ہی کی مرہون منت تھیں۔ سرجان اس سے بے حد خوش تھے اور اکثر و بیشتر اسے انعام و اکرام سے نوازتے رہتے تھے۔

سرجان کو کھانے وغیرہ سے کچھ زیادہ رغبت نہ تھی۔ اور نہ اچھے اور عمدہ کھانوں کے ایسے رسیا تھے۔ جو کچھ مل جاتا کھا لیتے اور خداعی بھی کچھ ایسا عمدہ باورچی نہ تھا۔ بس گذارہ کے لائق تک وہ ٹھیک تھا۔ مگر چوں کہ اس کی خدمات یا جذبۂ خدمت سرجان مارشل کو بہت پسند تھا سو وہ اکثر و بیشتر انعامات دیتے تھے۔ ان کے انعام دینے کا انداز بھی سب سے جدا تھا۔ ہم سب لوگ کھانے پر بیٹھتے تو سرجان خداعی کو پکارتے۔ "ارے بھائی خداعی! کیا عمدہ کھانا پکاتے ہو! اگر برطانیہ میں ہوتے تو وہاں کے لارڈ تمہیں کہاں چھوڑتے! اس سفر میں تمہیں دینے کے لیے ہمارے پاس کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ مگر رکو۔ شاید کچھ نکل ہی آئے" اور پھر۔ "لو بھئی تمہاری قسمت۔ پانچ مصری پاؤنڈ تو جیب سے نکل ہی آئے ہیں لو بھئی خداعی! یہ تمہارے ہیں مگر یہ اس عمدہ کھانے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو تم نے ہمیں کھلایا ہے"۔

اس طرح سرجان مارشل اس کو اعزاز و اکرام سے نوازتے رہتے۔ ان کی عادت تھی کہ کسی کو اپنی علمیت سے، کسی کو اپنی محبت و ہمدردی سے اور کسی کو انعام و اکرام سے خوش رکھا کرتے تھے لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ بعد میں جب ہم مصر اور وہاں سے عراق پہنچے تو ایک عرصہ کے بعد ہم پر یہ راز ظاہر ہوا کہ اشرف بیگ اور شیخ سباعی کا آدمی تھا وہ خداعی جو ہماری نگرانی کے لیے ہم پر مسلط تھا۔

دوسرا قلی حبشی تھا۔ اس کا نام شمرو تھا۔ شمرو دوسرے حبشی قلیوں کے برخلاف جو کسی نہ کسی سفارش سے ہم تک پہنچے تھے از خود ہمارے پاس آیا تھا۔ ہم سے کسی کو اس کا

حسب نسب، اس کا ماضی، اس کا گھر اور خاندانی پس منظر وغیرہ کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ وہ خود ہی ہم تک پہنچا تھا۔ تنومند و توانا، پھرتیلا، چھوٹ سے بھی نکلتا ہوا قد، نسیم شمیم، ہر کام کے لیے مستعد اور ہر خدمت کے لیے تیار، رنگ سیاہ بلکہ چمک دار سیاہ، ہونٹ موٹے، کانوں میں چھلے پہنے ہوئے اور گھونگھریالے بالوں کے ساتھ وہ ایک روایتی اور پیدائشی غلام نظر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں البتہ غیر معمولی طور پر چمک دار تھیں۔ ان میں ایک عجیب قسم کی مقناطیسیت تھی۔ کوئی شخص بھی اس سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کرسکتا تھا۔ میں جب بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تھا تو مجھے یوں لگتا تھا گویا میں کسی گہرے کنوئیں میں اتر رہا ہوں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سا سحر تھا۔ ہمارے پورے گروپ میں شرو فقط میرے لیے ایک خاص قسم کی تعظیم کا اظہار کرتا تھا۔ جب بھی میں نظریں اٹھاتا تو وہ گھبرا کر آنکھیں جھکا لیتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے "آقا" کہتا تھا۔ سر جان مارشل روس اور باقی مصری پروفیسر اس کے لیے فقط "سر" تھے۔ ان کو ہمیشہ "سر" یا "جناب" یا "پاشا" کہہ کر خطاب کرتا تھا مگر میرے لیے وہ ایک ہی لفظ استعمال کرتا تھا۔ "آقا.... آقا"۔

باب نمبر ۱۷

شرو ہمارے ساتھ قاہرہ میں نہیں ملا تھا۔ بلکہ جب ہم قاہرہ سے چل کر دو دن کی مسافت طے کر چکے تھے اور کیکر کی خشک جھاڑیوں کے ریتیلے میدانوں کو عبور کر رہے تھے تو وہ ایک شام کو ویرانے میں دوران سفر نہ معلوم کس طرف سے نکل کر ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔ سرجان مارشل ابھی حیران ہی ہو رہے تھے کہ یہ شخص کہاں سے ایک دم آگیا ہے کہ اس نے سرجان مارشل سے کہا" .... تین ستاروں والا میرا آقا کہاں ہے؟ میں اس کی غلامی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔" سرجان کچھ بھی نہ سمجھے کہ اس کا مطلب کیا ہے لیکن میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ میری طرف ہے کیونکہ میرے اندرون جسمانی خصوصیات ایسی تھیں جو میرے علاوہ شاذو نادر ہی کسی میں ہوتی ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ میرے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ اتنے لمبے کہ گھٹنوں تک آتے تھے اور دوسرے یہ کہ میرے ماتھے پر دائیں طرف قریب قریب ایسے پیدائشی نشان تھے جیسے وہ ستارے رہے ہوں۔ پہلی مرتبہ ان ستاروں کی موجودگی کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب اس حبشی ساحرہ جاشی نے ایک کرکٹ میچ کے بعد کاؤنٹی میں پکنک کے دوران ملاقات کے موقع پر مجھے بتایا۔ جب شرو نے کہا کہ تین ستاروں والے کی غلامی کے لیے آیا ہوں تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے اندر کی طاقت مجھ سے کہہ رہی ہو کہ یہ تم ہی سے تو کہا جا رہا ہے، یہ خطاب تو تمہارے لیے ہی ہے، تم ہی کو اس کا آقا بننا ہے۔

میں نے سرجان مارشل سے اس شخص کو نوکری میں لے لینے کی سفارش کی۔ سرجان اس کی آنکھوں کی چمک سے بڑے متاثر تھے۔ وہ شاید اسے کوئی سخت چالباز یا مکار سمجھ رہے تھے مگر نہ چاہنے کے باوجود انہوں نے شرو سے بات چیت شروع کی۔ اس کا نام پوچھا اور تنخواہ کے بارے میں اس کا عندیہ معلوم کیا۔ دوسرے حبشی خادموں کے برعکس جنہوں نے تنخواہ کے معاملے میں کافی حیل و حجت سے کام لیا تھا اور اپنی مرضی سے منہ مانگی تنخواہ مقرر کرائی تھی شرو نے تنخواہ کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس کی گفتگو اور اس کے انداز سے ایسا لگتا تھا کہ وہ بغیر کسی اجرت اور تنخواہ کے بھی ہمارے ساتھ ریگستان کی صعوبتیں جھیلنے کے لیے تیار ہے اور جب سرجان مارشل نے اس سے کہا تھا "ہم

نے تمہیں جان میلکم کے ذاتی خدمت گار کی حیثیت سے اپنی ٹیم میں شامل کر لیا ہے..."
ایسا لگتا تھا کہ یہ الفاظ سرجان نے خود نہیں کہے ہیں بلکہ کوئی طاقت ان سے کہلوا رہی ہے۔ غرضیکہ شرد اس طرح سے ملازم رکھ لیا گیا۔ وہ ہر وقت میرے قریب رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ میرے بستر لگانے، کھانے کے برتن دھونے، کپڑے صاف کرنے اور میرے لونٹ وکٹر کو پانی پلانے غرضیکہ میری ہر چیز اور ہر کام کو اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ شرد کے لیے میرے عجیب سے جذبات تھے۔ میرے اندر ذہن میں کوئی مجھ سے یہ کہتا تھا کہ شرد اپنے سینے میں بہت سے اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ جانے والی ٹیم میں قلی ہوتا تھا اور میرے ہر کام اور میری ہر خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔
شرد کے بارے میں چند باتیں عجیب عجیب سی قافلے کے قلیوں میں مشہور تھیں مثلاً یہ کہ ایک سے زیادہ مرتبہ یوں ہوا کہ رات کو شرد اپنا کام ختم کر کے اپنے خیمے میں آرام کرنے کی غرض سے داخل ہوا اور جب اس کے ساتھی قلی کام سے فراغت کے بعد رات کو گپ شپ مارنے کے لیے اس کے خیمہ کی طرف گئے تو شرد وہاں موجود نہیں تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد جب دوسرے قلی بھی اس کا خیمہ دیکھنے کے لیے گئے تو شرد پھر کمرے میں خراٹے لے رہا تھا مگر نہ کسی نے اس کو اندر سے باہر جاتے دیکھا تھا اور نہ ہی باہر سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ کب خیمہ سے نکلا اور کب خیمہ میں دوبارہ داخل ہوا یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا اگر کسی نے پوچھا بھی تو شرد نے کبھی کسی کو کوئی جواب ہی نہیں دیا۔
ایک تو وہ پہلے ہی سے اپنی کم گوئی اور خاموشی کی وجہ سے ذرا پراسرار سا تھا اور پھر بعد میں تو لوگ اسے ایک بے حد سر انگیز شخصیت سمجھنے لگے تھے۔ مگر میرے ساتھ اس کا رویہ نہایت فرماں بردار غلاموں جیسا تھا اور میرے ساتھ وہ ہمیشہ اس طرح رہتا تھا جیسے کوئی باڈی گارڈ ہوتا ہے۔ سفر میں وہ ہمیشہ میرے ساتھ وکٹر پر سوار ہوتا اور قیام کے دوران اس کا خیمہ میرے قریب ہی لگا ہوتا۔ وہ شاذ و نادر ہی کبھی بولتا تھا یا بات کرتا تھا۔
جس دن سرجان نے ٹیم کے باقی ممبران کی ضد سے مجبور ہو کر یہ اعلان کیا تھا کہ اگر ایک ہفتہ تک کی تلاش میں فرعون رمیسیس کی ممی نہ ملی تو ہم یہ تلاش فی الحال ملتوی کر دیں گے اور واپس لوٹ جائیں گے تو اس دن شرد کی حالت قابل دید تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا اضطراب تھا۔ آنکھوں سے اس کی بے چینی صاف ظاہر ہوتی تھی۔ اس کا

چمک دار سیاہ رنگ کچھ پھیکا سا ہو چکا تھا۔ جب بھی وہ مجھے تنہا دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ پاتا تھا۔ خدا جانے وہ کیا بات تھی جو اس کے ہونٹوں پر آکر رک جاتی تھی۔

جس دن کا یہ قصہ ہے وہ غالباً اس طے شدہ ہفتہ کا آخری دن تھا۔ جس کو ہم نے اپنی ناکامی کا آخری ہفتہ مقرر کیا تھا۔ ہم لوگ دن بھر اپنے اپنے خیموں میں رہے۔ خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ موسم کی بے رحمی، گھر والوں کی یاد، اشرف بیگ، شیخ سباعی، سوئز کنال کے ڈائریکٹروں کا قتل، سوئز کمپنی کے جہاز وکٹوریہ کی غرقابی اور والئی مصر کی بزدلی، برطانوی حکومت کی مصر میں حکمتِ عملی وغیرہ ایسے موضوعات تھے جن پر اکثر و بیشتر ہم لوگ بحث و تمحیص کرتے تھے۔ البتہ سرجان مارشل کی گفتگو اکثر و بیشتر علمی اور بڑی پر مغز ہوتی تھی۔ ان کا اوڑھنا بچھونا فقط تاریخ اور تاریخ ہی تھا۔

شام کو چھ بجے ہماری روانگی طے تھی۔ اونٹوں پر کجاوہ اور محمل کس دی گئی تھیں۔ پانی کا راشن تقسیم ہو چکا تھا۔ نقشوں اور چارٹوں کی مدد سے سروے کیے جانے والی تیس تیس میل کے رقبے کی مکمل نشان دہی کر دی گئی تھی۔ تین اطراف میں ایک دائرہ کی شکل میں تین ٹیموں کو سروے کرنا تھا۔ سرجان اور روسی اور قلی اور ایک مصری پروفیسر ایک تیسری جماعت کے ارکان تھے۔

روانگی سے چند منٹ قبل میں اپنی دوربین اور قطب نما لئے اپنے خیمہ میں گیا تو میں نے دیکھا کہ شرو خیمہ کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اس کی انگلی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے کسی چیز پر جم گئی تھیں۔ وہ ہر شے سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کوئی چیز تھی جس پر اس کی بائیں ہاتھ کی انگلی سے خون نکل نکل کر ٹپک رہا تھا۔ میں ذرا اور آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ شرو کے ہاتھ کا خون ایک چھوٹی سی ہڈی پر گر رہا تھا۔ وہ ہڈی سائز اور شکل کے اعتبار سے اسی ہڈی سے ملتی تھی جو مبشی ساحرہ جاشں نے مجھے اسکاٹ لینڈ کے قیام کے دوران مردوقش ساحر کے نام سے منسوب کر کے دی تھی۔ اور جس پر اکثر میں نے ماضی کی تاریخ کے مناظر ابھرتے دیکھے تھے۔

خون ہڈی پر گر رہا تھا اور شرو کے لب ہل رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا:-

"مردوخ دیوتا کی قربان گاہ کے لیے یہ خون کے چند قطرے کچھ بھی نہیں مگر یہ چھوٹی سی بھینٹ بھی غلاموں کی وفاداری کا ثبوت ہے۔

عظیم مردوتش اس کے پیروں کے نیچے سے مٹی کھینچ لے، رت ہٹا دے، بادل ہٹا دے۔ آج چودھویں کا چاند بھی چمکتا ہے، تینوں ستاروں کو بھی چمکا دے!"

پھر وہ میری طرف مڑا جیسے کہ اس کو معلوم ہو کہ میں اس کے پیچھے کھڑا ہوں اور پھر بولا۔ "آقا! میں نے غلامی کی ہے۔ غلام مشورے نہیں دیا کرتے۔ مگر آقا! تو رت کے اندر اور بادل کے پیچھے کیوں نہیں دیکھتا؟ وقت تیرے اشاروں پر پلٹتا ہے۔ مگر تو اپنی طاقت سے کام کیوں نہیں لیتا؟"

پھر اس نے ہڈی کو میرے سامنے کیا اور خون کے چند قطرے میرے قدموں میں ڈال دیئے اور کہنے لگا:۔

"دیوتا! بھینٹ ہو چکی۔ اب وقت کی گرہ کھول دے۔ اب راستہ دے کہ راستہ کا چلنے والا تیری طرف آرہا ہے!"

میں کچھ نہ بولا۔ شرو ایک لمحہ رکا۔ اس کی پراسرار آنکھوں نے مجھے دیکھا اور پھر اس نے نگاہیں جھکا لیں پھر وہ یکایک غلاموں کے سے انداز میں فرشی سلام کرنے جھکا اور اس کے بعد خیمہ سے نکل گیا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔

روسی اور سرجان والی پارٹی ہم سے دس منٹ قبل روانہ ہوئی تھی اور پھر باقی دو گروپ ساتھ ساتھ چلے۔ اس رات چاند مکمل تھا۔ روشنی شروع رات ہی سے پھیلی ہوئی تھی۔ صحرا کا رومان ایک اور ہی قسم کا رومان ہے۔ رات کی ہوائیں صحرا میں بہت خنک خنک سی ہوتی ہیں۔ دن میں جہاں ریگستانوں میں آگ برستی ہے، رات کو نرمی، ٹھنڈک اور ایک فرحت بخش لطافت چاروں سمت پھیلی ہوتی ہے۔ اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی کی آواز صحرا کی خاموش فضا میں ہوا کی سرسراہٹ سے ہم آہنگ ہو کر ایک بڑی ہی دل نواز اور دل کش موسیقیت پیدا کرتی ہے۔

اس رات کو چاند پورا تھا، ہوا میں نمی سی تھی اور رات کا موسم جیسا صحرا کا قاعدہ ہے خوش گوار خنکی لئے ہوئے تھا۔ آسمان صاف تھا اور بادلوں کے داغ سے پاک۔ ستارے چمک دار اور بڑے قریب قریب نظر آرہے تھے۔ اور ہم راستہ کے اونچے نیچے چھوٹے موٹے ٹیلوں کو دیکھتے بھالتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ کہیں کہیں خشک جھاڑی مل جاتی تو ہم وکٹر کی تواضع بھی کر ڈالتے۔ وکٹر بڑا اچھا جوان اور مطیع اونٹ تھا اسی طرح چلتے چلتے ہم کوئی چار گھنٹے گزار چکے تھے۔ میں کچھ کچھ اونگھ رہا تھا تو میں نے مہار اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے

شرد کے ہاتھ میں دے دی تھی۔

یکایک ایسا لگا جیسے کہ شرد کی چیخ نکلی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ حواس جاگ گئے تو نگھ غائب ہو گئی۔ شرد کی چیخ نے ماحول کا سکوت درہم برہم کر دیا تھا۔ دونوں اونٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگ چونک کر پوری طرح جاگ گئے۔

شرد منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ "ہٹ جاؤ ہاتھ روک لو ہاتھ روک لو، میرا آقا آگیا تو تمہاری روح تک چیخ جائے گی۔ ہٹ جاؤ!"

کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ شرد نے پھر چونک کر ایک طرف دیکھا تو مجھ سے کہنے لگا۔ "آقا! نیچے کود جاؤ۔ ملکہ لوران کا رومال سر پر رکھ لو۔ اور مردوقش کا تحفہ ہاتھ میں لے لو۔ دن کا وقت آگیا ہے۔ چراغ بجھنے سے پہلے بھڑک رہا ہے"۔

دونوں اونٹ خود ہی رک گئے۔ نہ معلوم وہ کس خطرے کا احساس کر رہے تھے۔ ان کے منہ سے عجیب عجیب ڈراؤنی آواز نکل رہی تھی۔ وہ ایک سمت منہ کر کے چیختے اور پھر سر نیچا کر لیتے۔ ہم سب اونٹوں سے اتر گئے تھے۔ میں نے لوران کا رومال سر پر رکھ لیا۔ اور مردوقش کی ہڈی ہاتھ میں لے لی۔ دل کہتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ یکایک آندھی کا سا ایک بگولہ ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ لگتا تھا کہ بگولہ سے ہوا کی سرسراہٹ نہیں آرہی بلکہ کسی کے گانے اور خوشی و مسرت کی ملی جلی چیخیں سی سنائی دے رہی ہیں۔ یہ بگولہ لحظہ لحظہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا اور بلندی سے نیچے کی طرف تیزی سے اترتا آرہا تھا۔ شرد نے کہا۔ "آقا ہوشیار! یہ آگیا ہے۔"

گرد و غبار کا طوفان بگولوں کی طرح اڑتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ یہ ایک اکیلا مٹیالے سے رنگ کا بادل تھا۔ جو تیزی سے پھیلتا سمٹتا اسی سمت بڑھا چلا آتا تھا۔ جہاں ہم اور ہمارے دونوں اونٹ کھڑے تھے۔ ہم چاروں ابھی یہی دیکھ رہے تھے کہ یہ کیسا بادل ہے جو تنہا سفر کر رہا ہے۔ آسمان پر اور کوئی بادل نظر نہ آتا تھا۔ سارا کا سارا آسمان بالکل صاف تھا۔ چاند اور ستارے اب بھی پہلے ہی کی طرح چمک رہے تھے۔ شرد، خداعی، میں اور وہ حبشی غلام منہ اٹھائے اسی بادل کے ٹکڑے کو تکے جا رہے تھے۔ جس میں سے کبھی تو گرج ترنخ کی آوازیں نکلتی تھیں اور کبھی جانوروں کی سی غراہٹیں سنائی دیتی تھیں۔ یہ ڈراؤنی آوازیں اس ویران صحرا میں کسی کا بھی دل ہلا دینے کے لیے کافی تھیں۔

ہمارے دونوں اونٹ بالکل نیم جاں ہو چکے تھے۔ کہتے ہیں کہ جانوروں کی چھٹی حس

بڑی تیز ہوتی ہے۔ وہ خطروں کو پہلے ہی محسوس کر لیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں اونٹ بالکل ساکت سے تھے۔ وہ کبھی گردن تھوڑا کر نیچے کر لیتے کبھی منہ ریت پر رکھ لیتے، کبھی ان کا سارا جسم کانپنے لگتا تو بدحواس ہو کر گردن اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی روح ان کے جسموں سے کھنچ رہی ہو۔ اور وہ جاں کنی کے عذاب سے گزر رہے ہوں۔

گرد و غبار کا مٹیالا بادل ہمارے سروں پر آ کر رک گیا تھا۔ ہمارا دونوں اونٹوں پر لدا ہوا چار آدمیوں کا یہ قافلہ عین اس بادل کی زد میں تھا۔ اس کی چھتری ہمارے اوپر تن گئی تھی۔ آسمان، چاند، ستارے کچھ بھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ بادل کے نیچے ہوا بالکل ساکن ہو گئی تھی اور گرمی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

بادل سے خوفناک گڑگڑاہٹیں مستقل سنائی دے رہی تھیں اور کبھی کبھی بجلیاں سی چمکنے لگتی تھیں۔ بادل کے نیچے کی فضا میں گرمی اور گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم سب کی نظریں اسی بادل پر جمی ہوئی تھیں۔ شردتوا سے یوں گھور رہا تھا جیسے اس کی نظر آر پار نکلی جا رہی ہو۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ بادل نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔

جیسے ہی بادل نیچے کی طرف آتا محسوس ہوا شردو کی آنکھوں کی چمک بھی بڑھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں خون اترتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس کا کوئی خونی دشمن سامنے آ گیا ہو۔ یکایک وہ اونٹ سے کودا اور چلا کر سب کو میرے قریب ہو جانے کی ہدایت کی اور خود آنکھیں بند کر کے ہاتھوں کو اوپر بلند کر لیا۔ ہم سب نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں میں ایک لمبی سی ہڈی کا ٹکڑا تھا۔

آنکھیں بند کر کے وہ چند لمحہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی آوازیں رفتہ رفتہ تیز تر ہوتی گئیں اور اب وہ چیخ چیخ کر، چلا چلا کر ایک نامعلوم سی زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اسی طرح ہڈی کو آسمان کی طرف اٹھائے اٹھائے وہ والہانہ انداز میں کچھ پڑھتا اور کچھ گاتا رہا۔ اس پر ایک بے خودی سی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی پر جوش کیفیت میں اب مجنونانہ رنگ جھلکنے لگا تھا۔ اور پھر ایک بے ساختگی کے ساتھ اس نے ہڈی کو اسی طرح آسمان کی طرف اٹھائے اٹھائے اونٹوں کے اور ہمارے گرد رقص کرنا شروع کر دیا۔ وہ چیختا، چلاتا، گاتا، شور کرتا اور نہ جانے کیا کیا پڑھتا، دائرہ کی صورت میں ہمارے گردا گرد چکر لگا رہا تھا۔ اور پھر اس کے رقص میں تیزی آتی گئی۔ شاید اس کے

قدموں میں سیماب لپیٹ دیا گیا تھا یا بجلی بھر دی گئی تھی اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ لگتا تھا جیسے کوئی بگولہ ہے جو ہمارے اطراف میں گھوم رہا ہے۔

دبیز مٹیالے بادل کی تہہ زینہ بہ زینہ نیچے اترتی آ رہی تھی اور اسی رفتار سے حبس، گھٹن اور گرمی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب بدبو سی پھیلنے لگی تھی جیسے مرگھٹوں یا شمشان سے جلتے ہوئے جسموں کی سڑاند پھیلتی ہے۔ یا جیسے مردہ جانوروں کی بدبو سب طرف پھیلتی اور بکھر جاتی ہے۔ اسی بدبو اور حبس گھٹن کے ساتھ بادل سے گڑگڑاہٹیں اور گرج بھی سنائی دے رہی تھیں اور ہر لمحہ ان کی ہیبت بڑھتی جا رہی تھی۔ گھٹن نے سانس لینا بھی دوبھر کر دیا تھا۔ اونٹ سراسیمہ ہونے لگے تھے۔ حبشی قلی اور مصری خادم خداعی کی رنگتیں زرد ہو چکی تھیں بس ایک شرو ہی تھا جس کے قریب قریب بھی خوف کا گزر نہ تھا، جو دیوانہ وار شعلوں کی طرح رقص کر رہا تھا اور ایک میں تھا جو دونوں اونٹوں کی مہاریں تھامے کھڑا تھا لیکن میرے ہمراہی نیم جان اور مضطرب تھے۔ شرو پر تو ایک مستی اور مدہوشی سی طاری تھی مگر خداعی اور حبشی!! بس بالکل پیلے ہو چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اب کوئی لمحہ جاتا ہے کہ خون ان کے جسموں سے نچوڑ لیا جائے گا۔ کبھی وہ ادھر دیکھتے اور کبھی اُدھر۔ بادل کی طرف دیکھ دیکھ کر خوف سے انکی چیخیں نکل رہی تھیں۔ اور ابھی بادل چالیس پچاس فٹ اونچا تھا۔ مگر سانس کی گھٹن اور دل کی دھڑکن ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ خداعی کبھی ہاتھ سر پر لے جاتا کبھی ادھر ادھر سر کے اوپر کوئی چیز جھلتا جیسے مکھیاں اڑا رہا ہو یا جیسے اُس بادل کو ہاتھوں پر روکنا چاہتا ہو اور کبھی آگے سے ایک دم پشت کی طرف مڑ جاتا، کبھی دائیں گھومتا تو کبھی بائیں طرف۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ دشمن اس کے سامنے کھڑا ہے جو کسی وقت بھی اس پر وار کرنے کو مستعد ہے۔

بادل کا ٹکڑا بہ مشکل بیس پچیس فٹ اونچا رہ گیا تھا۔ شرو کا سیمابی رقص اسی طرح جاری تھا اور حبشی قلی اور مصری خادم دونوں اب وحشت کی انتہائی حدوں پر تھے۔ اونٹوں نے تو منہ ریت پر ڈال دیئے تھے۔ لگتا تھا جیسے ان کی جان ہی نکل چکی ہو۔ میں ایک دم ذرا اونٹوں کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ خداعی اور حبشی میری نظروں کے حصار سے نکلے۔ میری توجہ ہٹی اور وہ چیختے چلاتے یکایک تیزی سے شرو کے اس رقص سے بننے والے اس دائرہ سے نکل بھاگے جو اس نے ہم سب کے اور اونٹوں کے چاروں طرف بنا رکھا تھا۔

اونٹ زندہ تھے۔ ان کے جسم میں سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ دیکھ کر جو میں نے خداعی کی طرف نظر کی تو وہ مجھے دائرہ سے باہر نظر آیا۔ شرد کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہوگیا ہے مگر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے ان کا انجام بتا دیا ہے۔ دو باتیں ساتھ ساتھ ہوئیں۔ جو ہڈی شرد کے ہاتھ میں تھی اور آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی اس میں یکایک ایک روشنی کی تیز کرن سی پھوٹی جو اوپر کی طرف بڑھی اور جیسے ہی یہ شعاع اس بادل سے ٹکرائی اور نہایت ہی ہیبت ناک تڑاخا سا ہوا۔ یوں لگا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ گڑگڑاہٹ اور خوفناک آوازوں کے ساتھ بادل کی تنی ہوئی مہیب چادر پھٹ گئی اور دوسری طرف بادل کے گرد و غبار کا جو حصہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پھٹا تھا وہ زمین کی طرف آیا اور خداعی اور حبشی غلام دونوں آن کی آن میں اس کی لپیٹ میں آکر نظروں سے غائب ہوگئے۔

گرد و غبار اور بدبودار مٹیالے رنگ کا یہ بادل بھی اب نیچے کی بجائے اوپر کی طرف اٹھنا شروع ہوا۔ پہلے تو ذرا آہستہ مگر پھر بڑی برق رفتاری سے واپس جاتا ہوا محسوس ہوا۔ اس میں سے اب چیخوں کی اور رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خوفناک گڑگڑاہٹیں دور ہوتے ہوتے بالکل ہی ماند پڑ گئیں۔ اس روشنی کی تیز کرن نے بادل کو نہ صرف بیچوں بیچ سے چیر ڈالا تھا بلکہ اس کی گرمی، گھٹن اور حبس کو بھی ختم کر دیا تھا جو بادل نے ہمارے سروں پر مسلط کر دیا تھا۔ گرد و غبار کی یہ چھتری بلند ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ہاں مگر خداعی اور حبشی کا اب دور دور تک کچھ پتہ نہ تھا۔ خدا جانے انہیں زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ یا بادل ہی نے اڑا کر ساتھ محبوس کر لیا تھا۔

ادھر شرد کے رقص میں بھی بتدریج کمی آگئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی رفتار کم ہونے لگی اور چند مزید یہ دائرے بنا کر وہ بھی نڈھال ہو کر ایک طرف گر گیا۔ اونٹوں کی گردنیں آہستہ آہستہ پھر اٹھ گئیں اور چاند، ستارے، آسمان، خنک ہوا سب کے سب صحرا کے اس رومانی ماحول میں سانس لینے لگے جو اس خوفناک بادل کی آمد سے قبل ہم سب کو مدہوش کیے دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یا شاید یہ ایک خواب تھا جو دیکھا گیا تھا یا ایک لمحہ تھا جو گزر گیا تھا۔ اس سارے ہنگامے میں بمشکل آدھا گھنٹہ صرف ہوا مگر محسوس ایسا ہوتا تھا کہ صدیوں کے عذاب سے جان بچی۔

شرد نے چند لمحے بعد آنکھ کھولی۔ اس کے سارے جسم پر مشقت کے قطرے بہہ رہے تھے۔ جسم کے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

اس کی پلکوں پر بھی پسینہ کے قطرے الجھے ہوئے تھے اور مارے تھکن کے وہ چور چور نظر آتا تھا۔ اس نے کہا
"آقا! وہ ہمیں گرفتار کرنے آئے تھے، ناکام ہو گئے ہیں۔ مگر اپنا کام کچھ کر لیا ہے۔ انہوں نے دھوئیں کے دبیز پردوں کے پیچھے تمہارے دوست روس اور سرجان کو ریت میں چھپا دیا ہے۔ جلدی چلو آقا، جلدی۔ ہمارا تو وہ کچھ نہیں بگاڑ سکے مگر سرجان مارشل سخت خطرہ میں ہیں۔ سب لوگ خطرہ میں ہیں"۔
مشرو! وہ حبشی اور خدامی دونوں بادل کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ ان کو بھی بچانا ہے۔ وہ کہاں ہیں؟"
"آقا! ان کو دیوتاؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔ وہ دائرہ سے نہ نکلتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اب جلدی چلو۔ ورنہ سرجان مارشل بھی کبھی ہاتھ نہ آسکیں گے۔"
"مشرو! مگر کدھر؟ کس طرف؟؟"
"آقا! سرجان کی طرف! سرجان کی طرف!!
وہ کیا کہہ رہا تھا مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ کدھر جا رہا تھا مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ بس اس کا اور میرا اونٹ آگے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ مجھے نہ منزل کی خبر تھی نہ راستے کا کچھ علم تھا اور میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس سنسان صحرا میں ہم دونوں کتنی دیر تک اپنے اونٹوں کو سرپٹ دوڑاتے رہے تھے۔
پھر کسی وقت شرو نے دوڑتے ہوئے اونٹ کی مہار کھینچ لی تھی تو میں بھی رک گیا تھا۔ سامنے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہر کی مانند دھوئیں نے سارے ماحول کو ہر طرف سے ایک غلاف میں لپیٹ لیا ہو۔ سفید سفید دھواں ہمارے سامنے ایک دیوار کی طرح چھایا ہوا تھا اور اس دھوئیں کی وجہ سے آگے کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔
"آقا! ہم سارجان کی سرحدوں پر آ چکے ہیں۔ یہاں صرف دیوتا مردوخ کے عظیم سیوک، مردوقش اور ملکہ اور ان کی طاقتیں کام کر سکتی ہیں۔ میری اب کچھ بساط نہیں۔ مجھے اتنا ہی حکم تھا کہ آپ کو سارجان تک پہنچا دوں۔ دیوتاؤں کی مرضی سے یہ کام ہو چکا ہے۔ مگر میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ کیونکہ مجھے واپسی کا کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے۔"
سارجان کیا تھا؟...... مُردوں کی دنیا...... زندگی کی حدوں سے دور کسی ایسی کائنات

یہاں صرف اشکال اور آوازیں تھیں۔ سانس اور رگوں میں دوڑنے والا خون کہیں نہ تھا۔ یہ ہزاروں سال قدیم ایک مصری قبرستان تھا جہاں ویرانے میں قدیم فراعین کے دور کا معبد موجود تھا۔ یہ معبد معمولی سی پہاڑی کے دامن میں کئی ہزار سال سے اسی طرح سر اٹھائے کھڑا تھا۔ سارحان دھوئیں کی ایک چادر کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ شرو کہے جا رہا گیا اور میں سنتا گیا۔

شرو کہہ رہا تھا۔ "سارحان ایک نادیدہ مخلوق کی پناہ گاہ ہے۔ یہ ان بادشاہوں، جنگجو سپہ سالاروں، عالی مرتبت پروہتوں اور مقدس کاہنوں کا مسکن ہے جو فراعین کے دربار سے منسلک ہوتے تھے۔ مگر جن کے جسم نہ ممیاں بن سکے اور نہ ہی کسی اہرام میں محفوظ ہو سکے۔ ارض مصر کا ہر ساحر سارحان کے راز سے واقف ہوتا تھا۔ مگر اس کی نشاندہی کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ سارحان کہاں ہے، کس جگہ واقع ہے؟ جب تک کہ سارحان کے مکین خود ہی اپنی سرحدوں تک کسی کو کھینچ نہ لائیں کوئی ذی روح یہاں تک نہیں آسکتا تھا۔ شاید سرجان مارشل کسی بے خیالی میں یا غیر دانستہ طور پر ان کی سرحدوں سے آٹکرائے تھے۔ ان نادیدہ قوتوں نے ان کے ذہن کی کھوج پڑھ لی تھی۔ ان پر حملہ کر کے ان کو بے بس بھی کر دیا تھا۔ اور پھر وہ ان ہی کے قدموں کے نشانات سے ہم تک جا پہنچے تھے۔ گرم ہوا کا بادل سارحان کی ہزاروں مردہ روحوں کے دھوئیں جیسے ہیولوں ہی سے مل کر بنا تھا اور شاید خداعی اور حبشی دونوں سارحان کے ان ہی باشندوں کی قید میں تھے۔"

شرو کے ذمے شاید شروع ہی سے یہ فرض تھا کہ سارحان والے جب بھی مشتعل ہو کر مجھ پر حملہ کریں تو وہ دفاع کرے اور پھر مجھے سارحان تک لے جائے۔

سرجان مارشل یا ان کی ٹیم کے کسی ممبر کا یہاں کوئی پتہ نہ تھا۔ نہ کوئی آواز تھی نہ حرکت، نہ شور نہ کوئی غوغا۔ ہر طرف سکوت سا چھایا ہوا تھا اور ہمارے سامنے کہر کی طرح سفید دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ چاندنی رات کی روشنی میں ماحول بالکل اسی طرح کا تھا جیسا اسکاٹ لینڈ میں سردیوں کی کسی صبح کو کہر نے ماحول کی ہر شے کو ڈھانپ لیا ہو۔ ملگجے اجالوں میں دودھیا کہر کا غلاف ہمارے چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ خاموشی اور بے آواز خاموشی پورے ماحول پر مسلط تھی گویا یہ سارحان کی سرحدوں کا ابتدائی دفاعی حصار تھا۔

ہم جس خوفناک بادل کی گھن گرج سے نکل کر یہاں تک آئے تھے وہ اب فقط ایک

خیال کی مانند رہ گیا تھا۔ اپنے ددساتھی گنوا کر ہم یوں بے حس سے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ شاید جس ماحول میں ہم اس وقت تھے وہ بس اب، ابھی اور اسی وقت تک محدود تھا۔ ان لمحات میں نہ مستقبل کچھ تھا، نہ ماضی کچھ تھا۔ بس حال ہی حال تھا۔

میں اور شرو دونوں اپنے لوشنوں سے اتر کر زمین پر آگئے تھے۔ میرا اونٹ وکٹر مجھ سے بہت مانوس تھا۔ میں نے مہار چھوڑ کر اس کی گردن تھپ تھپائی۔ وہ میرے اشارے سمجھتا تھا۔ میں نے اس کی طرف منہ کر کے کہا۔

"وکٹر! ایک سخت معرکہ ہونے والا ہے۔ تمہیں کچھ نہ ہوگا تم یہاں سے کہیں مت جانا۔ یہاں بیٹھے رہنا۔ تم دونوں کے بغیر ہماری واپسی ممکن نہیں ہوسکے گی۔"

اور وکٹر نے سر ہلایا جیسے میرے جواب میں "ہاں" کہہ رہا ہو۔

شرو بھی ایک قدم آگے بڑھ کر میرے قریب آکھڑا ہوا۔ اس کی تیز آنکھوں نے دور کچھ دیکھ لیا تھا۔ وہ اسی طرف گھورے جا رہا تھا۔ میں نے بھی اسی جانب دیکھا۔ پہلی نظر میں تو دور بہت دور مجھے صرف چند خشک سی جھاڑیاں ہی دکھائی دی تھیں۔ مگر نہیں یہ جھاڑیاں تو حرکت بھی کر رہی تھیں۔ یہ جھاڑیاں نہیں ہوسکتی تھیں۔ یہ تو ہیولے تھے حرکت کرتے ہوئے۔ ہم سے بہت دوری کے فاصلے پر۔ جسم کی طرح حرکت کرتے ہوئے یہ ہیولے عجیب سے لگ رہے تھے۔ شاید یہ ہماری طرف آ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ، بے آواز۔ لگتا تھا جیسے یہ چل نہیں رہے ہیں بلکہ ہوا کے جھونکوں کی طرح تیرتے ہوئے ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

ہم دونوں اپنے اپنے قدم جمائے کھڑے تھے، بے خوف اور بے جھجک۔ میں آج بھی نہیں جانتا کہ اس وقت مجھ میں اتنی جرأت اور اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ اس ویرانے میں اور سنسان رات کے اس بہلا کھانے والے ہیبت ناک ماحول میں بھی مجھے کوئی خوف اور کوئی ڈر ذرہ برابر بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ لگتا تھا جیسے یہ کوئی آسیب زدہ ماحول نہیں ہے بلکہ میں کسی کے گھر میں، کھڑا ہوا ڈرائینگ روم کی کھڑکی سے باہر کا نظارا کر رہا ہوں۔ شاید یہ سب کچھ.... یہ طاقت، یہ بے خوفی، اور یہ جرأت لوران کے رومال اور مردوتش کی اس ہڈی کا دین تھا جو ہر وقت میرے پاس موجود رہتی تھی اور اس وقت بھی یہ دونوں چیزیں میری ہم جلیس تھیں۔

اب ہیولے تیرتے ہوئے ہمارے قریب آچکے تھے جیسے دودھیا چادر سی نظر آ رہی

تھی۔ ویسے ہی دھوئیں کی رنگت کے یہ اجسام بھی تھے۔ کوئی چہرہ مہرہ، کوئی ناک نقشہ، کوئی صورت، کوئی رنگت کچھ بھی نہ تھی۔ بس جیسے دھواں سمٹ کر ایک انسانی جسم کی شکل میں ڈھل جائے ویسے ہی یہ اجسام بھی تھے۔ ہم سے ایک مختصر فاصلہ پر آکر یہ رکے تو شرد جو میرے برابر کھڑا ہوا تھا ایک دم ہٹ کر میری پشت پر آکھڑا ہوا۔

"آقا! ان کو آپ کی طاقت کا ادراک ہو چکا ہے اسی لیے آگے بڑھنے سے احتراز کر رہے ہیں۔ یہاں آپ کی ہی طاقتیں کام آئیں گی۔ میرے پاس ان کو روکنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ آپ ہمت کریں دیوتاؤں کا سایہ آپ پر رہے گا۔"

میں اب ایک قدم اور آگے بڑھ گیا تھا۔ ابھی میں ان ہیولوں کو غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ یکایک مجھے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے شہد کی مکھیاں اپنی بھن بھناہٹ سے پیدا کرتی ہیں۔ ان کا کوئی واضح آہنگ نہ تھا، کوئی لہجہ نہ تھا، کوئی لفظ نہ تھا، کوئی طریقۂ ادائیگی نہ تھا۔ کبھی یہ آوازیں ہوا کی سائیں سائیں جیسی بن جاتیں۔ اور کبھی جیسے گیلی لکڑی آگ سے چیخ کر آوازیں پیدا کرتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ آپس ہی میں کوئی تکرار کر رہے ہیں یا کسی بات پر الجھ رہے ہیں۔

میں ایک قدم اور آگے بڑھا۔ جیب سے مرد وقش کی ہڈی کو نکال کر دائیں ہاتھ کی مٹھی میں دبالیا اور ان کی طرف بڑھ کر میں نے زور سے چیخ کر کہا۔

"اس دھوئیں کے پیچھے میرے ساتھی تمہاری قید میں ہیں۔ وہ زندہ سلامت مجھے واپس کر دو۔ ہم تمہاری دنیا میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے"۔

میری زبان سے یہ جملے نکلتے ہی ان کی بھن بھناہٹ ختم گئی اور وہ سب چپ ہوگئے۔ جیسے ہی میں نے بات ختم کی یہ بے ربط آوازیں پھر بلند ہونے لگیں۔ چند لمحوں تک وہ یوں ہی شاید آپس میں کچھ کہتے رہے پھر ان میں سے ایک واضح آواز ابھری۔

"تم نے ہماری ابدی خاموشی اور ہمارے سکون میں خلل پیدا کیا ہے۔ تم نے سارجان کا رخ کر کے بڑی غلطی کی ہے مگر ہم تمہیں پھر بھی معاف کر دیں گے اگر یہ جو تمہارے پیچھے ہے تم اسے ہمارے سامنے کر دو۔ اس نے ہمارے بہت سے ساتھیوں کو جلادیا ہے۔ یہ ہمارا مجرم ہے۔ تم لوٹ جانے کا وعدہ کرو گے تو تمہارے باقی ساتھی بھی تمہیں مل جائیں گے۔ مگر یہ ہمارا قیدی رہے گا"۔

میں نے پیچھے گھوم کر ایک نظر شرو پر ڈالی اور شرو مجھے یوں لگا جیسے پھانسی کا مجرم

اپنی سزا پانے کے لیے پھندا گلے میں ڈالے کھڑا ہو۔ اور آسمان میں کسی امید کی کرن کے جگمگانے کا منتظر ہو۔ کیا میں شرو کا فدیہ دے کر سرجان مارشل کو بچالوں گا؟ کیا میں ایک زندگی کے بدلے دوسری زندگی محفوظ کرلوں؟ یہ ایک کالا حبشی ہے وہ ایک عظیم عالم اور تاریخ کا ایک مایہ ناز پروفیسر۔ شرو یا سرجان مارشل؟ ... شرو؟ .... نہیں سرجان مارشل؟ .... نہیں شرو؟ .... نہیں سرجان مارشل؟ پھر میں ایک واضح نتیجہ پر پہنچ چکا تھا۔ سرجان مارشل بھی اور شرو بھی! میں دونوں ہی کو بچاؤں گا ہر قیمت پر، ہر صورت میں۔ میں نے کہا۔

"ابتدا تم نے کی تھی۔ اپنی گندی اور میلی دھوئیں دار روحوں کا بادل تم لائے تھے، حملہ تم نے کیا تھا۔ تمہی نے میرے ساتھی کو قید کیا ہے۔ تم اس کو لے جاسکتے ہو نہ اس کو کوئی گزند پہنچا سکتے ہو۔ میرے ساتھی واپس کردو اور وہ دونوں بھی جنہیں تم بادلوں میں چھپا کر لے بھاگے ہو۔ میں واپس چلا جاؤں گا ورنہ جو ہوگا اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔"

"خاموش رہو! یہ ناممکن ہے۔ ہزاروں سالوں سے کسی نے ہم سے ایسے لہجے میں بات نہیں کی ہے، کسی نے ہمارے سکون کو توڑنے اور ہم سے ٹکرانے کی جرأت نہیں کی ہے۔ تم دھمکیاں دے رہے ہو بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ تم کہاں ہو اور تمہارا کیا انجام ہوسکتا ہے۔"

"ہزاروں سالوں سے تم تک کوئی مجھ جیسا پہنچا بھی نہیں ہے۔ میں تمہارے مسکن کو تہس نہس کردوں گا۔ اور اپنے ساتھیوں کو نکال لاؤں گا۔ میں جہاں ہوں محفوظ ہوں۔ تم میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے۔"

نہ جانے کب تک یوں ہی گرم گرم باتیں ہوتی رہیں۔ نہ وہ مانے اور نہ میں مانتا تھا۔ اور وہ اسی پر مصر تھے کہ شرو کو ان کے حوالے کردیا جائے تو بات آگے بڑھے گی۔ آخرکار انہوں نے اپنی قوت آزمانے کا فیصلہ کیا۔

جنگ شروع ہوچکی تھی۔ انہوں نے دھوئیں کو میری طرف بڑھانا شروع کیا۔ ہیولے میرے اور شرو کے قریب آچکے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہمیں چاروں طرف سے گھیر کر ہوا کی طرح اٹھالیں گے۔ مگر میں نے شرو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر خود سے ملالیا تھا۔ وہ بالکل میرے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔ اور پھر میں نے مردوقش کی اس ہڈی کو ہاتھ میں بلند کیا۔ اور ایک لمحہ کے لیے آنکھیں بند کیں اور حواس کو مجتمع کیا۔

"اے عظیم ولے لازوال مردوخ! اپنے پجاری مردوقش کے لیے مجھے سارمان کی قوتوں

سے ٹکرانے کی طاقت دے گا"
اس ایک جملہ نے میری ساری خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ میرے حواس، میری طاقتیں اب اور ہی رنگ میں تھیں۔ اسی لمحہ میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ یہ آوازیں دور سے آ رہی تھیں جیسے کوئی بھاری بھاری قدموں سے دھمک دھمک چلتا ہوا آ رہا ہو۔ پھر یہ آوازیں بڑھتی گئیں ایک دو تین۔ نہ معلوم کتنے پیروں کی، کتنے چلتے قدموں کی چاپ تیزی سے بڑھتی ہوئی ادھر چلی آ رہی تھی۔
"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے پجاری نے تمہارے دماغ آسمان پر پہنچا دیئے ہیں۔ یہ سارحان ہے سارحان! جادوگروں اور ساحروں کی جرأت نہیں ہوتی کہ لوہر کا رخ بھی کر سکیں۔ ان کی کیا مجال ہے کہ وہ سارحان کی طرف آنکھ بھی اٹھا سکیں۔ تمہارے ساتھی نے کسی ساحر ہی کے عطیہ سے ہماری طاقتوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ تمہیں اس کا مزا چکھایا جائے گا۔"
"سنو! وہ مردوقش کا عطیہ نہ تھا جس کی کرنوں سے گندے بادلوں کے سینے پھٹ گئے تھے۔ صرف اس کے کسی معمولی شاگرد کی چمتکار تھی۔ تم نے مردوقش کی عظمت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ مردوقش کچھ نہیں ہے مگر مریخ کے دیوتا مردوخ کی لامحدود قوت ہی تو اس کا مان ہے۔ میرا غرور مردوقش ہے۔ اور مردوقش کا فخر مردوخ ہے مردوخ! سنا تم نے؟ تم مردوخ دیوتا سے ٹکرا رہے ہو۔"
میں واضح طور پر سن سکتا تھا کہ مردوخ کا نام آتے ہیں ان کی بھن بھناہٹیں بلند ہوتی گئیں۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے بڑھتے قدم رک گئے۔ ان کی لاف زنی گنگ ہو گئی۔ شاید انہوں نے کچھ سوچنا چاہا تھا۔ شاید وہ ایک لمحہ کے توقف میں، اس کا جائزہ لے رہے تھے کہ مردوقش کا جو سلسلہ میں نے مردوخ دیوتا سے ملایا تھا اس میں حقیقت کتنی تھی۔

دوسری طرف بھاگتے ہوئے قدموں کی دھمک اب قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اندھیرے میں واضح طور پر تو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا مگر سینکڑوں، ہزاروں سفید سائے سے قریب آتے جا رہے تھے۔ کبھی تو یوں لگتا تھا کہ بہت سے قدم ایک ساتھ اٹھ رہے ہوں اور کبھی ہوا میں پروں کے پھڑپھڑانے کی سی آوازیں گونجتی تھیں۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں پرندے ایک ساتھ محوِ پرواز ہوں۔ پیروں کی دھمک بتا رہی

تھی کہ زمین پر چوپایوں کا بھی کوئی بڑا لشکر دوڑتا بھاگتا آیا ہے۔
اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک بڑا سا سفید پرندہ اڑتا ہوا اور شاہانہ انداز سے ہوا میں تیرتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کی پشت پر اسی جیسے مگر قد و قامت میں اس سے کہیں کم اور بھی بہت سے سفید پرندے صف بہ صف اڑ رہے تھے۔ اور ان کے پرے کے پرے دور تک پھیلے ہوئے تھے اور پھر ان کے زیر سایہ زمین پر عجیب و غریب جانور تھے جو بھیڑیوں سے مشابہ تھے مگر یہ کسی اور ہی نوع اور کسی اور ہی قسم کی کوئی ہیبت ناک مخلوق تھی۔ ان کے چہرے خوفناک اور زبانیں منہ سے باہر لٹکی ہوئی تھیں۔ خون آشامی ان کے جبڑوں اور تھوتھنوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔
شرو نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "میرے آقا! یہ ساحر اعظم مردوقش کا سفید عقاب ہے اور یہ اس کا لشکر ہے۔ ازوال مردوخ دیوتا کے سندیسے یہی عقاب ساحر اعظم مردوقش تک لاتا تھا۔ اس کا مسکن ستاروں سے بھی پرے کہیں دور آباد تھا اور پھر مردوقش کا مسکن ستاروں سے بھی پرے کہیں دور آباد تھا اور پھر مردوقش نے مردوخ دیوتا سے یہ عقاب اپنے لیے مانگ لیا تھا۔"
سفید عقاب بلاشبہ جسامت کے لحاظ سے ایک غیر معمولی پرندہ تھا۔ پندرہ بیس فٹ لمبے پروں کو پھیلائے ہوئے جب وہ میرے اور شرو کے عقب میں آکر ٹھہرا تو وہ کسی چاق و چوبند جنرل کی طرح لمبی لمبی آنکھوں سے دشمن کی پوری نقل و حرکت کا جائزہ لینے لگا۔ پھر تو چند ہی سانس آئے اور گئے ہوں گے کہ سفید عقاب نے ایک سیدھی اور بلند اڑان بادلوں کی طرف بھری اور اس کے پیچھے وہ تمام سفید سفید پرندے تھے جو اس کے ہمراہ اڑتے ہوئے آئے تھے۔ لگتا تھا جیسے آج برف کے گالے زمین سے آسمان کی طرف اڑ رہے ہیں۔ آسمان سفید پروں کے جتھے میں اپنا نیلگوں رنگ ہی کھو بیٹھا تھا۔
میلے کچیلے بدبودار بادلوں پر گویا سفید سی صاف ستھری برف کی تہیں جم رہی تھیں۔ سڑے ہوئے، بدبو اگلتے ہوئے گوشت پوست کی فضا میں سفید پروں والے پرندوں نے ایک پرا بنا کر جو پرواز کی تو اب ہمارے اور بادلوں کے درمیان سفید سی ایک چادر بن گئی تھی جس نے کم از کم ہمارے دماغوں کے اندر گھسی ہوئی اس غلاظت اور بدبو سے تو نجات دلا دی جو ہم پر چھا گئی تھی۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹیں اور ہوا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی سائیں سائیں نے رات کی خاموشی کے سارے پردے چاک کر دیئے تھے۔ ماحول

کی مہیب خاموشی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی تھی۔

اور اب پرندوں کی اڑان کے ساتھ ہی جب بادلوں کی چادر سے ٹکرانے کا لمحہ آیا تو ہر طرف چیخ و پکار، آہیں اور کراہیں بکھر گئیں۔ جیسے ایک ہی ہلے میں سینکڑوں زخمی جسم و جان کے رشتوں سے جدا جدا ہو چکے ہوں۔ اب بادلوں میں گھرے اور کثیف رنگ کی دبیز تہیں نہیں تھیں بلکہ یہ بادل ایک ایسی چادر کی طرح تھا جسے کانٹے دار کیکر کے درخت پر سے کھینچا گیا ہو اور جو جگہ جگہ سے پھٹ چکی ہو اور جس میں جا بہ جا درزیں کھلی ہوں۔ یہ پھٹی ہوئی آنکھوں والی دریدہ بدن اور دریدہ دہن چادر تھی۔ بادل میں جگہ جگہ سوراخ سے بن گئے تھے۔ سفید عقاب شبخون مارتا ہوا دفاعی حصار میں نقب لگا کر گزرا تھا۔ اور یہی سب کچھ اس کے پیچھے آنے والے پرندوں نے بھی کیا تھا۔ ایک چیخ و پکار تھی ہر طرف، ایک شور و غوغا تھا ہر طرف جیسے بلند آواز بھن بھناہٹیں گونج رہی ہوں۔

باب نمبر ۱۸

ادھر وہ زبان نکالے ہوئے خون آشام چوپائے سفید عقاب کے عقب میں شکاری کتوں کی طرح چوکنے منتظر کھڑے تھے کہ شاید آسمان کی جنگ میں کوئی زخمی یا مردہ جسم اوپر سے گرے اور ان کی ضیافت کا سامان مہیا کر دے۔ مگر وہ شکست خوردہ بادل اب آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ بچے کھچے ٹکڑے ادھر ادھر سے سمٹ سمٹ کر یکجا ہونے لگے تھے، کسی دوسری جنگ کے لیے نہیں بلکہ پسپائی کے لیے۔ سفید عقاب کا یہ حملہ نہایت شدید اور تباہ کن تھا۔ اس کے ساتھی پرندوں نے جو سب کے سب نہ جانے کہاں سے آئے تھے اور نہ معلوم کس طرح بادلوں میں گھس پڑے تھے، آن کی آن میں سارے ماحول کو بدل کر رکھ دیا۔ دھوئیں کی چادر میں جگہ جگہ سوراخ سے بن گئے تھے۔ بادلوں سے نکلنے والی چیخیں، گڑگڑاہٹیں، گرج، گرمی، حبس اور گھٹن سب کے سب ایک ہی حملہ میں ماند پڑنے لگی تھیں۔

سروں پر چھایا ہوا دھواں اب دور ہٹ گیا تھا مگر سامنے کی طرف جو دھوئیں کی دیوار تھی وہ ابھی تک جوں کی توں تھی۔ شرو اب میری پشت سے نکل کر برابر میں آ کھڑا ہوا تھا۔ سفید عقاب کے حملوں نے بادلوں کو ہمارے سروں سے بلند کر کے دور بھگا دیا تھا۔ مگر بادل سے زخمیوں کی چیخ و کراہ اور شور کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں اور سامنے سارحان کی دھوئیں کی فصیل اسی طرح ایستادہ تھی۔

سفید عقاب زمین پر اترا تو شرو نے آگے بڑھ کر اسے سجدہ کیا، بالکل اسی طرح جیسے یہ عظیم الجثہ عقاب کوئی زندہ جیتا جاگتا پر شکوہ بادشاہ تھا، اور شرو اس کا قیدی جو اس کے قدموں پر جھک کر اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اور پھر شرو نے تین بار زمین سے سر اٹھا کر پھر زمین پر رکھا۔ اس کے بعد بڑھ کر سفید عقاب کے رو برو جا کھڑا ہوا۔ پشت سے بندھا ہوا شکاری چاقو نکال کر شرو نے اپنے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں چیرا لگایا، خون انگلی سے ٹپکنے لگا تو شرو نے خون کے سات قطرے سفید عقاب کے قدموں میں ڈالے۔ پھر الٹے قدموں ہٹتا ہوا دوبارہ میرے برابر آ کھڑا ہوا۔

ہڈی ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی، لوران کا رومال سر پر رکھا ہوا تھا۔ سفید عقاب سے میری نظریں ملیں تو مجھے وہ رات یاد آگئی جب اس حبشی ساحرہ نے مجھے یہ دونوں عملیات دیئے تھے اور میں نے گھر آکر ان دونوں چیزوں کو رات کے وقت اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا اور پھر آدھی رات کو بند کمرے میں یہی سفید عقاب اسی ہڈی کو میرے منہ پر پھینک کر لوٹ گیا تھا۔ اس وقت اس کی نظریں خوں خوار جیسی تھیں مگر آج ان نظروں میں غصہ یا وحشت کچھ بھی نہ تھی بلکہ ایک طرح کی ہم رازی اور ہم جلیسی کی چمک تھی۔

سفید عقاب دو چار قدم چلتا ہوا میرے قریب آیا اور پھر سر کو ذرا سا جھکا کر زقند بھرتا ہوا اڑا، پھر پلٹا اور میرے سامنے نیچی پرواز کرتا ہوا جیسے مجھے سلامی دیتا ہوا سارحان کی طرف سفید دھوئیں کی چادر کی سمت بڑھ گیا۔ یہ میرے لیے ایک اشارہ تھا۔ سفید عقاب اور اس کے پیچھے آنے والے تمام پرندے اس کی نقل کرتے ہوئے اسی دائرے میں اڑے، اسی طرح مڑے اور پھر سارحان سے بالکل مختلف سمت میں اڑتے ہوئے غائب ہو گئے۔ ان کے پروں کی آوازیں اور ہراہی چوپایوں کے قدموں کی دھمک دیر تک فضا میں گونجتی رہی۔ جنگ پہلے ہی حملہ میں ختم ہو چکی تھی۔

بادل اور ہیولے اب کہیں دور جا چکے تھے، شور و غوغا معدوم ہو چکے تھے۔ خاموشی، رات کے بحرِ بے کراں کی خاموشی پھر سے ہمارے ماحول پر مسلط ہو گئی تھی۔

اب جب میں نے ہڈی کو اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے عظیم مردوقش کی روح سے کچھ مانگا تھا تو میرے ادراک اور میری مخفی طاقتوں کی بھی صلاحیتیں کہیں سے کہیں بڑھ چکی تھیں مجھے یوں لگتا تھا جیسے مردوقش اور میرے درمیان اب کوئی واسطہ نہیں ہے، وہ حجاب نہیں ہے جو حائل تھا اور وہ اجنبیت جو مانع تھی کب کی ختم ہو چکی تھی۔ آج پہلا موقع تھا کہ اس ساحرِ اعظم کے عطیہ سے کچھ مانگا تھا ورنہ اب تک اس ہڈی پر جو کچھ دیکھا تھا، سوتے جاگتے دنوں کے جو مناظر دکھائے گئے تھے وہ خود ہی ظہور میں آئے تھے ان میں میرا کوئی زور نہ تھا۔

شرو اور میں اور ہمارے دونوں اونٹ اور سامنے تنی ہوئی دھوئیں کی چادر... بس یہی ہمارا ماحول تھا، یہی کچھ ہمارے ہم راز تھے۔ شرو کی نظروں میں احسان مندی کے سائے لرزاں تھے۔ میں نے اس کی بھینٹ دے کر سرجان مارشل کو بچانے کی کوشش

نہیں کی تھی۔ اس کی جان سارحان والوں سے بچا کر میں نے گویا اس کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ اور بعد میں یہی شررو میرا سب سے بڑا مددگار بلکہ جاں نثار ثابت ہوا تھا۔

سفید عقاب سارحان کی سرحدوں سے ٹکراتا ہوا سارحان سے واپس ہوچکا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے تمام سفید پرندے بھی واپس جاچکے تھے۔ وہ چوپائے بھی جو اپنے خوفناک جبڑے کھولے، خوں آشام زبانیں لٹکائے دوڑتے بھاگتے سفید عقاب کے ساتھ ساتھ آئے تھے، واپس روانہ ہوچکے تھے۔ یہ سب کہاں سے آئے تھے، کہاں واپس چلے گئے تھے کچھ معلوم نہ تھا۔ یہ اندھیروں کے لاڈلے اندھیروں سے طلوع ہوکر اندھیروں میں ڈوب گئے تھے۔ ابھی ابھی جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوگیا تھا وہ غیر یقینی تھا۔ آج جب میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں مجھے معلوم نہیں میرے آکسفورڈ کے ساتھی طالب علم، جید علماء، پروفیسر اور میرے اساتذہ جو مجھے جانتے ہیں اس بات پر یقین کرلیں گے کہ جان میلکم کو ایک چاندنی رات میں مصر کے صحرا میں روحوں کے بادل ملے تھے۔ روحوں کے اس اجتماع کو اندھیروں سے آنے والے سفید پرندوں نے شب خوں مار کر شکست و ریخت کے مراحل سے گزارا تھا۔ کون یقین کرے گا؟...... کوئی بھی نہیں شاید۔ مگر میں جو کچھ اپنی آپ بیتی میں لکھ رہا ہوں وہ اس لیے نہیں لکھ رہا ہوں کہ اسے کتنے لوگ سچ اور کتنے جھوٹ مانیں گے۔ یہ تحریر تو وہی کچھ دکھارہی ہے جو مجھ پر گذرا تھا۔ اہرام مصر کی قید سے متعلق بھی جو کچھ میں لکھ چکا ہوں وہ شاید اس قدر تعجب خیز نہ ہو جو اب بیان کرنے والا ہوں۔ اور یہ سب کچھ سارحان کی سرحدوں کے اندر مجھ پر بیتا تھا۔

سارحان میں داخلہ کے وقت مجھے کوئی زیادہ دقت پیش نہ آئی تھی۔ سفید عقاب بازو ہلاتا، پر پھڑپھڑاتا ایک شاہانہ وقار کے ساتھ دھوئیں کی اس فصیل کے قریب پہنچ کر لوٹ گیا تھا۔ میرا اور اک اور میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مجھے بھی فوراً ادھر پہنچ جانا چاہیے چنانچہ شررو کا ہاتھ پکڑے میں بے دھڑک اس طرف بڑھا۔ دھوئیں کے قریب پہنچ کر جیسے ہی میں نے اندر داخل ہونا چاہا تو مجھے دھوئیں کی پہلی مڈبھیڑ سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ دھواں کسی گیس یا ہوا کی نوعیت کا نہ تھا بلکہ جیسے بہتی ہوئی رقیق شئے ہوتی ہے یا جیسے پانی کی لہراتی موجیں ہوں۔ اس طرح یہ گیس، یہ ہوائیں، یہ دھوئیں کے مرغولے ہم دونوں کے جسموں سے ٹکرائے تھے مگر میرے ہاتھ میں دبی ہوئی ہڈی اور سر پر رکھے ہوئے رومال کا اثر حیرت ناک تھا۔ شاید پہلا ٹکراؤ جو میرے جسم سے ان کثافتوں کا ہوا اس نے میرے پورے

وجود کو ایک شدید ترین سردی کی لہر سے دوچار کر دیا اور ایک لمحہ کے لیے ایسا لگا جیسے میں اسکاٹ لینڈ میں اپنے گھر سے سخت برفباری کے درمیان ننگے بدن نکل آیا ہوں۔ اور برف جیسی سرد ہوا نے میرے وجود کو جما کر رکھ دیا ہو۔ میری ریڑھ کی ہڈی تک سردی سے جمتی محسوس ہونے لگی۔ مگر یہ سرد ہواؤں کے اثرات اور یخ کر دینے والی برفیلی سردی فقط لمحاتی تھی اور اس کا اثر چند ثانیہ تک ہی تھا۔ جیسے ہی سرد دھوئیں کے مرغولے میرے ہاتھ میں دبی ہوئی ہڈی سے ٹکرائے ان کا وجود یک لخت معدوم ہو گیا۔ سردی کے اثرات زائل ہونے لگے۔ پانی کی لہروں جیسے مائع کے اثرات ختم ہونے لگے۔ اور میرا پورا جسم جو سردی سے یخ بنا محسوس ہو رہا تھا نارمل ہو گیا۔ ہمارے جسموں سے پانی کے ٹکرانے کی تھرتھراہٹیں بھی نارمل ہو گئیں۔

شرو اور میں نہ معلوم کب تک اسی دھوئیں میں سے گزرتے رہے۔ یہ ایک مہیب چادر تھی۔ ہم دونوں چپ چاپ تھے۔ بالکل خاموش۔ ہم اس مہیب خاموشی کے مسافر تھے۔ صدیوں کی یہ بے آواز دنیا جو سارحان کہلاتی تھی ہماری منزل تھی۔ یہاں ایک عظیم خاموشی تھی جہاں ہمارے قدموں کی چاپ بھی نہ جانے کتنی ان گنت نسلوں کے بعد فضا میں گونجی تھی۔ خاموشی کی اس گمبھیرتا میں ہم دونوں اس قدر کھو گئے تھے کہ دھیرے دھیرے ہمارے بکھرے ہوئے حواس ایک نقطہ پر سمٹنے لگے تھے۔ حواس تیز ہو گئے تو ہماری قوت سماعت اتنی ہوشیار ہو گئی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دل کے دھڑکنے کی آوازیں تک صاف سن رہے تھے۔

اور پھر نہ معلوم کس وقت ہم دھوئیں کے پیچھے اس بے آباد دنیا میں جا پہنچے جسے سارحان کہتے تھے۔

اب ہم دھوئیں کی فصیل کے ادھر سارحان میں کھڑے تھے۔ سارحان ایک راز تھا، ایک عجیب دنیا تھا۔ سارحان عجائبات کی اور ہی دنیا تھا۔ روحوں کی آبادی، پراسرار اور بے پناہ حد تک پر حول۔ ایک سناٹا تھا جو چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ ایک مہیب سناٹا جو ہزاروں سال سے کبھی ٹوٹا نہ تھا۔ وہاں ایسی بے شمار ہستیاں آباد تھیں جن کے گھر نہ تھے۔ ایسی گفتگو تھی جو سنی نہ جا سکتی تھی، ایسے چہرے تھے جو نظر نہ آتے تھے، ایسے جسم تھے جن کا کوئی ہیولیٰ نہ تھا۔ وہاں نہ حرکت تھی نہ زندگی، نہ روشنی تھی نہ حرارت مگر پھر بھی ایک دنیا آباد تھی۔ سارے ارضِ مصر کی مقید روحیں، جن کو قید ہونا تھا یا جن کو بغیر ابھراموں

کے رہتا تھا یا جن کو ایک عرصہ بعید تک کسی طور پر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا تھا سب کی سب یہاں موجود تھیں۔ یہاں جا بجا ریت کے ٹیلے تھے اور جہاں ریت نہ تھی وہاں کی زمین کا رنگ ہلکا ہلکا سرخی مائل تھا۔

دھوئیں کی چادر سے نکل کر ہم نے پہلی نظر میں یہی دیکھا کہ یہاں مٹی کا رنگ سرخ تھا۔ اور یہ سرخ مٹی اونچی نیچی چھوٹی موٹی سطح مرتفع کی طرح ایک وسیع و عریض میدان کی شکل میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے کئی میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ یہ میدان اس پہاڑی کے دامن تک چلا گیا تھا۔ پہاڑی دور تھی بلکہ یہاں سے پہاڑی کا نقطہ ہیولیٰ سا نظر آتا تھا جیسے کاغذ پر پنسل کا ہلکا سا نشان ڈال دیا جائے۔ اس پہاڑی سے یہاں تک جہاں ہم کھڑے تھے ایک لمبا چوڑا میدان تھا، وہاں اور کچھ بھی نہ تھا، چٹیل، بے آب و گیاہ میدان۔ بس کہیں کہیں ایک ایک، دو دو چھوٹی موٹی خود رو جھاڑی سی نظر آجاتی تھی جیسے لمبی تنہائی سے اکتا کر زمین کی اندرونی تہوں سے نکل آئی ہو۔ مگر یہ زمین نم تھی اور اس میں زندگی کی روئیدگی اور نمو کی پوری صلاحیتیں بیدار تھیں۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے گڑھے سے تھے۔

ہمارے سروں پر نہ چاند تھا نہ تارے تھے۔ آسمان کی بھی وہ حیثیت نہ تھی جو ہمیں اس ہماری دنیا میں نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک لامحدود وسیع و عریض خلا ہے جو حدِ نگاہ تک ایک ہوا کی سرنگ کی طرح اوپر ہی اوپر چلتا گیا ہے۔ ہماری دنیا میں تو حدِ نگاہ آسمان ہے مگر یہاں حدِ نگاہ ایک خلا ہی خلا تھا۔ آسمان کا تو کوئی وجود ہی نہ تھا۔ لگتا تھا جیسے آسمان تک آنے جانے کا کوئی نامعلوم سا راستہ ہے جس کے آگے سے آسمان کی نیلاہٹ ہٹالی گئی ہے۔ یہاں نہ آسمان کا وجود تھا نہ اس کا کوئی رنگ۔ نہ اس کا کوئی احساس تھا۔ بس یوں لگتا تھا کہ دور دور تک کچھ نہ ہونے کا احساس ہے۔ اور شاید یہ احساس ہمارے اس شوق کی حد تھا جسے شوقِ منزل کہتے ہیں۔ ورنہ منزل تو وہاں دور دور بھی نہ تھی۔ حدِ نگاہ سے آگے بھی کوئی حد تھی جو نظروں کی دوربینی سے محدود نہ ہوتی تھی۔

سارا جہان ہمارے لیے ایک ویران اور چٹیل میدان ہی رہتا اگر میرے سر پر پڑے ہوئے رومال کی جگہ نہ بدل جاتی۔ شہرو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنا چاہا تھا۔ میں اس کی طرف مڑا اور اس کا ہاتھ اتفاقاً میرے سر پر اس رومال سے لگ گیا جو لوران کا رومال تھا۔ رومال کا پلٹنا تھا کہ میں پھر سے اپنے وجود کو محسوس کرنے لگا۔ اب میری آنکھوں کے

سامنے سے پردے ہٹ گئے تھے۔ یہاں کے باسی مجھے اور میں ان کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں اب پھر زندہ ہوگیا تھا۔ ایک چادر تھی جو میرے حواس پر تنی ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ چادر ہٹی میں اس دنیا کے مکینوں کو دیکھنے کے قابل ہوگیا۔ اس سارے دوران میں مجھے یہ تجربہ کئی بار ہوا کہ میرے حواس اور میری قوتیں منجمد سی ہونے لگتیں تو پھر کوئی واقعہ یا کوئی اور احساس میرے ادراک پر صیقل سی کر دیتا اور میں پھر چونک کر ایک نئی صورت حال سے دوچار ہوجاتا۔ بہرحال، میری نظروں کے سامنے اب بے شمار لوگ چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ ان کے سروں پر اسی وضع قطع کی ٹوپیاں اور طرّہ اور خود تھے جیسے کہ میں نے خوفو کے اہرام میں چند گھنٹے کی قید کے دوران رمیسیس کے درباریوں کے جسموں پر دیکھے تھے۔ لمبے لمبے چوغے پہنے درباری تھے، بیش قیمت لباسوں والے امراء تھے، جنگی اسلحہ لادے ہوئے فوجی تھے، عورتیں مرد نوعمر، جوان، بوڑھے سب ہی تھے مگر کم سن بچے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ شاید اس لیے کہ بدی کی روحوں کے اس اجتماع میں معصوم بچوں کا کیا مقام ہوسکتا تھا؟ اپنی وضع قطع کے ساتھ ساتھ ان سے کچھ لوگ ہر طرف سے نکل نکل کر ہماری طرف آرہے تھے۔ اور کچھ اپنے ہی حال میں مگن اس طرح بیٹھے تھے جیسے کسی نے تصویر کے بت سجا دیئے ہوں۔

اس وسیع و عریض میدان میں کسی قسم کا کوئی گھر نہ تھا کوئی آبادی نہ تھی مگر پھر بھی قریب دور مجھے بہت لوگ چلتے پھرتے، بات چیت کرتے، بیٹھتے اٹھتے نظر آئے۔ ان کی ایک ہی طرز زندگی تھی۔ ان کی اپنی ایک معاشرت بھی تھی، ان کی اپنی ایک تہذیب بھی تھی۔ یہ لوگ چلتے پھرتے تھے تو اپنے قدموں کو ہلا کر نہیں چلتے بلکہ یوں لگتا تھا جیسے ایک مقام پر کھڑے کھڑے آگے بڑھ رہے ہوں جیسے کہ صحراؤں میں آندھیوں کے مرغولے حرکت کرتے ہوں۔ یہ اسی طرح آگے بڑھتے تھے جب یہ بات کرتے تھے تو ان کے ہونٹ ہلتے نہ تھے، ان میں کوئی حرکت نہ ہوتی تھی، ان کے ہونٹوں سے آواز نہ نکلتی تھی مگر پھر ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے کچھ کہنا چاہا اور وہ سننے والے تک پہنچ گیا ہے۔ ان کی کوئی زبان نہ تھی۔ مجھے یہ دشواری نہ تھی کہ یہ عربی، قبطی یا عبرانی بول رہے ہیں اور مجھے انگریزی کے سوا کچھ نہیں آتا ہے۔ یہاں تو ذہن بولتا تھا اور ذہن سنتا تھا۔ بات ہونٹوں سے نکلتی ہی نہ تھی کہ دماغ میں منتقل ہوجاتی تھی۔

اسی طرح میں نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے جسم خون میں نہائے ہوئے چل رہے

ہیں۔ ان کے جسموں میں زخم لگے ہوئے ہیں۔ مگر جیسے کہ ان کو ان کے زخموں کا کوئی احساس ہی نہ ہو جیسے کہ یہ خون جو ان کے زخموں سے ٹپک رہا ہے بے وقعت ہو۔ بہت سے لوہی اسلحے سہالے تھے۔ نوجوان لوگوں کے جسموں میں نیزے اور خنجر بھی پیوست تھے۔ مگر وہ بھی ان ہتھیاروں کی خوں ریزی سے بے پرواہ گھوم رہے تھے۔ کہیں شرابوں کا دور چل رہا تھا۔ کہیں عیش و عشرت کی غرمستیاں سر اشمار ہی تھیں۔ مگر سب کچھ ایسا تھا جیسے کہ ایک مصور نے تصویر کھینچ کر ان میں زندگی کی ایک معمولی سی رمق ڈال دی ہو۔ نہ تصویر اپنی حالت کو بدل سکتی ہو اور نہ ہی اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش موجود ہو۔ شاید جن انسانوں کو جس حالت میں زندگی سے محروم کیا گیا تھا وہی حالت ان پر لب تک طاری تھی۔

یکایک ایک قدآور جسم کا ہیولیٰ ہتھیار لگائے ہماری طرف بڑھا۔ اس پر فولاد کا خود تھا اور جسم لوہے میں غرق تھا۔ پسینے کی لڑیاں چہرے پر بہہ رہی تھیں، ہونٹوں پر خشکی اور پپڑیاں جمی تھیں۔ صرف آنکھیں اور منہ کھلے تھے اور فولادی زنجیریں کنپٹی سے لے کر کندھوں تک جھول رہی تھیں۔ چوڑے شانے تھے اور لمبا قد تھا۔ دوسرے چلتے پھرتے اجسام کی طرح یہ بھی اسی طرح تیرتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا جیسے ہوا میں برف کے گالے تیرتے ہوں یا کاغذ کا کوئی ٹکڑا ہوا کے جھونکوں سے فضا میں ڈولتا پھر رہا ہو۔

شاید یہ کسی جنگ سے لڑتا بھڑتا لوٹا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ہتھیار ابھی تک جسم پر اسی لیے لگائے ہوئے ہے کہ پھر کسی حملہ کا خدشہ ہے۔ ہماری طرف آ کر ایک لحظ اس نے ہمیں دیکھا اور پھر کہا۔

"وہ سب میرے پیچھے ہیں۔ میرے دشمن ہیں۔ میں بہت پیاسا ہوں، بہت زخمی ہوں۔ مجھے پانی پلا دو۔"

مگر وہ نہ جواب کے لیے رکا اور نہ اس نے پانی پینے کے لیے واقعی کوئی انتظار کیا۔ پھر اسی طرح ہوا کی مانند نکلا چلا گیا۔ میرے ذہن نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ممکن ہے اس کی مادی زندگی میں اسی پیاس کے سبب اس کی جان گئی ہو اور مرتے دم تک اسے یہی تمنا رہی ہو کہ کاش کچھ پانی مل جاتا۔

میں اب خوب سمجھ چکا تھا کہ سلرحان میں عمل نہیں ہے فقط خیال اور خواہشیں ہیں۔ جسم کی محدود حرکتیں ہیں۔

یہ دنیا روحوں کی دنیا تھی۔ پھر کیا اس روحانی دنیا میں خواہشیں ہوتی تھیں، کیا روح خواہش کر سکتی ہے، کیا روح اس خواہش کو اپنے جسمانی عمل سے اور ہماری دنیا جیسی مادّی طاقتوں سے بروئے کار لا سکتی ہے؟ میرا ادراک اور میرا احساس آج اور اس وقت بھی یہی کہتا ہے کہ روح کسی عمل کو انجام نہیں دے سکتی بلکہ عمل اور فعل فقط جسمانی زندگی ہی میں ممکن ہو سکتا ہے ہاں جسم سے نکل کر روح خواہشیں ضرور کر سکتی ہے۔ کون سی خواہشیں؟ عہدوں کی، ترقیوں کی، مال و دولت جمع کرنے کی اور طاقت و جبروت کو گھٹانے بڑھانے کی، وہ تمام نت نئی خواہشیں جو اس مادّی دنیا میں ہمہ وقت ہم سے چمٹی رہتی ہیں؟ نہیں، وہ خواہشیں نہیں۔ بلکہ صرف وہ خواہشیں جو روح اور جسم کا رشتہ منقطع ہوتے وقت دلوں میں رہتی ہے وہی خواہشیں موت کے بعد بھی روحانی احساسات میں موجود رہتی ہیں۔ اگر کسی کی زندگی جنگ و جدل میں گزری تو اس کی روح پر ہمیشہ وہی جنگ کی کیفیت سوار رہے گی۔ اگر کسی کی زندگی ہمیشہ فتنے اٹھانے اور جھگڑے کرتے بسر ہوئی تو موت کے بعد بھی اس کی روحانی زندگی میں ہمیشہ وہی فتنے عنوان بنے رہیں گے۔ اگر کسی نے دوسروں کے ساتھ نیکیاں کرنے اور اچھائیاں کرنے میں وقت گزارا تو اس کی خواہش موت کے بعد بھی اسی طرح نیکیوں کا اعادہ کرنے میں بسر ہو گی۔ شاید اسی لیے ہمارے عیسائیوں کے گرجا گھر اتوار کی سروس میں ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ موت کے بعد کی زندگی اس مادی دنیا کی پرچھائیں ہوتی ہے۔ جو کچھ یہاں کرو گے ویسے ہی وہاں نظر آؤ گے۔

موت کے بعد کی زندگی کا اپنا کوئی مادی وجود نہیں ہوتا۔ یہ بالکل ایک سایہ کی مانند ہوتی ہے۔ اس کا اصل اس مادّی پیکر کے وجود میں چھپا ہوتا ہے جو اس مادّی دنیا میں رہ جاتا ہے۔ جو شخص اپنی زندگی میں جیسا تھا اور اس کی شخصیت کا جو بھی پہلو علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، صحافتی، نظریاتی اس کی زندگی پر چھایا رہا تھا وہی موت کے بعد بھی اس کی شخصیت کا غالب عنصر بن جاتا ہے۔ اور وہ موت کے بعد فیصلہ کے آخری وقت تک اسی حالت میں اور اس قسم کے مستقل اثرات کے ماتحت رہتا ہے۔ شاید مسلمانوں کے قرآن میں جو کہا جاتا ہے کہ روزِ قیامت ہر شخص اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ موجود ہو گا تو اس کا مفہوم بھی یہی ہو سکتا ہے کہ اس کی مادّی زندگی کے غالب پہلو دور ہی سے نظر آتے ہوں گے۔ اس کی چال ڈھال طور طریقہ اور انداز ہی سے معلوم ہونے لگے گا کہ مادّی دنیا میں اس نے کیا کچھ کیا ہو گا۔ اور شاید یہی کچھ مجھے اس وقت نظر آ رہا تھا۔ وہاں ہر شخص ایک مخصوص کیفیت

میں مبتلا تھا کوئی زخمی تھا تو صدیوں سے زخمی تھا۔ کوئی پادری، کاہن یا جادوگر تھا تو وہ مادی زندگی میں بھی یہی کچھ رہا ہوگا۔ کوئی پیاسا تھا تو وہ اب بھی پیاسا ہے، تو پشیمان اور خوش تھا کوئی تو وہ یہاں بھی اسی حال میں ہے۔

شرد کو تو کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ وہاں کیا کیا ہے۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا اس کی نظروں سے بالکل پوشیدہ تھا۔ اس میں وہ طاقتیں ہی نہ تھیں جو اسے یہ سب چیزیں نظر آتی نہ اس کو وہ ادراک عطا ہوا تھا نہ اس کے پاس ملکہ لوران کے رومال جیسے کوئی شئے تھی، نہ مردوقش کا عطیہ تھا۔ ہاں اس کے پاس مردوقش کے کسی کمتر درجہ کے شاگرد کا کوئی عطیہ ضرور تھا اور شاید اسی عطیہ کی بدولت اس کو خطرے کا ادراک ہوگیا تھا اور اس کے رقص میں وہ شعلہ سامانی آگئی تھی جس کی وجہ سے اس نے ہم سب کو روحوں کے بادلوں کے حملے سے بچالیا تھا۔ وہ سب کچھ سارحان کے ادھر تک تھا۔ سارحان کے اندر اس کی کوئی قوت کام نہ کرتی تھی۔ وہ ایک عام آدمی اور عام شخص جیسا ہی تھا۔

میں جو کچھ وہاں دیکھ رہا تھا وہ ایک عجیب وغریب دنیا تھی، دنیا اس دنیا سے بہت مختلف اور بالکل جداگانہ۔ میں اسے نہ بیان کرسکتا ہوں نہ آپ اسے سمجھ سکتے ہیں۔ وہاں نہ زبان تھی، نہ گفتگو اور نہ آواز۔ صرف ذہن کے رابطے تھے اور ادراک کی رسائی تھی۔ کہنے سننے کے لیے کسی آہنگ کی حاجت نہ تھی۔ آبادیاں نہ تھیں، مکان نہ تھے، مکانوں کو آراستہ کرنے کی کوئی معاشرت نہ تھی۔ کچھ نہ تھا مگر پھر بھی آبادیاں تھیں، لوگ چل پھر رہے تھے۔ وہ آپس میں بولتے بھی تھے۔ ان کی اپنی ایک الگ ہی دنیا تھی بس جیسے تصویریں چل پھر رہی ہوں یا سائے لرز رہے ہوں یا پرچھائیاں سی ماحول میں بکھر بکھر کر ادھر ادھر ڈول رہی ہوں۔ یہ سارحان تھا، سارحان کی دنیا تھی... روحوں کی دنیا۔

ہم دونوں کچھ اور آگے بڑھے تو ایک پادری نما شخص کاہنوں جیسا لباس پہنے ہماری طرف آتا نظر آیا۔ اس کے اطراف میں چند شاگرد پیشہ کاہن بھی تھے گلے میں ہڈیوں کے ہار ڈالے اور سینہ پر کسی انسان کی خشک کھوپڑی سجائے لمبے لمبے چوغے پہنے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے بھی چلنے کا انداز وہی تھا جیسے مرغولے حرکت کررہے ہوں۔

وہ ہمارے سامنے آکر رک گئے۔ ان کے ارادے کچھ ایسے نظر نہ آتے تھے جو برے ہوں گو چہرے پر پذیرائی کی تمازت نہ تھی مگر پھر بھی نہ ہم ان سے متوحش ہوئے نہ وہ ہمارے وہاں کھڑے ہونے پر خشمگیں نظر آئے۔ اس کاہن کے پیچھے دو قطاروں میں اس کے

بادگردوں کے پرے بکھر گئے تھے۔ انہوں نے سر جھکائے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کہے سنے جانے کے لیے بے چین ہوں۔ کاہن لب کچھ آگے بڑھ آیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"سارحان کی سرحدوں میں آج تک کوئی سانس لیتا شخص داخل نہ ہوا تھا۔ تم سانس بھی لیتے ہو اور تمہارا دل بھی دھڑک رہا ہے۔ تم ہم میں سے نہیں ہو۔ پھر بتاؤ تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"بے شک میں تم میں سے نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر تمہارے دوستوں کی حماقت نے ہمارے قدم ان سرحدوں تک پہنچا دیئے ہیں۔"

"صاف صاف کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ سارحان نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ یہاں نہ اب زندہ آتے ہیں اور نہ نئی روحیں پہنچتی ہیں۔ یہ تو ایک الگ تھلگ دنیا ہے۔ تمہاری رسائی بغیر کسی شدید طلب کے یہاں تک ممکن ہی نہ تھی۔ تم کن دوستوں کی بات کرتے ہو۔ اور کن حماقتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟"

"ہم فقط فرعون رمیسیس کی ناآسودہ روح کی تلاش میں نکلے تھے وہ بھی اس لیے کہ رمیسیس کی بے اہرام ممی کو صدیوں کی بے مایگی سے نجات مل جائے۔ مگر تم نے اور تمہارے سارحان کے ساتھی باشندوں نے بجلیوں سے بھرے بادل ہم پر مسلط کر دیئے۔ ہمارے قدم رک جائیں اور گرمی، حبس اور گھٹن ہمیں مار ہی ڈالیں۔ تمہارے دوستوں نے ہمارے اور مصری خادموں کو بادلوں میں لپیٹ کر اٹھا لیا ہے اور اس سے پہلے میرے دو ساتھی روسی اور سرجان مارشل کو بھی کہیں سے اغوا کر کے قید کر لیا ہے۔ میرا ساتھی کہتا ہے تم نے اس دھوئیں کے پیچھے قید کیا ہوا ہے"۔

"تو تم اپنے ساتھیوں کو واپس لے جانا چاہتے ہو مگر تم کیسے یقین کر چکے ہو کہ تمہارے ساتھی ہماری قید میں ہیں؟"

"میرا ساتھی جانتا ہے کہ تم نے انہیں رلت کی تاریکی میں اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تم نے انہیں ریت کی تہوں میں چھپا رکھا ہے۔ تم میرے ساتھیوں کو لوٹا دو تو میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری دنیا کا سکون ذرا بھی منتشر نہ کروں گا اور چپ چاپ لوٹ جاؤں گا۔"

"اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر؟" انہوں نے پوچھا

"تو پھر تم جانتے ہو گیا ہو گے۔ پھر تمہیں مجھے پہچانتا ہو گا تم کو معلوم ہو جانے گا کہ میں کون ہوں۔ دیکھو میرے ہاتھ میرے گھٹنوں سے بھی لمبے ہیں۔ دیکھو میری پیشانی پر تین ستارے چمکتے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھو کہ میرے ہاتھ میں مردوخ دیوتا کے سیوک ردوقش کے عطیات ہیں اور دیکھو میرے سر پر ایک رومال بھی رکھا ہوا ہے۔ میں تمہاری سرحدوں کے اندر کھڑے ہو کر بات کر رہا ہوں۔ تم نے میری جسارت دیکھ ہی لی ہے کیا ضروری ہے کہ تم میری طاقت کے سمندر کو ابلتا ہوا بھی دیکھو؟" میں جس یقین سے یہ جملے کہہ رہا تھا وہ میرے لیے بھی نیا نیا تھا شاید یہ میں نہیں تھا۔ میری زبان کے عقب میں کوئی اور ذہن بول رہا تھا۔

"ہم تم سے محاذ آرائی نہیں چاہتے۔ تمہارے دوستوں کو واپس کیا جاسکتا ہے مگر تمہیں بھی ایک ضمانت دینی ہو گی"۔

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"تم اپنے اس سیاہ حبشی کو ہماری تحویل میں دینے کو تیار نہیں ہو تو پھر ہم کو یہ ضمانت دو کہ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر لوٹ جاؤ گے۔ فرعون کی غرق شدہ میت کا کھوج لگانا بند کر دو گے، تم فرعون رمیسیس کی ممی کو کسی اہرام کی زینت نہ بناؤ گے نہ اس کی تلاش و جستجو کرو گے۔ اس فرعون نے دیوتاؤں کی مرضی کے خلاف دیوتاؤں کے دیوتا اور خداؤں کے خدا کے ایک فرستادہ کو زک دینے کی کوشش کی تھی اور اسی جرم میں اسے یہاں قید کیا گیا ہے۔ اسے نہ اہرام ملا اور نہ کوئی دائمی پناہ گاہ نصیب ہوئی۔ اس کی حیثیت ایک ملزم قیدی کی ہے۔ تم اسے بھول جاؤ۔ ہم نے تمہارے ساتھی اسی لیے پکڑ لیے تھے کہ وہ اس کی کھوج میں سارحان کی سرحدوں تک آ پہنچے تھے۔ ان کی طلب میں بڑی وارفتگی تھی۔ وہ یقیناً اس جگہ تک آ پہنچتے کیوں کہ وہ اس قیدی کے لیے بہت دن سے چپہ چپہ ڈھونڈ رہے تھے"۔

"ہماری دنیا میں اس فرعون رمیسیس کی بہت اہمیت ہے۔ ہم اس کی ممی کو تلاش فقط اس لیے کر رہے ہیں کہ ہم کئی مذہب والے لوگ اس کی اصلیت جاننا چاہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس ممی کو قید سے رہائی دلانے کا جذبہ بھی خدا کی طرف سے ہمارے دلوں میں پیدا کیا گیا ہو۔ تم کوئی شرط پیش نہ کرو۔ ہمارے ساتھی واپس کر دو اور اگر نقصان سے بچنا چاہتے ہوں تو رمیسیس کی ممی تک ہماری رہنمائی کر دو۔ ہم اس سلسلہ میں تمہاری یہ شرط

بھی ماننے کو تیار نہیں ہیں۔"

میرے اس انداز تخاطب پر وہ چونکے۔ خاموش ہو کر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کاہن بزرگ نے من من کرتے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے شاگردوں سے کچھ مشورہ شروع کیا۔ شرو اور میں دونوں چپ چاپ کھڑے تھے اور ان کی طرف سے کسی حتمی جواب کے منتظر تھے۔ آپس کی گفتگو کچھ لمبی ہوتی گئی۔ اس کاہن نے جو مجھ سے بات کرنے میں پیش پیش تھا دوران گفتگو ایک دوسرے شخص سے کچھ پوچھا تو سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے اور پھر سب کے سب اسی سے باتیں کرنے لگے۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ وہ شاید سر جھکا کر ہی بات کرنے کا عادی تھا۔ مجمع میں موجود ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہوچکا تھا۔ شاید وہ سب اس سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ پھر اس نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ معلوم ہوتا تھا وہ سب کے سب اس سے کسی بات کا استفسار کر رہے ہیں۔ اور اس کے جواب سے کسی حتمی رائے پر پہنچنا چاہتے ہیں۔

کونے میں کھڑے ہوئے اس ادھیڑ عمر کے شخص نے اپنا چہرہ کچھ اور اونچا کیا۔ اور میری طرف گھورنا شروع کیا۔ میری نظریں بھی اس کے سراپا کا جائزہ لینے لگیں اور پھر اس کے چہرے پر آکر ٹھہر گئیں۔ صورت مجھے کچھ شناسا سی نظر آئی تھی۔ اس میں کچھ اجنبیت نہ تھی۔ کیا میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا تھا؟ میں اپنی یادداشت پر زور دے رہا تھا اور میں یاد کرنا چاہتا تھا کہ یہ چہرہ اس سے قبل میری نظروں سے کہاں گزرا تھا ادھر وہ شخص بھی میری صورت میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ شاید وہ بھی میرے چہرے پر شناسائی کی کچھ جھلک پا چکا تھا۔ اور اپنے اس گمان کو یقین میں بدل دینا چاہتا تھا کہ میری اس سے پہلے ملاقات کہاں ہوچکی تھی۔

ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو بغور دیکھ رہے تھے میں اپنے ذہن پر زور دے رہا تھا کہ میں نے اس کو یا اس سے ملتے جلتے چہرہ کو کہاں دیکھا تھا۔ وہ شخص بھی اب کسی نتیجہ پر پہنچ چکا تھا۔ اور اپنے ساتھیوں کو میری طرف دیکھ کر کچھ بتانے لگا تھا۔ یکایک جیسے میرے دماغ کی بھی دھند صاف ہوگئی۔ مجھے جیسے یادداشت واپس مل گئی۔ مجھے یاد آگیا کہ میں نے اس صورت کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔

یہ وہ چہرہ تھا جسے میں نے اہرام مصر کی قید کے دوران فرعون رمیسیس کی ممی بناتے دیکھا تھا۔ یہ کچھ اشلوک پڑھ پڑھ کر اس کی تدفین کی کچھ رسوم ادا کر رہا تھا۔ اسی نے

اس کے جسم پر ململ کی پٹیاں باندھ دینے کے بعد اس کے سرہانے کھڑے ہو کر کچھ نامعلوم اور غیر فہم زبان میں دعائیں اور بھجن پڑھے تھے اور پھر وہاں جب میرا پیر کسی تیز سے ٹکرایا تھا اور وہ سارا منظر معدوم سا ہو گیا تھا تو معدوم ہونے سے قبل اسی چہرے نے میری طرف پلٹ کر دیکھا تھا اور حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا تھا۔ ہاں، ہاں۔ یہ وہی چہرہ تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہی ہے۔ اور شاید وہ بھی سمجھ چکا تھا کہ اس نے مجھے کہاں اور کب دیکھا تھا۔

ادھر وہ بھی ایک نتیجہ پر پہنچ چکے تھے اور ان کی آپس میں گفتگو کی منمناہٹ ختم ہو چکی تھی۔ ان کو بھی شاید اس شخص نے بتا دیا تھا کہ میں وہ شخص تھا جو فرعون کی میت کو دریائے نیل سے نکال کر لاتے ہوئے چھپ کر دیکھ چکا تھا اور میں ہی وہ تھا جس کے سامنے انہوں نے اس کی لاش کو ممی بنایا تھا۔ گویا چار ہزار سال قبل جو واقعہ گزر چکا تھا میں اس کا گواہ تھا۔ عینی گواہ۔ وہ مجھ سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ فرعون رمیسیس کی لاش کو دریا سے نکالا ہی نہیں گیا تھا یا اس کی لاش کی ممی نہیں بنائی گئی تھی۔ تمام روئے زمین پر بسنے والے افراد میں وہ واحد شخص میں ہی تھا جس کو یہ منظر دکھلائے گئے تھے۔ میری ہی بدولت سرجان مارشل کے دل میں اس ممی کو کھوجنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ بے شک میری بجائے ان کی طلب مجنونانہ بن گئی تھی۔ بلاشبہ ان ہی کی معیت میں ہم اس فرعون کی میت تلاش کرنے نکلے تھے۔ اور ان ہی کی سربراہی میں مصر کے اس عظیم صحرا کی خاک چھان رہے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ میری وجہ ہی سے ممکن ہوا تھا۔ اگر فرعون کی لاش مل جاتی ہے تو مسلمان، عیسائی اور یہودی سرجان مارشل کے ساتھ ساتھ میرا نام بھی ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

مجھے اب ایسا لگ رہا تھا کہ میں ہی اس مہم کا سربراہوں اور سرجان مارشل تو فقط ایک منتظم کی حیثیت میں میرے ساتھ کر دیئے گئے تھے اور چوں کہ وہ میری وجہ سے سارجان کی قید میں جا پہنچے تھے اس لیے یہ میرا ہی فرض تھا کہ ان کو ردس کو خداشی کو اور دونوں مصری پروفیسروں کو جو مختلف سمتوں میں روانہ ہوئے تھے ان سب کو مہم کے اختتام تک محفوظ رکھ سکوں چنانچہ یہی جذبہ تھا جس کی وجہ سے فرعون کی بازیابی کی اس مہم کو بیچ میں نہ منقطع کرنے پر تیار تھا اور نہ ہی اپنے ساتھیوں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لیے راضی ہو سکتا تھا۔

وہی کاہن ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس نے گفتگو شروع کرنے سے قبل گلے میں پڑی ہوئی ہڈیوں کو ٹٹولا سینے میں جھولتی ہوئی خشک کھوپڑی کو سینے کے وسط میں جمایا اور بولا۔

"تم ہماری سرحدوں میں بغیر اجازت داخل ہونے ہی کے مجرم نہیں ہو بلکہ تم نے ہمارے ایک پرانے اور رازداری سے کئے گئے عمل کو افشا کیا ہے۔ میرا ساتھی تمہیں جانتا ہے۔ تم نے چھپ چھپ کر ماضی میں ہونے والے تدفین کے عمل کو دیکھ لینے کی جسارت کی تھی۔ تم ایک مجرم ہو۔ ہم اتنے کمزور بھی نہیں کہ ایک مجرم کو سزا نہ دے سکیں۔"

"میں تمہاری سزا کے حکم کا پابند نہیں ہوں۔ تم دیکھ ہی لوگے کہ مجھے مغلوب کر لینا تمہاری طاقتوں کے بس میں نہ ہوگا۔ اگر تم فضول ہی اپنی توانائیاں ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہوگا!" میں نے کہا۔ "آؤ اور اپنی طاقتیں آزمالو۔"

"اب ہم سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تم ہمارے قیدی ہو۔ سارحان تک آج تک کوئی زندہ شخص آیا بھی نہیں تھا۔ تم اب اگر آ ہی گئے ہو تو اپنا جسم لے کر واپس کبھی نہیں لوٹ سکو گے تمہاری روح اور تمہارے جسم دونوں ہی قید میں رہیں گے"۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے فیصلہ سنادیا ہے اور میری کسی بات سے وہ متاثر نہیں ہوا ہے۔ وہ اب تک مجھے اس بات کا مجرم سمجھ رہے تھے کہ ان کے مسکن سارحان میں جبریہ داخل ہوگیا تھا یا یہ کہ روحوں کے بادل کو شرو کی ہڈیوں کی شعاعوں نے چیر ڈالا تھا یا یہ کہ میری وجہ سے سفید عقاب نے ان پر حملہ کیا تھا مگر اب جوان کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے ہزاروں سالوں کے سربستہ رازوں سے بھی واقفیت حاصل کرلی تھی تو شاید ان رازوں کا علم اور ان کے افشا کرنے کی سزا ان کے یہاں ناقابل معافی تھی۔

مجھے اب کیا کرنا تھا؟ شرو کو میری کیا مدد کرنا تھی؟ مجھے ان عطیات پر جو میرے پاس موجود تھے بڑا ناز پیدا ہوگیا تھا ان کی قوت سے میرے دل میں ایک عجیب سا نشہ بیدار ہوچکا تھا۔ اور میں سمجھتا تھا کہ میرا بال بھی بیکا نہیں ہوسکتا۔ لیکن مجھے بہرحال یہ معلوم نہیں تھا کہ میں اس قوت کا اور اس طاقت کا جو مجھ میں ہے کس طرح استعمال کرسکوں گا۔ مگر فی الحال مسئلہ صرف میرا ہی نہیں تھا بلکہ میری ٹیم کے جو افراد وہاں مقید تھے ان کا بھی تھا۔ ان سب کو اگر رہائی دلاسکتا تھا تو میں اور صرف میں۔ اور اگر میں ہی اس جنگ میں ہار گیا تو میرے ساتھ ہی ساتھ وہ سب بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں گے جو سارحان

کی سرحدوں کے اندر چھپا دیئے گئے تھا۔ مجھ کو نہ صرف ان سب کو اس قید سے آزاد کرانا تھا بلکہ رمیسیس کی ممی کو بھی برآمد کرنا تھا جو ان کی قید میں تھی۔

مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ کسی لائحہ عمل کے تیار کرنے کا یہ وقت اور نہ کوئی مکمل اسکیم مرتب کرنے کا موقع تھا۔ جو کچھ بھی کرنا تھا وہ فوری اور ہنگامی بنیاد پر ابھی کرنا تھا۔ مردوتش کی بدی اور اور ان کا رومال وہ عظیم طاقتیں ہیں۔ اور وہ مجھے سرخرو دیکھنا چاہتی ہیں۔ کیونکہ میرا مشن تو سارجان تک آنا نہیں تھا بلکہ میرا مشن تو مینا متی کو صدیوں کی خموشی کے بعد دریاؤں کی سرزمین سے بازیافت کرنا تھی۔ میرا وہ مشن ابھی نامکمل تھا اس لیے ان کو میری حفاظت ضرور کرنا تھا۔ اس طرح مجھے یقین تھا کہ میرا ہی پلہ بھاری رہے گا۔

باب نمبر ۱۹

میں نے سوچ لیا تھا کہ پہل اس کو ہی کرنے دوں گا اور خود فقط مدافعانہ حربہ استعمال کروں گا۔ میں نے شمرو کا ہاتھ تھام کر اپنی دائیں طرف کھڑا کر لیا۔ شمرو کی آنکھوں میں بھی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے اس چھوٹی سی ہڈی کو پھر سے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پھر یکایک میں نے دیکھا کہ اس نے چاقو نکال کر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی پر شگاف ڈالا اور خون اس انگلی سے بہنے لگا۔ تو پھر اس ہڈی کو اپنے بہتے ہوئے خون سے تر بتر کیا۔ پھر آنکھیں بند کر کے ایک لمحہ کے لیے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اب اس کا بڑبڑانا بند ہوا تو اس کی وحشتیں اور چہرے پر پھیلا ہوا ڈر اور خوف ساری باتیں کسی حد تک کم ہو چکی تھیں۔

ادھر وہ کاہن اپنے ساتھیوں کو کئی قدم پیچھے ہٹا چکا تھا۔ اور خود اپنے گلے سے ہڈیوں کی مالا اتار کر دائیں ہاتھ میں لے لی تھی۔ اور دونوں ہاتھوں سے اسے ایک گول ہار کی طرح یوں گھما رہا تھا جیسے ایک دائرہ کا نشان ہوا میں بنا رہا ہو۔ شاید وہ ہمیں محصور کر دینے کی کوشش میں تھا میں اور شمرو یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ یکایک ہمیں یوں لگا کہ ان ہڈیوں سے دھواں ہی دھواں نکل رہا ہو اور وہ ایک حصار کی طرح دائرے کی شکل میں ہماری سمت بڑھ رہا ہو۔

اس دھوئیں میں بجلیاں چمک رہی تھیں۔ نیلے اور پیلے شعلے لمبی لمبی زبانیں نکالے سیاہ پھن والے ناگوں کی طرح ہماری طرف جھپکتے آ رہے تھے۔ یہ شعلے زنجیر کے حلقوں کی طرح ہم دونوں کے گرداگرد بھڑک رہے تھے۔ آگ کے ان دائروں میں حلقہ بگوشوں کی طرح کاہن اور اس کے ساتھی ایک گول چکر کی مانند آہستہ آہستہ قدم بقدم آگے آتے جا رہے تھے اور پھر یکایک اس کاہن نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرا کر ایک قدم زور سے زمین پر مارا۔ قدم کیا تھا شعلوں کی ایک لمبی سی لکیر تھی جو زمین سے اٹھی اور زمین ہی میں دفن ہو گئی۔

دھوئیں کے مرغولوں اور شعلوں کی آنچ نے ہم دونوں کے قریب تک رسائی حاصل کر لی تھی اور پھر شعلوں کی وہ لکیر جو زمین میں جذب ہو گئی تھی کسی پودے کی مانند

ہمارے قریب ابھر آئی۔ زمین سے اس آگ کے شعلے کا ابھرنا تھا کہ چشم زدن میں چاروں طرف آگ کے پھول کھلنے لگے۔ ایک چنگاری زمین سے ادھر ابھرتی تو ایک ادھر، ایک یہاں سے تو دوسری وہاں سے۔ ہم دونوں ان شعلوں میں یوں گھر چکے تھے کہ جیسے دشمنوں کے چمکتے ہوئے نیزوں اور بھالوں کے حصار میں۔ ہر طرف آگ کی انیاں چل رہی تھیں۔

میرے پاس لوران اور مردوقش کے عطیات ضرور موجود تھے اور مجھے یقین بھی تھا کہ ان اشیاء کی موجودگی میں وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے مگر مجھے یہ علم نہ تھا کہ ان پر جوابی حملہ کس طرح کیا جائے۔ مجھے اس عطیہ کا استعمال نہ بتایا گیا تھا اور نہ معلوم تھا۔ نہ ہی مجھے اس بات کی واقفیت تھی کہ اس ہڈی اور رومال کے ذریعے کس طرح اپنے دشمنوں پر بھاری پڑ سکتا تھا۔

اور ہوا بھی یہی کہ یہ آگ اور دھوئیں کے کھیل سے میرا یا شرو کا بال بھی بیکا نہ ہو سکا۔ آگ کے لپکتے ہوئے شعلے ہماری طرف بڑھتے تھے اور ایک حد تک آ کر رک جاتے۔ میرے چاروں طرف اگرچہ دھوئیں اور آگ کا حصار بنا ہوا تھا لیکن یہ گرم گرم آنچ میرا کچھ نہ بگاڑ سکی، شرو جو میری پشت پر بالکل چپکا ہوا تھا اسے بھی ذرہ برابر کوئی گزند نہ پہنچا۔

چند ثانیہ بعد ہی یہ دھواں خود بخود چھٹ گیا اور یہ آگ خود بخود بجھنے لگی، دھند صاف ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ کاہن اور اس کے حواری سب کے سب اسی طرح کھڑے ہیں۔ شاید جو کچھ ہوا وہ ان کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ آگ کے شعلے ہمارے قدموں سے لپٹ کر دوڑاتے ہوئے ہمیں ان کی عقوبت گاہوں تک لے جائیں گے جہاں ہم ان کے قیدی بن چکے ہوں گے مگر میں اور شرو ابھی تک اپنے ہی قدموں پر کھڑے تھے۔ پر اعتماد اور پروقار۔ یہ شاید ان کے لیے تعجب خیز بھی تھا اور ناقابل برداشت بھی۔

ادھر کاہن نے ایک بار پھر ہمیں اپنے جال میں جکڑ کر مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے سینے پر پڑی ہوئی کھوپڑی کا رخ ہماری طرف موڑا۔ اس کھوپڑی کی آنکھوں کے سوراخ میں اس نے دو انگلیاں ڈالیں اور پھر انہی انگلیوں کو نکال کر ہوا میں لہرایا، پھر وہ جھکا اور زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر ہوا میں بکھیر دی اور پھر کچھ مٹی کے ذرات اپنے سینے پر پڑی ہوئی کھوپڑی کی آنکھوں کے سوراخوں میں ڈال دیئے۔ کاہن کے ہاتھ سے اس مٹی کا کھوپڑی کے سوراخوں میں پہنچنا تھا کہ ایسا لگا جیسے خاک اور ذروں کا

طوفان ہے جو چاروں طرف سے اڑتا ہوا آ رہا ہے۔ ریت اور چھوٹے چھوٹے تیز نکیلے ذرات آندھی کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے وہ آ آ کر ہماری آنکھوں میں گھسنے لگے۔ ریت کی آندھیاں چل رہی تھیں اور ان آندھیوں کی منزل ہماری آنکھیں تھیں۔ ہر طرف کی ریت اڑاڑ کر ہماری آنکھوں میں اترنے کے لیے بے چین تھی۔ چاروں طرف گرد و غبار چھا گیا اور خاک اور ریت ہر طرف برسنے لگی۔

میرے ہاتھ میں وہی لوران کا رومال تھا۔ میں نے محض عادتاً اس کا استعمال کیا تھا بالکل اسی طرح جیسے گرمی اور آندھی میں جیب سے رومال نکال کر آنکھیں صاف کی جاتی ہیں یا آنکھوں پر اسے رکھ لیا جاتا ہے۔ اس رومال کا آنکھوں پر رکھنا تھا کہ دھند، گرد، خاک، ریت سب کی سب میرے اطراف سے ہٹ گئیں۔ اب مجھے ماحول کی آلودگی بالکل بھی محسوس نہ ہوتی تھی ایسا لگتا تھا کہ میں شیشے کے کمرے میں بیٹھا ہوا باہر چلنے والی کسی آندھی کو دیکھ رہا ہوں اور خود شیشوں کے اندر محفوظ و مامون ہوں۔

ان کا یہ وار بھی خالی گیا اور وہ میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ شروع کی آنکھوں سے بھی میں نے ایک بار یہ رومال مس کیا۔ آنکھوں سے اس رومال کا چھونا ہی اس کے لیے ایک عظیم تجربہ تھا کیونکہ جیسے ہی رومال اس کی آنکھوں سے لگا اس اس دنیا کے سب باسی چلتے پھرتے مردہ جسم لوگ نظر آنے لگے۔ اس نے دیکھ لیا کہ میرے سامنے مخالف کاہنوں کی کون سی جماعت یہاں کھڑی ہے۔ اس سے قبل اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ اس نے یہاں کے لوگوں کو دیکھا تھا اور نہ ہی ان کی گفتگو سنی تھی اب وہ سب لوگ بھی اس کے سامنے تھے، اپنے عجیب و غریب وضع قطع کے کپڑے پہنے اور طرح طرح کی ہئیت بنائے ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔

دوسری مرتبہ بھی اس کاہن کو شکست ہوئی۔ خاک اور ریت کے ذرّوں کے طوفان بھی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے تو اب اس کی وحشتیں عروج کو جا پہنچیں۔ اسے اپنے خاموش ساتھیوں اور اپنے سے کم حیثیت لوگوں کے سامنے مات پر مات مل رہی تھی تو اس کا غیظ و غضب نے بھر جانا اور ہمیں شکست دینے پر تل جانا ایک فطری تقاضا تھا۔ چنانچہ اس بار اس کا حملہ بڑا ہی شدید تھا۔

اس نے اپنی داڑھی سے دو بال توڑے، ان کو اسی کھوپڑی سے چھوا اور پھر اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ ایک دو لمحوں اپنے ہاتھ میں لے کر پھر اس نے ان بالوں کو اپنی انگلی

میں لپیٹ لیا۔ وہ ادہر آہستہ آہستہ بالوں کو اپنی انگلی میں لپیٹ رہا تھا اور ادھر مجھے یوں لگ رہا تھا کہ کوئی رسیوں سے میرے پیر باندھ رہا ہے۔

"آقا! اب آپ کچھ نہ کریں۔ ان کو آزاد چھوڑ دیں ممکن ہے کہ یہ ہمیں قید کر کے وہیں لے جائیں جہاں سرجان، روسی اور دوسرے قیدہیں۔ ہم ان کے پاس پہنچ کر بہت جلد ان کی رہائی کی سبیل نکال لیں گے۔ ان کو اس بار فتح مند ہونے دیں۔

یہ بات میری سمجھ میں بھی آگئی تھی کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے کیونکہ مجھے اپنے پاس رکھے ہوئے عطیات پر کچھ اسی قسم کا ناز اور ایسا ہی اعتماد تھا۔ چنانچہ میں نے بھی یہی سوچا کہ جہاں تک آزادی کا مسئلہ ہے وہ تو میں جب چاہوں گا حاصل کر لوں گا۔ البتہ ذرا سارحان کے اس وسیع و عریض علاقہ میں سرجان مارشل، روسی اور دوسرے ساتھیوں کو ڈھونڈ نکالنا آسان نہ ہوگا۔ چنانچہ فی الحال یہی طریقہ اپنایا جائے کہ ان کو دھوکہ دے کر ان کے قید خانے تک پہنچا جائے جہاں سے دوسرے ساتھیوں کو بھی نکالا جاسکے۔ اور پھر شاید وہیں کسی جگہ رمیسیس کی ممی بھی مل جائے۔

کاہنوں کی جماعت نے ہمیں مغلوب ہوتے دیکھا تو ان کے چہرے گویا فتح کے احساس سے دمکنے لگے۔ جب وہ نامحسوس سی رسیاں ہمارے گرداگرد لپیٹ کر ہم دونوں کو گرفتار کر رہی تھیں تو میرے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا کہ مجھے مدافعت نہیں کرنی ہے۔ اور نہ ہی ان لوگوں کی کسی چال کا توڑ کرنا ہے۔ گویا فقط یہی ایک خیال تھا جس کی بدولت میرے قبضہ میں آئی ہوئی قوتیں خوابیدہ سی ہو گئیں۔ اس سے قبل دونوں مرتبہ جوں ہی انہوں نے مجھے زک پہنچانے کی کوشش کی تھی تو میرے ذہن میں فوراً یہ خیال اٹھتا تھا کہ میں ان سے مغلوب نہ ہوں گا، وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ شاید ان عطیات کا استعمال جو مجھے سکھایا ہی نہیں گیا تھا فقط قوت خیال ہی سے اثر پذیر ہوتا تھا۔ شاید اس کے لیے صرف توجہ اور یکسوئی کی ضرورت تھی۔ اور پھر ان سے جس طرح کا بھی چاہیں کام لیا جاسکتا تھا۔

شمرو اور میں دونوں کاہنوں کی اس جماعت کے پیچھے ان کے وفادار شاگردوں کی طرح چلے جا رہے تھے۔ نہ انہوں نے پلٹ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ہم ان کی حراست سے بچنے کے لیے کوئی جدوجہد تو نہیں کر رہے ہیں اور نہ ہی ہم نے کوئی ایسی کوشش کی۔ ہم جن راستوں سے گزر رہے تھے وہاں اسی قسم کے اجسام چل پھر رہے تھے جیسے کہ مجھے ادھر ادھر

نظر آ رہے تھے۔ یہ ایک لمحہ ٹھٹک کر ہمیں دیکھتے تھے اور پھر اپنے کام میں منہمک ہو جاتے جیسے یہ ہم سے لاتعلق ہوں۔ یا جیسے ان کے لیے ہمارا آنا یا سارحان کے اندر گھومنا پھرنا کوئی معنی نہ رکھتا ہو۔

ان راستوں پر ہمیں کوئی آبادی نظر نہ آئی نہ ہی ہم نے کھیت کھلیان، باغ باغیچے دیکھے۔ یہاں کے باسی کہاں رہتے تھے، کیا کھاتے پیتے تھے ہمیں کچھ اندازہ نہ تھا۔ یہاں تو پانی کا کوئی چشمہ، کوئی ندی، کوئی نالہ تک نظر نہ آتا تھا۔ آخر یہ لوگ اس ویران جگہ پر کیا کرتے تھے، ان کی غذا کیا تھی اور ان کی رہائش کس طرح ہوتی تھی؟ یہ سب کچھ سوچ سوچ کر میرے ذہن میں بے شمار سوال اٹھتے تھے۔ مگر میں کسی ایک کا بھی جواب نہ پاتا۔

ہم دونوں ان کے پیچھے پیچھے یوں چلتے رہے۔ بہت دیر گزر گئی۔ وقت کا کوئی حساب نہ تھا، یہ لمحے تھے یا صدیاں یہاں اس کا کچھ شمار نہ تھا۔ اس اجتماع سے بھی کچھ اور آگے ہم نے دیکھا کہ ایسے قیدی تھے جن کے جسم حرکت بھی نہ کرتے تھے۔ بظاہر وہاں کوئی جیل نہ تھی، کوئی قید خانہ نہ تھا مگر ان کی حرکات اور ان کی جنبشیں قطعاً موقوف سی تھیں بالکل اسی طرح جیسے کسی ذی روح کو ایسے شکنجے میں جکڑ دیا جائے جہاں وہ اپنے کسی عضو کو ہلا بھی نہ سکے۔ یہ لوگ دیکھتے بھی تھے اور شاید انھوں نے ہم دونوں کو کاہنوں کے اس چھوٹے سے قافلے کے ہمراہ آتے اور گزرتے بھی دیکھا تھا مگر ان کے جسموں میں کوئی حرکت سی نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے اسی لیے یہ اندازہ لگایا تھا کہ شاید سارحان کا یہ حصہ قید خانے کا کام دیتا تھا۔ پہاڑ کا دامن اب ہمارے کافی قریب آ چکا تھا۔ چٹانوں کے خدوخال، رنگ اور بناوٹیں اب واضح ہونے لگی تھیں۔ اسی قید خانے سے ایک راستہ تو سیدھا پہاڑی کی طرف جاتا تھا اور دوسرا اس کے متوازی چلتا تھا۔ ہمارے محافظ اسی متوازی راستے کی طرف مڑ گئے تھے اور اب ہم سب پہاڑ کے متوازی چل رہے تھے۔ اس راستے پر بھی ہم نے ایک طویل مسافت طے کی مگر یہ سارا راستہ یوں ہی چپ چاپ اور بغیر کسی سوال و جواب کے گزرا۔ شیرو اور میں بھی آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ اور وہ لوگ تو شروع ہی سے ایک گھمبیر خاموشی طاری کیے ہوئے تھے۔

یکایک وہ سب رک گئے۔ اور زمین پر ایک پتلی سی سرنگ کی طرف ہمیں اشارہ کرنے لگے۔ یہ ریت کے نیچے بنی ہوئی کوئی خندق یا کوئی زیر زمین پناہ گاہ کی مانند کوئی راستہ سا معلوم ہوتا تھا۔ یہ سرنگ تاریک اور بڑی ویران سی لگ رہی تھی۔ یوں تو ہمیں ہر

جگہ، سارحان کے چپہ چپہ پر ایک عجیب اداسی اور نیم تاریکی سی مسلط نظر آرہی تھی مگر یہ سرنگ اور یہ زیر زمین راستہ تو ان تمام تاریکیوں سے بھی تاریک تر اور ویران نظر آرہا تھا۔
کاہنوں نے ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے ان کے بڑے کاہن کو مخاطب کیا۔
"یہاں تک ہم تمہاری مرضی سے چلے آئے ہیں۔ ہم نے نہ کچھ پوچھا، نہ معلوم کیا۔ مگر اب تمہیں بتانا ہوگا کہ تم ہمیں کہاں اور کیوں لے جارہے ہو؟"
کاہن کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور اس نے کہا "ہمارے مہمان خانے ہزاروں سال سے ویران پڑے تھے۔ تم جیسے دیوانے یہاں کہاں پہنچتے ہیں! ہم اب صدیوں تک تمہاری میزبانی کریں گے۔ تمہارے دوسرے دوست بھی یہیں جسم اور روح کے رشتوں سے جدا ہوں گے اور ان ہی ریت کے تہہ خانوں میں تم اپنی ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹیں سنو گے اور پھر تمہاری روحیں تمہارے پنجروں کے گرد منڈلایا کریں گی۔"
گویا یہی وہ ریت کی چھت تھی جس کے نیچے تہہ خانہ تھا جہاں روسی اور سرجان قید تھے، دھوئیں کی چادر کے پیچھے اور ریت کے نیچے یہی وہ جگہ تھی جہاں کے لیے شمرو نے پہلے اشارہ کیا تھا۔
میں اب اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں میرے ہمراہی قید تھے۔ چنانچہ مجھے اس بات کا کوئی خطرہ بھی نہ تھی کہ یہ لوگ مجھے قید کر کے ہمیشہ کے لیے تڑپتا ہوا چھوڑ دیں گے۔ میرے دل میں بڑا اعتماد تھا کہ میں جب چاہوں گا خود کو آزاد کرالوں گا۔ اس تہہ خانے میں آتے ہوئے بھی میں یہ سب کچھ جب چاہتا کرسکتا تھا اور اب بھی جب چاہوں گا یہاں سے نکل سکوں گا۔ آتے ہوئے میں نے اس لیے صبر کیا کہ کاہنوں کی یہ جماعت مجھے خود ہی قید خانوں تک لے آئے اور مجھے تلاش نہ کرنا پڑے۔
اس جگہ ایک تاریک سی زیر زمین گلی تھی دروازہ کسی تہہ خانے کے راستے جیسا تھا جو کھلا پڑا تھا۔ شمرو اور میں اس جگہ تک زیر حراست قیدیوں تک پہنچے تھے مگر اس تاریک سرنگ میں داخل ہونے کا مطلب شاید زیر زمین کسی جیل خانہ میں پہنچ جانے کے مترادف تھا۔
کاہنوں کا پورا گروہ بمعہ اپنے سردار کے چند لمحہ وہاں کھڑا رہا اور پھر انہوں نے ہمارے چاروں طرف ایک چکر سا لگایا اور جس جس طرف وہ گزرتے تھے اس اس طرف راستہ بند سا

ہوتا جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے چاروں طرف ایک ان دیکھی فصیل بن گئی ہے۔ ایسی دیوار جس کا نہ کوئی رنگ تھا نہ طرز تعمیر مگر پھر بھی وہ ہمارے چوگرد موجود تھی۔ ہماری نگاہیں اس کے آر پار دیکھنے سے قاصر تھیں وہ لوگ بھی ہماری نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔ شاید وہ اس ضخیم دیوار کے عقب میں جا چھپے تھے۔ اس گول دیوار کے اندر ہی ہم قید تھے۔ اور اسی کے اندر اس تہہ خانہ یا سرنگ کا دروازہ تھا جو ان ساحروں نے ہمارے زندان کے طور پر تجویز کیا تھا۔ گویا میں اور شمرو ان کاہنوں کی دانست میں ایسی قید میں تھے کہ کہیں نہ جا سکتے تھے۔ اگر جا سکتے تھے تو صرف اس تہہ خانہ میں جس کے دروازے ہمارے لیے کھلے تھے۔

یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔ شمرو نے مجھے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی کس مپرسی کی سی کیفیت تھی۔ بے یقینی اور یاسیت اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔

"آقا! ساحان کی ظالم روحوں نے ہمیں آخر اپنا قیدی بنا ہی لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان تنگ دیواروں ہی میں زندگی کے آخری دن گزارنا ہوں گے۔" شمرو نے سارحان میں آ کر پہلی بار ناامیدی کے جملے ادا کیے۔

"شمرو! ہمیں سارحان کی سرحدوں تک ہمارے قدم نہیں لائے۔ دیوتاؤں کے فیصلے ہمیں ان راستوں پر کھینچ کر لائے ہیں۔ سو وہی ہماری مدد کریں گے۔" میں نے کہا

"آقا! اب ہمارے چاروں طرف تو دیواریں کھڑی کر ہی دی گئی ہیں۔ صرف زیر زمین سرنگ ہی کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ اس زیر زمین تہ خانہ میں شاید تمہارے ساتھی قید ہوں۔ آقا! چلو ان کو بھی دیکھ لیں۔ کیا پتہ کون کون زندہ ہے اور کون کون مارا جا چکا ہے۔"

"چلو! کم از کم ہم ان کو یہاں اوپر تک تو لا ہی سکیں گے۔"

میں اور شمرو دونوں اس دروازے کی طرف بڑھے۔ شاید ہمارے چوگرد دیوار کھینچنے والے کاہنوں نے جو اگر اس دیوار کے آر پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، ہمیں یقیناً اس تہہ خانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ شاید وہ ہماری بے بسی پر خوش بھی ہوتے ہوں گے کہ ہمارے سامنے اور راستہ بھی کیا رہ گیا تھا۔

قدم قدم چلتے ہوئے اب ہم اس تاریک سرنگ جیسی راہداری میں آ چکے تھے جس کے

آگے ہمیں بالکل گھٹا ٹوپ اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ یہ ایک طویل سی راہداری تھی۔ جیسے کسی قدیم زمانے کے قلعہ کی کوئی خفیہ سرنگ ہو۔ یہاں ہم ایک دوسرے کو کیا دیکھتے خود اپنے ہاتھوں تک کو دیکھنے سے قاصر تھے۔

اس طویل سرنگ میں ہم دونوں نہ معلوم کتنی دیر تک یوں ہی چلتے رہے تھے۔ شرو نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اور میں باوجود یہ کہ سخت اندھیرے میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا پھر بھی اعتماد کے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا۔ میرے ذہن پر کسی قسم کا خوف یا ڈر نہ تھا۔ اس کے برعکس اس وقت اگر میں کچھ سوچ رہا تھا تو صرف یہ کہ روس، سرجان مارشل، مصری لیکچرار اور ہمارے چند قلی، کل ملا کر سات آدمی اور بھی ہوں گے جو اس تہہ خانہ میں قید تھے۔ مجھے ان سب کو چھڑا کر لانا ہے۔ اور ان سب کو رہائی دلانی ہے۔ مگر کیوں کر؟ کس طرح؟؟ اس بات پر میرا ذہن بالکل ماؤف ہو جاتا تھا اور میں کچھ بھی نہ سوچ پاتا تھا۔

چلتے چلتے اب ہم کافی دور نکل آئے تھے۔ آنکھیں کچھ کچھ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ اب سرنگ کی تنگ راہداری میں ذرا وسعت بھی نمایاں تھی اور پھر یہ وسعت آگے چل کر ایک بڑے کمرے میں تبدیل ہو گئی تھی۔

یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔ تاریکی میں اس کی وسعت کا اندازہ کرنا ممکن نہ تھا۔ میں اور شرو ایک کونے میں کھڑے ہو کر یہی سوچ رہے تھے کہ کس جگہ اپنے ساتھیوں کو تلاش کیا جائے کہ ہم نے اپنی پشت پر ہلکی ہلکی چاپ سنی جیسے کوئی ہلکے ہلکے چل رہا ہو۔ زمین پر قدموں کی ہلکی ہلکی دھمک پڑ رہی تھی۔ دھیمی دھیمی آواز ہمارے قریب تک آئی اور پھر رک گئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی ہمارے نزدیک ہے۔ ہمیں دیکھ رہا ہے یا ہمارے چہرے اور ہمارے احساسات کو ٹٹول رہا ہے۔ پھر یہ آواز واپس لوٹنے کے قدموں کی آواز لگی جو رفتہ رفتہ ہم سے دور ہوتی چلی گئی۔ کوئی تھا جو ہم تک آیا تھا، جس نے ہمارا تعاقب کیا اور ہمیں دیکھ کر واپس ہو گیا تھا۔ شرو نے مجھ سے پوچھا۔

"آقا یہ کون تھا؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں شرو؟" میں نے کہا

"آقا! تم بھی......؟؟ تم اتنی طاقتیں رکھنے والے ہو، تمہاری پشت پر تو مہرخ کے دیوتا مردوخ کا سب سے لاڈلا شاگرد مردوتش ہے۔ کیا وہ بھی تمہاری رہنمائی نہیں کرتا؟"

"شرو! میرے پاس یہ تحفے ضرور ہیں مگر میں نہیں جانتا کہ ان سے کیوں کر کام

لوں۔ مجھ کو یہ علم ہی نہیں ہے کہ ان کو کس طرح استعمال میں لاؤں۔"

"آقا! اس سیاہ براعظم کے ہر ساحر کا تعلق کسی نہ کسی طرح مردوقش سے ہے۔ وہ اس وقت بھی عظیم ترین ساحر مانا جاتا ہے۔ اس کے معمولی معمولی سیوک بھی اپنے اندر اتنی شکتی رکھتے ہیں کہ چٹانوں کو ہوا میں اڑا دیں اور اڑتے پرندوں کو پتھروں کا لباس پہنا دیں۔ تاریکیاں ان کے لیے خود روشنیاں مہیا کر دیتی ہیں۔ اور روشنیاں ان کو اندھیروں کی داستانیں سناتی ہیں۔"

"شرو میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں، میں ساحر بھی نہیں ہوں نہ میں نے کوئی شکتی حاصل کی ہے۔"

"آقا! آپ کے لیے تو تاریک براعظم کا ہر ساحر، ہر جادوگر منتظر ہے۔ نہ معلوم کتنی آنکھیں آپ کو اور آپ کے ہر قدم کو تکتی ہیں۔ آپ کے پاس جو عطیات عظیم ولازوال مردوخ کے شاگرد مردوقش کے ہیں وہ کسی کے پاس نہیں ہیں۔ پھر آپ خود کو کیوں اتنا بے کس اور کمزور سمجھتے ہیں؟"

"شرو! مجھے اپنے اندر کی کسی طاقت کا استعمال نہیں آتا اور نہ ہی میں کسی عطیہ کے استعمال کا طریقہ جانتا ہوں۔"

"آقا! فقط آپ کو اپنے اندر ہی ڈوبنا ہوگا۔ اپنے تمام حواس اپنی خواہش پر مرکوز کر دینے ہوں گے۔ پھر آپ خود ہی دیکھیں گے کہ اس یکسوئی سے اور خیالات کو ایک مرکز پر لانے سے آپ کیا کچھ نہ کرسکیں گے۔ آپ کی حس اور آپ کے ادراک اس قدر تیز کر دیئے گئے ہیں کہ آپ کو کوئی فرد یا شخص دھوکہ نہیں دے سکتا اور نہ ہی دھوکہ سے گرفتار یا قید کرسکتا ہے۔"

شرو نے مجھے ایک راستہ بتا دیا تھا۔ اس نے گویا میرے اندر کی طاقت کو استعمال کرنے کا طریقہ بتایا اور مجھے آگاہ کر دیا کہ میں اپنے اندر کی طاقتوں کو سمیٹ کر ایک بے پناہ قوت بن سکتا ہوں۔ میں نے اس طاقت کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

ذرا دیر آنکھیں بند کر کے میں نے اپنے حواس مجتمع کیے میں نے سوچا کہ میں کہاں ہوں اور یہاں سے کیسے باہر جاسکتا ہوں۔ اب میرا ذہن یک سو ہوگیا۔ سارے حواس جیسے ہی ایک نقطہ پر مرکوز ہوئے میری بکھری ہوئی طاقتیں سمٹنے لگیں۔ چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند یکایک چھٹ گئی اور میں اب بہت کچھ

دیکھ رہا تھا۔ یہاں بھی، اپنے چاروں طرف بھی اور یہاں سے دور بھی۔ اب اندھیرا یا تاریکی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

میں نے دیکھا کہ اس وسیع و عریض ہال کے ایک کونے میں ایک لاش پڑی ہے۔ شرو کو ایک جگہ کھڑا کر کے میں لاش کی سمت بڑھا۔ یہ لاش جس کا چہرہ زمین کی طرف تھا، الٹی پڑی تھی۔ اس کے جسم پر موجودہ زمانہ کے مصریوں جیسا لباس تھا۔ شاید وہ ہمارے ساتھیوں میں سے کسی مصری قلی یا مصری خادم کی لاش تھی۔ قریب جا کر میں نے اس کے الٹے پڑے ہوئے جسم کو پلٹا تو میرے خدشے صحیح نکلے۔ یہ ہمارے ہی گروپ کا مصری خادم تھا۔

جب سرجان مارشل، مصری پروفیسر اور میں تین اطراف میں مختلف ٹولیاں بنا کر نکلے تھے تو سرجان مارشل، روسی اور ایک قلی مغرب کی طرف گئے تھے۔ مصری پروفیسر، ایک ان کے اسسٹنٹ اور ایک مصری قلی شمال کی جانب بڑھے تھے۔ اور تیسرے گروپ میں، میں اور شرو، خداعی اور ایک اور قلی تھے۔ تین مصری پروفیسر تو ابتدائی ہفتہ کی صعوبتوں سے تنگ آ کر لوٹ چکے تھے۔ چنانچہ یہ لاش مصری پروفیسر کے گروپ کے ایک قلی کی تھی۔

لاش پر کسی ضرب کا نشان نہ تھا۔ کہیں خون بھی گرا ہوا نہ تھا۔ نہ ہی کسی جدوجہد یا کسی زبردستی کے آثار نظر آئے۔ مگر لگتا تھا جیسے یہ کسی لڑائی جھگڑے یا ہار جیت کی کشمکش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ لاش کچھ اور ہی قصہ سنا رہی تھی۔

اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، منہ کھلا ہوا تھا اور اس مردہ چہرے پر ابھی تک خوف کی لکیریں پھیلی ہوئی محسوس ہو سکتی تھیں۔ شاید اس مصری قلی نے رات کے اندھیرے میں مصری پروفیسر کے ہمراہ فرعون رمیسیس کے مدفن کو تلاش کرتے کرتے جب یکایک اپنے آپ کو دھوئیں کی چادروں سے ادھر پایا ہو گا تو اس پر خوف اور تعجب چھا گیا ہو گا۔ پھر اس نے خود کو سارحان کے اس قید خانہ میں محبوس دیکھا ہو گا تو دہشت اور بڑھ گئی ہو گی۔ اور پھر خوف و دہشت کے کسی لمحہ پر اس نے اس تاریک غار میں ایسا منظر دیکھ لیا ہو گا کہ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

سارحان کسی عام آدمی کے لیے ایک ویران اور بنجر علاقہ کے سوا اور کیا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں ایک بے آب و گیاہ ریت کا میدان جس پر کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں اور پھر

ریت کی بلند ہوتی ہوئی سطح پہاڑی کے دامن سے جا لگی تھی۔ لیکن جو لوگ اپنی باطنی طاقت سے یا کسی اور قوت کے ذریعہ سارحان کے مکینوں کو دیکھ سکتے تھے انہوں نے وہاں کھڑکھڑاتے ہوئے ہڈیوں کے پنجر بھی دیکھے ہوں گے، بگولوں کی طرح بل کھاتے اور مرغولوں کی طرح تیرتے ہوئے غیر مادی روحانی اجسام بھی نظر آئے ہوں گے اور مردہ جسموں سے نکلی ہوئی روحوں کی آبادیاں ان کی نگاہوں میں بس چکی ہوں گی۔ ہمارے پورے گروپ میں فقط میں تھا جس کو یہ باطنی قوت ملی ہوئی تھی کہ مادی اجسام اور روحانی پیکر دونوں ہی کو دیکھ لیتے اور ان کی گفتگو سننے اور ان سے بات کرنے پر مکمل طور پر قادر تھا یا پھر کسی حد تک یہ قوت شمرو کے حصہ میں بھی آئی تھی۔

لاش کے قریب آ کر میں نے شمرو کو آواز دی۔ میں نے سوچا کہ اس جسم کو دیوار کے سہارے ایک کونے میں لٹا دیا جائے تاکہ بعد میں ہم اسے باہر لے جا کر مسلمانوں کی طرح دفن کر سکیں۔ مگر شمرو نے میری پکار کا کوئی جواب نہ دیا۔ دوسری بار جب میں نے زیادہ زور سے شمرو کو آواز دی مگر اب بھی کوئی جواب نہ آیا تو مجھے تشویش ہوئی۔ سر اٹھا کر جب میں نے چاروں طرف دیکھا تو مجھے شمرو کے وجود پر موت کی گرفت نظر آئی۔ ہڈیوں کا ایک پنجر شمرو سے الجھا ہوا تھا۔ اس کی طویل کھڑکھڑاتی کلائیاں شمرو کی طرف دراز تھیں اور انگلیوں کی ہڈیاں شمرو کی گردن میں پیوست تھیں اور شمرو کسی اچانک حملے میں بہت جلد بے دست و پا ہو گیا تھا۔ اس کی گردن بھی ڈھلک رہی تھی اور جسم بھی پیروں پر استوار نہ تھا، ادھر ادھر جھول رہا تھا۔ میں لپک کر اس پنجر کے پاس پہنچا اور اپنی پوری طاقت سے اس کے سر پر گھونسا مارا۔ مٹھی کے گھونسے کا رس پر وہی اثر ہوا جو لوہے پر مارنے سے ہوتا ہے۔ ہاتھ بالکل جھنجھنا گیا۔ الٹی مجھے ہی چوٹ لگی۔ مگر اس کا اثر ہڈیوں کے پنجر پر یہ ضرور ہوا کہ اس نے شمرو کی گردن چھوڑ دی۔ وہ ایکا ایکی میری طرف پلٹا۔ شمرو تو جیسے کٹے ہوئے درخت کی طرح جھول رہا تھا ہڈیوں کے پنجر کا ہاتھ ہٹتے ہی زمین پر آ رہا۔

اب وہ مردہ جسم میرے سامنے تھا۔ اف، کس قدر بھیانک سر تھا اس کا! کاسۂ سر میں آنکھوں کے دو بڑے اور گہرے گڑھے تھے، ناک کا سوراخ بھی بڑا تھا اور جبڑے کے دانت ایک دوسرے کے اوپر تلے جمے ہوئے تھے۔ گھپ اندھیرے میں کسی اور کے لیے یہ پنجر کسی سفید سے سائے کی طرح تھا مگر میں جن باطنی قوتوں سے بہرہ ور تھا اور میرے احساس جو ابھی تھوڑی دیر قبل جاگ گئے تھے میں ان قوتوں اور حواسوں کے ساتھ دیکھ سکتا

تھا کہ یہ ایک محافظ کا جسم تھا۔ کسی فوجی کا جسم اور یہ یہاں غالباً کسی کی حفاظت پر مامور تھا۔ شاید یہی وہ پنجر ہوگا جو مصری قلی کے سامنے آگیا ہوگا اور شاید اسی کی دہشت سے اس کی جان نکل گئی ہوگی۔ اور شاید یہی وہ پنجر ہوگا جس کے قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ ابھی چند لمحوں قبل ہم دونوں نے سنی تھی۔ شرو کو تنہا دیکھتے ہی اس پر حملہ آور ہوا اور اگر میں چند سیکنڈوں کی بھی دیر کرتا تو پھر مجھے وہاں شرو کی لاش ہی ملتی۔

ہڈیوں کا یہ پنجر اب میرے سامنے کھڑا تھا اور پھر اس کے لمبے لمبے ہاتھ میری طرف لپکے۔ میں ذرا جھکا تو اس کے دونوں بازو بھی جھک کر مجھے پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں ذرا پھرتی سے جھکتے ہی جھکتے دو قدم پیچھے ہٹ کر پھر سے سیدھا کھڑا ہوگیا۔ یہ جسم پھر میری طرف بڑھا۔ قریب آکر جیسے ہی اس نے دوبارہ مجھے گرفت میں لینا چاہا میں نے اس بار بالکل نیچے کی طرف جھک کر اس کی پنڈلی کی ہڈیوں پر زور سے جوتے کی ٹھوکر ماری۔ اس چوٹ سے وہ ذرا ڈگمگایا تو میں نے دوسرے پیر کے گھٹنوں پر بھی دوسرے جوتے کی ٹھوکر رسید کی۔ اور اس کی پسلیوں پر ہاتھ ڈال کر اسے زمین سے اٹھا کر پٹخ دیا۔ دونوں پیروں کی ضربات نے اسے ویسے ڈگمگا دیا تھا، پھر اٹھا کر پٹخ دینا کچھ ایسا مشکل نہ ہوا۔ اس میں کچھ ایسا وزن بھی نہ تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر زمین پر چت پڑے ہوئے جسم اور پھیلے ہوئے ہاتھوں اور پنجوں کو دیکھا اور لپک کر اس کے ہاتھوں پر زور دے کر کھڑا ہوگیا۔ اب وہ اٹھنے کی کوشش کرنے کے باوجود بے بس تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کا ایک پنجہ میری گرفت سے نکلا اور اس نے میری پنڈلی پکڑنے کی کوشش کی تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے پیروں کے گوشت میں لوہے کی پتلی پتلی سلاخیں گاڑ دی ہوں۔ یہ تکلیف بھی زیادہ دیر نہ رہی۔ میں نے اپنے پیر کو اس کی گرفت سے چھڑا کر پھر اسے بے بس کر دیا۔

میں نے اپنی باطنی قوتوں سے نہ صرف اس کو سمجھ لیا تھا بلکہ اس کا نام، اس کے فرائض بھی جان چکا تھا۔ میرے ذہن میں خیال کا ایک شعلہ سا لپکا۔ تب میں نے اسے مخاطب کیا۔

"سنور عامادی! تم رمیسیس کے محافظوں میں سے ہو۔ میں جانتا ہوں، میرا علم ہی مجھے تمہارے نام اور تمہارے پیشے سے آگاہی دلا چکا ہے۔ تم اس کی حفاظت پر مامور ہو اور اس تک کسی کو پہنچنے نہیں دیتے۔ مگر میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔ تمہارا دشمن

نہیں۔"

ہڈیوں کا یہ پنجر جس محافظ کا تھا وہ ایک فوجی تھا اور رمیس کا باڈی گارڈ تھا۔ جس طرح اس کے مالک نے دریائے نیل میں ڈوب کر جان دی تھی اسی طرح یہ بھی اس کے ساتھ ہی غرق ہوگیا تھا۔ یہ بڑا وفادار تھا۔ پھر یہ دونوں سارحان کے قید خانے میں ڈال دیئے گئے۔ میرا ادراک مجھے دکھا رہا تھا کہ یہ صدیوں سے اسی طرح اس کی حفاظت پر تعینات تھا۔ مجھے اپنے تمام ادراک کے باجود نہ تو کہیں اس کا آقا نظر آ رہا تھا اور نہ ہی میرے ساتھی لوگ۔

اسے شاید اس کا نام لے کر پکارنے سے کچھ تعجب سا ہوا اور اس لمحے آزاد آزاد ہو کر مجھ پر حملہ آور ہونے کی اس کی جدوجہد ختم ہوگئی۔ میں بھی اسے چھوڑ کر الگ جا کھڑا ہوا۔ وہ دوبارہ کھڑا تو ہوا مگر میری طرف بڑھنے کی اب اس نے کوئی کوشش نہ کی۔ شاید وہ اس تذبذب میں تھا کہ میری بات پر یقین کرے یا نہ کرے۔

"رعامادی! میں یہاں یوں ہی نہیں آگیا ہوں۔ میری قوتیں میرے ساتھ ہیں۔ مردوخ دیوتا میری پشت پر ہے اور مردوقش کے عطیات میری گردن میں جھول رہے ہیں۔ تم جان لو کہ میں تمہارے آقا کو صدیوں کی بے حرمتی اور بے کسی سے نجات دلا کر کسی اہرام کی زینت بنانے آیا ہوں۔ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

رعامادی پر ایک سکوت سا طاری تھا۔ ادھر شرو بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ شاید سوچ رہا ہو کہ کیا مردہ ہڈیوں کے پنجر بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔ اسی اثنا میں شرو میرے قریب آ کر میرے پیچھے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے کان میں سرگوشی کی۔

"آقا! اس کو ملکہ لوران کا رومال دکھاؤ۔ ملکہ لوران فرعون کی زشتہ کی بہن تھی۔ اس کا ارضِ مصر میں بابل سے آنا جانا رہا تھا۔ شاید یہ اسے پہچان لے۔"

میں نے اس مردہ پنجر کی طرف دیکھا تو وہ ابھی تک شاید اسی گومگو کی کیفیت سے دوچار تھا۔

"دیکھو! شہزادی میناممتی کی ماں ملکۂ عالیہ لوران کا عطیہ، پہچانتے ہو؟ تمہارے آقا کی بہن کا تحفہ بھی میرے ساتھ ہے۔ تم چلو، مجھے اپنے شہنشاہ فرعون کے پاس مجھے لے چلو۔ وہ مجھے پہچان لے گا۔ اسی نے مجھے خوفو کے اہرام میں ادھر آنے کی دعوت دی تھی۔"

خوفو کے اہرام کا تذکرہ ملکہ لورابن کے رومال سے بھی زیادہ اثر انگیز ثابت ہوا۔ وہ ایک دم جھکا اور جھک کر اپنا سر زمین پر میرے قدموں سے لگا دیا۔

"اس شام کو جب تم خوفو کے اہرام کے گرد چکر کاٹ رہے تھے تو میں ہی تمہیں لے کر اہرام میں داخل ہوا تھا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ مجھے تم سے معافی مانگنی چاہیے۔ بے خبری میں شاید تمہارے ساتھی کو میں آج ختم ہی کر چکا ہوتا۔ مجھے تمہارے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔"

اب میں نے بھی جو غور کیا تو واقعی اسی تن و توش کی وہ لاش تھی جس نے پہلی بار مجھے خوفو کے اہرام میں داخل کرایا تھا۔ شاید یہی وہ محافظ یا ساتھی تھا جو مجھے اہرام کے اندر لے گیا تھا جہاں میں نے شہنشاہ فرعون رمیسیس کو حضرت موسیٰ سے مقابلہ کرتے اور پھر اس کو ان کا پیچھا کرتے، ڈوبتے اور ممی میں ڈھلتے دیکھا تھا۔

یہ گفتگو بھی شرو تک منتقل نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نے پھر مجھ سے پوچھا

"آقا! یہ کیا کہتا ہے؟"

میں نے شرو کو مختصراً اس کا جواب سنایا۔ تو اس نے میری طرف کسی اور ہی عقیدت سے دیکھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ یہ میرا آقا ہے جسے میں اب تک صرف شہزادی مینا مستی کا نجات دہندہ سمجھ رہا تھا فرعون رمیسیس کا بھی نجات دہندہ بننے والا ہے۔ دو دو اعزاز اس کے آقا کے نصیب میں لکھے تھے۔ میری سرفرازی اس کے لیے بھی باعثِ افتخار تھی۔

آگے آگے رعامادی کا لڑکھڑاتا ہوا پنجر چل رہا تھا اور اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے شرو۔ یوں یہ قافلہ تاریکیوں سے دور اور مزید تاریکیوں کی طرف جا رہا تھا۔ ایک بار چلتے چلتے اس نے سرگوشی کی۔

"تم میرے آقا کے مہمان ہو۔ جب میرا آقا یہاں نہیں ہو گا تو پھر مجھ سے یہ حرکت کرنے کی طاقت بھی چھن جائے گی مگر مجھے خوشی ہو گی اور صدیوں کی حفاظت کا فرض بھی پورا ہو چکا ہو گا۔"

"رعامادی! تم اس رات یہاں سے کس طرح نکل کر خوفو کے اہرام تک جا پہنچے تھے حالانکہ یہاں تو بہت سخت پہرے ہیں۔ اور تم تو سارحان کے قیدی ہو۔ پھر وہاں کیسے پہنچ گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"آقا! یہ روحوں کی دنیا ہے۔ اس کے اسرار کچھ اور ہیں۔ ساری دنیا کی روحوں کو سال کے چند مخصوص دنوں میں گھومنے کی آزادی ہوتی ہے۔ بڑے آسمانی دیوتا کے حکم سے ہر روح کو سفر کی آزادی ہوتی ہے۔ کوئی اپنے عزیزوں میں لوٹ جاتا ہے، کوئی اپنی کسی اور مخصوص پسندیدہ جگہ جاتا ہے کوئی خاص جگہ جا کر عبادت کرنے لگتا ہے۔ ہم اپنے عزیزوں کے گھروں میں جاتے ہیں، ان کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کے غموں کو جانتے ہیں مگر اس کا کوئی مداوا نہیں کر سکتے۔ عمل ہماری دنیا اور ہماری طاقت میں نہیں ہوتا۔ اور پھر اس معینہ مدت کے بعد خود بخود ہم اپنی پرانی جگہ لوٹ جاتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ یہ نظام ہزاروں سال سے یوں ہی چل رہا ہے۔"

میرے لیے واقعی یہ عجیب دنیا تھی۔ روحوں کا اپنا ایک الگ نظام تھا۔ اپنے الگ قانون تھے۔ محدود آزادیاں تھیں اور مخصوص مقامات تھے جہاں وہ رہتی تھیں۔ بہرحال یہی سوچتا ہوا میں آگے بڑھ رہا تھا کہ یکایک وہ پنجر ایک دیوار کے پاس جا کر رک گیا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ "آقا! اب تم خود ہی اندر چلے جاؤ۔ یہاں میرے داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔"

دیوار میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ پھر بھی جب میں آگے بڑھا تو مجھے یہ دیوار بھی اینٹ پتھروں کے بجائے کسی اور دبیز سی تہوں کی بنی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں اس سے گزر کر اندر جا پہنچا۔

اندر میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں لکڑی کا بنا ہوا ایک تابوت سا رکھا ہے۔ اس تابوت کے سوا یہاں اور کچھ بھی موجود نہ تھا۔ میں آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ تابوت کا ڈھکنا خود بخود آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

باب نمبر ۲۰

ادھر تابوت کا ڈھکنا آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ اور ادھر میرے دل میں امید و بیم کا چراغاں ہو رہا تھا۔ کیا یہی میری منزل تھی کیا یہی صندوق ہے جس سے میری شہرت کا آفتاب طلوع ہوگا؟ کیا اسی تابوت سے وہ لاش نکلے گی جس کی تلاش میں سرجان مارشل، روسی، شمرد، خداعی، مصری پروفیسر اور میں مصر کے ان ریگزاروں میں تپتے اور جلتے بھنتے رہے ہیں۔

کیا یہیں وہ فرعون قید ہے جس کی ممی میں نے اپنی قید کے دوران اہرام میں بیٹھے دیکھی تھی۔ یہ چند لمحے امید اور اضطراب کے لمحے تھے۔

اس گھپ اندھیرے میں، میں تنہا کھڑا ہوا تھا اور صندوق کی ہلکی سی چرچراہٹ بھی اسی مکمل سکوت میں ایک مہیب سا شور بن کر گونج رہی تھی، یہ ایک مہیب خاموشی کا تاریک سیاہ قید خانہ تھا۔ اس کی چاروں دیواریں سارجان کی سرحدوں کی طرح دودھیا رنگ کے دبیز دھوئیں کی دیواریں تھیں جو تاحدِ نظر اوپر اور اوپر ہی کی طرف اٹھتی چلی گئی تھیں۔ یہ دیواریں دیکھنے میں آسمان سے ملتی نظر آرہی تھیں اس محبس میں نہ کھڑکیاں تھیں، نہ جالیاں، نہ دروازے نہ کوئی پہرہ دار نہ محافظ یہاں صرف میں تھا اور میرا ادراک میرا تخیل اور میرا اضطراب، نہ کوئی دوسرا ذی روح تھا نہ آدم زاد۔ ایک میں اور ایک یہ تابوت جس میں سے مقید ہڈیوں کا پنجر اب آہستہ آہستہ باہر نکل رہا تھا۔

میں اس اندھیرے میں یہ دیکھنے کی شدید تمنا رکھتا تھا کہ اس تابوت میں سے جو کوئی بھی باہر آنے کی کوشش کر رہا ہے اس کے خدوخال کیا ہیں؟ وہ کون ہے؟ اور وہ کس طرح خود بخود باہر نکل سکے گا؟ کیا وہ اکیلے ہی صندوق سے نکل آئے گا؟ کیا میں اس کی مدد کروں۔ یا خاموشی سے دیکھتا رہوں؟

میں نے آنکھوں پر زور دے کر اندھیرے میں دیکھنے کی استعداد بڑھائی تھی۔ اور کچھ آنکھیں بھی اب تک اندھیرے کی عادی ہو گئی تھیں۔ ادھر اب صندوق کا ڈھکنا پوری طرح کھل چکا تھا۔ یہ ایک تاریخ ساز لمحہ تھا، کم از کم میں اپنی پوری زندگی اس لمحہ کو کبھی نہ بھول سکوں گا جبکہ تابوت سے ایک ڈھانچے کا پٹیوں میں لپٹا ہوا ہاتھ باہر نکل رہا تھا، ہاتھ

کیا تھا سفید سفید پٹیوں میں ملفوف ایک غلاف سا تھا جو لڑکھڑاتے ہوئے جسم کو سہارا دیتا ہوا باہر نکال رہا تھا۔

صندوق سے باہر نکل کر اس کی ہیئت اور بھی ڈراؤنی سی ہوگئی تھی، پورا جسم کپڑے کے ایک غلاف نما تھیلے میں لپٹا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ اس غلاف نما کفن سے صرف اس کا چہرہ باہر تھا اور چہرہ؟ یہ چہرہ بھی اب چہرہ کہاں تھا؟ ہاں کبھی رہا ہوگا۔ اب تو کاسہ سر پر آنکھوں کے دو بے نور گڑھوں اور ناک کے سوراخ کے سوا اور رہا بھی کیا تھا؟ جبڑے کی ہڈیاں اور دانتوں کی قطاریں سب کی سب مل کر بھی اسے کوئی ہیبت نہ دے سکی تھیں ہاں یہ ضرور تھا کہ ممی بنانے والوں نے اپنے علم، تجربہ اور دواؤں کے زور سے اس کے ناک نقشہ کو بوسیدگی سے بچا لیا تھا۔

ڈھانچہ تابوت سے نکل کر میرے قریب تک آ پہنچا تھا۔ پھر اس کے جبڑے کھلے دانتوں کی قطاروں میں حرکت پیدا ہوئی اور عجیب مِن مِن کی سی آوازیں نکلیں۔ اس کے لبوں کی جنبش کا کوئی آہنگ تھا نہ الفاظ کی ادائیگی کا کوئی ڈھب تھا نہ اس کے لبوں سے انگریزی کے لفظ نکلے نہ ہی عربی یا عبرانی کے مگر جو کچھ وہ کہنا چاہ رہا تھا وہ مجھ تک پہنچ رہا تھا، یوں بھی مافی الضمیر کے کسی زبان میں ادائیگی کا مسئلہ صرف زندہ انسانوں کا مسئلہ ہے مردہ روحوں کا نہیں، وہاں ذہن بولتا ہے اور ذہن پڑھتا ہے۔ وہاں زبان کے پردے نہ کچھ چھپا سکتے ہیں نہ کچھ بتا سکتے ہیں، مردہ انسانوں کی روحوں کی گفتگو فقط ادراک اور شعور کی زبان میں ہوتی ہے، کسی مخصوص بولی یا جغرافیائی زبان کی وہاں ضرورت نہیں ہوتی، چنانچہ اس پنجر نے جو کچھ مجھ سے کہنا چاہا میں سن رہا تھا اور جو میرے دل میں تھا وہ اس تک منتقل ہو رہا تھا۔

"نوجوان سن، میں ان طاقتوں کو سلام کرتا ہوں جنہوں نے تمہیں مجھ تک پہنچا دیا ہے؟"

اس لمحہ شاید میری برطانوی تہذیب کی رگ پھڑک اٹھی تھی۔ میں نے سوچا کہ کسی باقاعدہ گفتگو سے قبل ذرا تعارف ہو جائے تو اچھا ہے۔

میں نے کہا۔

"میں جان میلکم ہوں اور اسکاٹ لینڈ کے قصبہ مائیرن کا رہنے والا ہوں، میں آکسفورڈ کا ایک طالب علم ہوں کیا میں اپنے مخاطب سے متعارف ہو سکتا ہوں؟ کیا تم اپنا نام

بتانا پسند کرو گے؟"

"امیدوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ آرزو کو کوئی بھی جسم مل جائے وہ پھر بھی آرزو کہلاتی ہے۔ تم کون ہو؟ کیا ہو؟ ہم ہزاروں سال سے جاتے ہیں۔ ہم نے انتظار میں صدیاں ہی نہیں گزاریں تمہاری نسلیں بھی گنی ہیں۔" وہی آواز ابھری۔

"کیا تم جانتے تھے کہ میں یہاں آؤں گا۔ کیا تمہیں میرا انتظار تھا؟ کیا تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ طویل صدیاں جو لمحہ لمحہ جاں گسل انتظار میں گزر گئیں۔ تمہارے آنے سے آج محض ایک خواب کی طرح سمٹ گئی ہیں۔ تم کون تھے؟ کون ہو؟ کس لیے آئے ہو؟ یہ سب بے معنی ہیں تم بس ایک امید ہو آرزو ہو، ایک محسن ہو ایک نجات دہندہ ہو۔ ان ہزاروں سالوں میں یہاں ایک ہی ذی روح کو پہنچنا تھا اور وہ ذی روح تم ہی تو ہو۔ تمہارے آئے بغیر میں اس صندوق کی قید سے نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ فقط تمہاری موجودگی ہی میں ممکن تھا۔"

"تم نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا؟" میں نے کہا۔

"ہڈیوں کے اس پنجر نے ہاتھ اٹھا کر ایک شان بے نیازی سے کہا۔"

میں جو کبھی شاہ شاہان شہنشاہ فرعون رمیسیس دوئم کہلاتا تھا آج ان بے کار ہڈیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوں۔ تم یہ سب پوچھ کر کیا کرو گے؟ میں جانتا ہوں۔ مجھے دنیا میں بہت سے لوگ، تمام بڑی قومیں، یہودی، عیسائی اور مسلمان خوب اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں ایسا گمنام بھی نہیں ہوں۔ مجھے تمہاری مذہبی کتابوں میں جگہ ملی ہے میرا تذکرہ تمہاری تاریخوں میں موجود رہا ہے۔"

"ہاں تم ہر دور میں یاد رکھے گئے ہو تمہارا دریائے نیل میں ڈوب جانا ایک تاریخ ہے تم تاریخ اور ماضی کا ایک حصہ بن چکے ہو۔ جب تک دریائے نیل بہتا رہے گا تمہارا نام بھی تاریخ کے دھارے میں بہتا رہے گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میری بدنامی اور میرا عبرت بن جانا۔ یہی میرا مقدر تھا۔ اگر لعان اور شمعون مجھے الٹی راہیں نہ دکھاتے تو آج میرا مقام بھی آسمانی دیوتا کے مقبروں میں لکھا ہوتا۔ اور میں یوں کئی ہزار سال تک دھوئیں کے ان قید خانوں میں مقید نہ رہتا۔ سارحان میری منزل نہ بنتی، مجھے کبھی الہام نہ ملا میری صحیح طرح سے کبھی بھی نہ بنی

میری کھال اور جسم کو دریائی جانور کھا گئے تھے، پھر مجھے نکالا گیا۔ میری ایک غلط سلط ممی بنائی گئی وہ بھی چوری چھپے اور بالکل پوشیدہ طور پر اور مجھے یہاں پھر قید میں لا ڈالا گیا۔ دھوئیں کی ان دیواروں کو پار کر کے باہر نکل جانا میرے بس میں نہ تھا مگر مجھے علم تھا کہ تم آؤ گے۔ لوران شمعون اور مردوقش سب نے یہی کہا تھا کہ ایک لڑکا جس کی پیشانی پر تین ستارے چمکتے ہوں گے اور جس کے ہاتھ گھٹنوں سے لمبے ہوں گے آنے گا مجھے نکال کر بہت دور لے جائے گا۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ انہوں نے بالکل صحیح کہا تھا۔ تم ایسے ہی ہو جیسا کہ انہوں نے کہا تھا۔"

"ہاں مجھے تمہاری طلب تھی روسی اور سرجان مارشل بھی تمہاری تلاش میں صحرا کی خاک چھان رہے تھے۔ وہ سب یہیں کہیں قید ہیں۔ خدامی اور شرو نے بھی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ مگر خیر ہم تم تک آ پہنچے ہیں۔ تمہیں لے جائیں گے، میں تمہاری ممی کو برٹش میوزیم میں سجا دوں گا۔ چلو اب چلیں اور ہاں، میں اپنے مقید ساتھیوں کو بھی ڈھونڈنا اور نکال لے جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"سنو نوجوان تم سارحان کے قوانین کو نہیں جانتے تم یہاں سے اس طرح اپنی مرضی سے نہیں نکل سکو گے، صرف اس رات جب آسمان پر چاند پورا ہو جاتا ہے صرف اسی دن ہی یہاں کی کوئی روح باہر جا سکتی ہے اور ابھی چاند کے پورا ہونے میں پورا ایک دن اور ایک رات کا فاصلہ ہے۔" رمیسیس نے مجھ سے کہا۔

"تو کیا میں تمہارے ساتھ یہاں قید رہوں گا؟"

"خدامی روسی اور میرے ساتھی کہاں ہیں؟ مجھے ان کو بھی تلاش کرنا ہے۔ میں یوں وقت کیسے ضائع کر سکوں گا؟"

"صبر کرنا بھی سیکھو، پچھلے چار ہزار سال سے میں نے بھی تو سیکھا ہے سنو سارحان میں ہر سو نادیدہ حدود موجود ہیں کوئی بھی ان حدود کو توڑ کر آگے نہیں جا سکتا۔"

"مگر تم شاید یہ نہیں جانتے کہ میرے پاس مردوقش کی ہڈی اور لوران کا رومال بھی ہیں۔ عطیات میرے سینے پر سجے ہیں یہ دیکھو۔" میں نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھا تم نے! اب بتاؤ ان کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی یہاں آنے سے نہیں روک سکا تو اب مجھے یہاں سے جانے سے کون روک سکے گا۔ یہ ہمت یہاں کسی میں نہیں ہے۔"

"کسی کی بھی طاقت بے حساب نہیں ہوتی۔ تم ابھی نوجوان ہو۔ عملیات کا گھمنڈ نہ کرو۔ تم یہاں تک پہنچ گئے ہو یہ بھی تنہا تمہارے بس کی بات نہ تھی، تمہیں یہاں تک لانے کے اسباب بنائے گئے ہیں اور تم اسی طرح اس مقام تک آئے ہو جس طرح تمہارے بارے میں بہت پہلے سے لکھ دیا گیا تھا۔ یاد رکھو تمہارے اختیار میں کچھ بھی نہ تھا۔ تم ایک معمول کی طرح یہاں لائے گئے ہو۔ اور یہ بات کہ ان چار ہزار سالوں میں تم ہی وہ شخص کیوں منتخب ہوئے جس کو یہاں آنا تھا تو یہ کوئی بھی نہیں جانتا، سب تقدیر اور قسمت کی باتیں ہیں۔"

میں نے کہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے مجھ پر کسی کا زور نہ تھا۔ میں نے کسی چیز کے تحت تمہاری تلاش نہیں کی تھی۔ سب کچھ میری مرضی سے ہوا ہے۔"

"مرضی بھی تقدیر اور احکامات ہی کی تابع ہوتی ہے۔ احکامات آسمانی خدا کے ہوتے ہیں، تمام وہ کام جو اچھے ہوں تمہاری قسمت میں پہلے ہی سے لکھے ہوتے ہیں البتہ برے کاموں کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہوتا یہاں ہماری مرضی ہوتی ہے چاہیں تو اس سے بچ جائیں یا چاہیں تو وہ کر گزریں۔ اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جبکہ انسان پستی میں جا گرتا ہے یا آسمان تک بلند ہو جاتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھو میں اور موسیٰ ساتھ ہی ساتھ تو رہتے تھے وہ بندگی کرتا گیا اور میں خدا بنتا گیا، میرا غرور مجھے لے ڈوبا اور اس کی عاجزی اسے کیا سے کیا بنا گئی۔"

میں نے سوچا کہ یہ سچ ہی کہتا ہو گا کہ سار حان سے پورے چاند کی رات سے قبل نکلنا ممکن نہ ہو گا۔ سو جب وقت موجود ہی ہے تو کیوں نہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ جاؤں اور اس کے ساتھ کچھ گذرے ہوئے زمانے کی جھلکیاں ہی دیکھ ڈالوں، میں نے دھوئیں کی دیواروں کے پیچھے شرو اور رعاماوی کو چھوڑا تھا، میں نے شرو کو پکارا تو اس کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی، میں نے اسے بتایا کہ وہ کچھ دیر آرام کر لے۔ میں محفوظ ہوں اور جلد ہی اس سے آملوں گا۔ شرو نے پھر مجھ سے آواز دے کر پوچھا۔

"آقا۔ رعاماوی کہتا ہے کہ وہ مجھے ہمارے دوسرے ساتھیوں کے قید خانے تک لے جاسکتا ہے اور ان کو نکال کر یہاں تک لانے میں مدد بھی کرے گا۔ کیا میں اس کے ساتھ چلا جاؤں؟ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

میں نے اس کو اجازت دے دی اور خود ریمیسیس کی ممی کے پاس بیٹھ گیا وہ اسی طرح غلاف میں لپٹا لپٹایا کھڑا تھا۔

یہ رات مجھ پر جس طرح گزری تھی اس سے میرا پورا وجود دہل گیا تھا۔ بدبودار دھوئیں کے بادلوں سے ٹکراؤ پھر سارحان کی سرحدوں پر سفید عقاب کی یلغار اور پھر یہاں کی سرحد کے اندر آکر بھی جو مقابلے ہوئے تھے ان سب نے مل کر میرے پورے وجود کو شدید کسل مندی اور تھکن میں مبتلا کر دیا تھا۔ سو میں نے ذرا آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر اس تنہائی میں علاوہ آرام کے اور کیا ہوسکتا تھا یا پھر اس ڈھانچہ سے جس کا کبھی بڑا کروفر تھا۔ جلال تھا غلبہ تھا فوجیں تھیں اور شان و شوکت تھی، صرف کچھ گفتگو کی جاسکتی تھی۔

"تم نے موسیٰ کو پناہ دی تھی ان کی پرورش کی تھی تم ان کی نیک عادتوں کو دیکھتے بھی ہو گے پھر بھی تم ان کے دشمن بن گئے۔ کیوں؟ تم نے ان کو مار ڈالنا چاہا کیوں؟ ان کے ماننے والوں پر فوج لے کر چڑھ دوڑے۔ آخر یہ سب کچھ تم نے کیوں کیا تھا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

یہ میری بدقسمتی کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ اس وقت میرا غرور آسمان پر تھا۔ ہامان میرا وزیر اعظم تھا اور شمعون میرے دربار کا کاہن تھا۔ میری بڑی فوج تھی اور میرے حکم کی تعمیل انسانوں کے لیے ایک عبادت کا درجہ رکھتی تھی، میں لفظِ شکست سے ناآشنا تھا۔ ناکامی میں نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ دور و قریب کی ہر طاقت میرے سامنے جھک جاتی تھی، میرے دربار میں آنے سے قبل ہر ایک مجھے سجدہ کرتا تھا۔ جب اقتدار اتنا مکمل ہو تو تم ہی کہو انسان کا دماغ کیوں نہ بہک جائے؟"

"ہاں تم نے شاید کبھی کسی کو اپنے مقابل نہ پایا ہوگا۔ ہمیشہ خود کو ایک اعلیٰ حیثیت ہی میں دیکھا ہوگا۔ اس لیے تم اس بات کے ماننے پر خود کو کسی طرح نہ تیار کرپائے ہو گے کہ موسیٰ کے خدا کے سامنے جھک جاتے۔"

اس نے آنکھیں کھول کر بڑے کرب سے کہا۔ "ہاں ایسا ہی تھا ہمارا کوئی بھی حریف نہ تھا کوئی مقابل نہ تھا بلکہ یوں کہو کہ سینکڑوں سالوں سے ہم یونہی حکومت کرتے چلے آئے تھے، ہم حکم دیتے تھے، ہم حکومت کرتے تھے، محل بناتے تھے زندگی گزارتے تھے اور اس عیش و نشاط کی زندگی کو تاابد باقی رکھنے کے لیے اپنے اہرام بنا کر ان میں منتقل

ہو جاتے تھے۔ موسیٰ وہ پہلا شخص تھا جس نے کہا تھا کہ ہماری طاقت سے بھی بڑی کوئی طاقت ہے جو آسمان پر حکومت کرتی ہے۔ اس نے ہمارا ایک حریف ایک مقابل پیدا کر دیا تھا اور مقابل بھی وہ جس کو ہم سب سے کہیں بڑا کہتا تھا۔ اس نے ہمارے اقتدار ہی کو نہیں ہمارے پندار کو بھی زک پہنچائی تھی۔"

"پھر کیا تم نے اسے سچ سمجھا تھا؟ یا ہمیشہ ہی مذاق جانا تھا؟ کیا تم دل سے تسلیم کرتے تھے کہ تم سے بھی کوئی بڑی طاقت کہیں موجود ہے جو تمہاری خدائی سے کہیں عظیم اور جلیل القدر ہے؟"

"دل تو موسیٰ سے مرعوب تھا مگر سب کے سامنے کیسے اقرار کر لیتا؟ میرے سامنے تو سب ہی سجدہ کرتے تھے، سب اپنی اپنی مرادیں مجھ سے ہی مانگتے تھے۔ میں جس کو چاہتا زندگی بخش دیتا اور جس سے چاہتا زندگی چھین لیتا تھا۔ پھر جب موسیٰ نے کہا کہ اس کا خدا زمین اور آسمان کا مالک ہے تو مجھے خیال ہوا کہ میں بے شک زمین کا خدا تو ہوں مگر آسمانوں تک میری رسائی نہیں ہے مگر اس کا یقین بھی مجھے ایک دن ہامان اور شمعون نے دلا دیا تھا۔ جس کے بعد میں سمجھنے لگا کہ آسمان کی وسعتیں بھی میرے سامنے سرنگو ہو سکتی ہیں"۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا

"انہوں نے ایک دن آٹھ دس بڑے بڑے عقاب پکڑوا کر منگوائے ان کے اوپر چھوٹا سا تخت بنایا اور تخت کے آگے گوشت کے ٹکڑے لٹکائے، اب عقابوں کو کئی دن بھوکا رکھا گیا تھا۔ پھر گوشت ان کے آگے لٹکایا گیا اور وہ اسے کھانے کے لیے اوپر اٹھتے تھے میں اور ہامان دونوں اس نشست پر بیٹھے تھے۔ ساری خلقت دیکھ رہی تھی کہ ان کے خدا فرعون، عقابوں کو لے کر آسمان کی سیر کے لیے اڑا تھا۔ عقاب گوشت کے لالچ میں اونچے اونچے اور اونچے ہوتے چلے گئے اور ہم بادلوں کو اپنے قریب دیکھنے لگے تھے۔ اب مجھے نیچے کی زمین اور بھی چھوٹی نظر آ رہی تھی اور نیچے کی مخلوق بھی مختصر سی ہو گئی تھی۔

جب میں اور ہامان میرا وزیر اعظم کافی اونچے جا چکے تو میں نے کہا

"ہامان موسیٰ کا خدا تو مجھے کہیں نظر نہیں آتا!"

ہامان نے کہا۔

یے اس نے کسی اور طرف کا رخ اختیار کر لیا ہو۔"
میں نے اس سے کہا
"اگر میں اور تم اسی طرح اونچائیوں کی سیر کر کے واپس لوٹ گئے تو پھر ہم اپنے عوام سے یہ کیسے کہہ سکیں گے کہ ہم نے موسیٰ کے خدا کو زیر کر لیا ہے۔ کیوں نہ ہم ان بادلوں پر تیر پھینکیں اگر خدا ہے تو ضرور زخمی ہو گا۔
ہامان نے میری تجویز کی تائید کی۔ اور کہا اگر موسیٰ کا آسمانی خدا ہے تو شاید اس جنگ سے گھبرا کر بادلوں سے باہر نکل آئے گا ورنہ اگر وہ باہر نہ آیا اور ظاہر نہ ہوا تو ہم یہی کہیں گے کہ اوپر ہمیں خدا کہیں نہ ملا سب کچھ موسیٰ کا ڈھکوسلہ ہے۔"
تب میں نے اور ہامان نے تیر کمان میں جوڑے اور آسمان پر بارش کر دی۔ پھر کیا تھا ہم ہر طرف جنونانہ انداز میں تیر پھینک رہے تھے۔ کبھی ہامان عقابوں کے پروں پر بندھی ہوئی رسی کو تھام لیتا اور میں تیر پھینکتا۔ اور کبھی وہ تیر چلاتا تو میں نشست کا توازن سنبھال لیتا۔ ہم اپنی مرضی سے اس رسی کے ذریعے عقابوں کو اِدھر سے اُدھر اڑاتے پھر رہے تھے۔ جس طرف بھی گوشت کے لوتھڑوں کا رخ کر دیتے اسی طرف عقاب اڑنے لگ جاتے اور ہمارا رخ بدل جاتا۔
اور پھر ایک عجیب بات ہوئی جب ہمارے تقریباً سب ہی تیر ختم ہو چکے تھے اور ایک آدھ باقی رہ گئے تھے تو میں نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلایا۔ اور یہی وہ تیر تھا جو اوپر گیا اور پھر واپس ٹھیک اسی جگہ آ کر گرا جہاں میں اور ہامان دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ تیر گرا تو اس میں گہرا سرخ خون لگا ہوا تھا۔ تازہ تازہ خون جیسے یہ تیر ابھی ابھی کسی کے جسم کو پار کر کے چیر کے نکلتا ہوا واپس آیا ہو۔
اس وقت میری اور ہامان کی مسرت کا کچھ ٹھکانہ نہیں تھا۔ دل جیسے اچھل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ ہم نے سمجھا کہ اس تیر سے نہ صرف بادلوں میں چھپے ہوئے خدا کو مار ڈالا ہے بلکہ موسیٰ کی بڑائی بھی خاک میں ملا دی ہے۔ تو پھر جب ہم واپس لوٹے تو نیچے زمین پر ایک خلقت ہماری منتظر تھی۔ جیسے ہی میں نشست سے اترا سارے مجمع نے میرے سامنے سجدہ کیا۔ یہ تعظیم سے زیادہ توقیر کا سجدہ تھا۔ آسمانوں کی سیر نے ان کے دلوں پر میری خدائی کی مہریں اور گہری ثبت کر دی تھیں اب میں فقط زمین ہی کا نہیں بلکہ آسمانوں کا بھی خدا تھا کیونکہ اب میں فضاؤں پر بھی قدرت اختیار کر چکا تھا۔ اس

دن کے بعد میں بھی اپنے آپ کو کچھ اور ہی سمجھنے لگا تھا۔ میں نے لمعاؤں میں لڑنے کا وہ کام کیا تھا جو کوئی نہ کر سکا تھا۔

اور پھر ان کا جوش و ولولہ اس وقت اور بھی قابل دید بن گیا تھا جب ہامان نے خون آلودہ تیر ان کو دکھایا اور کہا کہ "بادلوں میں چھپے ہوئے موسیٰ کے خدا کو ہمارے خداوند فرعون رمیسیس کے تیروں کی بارش نے چھلنی کر دیا ہے اور یہ اس کے زخم کا ایک تیر ہے جو ہم ثبوت کے لیے ساتھ لے آئے ہیں۔"

مجھے آج بھی یہ سب کچھ کل ہی کی سی بات لگتی ہے ہر چیز ذہن اور یادداشت میں اس قدر واضح ہے کہ گویا ابھی اس بات کو گزرے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے ہیں۔ وہ مجمع وہ سجدے وہ نعرے وہ ان کا جنون اور وہ جذبۂ پرستش سب کا سب مجھے آج بھی اسی طرح یاد ہے"۔

"پھر کیا ہوا؟ میں نے پوچھا وہ کیا تمہاری بات پر یقین کر لیا گیا تھا، کیا سب نے مان لیا تھا کہ تم خدا کو ختم کر آئے ہو؟"

"ہماری صدیوں کی شہنشاہیت نے ان لوگوں کے دلوں پر ہماری ہیبت اتنی طاری کر رکھی تھی کہ وہ ہماری رائے اور ہمارے حکم کے خلاف کچھ کرنا تو درکنار کچھ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ سو جیسے ہی ہامان نے تیر دکھایا ایک غلغلہ سا بلند ہوا۔ خوشی اور تحسین کے نعرے بلند ہوئے اور پھر سب کے سب ایک بار پھر اسی طرح والہانہ طور پر سجدوں پر گر گئے۔"

"وہاں موسیٰ نے بھی یہ خون آلود تیر دیکھا تھا؟ انہوں نے کیا کہا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

موسیٰ کا تو یقین اپنے خدا کی عظمت پر فولاد کی طرح سخت تھا جب اس کو وہ خون آلود تیر دکھا دیا گیا اور ہامان نے کہا کہ خداوند نے تمہارے آسمانی خدا کو مار دیا ہے تو اس نے کہا کہ اس کا خدا ہمارے وہم و گمان کی حدود سے بھی باہر تھا۔ اس تک کسی تیر کا پہنچنا ایسا ہی تھا جیسے ہم اپنے ہاتھ میں پانی بھر کر سورج کی طرف اچھالیں اور سمجھیں کہ اس پانی کے قطروں سے سورج کو بجھا دیں گے۔ اس نے کہا کہ خدا کے حکم سے فرشتوں نے ایک مچھلی فرعون کے تیر کی زد میں لٹکا دی تھی تاکہ اس کی محنت رائیگاں نہ جائے۔ یہ خون اسی مچھلی کا تھا۔ اور موسیٰ نے یہ بھی کہا کہ چونکہ ایک مچھلی نے اپنی جان کا نذرانہ دیا تھا اس

لیے اس کے خدا نے ساری دنیا کی مچھلیوں کے لیے کسی بھی ہتھیار سے ذبح کیا جانا موقوف کر دیا تھا چنانچہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مچھلیوں کو کبھی کسی ذبح کی ضرورت نہیں ہوگی۔ پانی سے نکالنا بھی ان کی موت ہوگا۔"

"کیا پھر موسیٰ نے اپنے خدا کی عبادت اور اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے یا اس کے تحفظ کے لیے کچھ اور راستے اختیار کیے؟ کیا تمہارے عوام تم سے متنفر ہونے لگے تھے؟ آخر کیا بات تھی کہ صرف ایک شخص کی موجودگی ہی سے تمہاری طاقت کے حصار میں شگاف پڑنے لگے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"موسیٰ کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ اس کے چہرے پر نور ٹپکتا تھا، وہ ہزاروں میں بے مثل تھا۔ تم نہیں جانتے وہ کیسا شخص تھا۔ وہ بے غرض آدمی تھا۔ اس نے مجھ سے کبھی کچھ نہ مانگا وہ میرے محل میں رہتا تھا۔ اس کے لیے ہر قسم کے عیش و آرام میسر تھے، بہترین شرابیں تھیں۔ حسین عورتوں کے جھرمٹ تھے، پسینہ کی جگہ خون گرانے والے جاں نثار غلام، خادم دوست، سب کچھ اس کے تصرف میں تھا مگر وہ ان سب چیزوں سے بے گانہ رہتا تھا۔ وہ شہزادوں کی طرح پلا تھا۔ میری ملکہ آسیہ اسے اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی مگر وہ ہمیشہ اس ماحول سے الگ تھلگ رہا۔ کبھی عیش و آرام، شراب و شباب کو اس نے آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ ہم سب سے مختلف تھا، اسے جنگ و جدل پسند نہ تھی اور شہزادوں کی طرح اس نے کبھی کسی کا سر نہ اڑایا۔ بات بات پر کسی کو کبھی سخت سست نہ کہا، وہ کبھی کسی کو سخت آواز سے پکارتا تک نہیں تھا۔ وہ ایک نور تھا جو ہمارے محل میں جگمگاتا تھا۔ اس نے کبھی مجھ سے کوئی چیز نہ مانگی، کبھی کسی زرق برق لباس کی فرمائش نہ کی، کبھی میرا احسان مند نہ ہوا۔ وہ ہمارے ساتھ رہتا ضرور تھا مگر وہ ہم میں سے نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ فقر و فاقہ اور بے نیازی اور غربت میں خوش رہتا تھا۔

پھر ایک معمولی جھگڑے کے بعد وہ جوانی ہی میں صحرائے سینا کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں وہ کئی سال رہا جب واپس مصر آ رہا تھا تو واپسی میں صحرائے سینا ہی میں اس کو بزرگی عطا ہوئی، وہیں شاید اس نے اپنے خدا کی جھلک دیکھی تھی وہیں شاید اس کو پیغمبری ملی تھی۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ فرعون کو نہیں بلکہ اپنے اس خدا کو مانو جس کی طاقت عظیم ہے اور قوت لامحدود ہے۔ اس نے اچھائیوں کی تعلیم دی اور

برائیوں سے روکا۔ لوگ اس کی بات سنتے تھے اور اس پر توجہ دیتے تھے مگر ہمارے خوف سے کھل کر اس کا اظہار نہ کر پاتے تھے۔ جب موسیٰ نے جگہ جگہ مجمع لگا لگا کر اپنے مذہب کا پرچار کرنا شروع کیا تو یہ آگ بہت تیزی سے پھیلنے لگی۔ میرے فوجی، سپاہی، حکام، محافظ جاں نثار، نمک خوار سب کے سب روز ہی خبریں لاتے کہ موسیٰ نے ہماری رعایا کی پرسکون تھمی ہوئی زندگی میں ایک ہلچل مچا دی ہے تو مجھے خیال آتا کہ کہیں شمعون کی پیشن گوئی سچ نہ ہو جائے کہیں اس رات پیدا ہونے والے بچوں میں جن کو میں نے پورے ملک میں قتل کرا دیا تھا کوئی بچہ بچ تو نہیں گیا تھا۔ کیا یہی وہ بچہ تھا جس کے لیے میں نے، سپاہیوں نے، ماؤں کی گودوں سے نوزائیدہ بچوں کو چھین چھین کر مار ڈالا تھا۔ میں نے اپنی ملکہ آسیہ سے بھی بار بار اس کا تذکرہ کیا مگر وہ اسے ہمیشہ میرا وہم ہی سمجھتی تھی، اسے موسیٰ سے بڑی محبت تھی اور اس نے اسے خود پالا تھا۔

میرا بار بار دل چاہتا تھا کہ موسیٰ کو قتل کر ڈالوں مگر پھر دل کہتا تھا کہ میں نے اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی پھر کیوں مار دوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں؟ ادھر آہستہ آہستہ موسیٰ کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میرا دل تنہائی میں مجھ سے کہتا کہ موسیٰ کی تعلیم اچھی ہے۔ دل پر اثر کرتی ہے پھر میں دوسروں کے لیے خدا تو تھا مگر ذرا ذرا سی بیماری مجھے ہفتوں تلک بستر میں مقید کر دیتی تھی۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ میں کیسا خدا ہوں جو اپنے جسم کی بیماریوں پر قابو نہیں رکھ سکتا؟ میں خود کو حقیقتاً کمزور اور بے بس پاتا تھا مگر جب محل کے باہر اپنی شان و شوکت دیکھتا اور لوگوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی اپنی ہیبت کو محسوس کرتا تھا تو پھر دل کہاں مانتا تھا کہ اس قوت اور عظمت کو چھوڑ دوں؟ بار بار دل نے کہا کہ سب کے سامنے نہ سہی تنہائی ہی میں بلا کر موسیٰ سے بات کر کے دیکھوں مگر پھر وسوسے ہو جاتے تھے کہ اگر ایک بار بھی موسیٰ پر میری کمزوری کھل گئی تو پھر وہ تو اور بھی شیر ہو جائے گا اور ساری دنیا میں میری کمزوری کو اچھال دے گا۔ حالانکہ وہ ایسا نہ تھا وہ بے حد شریف النفس تھا، اس نے کبھی میری ذات سے متعلق کوئی بات نہ کی تھی اس کی تعلیم عام تھی وہ سب کو برائیوں سے روک کر اچھائیوں کی طرف بلاتا تھا مگر بس موسیٰ کا علم و حکمت کی روشنی میری قسمت میں نہ تھی اور ہر بار میرا غرور میرے آڑے آجاتا تھا۔ اور پھر میں اس کو سب سے بڑا حریف سمجھتا گیا۔

ادھر جب موسیٰ کو یقین ہوگیا کہ اس کی تعلیمات مجھ پر کوئی اثر نہ کریں گی اور میرے حکام اور فوجی اس کے ماننے والے اسرائیلیوں پر روز بروز ظلم بڑھاتے جائیں گے تو اس نے اپنے ماننے والوں کو اس بات پر تیار کیا کہ وہ سب کے سب اس کے ہمراہ وادئی نیل سے نکل کر صحرائے سینا کی طرف چلے جائیں گویا یہ مصر سے اس کی پہلی ہجرت تھی۔

میری مملکت میں اس زمانے میں ہر طرف ایک عجیب انتشار سا برپا تھا، گلیوں میں، چوراہوں پر سڑکوں کے کنارے، گھروں میں باہر، بازاروں میں لوگ جگہ جگہ ٹولیاں بنائے کھڑے ہوتے جہاں چار آدمی ملتے اور سر جوڑ کر کھڑے ہوجاتے، ان سب کا بس یہی ایک موضوع ہوتا تھا کہ کون کون موسیٰ کے ساتھ صحرائے سینا میں جائے گا؟

لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے۔

"کیا تم خداوند فرعون کا ملک چھوڑ دو گے؟"

"کیا تم موسیٰ کے ساتھ جا رہے ہیں؟"

"کیا تم اپنا گھر بار دکان، مکان، زمین چھوڑ کر وادئی سینا میں چلے جاؤ گے؟"

"لوگ جانے والوں کو سمجھاتے بتاؤ تمہیں آخر وادئی نیل میں کیا تکلیف ہے؟"

دیکھو یہاں شہنشاہ فرعون ہیں، شمعون جیسا ساحر ہے اور پھر ہر طرف امن و امان ہے پھر کیوں جا رہے ہو؟"

اور جانے والے بس ایک ہی جواب دیتے۔

"ہمیں موسیٰ اور موسیٰ کے خدا پر اعتماد ہے وہ ہر حال میں ہماری مدد کرے گا، ہم سب کچھ چھوڑ دیں گے مگر خدا کو نہیں چھوڑیں گے۔"

میں سب کچھ سنتا تو ایسا لگتا کہ جیسے سینکڑوں سالوں کی شہنشاہی کے بعد بھی میرے خاندان سے لوگ اتنے وفادار نہیں ہوسکے ہیں جتنے موسیٰ کی چند سالہ تربیت سے لوگ اس کے اور اس کے خدا کے وفادار بن گئے ہیں۔

اور پھر حالات بہت خراب ہونے لگے تو میری بھی پریشانی بڑھنے لگی۔ میں ہر وقت اسی سوچ میں رہتا تھا کہ کسی طرح موسیٰ کے معتقدین کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے نجات حاصل کروں۔

یہاں تک پہنچ کر وہ ذرا دیر کے لیے رکا، رمیسیس کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے کہ وہ بہت کچھ یاد کر رہا ہے، شاید اس کے ذہن میں ایک غبار تھا جو آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا

شاید اتنے ہزار سالوں تک کسی سے کچھ نہ کہہ سکنے کا بوجھ تھا جو وہ اتارنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے خیالوں کو بھٹک جانے سے قبل پھر اپنی راہ پر لگانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا۔

"تمہیں ان مشکل دنوں میں تمہارے وزیر ہامان اور تمہارے درباری جادوگر شمعون نے کوئی مشورہ نہیں دیا تھا۔ کیا وہ تمہیں اس مرحلہ پر تنہا چھوڑ گئے تھے؟"۔

اس نے چونک کر کہا۔ "ہامان اور شمعون! انہیں وہ ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے، مگر انہوں نے مجھے مخلص مشورہ کبھی نہیں دیا، وہ ہمیشہ فقط وہی بات کہتے تھے جس سے میں خوش ہوں اور ناراض نہ ہوجاؤں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر میں ناراض ہوگیا تو ان کے وہ شاندار عہدے جاتے رہیں گے، سو وہ تو جاہ وجلال کے لالچی تھے۔ وہ مجھے سیدھی راہ کیوں دکھاتے؟ اس نے اگر کبھی مشورہ دیا بھی تو یہی مشورہ دیا کہ میں شمعون ساحر کے ذریعہ جادو کا ایک مقابلہ کراؤں جس میں موسیٰ کو بھی بلایا جائے، شمعون اپنے جادو سے موسیٰ کو مار دے گا یا پھر اس کو ایسی شکست دے گا کہ وہ پھر کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ رہ سکے گا۔

شمعون ایک زبردست جادوگر تھا۔ اس کے پاس مخفی طاقتیں تھیں، وہ بیماروں کو اچھا کرسکتا تھا اور چنگے بھلے لوگوں کو کسی بھی بیماری میں مبتلا کر دیتا تھا، اگر کوئی میرا مخالف باغی اور دشمن ہوتا بھی تھا تو میں شمعون کی طاقتوں کے ذریعے اسے جب چاہتا تھا پابہ زنجیر کھینچ کر دربار میں بلالیا کرتا تھا، لوگ میری طاقتوں سے مجھ سے خوف کھاتے تھے اور میری طاقتوں کا اصل سرچشمہ شمعون تھا شمعون بابل کے عظیم ساحر مردوقش کا شاگرد تھا، بابل اور مصر میں ساحروں کا ایک مکمل گروہ تھا ان کی طاقت بے حد عظیم اور ان کی جمعیت نہایت وامنح تھی، ان کے اپنے اصول تھے اور یہ خود بھی علم اور حکمت کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے مردوخ دیوتا کی عبادت کرتے تھے اور اپنے علم کو علاوہ اپنے چند مخصوص شاگردوں کے کسی پر بھی ظاہر نہ کرتے تھے ان لوگوں کو دنیا سے بس اسی حد تک دلچسپی ہوتی تھی کہ اپنی طاقتوں میں اضافہ کرتے رہیں، یہ دن رات نہ معلوم کیسے کیسے الٹے سیدھے جاپ اور بے تکی مشقیں کرتے رہتے تھے۔ مختلف کھوپڑیاں جو انسانوں اور مردہ جانوروں کی ہوتی تھیں ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ یہ لوگ عموماً گندے رہتے تھے انہیں نہ اپنے جسم کا ہوش رہتا تھا نہ اپنی حالت کا خود مردوقش جب ایک بار بابل سے میرے دربار میں آیا تھا تو باوجود اس کے کہ بابل کے بادشاہ کا چاق وچوبند اور شاندار فوجی حفاظتی دستہ

س کے ہمراہ آیا تھا اور اس کی حیثیت ایک شاہی مہمان کی سی تھی، مگر مرد قش بذاتِ خود
یک بدبودار جسم کے سوا کچھ نہ تھا اس کی لمبی لمبی جٹاؤں میں میل کچیل کی غلاظت چمٹی
ہوئی تھی اور کپڑے تو بس ایسے تھے جیسے کوئی آدمی کیچڑ سے ایک دم نکل آیا ہو یہ سب کچھ
تو تھا مگر اس کی قوتیں بڑی عظیم الشان تھیں مثلاً ایک معمولی سی بات یہ تھی کہ بابل
سے وادیٔ مصر تک وہ اپنے دستے کو صحرا کی دھوپ سے بچا کر لایا تھا، ایک بڑا سایہ دار درخت
اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آیا تھا اسی طرح اس نے جہاں چاہا اور جب بھی کسی کو پیاس لگی
زمین سے تازہ پانی کا چشمہ نکال لیا اور اپنے فوجی محافظوں کو پانی سے سیراب کر دیا یہ اس کے
ادنیٰ سے کرشمے تھے۔ اس کی طاقتیں بڑی عظیم تھیں۔ شمعون نے اسے بابل سے میری ہی
پریشانیاں رفع کرنے کے لیے بلایا تھا۔ شروع میں شمعون نے موسیٰ کو بھی جادوگر ہی سمجھا
تھا کیونکہ شمعون کے کسی بھی جادو کا اثر اس پر نہیں ہوتا تھا اسے اپنے زبردست علم کے
باوجود یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ موسیٰ کی حفاظت کون سی طاقت کر رہی تھی۔ اور یہی
الجھن اسے شمعون کو وادیٔ نیل مدعو کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔"

"پھر کیا شمعون اور ہامان نے تمہیں موسیٰ کا زور توڑنے کے لیے کوئی کارآمد مشورہ
نہیں دیا تھا کیا تمہاری پریشانیوں کا ان کے پاس کوئی حل نہ تھا۔؟" میں نے پوچھا

"بس انہوں نے موسیٰ کو جادو کے زور پر شکست دے دینے کی اسکیم بنائی تھی۔ یہ
مقابلہ میرے ہی دربار کے باہر ایک کھلے میدان میں ہوا تھا، محل کے باہر اور محل کے اندر
ہزاروں افراد اس مقابلہ کا نتیجہ سننے کے منتظر تھے۔ میرے دربار کے راستوں پر لوگ ایک
دن قبل ہی سے جگہ گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہارون موسیٰ کے بھائی اور موسیٰ جب اس مجمع
سے گزرے تو ان کی چال سے عاجزی تھی اور چہرہ پر اطمینان تھا اور شمعون اپنے شاگردوں کی
فوج لے کر چلا تھا تو اس کی چال میں دبدبہ تھا اور انداز میں خودنمائی اور غرور تھا، مقابلہ
دراصل اسی غرور و عاجزی کا ہوا تھا۔ جو کچھ وہاں ہوا تھا وہ تو تم جانتے ہی ہو کہ موسیٰ کی ایک
معمولی سی لکڑی نے سارے مصر کے نامور ساحروں کے جادو کا چراغ ایک ہی وار میں ختم کر
دیا تھا۔ عاجزی اور انکساری نے جلال و حشمت، رعب و دبدبے کو خاک میں ملا دیا تھا۔

"موسیٰ کی یہ لکڑی کیا جادو کی چھڑی تھی؟" میں نے پوچھا

"اس وقت ہم سب نے یہی سمجھا تھا مگر اب میرے سامنے سے مادی ذہن کے
لاعلمی کے پردے ہٹ گئے ہیں اور میری نظر آفاقی ہو گئی ہے جیسا کہ مرنے کے بعد ہر روح

کی ہو جاتی ہے تو میں مان سکتا ہوں کہ لکڑی کی یہ چھڑی کوئی معمولی چیز نہ تھی اور یہ آسمانی خدا کا ایک بہت بڑا انعام تھا۔

موسیٰ اور ہارون نے جادوگروں کے سارے کرتب دیکھے تھے اور پھر اللہ اس ایک عصا کے ذریعہ موسیٰ نے سارے جادوگروں کے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔ موسیٰ کے سامنے فوراً ہی سارے کے سارے ساحروں نے اپنے جادو کی شکست مان لی۔ اور میری طرف رخ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"شہنشاہ آج ہم نے موسیٰ کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھ لیا ہے۔ اس کا خدا سچا ہے اس کی طاقت سے بڑی کسی کی کوئی طاقت ہی نہیں ہے۔ لوگو گواہ رہنا کہ ہم اس کے خدا پر ایمان لاتے ہیں۔

یہ اعلان یہ گواہی میری بے عزتی کے سوا اور کیا تھا؟ نوجوان تم ہی کہو کہ ان جادوگروں کے مجھ سے اس طرح برگشتہ ہونے کا مطلب سوائے اس کے اور کیا تھا کہ موسیٰ کے ذہن نے میری سلطنت کی جڑیں تک ہلا دی تھیں یہ ساحر میری قوت تھے میرا دایاں بازو تھے۔ میں ان کو یوں آسانی سے کیسے جانے دیتا؟ اور پھر یہ کہ یہ مقابلہ کھلے میدان میں ہوا تھا اس دن وادیٔ مصر کے ایک بڑے تہوار کا دن تھا۔ مقابلہ کیا تھا میلہ کا سماں تھا۔ خلقت تھی کہ ٹوٹی پڑ رہی تھی دور دور کے لوگ یہ مقابلہ دیکھنے آئے تھے۔ تو اب تم ہی بتاؤ کہ میں اتنے لوگوں کے سامنے بے عزتی کیسے برداشت کر لیتا کہ جو آج تک مجھے سجدہ کرتے آئے تھے وہ اب کسی اور کو سجدہ کرتے ہیں؟ بتاؤ تم ہوتے تو کیا کرتے؟ بتاؤ؟

"میں سمجھتا ہوں تم سخت غضبناک ہو گئے ہو گے۔"

"غضبناک؟ میں تو کھول اٹھا تھا! میں نے ان جادوگروں سے کہا، تم ہوش میں نہیں ہو، یہ ڈھونگ تم نے موسیٰ سے مل کر رچایا ہے تم باغی ہو گئے ہو، تم سب میرے دشمن ہو۔ میں جانتا ہوں موسیٰ تم سب کا سردار ہے وہ تم سب سے بڑا جادوگر ہے مگر یاد رکھو میں تمہیں وہ سزا دوں گا کہ تمہاری آنے والی نسلیں تک بھی کانپ اٹھیں گی۔ میں تم سب کے جسم کاٹ کر پھینک دوں گا۔ تمہارے دائیں ہاتھ اور بائیں ٹانگیں کٹوا کر چیل کوؤں کو کھلا دوں گا، اور پھر تم دیکھنا کہ تمہارے کٹے پھٹے جسم کھجوروں کی شاخوں کے ساتھ ہوا کے جھونکوں میں جھولا کریں گے، میں تمہیں وہ سزا دوں گا کہ آئندہ ہر شخص دیکھ لے کہ خداوند فرعون سے بغاوت کا کیا انجام ہوتا ہے، میں نے ان کو اور بھی ایسی ہی دھمکیاں

دیں مگر ان سب باتوں کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا اور وہ یہی کہتے رہے کہ:-

"شہنشاہ تو ہماری زندگی ختم کر دینے کی قوت تو ضرور رکھتا ہے مگر اب ہم موت کے خوف سے اجالے سے اندھیروں میں واپس نہیں جائیں گے۔"

"آج میں سوچتا ہوں کہ وہ کس قدر خوش قسمت تھے کہ انہوں نے اجالے اور اندھیرے کی تمیز کر لی تھی مگر میں اپنے غرور اور شان و شوکت کے نشہ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔"

"تم نے کہا تھا کہ وہ جوانی ہی میں صحرائے سینا کی طرف چلا گیا تھا، کیا یہ تمہارے ایماء کے سوا تھا؟ یا تم نے کچھ خطرات محسوس کر کے اسے محل سے نکال دیا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں نہ میں نے اسے نکالا تھا اور نہ ہی اسے مجھ سے کبھی خطرات لاحق ہوئے تھے۔ اس نے ایک کمزور شخص کو جو میرے بازار میں ایک قوی آدمی سے پٹ رہا تھا۔ بچانے کی کوشش کی تھی اور اس کے ایک ہی گھونسے نے اس مارنے والے شخص کو ختم کر دیا تھا۔ بس اسی ڈر سے کہ اس مقتول کا جھگڑا اسے کہیں اور تنگ نہ کر دے، اس نے وادی مصر ہی کو چھوڑ دیا تھا۔ پھر وہ صحرائے سینا سے گزر کر مداشبن جا پہنچا، جہاں بعد میں اس کو وہ عصا ملا تھا۔

"کیا کہا وہ عصا مداشبن میں ملا، یہ کیسے ہوا تھا؟" میں نے رمیسیس سے کہا۔

اس نے کہا۔ "موسیٰ بے حد خوددار تھے انہوں نے کبھی کسی سے مدد نہیں مانگی تھی نہ کسی کے ڈر سے کہیں جا چھپے تھے، بس انہوں نے وادیٔ نیل چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مصر سے جا رہے ہیں انہیں صحرائے سینا ہی ایک محفوظ جگہ نظر آئی تھی، اس ریگستان میں بنجر پہاڑیوں کے اور تپتی ہوئی ریت کے اور کچھ نہ تھا۔ کسی تنہا آدمی کے لیے یہ سوچا بھی نہ جا سکتا تھا کہ وہ اس صحرا میں جا سکتا ہے۔ وہاں جانا بذلتِ خود موت کو دعوت دینا تھا نہ یہاں غذا تھی نہ پانی مگر موسیٰ ہی کا حوصلہ تھا کہ بھوکے پیاسے اس صحرا میں تن و تنہا چلتے گئے جہاں لوگ قافلوں میں بھی جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ پھر بارہ چودہ دن کی تھکا دینے والی مسافت کے بعد وہ ایک نخلستان میں جا نکلے، وہیں ایک کنواں بھی تھا جہاں سے اس آبادی کے سبھی لوگ مرد عورتیں، جوان بوڑھے اور لڑکے لڑکیاں پانی بھرنے آتے تھے۔ وہاں جب یہ پہنچے تو انہوں نے بڑی چہل پہل دیکھی بڑی عمر والی

عورتیں اور پختہ عمر کے مرد خوش گپیوں میں مشغول تھے، خوب مزے کی باتیں ہو رہی تھیں، مگر اس کنویں سے دور دو لڑکیاں جوان اور خوبصورت الگ تھلگ کھڑی ہوئی گھڑا لیے اپنی باری کی منتظر تھیں کہ کب نظر بازوں اور خوش وقتوں کا یہ مجمع چھٹے تو وہ بھی پانی بھر لیں۔ موسیٰ نے ان لڑکیوں سے پوچھا کہ وہ پانی کیوں نہیں بھر تیں۔ انہوں نے کہا۔ ہمیں اس طرح سب کے بیچوں بیچ پانی بھرتے حیا آتی ہے۔"

"پھر تم اپنے گھر سے کسی مرد کو کیوں نہیں بھیج دیتیں کہ وہ پانی بھر کے لے جایا کرے؟"

"گھر میں کوئی مرد اس قابل ہوتا تو ہم کیوں آتے وہاں تو بس ایک ہی ہمارے باپ ہیں جو بڑھاپے کی بدولت کسی قسم کی محنت کا کام کرنے کے لائق نہیں رہے ہیں۔"

موسیٰ کو ان پر بڑا ترس آیا اور خود جا کر کنویں سے پانی بھر کر ان کو دے آئے۔

موسیٰ اتنے دن کی مسافت طے کر کے آئے تھے نڈھال تھے، بھوکے پیاسے سفر کرتے رہے تھے، گو جوان تھے بیس بائیس سال کی عمر تھی مگر پھر بھی اس تھکان بھوک اور اس مشقت نے جسم کو لاغر کر دیا تھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتے تھے مگر کسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر کچھ مانگنے سے غیرت آتی تھی، اسی درخت کے نیچے جہاں کچھ دیر قبل لڑکیاں تھیں موسیٰ ضعف اور تھکن سے بے حال پڑ گئے تھے۔

انہوں نے دیکھا کہ وہی دونوں لڑکیاں پھر آ گئی تھیں، اس بار ان کے پاس پانی کا برتن نہ تھا، پہلے تو وہ دونوں ہمت کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی رہیں مگر شرم و حیا ان کو روک لیتی تھی۔ ایک آگے بڑھتی تو دوسری اس کے پیچھے چھپ جاتی، پھر پہلی رک جاتی تو دوسری ہمت کرتی۔ آخر چھوٹی لڑکی شرماتی ہوئی آگے بڑھ کر موسیٰ تک پہنچی اور ان سے کہنے لگی۔

"ہمارے والد نے آپ کو گھر بلایا ہے؟ کیا آپ چلنا پسند کریں گے؟"

"کیوں؟" موسیٰ نے پوچھا۔

مگر وہ دونوں شرماتی رہیں کچھ نہ کہہ سکیں۔

"میں نہیں جانتا کہ آخر وہ مجھے کیوں بلاتے ہیں۔؟" موسیٰ نے کہا۔

پھر ایک نے ہمت کر کے کہا۔ "ہم دونوں روز پانی بھرنے کے دیر سے گھر پہنچتے تھے مگر آج جلدی چلے گئے، کیونکہ آپ نے پانی جلدی بھر کر دے دیا تھا۔ تو ہمارے والد نے

آج جلدی آنے کا سبب پوچھا جو ہم نے ان کو بتا دیا تو انہوں نے کہا کہ جس شخص نے ان پر احسان کیا ہے اسے یہاں بلا کر گھر لانا چاہیے۔ سو انہوں نے آپ کو گھر آنے کی دعوت دی ہے اور ہم کو آپ کے لینے کے لیے بھیجا ہے۔"

تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟ کون ہیں؟ موسیٰ نے پوچھا۔

"اب تو فقط بکریاں چراتے ہیں، کافی ضعیف ہیں کچھ زیادہ محنت کا کام نہیں کر سکتے۔ بس ہر وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔"

موسیٰ نے سوچا کہ اگر لڑکیاں حیادار اور شریف اور پاکباز ہیں تو یقیناً ان کا باپ بھی نیک اور دیندار ہی ہوگا۔"

موسیٰ ان لڑکیوں کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں اس شہر کے ایک نہایت برگزیدہ شخص شعیب کی بیٹیاں تھیں اور وہ مدائین میں خدا کے نبی تھے اور جن کا شمار بارگاہ الٰہی کے مقربین میں ہوتا تھا۔

مہمان اور میزبان کا تعارف ہوا۔ دونوں نے اپنے آپ کو نیک بختی کے سلسلوں میں منسلک پایا۔ مگر اجنبیت بہر کیف موجود رہی، حضرت شعیب پیغمبری کے مدارج پر فائز تھے، جبکہ موسیٰ ابھی کندن نہیں بنے تھے بلکہ کندن بنائے جانے کے لیے تپائے جا رہے تھے۔

شعیب نے موسیٰ سے کہا۔

"نوجوان تم نے میری بیٹیوں پر اور مجھ پر احسان کیا ہے میرے کوئی بیٹا نہیں ہے جو اس بڑھاپے کے زمانے میں میری مدد کر سکے۔ اس لیے میں مجبور ہوں کہ یہ گھر والے سے نکلیں اور گھر کے وہ کام بھی کریں جو ان کے کرنے کے نہیں ہیں۔"

موسیٰ نے جواب دیا۔

"میں نے آپ پر یا ان لڑکیوں پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ تو بس انسانی ہمدردی کی بات تھی، آپ اس کا ذکر بار بار کیوں کرتے ہیں؟"

"تم آج ہمارے مہمان ہو، ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اس نیک کام کا جو تم نے کیا ہے آخر کوئی تو اجر ہونا چاہیے!" شعیب نے کہا۔

"میں اس دو روزہ زندگی پر آخرت کو نہیں بیچتا۔ اپنی نیکیوں کا اجر فقط خدا ہی سے چاہتا ہوں۔ میں نے یہ کام کسی اجر کی امید کے بغیر کیا تھا۔"

پیٹ میں غذا کا دانہ نہ ہو سات آٹھ دن بھوک پیاس میں گزر گئے ہوں اور پھر کوئی خدا کے لیے سب کچھ چھوڑ دے تو عظمت کا کیا درجہ ہوسکتا ہے، ذرا سوچو کہ موسیٰ نے اس جرأت اور استقلال کا مظاہرہ اس وقت کیا تھا جبکہ وہ خود بھوک اور نقاہت سے بے حال ہو چکے تھے۔ اور لمبی مسافت اور طویل بھوک پیاس نے ان کو شدید مصیبت سے دوچار کر رکھا تھا۔ مگر پھر بھی وہ احسان کا بدلہ اس دنیا میں لے لینے کے خواہش مند نہ تھے اور نہ بھوک مٹانا چاہتے تھے۔

بڑی دقت سے موسیٰ نے اس میزبانی کو قبول کیا اور وہ بھی اس وقت جبکہ شعیب نے یہ یقین دلایا تھا کہ ان کی دعوت احسان کے بدلے میں نہیں بلکہ ان کی مسافری کی بدولت ہے۔ پھر یہیں مدائیں ہی میں شعیب نے اپنی چھوٹی لڑکی سے ان کی شادی کی اور ان کو سات سال تک اپنے گلے کی نگہداشت کے فرائض سونپے اور ان بھیڑوں کے گلوں کو ہانکنے کے لیے اپنے پاس سے وہ چھڑی دی جو بعد میں موسیٰ کا عصا کہلایا۔

رمیسیس نے یہ سب باتیں یوں بیان کیں جیسے سب کچھ اس کے سامنے کی بات ہو۔ اس نے مجھ سے کہا کہ مدائیں کے وقت تک اور ان کے سات سالوں میں جبکہ وہ اپنے سسر کی بھیڑوں کی گلہ بانی کر رہے تھے ان کو خدا نے پیغمبری کے لیے منتخب نہیں کیا تھا یہ بات مدائیں سے واپس سیناٹی کی طرف جاتے ہوئے ہوئی۔

سیناٹی کے راستہ ہی میں ان کی بیوی اور بچے کو جب سخت سردی نے آ لیا اور ان کو کوہ طور پر کچھ آگ کی چمک اور شعلہ نظر آئے تو وہ اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر پہاڑ پر آگ لینے کے لیے چلے گئے تھے یہاں ہی ان کو ید بیضا کا معجزہ عطا ہوا اور یہیں ان کو پیغمبری ملی اور پھر جب وہ میرے دربار میں آئے تو ان کی استقامت اور ان کا استقلال کچھ اور ہی منزل پر تھا۔ وہ موسیٰ جو ایک قبطی کے قتل کے بعد سیناٹی چلے گئے تھے حاجم بیرا تھے جب لوٹے تو ان کے ارادے ان کا ایمان خدا پر یقین بڑے اونچے درجے پر تھا، اور جادوگروں سے مقابلہ کے بعد تو وہ فوراً ہی سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے معتقد بن گئے اور پھر وہ اپنے حواریوں کے ہمراہ نیل کو پار کر گئے اور میں اسی دریا میں غرقاب ہو گیا۔

میں تو دریائے نیل میں غرق ہو ہی گیا تھا اور ہمیشہ کے لیے مقہور اور معتوب قرار پایا مگر موسیٰ کے بھی بہت سے حواری کئی بار خدا کے غضب کا نشانہ بنے۔ خدا نے ان کو ۔

بہت کچھ دیا، من وسلویٰ کی بارشیں کیں، دسیوں نبی اور بیسیوں ہدایت دینے والے بھیجے مگر نافرمانوں کو کوئی پناہ نہ ملی۔ قارون بھی اس کے معتقدین میں سے ایک تھا۔ وہ ایک معمولی آدمی سے ترقی کر کے ایک نہایت متمول شخص بن گیا تھا اس کے خزانوں کا کچھ شمار نہ تھا صرف اس کے خزانوں کی چابیاں ہی اونٹوں کی ایک لمبی قطار پر لادی جاتی تھیں۔ وہ مصر ہی میں رہتا تھا اور اس کا شہرہ دور دور تک تھا، اس کی دولت بے حساب تھی۔ شروع میں وہ موسیٰ کے ہمراہیوں میں سے تھا۔ اور ان کا معاون بھی سمجھا جاتا تھا مگر پھر اس کی دولت بڑھنے لگی اس کی مصروفیت اور دولت کمانے کی طمع بڑھتی گئی۔ اس کے پاس اب نہ موسیٰ کے لیے وقت تھا، نہ موسیٰ کے خدا کی عبادت کے لیے۔ ہارون اور موسیٰ اسے سمجھاتے تھے کہ ناشکرا پن نہ کرو، مگر قارون کا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ میں اتنی محنت کرتا ہوں کہ رات دن ایک کر دیتا ہوں، سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا میرا تو ہر کام ہی تجارت اور تجارت ہی کے لیے ہوتا ہے، پوری وادی سینا اور مصر میں میرے برابر کسی کا تجارتی ذہن نہیں ہے پھر بھلا میری دولت کس طرح ختم ہو سکتی ہے۔

ادھر جوں جوں اس کا فخر بڑھتا گیا اتنا ہی اس کے خزانے وسیع ہوتے گئے۔ قارون کی دولت بھی بڑھتی گئی اور اس کا لالچ بھی اور خدا سے روگردانی بھی، اس کی دولت نہ مسافر کے کام آئی، نہ یتیم کے اور، نہ وہ کسی کو خیرات دیتا نہ غریبوں کی دست گیری کرتا، اس کے خزانوں سے بھرے اونٹ چل رہے ہوتے اور سامنے پھٹے پرانے کپڑوں میں لوگ آتے مگر اس کا دل نہیں پسیجتا۔ اور پھر ایک دن اس کا سارا خزانہ زمین میں دھنس گیا، زلزلہ نے اس کے سارے محلات زمین بوس کر دیئے بڑے بڑے مقفل کمرے جن میں آہنی صندوقوں میں بیش بہا جواہرات بند تھے، ...... بے حساب سونا چاندی جمع تھا سب ختم ہو گئے، خود قارون آناً فاناً ختم ہو گیا۔ جس طرح میں دریا میں غرق ہوا تھا تو مجھے کچھ سکون آیا اور میں نے سمجھا کہ سزا کا خدائی اصول ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اگر بار بار تنبیہہ کے باوجود بھی اس کے احکامات نہ مانے جائیں تو پھر سزا سے بچ نکلنا ممکن ہی نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ سزا جتنی چھوٹ دے کر ملتی ہے اتنی ہی عبرت ناک بھی ہوتی ہے۔"

رمیسیس اب ذرا چپ ہوا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے دربار میں مردوخ دیوتا کے پجاری مردقش کی بھی آمدورفت تھی کیا اس نے بھی ساحری کو خیرباد کہہ دیا تھا؟ کیا وہ بھی موسیٰ کے مذہب پر کاربند ہو گیا تھا؟"

"نہیں اس نے کبھی بھی ساحری کو نہ چھوڑا بلکہ وہ تمام جادوگروں کا استاد تھا اس نے جادو میں بڑی ترقی کی تھی۔ تم نے سامری کا نام سنا ہوگا، وہ بھی اپنے وقتوں کا ایک بڑا عظیم ساحر تھا اس نے موسیٰ کو بھی زک دے دی تھی اس نے بھی مردوقش ہی سے علم سیکھا تھا اور سامری کو مردوقش ہی نے عالم بنایا تھا۔"

"سامری نے موسیٰ کو جادو میں شکست دے دی تھی؟"

میں نے پوچھا۔

نہیں موسیٰ کا پھر کسی جادوگر سے مقابلہ نہیں ہوا۔ بس میرے محلات کے باہر جو ساحروں سے مقابلہ تھا وہی ان کا پہلا اور آخری تھا، اس کے بعد انہیں کسی مقابلہ کی حاجت ہی نہ تھی۔"

"جب موسیٰ اپنے معتقدین کو لے کر نکلے اور دریائے نیل پار کر گئے تو ان پر اور ان کی قوم پر اس وقت خدا کی ساری نعمتیں برس رہی تھیں۔ ان پر آسمان سے شہد سے زیادہ میٹھے رس کی بوندیں ٹپکتی تھیں جن کو پی کر انہیں کسی قسم کی پیاس ہی نہ لگتی تھی، پھر ان کے پاس بٹیریں خود آ کر بیٹھ جاتی تھیں اور موسیٰ کے ہمراہی ان کو پکڑ کر اپنا کھانا بنا لیتے تھے گویا انہیں ہر چیز مل رہی تھی، یہی من سلویٰ تھا جو ان تک پہنچ جاتا تھا۔ پھر خدا نے موسیٰ کو حکم دیا کہ تم کوہ طور پر آؤ چالیس دن روزہ رکھو اور میری عبادت کرو۔"

موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون کو اپنا نائب بنایا جو بڑی اچھی اور رواں تقاریر کر لیا کرتے تھے اور پھر خود پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ ان کے ماننے والے سب کے سب اسی طرح عبادت میں مشغول رہے۔

موسیٰ کی قوم کو یہ معلوم تھا کہ خدا کے احکامات موسیٰ کو کوہ طور کی ایک چٹان کے پیچھے سے آنے والی آواز کے ذریعے ملتے ہیں گو اس چٹان کے پیچھے کوئی موجود نہیں ہوتا تھا مگر وہ سب یہی سمجھتے تھے کہ خدا کا مسکن اسی چٹان کے پیچھے ہے۔

اور سامری بھی اتفاقاً ادھر جا نکلا۔ موسیٰ اور سامری ایک ہی رات کو پیدا ہوئے تھے جس طرح موسیٰ میرے سپاہیوں کی تلواروں سے بچ نکلے تھے اسی طرح سامری کی ماں نے بھی سامری کو کہیں چھپا کر بچا لیا تھا، سامری نے بڑے ہو کر پہلے شمعون سے جادو سیکھا اور پھر مردوقش کا شاگرد بنا۔ جب موسیٰ وادیٔ طور میں تھے تو سامری کو موقع مل گیا کہ موسیٰ کو

موسیٰ کی قوم مصر سے بھاگتے ہوئے اپنے ساتھ جتنا کچھ بھی سونا چاندی اور جواہرات لائی تھی وہ ان کے پاس سب کچھ ویسا کا ویسا ہی موجود تھا۔ ساری نے ان سے وہ سونا لے کر آگ میں تپایا اور پھر اس سے گائے کے بچھڑے کی ایک مورت بنالی۔ ساری نے اپنے جادو کے زور سے اس میں قوتِ گویائی بھی پیدا کر دی۔ یہ بچھڑا آدمیوں کی طرح باتیں بھی کرتا تھا اور سوالوں کے جواب بھی دیتا تھا۔ ساری نے اسے بنا کر خفیہ طور پر اسی چٹان کے پیچھے چھپا دیا تھا جہاں سے موسیٰ کو خدا کے احکامات ملا کرتے تھے اور پھر سب کے سامنے جبکہ ایک پورا جمِ غفیر موجود تھا اس نے اس بچھڑے کو چٹان کے پیچھے سے برآمد کر لیا۔

انسانوں کی طرح بولتا ہوا یہ گائے کا بچھڑا لوگوں کے لیے نہ صرف ایک عجوبہ تھا بلکہ اس نے ان کے ایمان کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا سب لوگ سمجھنے لگے کہ موسیٰ کو اس کی آواز سنائی دیتی تھی اور یہی وہ طاقت تھی جو ان کو مستقبل کا حال بتایا کرتی تھی۔ اب کیا تھا سب ہی اس بچھڑے کی پوجا کرنے لگے جیسے یہی ان کا اور موسیٰ کا خدا تھا۔

ہارون نے بہت کوشش کی کہ ساری کا جادو نہ چل سکے لوگوں کو خدا کے عذاب سے ڈرایا موسیٰ کی واپسی تک انتظار کرنے کے لیے کہا مگر کسی نے ان کی ایک بھی نہ سنی۔ ایک طرح سے لوگ اب ساری کو موسیٰ کا جانشین سمجھنے لگے تھے اور وہ خود بھی پوری طرح موسیٰ کی قوم کو ورغلانے میں کامیاب ہو ہی چکا تھا کہ موسیٰ چالیس دن عبادت کی مدت ختم کر کے کوہ طور سے اتر آئے جہاں ان کو توریت بھی ملی اور مزید بزرگی بھی، مگر ادھر موسیٰ کے لیے ایک شدید مایوسی کی وجہ بھی وجود میں آچکی تھی۔ وہ یہ تھی ان کی قوم اس جادو کی گائے کی عبادت کرنے لگی تھی۔

موسیٰ اس پرستش کو دیکھ کر بے حد غضب ناک ہوئے مگر ان کی قوم تھی کہ اسی میں خوش تھی کہ جس خدا کا زعم صرف موسیٰ ہی کو تھا وہ اب ان کے قبضہ میں آچکا تھا۔

موسیٰ جو اپنی قوم کے لیے ہمیشہ خدا سے مزید نعمتیں حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اس صورت حال سے بڑے بد دل ہوئے اور پھر انہوں نے اپنی قوم کی طرف سے بے توجہی برتنی شروع کر دی اور آخر کار انہوں نے خدا سے دعا کی کہ وہ غیر اللہ کی عبادت کے جرم پر ان لوگوں پر عذاب نازل کرے۔ چنانچہ خدا کا حکم ہوا کہ سب لوگ آنکھیں کپڑے سے ڈھانپ لیں اور تلواریں لے کر ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیں پھر خدا نے چہار اطراف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا دیا کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکیں اور اس

طرح گھمسان کا رن پڑا ہر طرف کشتوں کے پشتے لگ گئے۔

اس عذاب کے نتیجے میں ہزاروں لوگوں نے اپنی جان گنوائی جس جس نے بھی اس بچھڑے کی عبادت کی تھی ان سب کو عذاب نے آپکڑا اور پھر نہ وہ جادو گر رہا نہ وہ جادو کی گائے رہی۔

"سامری بھی اس گروہ کے ساتھ ختم ہو گیا تھا اس کا بھی پھر کبھی کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کہاں سے آیا تھا اور کدھر نکل گیا۔"

"زمیسیس تم اس دور کی بہت بڑی سلطنت کے بادشاہ تھے تم نے اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے شہرت پائی کیا تمہارا خیال ہے کہ ایک تم ہی تھے جس کو یہ سزا ملنی چاہیے تھی، کیا اور ایسے لوگ نہ تھے جن کو ایسی سزا ملنی چاہیے تھی؟"

تم یہ باتیں ابھی نہیں سمجھو گے۔ خدا کا ایک اپنا مستقل نظام ہے۔ جرم کی وسعت اور اس کی اثر پذیری کے مطابق خدا کی طرف سے نرم یا سخت سزا ملا کرتی ہے۔ اور ہر دور میں ملتی ہے۔ ہر شخص کو ملتی ہے۔ جسے جتنی دیر میں سزا ملتی ہے اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔ خدا بار بار موقع دیتا ہے کہ وہ سدھر جائے اور سزا سے بچ جائے۔ مگر خوش قسمت وہی ہوتے ہیں جو راہ راست پر آجاتے ہیں، مجھے دیکھو کہ میرا غرور میری پوری سلطنت پر محیط تھا تو مجھے سزا بھی ایسی عبرتناک ملی کہ میری سلطنت تو کیا دنیا بھر نے جان لیا کہ میرے ساتھ کیا گزر چکا ہے مگر سزا دوسرے لوگوں کو بھی ملی۔ جو ٹھوکر کھا کر سنبھل جاتے ہیں وہ بچ جاتے ہیں جن کی قسمت میں روشنی نہیں ہوتی وہ اپنی بے جا ضد پر اڑے رہتے ہیں اور پھر منہ کے بل ایسے گرتے ہیں کہ پھر کبھی اٹھ نہیں پاتے۔"

"ہاں جس طرح تم بمعہ اپنی فوج کے اور پوری شان و شوکت کے لمحہ بھر میں سب کچھ کھو بیٹھے اسی طرح نہ جانے کون کون اپنے غرور و تکبر کے سبب اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتا ہے"۔ میں نے کہا

"خود میرے سامنے اس سے پہلے بہت سی ایسی مثالیں تھیں۔ ہم اپنے دربار میں اکثر ایسے قصے سنتے تھے۔ مگر کبھی ہمارے غرور میں کمی آئی نہ کبھی ہم نے ان واقعات سے عبرت پکڑی۔"

کیا تمہارے زمانے سے قبل بھی کوئی ایسا واقعہ گزر چکا تھا کہ طاقت اور قوت کے باوجود کسی مغرور بادشاہ کا غرور زمین بوس ہو گیا تھا؟"

"میرے زمانے سے قبل نہیں بلکہ میرے بعد دقیانوس کا حال بہت مشہور ہوا، یہ ایک بے حد مغرور اور صاف ستھرا شخص تھا، اسے خوشبوئیں بے حد پسند تھیں اس کا بہت شاندار محل تھا اور عظیم الشان فوجیں تھیں، جاہ و حشمت والے امراء تھے۔ وہ مختلف عطریات کا ایسا شائق تھا کہ اس نے سدھائے ہوئے باز اپنے محل میں رکھے ہوئے تھے ایک چھوٹی سی حوض تھی جس میں ہر وقت مختلف قسم کی خوشبوئیں عطر اور اعلیٰ قسم کے تیل بھرے رہتے تھے، یہ پلے ہوئے باز وقفہ وقفہ کے بعد اس حوض میں اترتے لوٹ پوٹ ہو کر عطریات اپنے پروں میں داخل کر لیتے اور پھر پھڑپھڑا کر اڑتے اور سارے محل کے کمروں اور دالانوں اور راہداریوں پر پروں کو جھٹکتے جاتے تھے اس طرح پورا محل ہر وقت خوشبوؤں سے مہکتا رہتا تھا۔

اس بادشاہ کا حال میں نے اپنے مرنے کے بعد سنا تھا۔ اور اس کا مقابلہ بھی میری طرح چند خدا پرستوں سے ہوا تھا اس نے بھی غرور کیا تھا اور اسے بھی میری طرح ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔"

"کیا دقیانوس کی ان لوگوں سے جنگ ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ایسا نہیں ہوا۔ خدا کے پاس کسی کو زیر کرنے کے لیے بے حساب طریقے ہوتے ہیں اس معاملہ میں اس نے فقط ان لوگوں پر نیند طاری کر دی اور دقیانوس ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا اور خود بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ظالم اور معتوب قرار پا گیا۔"

"یہ کس زمانے کی بات ہے؟"

"یہ تمہارے نبی عیسیٰ کی پیدائش سے بھی تین سو سال قبل کا واقعہ ہے۔ جان میلکم خدا کی قدرت کے مظاہر بڑے حیران کر دینے والے ہیں تم کو اگر اس کی قوت کا یقین نہ ہو تو کبھی بھی ان معاملات کو سمجھ نہیں سکتے۔

دقیانوس کے زمانے میں بتوں کی عبادت عام تھی۔ جو شخص بتوں کی پوجا نہ کرتا تھا اس کو کوئی نوکری نہ ملتی تھی نہ اسے کھیتی باڑے کے لیے کوئی قطعہ زمین دیا جاتا تھا۔ عرصۂ حیات اس پر تنگ ہو جاتا تھا۔ بادشاہ اس بات کو اپنا فرض سمجھتا تھا کہ سب لوگوں سے بتوں کی پرستش کرائے، جو کوئی بھی اس کی مملکت میں داخل ہوتا تھا اس کو شہر پناہ کے باہر لگے ہوئے بڑے بت کو لازمی طور پر سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح بادشاہ دقیانوس کے محل کے باہر بھی بت رکھے تھے، کسی آنے والے شخص کے لیے چاہے وہ سائل ہو یا

ملاقاتی بتوں کو سجدہ کیے بغیر اندر جانا ممکن ہی نہ تھا۔

اس عبادت میں بادشاہ اگر ذرا سی بھی کمی، بے توجہی یا مخالفت کی اطلاع پاتا تھا تو وہ فوراً اپنے ملازموں کی گردن مار دیا کرتا تھا۔ اس کے زمانے میں جو سکے رائج تھے ان پر بھی بتوں کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔

اس بادشاہ کے محل سے دور ایک آبادی میں ایسے بھی لوگ رہتے تھے جو بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے وہ آسمانی خدا کی عبادت کرتے تھے جو ساری مخلوق کا پیدا کرنے والا تھا۔ اس بستی میں چھ آدمی بڑے دیندار تھے جن کے نام تھے مسلمینا، سارینولس، ملیتانہ، مرطونس، نیونس اور یونس اور ان کی بستی کا نام افسوس تھا۔

یہ لوگ نہ تو کبھی بادشاہ سے ملنے گئے نہ ہی کبھی اس طرح سے شہر سے باہر نکلے کہ بتوں کو سجدہ کرنا ضروری ہوتا۔ ان کی ضروریات شہر کے اندر ہی پوری ہوجایا کرتی تھیں۔ آخر ایک دن بادشاہ کے کسی خوشامدی مصاحب نے بادشاہ دقیانوس سے ان کی عبادت اور بتوں سے بے زاری کا حال کہہ سنایا۔

اب کیا تھا بادشاہ کا غیض وغضب کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ اس نے حکم دیا:۔

"شاہی فوج کا ایک دستہ فوراً روانہ کیا جائے اور ان بے دین لوگوں کو سزا کے لیے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔"

ادھر فوجی رسالہ چلا اور ادھر ان لوگوں کو اطلاع مل گئی۔ یہ سارے افراد اپنی جان بچانے اور شاہی غضب سے بچنے کے لیے بستی سے نکل کھڑے ہوئے شہر کے دروازے پر آئے تو پہرہ داروں سے کہا۔

"ہم شکار کے لیے جا رہے ہیں تمہارے لیے ہرن مار کر لائیں گے اس سخت پہرے نے تمہیں دنیا بھر کی ہر نعمت سے محروم کر رکھا ہے۔"

"بس روزی کا معاملہ نہ ہوتا تو کون ایسے ظلم برداشت کرتا خود تو بادشاہ ہر وقت خوشبوؤں سے معطر محلوں میں رہتا ہے اور ہمارا یہ حال ہے کہ دن بھر دھوپ کی شدت میں جلتے ہیں کڑی ذمہ داری جھیلتے ہیں پھر بھی ہر وقت جان کے لالے پڑے رہتے ہیں"۔

محافظوں کو اسی طرح باتوں میں لگا کر یہ لوگ دروازہ سے نکل کر جنگل میں جا پہنچے اور اب ان کے پیچھے شاہی حدودِ سلطنت تھیں اور آگے جنگلات کا سلسلہ جو پہاڑوں کے دامن تک چلا گیا تھا، یہ لوگ آگے اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے، دل میں بیوی بچوں کو

گھروں پر تنہا چھوڑ آنے کا خوف بھی تھا اور بہت سے اندیشے بھی۔ بادشاہ ظالم بھی تھا اور بت پرست بھی، پھر ان کے خلاف تو اس کے کان بھرے گئے تھے اور شاہی دستہ ان کی گرفتاری ہی کے لیے بھیجا گیا تھا ہر طرح کے وسوسے ان کے دلوں میں اٹھ رہے تھے، ہزار طرح کے ڈر ان کے ساتھ لگے ہوتے تھے جب سپاہیوں نے ان کو بستی پر نہ پایا ہوگا تو ان کا شبہ مزید قوی ہوگیا ہوگا۔ خدا جانے پھر بچوں اور گھر والوں پر انہوں نے کیا کیا ظلم ڈھائے ہوں گے؟" یہ سب اندیشے بھی دلوں میں تھے اور اس کی خوشی بھی تھی کہ خدا نے اس بستی ہی سے بحفاظت باہر نکال لیا تھا۔ جہاں دین اور خدا پرستی کو خطرہ تھا۔

انہوں نے وہ رات جوں توں کر کے گزاری کہ صبح کو بادشاہ کے کچھ حالات معلوم ہوں مگر شہر سے نہ کوئی رات بھر میں باہر آیا تھا نہ اس چہار دیواری کے اندر داخل ہوا تھا۔ ہاں البتہ دوپہر کے وقت ایک چرواہا اپنی بکریاں بھیڑیں لے کر شہر سے باہر نکلا۔ ریوڑ کے پیچھے پیچھے اس کا کتا قطمیر ریوڑ کو ہنکاتا ہوا جنگل کی طرف چل رہا تھا۔

چرواہے کا ان کے قریب سے گزر ہوا تو یہ لوگ جھاڑیوں میں کچھ اور بھی چھپ گئے۔ مگر کتا ان کی بو سونگھ چکا تھا، وہ جیسے ان کے پاس آیا تو اس جھنڈ کے چاروں طرف گھومنے لگا، بار بار بھونک کر وہ اپنے مالک کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا تھا جب کتا کسی طرح ان کا پیچھا چھوڑتا نظر نہ آیا تو یہ لوگ بھی پوشیدہ مقام سے باہر نکل آئے۔ وہ گڈریا بھی ریوڑ چھوڑ کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ کتا بھی ان کے چاروں طرف گھوم پھر کر سب کی بو باس لینے لگا۔

گڈریئے کو فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ ہو نہ ہو یہی وہ چھ آدمی ہیں جن کا ذکر رات بھر ساری بستی میں ہوتا رہا ہے۔ بادشاہی فوج انہی کی تلاش میں کل شام سے گاؤں کے ایک ایک گھر کی تلاشی لے رہی تھی۔ اس نے ان کو بستی کے حالات بتائے اور کہا۔

"تم لوگوں کے گھروں پر فوجی پہرہ ہے تمہارے سب بچے اور خاندان والے محصور ہیں مگر کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ بادشاہ سنا ہے بہت غصہ میں ہے اور ابجلد ہی تمہاری تلاش شہر پناہ کے باہر بھی شروع ہوجائے گی، تمہارا بچ کر نکلنا کسی طرح ممکن نہ ہوگا۔"

بھائی ہمیں اپنی جانوں کی اتنی فکر نہیں ہے، اور نہ ہی ہم جان بچا کر بھاگے ہیں ہم تو فقط اس لیے شہر چھوڑ کر نکل آئے ہیں کہ ہمارا دل و دماغ کسی طرح بتوں کی پوجا پر راضی

نہیں ہوتا۔ ہم تو تمہیں بھی یہی پیغام دیتے رہے کہ ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ اور خدا کی مدد پر بھروسہ رکھ اگر محفوظ رہے تو بھی اچھا ہے کہ دین بچ گیا اور پکڑے گئے اور مارے گئے تو بھی اطمینان رہے گا کہ صحیح راستہ پر ہی جان جائے گی۔"

یہ گڈریا کسی طرح ان کی مدد پر راضی تھا نہ ہی ان کی سچائی اور ان کی بت پرستی سے توبہ پر متاثر تھا۔ اس نے اپنی راہ لی اور ریوڑ کی بکریاں جو اس کی غیر موجودگی میں ادھر ادھر ہو گئیں تھیں ان کو ہنکاتا ہوا پہاڑی کی طرف نکل گیا۔ مگر اس کا کتا قطمیر ان کے قدم چاٹتا ہوا وہیں ٹھہر گیا۔

سارا دن اسی پریشانی میں گزرا بار بار دل چاہتا کہ شہر پناہ میں داخل ہو کر گھر والوں سے جا ملیں۔ مگر پھر یہی بات سامنے آجاتی کہ بادشاہ ظالم بھی ہے ضدی بھی۔ وہ ضرور انہیں پکڑ بلوا لے گا اور پھر بتوں کو سجدہ بھی کرائے گا اور جان بھی لے لے گا۔ آخر چھپتے چھپاتے پہاڑ جانے کا قصد کیا، تاکہ وہاں پہنچ کر کسی غار میں جا چھپیں، چند دن کسی طرح گزار لیں تو پھر اپنے گھر والوں کی بھی خیریت معلوم کر ہی لیں گے۔

ادھر چرواہا واپس شہر پہنچا تو اس نے فوجی دستوں میں مخبری کر دی کہ جن بے دینوں کو وہ شہر کے گھروں میں ڈھونڈ رہے ہیں وہ تو باہر جنگل میں چھپے ہوئے ہیں۔ بادشاہ بذاتِ خود سپاہیوں اور اپنے وزیرِ اعظم کے ہمراہ افسوس سے باہر آیا، تلاش کرتا ہوا آخر کار پیروں کی نشانات کی مدد سے اس پہاڑ کی کھوہ تک جا پہنچا جہاں یہ سب لوگ چھپے ہوئے تھے۔

ادھر یہ سب کے سب اور ان کا کتا دن بھر کی مسافت کے بعد ایسے تھکے کہ غار میں پہنچتے ہی بے سدھ ہو کر گر گئے اور بھوک اور خوف اور کمزوری اور تھکان کی وجہ سے جلد ہی غافل نیند سو گئے۔

بادشاہ کا وزیر اعظم ان لوگوں کی سچائی، دینداری اور پاکبازی کے متعلق سن چکا تھا اور خود بخود ہی ان کا ہمدرد بن گیا تھا بادشاہ نے وزیرِ اعظم کو حکم دیا کہ وہ اندر جائے اور ان لوگوں کو غار سے باہر نکال لائے، وزیر اعظم اندر گیا اس نے دیکھا کہ سب کے سب بے خود ہو کر سو رہے ہیں اس نے بادشاہ سے کہا:

"جہاں پناہ وہ اب زندوں میں نہیں ہیں اندر تو ان کے ڈھانچے پڑے ہوئے ہیں شاید تیرے خوف اور بھوک نے ان کی زندگی ہی ختم کر ڈالی ہے۔"

"ان کا انجام یہی ہونا تھا جو ہمارے بتوں سے روگردانی کرے گا اسے بھلا چین کدھر نصیب ہوگا۔ اب تم یہ کرو کہ ان مفروروں کے نام اور پتے لکھ کر ایک تختی اس غار کے منہ پر لٹکا دو اور اس غار کے منہ کو ایک دیوار سے چن کر بند کر دو تاکہ ادھر سے گزرنے والوں کو ہمیشہ ان کا حال اور ان کی موت کا پڑھ کر عبرت ہو۔"

وزیر اعظم نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو مگر حکم حاکم کے سامنے مجبور تھا سو جو کچھ بھی بادشاہ نے کہا اس کو کرنا پڑا۔ غار کے باہر کتا بھی سویا ہوا تھا وہ بھی اسی طرح سوتا رہا اور اندر وہ لوگ خراٹے لیتے رہے اور سوتے رہے۔

نوجوان میلکم کیا تم یقین کرو گے کہ یہ لوگ سوئے تو بس سوتے ہی رہے اور اسی طرح تین سو برس گزر گئے۔ پھر خدا نے ان کو نیند سے بیدار کیا تو یہ غار کا دروازہ بند دیکھ کر بڑے متعجب ہوئے، ان کا خیال تھا کہ وہ بس ایک رات یا اس سے کچھ ذرا زیادہ سوئے ہوں گے، پھر راتوں رات یہ دروازہ اور دیوار سب کچھ کیسے اور کہاں سے آ گیا؟ وہ بڑے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھتے تھے مگر کچھ سمجھ نہ پاتے تھے۔

بھوک ستا رہی تھی اور دل باہر نکلنے کو بے چین ہو رہا تھا۔ کتا بھی جاگ چکا تھا مگر دیوار سے باہر کیسے نکلتے ایک نے کہا اگر ہم نے اپنی زندگی میں کوئی قابلِ ذکر نیکی کی ہو تو وہ ہم سب کو باری باری بیان کرنی چاہیے ہوسکتا ہے کہ اس کی بدولت خدا کا کرم ہو اور اس قید سے نجات ملے۔"

ایک نے کہا

"ہاں مجھے اپنی ایک قابلِ ذکر نیکی یاد آ رہی ہے۔ ایک بار میں نے ایک مزدور سے کچھ کام کرایا جتنی اجرت اس کی طے کی تھی وہ کام ختم کرنے کے بعد اس سے زیادہ کا طلب گار ہوا میں نے انکار کیا تو وہ اپنی اجرت بھی چھوڑ کر چلا گیا، میں نے اس کی واجب رقم میں سے بکری خرید کر جنگل میں چھوڑ دی، اپنے گلے کے ساتھ اس کی بھی حفاظت کرتا رہا پھر کئی سال گزر گئے اور اس کی ایک بکری سے اچھا خاصا ریوڑ بن گیا، پھر یوں ہوا کہ تنگدستی اور مصائب نے اس مزدور کو کچھ اور بھی فاقہ زدہ کر دیا، تب اس کو اپنی وہ اجرت یاد آ گئی جو غصہ میں میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا تھا، وہ میرے پاس آیا اور رقم مانگنے لگا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جنگل میں اس کا لمبا چوڑا ریوڑ دکھا دیا اور کہا کہ یہ سب کچھ اسی کا ہے۔ اس کا خوشی اور تعجب سے برا حال ہو گیا، مگر مجھے اطمینان ہوا کہ میں نے امانت واپس کر دی

ہے۔ اور اس طرح سے ایک نیکی کمائی، اے خدا اگر میری یہ نیکی تیری نظروں میں کس قابل تھی تو یہ دیوار کھول دے اور باہر جانے کا موقع دے۔

دیوار ایک چوتھائی کھل گئی۔

تب دوسرے نے کہا ایک نیکی مجھے بھی یاد آتی ہے۔ میرے پاس گزر بسر کی جب تنگی ہونے لگی تو میں نے کھانے پینے کی اشیاء کی ایک دکان نکالی۔ پھر خدا نے میری دکان کو ترقی دی اور میرے پاس غلہ اور اجناس کے ڈھیر لگے رہنے لگے تب شہر میں یکے بعد دیگرے کئی سال قحط کے گزرے، ہر طرف غلہ اور اناج مہنگا ہوگیا۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔

میرے محلہ میں ایک بڑی خوبصورت عورت رہتی تھی میری ہمیشہ اس پر نگاہ تھی مگر وہ کبھی مجھے خاطر میں نہ لاتی تھی۔ آخر جب بھوک نے اسے نڈھال کر دیا تو ایک دن میری دکان پر آگئی۔ میں نے اس کو کہا کہ تو نے مجھے بہت تڑپایا ہے میں تو ایک مدت سے تیرا طلب گار ہوں۔ میری خواہشوں کو پورا کر دے تو جتنا چاہے غلہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے لے جا۔" مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئی۔ پھر کئی بار میرے پاس آئی مگر میں نے اس کے لیے وہی ایک شرطِ وصال رکھی جو وہ کسی طرح قبول نہ کرتی تھی۔

آخر ایک دن بھوک اور بے چارگی نے اسے نڈھال کر دیا تو وہ میری خواہش کے سامنے جھک گئی، جب ہمیں تنہائی ملی اور میں چاہتا ہی تھا کہ اپنے گوہر مراد کو پالوں تو میں نے دیکھا کہ وہ کانپ رہی تھی میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی میں خدا سے ڈرتی ہوں۔ یہ سن کر مجھ پر بھی خوفِ خداوندی طاری ہوگیا اور میں نے فوراً توبہ کی، اور اس کو جانے دیا۔ اور جتنا غلہ اس کی ضرورت کا تھا اس سے کہیں زیادہ اس کا عطا کر دیا۔ یہ میری نیکی تھی کہ میں گناہ سے بھی بچ گیا اور پھر میرا گناہ ایک اچھی نیکی سے بدل گیا، اگر میری یہ نیکی خدا کے حضور قبول ہوئی ہو تو میں دعا کرتا ہوں کہ ہماری قید کا یہ دروازہ کھل جائے۔"

اور دروازہ نصف حد تک کھل گیا۔

تیسرے شخص نے کہا کہ میرے ماں باپ بوڑھے تھے اور میں ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ میرے گلہ میں بہت سی بھیڑیں تھیں، جو مجھے ہر وقت ہی معروف رکھتی کیونکہ ان کی دیکھ بھال کے لیے میرے پاس کوئی آدمی یا ملازم موجود نہ تھا۔

ایک رات سخت سردی پڑی میرا پورا ریوڑ باہر کھلے آسمان کے نیچے تھا میں اٹھا کہ

ان سب کو اندر کمروں میں لے جا کر بند کر دوں تاکہ سردی سے بچ سکیں۔ ابھی میں اٹھا ہی تھا کہ میرے باپ نے آواز دے کر مجھ سے پانی طلب کیا۔ میں پانی لے کر ان کے پاس پہنچا تو وہ پھر سو چکے تھے میں پانی لیے کھڑا رہا کہ وہ اٹھیں تو پانی پی لیں مگر وہ نہ اٹھے۔ اور سوتے رہے اور میں صرف یہ سوچ کر اگر میں پانی چھوڑ کر ریوڑ کو بچانے کے لیے باہر چلا گیا اور اس دوران انہوں نے پانی مانگا تو کون دے گا؟ اسی طرح رات بھر ان کے سرہانے مستعد کھڑا رہا۔ صبح تک سردی سے میری بہت سی بھیڑیں مر چکی تھیں اور میرا بہت نقصان بھی ہو گیا تھا مگر میں نے باپ کی خدمت کو افضل جانا۔

یہ ایک معمولی سی نیکی تھی لیکن اے خدا اگر تیری نظر میں اس کی کچھ حقیقت تھی تو اس دروازہ کو کھول دے تاکہ ہم لوگ باہر نکل سکیں۔

اور دروازہ تین چوتھائی کھل گیا۔

آخر اس قید سے رہائی ملی تو ایک شخص کو شہر بھیج کر مال اودال لینے اور نانبائی سے کچھ کھانے پینے کا سامان خرید کر لانے کا منصوبہ بنایا گیا۔

ادھر شہر کا شہر ہی بدل گیا تھا۔ وہ گلیاں نہ سڑکیں نہ لوگ نہ بستیاں۔ نہ لباس نہ رہن سہن ہر چیز ہی الگ تھلگ تھی، بازار کے لوگ بھی اس عجیب و غریب لباس والے شخص کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آگیا ہے۔

انہوں نے نانبائی سے روٹی لی کھانا لیا اور پھر جب پیسے دیئے تو دکاندار نے کہا:

"بھائی یہ کون سے سکے دے رہے ہو یہ پرانے سکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرانے سکے تمہیں کسی خزانے سے ہاتھ لگے ہیں۔"

بات بڑھ گئی انہوں نے کہا کہ میں نے تمہیں ٹھیک سکے دیے ہیں اور لوگ سکہ دیکھتے ہی ہنستے تھے کہ یہ کیا غافل شخص ہے جو پرانے فرسودہ دقیانوسی سکوں کو آج کے سکہ ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔

جھگڑا بڑھا تو بات قاضی تک جا پہنچی، کسی نے کہا

"اس عجیب و غریب آدمی کو شاہی دربار میں لے چلو تاکہ بادشاہ خود ہی اس کی بات کا فیصلہ کر دے۔" یہ سن کر ان کی حالت مارے خوف کے بگڑ گئی۔ سوچا کہ جس کا ڈر تھا وہی ہوا، اب بھاگنے اور چھپنے کا موقعہ نہیں۔ سارا راز بادشاہ دقیانوس پر کھل جائے گا۔ تو گڑگڑا کر کہا۔

"اچھا تم ہی سچے ہو تم اپنا یہ کھانا اور روٹی واپس لے لو مگر مجھے دقیانوس کے پاس نہ لے جاؤ وہ مجھے دیکھتے ہی مار ڈالے گا اور بتوں کو سجدہ کرائے گا۔"

"دقیانوس! تم کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ اسے تو مرے ہوئے تین سو سال ہو گئے ہیں۔ اب افسوس پر اس کی حکومت نہیں ہے اب تو بت پرستی بھی کبھی کی ختم ہو چکی ہے۔ بیت المقدس سے ایک نبی مسیح آ گئے تھے انہوں نے بت پرستی ختم کرا دی ہے۔" یہاں تو سب کے سب اسی کے پیروکار بستے تھے۔

ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ بادشاہ کے پاس گئے تو دیکھا واقعی نہ وہ محل ہے نہ وہاں بت خانہ ہے۔ نہ کوئی بے دینی کا کام ہے۔ انہوں نے سارا حال کہہ سنایا تو بادشاہ کو بہت تعجب ہوا اس نے کہا کہ اچھا وہ غار چل کر دیکھا جائے وہ وہاں آئے تو دروازہ پر تختی لگی ہوئی ملی جہاں ان کے بھاگنے کا واقعہ اور دیوار کے چنوانے کی تاریخ لکھی ہوئی تھی اور دقیانوس بادشاہ کی شاہی مہر لگی ہوئی تھی۔ تب سب کو یقین ہوا کہ ہاں یہ سچے تھے۔ اور ان لوگوں پر بھی عقدہ کھلا کہ یہ شب ایک دن کی نہ تھی بلکہ تین سو سال کی تھی۔

پھر خدا سے انہوں نے دعا کی الٰہی ہم پر پھر ویسی ہی نیند طاری کر دے اور یہ پھر سو گئے۔ تب بہت عرصہ کے بعد جب مکہ میں مسلمانوں کے نبی پیدا ہوئے تو یہ ایک بار پھر جاگے اور پھر سو گئے اور آج بھی کہیں سو رہے ہیں۔

نوجوان تم نے دیکھا کہ خدا ظلم کرنے والوں کو کس طرح پشیمان اور ذلیل کرتا ہے۔ ہاں پانچ چھ آدمیوں کے پاس موسیٰ کی طرح تہی دستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بادشاہی مقابلہ کے لیے کوئی لاؤ لشکر، فوج، قوت، غلبہ حد یہ کہ ہتھیار تک نہ تھے مگر پھر بھی ان کو ہی برتری حاصل ہوئی۔ اور یہی قدرت کا قانون ہے۔ فتح کے ذرائع کہاں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب سوچنا خدا والے کا کام نہیں ہوتا، خدا کی مدد آتی ہے بس شرط یہ ہے کہ دل صاف ہو گناہ سے بچا رہے اور ایمان سلامت رہے۔"

"مجھے ایک بات اور بتاؤ کہ تم نے موت کی وادی میں قدم رکھا۔ عذاب اور قید کے طویل زمانے گزارے۔ تمہیں یہ مردوں کی دنیا اور زندوں کی دنیا میں کیا فرق محسوس ہوا؟"

رمیسیس نے کہا

سچ پوچھو تو زندوں کی دنیا ایک خواب سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اصل تو یہی دنیا ہے جس میں ہم مرنے کے بعد آتے ہیں۔ زندوں کی دنیا میں جسم سب کچھ ہے۔ اسی

کو تم ہر وقت مقدم رکھتے ہو مگر تمہارے جسم کے اندر چھپی ہوئی روح ایک غلاف میں بند ہے۔ موت جسم کے اس غلاف کو کھول دیتی ہے۔ زندگی تو اس زندگی کے بعد ہی شروع ہوتی ہے جو موت کی حد سے گزر آتی ہے۔ انسانی جسم کے اندر اسی صورت و شکل کی ایک اور بھی صورت پنہاں رہتی ہے جب آدمی مرجاتا ہے تو لطیف اور ہلکی اور سبک شکل و صورت باہر نکل آتی ہے۔ یہی روح کا پیکر ہوتا ہے اور یہی روز ابد تک زندگی پاتا ہے۔

یہ زندگی جو تمہیں خاکی جسم کے ساتھ ملی ہے تمہارے لیے ایک نقطۂ اول ہے موت تک تمہیں فرصت حاصل ہے۔ تمام خاکی اور تمام زندہ مخلوق میں ہر چیز چار و ناچار خدا کے سامنے جھکی ہوئی ہے مگر تنہا انسان بھی ایک ایسی مخلوق ہے جسے اپنی مرضی کا مالک بنادیا گیا ہے جو کچھ اسے کرنا ہے واضح طور پر بتایا جاچکا ہے۔ اور جس سے بچنا ہے اس کا بھی اسے علم دیا گیا ہے۔ اگر بار بار کی شکستوں نے سلا نہ دیا ہو تو خود اس کا اپنا ضمیر ہی اس کا رہبر بن جاتا ہے۔ اگر دل ہوا و ہوس سے مکدر نہیں ہوتے ہیں۔ اگر نفرت، دشمنی اور جہالت نے دلوں پر پہرے نہیں بٹھادیے ہیں تو انسان کے بلند ہونے کی کوئی حد نہیں ہے وہ روحوں کے بلند طبقات تک جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہماری دنیا میں چار درجہ ہیں جو سب کے سب روحوں کے عارضی مسکن اور بڑے فیصلے کے دن تک سب کے سب یہیں موجود رہیں گے۔

ایک وہ طبقہ ہے جہاں پست درجہ کے اوباش قاتل، نفرت زدہ، فساد پھیلانے والے موجود ہیں یہ مقام زمین سے قریب ترین ہے۔ سب سے نیچے ہے اور روحوں کے لیے ایک مستقل عقوبت خانے سے کم نہیں ہے۔

دوسرا مقام وہ ہے جہاں سادہ، صاف گو معمولی درجہ کے عبادت گزار عام زندگی میں لین دین میں، معاشرت میں سچائی اور نیک راہیں برقرار رکھنے والے ٹھہرائے جاتے ہیں۔ مقام نسبتاً پر سکون ہے۔ اور یہاں کے قیام کا وقت اچھی طرح گزرتا ہے۔

روحوں کا تیسرا طبقہ اس مقام پر رہتا ہے۔ جہاں بڑے بڑے عبادت گزاروں، صوفیاؤں، دینداروں اور خدا کی حدود سے کبھی باہر نہ نکلنے والوں کی روحیں بستی ہیں اس جگہ ان کا قیام نہایت عمدہ ماحول میں ہوتا ہے جس کا تم دنیا والے تصور بھی نہیں کرسکتے اور آخری مقام ان روحوں کا ہے جو خدا کے نبیوں ولیوں اور پیغمبروں اور خدا کے خاص دوستوں کے ہمراہ آتے ہیں۔ ان میں سے ہر مقام کے اندر اپنے اپنے اور بہت سے درجات

ہیں اور ہر ایک کو اس کے طبقے کے اعلیٰ اور ادنیٰ درجات میں ٹھہرایا جاتا ہے۔

ہر طبقہ میں روحیں اپنے جسم کی خاکی زندگی کے اعمال کے نتائج میں بندھی ہوئی ملتی ہیں اور انہی نتائج کا اس کو صلہ بھی ملتا ہے۔ زندگی میں اگر محبت، مروت، نیک نیتی اور ہمدردی کے پاک جذبات روز مرہ کے معمولات پر چھائے رہے ہیں تو پھر ان کا صلہ بھی اچھا ملتا ہے اگر خیانت، چوری، غصہ، جلن، حسد انتقام اور نفرت سے زندگی گزرے گی تو پھر روحوں کا قیام بھی اسی طرح کے پست اور تکلیف دہ ماحول میں رہے گا۔"

رمیسیس بتاتا رہا اور میں سنتا رہا۔ موت کے بعد روحوں کے مقام ان کی آزادی اور حدود سب ہی کچھ معلوم ہوا۔

ہم نے نہ معلوم اور کن کن موضوعات پر گفتگو کی اور یہ گفتگو رات بھر اور اس کے بعد اگلے دن تک چلتی رہی۔ روحوں کی دنیا کا نظام اس قدر پیچیدہ تھا کہ اس کو آسانی سے سمجھنا ممکن ہی نہ تھا۔ روحوں کی دنیا کے مختلف درجات اور پھر ان درجات میں اور بہت سے مختلف درجات ہیں جن میں رہنے والی روحوں کی آزادی کی حدود اور ان کو عطا ہونے والے مواقع جن کے اندر رہ کر وہ خاکی انسانوں کی مدد بھی کر سکتی ہیں اور ان کی رہنمائی بھی یہ سب کچھ اس نے بتایا۔ یہ واقعی ایک مکمل نظام کے ماتحت تھا جو محدود مادی عقل کے ساتھ سمجھ میں آنا مشکل تھا۔

باب نمبر ۲۱

ابھی گفتگو چل رہی تھی کہ میرے دل میں ملکہ لوران اور سینا شرب کا خیال آیا مجھے معلوم تھا کہ بابل کے بادشاہ کی ملکہ لوران اس کی بہن تھی۔ میں نے پوچھا۔

"ابھی تم نے کہا تھا کہ تم صدیوں سے ایک نجات دہندہ کے منتظر تھے اور تمہیں ردوقش اور لوران نے میرا حلیہ بتا دیا تھا کیا ملکہ لوران کو میرا انتظار نہ تھا؟ اسے یہ جلدی نہیں ہے کہ میں اس کی بیٹی کو بھی نجات دلاؤں اور اگر ان کی نجات بھی میرے ہاتھوں ہی ہوگی تو پھر اس نے راہبری کر کے مجھے تم تک جلد از جلد کیوں نہ پہنچا دیا؟ تاکہ میں جلد از جلد اس کی طرف پلٹ سکتا؟ صحراؤں میں اس طرح ہفتوں تک بھٹکانے کی آخر کیا وجہ تھی؟"

"تم ہماری طرح مینا متی اور شہنشاہ سینا شرب اور ملکہ لوران کی بھی آخری امید ہو۔ ان کی اولاد بھی ایک قیدی ہے میں دھوئیں کے حصار میں قید تھا اور وہ دریاؤں کی سرزمین میں زیر زمین قید ہے۔ تمہارے راستے صاف کیے جا رہے تمہیں ایک وقت معینہ تک کھینچا جا رہا ہے تم اس متعین کردہ وقت سے نہ ایک لمحہ پہلے نہ ایک لمحہ بعد وہاں پہنچو گے تم کو وہاں پہنچنا ہے کب؟ اور کس طرح؟ تمہیں نہیں بتایا جاسکتا۔ مشکلیں تم پر برسات کی بارش کی طرح آگریں گی۔ مگر تم ضرور وہاں تک پہنچو گے۔"

مگر میں نہیں جانتا کہ لوران کی بیٹی کس جگہ قید ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میں اسے کس طرح تلاش کروں اور کیسے ڈھونڈ نکالوں گا؟"

"کیا تم میرے قید خانہ سے واقف تھے؟ کیا تم کو میری صورت وشکل یاد تھی؟ پھر تم آج اس جگہ کیسے پہنچ گئے۔ اس طرح تم کو راستے خود بخود ملتے چلے جائیں گے۔ بس تمہارے دل میں منزل کی لگن ہونی چاہیے۔ پھر منزلوں کے لیے تمہیں چلنا نہیں ہوگا۔ بلکہ منزلیں خود تم تک چلی ہوئی آجائیں گی۔

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ رعاماوی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس پر سنگین قسم کا تشدد کیا جا رہا ہے۔
"تمہیں ایک اور مہم سے گزرنا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔"
رمیسیس نے کہا۔
میں نے ایک دم کھڑے ہو کر باہر کی طرف نکلنا چاہا تو اس نے کہا۔
"یوں نہیں۔ ایسے نہ نکلو۔ تم ان کی قوتیں نہیں جانتے وہ سارحان کے مکین ہی نہیں محافظ بھی ہیں اور صدیوں سے کسی نے ان کی طاقت کو للکارا نہیں۔ تم محفوظ ہو کر نکلو۔"
"اپنے گرد اگرد حصار بنا کر چلو۔ عملیات اپنے سامنے رکھو۔ دل کو مضبوطی سے دھڑکنا سکھاؤ۔ اور نظروں میں نظریں ڈال کر بات کرو۔"
"اچھا ایسا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔
میں تیزی سے اٹھ کر باہر کی طرف چلا۔ رمیسیس ابھی تک یونہی پٹیوں میں لپٹا لپٹانے کپڑے کے سے غلاف میں کھڑا تھا۔ یقین ہی نہ آتا تھا کہ اسی ڈھانچہ سے میں اتنی دیر تک ہم کلام رہا تھا۔ اب وہ بھی ایک لاش کی طرح بے جان اور ساکت ہو چکا تھا اور ذرا آگے تابوت کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ باہر شور کی آواز بھی مسلسل آ رہی تھی۔ رعامادی کی چیخیں بڑی کربناک تھیں وہ بار بار چیخ رہا تھا اور مجھے مدد کے لیے پکار رہا تھا۔
دھوئیں کے قید خانہ کو عبور کرتے ہی میں نے رومال کو سر پر رکھا اور مردوقش کی ہڈی کو اپنے چاروں طرف گھما کر ایک ہوائی حصار سا بنا لیا میں آگے بڑھ رہا تھا اور یہ غیر مرئی سا حصار میرے ساتھ چل رہا تھا۔
میری نگاہیں دور دور تک دیکھ لینے پر قادر تھیں۔ اندھیرا اور سویرا میری نظر میں سب یکساں تھے۔ رعامادی کو میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ جس طرح کسی مردہ لاش پر گدھ نوچتے اور کھسوٹتے ہیں بالکل اسی طرح رعامادی ان کے نرغہ میں پھنسا ہوا تھا۔ رعامادی خود بھی سارحان ہی کا باشندہ تھا۔ اسی جگہ قید تھا مگر شاید اس نے شرو کو اپنے ہمراہ ان کے اس علاقہ میں لے جا کر جہاں سرجان مارشل روس اور مرے دوسرے مصری ساتھی قید تھے ایک سنگین غلطی کا ارتکاب کیا تھا جس کی سزا اسے دی جا رہی تھی۔
ان کی آنکھوں کے گڑھوں سے آگ کے شرارے سے نکلتے تھے اور بار بار رعامادی کے پنجر میں لمبی سلسلاتی ہوئی زبانیں بھر کر لوٹ جاتے۔ شعلے اس کو جلا رہے تھے وہ

کبھی دائیں طرف ہو جاتا اور کبھی بائیں۔ کبھی آگے ڈولتا اور کبھی پیچھے مگر وہ تو سینکڑوں کے غول میں تنہا کھڑا تھا اور اپنے آپ کو کسی بچاؤ کے لیے قطعاً کافی نہ تھا۔

میرے آتے ہی ان کا رخ میری طرف ہو گیا جیسے ان کو اب ایک نیا شکار مل گیا تھا۔ یہ چہرے ان سے مختلف تھے جن سے سارجان کی سرحدوں میں آتے ہوئے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ ان کی وضع قطع بھی مختلف تھی اور چلنے کا انداز بھی کچھ الگ ہی سا تھا۔

جیسے ہی یہ میری طرف بڑھے میں نے اپنے ہوائی حصار کو پھر سے مستحکم کر لیا اور رومال سے اپنے چہرے اور اپنے بازوؤں کو پھر سے مس کر لیا۔ مرے قریب آ آ کر انہوں نے وہی آگ کا کھیل مجھ پر بھی آزمایا مگر ان کا کوئی وار اس دائرہ سے آگے نہ بڑھ سکا جو میں نے بنا لیا تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے پکڑنا چاہا مگر ان کی پہنچ سے میں کافی دور تھا۔ میں نے بھی اب جوابی کارروائی کی۔ میں نے اپنے سر کے بالوں سے ایک بال توڑا اسے ہڈی سے ملا کر مردو کش کا نام تین مرتبہ لیا اور اسے دائرہ سے باہر اچھال دیا۔

جس طرح ایک رسی کا جال کسی درخت کے چاروں طرف بن دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان چہروں کے ارد گرد ایک رسی کا جال بن دیا گیا اور وہ اس طرح ہاتھ پیر مارنے لگے جس طرح کوئی مچھلی پانی سے باہر تڑپ رہی ہو۔ مگر جتنی دیر میں وہ تڑپ کر باہر نکلنے کی جدوجہد کرتے اتنی دیر میں وہ اس جگہ قید ہو چکے تھے۔ بار بار دوسرے دسیوں چہرے آگے بڑھ آتے اور پھر مرے دفاعی حصار سے ٹکرا کر لوٹ جاتے۔ ان کی قوتیں اسی طرح محدود تھیں۔ میں اپنے حصار کے ساتھ ساتھ چلتا اب رعامادی کے قریب تک جا پہنچا تھا اور یکایک میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے پنجر کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور اب ہم دونوں اسی حصار میں تھے۔ ان کی دسترد سے محفوظ اور الگ۔

"میرے آقا کے محسن! مجھے معاف کر دینا؟" اس نے کہا

"معافی؟ کس بات کی معافی؟"

تمہارا ساتھی شرو آگ میں جلا کر راکھ کر دیا جا چکا ہے۔ یہ میری ہی غلطی تھی کہ اسے تمہاری حفاظت کے بغیر تمہارے ساتھیوں کے قید خانوں تک لے گیا تھا۔ مجھے معاف کر دینا میرے آقا۔"

"کیا انہوں نے اسے مار ڈالا؟"

"کیوں؟ کس لیے؟؟"

"ہم چالیس چالیس گزوں کے فاصلے کی تین سرحدیں عبور کر کے اس پہاڑی کی طرف پہنچ گئے تھے، جہاں ایک تنگ و تاریک غار میں تمہارے ساتھی قید تھے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے بھی شرو کو کئی بار اپنے خون کی بلیدان دینی پڑی۔ جگہ جگہ حصار بن جاتا اور اس کو روکنے کی کوشش کی جاتی مگر وہ اور میں بڑھتے ہی رہے۔ غار کے پاس پہنچ کر انہوں نے آگ اور دھوئیں سے اسے گھیر لیا اور جلا کر مار ڈالا۔ اگر آپ نہ آجاتے تو یہ سب مجھے بھی جلا کر بھسم کر چکے ہوتے۔"

"مگر شرو نے مجھے کیوں نہ پکارا۔ میں وہاں پہنچ سکتا تھا؟"

"آپ دھوئیں کی جن دیواروں میں مرے، آقا کے ساتھ تھے۔ وہاں تک کوئی پیغام اور کوئی آواز پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ پر شرو نے بار بار آپ کو پکارا مگر آپ کو پتہ نہ چلا۔ وہ جلتا رہا اور کچھ پکارتا رہا۔ اس کی چیخیں بہت دردناک تھیں۔"

"کاش! میں اس کی مدد کر سکتا۔ سارجان تک مجھے لانے والا وہی تھا۔ اس کی مدد کے بغیر میں یہاں تک کیسے پہنچ سکتا تھا۔ کاش! میں نے شرو کو تمہارے ساتھ جانے کی اجازت نہ دی ہوتی۔"

میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور خود پر ہی اپنا غیظ و غضب اتار رہا تھا۔ میری حالت دیکھ کر یہ سب کے سب چہرے، جو میرے چاروں طرف کھڑے مجھے نفرت اور حقارت سے گھورے جا رہے تھے، میری دلی کیفیت بھانپ رہے تھے۔ جب انہوں نے مجھے خود اپنے ہی ہونٹ کاٹتے دیکھا تو ان کے چہروں پر استہزائیہ ہنسی آنے لگی تھی۔ میرا دل چاہا کہ ان سب سے ایک ایک سے شرو جیسے جانثار کا انتقام لوں مگر اسی لمحے میرے جذبات پر عقل غالب آگئی۔ اپنے ہی بنائے ہوئے حصار سے ایک قدم بھی باہر نکالنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ان کے خشمگیں چہرے اور ان پر نفرت کے الاؤ جس طرح دہک رہے تھے، وہ میں صاف دیکھ رہا تھا۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ میری طرف بڑھ آئیں اور میری تکا بوٹی کر ڈالیں۔

"رعامادی نے کہا۔ آقا اپنے دوستوں کی جان بچائیے ورنہ وہ ان کو بھی مار ڈالیں گے۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اسی طرف چلنے کا قصد کیا، جس سمت کا اشارہ رعامادی نے کیا تھا۔

"آقا اگر آپ نے مجھے یہاں چھوڑ دیا تو یہ مجھے بھی انتقام کا نشانہ بنا دیں گے۔ ان

میں اتنی طاقت ہے کہ یہ مجھے خاک اور مٹی میں بدل سکتے ہیں۔ آپ مجھے میرے آقا کے قیدخانہ کے پاس پہنچادیں۔ یہاں تک پہنچنا ان کے بس میں نہ ہوگا۔"

اور پھر میں رعامادی کو اپنے ہمراہ لے کر ایک بار پھر اسی قیدخانہ میں داخل ہوا، جس کی دیواروں کے عقب میں فرعون رمیسیس کی ممی کی معیت میں دس بارہ گھنٹے گزارے تھے۔ ان کی چیخیں غیظ و غضب کی پھنکاریں اور ملعون چہرہ قیدخانہ تک میرے تعاقب میں آئے اور اسی کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح مجھ سے کہیں کوئی غفلت ہوجائے تو فوراً مجھے میرے حصار سے باہر نکال لیں۔ مگر میں نے ایک ایک قدم ناپ تول کر رکھا تھا۔ رمیسس کے قیدخانہ کی دیواروں کے اندر ان میں سے کسی نے آنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ سب کے سب انہی دھوئیں کی دیواروں سے لگے کھڑے تھے مگر اندر کوئی نہ آیا۔ اندر آکر رعامادی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے اپنے آقا کو دیکھا، جو صندوق سے باہر ایک بے جان لاش کی طرح اسی طرح لپٹالپٹایا کھڑا تھا۔ جس طرح میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

رعامادی نے کہا۔ "آقا میرا مالک صرف ذی روح انسانوں کے ساتھ مل کر چاندنی رات میں چاند کے سائے ہی میں چل کر باہر آسکتا ہے ورنہ وہ کبھی اس عقوبت خانے سے باہر نہ نکل سکے گا۔ آپ جلدی کریں۔ اپنے ساتھیوں کو بچالائیں۔ پھر میرے شہنشاہ کو بھی باہر نکال لیں ورنہ یہ چاندنی رات نکل گئی تو ایک ماہ اسی کے انتظار میں گزارنا پڑے گا۔"

مجھے ایک بار پھر رعامادی نے وہ جگہ سمجھائی، جہاں پروفیسر سرجان مارشل مصری پروفیسر اور ایک چینی قلی قید تھے۔ چالیس چالیس گز کے تین پہاڑی سلسلے عبور کر کے مجھے بڑی پہاڑی کے قریب پہنچ جانا تھا۔ جہاں بڑی پہاڑی شروع ہوئی تھی۔ اسی بڑی پہاڑی کے دامن میں ایک ریت کا ٹیلہ تھا، جس کے چاروں طرف سارحان کے محافظ پرے کا پرا باندھے کھڑے تھے اور اسی ریت کے ٹیلے کے نیچے میرے ساتھی قید تھے۔ رعامادی نے کہا تھا کہ شردو اس ریت کے ٹیلے تک پہنچ گیا تھا کہ ان کے حملوں کا شکار بن گیا تھا۔

میں قیدخانہ سے باہر نکل آیا۔ وقت کا ایک ملگجا سا غبار سا چھایا ہوا تھا۔ قیدخانہ کی دیوار کے پاس وہی چہرے موجود تھے۔ میں نے پھر سے اپنے دفاعی حصار مضبوط کر لیے اور انہوں نے پھر سے اپنی کوششیں تیز کر دیں کہ میں کس طرح ان کے ہاتھ آجاؤں۔ ان کے خون آشام چہرے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اگر میں کسی طرح ایک بار ان کے ہتھے چڑھ

گیا تو میری بولی بولی بھی وہ لوگ باقی نہ چھوڑیں گے مگر میں بے حد محتاط ہو کر چل رہا تھا۔

قید خانہ سے چالیس گز تک آتے آتے جہاں چھوٹی سی پہاڑی ٹکری واقع تھی، مجھے کچھ زیادہ وقت نہ لگا۔ جیسے جیسے میں اس پہاڑی کے قریب ہوتا جارہا تھا، ان کی وحشت اور غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ مجھے اس راستہ سے ہٹا کر کسی اور طرف کردیں۔ جب میں اس پہاڑی کے بالکل ہی دامن میں پہنچ گیا تو ان کا غیظ و غضب چیخوں میں بدل گیا۔ وہ آسمان کی طرف منہ کر کے نہ معلوم کیا کیا پڑھتے جاتے تھے۔ جیسے ہی میں اس پہاڑی پر پہنچا، ان کے رونے اور چیخ چیخ کر رونے کی آوازیں میرے چاروں طرف گونجنے لگیں۔

انہی میں سے کسی نے گرجدار آواز میں مجھے دھمکی دی، "اگر اس پہاڑی کو پار کرو گے تو یاد رکھو تم اپنی زندگی چالیس سال سے زیادہ نہ گزار سکو گے۔ قید خانہ سے جتنے گز کا یہ فاصلہ ہے، اتنے ہی سال تمہاری زندگی میں برداشت کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے ایک لمحہ بھی زیادہ نہیں۔

میں نے یہ دھمکی سن کر بھی ان سنی کردی اور میں اسی طرح آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔"

اس چھوٹی سی پہاڑی کو عبور کر کے میں اور آگے چلا۔ میرے دائیں بائیں ان کا پورا گروہ چل رہا تھا بلکہ پہاڑی پار کرتے ہی اور بہت سے لوگ اس جلوس میں شامل ہوگئے۔

میں آہستہ آہستہ اب دوسری پہاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سارحان کی یہ نادیدہ مخلوق، جو اوروں کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہتی تھی مگر میرے سامنے اپنے پورے وجود کے ساتھ موجود تھی۔ میرے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہزاروں کی تعداد میں چل رہی تھی۔ یہ مجھے گھیر کر واپسی پر مجبور کرنا چاہتے تھے مگر ان کا کوئی بس نہیں چلتا تھا۔ میرے قدم جیسے ہی آگے بڑھتے، ان کا مجمع کائی کی طرح سے ادھر ادھر سے پھٹ جاتا تھا اور میں نکلتا چلا جاتا تھا۔

چالیس گز چل کر اب میں دوسری پہاڑی تک آپہنچا تھا۔ یہاں بھی اوپر چڑھنے اور اسے پار نہ کرنے کے لیے بہت شور مچایا۔ روتے، چیختے، منت سماجت کی مگر میرا دل بالکل

پگھلا اور میں نے اس سلسلے کو بھی عبور کرلیا۔
جب میں اسے عبور کرچکا تو کسی نے چیخ کر کہا، "دیکھ تیری آنے والی نسل کی عمر بھی ہم نے چالیس سال تک ہی محدود کردی ہے۔ اگر اور آگے جائے گا تو تیری نسل بھی اتنے ہی سال زندگی گزار سکے گی، جتنے گز تو چل کر اس رکاوٹ کو عبور کرے گا۔"
مجھے اس کی کیا پرواہ تھی۔ میں نے اس پہاڑی کو بھی پار کرلیا تو انہوں نے چیخ چیخ کر کہا
"اس کی دوسری نسل کی بھی عمر چالیس سال آگے نہ بڑھنے دی جائے گی۔"
اور پھر میں نے اس ضد اور بڑے وثوق کے ساتھ تیسرا حصہ بھی عبور کرلیا۔ جب بھی کسی نے للکار کر یہی کہا۔
"تین نسلیں، تین نسلیں، چالیس سال، چالیس سال۔"
یہ گویا میری زندگی کا پروانہ تھا، جو فقط چالیس سال تک ہی چلنی تھی مگر پھر بھی مجھے اس وقت یہی دھن تھی کہ کسی طرح اپنے ساتھیوں اور پروفیسر جان مارشل کو نکال لاؤں۔ جیسے ہی میں نے پہاڑی دیکھی تو مجھے یوں لگا، جیسے ریت کے ٹیلے کے نیچے پروفیسر سرجان مارشل کھڑے ہوکر ہمیں پکار رہے ہیں۔
ریت کے اس چھوٹے سے ٹیلے کے نیچے ایک غار نما کمرہ میں مجھے وہ دونوں نظر آرہے تھے۔ سرجان مارشل اور روسی، دونوں کے دونوں میری آمد سے بے خبر اور سخت مایوسی اور یاس کے عالم میں کھڑے تھے۔ میری نگاہیں ریت کی ان دیواروں کے آر پار دیکھ رہی تھیں۔ روسی نہایت بدحواس اور بری طرح پریشان تھا۔ اسے شاید کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا کہ اس کو قید کرنے والے کون ہیں۔ بس ہر طرف وہی ویرانی، اداسی اور بے چارگی کا سا ماحول تھا۔ کبھی وہ اس دیوار کے پاس آکر "مدد مدد" پکارتا تھا، کبھی اس دیوار کے پاس جاکر۔ سرجان مارشل بھی اس کے ساتھ زور زور سے مدد کے لیے پکارنے میں شامل ہوجاتے اور کبھی پھر مایوس ہوکر بیٹھ رہتے تھے۔
میرے ہمراہ آنے والے اکثر اس تیسری رکاوٹ کے پیچھے ہی رک گئے تھے۔ اب دو آدمی آگے بڑھ کر آگے آئے۔ شاید وہ اس قید خانہ کے محافظ تھے، جن کو اس عقوبت گاہ کے قریب تک آجانے کی اجازت تھی۔ جیسے ہی میں نے پہاڑی کی ڈھلان کی طرف اور قید خانہ کی سمت چلنا شروع کیا۔ ان میں سے ایک نے چلا کر کہا، "تو نے اپنی ضد میں اپنی تین

آنے والی نسلیں تباہ کرلی ہیں۔ چالیس گز بلا اجازت رکاوٹ کو پار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بڑی اور تیری دو نسلیں چالیس سال سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گی۔ اب اس سزا پر بھی تیرے دماغ ابھی درست نہیں ہوئے ہیں؟"

"مجھے اپنے ساتھیوں کو نکال کر لے جانے سے تم روک نہیں سکتے۔ سچے اگر تم میں مجھے روک لینے کی قوت ہوتی تو اب تک تم کبھی کا مجھے نیست و نابود کر چکے ہوتے۔ پھر میں ضرور ان کو نکال کر لے جاؤں گا۔ تم نے میرے حبشی دوست رعامادی کو ملا کر مار دیا ہے۔ میں اس سارحان کو ختم کر دوں گا۔"

وہ چیختے رہ گئے اور میں آگے بڑھتا رہا۔ میری نظریں سرجان مارشل اور روسی، دونوں پر لگی ہوئی تھیں اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ سخت مضطرب ہیں۔ شاید کئی دیواروں سے باہر کا شور کچھ کچھ ان کے کانوں تک بھی پہنچ رہا تھا مگر انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ میں ان کی مدد کے لیے پہنچ گیا ہوں۔

قید خانہ کے دروازے پر بھی دو محافظ روحوں کے چہرے نظر آئے۔ مزاحمت بھی ہوئی اور معرکے بھی۔ مجھے کوئی وار کرنا آتا ہی نہ تھا۔ وار وہ کرتے رہے اور لوران کا رومال اور مردوقش کی ہڈی مجھے بچالیتے تھے، اور میں ہر معرکے اور ہر مزاحمت کے بعد کچھ اور ہی آگے بڑھ جایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے آخری وار مجھ پر آزمایا۔ یکایک شدید آندھی چلنے لگی۔ گرد وغبار اور مٹی اڑ اڑ کر میرے سامنے جمع ہوگئی۔ کنکر، چھوٹے چھوٹے پتھر اور گہرا غبار، میرے اطراف میں ایک مہیب چادر کا غلاف تن گیا تھا۔ ایک لمحہ تو ایسا آیا کہ میری نظریں بھی دیکھنے کے قابل نہ رہیں کہ سرجان مارشل اور روسی کہاں ہیں۔ آندھی کے ساتھ ہولناک گرج اور گڑگڑاہٹیں تھیں، جیسے اونچے پہاڑوں سے بڑے بڑے مہیب پتھر ادھر ادھر لڑھک رہے ہوں۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

جیسے ایک شدید زلزلہ کی گڑگڑاہٹیں دل دہلا دیتی ہیں۔ اسی طرح یہ ایک مہیب شور تھا، جیسے بہت سے بادل ایک ساتھ گرج رہے ہوں یا جیسے ہزاروں بڑے بڑے پتھر پہاڑوں سے ایک بار گی ساتھ ہی ساتھ لڑھکا دیے گئے ہوں۔

یہ بھیانک شور ہی کیا کم تھا کہ انہوں نے پھر ایک اور وار کیا۔ میرے اطراف زمین پھٹنے لگی۔ کبھی ایک زوردار گڑگڑاہٹ ہوتی تو یہاں سے وہاں تک زمین میں بڑا سا شگاف پڑ جاتا۔ ابھی یہ افتاد ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ پھر گرجدار آوازوں کے ساتھ زمین کسی اور جگہ

سے پھٹ جاتی۔ زمین ہر طرف یوں پیچ پچار ہی تھی، جیسے کہ دلدلی زمین میں سطح اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے۔ ہر طرف مہیب گڑگڑاہٹوں کے ساتھ ساتھ بار بار زمین ادھر ادھر سے پھٹ رہی تھی مگر میرے اطراف میں ایک بار بھی زمین نے شگاف پیدا نہیں کیے اور نہ ہی میرے قدموں کے نیچے زمین پھٹی، میں جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں واقعی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بس کوئی دم جاتا ہے کہ زمین پھٹے گی اور میں اس میں دفن ہو جاؤں گا۔ تب میری زبان پر پہلی بار مقدس باپ کا نام آیا۔ میں نے پاک مریم کو یاد کیا اور میں نے بھیانک شور میں اپنے گناہوں کو یاد کیا اور ندامت اور شرمندگی کا شدید احساس ہوا۔ میں نے اپنے مقدس باپ سے دعا کی، "میرے معبود مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے!"

اور پھر میں نے دیکھا کہ فقط اس روحانی نام میں بلکہ صرف مقدس باپ کے احساس خیال ہی میں کس قدر مقناطیسیت اور طلسماتی قوت موجود تھی کہ جیسے ہی میرے خدا کا نام میری زبان پر آیا، یہ شور گڑگڑاہٹیں اور گرج چمک سب کی سب ہی ختم ہو گئیں۔ ہاں، البتہ زمین ابھی تک کہیں کہیں سے تڑخ رہی تھی۔

ان کا یہ وار بھی کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا۔ ایک بار پھر انہوں نے مجھے شکست دینے کی کوشش کی اور مجھے چاروں طرف سے ریت اور پتھروں کی چٹانوں کی موٹی موٹی دیواروں میں مقید کر دیا۔ یہ دیواریں یکایک ہی بلند ہو گئی تھیں اور انہوں نے خیال کی طرح زیادہ سرعت زیادہ جلد وہ چاروں طرف جال بن دیتے تھے۔ اب میں ایک قیدی تھا۔ باہر ان کے قہقہوں کی آواز آنی شروع ہو گئی تھی مگر میں نے ان کی فتحمندی سے مرعوب ہوئے بغیر آزادی کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کو اپنی قریب والی دیوار سے چھوا تو وہ برف کی طرح پگھل گئی اور میں باہر نکل آیا مگر ان کے چہروں پر میں نے بڑی خشونت دیکھی۔

یہ ایک غیر یقینی صورتحال تھی۔ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ ان چہروں کی غضبناکی کس وقت مزید کسی تشدد پسندی میں ڈھل جائے گی۔ نظریں خشمگیں تھیں اور انداز جارحانہ تھے۔ بار بار ان کے ہاتھ آپس میں اس طرح الجھتے تھے کہ وہ کچھ نہ کچھ کر گزرنے پر تیار نظر آتے تھے۔

مجھے آج بھی جب یہ خیال آتا ہے کہ آکسفورڈ کے ایک تعلیم یافتہ شخص کو، جس کو

یہ کہانی سنانی پڑ رہی ہے اور جو زندگی کے کسی بھی حصہ میں کبھی بھی غیر مادی مخلوق، نادیدہ طاقتوں اور ماورائی قوتوں کا قائل نہیں رہا تھا۔ ان حالات سے گزرنا پڑا تو پھر واقعات سب کچھ ایک خواب سے لگتے ہیں۔ ایک بھیانک خواب، جو ہوا کی طرح آ کر گزر تو گیا مگر جس کے عکس اور جس کے سائے آج بھی یادداشتوں کے پردوں پر ابھرے ہوئے ہیں۔

اس رات سارحان کی وادیوں میں مجھ پر کیا گزری؟ سرجان مارشل اور روسی اور معزی پروفیسر اور خداعی کو میں نے کن کن حالتوں میں پایا، یہ ایک غیر یقینی داستان ہے۔

مجھے کچھ علم نہ تھا کہ سارحان کی یہ نادیدہ مخلوق، جو صرف مجھے ہی نظر آتی رہی تھی، شرو یا کسی اور شخص کو بالکل بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ کیونکہ وہ مجھ پر حملہ کر دینے سے کترا رہی تھی۔ آخر رعامادی کی قیمت میں شرو نکل کر ان کی طرف چلا تھا تو یہ اس پر ٹوٹ ہی پڑے تھے۔ شرو کو شاید میں بچا لیتا مگر اس کی آوازیں مجھ تک نہ پہنچ سکی تھیں۔ میں رمیسیس کے ساتھ جب پچھلے وقتوں کی جھلکیاں دیکھ رہا تھا تو مجھے یہ علم بھی نہ تھا کہ دھوئیں کی دیواروں کے اس قید خانہ میں نہ اندر سے کوئی آواز باہر جا سکتی تھی، نہ باہر کی گفتگو کی لرزشیں اندر آ سکتی تھیں۔ شرو مر گیا۔ اس کی بوٹی بوٹی الگ کر دی گئی۔ وہ چیختا ہی رہ گیا اور میں اس کی کسی آواز کو سن تک نہ سکا۔ اس کی آنکھوں کی وہ چمک، جو نجانے کیا کیا اسرار اپنے اندر ڈبوئے ہوئے تھی، بجھ گئی اور میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہ جان سکا کہ وہ کون تھا کہاں سے آیا تھا، کدھر چلا گیا تھا، کس نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ مجھے سارحان تک لے آئے، دھوئیں کے اس کثیف بادل سے اس نے کس طرح اور کس بے جگری سے معرکہ کیے تھے۔ یہ سب کچھ ایک خواب ہی کا حصہ بن گیا تھا اور میں کبھی بھی نہ جان سکا تھا۔ اس کو یہ غیر مرئی طاقتیں کس نے عطا کی تھیں۔ اس کی پشت پر کون تھا اور کیوں وہ مجھے آقا کہتا تھا۔ شرو مر چکا تھا اور میں اب سارحان کی سرحدوں میں اکیلا تھا۔ فقط میں ہی ایک زندہ شخص تھا، جو ابھی تک آزادی سے گھوم پھر رہا تھا۔

شرو کے مرتے ہی ان کی ہمتیں بڑھ چکی تھیں مگر وہ مجھ پر حملہ کرنے سے کترا رہے تھے۔ ادھر میں آگے آگے اور آگے ہی بڑھتا رہا تھا۔ سامنے ایک اونچا سا ٹیلہ تھا، جس کے نشیب میں دوسری طرف میرے ساتھی بند تھے۔ شور و غوغا بڑھتا رہا اور وہ نہ معلوم کس

کس زبان میں کیا کیا پڑھ رہے تھے مگر مجھ پر وار کرنے کی انہوں نے دوبارہ ہمت نہیں کی تھی۔

یکایک چاند نے ایک سمت سے سر ابھارا۔ ہلکی سی ملگجی روشنی پھیلی اور جیسے ہی چاند کی کرنیں ان پنجروں پر پڑیں تو یوں لگا کہ جیسے ان سب میں بجلیاں بھر دی گئی ہوں۔ اب وہ اچھل اچھل کر میری طرف بڑھے۔ لگتا تھا کہ وہ صرف چند قدم چل کر ہی مجھے اپنے کھڑکھڑاتے ہوئے بازوؤں میں دبوچ لیں گے اور میں نے کسی خطرہ کے احساس کے ساتھ ہی اس ہڈی کو جو میرا واحد اسلحہ تھی، واحد محافظ تھی اور میرا سہارا تھی، اپنے ہاتھ میں لے کر چاروں طرف گھمانا شروع کیا۔

ملکہ بوران کا رومال میرے سر پر تھا اور ہڈی میرے ہاتھ میں تھی، اور دشمنوں کے غول کے غول میرے چاروں طرف جمع تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ اس چاندنی میں ایک اندھیرے کا جال کسی طرف سے آیا اور میرے اطراف میں پھیل گیا۔ یہ ایک سیاہ تاریک گول دائرہ سا تھا، جو میرے ہاتھوں کی گردش سے میرے اطراف میں بن رہا تھا، اس دائرہ میں سیاہ اندھیرے کی دبیز تہہ بنتی گئی اور میں اس میں چھپتا گیا۔

میں ان سب کو دیکھ رہا تھا مگر شاید وہ مجھے دیکھ لینے پر قادر نہ تھے۔ اس اندھیرے کے سوا ہر طرف چاندنی تھی اور سب کچھ ہی نظر آنے لگا تھا مگر میں ان کی نگاہوں سے اب اوجھل ہو چکا تھا۔

اب میں چلتے چلتے عقوبت خانے کے دروازے تک آچکا تھا۔ سر جان مارشل روسی اور مصری پروفیسر ایک ساتھ قید تھے۔ خداعی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ میں ابھی تک اندھیرے ہی میں تھا اور یہ لوگ اپنی آنکھوں سے گھور گھور کر مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں نے عقوبت خانے سے اپنے ساتھیوں کو نکالنا شروع کر دیا تھا۔

سر جان مارشل روسی اور مصری پروفیسر میرے ہمراہ اس طرح چل رہے تھے، جیسے کہ وہ کسی سوئے ہوئے آدمی کی طرح حرکت کر رہے ہوں۔ میں ان سے بات کر رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ میرے احکامات پر عمل کر رہے تھے مگر ان کی نظریں خالی تھیں اور چہرے بالکل BLANK تھے، جیسے کہ وہ مجھے پہچانتے ہی نہ تھے۔

ادھر ہم سب اس قید سے باہر نکلے۔ ادھر ان کی آہ و بکا شروع ہو گئی۔ وہ ایسے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، جیسے کہ کسی کی میت پر بین کر رہے ہوں۔

چاند کی روشنی اب زیادہ واضح اور صاف ہو گئی تھی اور ان کی جدوجہد بھی کچھ زیادہ ہی تیز ہوتی جارہی تھی۔

ہمارا چھوٹا سا قافلہ پھر اسی قید خانے کی طرف جارہا تھا، جہاں کچھ دیر قبل میں نے فرعون رمیسیس کی ممی کے ساتھ چند گھنٹے گزارے تھے۔ سرجان مارشل اور روسی اور مصری پروفیسر بالکل ایک معمول کی طرح چل رہے تھے۔ شاید انہیں اپنی رہائی کی کوئی خوشی تھی اور نہ ہی اس قید کی شدت کا کوئی اندازہ تھا، جس سے میں آپ کو بچا کر نکال لایا تھا۔ قید خانہ کے دروازے پر مجھے دیکھا بھی۔ انہوں نے گرمجوشی کا اظہار نہ کیا تھا۔ ہاں، البتہ روسی اور سرجان آپس میں کبھی کبھار کوئی بات ضرور کر لیتے تھے۔ سارحان کی مخلوق ان کے لیے قطعاً نادیدہ تھی اور یہ سارا علاقہ ایک بنجر اور ویران قطعہ کے اور کچھ نہ تھا، جس میں کوئی زندہ شخص تک رہتا نہ تھا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ جب کبھی سرجان مارشل اپنے ہوش و حواس میں آکر یہ معلوم کر چکے ہوں گے کہ میں انہیں کسی خطرناک مقام سے نکال کر لے آیا تھا تو وہ کس قدر خوش اور احسانمند ہوں گے۔ خیالات کا تانا بانا بنتے بنتے میں اچانک چونک پڑا تھا۔ مصری پروفیسر نے ایک گھٹی گھٹی چیخ ماری تھی اور جب تک میں اس کو پلٹ کر دیکھتا، تب تک وہ زمین پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ انہوں نے پھر اپنا بھیانک روپ دکھایا تھا۔ ان کے جبڑوں کی ہڈیوں کے اندر سے ان کے دانت جھانک رہے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے کہ آخر انہوں نے میرے ایک اور ساتھی کو مار گرایا تھا۔ میں بے بس تھا۔ کیا کر سکتا تھا۔ سارحان ان کا علاقہ تھا اور مجھے کوئی علم نہ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے اور کس طرح اپنے دو ساتھیوں کی جانیں بچانی چاہیئیں۔ میں نے فوری طور پر بس اتنا ہی کیا کہ اب دونوں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا کہ روسی اور سرجان میرے ساتھ ساتھ چلتے رہیں۔ سارحان والے موقع کی تلاش میں تھے۔ جیسے کسی ویران علاقہ میں ایک زخمی آدمی کے ساتھ ساتھ بھیڑوں کے غول چلتے ہیں کہ ذرا وہ زخمی شخص لڑکھڑائے تو وہ اپنی خون آشامی اس پر اتار دیں۔ بالکل یہی حال سارحان کے بھیڑیوں کا تھا۔ وہ بھی میرے اور میرے ساتھیوں کی تکابوٹی کرنے کی فکر میں تھے اور اس موقع کی تلاش میں تھے۔

ہم مصری پروفیسر کی تلاش چھوڑ کر اور آگے بڑھ گئے اور اب ہم اسی قید خانہ کے قریب آچکے تھے، جہاں میں اور شرو رعامادی سے بھڑ چکے تھے اور یہیں سے میں فرعون

سے جاملا تھا۔

رعاماری نے مجھے مبارکباد دی کہ میں ان سب کو صحیح سلامت نکال لایا تھا اور پھر کہنے لگا، "آج چاندنی رات ہے۔ سارحان کی روحوں کو آج باہر جانے کی آزادی ہوتی ہے۔ میرے آقا کو اسی تابوت میں رکھ کر سارحان سے باہر لے جاؤ تو اسے آزادی نصیب ہو سکتی ہے ورنہ اگر چاند ڈھل گیا تو پھر ایک ماہ تک مزید اس دن کے لیے انتظار کرنا ہو گا۔"

میں پھر سے اسی کمرے میں جا پہنچا، جہاں فرعون سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔ میں سر جان مارشل اور روسی کو لے کر آیا تھا۔ فرعون رمیسیس مجھے دیکھ کر خوشی سے ہنسا اور کہنے لگا، "آج جب تم مجھے یہاں سے نکال کر لے جاؤ گے تو آج کے بعد میری قوتِ گویائی بھی ختم ہو چکی ہوگی اور اب میری بھٹکی ہوئی آتما کو سکون بھی مل جائے گا۔ میں اب کسی اہرام کے چکر نہیں کاٹوں گا اور میری روح کو سارحان سے نکل کر قرار آجائے گا۔"

"تم کو میں برطانیہ بھیجوں گا تاکہ تمہیں برٹش میوزیم میں آرام سے رکھا جاسکے اور ساری دنیا دیکھ سکے کہ تم ہی ہو، جو موسیٰ کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے نیل میں غرق ہوئے تھے۔"

"تم مجھے نہیں بھی رکھو گے تو میں ناراض نہیں ہوں گا۔ ویسے بھی میں جانتا ہوں کہ میری قید کے دن زیادہ طویل نہ ہوں گے۔ موسیٰ کے جاننے والے بھی کہتے تھے کہ بی ثریا اور ایلیا والے اس وقت بہت طاقتور ہوں گے، جب مجھے دوبارہ گمنامی سے اٹھایا جائے گا اور وہی زمانہ اس دنیا کا آخری زمانہ بھی ہوگا۔"

"یہ بی ثریا اور ایلیا والے کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مسلمانوں کی برگزیدہ ہستیوں کے نام ہیں۔ انہی کے جاننے والے اب نیل کی وادیوں میں حکمرانی کرنے والے ہیں اور انہی کی حکمرانی کے عہد میں مجھے خاک سے اٹھایا جانا طے ہوا تھا۔"

فرعون نے کچھ اور بھی کہنا چاہا مگر رعاماری نے کہا، "آقا، چاند تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ چاندنی ماند ہو جائے گی تو پھر قید کی مدت اور بڑھ جائے گی۔ جلدی کرنا چاہیئے ورنہ سارحان سے نکلنا مشکل ہو گا۔"

فرعون نے واپس اپنے تابوت کی طرف آتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے کہا، "جب تم

مینامتی کے لیے مشرق کا سفر اختیار کرو تو اُر اور فرویک سے گزرنا۔ یہیں موسیٰ کا جد ابراہیم رہتا تھا اور یہیں ابراہیم کی نسل کے ایک بزرگ نوحؑ نے کشتی بنائی تھی۔ تم اُر اور فرویک سے گزرو گے تو ہی تریا اور ایلیا کے متعلق بھی سب کچھ معلوم کر لو گے۔"

تابوت میں بیٹھ کر اس نے پھر اپنے آپ کو ایک مکمل ممی کی صورت میں ڈھال دیا۔ ہم نے صندوق کا ڈھکنا بند کیا اور اسے اٹھا کر لے چلے۔

باہر ایک عجیب شور برپا تھا۔ لگتا تھا کہ بھرے گھر سے کوئی میت اٹھا کر باہر لے جائی جارہی ہو۔ سارحان والے رو بھی رہے تھے، چیخ بھی رہے تھے اور وہ جوان میں چپ تھے۔ وہ مجھے تو بس کھاجانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ صندوق میرے سر پر رکھا تھا اور ادھر اودھر سے سرجان مارشل اور روسی اسے سہارا دیئے ہوئے تھے۔

سارحان کی سرحدوں سے ہم کیسے پار نکلے۔ یہ ایک الگ طویل داستان ہے۔ بہرحال، باہر آکر ہم نے دیکھا کہ ہمارا اونٹ وکٹر اسی طرح وہیں بیٹھا ہوا تھا، جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا۔

وکٹر کے اوپر صندوق رکھ کر ہم لوگ لوٹ چلے۔ سارحان کا آخری منظر، جو مجھے یاد ہے، وہ یہ ہے کہ ادھر ہمارا قافلہ چلا اور ادھر ایک زلزلہ آیا اور سارحان کی تمام دھوئیں کی دیواریں ایک مہیب شور کے ساتھ ہوا میں معدوم ہوگئیں۔ اب وہاں آن کی آن میں علاوہ ایک بنجر میدان کے اور کچھ نہ تھا اور اس بنجر میدان کے آخری سرے پر ایک پہاڑی تھی، جس کے دامن میں کبھی دریائے نیل بہتا تھا اور اسی نیل سے فرعون کی لاش نکال کر یہیں کہیں ممی بنائی گئی تھی۔

جیسے ہی سارحان کا وجود مٹا اور زلزلہ کی جھنکار سنائی دی، روسی اور سرجان مارشل بھی گویا جاگ اٹھے اور ان کے ہوش و حواس پر جو دھند سی چھائی ہوئی تھی، وہ چھٹ گئی۔ انہوں نے مجھے دیکھا، وکٹر (میرے اونٹ) کے اوپر لادے ہوئے بکس کو دیکھا اور پھر حیرانی سے اودھر اودھر دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کس طرح ہوا کہ ہم سب لوگ پھر سے اکٹھے ہوگئے۔

یہ سب کچھ میں نے ان کو قاہرہ واپس جا کر بتایا اور پھر قاہرہ میں جو ہماری پذیرائی ہوئی، وہ بھی بے مثال تھی۔

فرعون کی ممی ایک عجوبۂ روزگار ثابت ہوئی۔ گو ہمارا ارادہ اس کو لندن کے عجائب گھر

بھیج دینے کا تھا مگر ریذیڈنٹ نے ہمیں اس ارادہ سے باز رکھا۔ ہاں البتہ بعد میں شاہی فرمان سے یہ ضرور طے ہوگیا کہ بیس سال بعد اسے برطانیہ بھیج دیا جائے گا۔

قاہرہ میں اب میں تھا یا اہرام کے روزنامہ میں روز شائع ہونے والے میرے قصیدہ تھے۔ میری ہی ذات سے فرعون کی تلاش منسوب کی گئی اور مجھے مدیو توفیق (والی معرے) نے محل میں بازیابی کی سعادت بخشی۔ جامعہ الازہر کے شعبے اہرامیات میں مجھے تاحیات فیلوشپ دے دی گئی اور برطانیہ میں مجھے اس عظیم تلاش پر سر کا خطاب دیا گیا۔ میں شاید سلطنت برطانیہ کا پہلا لارڈ تھا، جس کو صرف آٹھائیس برس اور چند ماہ کی عمر میں سر کا خطاب مل گیا تھا۔

چند ماہ اسی طرح قاہرہ میں گزارے کہ پھر مجھے ایک دن نیم خوابی کی حالت میں جاشن کا ہیولہ نظر آیا۔ جاشن اسی طرح اور اسی ہئیت میں تھی، جس طرح مجھے میرے قصبہ بائرن میں اب سے چار سال پہلے ملی تھی۔ اس نے مجھے ملکہ لوراں کا رومال اور مردو تش کی ہدی عطا کی تھی۔ خواب میں اس نے مجھے بس ایک ہی حکم دیا:

"مشرق کی طرف... مشرق کی طرف... دریاؤں کی سرزمین کی طرف چل، وادیٔ فرات میں اُر سے نکل کر مشرق کی طرف چل اور جلد سفر شروع کر دے۔"

اور اگلے دن میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ عراق کی طرف رخ کرلیا تھا۔

باب نمبر ۲۲

عراق کا سفر میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ جب سر جان مارشل نے شعبۂ تاریخ میں آکسفورڈ کے ہونے والے سیمینار میں شرکت کے بعد مجھے مشرق وسطیٰ اور برصغیر ہندوستان جانے کے لئے مدعو کیا تھا تو میرے ذہن میں صرف اتنی سی بات تھی کہ ہم سب لوگ، یعنی روسی، میں، پروفیسر جان مارشل اور ہمارے دو دوسرے ساتھی طالب علم بحر روم اور سویز سے ہوتے ہوئے باب المغرب سے گزر کر برصغیر ہندوستان تک جا پہنچیں گے، اور وہاں وادیٔ سندھ میں کسی مقام پر کھدائی میں حصہ لیں گے۔

مگر جب سر جان مارشل مصر ہی میں رک گئے اور مصر کا یہ قیام کم و بیش سال بھر کا ہو گیا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ صورت حال ہمارے اندازوں سے مختلف ہے اور اب سر جان مارشل بجائے آگے بڑھنے اور ہندوستان پہنچنے کے ہمیں عراق لئے چل رہے تھے گویا مشرق وسطیٰ میں ہمارے قیام کا عرصہ ابھی کچھ اور باقی تھا۔ عراق میں ان کی دو دوست سر چارلس، ولی اور کالڈیوی موجود تھے "جوارک" اور "بابل" میں کھدائی کر رہے تھے۔ یہیں سے سر چارلس وولی نے وہ تاریخی ٹیلیگرام لندن بھیجا تھا جس میں لکھا تھا میں نے طوفان نوح کو پالیا ہے۔

مصر میں فرعون رعمسیس کی ممی کی دریافت ایک عظیم کارنامہ تھی جس کے بعد مسلمان عالموں نے مجھ سے ملاقاتیں کی تھیں اور یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ دریائے نیل میں ڈوب جانے کے بعد فرعون کی لاش کی ممی کیوں کر بنی تھی؟ ہر ایک تاریخ خواہ وہ یہودیوں کی ہو یا عیسائیوں کی اس مقام پر آکر خاموش ہو جاتی ہے کہ فرعون دریائے نیل میں ڈوب گیا تھا مگر اس کی لاش کا نیل سے نکال کر اس کی ممی بنایا جانا کسی بھی تاریخ میں مذکور نہ تھا۔ ہاں البتہ مجھ سے جامعہ الازھر کے ایک طالب علم نے یہ ضرور کہا تھا کہ کتاب قرآن میں (جس کو وہ الہامی کتاب کہتے ہیں اور قرآن شریف کے نام سے پکارتے ہیں) فرعون کے بارے میں یہ الہامی تذکرہ موجود ہے کہ "ہم نے فرعون کو آنے والے زمانے کی عبرت کے لئے محفوظ کرلیا ہے یہ ۔۔۔۔ میں نے اس بات پر کچھ زیادہ تحقیق نہیں کی تھی

کہ آیا جامعہ الازھر کے اس طالب علم کا دعویٰ صحیح تھا یا غلط۔ بہرحال قاہرہ میں فرعون رمیسیس کی ممی مل جانے کا حیرت انگیز اثر یہ تھا کہ مصری یہودیوں اور مصری مسلمانوں نے مجھے جو عزت و مقام عطا کیا وہ اس سے پہلے کسی عیسائی مبلغ، عالم دین، علمی اور سیاسی شخصیت کو نہیں ملا تھا۔

مسجد محمد علی جامعہ الازہر میں جہاں ہزارہا طلباء صحافی اور مختلف النسل علماء اور تاریخ کے جید پروفیسران مدعو تھے مجھ سے اس ممی کی تلاش پر لیکچر دینے کے لئے کہا گیا۔ میں نے اس تلاش کا سہرا سرجان مارشل کے سر باندھا اور خود کو ان کی جماعت کا ایک معمولی رکن بنا کر پیش کیا، پھر میں نے سفر کی ساری تفصیل پیش کی مگر سارجان کے معرکوں کا حال جان بوجھ کر چھوڑ دیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ روحوں کے اس مسکن میں جو کچھ بھی مجھ پر گزرا تھا اور جس طرح فرعون رمیسیس کی مجھ سے گفتگو ہوتی تھی وہ کسی کے لئے مجذوب کی بڑ سمجھا جائے گا۔ لیکن جب میری تقریر ختم ہوئی تو فوراً ہی سرجان مارشل کھڑے ہوئے اور چند جملے میری ستائش میں ادا کرنے کے بعد کہنے لگے۔

حضرات ہماری موجودہ ٹیم میں سرجان میلکم سب سے کم عمر ہیں۔ ان کی عمر اس وقت صرف اٹھارہ سال اور چند ماہ ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ابھی ان کو صرف ایک سال ہی ہوا تھا کہ میرے ہمراہ مشرق کی سیاحت اور مشرق کے اسرار کی کھوج میں نکل کھڑے ہوئے اب یہ برطانوی حکومت کے لارڈ بھی بن چکے ہیں اور آپ کی قاہرہ یونیورسٹی کے شعبہ اہرامیات کے تاحیات فیلو بھی منتخب ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ان کی اپنی استعداد کی بدولت ہوا ہے۔ یہ فقط ان کی سادگی اور انکسار ہے کہ فرعون رمیسیس کی تلاش کا سہرا میرے سر باندھ رہے ہیں حالانکہ یہ سب کچھ ان کا اپنا کارنامہ ہے۔ یقین جانئے کہ اگر یہ اس مہم میں موجود نہ ہوتے تو فرعون رمیسیس کی ممی کا ملنا تو درکنار آج ہم لوگ زندہ حالت میں آپ سے باتیں بھی نہ کر رہے ہوتے۔ انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ میری جان بچا کر اور مجھے و روسی کو چند نادیدہ قوتوں سے چھڑا کر ہمیشہ کے لیے اپنے احسان تلے دبا لیا ہے۔

یہ واقعی سرجان مارشل کی عظمت تھی جو انہوں نے صاف صاف لفظوں میں اور بھرے بھرے مجمع میں میری خدمات کا اعتراف کیا تھا۔ اگر کوئی اور عالم ہوتا تو اس قدر خلوص کے ساتھ ایسے توصیفی جملے کہاں ادا کرتا؟۔ بہرحال پھر بہت سے لوگ مجھ سے یہ

پوچھتے بھی رہے کہ نادیدہ قوتوں سے سرجان مارشل کی کیا مراد تھی؟ اور ان کی جان کب اور کس طرح خطرے میں تھی؟ اور روس اور سرجان مارشل کو کس طرح بچایا گیا تھا مگر میں یہ سب کچھ گول ہی کر گیا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمارا ارادہ فرعون رمیسیس کی ممی کو لندن لے جا کر رسل پارک کے پاس بنے ہوئے برٹش میوزیم میں رکھ دینے کا تھا مگر حدیو توفیق (والی مصر) اس بات پر رضامند نہ ہوا اور اس نے کہا کہ فی الحال دس سال تک یہ ممی اسی کے میوزیم میں رہے گی۔ چنانچہ اس مشہور ممی کو ہمیں بادل ناخواستہ قاہرہ میں ہی چھوڑنا پڑا۔

اس پر تکالی "روزنامہ کالونی" کے پڑھنے والے قریباً تین ماہ سے ہر روز میرے دادا سرجان میلکم کے مصر کی سیاحت اور سرجان مارشل کی ہمراہی میں ہونے والے معرکوں کی داستان پڑھ رہے ہیں۔ سرجان مارشل کی علمی حیثیت اور شخصیت بطور ایک ممتاز ماہر آثار قدیمہ اور ان کی اپنی وقعت بھی بہت اہم ہے لیکن میرے دادا سرجان میلکم کی مصر میں جو کچھ پذیرائی ہوئی اور جو کچھ بھی دریافتیں انہوں نے مصر میں کیں خصوصاً اہرام مصر سے ملنے والا ایک خنجر نما اوزار جو کسی دنیاوی دھات سے ہرگز بھی بنا ہوا نہیں تھا اور جس کا حال میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور فرعون رمیسیس کا تابوت وغیرہ انہیں ملا، اس کی وجہ سے پوری علمی برادری اور دنیا بھر میں ایک دم ان کی قدرو منزلت بڑھ گئی جس کی وجہ سے نہ صرف ان کے بہت سے دوست بن گئے بلکہ ان کے بہت سے دشمن بھی پیدا ہو گئے۔

خصوصاً آکسفورڈ کے شعبۂ تاریخ کے ایک پروفیسر ارولے جو میرے دادا جان میلکم کو کالج میں کبھی اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے اور جو ایک معاصرانہ چشمک اور ایک غیر ضروری مخاصمت کا شکار تھے ان کے خواہ مخواہ دشمن بن گئے اور ان کی ایکا ایکی شہرت سے حسد کرنے لگے۔ ان کے ہاتھ اور کچھ تو نہ آیا مگر انہوں نے جان میلکم کو طویل عرصے بعد تک کلاس سے غیر حاضر ہونے اور کلاسیں اٹینڈ نہ کرنے پر آکسفورڈ یونیورسٹی سے نکال دیا۔

گو کہ میرے دادا کی سرگزشت میں مجھے کسی جگہ بھی کوئی ایک جملہ پروفیسر لی ہاروے کے خلاف نہیں ملا ہے اور نہ ہی میرے دادا نے کبھی کسی موقع پر پھر آکسفورڈ میں داخلہ لیا۔ مگر یہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے خارج RESTICATION کئے جانے والی بات مجھے ان کے تعلیمی فائلوں میں لگے ہوئے یونیورسٹی کے خطوط سے معلوم ہوئی تھی جسے قارئین تک پہنچانا میں نے اپنا فرض سمجھا ہے، تاکہ وہ ایک طرف سرجان مارشل کی فیاضانہ

روش کو سامنے رکھیں کہ انہوں نے میرے دادا کی بڑائی کو بھرے مجمع میں تسلیم کیا اور دوسری طرف پروفیسر لی ہاروے کی حاسدانہ عداوت کو بھی دیکھ لیا جس نے ایک اصول کی آڑ لے کر ملک کے مایہ ناز فرزند کو آکسفورڈ یونیورسٹی سے نکلوا دیا تھا۔ دوسری بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ پچھلے سال یعنی ۱۹۸۷ء میں فرانس کی آثار قدیمہ کی ایک ٹیم نے جو قاہرہ کے دورہ پر تھی اور جس نے رمیسیس سوئم کی ممی کا مکمل معائنہ تھا یہ بتایا کہ اس کے پیر کے انگوٹھے میں کچھ INFACTION ہو چکا تھا اور جراثیم اس کی لاش کو آہستہ آہستہ کھاتے جا رہے تھے۔ یہ رپورٹ جب فرانس سے شائع کی گئی تو بہت سے یہودی تاجروں نے اس بات کی پیش کش کی کہ نیویارک کے مشہور ماؤنٹ سینائی اسپتال میں اس ممی کا علاج کیا جائے تاکہ اس کی میت مزید نقصان سے بچ جائے کیوں کہ یہ فرعون حضرت موسیٰ سے مقابلے کی وجہ سے یہودیوں کی تاریخ کا ایک بے حد اہم عنصر تھا جسے وہ ہر قیمت پر باقی رکھنا چاہتے تھے اس لیے اس کے علاج پر مصری حکومت کو بڑی فیاضانہ پیشکش کی گئی مگر ان دنوں مصر اور اسرائیلیوں کے تعلقات خراب تھے اور یہودیوں کی فتوحات کی وجہ سے صحرائے سینا اور نہر سوئز تک مصریوں کے قبضے سے نکل چکی تھیں اس لیے مصر نے ان تمام پیش کشوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

بعد میں برطانوی اور فرانسیسی مشترکہ کوششوں سے یہ ممی لائی گئی جس کے بعد لندن بھی آئی اور وہاں تابکاری کی شعاعوں سے اس کے جراثیمی اثرات کو دور کیا گیا۔ اسی زمانے میں اس ممی کے فوٹو دنیا بھر کے اخبارات اور رسائل میں چھپے تو ایک بار پھر دنیا کو حضرت موسیٰ اور اس کے مقابلے میں آنے والے فرعون کے حالات کا علم ہوا مگر اس عرصے میں لوگ اس ممی کے دریافت کنندہ جان میلکم کو بھول چکے تھے یہ ممی کچھ عرصہ لندن اور پیرس کے عجائب گھروں میں رکھے رہنے کے بعد واپس قاہرہ بھیج دی گئی ہے، یہ ممی کبھی بھی لندن کے برٹش میوزیم میں نہ رکھی جا سکی کیوں کہ جب اس کی دریافت کے بعد کا دس سالہ عرصہ ختم ہوا تو دنیا پر پہلی جنگ عظیم کے بادل منڈلا رہے تھے اور اس کے بعد ۱۹۱۷ء سے مصر میں برطانوی اثرات کے خلاف عوامی تحریکیں اس قدر زور پکڑ چکی تھیں کہ مصر کے کسی ایسے تاریخی ورثے کو کسی صورت میں بھی لندن بھیجنا ممکن نہ تھا اور پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد مصر کا انقلاب کرنل نجیب اور کرنل ناصر کی سرکردگی میں اس طرح آیا کہ مصر میں برطانیہ کا نام لینا بھی بغاوت کے مترادف سمجھا جانے لگا اس

طرح یہ ممی ہمیشہ مصر ہی میں رہی، ماسوا اس قلیل وقفہ کے جب اسے ۱۹۹۹۹۹۹ میں پیرس اور لندن لایا گیا تھا۔

میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ تاریخی طور پر حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے واقعہ کا قطعی تعین ممکن نہیں ہے۔ بہر حال میرے دادا جان میلکم کے بعد ان ستر بہتر سالوں میں علمی اور تحقیق کے میدانوں میں بہت ترقی ہوئی ہے چنانچہ تاریخ کے جو گوشے اس وقت چھپے ہوئے تھے وہ اب سامنے آگئے ہیں۔ موجودہ تحقیقات کے مطابق حضرت موسیٰؑ لگ بھگ بارہ سو سال قبل مسیح یہودیوں کو مصر سے نکال لائے تھے پھر وہ ایک طویل عرصہ تک چھوٹی چھوٹی جنگوں میں مصروف رہے یہاں تک کہ انھوں نے کنعان کو فتح کر لیا اور پھر یہودیوں کو حضرت سلیمان اور حضرت داؤد جیسے عظیم بادشاہ ملے جنگی سلطنت اور حکومت تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔

حضرت داؤدؑ کی حکومت ۶۵ سال کی ہوئی یعنی ۱۰۱۰ ق۔ م سے ۹۵۵ ق۔ م تک۔ حضرت سلیمان نے بیس سال حکومت کی۔ ۹۵۵ ق۔ سے ۹۳۵ ق۔ م تک اس کے بعد جوُدا (یہودا) ۹۳۱ ق۔ م سے ۹۱۰ ق۔م تک اور پھر عمری اور جوسیف وغیرہ بادشاہ بنے جو اسرائیلیوں کے نسبتاً کم نام سے بادشاہ تھے۔ گویا مختصراً حضرت موسیٰؑ اور فرعون رمیسیس کا واقعہ اب سے کوئی سوا تین ہزار سال قبل پیش آیا تھا۔

اس مختصر سی سمع خراشی کے بعد میں جوزف میلکم اجازت چاہتا ہوں اور اب میں پھر اپنے دادا جان میلکم کی سرگزشت کی طرف لوٹتا ہوں۔

"ان دنوں قاہرہ میں ہر طرف جان میلکم ہی جان میلکم کا چرچہ تھا اور میری مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اسی دوران مجھے لنی ممی کا میرے گھر یعنی بائیرن کے قصبہ سے ایک خط ملا۔ اس خط میں ممی نے مجھے ڈھیر ساری مبارکبادیاں دی تھیں اور میری کامیابیوں کی جو خبریں ان تک پہنچی تھیں ان سے ان کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا وہ بہت خوش تھیں۔ ڈیڈی کے لیے بھی میں بہت ہی باعث افتخار بن چکا تھا۔ اپنے ہم عمروں اور ساتھی محفلوں میں ممی اور ڈیڈی میرا تذکرہ بہت ہی فخر سے کرتے تھے۔

یہ سب کچھ تو تھا مگر ممی نے لکھا تھا کہ ہمارے بائیرن والے کاٹج میں اب کچھ عجیب وغریب واقعات ہونے لگے تھے جو بعض اوقات بڑے پراسرار بھی تھے اور خوفزدہ کر دینے والے بھی ہوتے تھے۔

می نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ستمبر ۱۹۰۰ء کی ۲۰ تاریخ کو انھوں نے حسب معمول رات کو سونے سے قبل گھر کے تمام دروازے خود بند کیے ان کے آخری سرے پر چھوٹا گیٹ بلاک کیا، دودھ والے کے لیے پرانی بوتلیں باہر رکھیں تاکہ ان کو بدل کر وہ نئی بوتلیں رکھ جائے اور پھر سونے سے قبل کچھ مطالعہ کیا اور سو گئیں۔ برسوں سے یہ ان کا معمول تھا۔

اس رات چاندنی خوب پھیلی ہوئی تھی اور آسمان پر ہمیشہ رہنے والی لندن اور بارن کی کہر اور بادلوں کی تہیں کچھ کم تھیں۔ می نے مطالعہ کے بعد کتاب اپنے سرہانے رکھی اور ڈیڈی کو چادر اوڑھائی اور خود بھی لیٹ گئیں ابھی انھیں لیٹے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ انھوں نے باہر کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنی جس سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ کسی قدر نیند اور کچھ غنودگی کی ملی جلی کیفیت تھی کہ انھیں ایسا محسوس ہوا کہ قدموں کی یہ چاپ آہستہ آہستہ ان کے نزدیک آتی جا رہی ہے۔ پھر دفعتاً باہر سے کسی نے دروازہ کھولا اور سفید سفید چادر میں لپٹی ہوئی کوئی ہستی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھیں کہ بند دروازہ باہر سے کیسے کھل گیا کہ وہ سفید سفید چادر میں لپٹی ہوئی ہستی لہراتی ہوئی ان کے قریب آکر کھڑی ہو گئی سر سے پیر تک اس کا لباس سفید ہی تھا می کی خوف سے چیخ نکل گئی تو ڈیڈی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے انھوں نے فوراً لائٹ جلائی دروازہ اسی طرح بند تھا۔ باہر اسی طرح چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور اندر کسی تیسری ہستی کا وجود تک نہ تھا البتہ تحیرانہ استعجاب کے جھٹکوں نے می کا چہرہ سفید کر دیا تھا۔

ہر چند کہ می کو یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی دروازے سے اندر ضرور داخل ہوا تھا مگر ڈیڈی نے ان کی تشفی کر دی کہ انھوں نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔ می بہت ڈر گئی تھیں اس لیے اس رات پھر صبح تک ان کی آنکھ نہ لگ سکی۔

اگلی رات، کہر آلود سیاہ بادلوں سے ڈھکی ہوئی ایک سیاہ رات تھی جس میں صبح ہی سے وقفہ وقفہ سے بارش ہوتی رہی تھی پچھلی رات کے جاگنے کی بدولت ان کی آنکھیں نیند سے بری طرح بوجھل تھیں اس لیے وہ جلد ہی سو گئیں، ڈیڈی بھی سو گئے تھے۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب می نے محسوس کیا کہ کوئی ان کے بیڈ کے قریب کھڑا ہوا ہے اور ان کے پیر کا انگوٹھا آہستہ آہستہ ہلا رہا ہے۔ یہ سایہ سا تھا جس کی ایک ہیئت تو تھی مگر اس کے چہرے کے نقوش، جسم کے کسی اور حصہ کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

می کی خوف سے گھگی بندھ گئی۔ اندھیری رات میں بند کمرے میں کسی اجنبی کو اس طرح اپنے قریب دیکھ کر می کی حالت بگڑ گئی یوں تو وہ بہت ہمت والی خاتون تھیں مگر انھوں نے خط میں لکھا کہ اس سرد رات میں بھی میری پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی، خوف سے میرا رواں رواں کھڑا ہو چکا تھا اور ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈیوں میں سرایت کر چکی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ سانس اس بار آکر دوبارہ نہیں آسکے گا۔

خوف نے می کی زبان گنگ کر دی تھی اور ان سے چیخنے چلانے یا ڈیڈی کو آواز دے کر اٹھانے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ سائے نے ان کو اپنے پیچھے چلے آنے کا اشارہ کیا اور وہ ایک سحر زدہ معمول کی طرح پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ بستر سے اٹھ کر وہ چند ہی قدم آگے بڑھی تھیں کہ سامنے رکھی ہوئی شیشے کی میز سے ٹکرا گئیں اس پر بجلی کا لیمپ بھی رکھا ہوا تھا میز بھی گری اور بجلی کا لیمپ بھی، اور پھر بجلی کا بلب ایک دم دھماکے سے پھٹ گیا جس سے ڈیڈی جاگ گئے اور انھوں نے می سے پوچھا کہ کیا بات تھی مگر می گم سم سی کھڑی تھیں۔ خوف اور دہشت نے زبان بند اور چہرہ پسینہ سے تر کر دیا تھا۔ ڈیڈی نے فوراً بیڈ لیمپ روشن کیا اور دروازہ کھلا دیکھا مگر باہر کے اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آیا تھا کہ دفعتاً بجلی چمکی اور باہر ایک سایہ سا ہوا میں اڑتا نظر آیا۔ سایہ بھی اس طرح کا جیسے کسی کٹے ہوئے درخت کا بغیر شاخوں کا صرف ایک تنا ہوا میں ڈول رہا ہو اس پر ایک لمحہ کے لیے نگاہ پڑی اور پھر بجلی کی چمک نے اسے معدوم کر دیا، پھر ہر طرف اندھیرا چھا گیا پھر بس باہر بارش کا شور تھا اور مہیب تاریکی۔

دروازہ کیسے کھلا؟ بغیر آہٹ کے اندر کون داخل ہوا؟ می کو اپنے پیچھے آنے کا کہنے اشارہ کیا اور کہیں اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتا تھا یہ سب ایک معمہ تھا۔

می نے خط میں لکھا کہ اس واقعہ سے وہ اور ڈیڈی دونوں ڈر گئے اور فوراً ہی صبح کو فادر جان دوڈ (چرچ کے پادری) کے پاس پہنچے تو انھوں نے ان کو بڑی تسلی دی اور تشفی دی اور بائبل کی چند آیات پڑھنے کے لیے کہا مگر اس کا بھی کچھ خاطر خواہ اثر نہ ہوا کیوں کہ تقریباً ایک ہفتہ کے بعد ہی ایک اور واقعہ رونما ہوا۔

می نے خط میں لکھا کہ اس دوپہر کو سورج اپنی پوری تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا ڈیڈی ایک ضروری کام سے برابر کے شہر سینٹ آلین گئے ہوئے تھے، ہماری خادمہ بھی کام کر کے اور ابی کو لنچ کھلا کر جا چکی تھی۔ گھر میں می تھیں یا ہماری پالتو سیاہ بلی کٹی

اور آسٹریلین طوطا جسے ہم پیار سے ایگلیٹ (چھوٹا عقاب) کہتے تھے، موجود تھا۔ می لنچ کے بعد نیم غنودہ تھیں، کٹی صوفہ پر کھڑکی کے سامنے بیٹھی ہوئی دھوپ تاپ رہی تھی اور ایگلیٹ چوری کھا رہا تھا کہ یکایک بلی نے رونا شروع کر دیا، بلیاں عام طور پر رات ہی کو رونے کی آوازیں نکالتی ہیں، دن میں ایسا ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اچھی بھلی دھوپ سہاتی بلی نے جو رونا شروع کیا تو ماحول پر ایک عجیب سوگوار سی فضا طاری ہو گئی اور پھر ایک دم دھڑا دھڑ سارے کھڑکی اور دروازے کھل گئے۔ کٹی سہم کر ایک صوفے کے کونے میں دبک گئی اور آسٹریلین طوطا اپنے ہی پروں میں چھپ گیا۔ می بھی چونک کر اٹھ بیٹھیں اور چند ہی لمحوں میں انھوں نے دیکھا کہ سیاہ مرغولے اور کالے گردابوں کی طرح تیرتے ہوئے بادل ہر کھلی کھڑکی، دروازے اور روشن دانوں سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ می کے دیکھتے ہی دیکھتے سارا کمرہ انھی سیاہ مرغولوں سے بھر گیا اور می کی یہ حالت تھی کہ جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو۔ پھر آن کی آن میں یہ سب گرداب، بگولے اور بادل نما دھواں کچھ عجیب و غریب صورتوں میں بدل گئے، کمرے میں موجود دھواں ادھر ادھر بکھر کر ہوا میں تحلیل ہو گیا اور اس کی جگہ می کے بیڈ کے گرداگرد عجیب و غریب پرانی وضع کے لمبے لمبے سے چوغے پہنے کچھ لوگ منڈلانے لگے۔ جانوروں کی کھالیں ان کے جسم پر تھیں اور لمبے لمبے چوغوں کی مانند ان کے جسموں پر جھول رہی تھیں۔

می نے لکھا کہ انھوں نے ان کی آنکھوں میں بڑی بے رحمانہ چمک اور سفاکانہ جذبات کی بجلیاں سی کڑکتی دیکھیں۔ لگتا تھا کہ ابھی کوئی لمحہ جائے گا اور یہ اس گھر اور اس کے سارے مکینوں کو تہس نہس کر کے چھوڑ دیں گے۔ ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر یہ سب کے سب آہستہ آہستہ نپے تلے قدموں سے می کی طرف بڑھ رہے تھے۔

قریب تھا کہ اُن کا انتقام می کو ختم کر کے رکھ دیتا یا اس گھر ہی کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی کہ یکایک باہر لان میں ایک سیاہ فام شخص کی جھلک نظر آئی یہ شخص تقریباً دوڑتا ہوا لان کے گیٹ سے اندر آیا اور اسی عجلت میں تیز رفتاری سے زور سے دروازہ کھول کر بے دھڑک می کے کمرے میں گھستا چلا گیا۔

اس شخص کی ہیئت بھی عجیب و غریب تھی می نے اپنے طویل خط میں اس کا بہت تفصیلی ذکر کیا تھا۔ اس شخص کی آنکھوں میں چمک نہ تھی بلکہ بجلیوں کے بلب کی طرح روشنی تھی، لگتا تھا کہ سارے جسم کی تاریکی میں بس یہی آنکھیں اندھیرے سے لڑ

رہی تھیں۔ اس کے آتے ہی کمرہ میں ایک عجیب ناگوار سی بو پھیل گئی تھی بالکل ایسی بدبو جیسی کسی مردہ بلی کے جسم کی سڑاند سے تعفن پھیل جاتا ہے اس قسم کی بدبو نے سارے گھر کو آن واحد میں ایک نہایت بدبودار عفونت خانہ میں بدل دیا۔

مگر اس شخص کے اندر آنے کا اثر حیرت انگیز ہوا، دھوئیں کے سیاہ مرغولوں سے متشکل افراد کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے جیسے ایکا ایکی وہ سب کے سب آن واحد میں پتھر کے بے جان مجسموں میں بدل گئے ہوں ان کی نگاہیں جم گئیں، قدم جم گئے، حرکتیں و جنبشیں جم گئیں مگر چہروں کی سفاکیاں اور نظروں کی خشمگیں اور شعلہ باراتی اب بھی اسی طرح موجود تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی نے ان کے منہ آتے شکار کو ان کے دانتوں اور جبڑوں سے باہر کھینچ لیا ہو۔

ادھر سے اس سیاہ فام چمکیلی آنکھوں والے شخص نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنے پیروں کے انگوٹھوں کی مدد سے می کے پلنگ کے چوطرفہ ایک دائرہ نما نشان سا بنا دیا تھا اور اس نے باہر ہی کھڑے کھڑے اپنے ہاتھوں سے کسی چمک دار قسم کے چند دانے می کے پلنگ کے چاروں طرف بھی ڈال دیے اور پھر پلنگ کے قریب کھڑے ہو کر سفید سارس کے چار پر ان کے بیڈ کے چاروں طرف ڈال دیے اور پھر می سے مخاطب ہوا۔

"ملکہ بوران کا ادنیٰ خادم نجات دلانے والوں کے بیٹے کے گھر کی حفاظت کا ذمہ لینے آیا ہے۔ خوش رہ کہ تو ایک خوش بخت بیٹے کی ماں ہے۔ جب تک نجات دہندہ دریاؤں کی سرزمین تک نہیں پہنچ جاتا ہم حفاظت کرتے رہیں گے اور شکستہ سارحان کی اُجڑی روحیں تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔"

ابھی اس آواز کی گونج فضا میں موجود تھی کہ کمرہ میں کچھ نہ رہا۔ یوں لگا جیسے اس کمرہ میں غیر معمولی کوئی بات ظہور پذیر بھی نہ ہوئی ہو، وہی بستر، وہی لیمپ، وہی کتابیں، وہی سوتا ہوا ایگلیٹ اور وہی ہمارے گھر کا سکون پرور ماحول، امی نے لکھا کہ یہ گویا ایک رات کا ڈراؤنا خواب تھا جو ایک جھلک دکھا کر گزر گیا اور پھر وہ ساری شام اور ساری رات امی کو مقدس باپ اور مقدس ماں مریم کو یاد کرتے گزر گئی۔ انھوں نے لکھا کہ ذہن میں جتنی پریشانیاں تھیں وہ بائبل کے پڑھنے سے آپ ہی آپ ختم ہوتی چلی گئیں ان کے خط کا آخری جملہ تھا۔

"مگر جان، یہ بوران، بوران کی بیٹی، دریاؤں کی سرزمین، نجات دہندہ سارحان، یہ

سب کیا ہیں؟ میں بہت غور کرتی ہوں مگر مجھے ان کے مفہوم کچھ سمجھ میں نہیں آتے تم بتا سکتے ہو تو مجھے لکھنا۔"

تمھاری پیاری ممی

کم از کم اس خط کے بعد مجھے یہ مکمل یقین تو ہو گیا تھا کہ جب تک میں اس سیاہ فام حبشی عورت جاش کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر دریاؤں کی سرزمین تک نہیں پہنچ جاتا جہاں زمین کی گہرائیوں میں سے مینا متی کو ابھرنا ہے میرے گھر والے اور میرا اپنا وجود ہر قسم کے دیکھے اور ان دیکھے خطرات سے محفوظ رہیں گے۔
بہرحال سرجان کے مصر کے گزر گئے تھے، رمیسیس سوم کی ممی دریافت ہو چکی تھی۔ مصر میں دوران قیام اس عجیب و غریب ہڈی پر میں نے سیناثرب کی فوجوں کو بابل تباہ کرتے دیکھ لیا تھا مینا متی کا چہرہ بھی اس آئینہ میں ایک دو بار ابھر آیا تھا۔ شاید سفر اب آگے کی طرف ہونا ہی تھا۔
قاہرہ کی عزت افزائیوں کے بعد جہاں ہمارا قیام کم و بیش سال بھر رہا تھا اب سرجان مارش مصر سے عراق کی طرف کوچ کرنے والے تھے۔ یہ زمانہ جو ہم نے ممی کی دریافت کے بعد مصر میں گزارا اکتوبر سے مارچ ۱۹۰۱ء تک کا تھا۔
ہم لوگ آخر کار ۱۴ مارچ کو قاہرہ سے اسکندریہ اور وہاں سے بصرہ کی بندرگاہ کی طرف روانہ ہونے والے تھے۔ جب ایک سال قبل میں نے اس پراسرار سرزمین پر جسے مصر کہتے ہیں قدم رکھا تھا تو میں ۱۸ سال کا ایک نوعمر لڑکا تھا۔ میری طرف کسی کی آنکھیں نہیں اٹھتی تھیں، مجمع میں کوئی مجھے پہچانتا نہ تھا۔ میری آواز کو کوئی فوقیت نہیں دی جاتی تھی، میرے تجربے خام تھے اور میری زندگی گھر کے خوبصورت پنجروں میں پلے ہوئے احساس تحفظ سے مگن ان پرندوں کی طرح تھی جو ہر طرح کی گرم و سرد ہواؤں سے بچے رہتے ہیں، سو میرا ماحول ممی، ڈیڈی میرے دوستوں اور کلاس کے لڑکوں اور لڑکیوں ہی تک محدود تھا۔

مگر اب؟؟ ..... میرے لیے سب کچھ تھا۔
مگر اب ایک سال کے بعد میرے چہرے پر مصر کے گرم موسم کی سیاہ فامی کی چھاپ لگ چکی تھی، تجربات نے خود اعتمادی بخشی تھی، حالات نے اہرام مصر کے پتھروں کے قلعوں تک رسائی کرا دی تھی، ان آنکھوں نے تاریخ ساز لمحات دیکھ لیے تھے، فرعون کو غرق

ہوتے دیکھا تھا، فرعون کی لاش کی ممی بنتے دیکھا تھا اور پھر سارے مصر میں اپنی شہرت کا ڈنکا بجتا دیکھا۔ مجھے قاہرہ یونیورسٹی کے شعبہ مصریات EGYPTIALOGY کا تا حیات اعزازی رکن منتخب کیا گیا تھا۔ میرے ملک نے مجھے ہاؤس آف لارڈ کی ممبری عطا کی، سرکاری خطاب دیا اور والیٔ مصر خدیو توفیق سے کئی بار ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا۔ اس ایک سال نے میرے حواس صیقل کر دیے تھے۔ میری جذبوں کو بے کراں امنگوں کے پانیوں کی نذر کر دیا تھا، ماضی کے پردے میری نظروں سے ہٹ گئے تھے، میں کیا سے کیا ہو چکا تھا۔

اور ہاں اسی قیام مصر کے دوران اشرف بیگ نے مجھے قید کیا تھا، میرے ہاتھ پیر باندھ کر آنکھوں پر پٹی باندھ کر اونٹ کا تکلیف دہ سفر کرایا تھا۔ اس کے غاروں میں ایک رات کے چند گھنٹے گزارے تھے اور وہیں اس مشفق شخص سے ملاقات ہوئی تھی جس کا نام شیخ سباعی تھا جس نے اشرف بیگ سے میری جان صرف اس جملہ پر بچالی تھی کہ

"جن آنکھوں نے ایک پیغمبر کا جلوہ دیکھا ہو ان کو گل کر دینا نیکی نہیں ہے۔"

اشرف بیگ اور اس کا گروہ مصر کی ناکام بغاوت کے بعد حجاز اور عراق کی طرف چلے گئے تھے۔ وہاں ان دنوں ریگستان میں برطانوی انجینئر نئی ریلوے لائن ڈال رہے تھے اور وہاں سے کبھی کبھی اشرف بیگ موسوی کی بازگشت سنائی دے جایا کرتی تھی۔

اب جس عراق کی طرف سرجان مارشل اور ہم کوچ کر رہے تھے وہ کیا تھا، وہ عراق کیا تھا؟ عراق تاریخ لکھنے والوں کے لیے کیسا ہے؟ دجلہ و فرات کی وادیوں میں جس قدر تاریخ بکھری پڑی ہے وہ دنیا کے اور کسی حصہ میں نہیں آئی ہے۔ عراق مورخ کی جنت ہے اور ماہرین آثار قدیمہ کی تو روح تک اس وادی میں بھٹکتی ہے۔ یہاں تاریخ ہے، ازمنہ وسطی کی تاریخ، مذاہب کی تاریخ، یہودیوں کی تاریخ، عیسائیوں کی تاریخ، مسلمانوں کی تاریخ، نوح کا طوفان یہیں آیا تھا، ابراہیم کی آگ یہیں جلی تھی، ہابیل اور قابیل کے قصہ یہیں گزرے تھے۔ اسلام کے نبی کے نواسے کا واقعہ بھی یہاں ہی گزرا تھا۔ یہاں کی تاریخ قدیم تھی، قدیم تر تھی بلکہ قدیم ترین تھی۔

باب نمبر ۲۳

اس عراق میں تقریباً سات ہزار سال قبل سونا اور سارا اور پھر حلف کی ابتدائی تہذیبوں نے جنم لیا، یہیں پر ماہرین آثارِ قدیمہ کو ارک کے تمدن کے آثار ملے، اسی عراق میں تین ہزار سال قبل مسیح کا نینوا کلچر دریافت ہوا، یہی وہ علاقہ ہے جہاں پر کش KISH، ارک، اُر، لاگاش، اک شک جیسی ابتدائی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، مکاٹر کی سلطنتیں جن میں سارگان، ارحیش، ندام سین، سیناشرب، آشربنی پال جیسے بادشاہ گزرے۔

عراق کی قدیم ترین تاریخ سے لے کر قبل مسیح لگ بھگ کے زمانے تک کی تفصیل تو علیحدہ لکھی ہے۔ اسے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دجلہ اور فرات کے پانیوں سے بنی ہوئی یہ وادی اپنے اندر کتنی عظیم الشان شخصیتوں کے جسود خاکی کو سلائے ہوئے ہے۔

عراق میں اپنے سفرنامہ کے اصل قصہ کو شروع کرنے سے قبل میں آپ کو تھوڑا بہت عراق کی وادی، اس کے ریگستان، اس کی قدیم تاریخ اور اس کے متعلق کچھ اضافی معلومات بہم پہنچانا بہتر سمجھتا ہوں۔

دریائے سندھ کے مشرق سے جو ریگستان شروع ہوتا ہے تو دریائے نیل تک صحرا ہی صحرا ہے۔ یہ ریگستان سندھ سے مصر تک ۲۳۰۰ میل چوڑا ہے اور نیل کے مشرق سے بحر اوقیانوس کے ساحل تک کا صحرا اس کے علاوہ ہے مگر سندھ سے قبل تک کے ریگستان کی ایک مخصوص اہمیت ہے کہ ازمنۂ قدیم سے اسلام آباد کے عہد تک اسی علاقہ میں تاریخ مذہب اور تہذیب کی ابتدا ہوئی ہے اور اس علاقہ کے درمیانی حصہ میں دجلہ و فرات کی وادی ہے جو خاص طور پر تاریخ کا گہوارہ رہی ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں ابتدائی انسانی تہذیب کا ارتقاء ہوا۔

دجلہ و فرات کی درمیانی وادی کا نام عراق نسبتاً ایک نیا نام ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس کا کوئی مستقل اور متحدہ نام نہیں تھا۔ یا تو یہاں شہری یا مقامی ریاستوں کے نام سے علاقوں کی شہرت تھی یا خاندانوں کی شہنشاہتوں کی بدولت جو عموماً بہت کم رقبہ پر

حکومت کرتی تھیں یونانیوں نے عراق کی وادی کو پہلی بات ایک مجموعی نام دیا اور وہ نام تھا میسوپوٹامیا۔ قدیم یونانی زبان میں اس کے معنی ہیں دو دریاؤں کی درمیانی زمین یعنی دجلہ و فرات کی درمیانی زمین

گو آج کے عراق اور یونانیوں کے اس علاقہ کے مفہوم میں جس کو انھوں نے میسوپوٹامیا کہا تھا کافی فرق ہے۔ آج اس علاقہ میں عراق، شام اور ترکی کے کچھ جنوبی حصوں اور ایران کے شمالی حصوں کا نام بھی شامل ہوتا ہے مگر درحقیقت اس وادی کا تاریخی ورثہ آج بھی زیادہ تر عراق ہی کے پاس ہے کیوں کہ اسی علاقہ میں ماہرین آثار قدیمہ نے وہ کھنڈرات کھود نکالے جن کے ذریعے وادی دجلہ و فرات کی کم و بیش پانچ ہزار سالہ تاریخ ظاہر ہوتی بلکہ تاریخ کے مطالعہ کے اس سفر میں سنگ میل ثابت ہوئی۔ یہ نشانات یا یہ شہر خود اپنے عروج کے زمانوں میں اپنی اپنی سلطنتوں کے پایہ تخت یا اہم ترین شہروں میں شامل تھے۔ گو آج کل کے معمولی قصبات سے زیادہ بدلے نہ تھے مگر ان میں جو تاریخی آثار ملے ہیں وہ اس وادی کی پوری تاریخ کے ارتقاء کی کڑیاں جوڑتے نظر آتے ہیں۔

ان گم شدہ تہذیبوں کے وارث شہروں میں اُر، اُرک، نینوا، نِپر، اگوے، بابل اور اسور، غرود خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہ سب کے سب دجلہ اور فرات کی گزرگاہوں کے قریب آباد تھے۔

دجلہ و فرات کی یہ وادی جسے یونانیوں نے میسوپوٹامیا کا نام دیا، دراصل ایک تکون کی شکل میں ہے جو عرب کے ریگستان اور ایرانی سطح مرتفع کے درمیان پھیلی ہوتی ہے۔ اس وادی کا تین چوتھائی حصہ آج کے موجودہ عراق کے پاس ہے اور ایک چوتھائی شام کے قبضہ میں ہے اس وادی کے جو علاقے ایران تا ترکی کی تحویل میں ہیں حقیقتاً جغرافیائی لحاظ سے ان کی وسعت اس وادی کے کل رقبہ کا ایک معمولی حصّہ سے زیادہ نہیں ہیں۔

اس وادی کی تہذیب کو اور اس علاقہ میں فروغ پانے والے قدیم تمدّن کو تاریخ دانوں نے مختلف تہذیبوں کا نام دیا ہوا ہے مگر ان سب کا مرکزی نام آج بھی دجلہ و فرات ہی کی تہذیب کہلاتا ہے۔ ویسے ان کے الگ الگ ناموں میں شالدین تہذیب، اسیرد بابلی تہذیب، سمیری اکادی تہذیب اور موسو پسرٹامی تہذیبوں کے نام شامل ہیں۔

ان دونوں دریاؤں کی سرزمین کے تہذیب اور تمدّنی ارتقا پر نظر ڈالنے سے قبل میں آپ کو ذرا دجلہ و فرات، کے بارے میں بھی کچھ بتاتا چلوں، دونوں دریا یعنی فرات اور

دجلہ آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ دجلہ جھیل وان کے جنوبی حصہ سے نکلتا ہے اور فرات کوہ ارارات سے۔ فرات کی کل لمبائی ۱۷۸۰ میل ہے اور دجلہ کی ۱۱۵۰ میل۔ دریائے فرات کی ابتدائی گزرگاہ بہت سے پیچ و خم کھاتی ہوئی ترکی سے گزرتی ہے مگر دجلہ فوراً ہی تورس کے پہاڑوں سے گزر کر جنوبی ریگستان کا رخ کر لیتا ہے۔ ان پہاڑوں کے قریب دجلہ اور فرات کا درمیانی واصلہ کم و بیش ۲۵۰ کا ہے۔ دریائے فرات کا ابتدائی رخ بحر روم کی طرف تھا مگر جب یہ دریا سمندر سے صرف سو میل دور رہ جاتا ہے تو اس رخ پھر جنوبی مشرقی ریگستانی حصہ کی طرف ہو جاتا ہے اور دجلہ کی گزرگاہ کی سمت بہنے لگتا ہے۔ بغداد کے قریب آ کر دونوں دریا قریب قریب بہنے لگتے ہیں کیوں کہ بغداد میں ان دونوں دریاؤں کا درمیانی فاصلہ صرف ۲۰ میل رہ جاتا ہے۔ مگر بغداد سے پھر ان کا رخ ادھر اُدھر مڑ جاتا ہے اور یہ بصرہ سے ساٹھ میل دور قرنا تک ایک دوسرے نہیں ملتے۔ قرنا میں یہ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں جہاں ان کا ڈیلٹا شط العرب کہلاتا ہے اور یہاں سے یہ دونوں دریا ساٹھ میل تک ساتھ ساتھ بہہ کر سمندر میں گر جاتے ہیں۔

شمال میں ان کی گزرگاہ چونے کے پتھروں کے راستے میں ہے جہاں ہزاروں سالوں سے ان کی گزرگاہ تبدیل نہیں ہوئی ہے مگر جنوب کے میدانی علاقوں میں فرات اور دجلہ جگہ جگہ اپنی چھوٹی چھوٹی شاخیں بنا لیتے ہیں جو قدرتی آبپاشی کی نہروں اور آبی گزرگاہوں کا کام دیتی ہیں اور یہ گزرگاہیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں اور زمانۂ قدیم میں ان گزرگاہوں کے قریب آباد شہر دریا کی شاخوں کے بہاؤ کے ساتھ بنتے اور بگڑتے رہتے تھے یعنی دریا کی گزرگاہ بنی تو بستیاں آباد ہونے لگیں اور پھر یہ آبادیاں دریا کی ان شاخوں کے بدلتے ہی ویران اور بے آباد ہو جایا کرتی تھیں جواب ماہرین آثار قدیمہ کھود کھود کر نکال رہے ہیں۔

دریائے فرات اور دجلہ کی وادی ایک ریگستانی وادی ہے۔ جہاں جہاں دریاؤں کی لائی ہوئی زرخیز مٹی کی تہہ بنیں ہیں، وہاں کنکریلے پتھروں کی سخت زمین ہے، وہاں چھوٹی چھوٹی کچی مٹی کی پہاڑیاں یا سفید لائم اسٹون کی اونچی نیچی پہاڑی ٹکڑیوں کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ دور دور تک گھاس کا ایک تنکا تک نہیں اُگتا نظر آتا۔ گرمیوں میں یہاں کا درجہ حرارت عموماً ۱۲۰ درجہ کے لگ بھگ رہتا ہے۔ راتیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں مگر دن حد درجہ گرم، سال بھر میں بارش کا اوسط دو یا تین انچ سے زیادہ نہیں ہوتا، فصلوں میں جو، مکئی، جوار پیدا ہوتے ہیں کبھی کبھی کپاس اور گندم بھی کاشت ہوتی ہے پھلوں میں کھجور سب

سے اہم پھل شمار کیا جاتا ہے۔
یہاں زمانہ قدیم سے کاشت کے دو تین طریقے رائج ہیں، یا تو چڑھتے ہوئے دریا کے کنارے سے اُبل نکلنے والے پانی کو بڑی بڑی جھیلوں، تالابوں اور گڑھوں میں بھر لیا جاتا ہے جس کو سال بھر استعمال کیا جاتا ہے یا پھر چھوٹے موٹے بند باندھ کر چھوٹی چھوٹی شاخیں دریا سے کاٹ لی جاتی ہیں یا اب موجودہ زمانے میں ان کی جگہ نہریں کھود لی گئی ہیں جن کے ساتھ ہی ساتھ سیم اور تھور کی لعنت بھی بڑھتی چلی گئی ہے اور ایک پرانا طریقہ آبی گزر گاہوں کے قریب کنویں کھودنے کا ہے جس سے پانی کھیتی باڑی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔
عراق کا کسان مصر یا سندھ کے کسان سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ وہی سیاہی مائل رنگت، گھری دار پھیلا ہوا لباس، سر پر پگڑی یا دھوپ سے بچاؤ کا کوئی کپڑا اور کھرے نقوش کا چہرا، طبیعت میں گرمی اور سخت محنت سے جی بچانا اور زیادہ وقت کو مجلسی خوش گپیوں میں ضائع کر دینا اس کا وطیرہ تھا ہمیشہ سے ہی اس کے سب سے زیادہ جھگڑے زمین اور پانی پر ہی ہوتے رہے ہیں۔ موسم کی سختیوں نے اسے زیادہ جاندار اور جفا کش بنا دیا ہے۔ اعصاب کی قوت برداشت اور گفتگو کی گرم مزاجی اس کے کردار کا خاصہ ہیں۔ یہ خاندان کے سربراہوں کی قیادت میں قبیلوں کی شکل میں رہتے آئے ہیں خون کے رشتے اور قبیلوں سے وفاداریاں مسلم ہیں۔ قبیلہ کے ایک فرد کی تکلیف پورے قبیلہ کی اجتماعی اور انفرادی ذمہ داری جو قبائل زرخیز زمینوں پر آباد ہو جاتے تھے ان میں خانہ بدوش کا تمدن ختم ہو جاتا تھا اور ان کی زندگی نسبتاً آباد کاروں جیسے تمدن کی طرف مائل ہو جاتی تھی۔ اس قدیم دور میں زندگی کے یہی دو عنوان تھے۔ صحرا میں پانی کی تلاش، اور اگر وافر مقدار میں پانی مل جائے تو اس علاقے کی حفاظت اور اس کا دماغ تیزی سے کام کرتا تھا۔ دریاؤں کے قریب کی آبادیاں کچی مٹی کے گارے سے بنائی ہوئی اینٹوں پر تعمیر ہوتی تھیں اور جو آبادیاں بالکل ہی ساحل پر تھیں ان میں دریائی گھاس پٹھے اور کھجور کی شاخیں استعمال کی جاتی تھیں۔
چونکہ زرخیز وادی کے علاقوں میں آبادیاں قائم ہو جاتی تھیں اس لیے دوسرے خانہ بدوش قبائل ان علاقوں پر قابض ہونے کی تمنا کیا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ آباد علاقوں میں بھی مستقل طور پر دفاعی جنگوں کی تیاری موجود رہتی تھی۔ دوسری طرف ان کے مخالف خانہ بدوش یا نسبتاً کم ذرائع والے جنگجو قبائل ہمیشہ ان کی زرخیز وادیوں، کھلیانوں،

کاروانوں پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ یہ حملہ عموماً عرب کے ریگستونوں میں بسنے والے بدوخانہ بدوشوں کی طرف سے وادی دجلہ وفرات کے شہروں پر ہوتے رہتے تھے۔

عراق کے شمال میں پہاڑی علاقہ جو کردستان کے سلسلے کہلاتے ہیں بارش کے معاملے میں زیادہ خوش قسمت ہیں یہاں سالانہ اوسط ۱۲ سے ۲۵ انچ تک ہے اور ان پہاڑوں کی بلندیاں ۸ ہزار فٹ سے لے کر گیارہ فٹ تک ہیں۔ ان پہاڑوں پر برفباری بھی ہوتی ہے اور ڈھلوانوں پر بڑے شاداب جنگلات بھی ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں کوہ کوزھراس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے گورس کا پہاڑی سلسلہ بھی اسی کا حصہ بن جاتا ہے یہ وہ علاقہ ہے جو ایران کن وادی عراق سے علیادہ کرتا ہے یہاں پر دریائے دجلہ کی چار چھوٹی چھوٹی معاون ندیاں بہتی ہیں جو زاب حقیر، زاب کبیر، دیالہ اور عظیم کے نام سے مشہور ہیں۔ اس علاقے میں زیتون، انگور اور مختلف قسم کے پھل، دیوار اور چیر کے جنگلات پائے جاتے ہیں۔ شمال سے جنوب کی طرف جیسے جیسے بڑھتے ہیں بارش کا اوسط کم ہوتا جاتا ہے۔ مگر ان علاقوں میں سر سبز چراگاہیں بڑی افراط میں ہیں یہاں زمانہ قدیم سے مویشی پائے جاتے ہیں۔ بکری بھیڑ، گائے بیل اور گھوڑوں کی افزائش نسل کے لئے یہ علاقہ بہت موزوں ہے۔ اس علاقے میں جن کو ترائی کا علاقہ سمجھنا چاہئے، جنگلی سور، ریچھ بھیڑیئے، شیر اور مختلف قسم کے درندے اور جنگلی جانور سب ہی مل جاتے تھے اور آج بھی یہ علاقہ بہترین شکار گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

عراق کے شمال میں پہاڑی سلسوں ہی میں۔۔۔۔ کا وہ پہاڑ ہے جس سے دریائے فرات نکلتا ہے۔ یہ پہاڑ ۱۱ ہزار فٹ تک بلند ہے اور یہی وہ پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر حضرت نوح کی کشتی کے ٹکڑے دریافت ہوتے ہیں جو روسیوں نے دریافت کئے ہیں اور جس پر عبرانی کی قدیم زبان میں اسلام کی برگزیدہ ہستیوں کے نام ملتے ہیں جس کا ذکر آپ بعد میں پڑھیں گے۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ طوفان نوح میں پانی کی بلندی ۱۱ ہزار فٹ کے بلند پہاڑ تک کو ڈبو چکی تھی اور یہ طوفان عراق ہی کہ ایک چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہوا تھا۔

زمانہ قدیم میں شمالی عراق اور جنوبی عراق کی سلطنتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے دست و گریبان رہیں اور قریباً ۲ ہزار سال قبل مسیح کی دو سلطنتیں شمال میں سمر اور مکانڈ جن کا پایہ تخت زیادہ تر بابل رہا اور جنوب میں اسیریاتی سلطنت کی تاریخ اس قسم کے جنوبی اور

شاہ حکومتوں کے معرکوں سے بھری ہوتی ہے۔

عراق میں قدیم ترین شہروں کی کھدائی کی گئی ہے ان میں ہاری، نینوا، نمرود، کرکیش، سپر، شروک، اُرک اور اُر وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ عراق میں بے شما آثار قدیمہ کے نشانات ہیں جن کو قلہ کہتے ہیں۔ عربی میں اسی لفظ سے اردو میں لفظ ٹیلہ بنا ہے۔ یہ نشانات دسیوں، بیسیوں نہیں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں دریافت ہو چکے ہیں اور ان ٹیلوں کی کھدائی سے جو ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے، ہڈیوں، مٹی یا تانبہ اور لوہے کے مختلف گلاس، صراحی۔ بٹہ، ترازو، چاقو، جام، عطردان، اوزار، پلٹ اور گھڑے، رکابیاں، اناج اسٹور کرنے کے بڑے مٹکے، سیل اور گھریلو استعمال کی مختلف اشیاء ملی ہیں ان سے عراق میں بہت سے تہذیبی ادوار کا پتہ چلتا ہے جو مختلف وقتوں میں بنتے اور بگڑتے رہے ہیں۔

عراق کا سب سے اول تہذیبی دور، دورِ اُرک کہلاتا ہے جو قریب قریب تین ہزار سال قبل مسیح اختتام پذیر ہو گیا تھا۔ یہ دور، اُرک دور اس لیے کہلاتا تھا کہ اس تمدن اور تہذیب کے نشانات سب سے پہلے اُرک کی کھدائی کے دوران ملے تھے۔ یہاں سے ملنے والے مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے عموماً سادہ اور کسی نقش و نگار کے بغیر تھے۔ بعد کے ادوار میں ان پر رنگ برنگی گلکاریاں ہونے لگی تھیں۔ اس طرح ان ادوار کی درجہ بندیاں کی جاتی ہیں اور ان کے سال بھی متعین کیے جاتے ہیں۔

یہاں میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ آثارِ قدیمہ میں کسی زمین سے دریافت ہونے والی چیز کی عمر کا پتہ کیسے چلتا ہے۔ سائنس کی ترقی کی بدولت تاریخ داں اس قابل ہو گئے ہیں کہ قریب قریب ~~چھ ہزار سال تک کی~~ قدیم چیز کی عمر کا بالکل صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ سائنس کے اس فارمولے کا نام "ریڈیو کاربن ۱۴ کا اصول ہے۔ جسے شکاگو کے ایک سائنس داں ڈبلیو۔ ایف لیبی نے موجودہ صدی (۱۹۴۶ء) میں مکمل کیا۔

اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ یہ ہر نشو و نما پانے والی چیز میں جن میں انسان، جانور، درخت، سب ہی شامل ہیں۔ کاربن کی موجودگی لازمی ہوتی ہے اور اس کاربن کا اٹمی وزن ۱۲ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں کاربن کا تابکاری آئیسوٹوپ جس کا اٹمی وزن ۱۴ ہے بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ تابکار آئیسوٹوپ ۱۴ فضا کی بالائی حصہ میں سورج کی شعاعوں کے نائٹروجن گیس سے ملنے سے بنتا ہے اور یہ دونوں قسم کے کاربن زمین پر گرتے رہتے

ہیں۔

کاربن کے یہ ذرات پہلے درختوں اور پودوں میں حلول کرتے ہیں اور پھر ان کے ذریعے جانداروں میں سرائیت کر جاتے ہیں مگر کاربن ۱۴ اور کاربن ۱۲ کا تناسب ہر جاندار میں ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔

کسی بھی جاندار کی موت کے بعد اس کا جسم کاربن ۱۴ کو جذب نہیں کرتا بلکہ کاربن ۱۴ کا جو حصہ اس مردہ جسم میں موجود رہ جاتا ہے وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ کاربن نائٹروجن میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ۵۷۳۰ سال کے بعد ایک مردہ جسم میں کاربن ۱۴ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح جس چیز کی بھی عمر معلوم کرنی ہو اس میں کاربن میتھڈ سے صرف یہ جانچنا ہوتا ہے کہ اس میں کاربن ۱۴ کی کس قدر مقدار باقی رہ گئی ہے۔ یہ طریقہ کار لکڑی، ہڈی، گھونگا، جلی ہوئی اشیاء انسانی اور حیوانی ڈھانچوں میں یکساں آزمایا جا سکتا ہے اور ... کی عمر معلوم کی جا سکتی ہے اس طریقے سے کسی بھی دریافت کی ہوئی تاریخی چیز کی بالکل اصلی عمر دریافت کی جا سکتی ہے یہ طریقہ اب عام طور پر مستعمل ہے اور ہر ماہر آثارِ قدیمہ اس کی صحت کو تسلیم کرتا ہے۔

آئیے عراق کے تہذیبی اور قدیم تاریخی ورثہ پر نظر ڈالنے سے پہلے ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ عراق کی تاریخ کو کھنگالنے اور دریافت کرنے میں کس کس ماہرِ آثارِ قدیمہ نے کب کب خدمات انجام دیں۔

عراق میں آثارِ قدیمہ کی دریافت کی ابتدائی کوشش ۱۷۸۶ء میں فرانسیسی ماہر جوزف ڈی بیوسٹمپ نے کی تھی اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ملازم نے جس کا نام کلاڈیس جیمس رچ تھا اور جو کمپنی کی طرف سے بغداد میں بطورِ ریذیڈنٹ تعینات تھا عراق میں مختلف مقامات کی کھدائی میں حصہ لیا جو ۱۸۰۷ء میں شروع کی گئی تھی۔

ان دو ماہرین کے بعد مندرجہ ذیل تاریخ دانوں نے بھی عراق میں کھدائیاں کرائیں اور مختلف آثار برآمد کیے جس سے عراق کی قدیم تاریخ کی گرہیں کھلتی چلی گئیں۔

سر جیمس بکنگھم	۱۸۱۶
رابرٹ مگنن	۱۸۲۷
جیمس بیلی فریسر	۱۸۳۴
سر ہنری کرس وائیک	۱۸۸۰-۹۵

پال ایمل بوٹا	۱۸۴۳	ایسرتین کے آثار دریافت کیے۔
سر ہنری لیارڈ	۱۸۴۵	نمرود اور نینوا دریافت کیے۔
ارنسٹ ڈی سارزی	۱۸۷۷	سمیریوں کی تہذیب دریافت کی۔
سر چارلس ولی		بیسویں صدی کے شروع میں اُرک میں دریافتیں کیں۔

اس کے علاوہ تاریخ میں ماہرین آثارِ قدیمہ میں گروٹے فنڈ کا نام بھی مشہور ہے کیونکہ اس نے پہلی بار پرسی پولس اور اُر کے کھنڈرات سے نکلنے والی مٹی کی اینٹوں پر کھدی ہوئی تصویری زبان کو پڑھنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ قدیمہ فارسی زبان کی ایک بالکل ابتدائی شکل تھی یہی زبان جنوبی عراق میں بھی پائی جاتی تھی۔

عراق کے آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا تذکرہ رالن سن کے نام کے بغیر نامکمل سا لگتا ہے کیونکہ یہی وہ باہمت اور پاگل پن کی حد تک مستقل مزاج شخص تھا جس نے ۱۸۳۵ء سے ۱۸۴۴ء تک جنوبی عراق میں بلکہ مغربی ایران کے اونچے پہاڑوں پر داریوش اعظم کے عہد کی کندہ کی ہوئی عبارت کو چٹانوں سے نقل کیا۔ یہ چٹانیں اس قدر خطرناک گھاٹیوں اور زاویہ قائمہ کی طرح کی عمودی صورت میں موجود تھیں کہ ان پر قدم جمانا اور ٹھہر جانا بھی ناممکن تھا اور ان تمام سالوں میں ہر لحظہ اس کی جان کو خطرہ لاحق تھا کہ اگر ذرا بھی بے احتیاطی ہو جاتی ہے یا توازن بگڑ جاتا تو ہزاروں فٹ گہری کھائی میں اس کی قبر بن جاتی۔

رالن سن اور اس کے ہمعصر فرانسیسی جیولس اوپرٹ اور ایک برطانوی ماہر ایڈورڈ ہنکس نے مل کر عراق کی مختلف تحریری زبانوں کو جن کو بابلی، اسیری یا اکاڈین زبان کہا جاتا ہے، پہچان لیا تھا اور اس کے مفہوم سے آگاہی حاصل کر لی تھی۔

ہم لوگ یعنی سرجان مارشل، میں اور روسی وغیرہ جن دنوں عراق پہنچے تو ایک جرمن ماہر آثارِ قدیمہ سر رابرٹ کالڈیوی بابل کی کھدائی میں مصروف تھے۔ سرجان مارشل اپنے اس ہم عصر کی بے حد عزت و توصیف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کالڈیوی عصر حاضر کا ایک بے حد مشہور ماہر آثارِ قدیمہ ہے اور کچھ عجب نہیں کہ وہ بابل کی اصل تاریخ کو واقعی ڈھونڈ نکالے۔ جب ہم عراق پہنچے تو کالڈیوی واقعی بابل کی چھپی ہوئی اور سینکڑوں سالوں سے ہزاروں ٹن مٹی کے نیچے دبی ہوئی تصویر کو برآمد کر چکا تھا۔ عراق ہی میں سرجان کے دوسرے دوست سرجان وولی بھی بڑی مستقل مزاجی سے اُرک میں کھدائی اور تحقیقاتی

کاموں میں مصروف تھے۔

بابل کی طرف نظر ڈالنے سے قبل یہ سمجھیے کہ عراق ہی میں انسانی تہذیب کے ارتقاء کی اولین شکل میں ظاہر ہوئی ہے اور یہ دریافت جرمو نام کے ایک کھنڈر سے ہوتی ہے جس کے قریب قریب تین اور ٹیلے بھی دریافت ہوئے تھے۔ پہلا کھنڈر جس کی کھدائی کی گئی شاپندار کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرا اکرم شہر کے نزدیک ہے، تیسرے کا نام میلاغات ہے جو کرکوک کی شاہراہ پر واقع ہے اور چوتھا جرمو کے کھنڈرلت کے نام سے مشہور ہے، چاروں بستیاں بالکل ابتدائی دور کی ہیں۔ مگر جرمو کے آثار قریب قریب چھ ہزار پانچ سو سالہ قبل مسیح کے قدیم دور سے متعلق ہیں، یہ بستی اگرچہ چھوٹی تھی لیکن اس میں جو اشیاء برآمد ہوئیں وہ بہت ہی اہم اور قیمتی تھیں کیونکہ جلے ہوئے گندم اور جو کے دانے اور پالتو جانوروں ہڈیاں، ہڈیوں کے بنے ہوئے چاقو اور چھرے، کلہاڑی نما اوزار وہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس دور میں عراق کی ان بستیوں میں رہنے والے زرعی کاشتکاری اور گلہ بانی کے دور میں داخل ہو چکے تھے اور یہاں فینولیتھک تہذیب شروع ہو چکی تھی۔ یہ وہ عہد ہے جس کی عمومی تاریخ ہمارے پاس نہیں ہے البتہ پانچ ہزار سال قدیم میں ہمیں شمالی عراق میں مسونا اور سارا اور پھر اس کے پانچ سو سال بعد حلاف اور پھر عبید کی سلطنتیں نظر آتی ہیں، ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح سے لگ بھگ شمالی عراق میں گاوارا تہذیب اور جنوبی عراق میں اُرک تہذیب کے آثار نظر آتے ہیں اور پھر تین ہزار ق۔ م میں نینوا تمدن کی ابتدا ہوتی ہے جس میں رسم الخط کی کچھ شعوری کوششیں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس دور میں الفاظ تصویروں کی بجائے ایک مخصوص انداز میں بنائے جانے لگے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سرسبز میدانوں اور پانی کی تلاش میں ریگستان میں پھرنے والے خانہ بدوش افراد نے جتھوں کی صورت میں چھوٹی چھوٹی بستیاں بنا کر رہنا شروع کر دیا تھا۔ اس دور میں گلہ بانی بھی شروع ہو چکی تھی، گندم جو اور جوار غالباً کپاس کی کاشت بھی ہونے لگی تھی۔ مویشی پالے اور سدھائے جا چکے تھے ان سے دودھ اور غذا اور زراعت کا بھی کچھ کام لیا جانے لگا تھا۔ مکانات کچھ مٹی کی بنائی ہوئی اور دھوپ میں سکھائی ہوئی مٹی کی اینٹوں سے بنائے جانے لگے تھے اور درختوں کی شاخوں سے چھتیں پاٹی جانے لگی تھیں۔ یہ انسانی تہذیب کے ارتقاء کا گویا ابتدائی زمانہ تھا جو پانچ ہزار سال قبل مسیح سے ۳۵۰۰ ق م تک کے زمانے پر محیط ہے۔

اور پھر انسانی تہذیب نے کچھ اور سماجی شعور حاصل کیا۔ بستیاں چھوٹے چھوٹے شہروں میں تبدیل ہونے لگیں ان شہروں کی آبادی کی بنیاد سرسبز علاقہ اور وافر پانی کی وصولیابی تھا۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ان آبادیوں پر خانہ بدوشوں کے حملوں کے بھی مستقل خطرات منڈلاتے رہتے تھے۔ ان خطرات کے دفاع کے لیے فوجی تنظیمیں بننا شروع ہوئیں۔ قبیلوں اور بستیوں کے راجہ اور سردار اور سپہ سالار نے مذہبی رسومات کی تیاریوں اور ادائیگیوں کے لیے مذہبی پیشوا اور رہنما بھی متعین ہونے لگے اور اس طرح انسانی معاشرہ میں راجہ، پرجا، فوج، مذہبی پیشوا، سپہ سالار اور دیگر عمال کے عہدے پیدا ہونے لگے۔

ایک طرف انسانی ہدیب کی ترقی ہوتی گئی اور دوسری طرف انسانی تاریخ بنتی گئی۔ انسانی مذاہب کے خاکے اُبھرنے لگے۔ مذہب انسان کی ضرورت بن گیا تھا کیونکہ مظاہر فطرت اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ انسان کو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کیوں مرجاتا ہے اور مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے۔ ان سوالوں کے جواب میں اس نے اپنی عقل سمجھ کے مطابق بہت سے دیوتا بنائے۔

عراق میں مختلف سلطنتوں میں خصوصاً سمیریوں اور اسیریوں میں جو بہت سے دیوتا بنائے گئے تھے وہ یہ تھے۔

نین اُرتا	جنگ کا دیوتا
اُوتو	سورج دیوتا جو اندھیرے کے خلاف تھا۔
نین ہرساگ	مادر دیوی جو تمام انسانوں کی ماں تھی اس کو اشتر دیوی بھی کہتے تھے۔
انانا	محبت کی دیوی
دوموزی	سبزے اور درختوں کا دیوتا
ان لیل	فضاؤں اور آسمانوں کی قوت کا دیوتا
ان کی یا عنقی	یہ سمیریوں کا عظیم دیوتا کہا جاتا تھا۔
مردوک یا مردوقش	ہواؤں کا دیوتا۔

(بعض کہانیوں میں مردوک (مردوقش) کو ان لیل کے مساوی دیوتا مانا گیا ہے۔
مردوک بابل کا دیوتا تھا اور تمام بادشاہوں اور بابل کے راجہ، مہاراجہ سب ہی مردوک کو سب

سے بڑا دیوتا مانتے تھے)

آشور اسیریوں کا قومی خدا بھی یہی تھا۔

ان دیوتاؤں کے ناموں سے زمینوں، آسمانوں، ہواؤں اور جگہوں اور فضاؤں کے قصہ کہانیاں مشہور تھیں ان کے بارے میں منظوم خیالات پیش کیے جاتے تھے۔ مثلاً ایک جگہ کہا جاتا ہے۔

"فقط دیوتا ہی سورج کی دھوپ میں باقی رہ سکتے ہیں اور انسان؟ تو اس کے تو گنتی کے چند دن ہیں اور انسان جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے وہ کیا ہے، ہوا کا ایک جھونکا جس پر اس کا کوئی قبضہ نہیں رہتا....."

ایک جگہ انسان کی تخلیق کے بارے میں مردوقش دیوتا کہتا ہے۔

"میں ایک حیوان کو انسان میں بدل دوں گا یہ جنگلوں میں رہنے والا جانور آدمی بنا دیا جائے گا اس کے ذمے دیوتاؤں کی خدمت کرنا ہوگی اس لیے کہ دیوتا اپنے کام بانٹ کر آرام سے رہ سکیں......"

ایک بابلی نظم میں عقل کے خدا کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"آسمانوں کے خداؤں کی مرضی کو کون جانتا ہے؟ کون جانتا ہے کہ ان کی عقل اس دنیا کے لیے کیا سوچ رہی ہے۔ فانی انسانوں نے دیوتاؤں کے طریقوں کو کب سمجھا ہے؟

جو انسان کل تھا آج کہاں ہے؟

وہ آج رو رہے ہیں۔

دیوتاؤں کے ان منصوبوں ہی سے دیوتاؤں سے خوف کھانا سیکھو۔"

ان قدیم قصوں میں ہمیں یہ بھی ایک تصوّر ملتا ہے کہ انسان فانی کب بنا۔ یہ قصہ بھی "ادایا" کے واقعہ میں موجود ہے۔ "عنقی دیوتا نے اپنی خدمت کے لیے ایک جنگلی جانور کو اس کا روپ بدل کر اسے انسان بنا دیا جس کا نام ادایا رکھا گیا۔ ادایا کا اصل کام دیوتاؤں کے لیے خوراک جمع کرنا تھا۔ ایک دن جبکہ ادایا سمندر سے مچھلیاں پکڑ رہا تھا تو جنوب کی ہواؤں کا شیطان وہاں آگیا اور ان ہواؤں نے ادایا کی کشتی الٹ کر پانی میں پھینک دی۔ اس پر ادایا کو بھی غصہ آگیا اور اس نے جنوب کی ہواؤں کے شیطان کو بددعا دے دی جس کے بعد زمین پر جنوبی کی ہوائیں چلنا بند ہو گئیں۔ یاد رہے کہ یہی ہوائیں جو آج بھی عراق میں سردیوں کی تھوڑی بہت بارش کا سبب بنتی ہیں جن سے کاشت میں مدد ملتی ہے

اور گرمیوں میں انہی جنوبی اور مشرقی ہواؤں کی بدولت کھیتوں میں غلہ پکتا ہے۔
چنانچہ جب ہوائیں نہ چلیں تو غلہ بھی نہ پک سکا اب آنو دیوتا کو ادایا پر غصہ آیا اور اس نے ادایا کو اپنے دربار میں طلب کر لیا۔ یہاں ادایا کی مدد عنقی دیوتا نے کی جس نے اپنی خدمت کے لیے اسے انسان کا روپ دیا تھا۔
عنقی دیوتا نے ادایا کو بتایا کہ آنو دیوتا کے دربار کے دروازے پر دموزی دیوتا (جو زراعت اور سرسبزی کا دیوتا تھا) ملے گا اگر ادایا اس کو خوش کر دے گا تو آنو دیوتا بھی خوش ہو جائے گا مگر اس منصوبہ کے ساتھ ہی عنقی دیوتا نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جب آنو دیوتا تجھے کھانے اور پینے کے لیے کچھ دیں تو وہ نہ کھانا نہ پینا کیونکہ موت کا کھانا ہوتا اور موت کا پانی ہو گا۔
ادایا کے ساتھ سب کچھ اسی طرح ہوا جیسا کہ عنقی دیوتا نے کہا تھا۔ بجز اس کے کہ دموزی دیوتا کی دوستی اور سفارش کی وجہ سے آنو دیوتا بھی ادایا کا دشمن نہ رہا اور اس نے ادایا کو موت کا پانی اور موت کا کھانا دینے کی بجائے زندگی کا کھانا اور زندگی کا پانی دیا جسے ادایا نے عنقی کی ہدایت کے بموجب نہ کھایا نہ پیا۔ اگر ادایا یہ تحفہ لے لیتا تو وہ امر ہو جاتا اس کی موت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی مگر اس نے زندگی کے یہ تحفے اپنی نا سمجھی سے رد کر دیے جس کی وجہ سے وہ فانی ہو گیا تب آنو دیوتا نے غصہ سے کہا
"....اسے فانی بنا کر زمین پر واپس کر دو۔"
اور اس طرح ادایا یعنی انسان کو اس کے بعد سے موت کا ذائقہ چکھنا ضروری ہو گیا۔

باب نمبر ۲۴

قدیم عراق کے یہ خدوخال واضح کرنے کے بعد اب میں پھر اپنے اور سر جان مارشل کے سفر کی طرف لوٹتا ہوں۔ عراق میں دراصل ہماری منزل اُرک تھی۔ یہ ایک ٹیلہ تھا جہاں سر جان مارشل کے ایک ہم عصر دوست آثارِ قدیمہ کی کھدائی کر رہے تھے۔ ہمارا قیام یہاں چند دن کا تھا ہم انہی کی دعوت پر "اُرک" پہنچ رہے تھے اور پھر وہاں سے ہمارا ارادہ بابل کی طرف جانے کا تھا۔

اُرک میں سر جان مارشل کے دوست سر چارلس وولی کھدائی کر رہے تھے۔ انہوں نے کچھ عظیم دریافتیں بھی کر لیں تھیں اور سر جان مارشل کو اپنی دریافتیں دکھانا چاہتے تھے اور ان سے کچھ مشورہ بھی کرنا چاہتا تھے۔

اُرک کے متعلق ہمیں بعد میں سر چارلس وولی نے بہت کچھ بتایا تھا۔ ہم پہلے سکندریہ سے بصرہ پہنچے اور پھر وہاں سے اُرک گئے۔

عراق میں بصرہ پہنچ کر ہمیں وہاں سے ۱۲۰ میل دور شمال کی طرف لے جایا گیا۔ بغداد ریلوے جو ان دنوں نئی نئی بچھائی گئی تھی ایک اسٹیشن پر آ کر رکی جس کا نام اُرک تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا جس کی چاروں طرف خشک جھاڑیاں اور ریت کے پہاڑ پھیلے ہوئے تھے۔ اس اسٹیشن پر علاوہ اسٹیشن ماسٹر کے ایک چھوٹے سے کمرے کے اور برابر میں بنے ہوئے عملے کے دو کمروں کے اور کچھ نہ تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا کیبن تھا جس میں چائے اور بسکٹ اور کھجوریں مل جاتی تھیں۔ کچھ دور پر جنگلی جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں اور تیز چمکتی ہوئی دھوپ میں ریگستان کے ہر ذرہ سے سورج طلوع ہوتا نظر آتا تھا۔ اتنے سارے ذرات کے انعکاس سے دھوپ کی تمازت اور حدت اپنے شباب پر پہنچ گئی تھی۔ ریلوے لائن کے دونوں طرف ہی بے آباد چٹیل صحرا پھیلا ہوا تھا اور دور دور تک اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ علاوہ ایک مٹی کے سرخ ڈھیر کے جو اسٹیشن سے قریباً ۷۲ میل کے فاصلے پر تھا۔ سرخ مٹی کا یہی ٹیلہ ہماری منزل تھا۔

اس ٹیلہ کے قریب ہمیں دو کمرے بنے ہوئے نظر آئے جو ایک میوزیم نما عمارت

تھی۔ اس ٹیلے کے ادھر اُدھر چند صحرائی بدو ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ ان کے اونٹ اسی ٹیلے کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے اور صحرائی لوگ اسٹیشن سے پانی لے کر آ رہے تھے۔ جہاں کئی کئی دن کی ضرورت کا پانی ریلوے کے ذریعے لایا جاتا تھا۔

یہاں ہماری ملاقات سر چارلس وولی سے ہوئی جس کی دعوت پر ہم لوگ یہاں آئے تھے، انھوں نے بڑے پرجوش انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا۔

یہ بے آباد ٹیلہ جو آج ریگستانی طوفان میں اٹا ہوا صحرا کی وسعتوں میں حقیر نظر آ رہا تھا دراصل وہ شہر تھا جہاں حضرت ابراہیم کے والد کی رہائش تھی اور یہی وہ جگہ تھی جہاں کے بت تراش بہت مشہور تھے۔ حضرت ابراہیم کے والد اس جگہ ہی سے ہجرت کر کے ہران اور کنعان جا کر آباد ہو گئے تھے۔ یہ ٹیلہ اُرک کے شہر کا بچا کھچا سرمایہ تھا جسے حال ہی میں دریافت کیا گیا تھا۔ اُرک سے ذرا فاصلے پر ایک اور ٹیلہ تھا جس کا نام اُرک تھا یہ بھی بہت اہم جگہ تھی اس شہر کی کھدائی کے بعد جو سب سے نمایاں عمارت دریافت ہوئی وہ ایک چوکور مینار تھا جو اینٹوں سے بنایا گیا تھا جو ہر طرف سے ۱۲۰ فٹ طویل تھا اور پچھتر فٹ اونچا تھا۔ اس کی چھت پر سونے اور چاندی کی ملمع کاری کی گئی تھی۔ اُرک کے اطراف میں آباد زمینیں تھیں جن میں جو، جوار کی کاشت ہوتی تھی یہاں کے باغوں میں کھجور اور انجیر کی بہتات تھی اور دور دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقہ میں آبپاشی نہروں کے ایک جال سے ہوتی تھی۔ یہ نہریں فرات سے نکالی گئی تھیں۔ یہ شہر اُرک سیری تہذیب و تمدن کا ایک مرکز تھا اس میں دولت اور قوت کے خزانے محفوظ تھے۔ طاقت ور فوجیں اس شہر کی حفاظت کرتی تھیں اور قرب و جوار کے مہم جو اور قسمت آزما اس طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی جرات نہیں کرتے تھے۔

انگریزوں نے جب سے عراق میں اپنی عمل دخل بڑھایا انھوں نے اکثر جگہ کھدائی کر کے زیر زمین سونے چاندی کے زیورات اور دولت کی تلاش شروع کر دی۔ دجلہ اور فرات کی وادی جو آج بھی عراق کی زرخیز زمین ہے ہمیشہ سے قدیم تہذیب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس وادی کے اس علاقے میں جب ایک بار چند انگریز فوجی بصرہ سے نکل کر صحرائی ہرن کے شکار کے لیے گھوڑوں پر تھوڑی بہت کھدائی ہی سے ان کو یہاں سونا چاندی ملنے لگا۔ انھوں نے مینار سے سونا نکالا، کچھ سونے چاندی کے علاوہ یہاں سے مختلف اشیاء اور ظروف بھی مشہور کہیں۔ اب کیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے ہر فوجی چھٹی کے دن غزالوں کے شکار کو

جانے لگا، مینار کی شکست و ریخت ہونے لگی اور اس کی کھدائی جاری رہی۔ ادھر عربوں نے بھی اس طرف کا رخ کیا اور جاہل بدو اس مینار سے اینٹیں اُٹھا اُٹھا کر لے آتے تھے اور اپنے گھر بناتے تھے۔ ان میں سے اکثر اینٹوں پر کسی مخصوص قسم کے رسم الخط کی تحریریں تھیں جو سب کی لاعلمی اور صحیح حفاظت نہ ہونے کی وجہ سے برباد ہو گئیں۔

اس مینار کی خبریں جب برطانیہ پہنچیں تو وہاں کے ایک مشہور ماہرانہ آثارِ قدیمہ سر چارلس وولی نے ادھر کا رخ کیا اور یہاں آ کر پڑاؤ ڈالا۔ انہی کی وجہ سے اُرنک ریلوے لائن آئی۔ انھوں نے اُر اور اُرک دونوں جگہ پر تقریباً چھ سال تک قیام کیا۔ اس مینار کے گرداگرد کے ٹیلے کو چاروں طرف سے ناپا اور پھر اس کی کھدائی کی جغرافیائی حدود متعین کیں۔ تب اس کی کھدائی شروع کی۔ حکومت برطانیہ نے ان کی بڑی بھرپور مدد کی۔ ان کو مالی امداد کے علاوہ حکومت ترکی سے مخصوص مراعات دلوائیں اور ان کے بچوں اور گھر والوں کی کفالت کا ذمہ لیا تاکہ سر چارلس وولی دل جمعی سے اپنا تحقیقی کام جاری رکھ سکیں (یہ کھدائی بعد میں ۱۹۲۸ء میں ختم ہوئی) جیسے جیسے کھدائی کا کام بڑھتا گیا ویسے ویسے ہی تاریخی علم کا دامن بھرتا گیا۔

اُر کے مینار کے چاروں طرف مندر اور عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ تعداد میں پانچ تھیں۔ ان عبادت گاہوں سے ذرا باہر کی طرف ایک پورا شہر آباد تھا۔ گلیاں عمارتیں، چوراہے، مکان سب ہی نکلتے چلے آئے۔ یہ شہر نہایت نفیس، باضابطہ تعمیر کیا ہوا اور نہایت عمدہ گلیوں اور سڑکوں والا شہر تھا۔

سر چارلس وولی نے اپنی کتاب "دیوتا، قبریں اور عالم" میں اس شہر کی تفصیلات لکھتے ہوئے بیان کیا۔

مکانوں کی تعمیر میں آرام بلکہ تعیش کو مدِ نظر رکھا گیا تھا۔ مکانوں میں مذہبی نظمیں جو کہ عبادت گاہوں میں پڑھی جاتی تھیں اور حساب دانی کے علم سے متعلق کتبہ رکھے ہوئے ملے تھے۔ حساب دانی کی کلید جو معمولی جمع تفریق سے لے کر مربعوں کا رقبہ اور حجم کے نام معلوم کرنے کے فارمولے بھی لکھے ہوئے ملے تھے۔ کچھ اور کتبوں پر اُر کے قدیم مندروں اور مشہور عمارتوں کی تفصیل لکھی ہوئی ملی جو ایک طرح سے اُر شہر کی ایک مختصر سے تاریخ ثابت ہوئی۔

سر چارلس وولی کی ٹیم نے اپنی کھدائی کے دوران سمیرین بادشاہوں کے مقبرہ بھی

دریافت کیے۔ یہ مقبرے بھی تھے اور چھوٹے چھوٹے اہرام بھی۔ ان میں پتھروں کی قبریں بنائی گئی تھیں اور قبریں اندر سے وسیع کمروں جیسی تھیں۔ ان میں بادشاہ کے روز مرہ استعمال کی اکثر و بیشتر چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ سونے کے جگ، پانی پینے کے گلاس، پھول رکھنے کے گلدان، میناکاری کے زیور، سر پر پہننے کے خود اور لوہے کی مختلف ٹوپیاں، تاج، آلات و موسیقی، بیجے، کنگھی وغیرہ سب ہی کچھ تھے۔

ان مقبروں سے جو سونے کے زیورات اور ہیرے جواہرات ملے تھے وہ اس قدر زیادہ تھے کہ مصر کے اہراموں میں نفرتیتی اور توتاخامن کے مقبروں سے ملنے والی دولت ان کے آگے کچھ نہ تھی۔ ہر بادشاہ کے مقبرے میں اس کے ہمراہ اور بہت سے زندہ افراد بھی دفن کیے جاتے تھے۔ عموماً ان کی سواری کے گھوڑے، بیل، گاڑیاں، فرنیچر، خدام، حفاظتی عملہ، باڈی گارڈز اور غلام و کنیزیں سب کی سب زندہ دفن کی جاتی تھیں تاکہ کسی وقت بادشاہ موت کی بندش اور نیند سے چونک اٹھے تو جاگ جانے پر خود کو تنہا محسوس نہ کرے۔ یہ شہر تقریباً ۴ ہزار سال قدیم تھی اور بادشاہوں کی یہ قبریں سر چارلس وولی کے اندازے کے مطابق مصر کے اہراموں سے کوئی ہزار سال سے زیادہ قدیم تھی۔

سر چارلس وولی کے مزدور تنکوں کی ٹوکریوں میں کباڑ اور کوڑا بھر بھر کے نکال لیتے تھے اور پھر ریت، لی، کوڑا اور ٹوٹے پھوٹے برتنوں کے ٹکڑے جواہرات، زیور، سونے چاندی یا کسی اور دھات کے ظروف، اوزار وغیرہ سخت محنت کے بعد علیحدہ علیحدہ کر لیتے تھے۔ اس طرف ایک صبر آزما کام تھا جو دن رات جاری رہتا تھا۔ بادشاہوں کے مقابر پر جو تحریریں کندہ ملیں اور جو کتبے لگے نظر آئے ان سے اس تمدن کی عمر تقریباً ۳۵۰۰ سال قبل مسیح معلوم ہوئی۔

جوں جوں کھدائی کا کام بڑھتا جاتا تھا یہ اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ اوپر کی سطح پر جس تہذیب کے آثار ملے ہیں وہ دراصل اپنے انداز فکر کی اور طرز رہائش کی بدولت ایک اور قدیم تر تہذیب کی پیش خیمہ تھی۔ آخر کار یہ قدیم تر تہذیب مل ہی گئی۔

ایک بادشاہ کے مقبرے کے نیچے کھدائی کرتے کرتے ایک دن مٹی سے بھری ٹوکری میں جلی ہوئی لکڑیاں اور چند تختیاں ملیں اور چند ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے ہاتھ لگ گئے۔ یہ چیزیں مقبروں سے تقریباً تین سو سال قدیم تھیں۔ اب وولی کا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ ان مقبروں کے نیچے بھی ایک اور تہذیب دفن ہے۔ چنانچہ اسی زور و شور

بے کھدائی چلتی رہی۔ تہہ در تہہ غلافوں میں بنا ہوا ماضی اور حال کے اُجالوں میں اُبھرتا گیا۔ ہر تہہ پر کم و بیش ایک ہی قسم کی روزمرہ کے استعمال کی اشیاء برتن، اور ظروف نکلتے رہے جبکہ ہر ایک تہ میں ایک دور پوشیدہ تھا اور یہ ادوار ایک دوسرے سے کئی کئی سو سال کا فرق لیے ہوئے تھے۔ اس طرح تقریباً ۳۸۰۰ سال قبل مسیح تک کی تاریخ سامنے آ گئی۔

وولی نے اشیاء کے معائنہ کے بعد یہ اندازہ لگایا کہ سمیرین تہذیب جو اس شہر میں پھلی اور پھولی کم و بیش پندرہ سو سال تک زندہ و تابندہ رہی۔ یہ قوم حساب، جیومیٹری، سیاروں کی گردش کا علم، تعمیراتی معلومات، زندگی بعد الموت کے تصور، لوہے کے استعمال کے فن سے آشنا ہی نہیں بلکہ اس فن میں خاصی بلندی پر جا پہنچی تھی۔

اُر کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، وولی کے مزدوروں نے ایک دن ایک مٹی سے بھری ہوئی ٹوکری کو باہر کھینچا تو اس میں ایسی کیچڑ نما مٹی نکلی جو کسی بہتے دریا کی تہ میں ہی جم کر خشک ہو جانے والی چکنی مٹی سے مشابہ تھی۔ پہلے پہل وولی نے یہ سمجھا کہ کسی زمانے میں دریائے فرات اس علاقہ کے قریب سے گزرتا ہو گا اور جب اس نے راستہ بدلا تو بدلتی ہوئی گزرگاہ پر اُر کا شہر آباد ہوا ہو گا جس کی مٹی سامنے آتی جا رہی ہو گی، مگر یہ کیا؟ اس مٹی میں تو سمندری سیپیاں، گھونگے اور بے شمار اس قسم کی چھوٹی چھوٹی چیزیں ملتی جا رہی تھیں کہ جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ دریا کی گزرگاہ کے علاوہ یہ کسی اور قسم کے پانی کی کرشمہ سازی تھی۔ پھر یہ مٹی دریاؤں کی لائی ہوئی نئی اور زرخیز مٹی سے مختلف تھی۔ اس مٹی میں ٹوٹی پھوٹی اشیاء روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں دفن تھیں۔ مٹی کے ظروف بھی مل گئے مگر اُر سے جو مٹی کے برتن ابھی تک ہاتھ لگے تھے وہ بڑی حد تک ہموار اور خوبصورت تھے جنہیں کمہار کے پہیہ پر چلا کر درست کیا گیا تھا اور جو ظروف اس مٹی سے نکلے تھے وہ ہاتھ کے بنائے ناہموار اور بے ترتیب برتن تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ بھی تھی کہ جتنی بھی ٹوکریاں اس مٹی کے کوڑے سے نکلی تھیں ان میں دھات کے بنے ہوئے کسی برتن کا یا کسی ایک چھوٹے سے ٹکڑے کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ گویا یہ تہذیب تھی جو پانی میں دفن ہوئی۔ خالصتاً حجری یا پتھروں کے زمانے کی تہذیب تھی۔ مگر یہ کون سی تہذیب تھی اور یہ پانی کون سا تھا جو سمندری پانی کو اپنے ساتھ بہا کر لایا؟ اور یہ مٹی کہاں کی تھی جو ریگستانی علاقہ میں چکنی مٹی کی صورت میں دفن تھی؟ مٹی کی یہ تہہ دس فٹ موٹی تھی جب تک مٹی نکلتی رہی سر چارلس وولی کی ٹیم روز سر جوڑ کر

بیٹھتی۔ نئے نئے نظریہ پیش کیے جاتے، اشیاء کا بار بار معاونہ کیا جاتا، ایکسپرٹ اور ماہرین کو بلایا جاتا۔ ان کی رائے لی جاتی اور بڑے طویل مباحثہ ہوا کرتے آخر کار سر چارلس وولی ایک نتیجہ پر پہنچ ہی گئے کہ مٹی قریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح کے عہد کی تھی۔ اس دن اُر کے شہر سے لندن میں برٹش میوزیم کے سربراہ کو ایک تار بھیجا گیا جس کا مضمون یہ تھا۔

"ہم نے طوفانِ نوح کو دریافت کر لیا ہے...... وولی"

سر چارلس وولی نے بتایا کہ جب انھوں نے تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا کہ بائبل کا طوفان نوح ایک مسلمہ حقیقت تھا تو اب نوح کی کشتی کی تلاش شروع ہوئی اور اُر کی دریافت ہوئی اور طوفان نوح کے اثرات کو تلاش کر لینے کے بعد یورپ کے تاریخ داں اس کشتی کی تلاش میں نکلے جو بائبل اور توریت اور قرآن کے مطابق نوح نے بنائی تھی۔ بائبل میں طوفانِ نوح کے متعلق لکھا ہے۔

"طوفان چالیس دن تک جاری رہا۔ سمندروں کا پانی خشکی پر آگیا۔ زمین پر ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ تمام دنیا کے بڑے بڑے پہاڑوں کی چوٹیاں پانی سے چھپ گئی تھیں۔ تب نوح نے خدا کو یاد کیا۔ ایک ہوا چلی جس نے پانی کو مزید آگے بڑھنے سے روک دیا۔ چشموں سے پانی ابلنا بند ہو گیا۔ بادلوں کو لانے والی ہوائیں خوش کر دی گئیں۔ بارش کو بھی بندش کا حکم ملا۔ پھر پانی اُترنا شروع ہوا۔ ایک سو پچاس دن تک مسلسل پانی ترائیوں کی طرف بہتا رہا اور وہاں سے سمندروں کی طرف پھیر دیا گیا۔ نوح کی کشتی بھی حفاظت سے رکھی گئی اور ساتویں مہینے کی سترھویں تاریخ کو اس کشتی کو کوہ ارارات پر ٹھہرا دیا گیا۔"

کوہ ارارات مشرقی ترکی میں ایران اور روس کی سرحد پر واقع ہے۔ اس کی گیارہ ہزار فٹ بلند چوٹی جس کے تمام سلسلوں کی اونچائی تیرہ ہزار سے بارہ ہزار فٹ کے لگ بھگ ہے۔ سلسلہ ارارات کے نام سے مشہور ہے۔ ان پہاڑوں پر ہمیشہ برف جما رہتا ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس ہزاروں لاکھوں ٹن برف کے نیچے کہیں وہ کشتی بھی دبی ہوئی ہو گی جس کو نوح کی کشتی کہا جاتا رہا ہے۔

اس کشتی کی تلاش ایک قدیم رسم ہے۔ یہودی مورخ جوزی فس نے دو ہزار سال قبل مسیح اس کی تلاش کی کوشش کی تھی۔ بابل کے رہنے والے بھی اس کو کھوجتے رہے کہ ان کے چرواہے جو کبھی کبھی زیادہ بلندی پر چلے جاتے تھے۔ اس کشتی کے ٹکڑے کہیں نہ کہیں برف میں دبے ہوئے دیکھ لیتے تھے۔

یہ مسئلہ ایک مدت تک مذہبی تقدس اور مقدس جوش کے ساتھ چلتا رہا اور پھر بعد میں تاریخ کے ماہرین اور قدیم علوم کے محققین نے اس کی تلاش میں کافی محنت کی۔ اس کشتی کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ اس لیے اور بھی مسلم ہے کہ اس کے متعلق زبور، توریت، انجیل اور قرآن چاروں کتب میں بہت واضح اشارات موجود ہیں۔ یہ کشتی کوہِ جودی پر ٹھہر گئی تھی۔ کوہِ جودی آج بھی موجود ہے اور اس کے اطراف میں بسنے والے لوگ آج بھی عیسائی، یہودی اور مسلمان مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے اپنے مذاہب کی سچائی ثابت کرنے کے لیے انھوں نے اسے کھوج نکالنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔

سر چارلس وولی نے بتایا کہ روز ہی ان کو کشتی نوح کے متعلق کوئی نہ کوئی اطلاع مل جایا کرتی تھی۔ اکثر اوقات یوں بھی ہوا کہ وہ چرواہے کوہ پیمائی کے شوقین شکاری جو کوہِ جودی پر بلندیوں تک پہنچ گئے انہیں جب بھی برف میں دبی ہوئی لکڑیاں نظر آئیں ان کو حضرت نوح کی کشتیوں کے ٹکڑے سمجھا گیا۔ مگر یہ بات ہمیشہ سچ نہیں ہوتی تھی۔

سر چارلس وولی نے ہمیں بتایا کہ نوح کے طوفان اور نوح کی کشتی سے بھی زیادہ اہم ایک وجہ ہے۔ کشتیٔ نوح کی تلاش کی تاریخ سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ طوفان نوح سے ملتی جلتی کہانی سمیریوں کی تاریخ میں بھی موجود ہے۔ اس میں حضرت نوح کی جگہ ایک بادشاہ ضیا الصدر راج

ط: کہیں کہیں اتنا پشتم کے نام سے بھی پکارا گیا ہے کو کم و بیش وہی حالات پیش آئے جو حضرت نوح پر گزرے۔ اتنا پشتم کو بھی پہلی ہی سے بتا دیا گیا تھا کہ ایک زبردست طوفان آنے والا ہے جو ہر ذی روح کو تباہ کر دے گا۔ گلگمیش کے کارناموں پر مشتمل جو کتبے ہمیں ملے ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ گلگمیش کو سمندروں اور پہاڑوں کو عبور کر کے اتنا پشتم تک پہنچنا ہے تو اس کو طوفان کے بارے میں بتایا کہ اتنا پشتم کو طوفان کے بارے میں دیوتاؤں نے کہا تھا۔

"اپنا گھر توڑ دے، ایک جہاز بنا، دولت کو فراموش کر دے، زندگی کی تلاش کر جن چیزوں پر تیرا قبضہ ہے انہیں بھول جا، ہر قسم کے پودوں کے بیج جمع کر اور ہر قسم کی زندہ چیزوں کو جہاز میں رکھ دے پھر یہ بھی اس لیے کہ جو جہاز تو بنائے گا اس کی جسامت اور اس کا سائز بالکل متناسب ہونا چاہیے۔"

نوٹ:- ۱۹۵۱ء میں روسیوں کی ایک جماعت نے جو بلند پہاڑوں کی آب و ہوا اور جغرافیائی تبدیلیوں سے متعلق موضوعات پر تحقیق کر رہی تھی اس قسم کی ایک واضح نشانی حاصل کی جو بعد کی تحقیق سے نوح کی مشہور و معروف کشتی ہی کا ایک ٹکڑا ثابت ہوئی (اس کا تفصیلی ذکر بعد میں ہوگا)

اس کے مقابلے میں بائبل میں نوح کے طوفان کا یہ حال بھی قابل غور ہے۔
"اور نوح کشتی میں بیٹھ گوے۔ نوح کی بیویاں کشتی میں بیٹھ گئیں۔ نوح کے بیٹوں کی بیویاں کشتی میں بیٹھ گئی اور طوفان کا پانی چڑھنا شروع ہوا۔ وہ تمام جانور جو پاک تھے اور وہ تمام جانور جو ناپاک تھے وہ پرندے جو پاک تھے اور وہ پرندے جو ناپاک تھے اور وہ تمام جانور جو چلتے تھے یا رینگتے تھے سب کے جوڑے جوڑے کشتی میں لا کر جمع کر دیے گئے اور پھر کشتی طوفان کے پانی کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی گئی۔"

پھر اتنا پشتم کے طوفان کا حال سمیری کتبوں کی زبانی یوں آتا ہے۔
"جو کچھ بھی میں نے کشتی میں ڈال دیا ہے وہ زندگی کے تمام بیجوں پر مشتمل ہے۔ میں نے اپنی کشتی میں اپنے خاندان کو سوار کرالیا ہے۔ اپنے کنبے والوں کو بٹھالیا ہے۔ میں نے چراگاہوں کے مویشی بٹھائے ہیں۔ میں نے جنگلوں کے درندے سوار کرائے ہیں۔ میں نے تمام کاریگر اور ہنرمند کشتی میں سوار کرا دیے ہیں اور میں نے کشتی کو حکم دیا ہے کہ وہ پانی کے ساتھ اوپر اٹھتی رہے۔"
اس طرح یوں معلوم ہوتا ہے کہ اتنا پشتم نے طوفان کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ ہر جگہ اس کہانی میں لفظ "میں" آیا ہے۔ گویا طوفان سے گزرنے والا اپنی کہانی سنا رہا ہے۔
"چھ دن اور چھ راتوں تک تند و تیز ہوائیں چلتی رہیں پھر ہواؤں اور طوفان نے زمین کو ہلا کر رکھ دیا جب ساتواں دن آیا طوفان ہوا اور بارش سب رک گئے۔ پانی رک گیا۔ ہوائیں خاموش ہو گئیں اور زمین پر رہنے والوں کی تمام تہذیبیں مٹی کے ڈھیر میں بدل گئیں اور میدان اتنے اونچے ہو گئے جیسے کہ اونچے اونچے مکانوں کی ہموار سطحیں ہوتی ہیں۔"
آگے چل کر اس کہانی میں اتنا پشتم کشتی کے رکنے کی جگہ کو اس طرح بیان کرتا ہے
"اور پھر میں نے کھڑکی کھولی، صبح کے سورج کی روشنی میرے چہرے پر پڑی۔

میں نے دیکھا کہ کشتی ایک پہاڑ پر ٹھہر گئی ہے۔ یہ پہاڑ کوہ نصیر تھا اور چٹانوں نے کشتی کو اس طرح جکڑ لیا تھا کہ وہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ کوہ نصیر دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیان واقع تھا۔"

یہ پہاڑ ایران کے شمال میں کردستان کے علاقے میں واقع ہے۔ اس سلسلہ کوہ کو کوہ ارارات کہتے ہیں اسی کے ایک حصہ کو کوہ نصیر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اب جبکہ یہ تذکرہ نکل ہی آیا ہے تو یہ بھی سنتے چلیے کہ اتنا پشتم یا ضیا الصدر را کون تھا۔ اور گلگمیش سے اس کا کیا تعلق تھا۔ گلگمیش کی داستان ۱۸۷۲ء میں جارج اسمتھ نامی ماہر آثار قدیمہ نے دریافت کی تھی اور برطانوی ماہر اسیریائی تہذیب و نسل پر تحقیق کرنے والوں میں نہیت اعلیٰ درجہ پر تھا۔

گلگمیش دراصل اُرک کا بادشاہ تھا اور اس کی داستان پر مشتمل چونے کے پتھروں پر لکھی ہوئی بارہ تختیاں ملیں جو اشور بنی پال بابل کے بادشاہ کے محل سے برآمد ہوئیں۔ یہ اشور بنی پال سیناخرب کا پوتا تھا۔ ٦٣١ سے ٦٦٨ ق م تک بابل پر حکومت کی یعنی بابل کی دوبارہ تعمیر کے بعد جو سارحان نے کی تھی بابل پر اشور بنی پال کی حکومت ہوئی۔

چونے کے پتھروں پر لکھی ہوئی ان بارہ تختیوں پر گلگمیش کے کارنامے درج ہیں۔ گلگمیش ۲۷۰۰ ق۔ م میں اُرک کا بادشاہ تھا جو سمیریوں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ تاریخ داں آج بھی نہیں جانتے کہ سمیری کون تھے اور کہاں سے آئے تھے۔ مگر ان کا سائنسی علم اور ان کا علم الحساب آج کے ترقی یافتہ دور سے کچھ کم ترقی یافتہ نہ تھا۔ اشور بنی پال اور سمیری نہ تھا بلکہ اسیری بادشاہ تھا اس لیے جو تحریریں اشور بنی پال کے عہد میں لکھی گئیں وہ اس کے دور سے بھی دو ہزار سال قدیم دور کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

یہ دریافت کیوں جک کی پہاڑی ٹیلے سے ہوتی تھی۔ سرچارلس وولی نے سرجان مارشل کو اور ہمیں ان تختیوں پر تحریر کردہ پوری کہانی سنائی تھی جو اب مجھے پوری طرح یاد بھی نہیں ہے۔ مگر بہرحال شاید مفہوم میں واضح کر سکوں گا۔

یہ داستان ایک ہیرو کی داستان ہے، گلگمیش ایک نیم انسانی دیوتا تھا جو چوتھائی انسان اور تین چوتھائی دیوتا تھا۔ اس نے اُرک کے چاروں طرف ایک مضبوط اور پختہ چہار دیواری بنوائی تھی۔ گلگمیش کی آنکھوں میں ہیبت اور خوبصورتی دونوں ہی ایک حسین امتزاج کے ساتھ پائی جاتی تھیں۔

گلگمیش کے زمانے میں آسمانوں کے دیوتا اردرو نے انکیدو کو پیدا کیا۔ انکیدو کے بہت لمبے لمبے بال تھے وہ بالوں کی کھال کے کپڑے پہنتا تھا اور جنگلوں میں گھاس کھاتا تھا۔ آبادیوں میں انکیدو کو آنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ لوگ اس جنگلی انسان نما جانور سے خوف کھاتے تھے۔

گلگمیش کو اس پر رحم آگیا کیونکہ وہ جنگلوں اور صحراؤں میں اکیلا اکیلا پھرا کرتا تھا تب گلگمیش نے اس کی شادی ایک خوبصورت اور حسین دیوی سے کرادی تاکہ اس کی تنہائی بھی دور ہو اور اس کی اولاد میں طاقت اور حسن دونوں ہی اکٹھے ہو جائیں۔ مگر یہ بات سورج دیوتا کو بری لگی اور اس نے سزا کے طور پر انکیدو کو بہت بے دردی سے مارا پیٹا۔ اس ظلم کے خلاف انکیدو اور گلگمیش دونوں نے دیوتاؤں کے مسکن کی طرف جانے کا ارادہ کیا تاکہ اس ظلم سے ان کو آگاہ کیا جائے اور ساتھ ہی کوئی ایسا طریقہ معلوم ہو جائے جس کی بدولت وہ موت سے نجات حاصل کر کے ابدی زندگی حاصل کر سکے۔

یہ دونوں سفر پر چلے تو پہلے دیوی ارمنی فس کا محل آتا تھا یہ بھی پہاڑوں کی بلندیوں پر تھا اور اس محل کے محافظوں نے دونوں پر تیروں کی بارش کر دی مگر ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا مگر پھر محل کے اندر سے بڑے محافظ نے للکار کر کہا۔

"واپس لوٹ جاؤ کوئی فانی انسان دیوتاؤں سے نہیں مل سکتا جب تک کہ دیوتا خود نہ چاہیں اور جو دیوتا کے چہرے کو دیکھ لے گا اسے زندگی نہیں ملے گی۔ اسے مرنا ہی ہوگا۔"

سر چارلس وولی یہ قصہ سنا رہے تھے تو مجھے ایک دم یاد آیا تھا کہ توریت کی کتاب ہجرت میں جو EXODAS کے نام سے ہے خدا کی زبان سے یہ جملہ ادا کیا گیا ہے۔

"تم میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتے کیونکہ کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جس نے میرا چہرہ کبھی دیکھا ہو اور وہ زندہ بھی رہا ہو۔"

اسی طرح مسلمانوں کی کتاب قرآن میں حضرت موسیٰ کو کوہِ طور پر کہا گیا تھا کہ جبکہ انھوں نے ضد کی کہ خدایا میں تیری تجلی دیکھنا چاہتا ہوں تو ان سے خدا نے کہا تھا۔

"موسیٰ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔"

میرے اس جملے کے بعد سر جان مارشل اور سر چارلس وولی میں بڑی دیر تک اس بات پر بحث ہوتی رہی تھی کہ آخر قدیم زمانہ کی دیومالائی کہانیوں میں اور آسمانی کتابوں کے ان قصوں میں اس قدر مماثلت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال وہ ایک الگ بحث تھی تو

گلگمیش نے ان محافظوں کو بتایا کہ وہ تو خود بھی تین چوتھائی دیوتا ہے تو اس طرح اسے اندر آنے کی اجازت ملی اور پھر ان دونوں کو ایک آسمانی سفر پر اوپر لے جایا گیا۔

ساتویں کتبہ کی پوری تحریر ہی اس فضائی سفر سے متعلق ہے جو قریب چار گھنٹہ جاری ہے جو ایک تانبہ کے بنے ہوئے عقاب کے پروں کے اندر بیٹھ کر شروع کیا گیا تھا۔ سفر کی کہانی یوں ہے۔

"نیچے زمین کی طرف دیکھو یہ کیسی لگتی ہے؟

نیچے سمندر کی طرف دیکھو یہ کیسا لگتا ہے؟"

اور جب میں نے نیچے دیکھا تو زمین پہاڑ کی طرح تھی اور سمندر ایک جھیل کی مانند تھا اور پھر وہ چار گھنٹہ تک اور اوپر کی طرف اڑتے رہے تب دیوتا نے پھر پوچھا۔

"اب زمین کی طرف نیچے دیکھو اور سمندر کی طرف نیچے دیکھو زمین اور سمندر کیسے لگتے ہیں۔"

اور جب میں نے نیچے دیکھا تو زمین ایک باغ کی طرح لگتی تھی اور سمندر اس باغ میں بہتے ہوئے ایک نالی کی مانند تھا۔

اور تب وہ مزید چار گھنٹے تک اونچے اور اونچے اُڑتے رہے گویا زمین سے اوپر اُڑتے ہوئے اب انہیں ۱۲ گھنٹے گزر چکے تھے تب دیوتا نے پھر پوچھا۔

"نیچے زمین کی طرف دیکھو، نیچے سمندر کی طرف دیکھو۔ تمہیں زمین کیسی لگتی ہے؟ تمہیں سمندر کیسا لگتا ہے؟ اور تب زمین سنہرے بھوسے کی طرح لگتی تھی اور سمندر ایک پانی کے بلبلے کی طرح اُٹھا ہوا نظر آتا تھا۔"

سر چارلس وولی نے بتایا کہ جس طرح اوپر سے ہوائی جہاز کے ذریعے نیچے کی زمین کو لگنا چاہیے۔ اس سفر میں زمین اور سمندر کی صورت اسی طرح بنائی گئی تھی۔ دراصل حال ہی میں یعنی ۱۸۹۹ء میں امریکہ کے دو بھائیوں نے جن کو رائٹ برادر کہا جاتا ہے ایک ہوا میں اڑنے کی مشین ایجاد کیا ہے اور اس سے قبل کاؤنٹ زیلپن نے بھی ایک مشین پر بیٹھ کر فضا میں اڑنے کا تجربہ کیا تھا اور ان دونوں نے فضا کی بلندی سے جس طرح زمین کو دیکھا تھا اس کی تفصیل بھی سر چارلس وولی کے مطابق اُرک سے نکلنے والی گلگمیش کے کارنامے کی ساتویں تختی سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

اسی تختی پر سفر کی تفصیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دروازہ آدمی کی طرح گفتگو کرتا تھا تو شبہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے کسی لاؤڈ اسپیکر کے مشابہ کسی قسم کی کوئی چیز تھی؟ یہ کون سی ایجاد تھی؟ جو آج سے لگ بھگ ساڑھے چار ہزار سال قبل کی دنیا میں موجود تھی؟ یہ ایک عجیب گتھی ہے۔

انھویں تختی میں درج ہے کہ انکیدو سفر کے دوران کسی قسم کی گیس سے مر گیا تو گلگیمش نے اس کے ایکاایکی موت کے بارے میں سوچا۔

"کیا انکیدو کسی آسمانی پرندے کی زہریلی سانس سے ہلاک ہو گیا ہے؟"

اور جب یہ فضائی سفر ختم ہو گیا تو دیوتا نے اسے نیچے اُتار دیا اور کہا کہ وہ بڑے دیوتاؤں سے ملنے سے قبل اُتناپشتم سے ملے۔ تب گلگیمش اکیلا ہی دیوتاؤں کی ملاقات کو گیا اور پھر وہ ایک ایسے اونچے دو پہاڑوں تک آ گیا جن پر آسمان ٹکا ہوا تھا اور جن کو سورج کا دروازہ کہتے تھے اور اس کے سامنے ایک وسیع و عریض سمندر تھا جس کے پیچھے دیوتاؤں کے مکان تھے۔ یہاں آکر پھر دیوتاؤں کے محافظوں نے گلگیمش کو روک لیا۔ گلگیمش کو انکیدو کا غم تھا جس کو سفر کے دوران ہی موت نے ڈس لیا تھا۔ اس نے اپنے غم کا اظہار ان محافظوں سے کیا تو انھوں نے کہا

"تو موت سے کیوں ڈرتا ہے؟ تجھے اگر جاوداں زندگی کی تلاش ہے تو وہ کہیں نہیں ملے گی جب دیوتاؤں نے انسان کی تخلیق کی تو انھوں نے زندگی خود رکھ لی اور موت انسان کی قسمت میں لکھ دی ہے"

اور پھر جب گلگیمش نے محافظوں کو بتایا کہ وہ تین چوتھائی دیوتا ہے اور ایک چوتھائی انسان ہے تو پھر انھوں نے اس کو آگے جانے کی اجازت دے دی اور پھر دیوتاؤں کی ملاقات سے پہلے گلگیمش کی ملاقات ضیا الصدرا یا اُتناپشتم سے ہوئی جو انسانوں کا باپ اور سب آدمیوں میں پہلا آدمی تھا اور درحقیقت یہ وہی شخص تھا جس کو دیوتاؤں نے ابدی زندگی بخش دی تھی۔

تب گلگیمش کو اُتناپشتم نے اپنا ماضی بتایا اور یہی وہ مقام تھا جہاں اس پوری کہانی کا سب سے حیرت ناک قصہ شروع ہوا یعنی ایک ایسے طوفان کی کہانی جو ہر طرح سے نوح کے طوفان جیسا تھا اور شروپک میں جہاں اُتناپشتم بادشاہ تھا دیوتاؤں نے ایک عظیم طوفان لانا طے کیا تاکہ گنہگار ختم ہو جائیں اور نسل انسانی نئے سرے سے تعمیر کی جا سکے۔

اتنا پشتم نے کہا کہ دیوتاؤں نے اسے بتا دیا تھا کہ ایک قیامت خیز طوفان آنے والا
چنانچہ دیوتاؤں کے کہنے پر اس نے ایک وسیع و عریض کشتی تیار کی جسمیں دس منزلیں
تھیں اور تمام زندہ جانوروں اور ہر قسم کے کیڑے مکوڑوں، درندوں اور پرندوں کا ایک ایک
جوڑا اس کشتی میں رکھ لیا گیا اور پھر وقت معین پر ہر طرف سے بادل منڈلانے لگے۔
اندھیرے چھا گئے آسمانوں سے پانی اُبلنے لگا، ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا اور جس طرح کشتی
کنارے آلی جس کی تفصیل آگے گزر چکی ہے۔

جس دن سے اشور ہنی پال کے محل سے اُرک بادشاہ گلگیمش کے سفر کی داستان کی
بارہ تختیاں حاصل ہوتیں ہیں اور جب سے وہ تحریریں پڑھی گئی ہیں یہ سوال ہزاروں بار
اُٹھا کہ آخر اتنا پشتم کے طوفان کے تذکرے میں تو قرآن، توریت اور بائبل میں بیان کیے
ہوئے طوفانِ نوح سے اس قدر مشابہت کیسے ہوئی؟

یہ پوری داستان جو اسیریائی عہد کے بادشاہ اشور ہنی پال کے محل سے ملی دراصل
اس نسل سے تعلق رکھتی ہے جسے ہم سمیری نسل کہتے ہیں جس کے متعلق آج تک یہ
معلوم نہ ہو سکتا کہ یہ کون لوگ تھے اور کہاں سے آتے تھے اور ان کے علوم اور سائنس کی
ترقی آخر کس طرح ہوتی تھی۔ ان کے متعلق ایک عام نظریہ یہ ہے کہ یہ لوگ شائی اس
نسل کے لوگ تھے جو براعظم اٹلانٹا کے فنا ہونے سے قبل وہاں آباد تھا اور اس کی تباہی کے
بعد کسی نہ کسی طرح اس براعظم سے بچ کر نکل آئے تھے۔ انہی لوگوں نے مصر کے اہرام
تعمیر کیے اور انہی لوگوں نے سمیریوں کا روپ دھارا اور انہی سمیریوں کا ایک بادشاہ اتنا پشتم
بھی تھا جس کا نام سمیریوں کے بادشاہوں کی فہرست میں موجود ہے جس کا تذکرہ آئندہ
ہوگا۔

مذہبی کتابوں میں طوفانِ نوح کا تذکرہ سب سے پہلے توریت میں آیا ہے۔ اسی
میں پہلے پہل طوفانِ نوح کا ذکر بھی ہوا ہے۔ سر چارلس وولی کا اس بارے میں ایک نظریہ
یہ تھا کہ فرعون جو کئی ہزار سال تک مصر میں حکمران رہے۔ اٹلانٹا کے براعظم سے آئی
ہوئی ترقی یافتہ نسل سے تعلقات پیدا کر چکے تھے۔ جنھوں نے ان کو زندگی بعد الموت کا
نظریہ دیا تھا اور انھوں نے ہی ان کو اہرام تعمیر کرنا سکھاتے تھے۔ انہی کے دیوی دیوتاؤں
اور ان ہی کی دیومالائی کہانیاں فراعین کے زمانے میں مذہبی داستانوں کا درجہ اختیار کر گئے
ہوں گے۔

بعد میں یہی نسل سُمیری نسل کے طور پر عراق میں اُبھری اور اس کے قصے جو مصر میں موجود تھے اور ان کو عراق میں بھی جگہ ملی مگر توریت میں حضرت موسیٰ نے کس طرح اس طوفان کے قصہ کو داخل کیا اور آتنا پشتم کا نام نوح کیسے ہو گیا؟ سر چارلس وولی کا اس بارے میں یہ خیال تھا کہ توریت الہامی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی بائبل کوئی آسمانی کتاب تھی چنانچہ حضرت موسیٰ نے جو فرعون کے محل میں پہلے بڑھے اور علم لیا ان کی رسائی ان کتابوں، لائبریریوں یا تختیوں تک رہی ہو گی جہاں مختلف قسم کی داستانیں جمع کی جاتی تھیں اور تصویری یا نیم تصویری زبانوں میں لکھی جاتی تھیں اور چونکہ طوفان کی داستان ایک عظیم داستان تھی چنانچہ انھوں نے اسے اپنی کتاب توریت میں جگہ دے دی اور اسی طرح حضرت عیسیٰ نے اس کو بائبل میں بیان کر دیا بہر حال سر چارلس وولی کے اس نظریہ سے نہ سر جان مارشل متفق تھے اور نہ میں مگر یہ بحث ایک علیحدہ موضوع ہے۔

اس موضوع کو ختم کرنے سے قبل سمیری بادشاہوں کی فہرست جو طوفان تک آتی ہے اور بائبل میں GENESIS یعنی تخلیق کے باب میں آدم سے نوح تک بادشاہوں کی جو فہرست آئی ہے دونوں کا مطالعہ ایک نظر کر لینا برا نہ ہو گا۔

یوں بھی میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ سر چارلس وولی کا اس قسم کا تغافل ایک عام سا کام تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ بائبل کو صد فی صد الہامی کتاب تسلیم کر لینا درست نہیں ہے کیونکہ اس طرح تحقیق اور علم حاصل کرنے والے کو اپنے علم کی حد بندی کرنی پڑتی ہے اور وہ آزادانہ انداز سے نہ سوچ سکتا ہے اور نہ ہی تحقیق کر سکتا ہے۔

سر چارلس وولی ہی نے ہمیں دونوں فہرستیں دی تھیں۔ ایک بائبل کے مطابق اور دوسری سمیریوں کے کتبوں سے حاصل کی ہوئی۔

انجیل یا بائبل میں (GENESIS) تخلیق کے نام سے جو باب ہے اس میں آدم سے لے کر نوح تک کی تمام بڑے بڑے سرداروں کی عمریں دی گئی ہیں۔ اس تفصیل کے مطابق آدم سے آگے تک کی عمریں یوں تھیں۔

آدم کل عمر ۹۳۰ سال۔ آدم کے بعد شیث آئے تو حضرت آدم کی عمر اس وقت ایک سو تیس سال تھی۔

شیث کل عمر ۹۱۲ سال۔ حضرت شیث کے ۱۰۵ سال کی عمر میں ایک بیٹا ہوا جن کا نام انوش رکھا گیا۔

انوش کی عمر ۹۰۵ سال ۔ انوش کے ۹۰ سال کی عمر میں بیٹا پیدا ہوئے جس کا نام کنعان رکھا گیا۔
کنعان کی عمر ۹۱۰ سال ۔ کنعان کے ۷۰ سال کی عمر میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام محلیل تھا۔
محلیل کی عمر ۸۹۵ سال ۔ محلیل کے خدا نے ۶۵ سال کی عمر میں جرید نام کا بیٹا دیا۔
جرید کی عمر ۹۶۲ سال ۔ جرید کے ۱۶۵ سل کی عمر میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام لینبوش تھا۔
لینبوش کی عمر ۳۶۵ سال ۔ لینبوش کے ۶۵ سال کی عمر میں مہدی الصلح پیدا ہوئے۔
مہدی الصالح کی عمر ۹۶۹ سال ۔ مہدی الصلح کے بیٹے کا نام لامیش تھا۔
لامیش کی عمر ۵۰۰ سال ۔ لامیش کے بیٹے کا نام نوح تھا۔ جو فرد یک کے رہنے والے تھے اور ان کی عمر ۶۰۰ سال تھی کہ طوفان آیا اور پھر اس طوفان کے بعد بھی وہ ۳۵۰ سال زندہ رہے اور انہی سے دوبارہ لولاد آدم چلیان کو آدم ثانی بھی کہا گیا۔
نوح کی عمر ۹۵۰ سال
کل۔ ۸۱۹۸ سال۔

اب سرداروں کے مقابلہ میں سمیریوں کے بادشاہوں کی فہرست ہے جس میں ان کی عمریں اور نام بھی دیے گئے ہیں۔ سمیریوں کے بادشاہوں کی فہرست کے جو کتبے ملے ہیں ان سے بھی بے حد طویل عمروں کا انکشاف ہوتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ سمیریوں کے بادشاہوں کی فہرست، ناموں اور ترتیب کے لحاظ سے صد فی صد درست تسلیم کی جاتی ہے مگر عمروں کی جو طوالت اس میں ملتی ہے وہ ناقابل یقین ہے جس طرح آدم سے نوح تک کی عمروں کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی اسی طرح سمیری بلشاہوں کی فہرست اور ان کی عمروں کے متعلق بھی کوئی قطعی شہادت یا کوئی تاریخی گواہی موجود نہیں ہے۔

ان کتبوں سے جو اطلاع ہمیں ملتی ہے وہ یوں ہے کہ جب بادشاہی آسمانوں سے اتر کر زمین پر آئی تو اریدو بادشاہوں کا شہر قرار پایا یہاں سب سے پہلے ایلولم نے حکومت کی۔
ایلولم کا صدر مقام اریدو تھا۔ مدت حکومت ۲۸,۸۰۰ سال تھی۔
الالگر کا صدر مقام اریدو تھا۔ مدت حکومت ۳۶,۰۰۰ سال تھی۔

بعد میں دو بادشاہوں نے حکومت کی
جن کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ انہی کے
زمانے میں صدر مقام اریدو سے
بدطبریہ منتقل ہوا۔ مدت حکومت ۶۴،۸۰۰ سال تھی۔
ان عمانی لونا۔ صدر مقام بدطبریہ۔ مدت حکومت ۶۴۸۰۰ سال تھی۔
ان میںگلانا۔ صدر مقام بدطبریہ۔ مدت حکومت ۲۸،۸۰۰ سال تھی۔
دو منیری گڈریا۔ صدر مقام بدطبریہ۔ مدت حکومت ۳۶،۰۰۰ سال تھی۔
اس کے بعد مختلف بادشاہوں نے حکومت کی
اور صدر مقام بدطبریہ سے لارک منتقل ہوا۔ مدت حکومت ۱۰۸،۰۰۰ سال تھی۔
ان سسی پتریانہ۔ صدر مقام لارک۔ مدت حکومت ۲۸،۸۰۰ سال تھی۔
ان مدیورانا۔ اس کے دور میں صدر مقام
لارک سے میر منتقل ہو گیا تھا۔ مدت حکومت ۲۱،۰۰۰ سال تھی۔
البر توتو۔ اس کے عہد میں دارالحکومت شرویک ہو گیا۔ مدت حکومت ۱۸،۶۰۰ سال تھی۔

اس طرح طوفان سے قبل ۲ لاکھ ۴۱ ہزار ۲ سو سال تک آٹھ بادشاہوں نے حکومت کی اور کل پانچ دارالحکومت بنائے گئے۔

اس کے بعد دنیا کو طوفان نے گھیر لیا اور طوفان نے تمام پہاڑوں، کھیتوں، خشکی اور ندی نالوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ شہنشاہ ابر توتو کے بعد اس کا بیٹا ضیاالصدرا بادشاہ بنا اور اسی کے زمانے میں طوفان آیا۔ یہ ضیاالصدرا ہی ہے جس کو سمیریوں کے گیتوں میں طوفان کے زمانے کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ نینوا (عراق) کے آثار قدیمہ کی کھدائی سے برآمد ہونے والے بہت سے کتبوں پر مشتمل تحریروں میں جن کو گلگمیش کے کارناموں کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ضیاالصدرا کو شرویک کے ابر توتو کے بیٹے کے نام سے پکارا گیا ہے۔

سمیریوں کے یہاں گلگمیش کے کارناموں پر مشتمل جو تحریریں ملی ہیں ان کا پس منظر بھی بالکل حضرت نوح ہی کی طرح سے ہے۔ گلگمیش طوفان کے بعد بادشاہوں میں سمیریوں کا ہیرو ہے اور گلگمیش ہی کے زمانے میں بابل کی تہذیب کو ترقی ملی۔ ضیاالصدرا کے بعد یعنی طوفان کے بعد سمیری بادشاہوں کی عمروں کی طوالت گھٹ گئی۔ طوفان کے بعد کل بارہ بادشاہ ہوئے جس میں طویل ترین عمر چار سو بیس (۴۲۰) سال کی

ہوئی اور سب سے کم آٹھ سال کی۔ ان تمام بادشاہوں کا زمانہ حکومت، دو ہزار تین سو دس سال (۲۳۱۰) پر مشتمل ہے۔ اس عرصہ کے بعد سمیری بادشاہوں کی فہرست باقی رہی۔ ان بادشاہوں میں اٹھائیسویں نمبر پر گلگیمش آتا ہے گویا ضیاالصدرا سے گلگیمش تک سمیریوں کے کل بادشاہوں کی تعداد ۴۰ ہوئی۔

گلگیمش نے کل ۱۳۹ سال حکومت کی اس کا دارالحکومت ارک یا ایرش تھا۔ یہ ایرش جنوبی عراق کے موجودہ شہر ورنا کے قریب موجود تھا۔ جرمن ماہرین آثار قدیمہ نے اسی ایرش کے کھنڈرات سے ۲۱۰۰ سال قبل مسیح کے مٹی کے کتبے حاصل کیے ہیں جو سمیریوں کی تہذیب سے متعلق تحریروں کا سب سے پرانا ریکارڈ ہے۔ گلگیمش کے کارناموں پر مشتمل جو کتبے ملے ہیں وہ کسی ایک مقام پر موجود نہ تھے بلکہ وہ نینوا، اُر، بابل، شروپک اور نیپر کے کھنڈرات کے مختلف مقامات سے برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں شروپک کے کھنڈرات خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں نوح نے زندگی کے چھ سو سال گزارے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں کے رہنے والے ان کو کشتی بناتا ہوا دیکھ کر ہنسی اور ٹھٹول کیا کرتے تھے۔ یہ شہر بغداد سے ۹۵ میل دور جنوب مشرق میں موجود قصبہ فارا کے مقام پر آباد تھا۔ یہ جگہ اُر سے چالیس میل کے فاصلے پر تھی۔

ان کتبوں کی تحریریں نہایت خوشنما، صاف اور واضح ہیں، ان میں ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی ہیں جس کی وجہ سے کتبوں پر مشتمل تحریروں سے مکمل کہانیاں اور مکمل روایات ظاہر نہیں ہوتیں۔ یہ کتبے ہوئے لب لندن کے برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں انہی کی تحریروں کے مطالعہ سے سمیریوں کے طوفان سے متعلق خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ کتبے کس طرح لکھے گئے ہیں اس کی مثال یوں ہے۔

"دوسرا کتبہ:۔ جب دیوتاؤں کے آدمی۔ کل تعداد ۴۳۱ ابلیت آیا کا ہاتھ یہ تحریر لکھتا ہے۔ مہینہ شبات کا اٹھائیسواں دن، سال وہ سال جس میں ایمی صدوقہ بادشاہ نے فرات کے دہانے پر ایمی صدوقہ کا قلعہ تعمیر کیا۔"

اس کتبہ کی تحریر پڑھنے والوں نے اس کی تفسیر یوں کیے کہ یہ کتبہ ابتدائی الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ "جب دیوتاؤں کے آدمی" اس کہانی سے کتبوں کی سطروں کی کل تعداد ۴۳۹ تھی۔ کتبوں کی فہرست میں اس کتبہ کا نمبر دوسرا تھا۔ یہ کتبہ بادشاہ ایمی صدوقہ کے دور حکومت میں جو ۱۶۹۲ قبل مسیح میں بادشاہ بنا تحریر کیا گیا۔ اس کے دور حکومت میں بھی

اس تحریر کا وہ مخصوص سال تھا جبکہ فرلت کا قلعہ تعمیر ہوا۔ اس میں کل ۴۴۹ سطریں تھیں مگر موجودہ کتبہ میں صرف ۵۰ سطریں ملتیں باقی ضائع ہو چکی ہیں۔ اس کتبے میں وہ الفاظ جن کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے "جب دیوتاؤں کے آدمی" سمیریوں کی اصل زبان میں یوں لکھے گئے ہیں۔

"انوما ایلوادی لم...... یعنی...... جب دیوتاؤں۔ کے آدمی"

انہی کتبوں سے ہمیں سمیریوں کی تہذیب اور تمدن کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

میں اور سر جان مارشل اور چارلس وولی قریباً ایک ماہ تک ساتھ ساتھ رہے اور پھر ہم لوگ سر جان مارشل کے ہمراہ عراق کے مختلف علاقوں میں دوسرے کھنڈرات دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک ماہ کا یہ زمانہ جو اُرک اور اُر، شرویک وغیرہ کے مطالعہ میں گزرا ایک بہت اعلیٰ علمی وقفہ تھا اور طوفانِ نوح، نوح کی کشتی، سمیری نسل اور ان کی زبان اکادین کے حروف تہجی وغیرہ اور مختلف ٹیلوں سے برآمد ہونے والے کتبہ اور تختیاں ہی ہر وقت موضوعِ بحث رہتی تھیں۔

اس پورے وقفہ میں ایک بار بھی میری توجہ کسی وقت بھی نہ تو ملکہ بوران کے رومال پر گئی اور نہ ہی اس سیاہ فام حبشی ساحرہ جامش کے دیے ہوئے ہڈی کے تحفے پر جو ہمیشہ میرے پاس رہتے تھے۔ میں نے ان دونوں تحفوں کو تعویز کی طرح گلے میں بازو پر باندھنے کی عادت ڈال لی تھی۔ ہڈی تو فقط ایک شلنگ (ایک روپیہ) کے سائز کی تھی۔ رومال بھی چمڑہ کا بھدا سا ایک ٹکڑا تھا مگر چونکہ سارحان کے معرکوں میں میں ان کی اہمیت دیکھ چکا تھا اس لیے ان کو اپنے سے کبھی جدا نہ کرتا تھا۔

سارحان کے معرکوں کو اب قریب قریب سات، آٹھ ماہ گزر چکے تھے اور ہڈی یا رومال سے متعلق کوئی نئی بات نہ ظہور پذیر ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے میں نے ان دونوں چیزوں کو کسی حد تک فراموش کر دیا تھا۔

اس دن ہم نے نمرود کے کھنڈرات کی تحقیقات میں کافی وقت صرف کر دیا تھا اور بہت تھک گئے تھے۔ خلاف توقع اس شام کو سخت قسم کی بارش بھی شروع ہو گئی تھی اور ہم دونوں یعنی سر جان مارشل، روسی اور میں بارش میں شرابور سات بجے کے قریب بھیگتے ہوئے ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تھے۔ بھیگے ہوئے کپڑے بدل کر اور معمولی سا کھانا کھا کر میں جلد ہی اپنے کمرے میں سونے چلا گیا تھا۔ شاید آدھی رات کا وقت تھا کہ میں نے اپنے سینے

پر گرمی کی جلن محسوس کی اور اسی جلن کی بدولت سوتے سوتے سے میری آنکھ کھل گئی۔ سینہ پر جیسے کسی نے انگارے رکھ دیے تھے مگر یہ گرمی لحظہ بھر کے لیے اُبھرتی اور پھر معدوم ہو جاتی۔ نیند کی مدہوشی سے نجات پاتے ہی میرے ذہن نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ گرمی گردن میں پڑی ہوئی مردوقش کے عطیہ کی ہے۔ اس پراسرار ہڈی سے جب کبھی مجھے کوئی پیغام ملنا ہوتا تھا وہ اسی طرح ملا کرتا تھا۔

ہڈی آہستہ آہستہ سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ میں نیند سے پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور اس ہڈی کو نظریں جماتے دیکھ رہا تھا کہ ایک جوان فوجیف سالار ایک فوج لیے ہوئے ریگستانوں کی مسافت طے کرتا ہوا ایک عظیم چہار دیواری سے گھرے ہوئے شہر کیفصیل تک پہنچ رہا تھا۔ یہ منظر آہستہ آہستہ اس ہڈی پر اُبھر رہا تھا۔ تفصیلاً اور فوج کے گھوڑے، سپاہیوں کے لباس، ان کے سامان سے لدے ہوئے رتھ سب کے سب واضح طور پر نظروں کے سامنے آ چکے تھے۔

اس ہڈی پر جو نقوش اُبھر رہے تھے وہ بہت واضح تھے جس طرح ایک آئینہ میں کوئی منظر اُبھرتا ہے۔ یہ منظر بھی اسی طرح صاف طور پر اُبھر آیا تھا اور اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ زندہ اور سانس لیتا ہوا منظر میری آنکھوں کے سامنے آویزاں تھا۔

اس نوجوان سپہ سالار نے فصیل کے گرد پہنچ کر اپنا گھوڑا روک دیا۔ فصیل کے پھاٹک بند تھے اور اندر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نوجوان کے ہمراہی فوجیوں نے آگے بڑھ کر پھاٹک کے دروازے کھول دیے۔ اندر کون تھا جو مزاحمت کرتے؟ شہر کے اندر اور قلعہ کے چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

یہ فوج حملہ آور نہیں تھی نہ اس کے فوجیوں کی آنکھوں میں حملہ آوروں کی سی خون آشامی تھی۔ نہ اس کے سپہ سالار کی چال ڈھال میں شکار پر جھپٹنے والے درندوں کی سی تیزی تھی۔ یکایک اس کی آواز اُبھری۔

"اشتر دیوی کی قربان گاہ تک
مردوقش دیوی کے مندر تک"

اور پھر ساری فوج آہستہ آہستہ پھاٹک کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ اس کے ہمراہ پھاٹک سے اندر داخل ہونے کے لیے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ فولاد کے اسلحہ کی جھنکاریں، گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ مل کر ایک عجیب سُرتال کی موسیقیت پیدا کر رہی

تھی۔ فوجیوں کے چہرے تپے ہوئے تانبے کی طرح سرخ تھے اور ان کے جسموں پر سجے ہوئے اسلحوں پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ شاید کہیں دور کی مسافت طے کر کے یہ فوجیں اس گم گشتہ اور بھولے بسرے شہر کی فصیل تک آ پہنچی تھیں۔

اس شہر کے مکین شاید کہیں اور جا آباد ہوئے تھے اور اگر تھے بھی تو شاید بہت کم لوگ تھے جو اس عظیم فوج کی آمد کے گرد کارواں ہی سے ڈر کر ادھر اُدھر چھپ گئے تھے۔

یکایک فصیل کے فولادی اور عظیم دروازے کا ایک حصہ کھلا۔ ایک بہت بڑے بیل کا مجسمہ جس کے سینگ اونچے اور نوکیلے تھے ایک رتھ پر رکھا ہوا نظر آیا۔ اس رتھ کو چار پجاری کھینچ رہے تھے ان کے پیچھے ایک بڑا پجاری تھا جس نے زرق برق لباس پہنچ رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ کھلے دروازے سے آگے بڑھ کر پجاری سپہ سالار کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"اشتر دیوی، مشرق کے فاتح کو آشیرباد دیتی ہے۔"

تاریخ کی گتھی

انسانی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس کی مثال ایک پیاز سے دی جا سکتی ہے جس کی پرتیں کھلتی ہی چلی جائیں اور عقل یہ سوچنے پر مجبور نظر آئے کہ آخر یہ گتھی کب سلجھے گی۔ انسانی تاریخ کی گتھی بھی نہ کبھی سلجھی ہے اور نہ ہی سلجھے گی۔ تاریخ ہر دور میں مختلف اور ادھوری ہی نظر آتی ہے لیکن مرتب اثرات اور انسانی فہم و ادراک اور شعور و آگہی نے تاریخ کو ملیامیٹ ہونے سے ہمیشہ بچا کر رکھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کسی بھی عہد کی تاریخ کو مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس بڑے کام کو سرانجام دینے میں بلاشبہ کسی بھی دور کے ان بڑے انسانوں کا ہاتھ ہے جو تاریخ بنانے میں اہم کردار انجام دینے کی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ علم کی پیاس رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر دور کے سماجی رویوں کے سبب جو تبدیلی روز افزوں ہوتی رہی ہے اس سے آگاہی ہو۔ شوکت زیدی بھی ایسے ہی لوگوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ آنے والا مورخ اپنے دور کی تاریخ میں جن چند نمایاں لوگوں کو تذکرہ ضروری سمجھے گا ان میں یہ بھی شامل ہوں گے۔ ان کا تعلق بھی سندھ کے تیسرے بڑے شہر سکھر سے ہے جو میرا بھی شہر رہا ہے اور ہم دونوں نے مشترکہ طور پر علمی، ادبی سیاسی، سماجی زندگی کے نشیب و فراز سکھر ہی میں گزارے ہیں۔ اس حوالے سے میں جانتا ہوں کہ شوکت زیدی ہمہ جہت و ہمہ صفت انسان کا نام ہے جو بیک وقت ایک ماہر تعلیم، ادیب و شاعر اور سماجی حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک مورخ اور جغرافیہ دان بھی ہے اس لئے کہ میری معلومات کے مطابق شوکت زیدی تقریباً آدھی دنیا دیکھ چکے ہیں اور آدھی دنیا دیکھنے والے شخص کو ایک سیاح کہنے کے ساتھ ہی ایک تاریخ دان بھی بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں۔ ''مینا متی'' ایک ایسی سلسلہ وار کہانی کا نام ہے جو ہمارے ایک اور دوست ضیاء شہزاد کے ''ماہنامہ سات رنگ ڈائجسٹ'' میں قسط وار شائع ہو کر مقبولیت کے نئے ریکارڈ بنا چکی ہے۔ یہ کہانی بیک وقت ایک تاریخ بھی ہے اور ایک ایسا فکشن بھی جو اپنی طرز کا انوکھا اور سحر انگیز بھی ہے۔ یہ کہانی جغرافیائی حیثیت بھی رکھتی ہے اور پراسراریت کی ایک ایسی دلچسپ مثال بھی کہی جا سکتی ہے کہ پڑھنے والے کے جسم میں جھرجھری آئے بغیر رہا نہیں جائے۔ یہاں کسی لمبی چوڑی تاویل میں جائے بغیر صرف اتنا کہوں گا کہ ''مینا متی'' ضرور پڑھیے۔ اگر اس کہانی کو نہ پڑھا تو آپ کی طلسمیت متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گی۔

تو آیئے ''مینا متی'' پڑھتے ہیں۔

مظہر جمیل

مینامتی
صدیوں پر پھیلی ہوئی پراسرار و تاریخی داستان
شوکت زیدی

آثارِ قدیمہ کے جھروکوں سے جھانکتی
ہوئی رومان انگیز حقیقی سرگزشت

مینامتی

(حصہ دوئم)

(سید شوکت علی زیدی)

فہرست

طرز فغاں میری

مینا متی کی سرگزشت چھپتے ہی قارئین نے اس سے بے اندازہ دلچسپی کا اظہار کیا اور اسے فن و علم آثار قدیمہ کے پس منظر میں لکھا جانے والا ایک ایسا ادبی واقعہ قرار دیا جو اردو ادب میں بالکل انوکھا تھا۔ یہ کتاب بیک وقت ایک ناول بھی ہے اور مصر و عراق اور دوسرے تاریخی مقامات کی دفن شدہ تہذیبوں پر ایک علمی تحقیق بھی۔ میں بیک وقت ان تمام احباب اور اہل قلم کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا جنہوں نے میری تحریر میں وہ خوبیاں تلاش کیں جن کا مجھے خود بھی علم نہیں تھا۔

پچھلی بیسوی صدی میں مصر اور مشرق وسطیٰ میں اٹھنے والی سیاسی سرگرمیوں کا عکس ہے۔ قدیم عراقی، شامی اور دریائے نیل کے فراعین کی سلطنتوں کا خاکہ ہے اور اردو زبان کی سادہ بیانیہ پرکاری کا آئینہ ہے۔

تمام ادبی دوستوں کا خیال تھا کہ مینا متی کی داستان اس وقت تک ادھوری ہے جب تک اس کا وہ باب مکمل نہ کر لیا جائے جہاں مینا متی کی دریافت ہوتی ہے۔ اسی لئے اب مکمل داستان آپ کے ہاتھ میں ہے۔

مینا متی کون ہے؟ کہاں ہے؟ حقیقت ہے یا محض افسانہ؟ اور کیوں اتنے ہزاروں سالوں سے لوگوں سے پوشیدہ ہے؟

اس جیسے سینکڑوں سوالات مجھ سے پوچھے جاتے رہے ہیں۔ ان سب کا جواب مختصراً یہ ہے کہ آپ کے ذوق کی تسکین کے لئے مینا متی کا دوسرا اور آخری حصہ آپ کے سامنے ہے اسے ملاحظہ فرمایئے تا کہ آپ کے سارے سوالات کا جواب مل جائے۔

اس حصے میں آپ کو عراق سے متعلق چند مذہبی انکشافات بھی ملیں گے جو مختلف غیر مصدقہ ذرائع اور تحاریر سے مجھ تک پہنچے ہیں افسانوی ناولوں یا لوک تحریروں اور ادبی ورثوں میں سچ اور جھوٹ کی تحقیق نہیں کی جاتی بلکہ اُن کو سینہ بہ سینہ چلتی ہوئی روایات کا ایک بہاؤ سمجھ کر اپنایا جاتا ہے۔ سو کسی بے ادبی کا شائبہ لائے بغیر ان کو نقش سلیمانی کے ضمن میں بیان کر دیا گیا ہے۔ جس سے کسی کی بھی دل آزاری مقصود نہیں۔

آپ اس کتاب میں مینامتی کے دونوں حصے پڑھ کر ناراض ہونا چاہیں، اسے وقت کا زیاں سمجھنا چاہیں، بے سروپا انشائیہ سمجھیں یا اردو ادب میں ایک نیا باب گردانیں۔ یہ سب آپ کا حق ہے۔ میں تو صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ:

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

میں نے اپنا عزیز سرمایہ تیرے سپرد کر دیا ہے
کم اور زیادہ کو اب تو ہی جانے

شوکت زیدی

پہلا باب

مصر سے روانگی

مصر سے نکل کر اب روسی، میں اور سر جان مارشل عراق کی طرف روانہ ہونے والے تھے۔ روسی اکثر بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ اس کو بس ایک ہی دُھن تھی کہ ہم کو جلد از جلد مینا متی تک پہنچنا چاہیے جس کو ہماری زندگیوں کا مقصد بنا دیا گیا ہے۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ میں تو پیغام اور ہدایات صرف وصول ہی کر سکتا ہوں نہ مجھے اپنے سفر پر قدرت ہے، نہ ہی اپنے آنے والے دنوں کے لئے کوئی راستہ مقرر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ موجوں کے رُخ پر کشتی ہے جو بنا مانجھی اور بنا پتوار کے بس بہے چلی جارہی ہے۔ میں اس کا مسافر ہوں ناخدا نہیں۔ سو میں نہیں جانتا اس عراقی بادشاہ سینا ثرب کی بیٹی کو کیسے، کہاں سے اور کب گمشدہ دفینوں سے نکال کر باہر لا سکوں گا۔ میں یہ سب کچھ روسی کو کئی بار بتا چکا تھا مگر اس کے اضطراب میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔

مصر کے قیام کے پانچ چھ سال کسی طوفان خیز خواب سے کم نہ تھے۔ میں ایک کیمبرج کے معمولی انیس سال کے لڑکے سے بڑھ کر 23 سال کا ایک نامور شخص بن چکا تھا اور جان مارشل جیسا عالم و فاضل بھی مجھے بہت وقعت بخشتا تھا اور میں اکثر اس دن کو یاد کرتا تھا کہ جب جان مارشل کیمبرج میں ہندوستان کے کسی کھنڈر کی کھدائی پر لیکچر دینے کے لئے ہی کیمبرج یونیورسٹی کے کالج آئے تھے اور میں ان سے ملا تھا اور پھر کیسے میرا ان کا ساتھ ہوگیا اور ہم پھر کس طرح سوئز کینال کی طرف روانہ ہو کر مصر کی بندرگاہ اسماعیلیہ پہنچے تھے اور پھر وہ اشرف بیگ سے ملاقات۔ شیخ سباعی کی شفقتیں، اہرام کے اندر پہنچنا اور پھر فرعون رامسیس کی حنوط شدہ لاش کی دریافت، یہ سب کی سب نظروں میں گھوم جاتی تھیں۔

ان پانچ سالوں میں، میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ مگر اس میں میرا تو کوئی ہنر نہ تھا بلکہ یہ سب کچھ تو کوئی نادیدہ قوت ہی مجھ سے کراتی رہی تھی گویا کندن بنانے کے لئے مجھے بھٹی میں تپایا جا رہا

تھا۔ بس میں سر جان مارشل کے ساتھ مصر کے مختلف مقامات پر پانچ سال تک کھدائیوں میں بھی مصروف رہا۔

اب ہماری منزل عراق تھا اور وہاں سے مجھے سر جان مارشل کے ہمراہ برصغیر ہندوستان پہنچنا تھا جہاں وہ ایک بڑے عہدے پر بطور مشیر تعینات تھے اور آثار قدیمہ کے کسی کھنڈر کے لئے اضافی فنڈز کا مطالبہ کرنے اور اپنا کیس متعلقہ محکمہ خزانہ کے افسران کو سمجھانے کے لئے لندن آئے تھے۔ وہ ایک سال کی چھٹی لے کر آئے تھے اور اب دو ماہ میں ان کو واپس برصغیر پہنچ کر ڈائریکٹر آثار قدیمہ ہندوستان کا عہدہ پھر سے سنبھالنا تھا۔ مگر کسے معلوم تھا کہ عراق میں ان کا قیام مہینوں کا نہیں بلکہ سالوں کا ہوگا۔

عراق جانے سے قبل عراق کی قدیم تاریخ اس کے قدیم تہذیب وتمدن پر وہ روز ہی ہماری معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ عراق میں ان کے ایک دوست لیونارڈ وولی بھی آثار قدیمہ کے ایک ماہر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ یہ پہلے مصر میں بھی چند مقامات پر قدیم دفن شدہ بستیاں کھود کر کافی مشہور ہو چکے تھے۔ تو سر جان مارشل ان سے بھی ملنا چاہتے تھے۔

چنانچہ روسی، میں اور سر جان مارشل اسماعیلیہ کی بندرگاہ سے ایک بحری جہاز میں عراق کی بندرگاہ بصرہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ اپریل 1905 عیسوی کا زمانہ تھا۔

عراق قدیم تہذیبوں کا گہوارہ تھا۔ اسی عراق میں تقریباً سات ہزار سال قبل سونا، سمارا اور پھر حلف کی ابتدائی تہذیبوں نے جنم لیا تھا اور یہیں پر ہی ماہرین آثار قدیمہ کو اُرک کے تمدن کے آثار ملے۔ اسی عراق میں تین ہزار سال قبل مسیح کا نینوا کلچر دریافت ہوا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں پر کش (Kish) اُرک، اُر، اک منگ جیسی ابتدائی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں۔ عکاظ کی سلطنتیں جن میں سارگان، ارحیش، ندام سین، سیناشرب اور آشور بنی پال جیسے بادشاہ گذرے۔

عراق کی قدیم ترین تاریخ سے لے کر قبل مسیح لگ بھگ کے زمانے تک کی تفصیل کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دجلہ وفرات کے پانیوں سے بنی ہوئی یہ وادی اپنے اندر کتنے عظیم الشان شخصیتوں کے جسود خاکی کو سلائے ہوئے ہے۔

عراق میں اپنے سفرنامے کے اصل قصے کو شروع کرنے سے قبل میں آپ کو تھوڑا بہت عراق کی وادی، اس کے ریگستان، اس کی قدیم تاریخ اور اس کے متعلق کچھ اضافی معلومات بہم پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں۔

دریائے سندھ کے مشرق سے جو ریگستان شروع ہوتا ہے تو دریائے نیل تک صحرا ہی صحرا

ہے۔ یہ ریگستان سندھ سے مصر تک 3300 میل لمبا ہے اور نیل کے مشرق سے بحراوقیانوس کے ساحل تک کا صحرائے اعظم اس کے علاوہ ہے۔ مگر سندھ سے نیل تک کے ریگستان کی ایک مخصوص اہمیت ہے کہ ازمنہ قدیم سے اسلام کے عہد تک اسی علاقے میں تاریخ، مذہب اور تہذیب کی ابتداء ہوئی اور اس علاقے کے درمیانی حصے میں دجلہ وفرات کی وادی ہے جو خاص طور پر تاریخ کا گہوارہ رہی ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں ابتدائی انسانی تہذیب کا ارتقاء ہوا۔

دجلہ وفرات کی درمیانی وادی کا نام عراق نسبتاً ایک نیا نام ہے۔ زمانہ قدیم میں اس کا کوئی مستقل اور متحدہ نام نہیں تھا۔ یا تو یہاں شہری یا مقامی ریاستوں کے نام سے علاقوں کی شہرت تھی یا خاندانوں کی شہنشاہیتوں کی بدولت جو عموماً بہت کم رقبے پر حکومت کرتی تھیں۔ یونانیوں نے عراق کی وادی کو پہلی بار ایک مجموعی نام دیا اور وہ نام تھا میسوپوٹیمیا۔ قدیم یونانی زبان میں اس کے معنے ہیں دو دریاؤں کی درمیانی زمینیں۔ یعنی دجلہ وفرات کے درمیان زمینیں۔ بعد میں عربوں نے اسے عراق کہا جو کہ عرق کی جمع ہے جس کا مفہوم تھا کہ کوہ ارارت کے عرق یعنی پانیوں کی زمین۔

گو آج کے عراق اور یونانیوں کے اس علاقے کے مفہوم میں جس کو انہوں نے میسوپوٹیمیا کہا تھا کافی فرق ہے۔ آج یعنی 1910ء میں اس علاقے میں عراق، شام اور ترکی کے کچھ جنوبی حصوں اور ایران کے شمالی حصوں کا نام بھی شامل ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت اس وادی کا تاریخی ورثہ آج بھی زیادہ تر عراق ہی کے پاس ہے کیوں کہ اس علاقے میں ماہرین آثار قدیمہ نے وہ کھنڈرات کھود نکالے ہیں جن کے ذریعے وادی دجلہ وفرات کی کم وبیش پانچ ہزار سالہ تاریخ ظاہر ہوگئی ہے۔ بلکہ تاریخ کے مطالعے کے سفر میں سنگ میل ثابت ہوئی۔ یہ نشانات یا یہ شہر خود اپنے تمدنی عروج کے زمانوں میں اپنی اپنی سلطنتوں کے پایہ تخت یا اہم ترین شہروں میں شامل تھے۔ گو آج کل کے معمولی قصبات سے بڑے نہ تھے مگر ان میں جو تاریخی آثار ملے ہیں وہ اس وادی کی پوری تاریخ کے ارتقاء کی کڑیاں جوڑتے نظر آتے ہیں۔

ان گمشدہ تہذیبوں کے وارث شہروں میں اُر، اُرک، نینوا، نپر، اگوے، بابل اور غرود خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہ سب کے سب دجلہ وفرات کی گذرگاہوں کے کناروں پر آباد تھے۔

دجلہ وفرات کی یہ وادی جسے یونانیوں نے میسوپوٹیمیا کا نام دیا، دراصل ایک تکون کی صورت میں ہے جو عرب کے ریگستان اور ایرانی سطح مرتفع کے درمیان پھیلی ہوئی ہے۔ اس تکون کا تین چوتھائی حصہ آج کے موجودہ عراق کے پاس ہے اور ایک چوتھائی شام کے قبضے میں ہے۔ اس وادی کے جو علاقے ایران یا ترکی کی تحویل میں ہیں حقیقتاً جغرافیائی لحاظ سے ان کی وسعت اس وادی

کے کل رقبے کے ایک معمولی حصے سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس وادی کی تہذیب کو اور اس علاقے میں فروغ پانے والے قدیم تمدن کو تاریخ دانوں نے مختلف تہذیبوں کا نام دیا ہوا ہے۔ مگر ان سب کا مرکزی نام آج بھی دجلہ و فرات کی وادی کی تہذیب ہی کہلاتا ہے۔ ویسے ان کے الگ الگ ناموں میں شالدین تہذیب، اسیریائی و بابلی تہذیب، سمیری اکادی تہذیب اور سُمری نامی تہذیبوں کے نام شامل ہیں۔

ان دونوں دریاؤں کی سرزمین کی تہذیب اور تمدنی ارتقاء پر نظر ڈالنے سے قبل میں آپ کو ذرا دجلہ و فرات کے بارے میں بھی کچھ بتاتا چلوں، دونوں دریا یعنی دجلہ اور فرات آرمیدیا کے پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ دجلہ جھیل دان کے جنوبی حصے سے نکلتا ہے اور فرات کوہ ارارت سے۔ فرات کی کل لمبائی 1780 میل ہے اور دجلہ کی لمبائی 1150 میل۔ دریائے فرات کی ابتدائی گزرگاہ بہت سے پیچ و خم کھاتی ہوئی ترکی سے گزرتی ہے مگر دجلہ فوراً ہی تورس کے پہاڑوں سے گذر کر جنوبی ریگستان کا رخ کر لیتا ہے۔

ان پہاڑوں کے قریب دجلہ و فرات کا درمیانی فاصلہ کم و بیش 250 میل کا ہے۔ دریائے فرات کا ابتدائی رخ بحر روم کی طرف تھا مگر جب یہ دریا سمندر سے صرف 100 میل دور رہ جاتا ہے تو اس کا رخ پھر جنوب مشرقی ریگستانی حصے کی طرف ہو جاتا ہے اور دجلہ کی گذرگاہ کی سمت بہنے لگتا ہے۔ موجودہ بغداد کے قریب آکر دونوں دریا قریب قریب بہنے لگتے ہیں کیونکہ بغداد میں ان دونوں دریاؤں کا درمیانی فاصلہ صرف 20 میل رہ جاتا ہے۔ مگر بغداد سے پھر انکا رخ اُدھر اِدھر مڑ جاتا ہے اور یہ بصرہ سے 60 میل دور قرنا تک ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ قرنا میں یہ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں جہاں ان کا ڈیلٹا شط العرب کہلاتا ہے اور یہاں سے یہ دونوں دریا 60 میل تک ساتھ ساتھ بہہ کر سمندر میں گر جاتے ہیں۔

شمال میں ان کی گذرگاہ چونے کے پتھروں کے راستے میں ہے جہاں ہزاروں سالوں سے ان کی گزرگاہ تبدیل نہیں ہوئی ہے مگر جنوب کے میدانی علاقوں میں دجلہ اور فرات جگہ جگہ اپنی چھوٹی چھوٹی شاخیں بنا لیتے ہیں جو قدرتی آبپاشی کی نہروں اور آبی گذرگاہوں کا کام دیتی ہیں اور یہ گذرگاہیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں اور زمانہ قدیم میں ان گذرگاہوں کے قریب آباد شہر دریا کی شاخوں کے بہاؤ کے ساتھ بنتے اور بگڑتے رہتے تھے یعنی دریا کی گذرگاہ بنی تو بستیاں آباد ہونے لگیں اور پھر یہ آبادیاں دریا کی ان شاخوں کے بدلتے ہی ویران اور بے آباد ہو جایا کرتی تھیں جو اب ماہرین آثار قدیمہ کھود کھود کر نکال رہے ہیں۔

دریائے دجلہ وفرات کی وادی ایک ریگستانی وادی ہے۔ جہاں دریاؤں کی لائی ہوئی زرخیز مٹی کی تہہ بنتی ہیں وہاں کنکریلے پتھروں کی سخت زمین سی ہے، وہاں چھوٹی چھوٹی کچی مٹی کی پہاڑیاں یا سفید لائم اسٹون کی اونچی نیچی پہاڑی کڑیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ دور دور تک گھاس کا ایک تنکا تک نہیں اگتا۔ گرمیوں میں یہاں کا درجۂ حرارت عموماً 120 درجے کے لگ بھگ رہتا ہے۔ راتیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں مگر دن حد درجہ گرم۔ سال بھر میں بارش کا اوسط دو یا تین انچ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ فصلوں میں جو، گنا، چاول اور جوار پیدا ہوتے ہیں۔ کپاس اور گندم بھی کاشت ہوتی ہے۔ پھلوں میں کھجور سب سے اہم پھل شمار کیا جاتا ہے۔

یہاں زمانہ قدیم سے کاشت کے دو تین طریقے رائج ہیں۔ یا تو چڑھتے ہوئے دریا کے کنارے سے ابل کر نکلنے والے پانی کو بڑی بڑی جھیلوں، تالابوں یا گڑھوں میں بھر لیا جاتا ہے جس کو سال بھر استعمال کیا جاتا ہے یا پھر چھوٹے موٹے بند باندھ کر چھوٹی چھوٹی شاخیں دریا سے کاٹ لی جاتی ہیں یا اب موجودہ زمانے میں ان کی جگہ نہریں کھود لی گئی ہیں اور ایک پرانا طریقہ آبی گذرگاہوں کے قریب کنویں کھودنے کا ہے، جس سے پانی کو کھیتی باڑی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

عراق کا کسان مصر یا سندھ کے کسان سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ مگر ان کی رنگت گندمی سرخی مائل ہوتی ہے۔ یہ لوگ سوتی چوغہ نما پھیلا ہوا لباس، سر پر پگڑی یا دھوپ سے بچاؤ کا کوئی کپڑا اور کھڑے نقوش کے لکیروں والے کپڑے پہنتے ہیں۔ ان کے جسم موٹے اور طبعیت میں گرمی سے اور سخت محنت سے جی چرانا اور زیادہ وقت کو مجلسی خوش گپیوں میں ضایع کر دینا ان کا وطیرہ ہے، ہمیشہ ہی سے ان کے سب سے زیادہ جھگڑے زمین اور پانی پر ہی ہوتے رہے ہیں۔ موسم کی سختیوں نے انہیں زیادہ جاندار اور جفاکش بنا دیا ہے۔ موسموں کی قوت برداشت اور گفتگو کی گرم مزاجی اس کے کردار کا خاصہ ہیں، یہ خاندان کے سربراہوں کی قیادت میں قبیلوں کی شکل میں رہتے آئے ہیں۔ خون کے رشتوں اور قبیلوں سے ان کی وفاداریاں مسلّم ہیں۔ قبیلے کے ایک فرد کی تکلیف پورے قبیلے کی اجتماعی اور انفرادی ذمے داری سمجھی جاتی ہے۔

قدیم زمانے میں جو قبائل زرخیز زمینوں پر آباد ہو جاتے تھے ان میں خانہ بدوشی کا تمدن ختم ہو جاتا تھا اور ان کی زندگی نسبتاً آباد گاروں جیسے تمدن کی طرف مائل ہو جاتی تھی۔ اس قدیم دور کی زندگی کے یہی دو عنوان تھے۔ صحرا میں پانی کی تلاش اور اگر وافر مقدار میں پانی مل جائے تو اس علاقے میں سکونت اور اس کی حفاظت۔ دریاؤں کے قریب کی بستیاں کچی مٹی کے گارے سے بنی ہوئی اینٹوں پر تعمیر ہوتی تھیں اور جو آبادیاں بالکل دریا کے ساحل پر ہوتی تھیں ان میں دریائی

گھاس، پٹھے اور کھجور کی شاخیں استعمال کی جاتی تھیں۔

زرخیز وادی کے علاقوں میں چونکہ آبادیاں قائم ہو جاتی تھیں اس لئے دوسرے خانہ بدوش قبائل ان علاقوں پر قابض ہونے کی تمنا کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آباد علاقوں کی بستیوں میں مستقل طور پر دفاعی جنگوں کی تیاری موجود رہتی تھی۔ دوسری طرف ان کے مخالف خانہ بدوش یا نسبتاً کم ذرائع والے جنگجو قبائل ہمیشہ ان زرخیز وادیوں، کھلیانوں، کاروانوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ یہ حملے عموماً عرب کے ریگستانوں میں بسنے والے بدو خانہ بدوشوں کی طرف سے وادی دجلہ وفرات کے شہروں پر ہوتے رہتے تھے۔

عراق کے شمال میں پہاڑی علاقہ جو کردستان کے سلسلے کہلاتے ہیں بارش کے معاملے میں زیادہ خوش قسمت ہیں۔ یہاں سالانہ اوسط 12 سے 25 انچ تک ہے اور ان پہاڑوں کی بلندیاں 8 ہزار فٹ سے لے کر 11 ہزار فٹ تک ہیں۔ ان پہاڑوں پر برفباری بھی ہوتی ہے اور ڈھلوانوں پر بڑے شاداب جنگلات بھی ملتے ہیں۔ اس سلسلہ کوہ کو زخراس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گورس کا پہاڑی سلسلہ بھی اسی کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جو ایران کی وادی کو عراق سے علیحدہ کرتا ہے۔ یہاں پر دریائے دجلہ کی چار چھوٹی چھوٹی معاون ندیاں بہتی ہیں جو کہ زاب صغیر، زاب کبیر، دیالہ اور عظیم کے نام سے مشہور ہیں۔ اس علاقے میں زیتون، انگور اور مختلف اقسام کے پھل، دیار اور چیڑ کے جنگلات پائے جاتے ہیں۔

شمال سے جنوب کی طرف جیسے جیسے بڑھتے ہیں بارش کا اوسط کم ہوتا جاتا ہے۔ مگر ان علاقوں میں سرسبز چراہگاہیں بڑی افراط میں ہیں۔ یہاں زمانہ قدیم ہی سے مویشی پائے جاتے ہیں۔ بکری، بھیڑ، گائے، بیل اور گھوڑوں کی افزائش نسل کے لئے یہ علاقہ بہت موزوں ہے۔ اس علاقے میں جن کو ترائی کا علاقہ سمجھنا چاہئے، جنگلی سؤر، ریچھ، بھیڑیئے، شیر اور مختلف اقسام کے درندے اور جنگلی جانور سب ہی مل جاتے تھے اور آج بھی یہ علاقہ بہترین شکارگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

عراق کے شمال میں پہاڑی سلسلوں ہی میں ارارت کے سلسلے کا وہ پہاڑ ہے جس سے دریائے فرات نکلتا ہے۔ یہ پہاڑ 11 ہزار فٹ تک بلند ہے اور یہی وہ پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر نوح کی کشتی کے ٹکڑے دریافت ہوئے ہیں اور جن کو روسیوں نے دریافت کیا ہے اور جس پر عبرانی قدیم زبان میں اسلام کی برگزیدہ ہستیوں کے نام ملتے ہیں جس کا ذکر آپ بعد میں پڑھیں گے۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ طوفان نوح میں پانی کی بلندی 11 ہزار فٹ بلند پہاڑ تک کو ڈبو چکی تھی اور یہ طوفان عراق ہی کے ایک چھوٹے سے گاؤں نجف کے علاقے سے شروع ہوا تھا۔

زمانہ قدیم میں شمالی عراق اور جنوبی عراق کی سلطنتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے دست و گریباں رہیں اور قریباً 2 ہزار سال قبل مسیح کی دو سلطنتیں شمال میں سمر اور عکاظ تھیں جن کا پایہ تخت پہلے اُر اور پھر بابل رہا اور جنوب کی اسیریائی سلطنت کی تاریخ اس قسم کے جنوبی اور شمالی حکومتوں کی معرکہ آرائیوں سے بھری پڑی ہیں۔

عراق میں قدیم ترین شہروں کی کھدائی کی گئی ہے جن میں باری، نینوا، جمرود، کرکمیش، سپر، شروک، اُرک اور اُرو غیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ عراق میں بے شمار آثار قدیمہ کے نشانات ہیں جن کو تلہ کہتے ہیں۔ عربی کے اسی لفظ سے اردو لفظ ٹیلہ بنا ہے۔ یہ نشانات دسیوں بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں کی تعداد میں دریافت ہو چکے ہیں اور ان ٹیلوں کی کھدائی سے جو ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے، ہڈیوں، مٹی یا تانبے اور لوہے کے مختلف گلاس، صراحی وزن کے باٹ، ترازو، چاقو، جام، عطردان، اوزار، باٹ، گھڑے، رکابیاں، اناج ذخیرہ کرنے کے بڑے مٹکے، سل اور گھریلو استعمال کی مختلف اشیاء ملی ہیں۔ ان سے عراق میں بہت سے تہذیبی ادوار کا پتہ چلتا ہے جو مختلف وقتوں میں بنتے اور بگڑتے رہے ہیں۔

عراق کا سب سے اوّل تہذیبی دور، دورِ اُرک کہلاتا ہے جو قریب قریب 3 ہزار سال قبل مسیح اختتام پذیر ہو گیا تھا۔ یہ دور اُرک دور اس لئے کہلاتا تھا کہ اس تمدن اور تہذیب کے نشانات سب سے پہلے اُرک کی کھدائی کے دوران ملے تھے۔ یہاں سے ملنے والے مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے عموماً سادہ اور کسی نقش و نگار کے بغیر تھے بعد کے ادوار میں ان پر رنگ برنگی گلکاریاں ہونے لگی تھیں۔ اس طرح ان ادوار کی درجہ بندیاں کی جاتی ہیں اور ان کے سالوں کا بھی تعین کئے جاتا ہے۔

یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا تا چلوں کہ آثار قدیمہ میں کسی زمین سے دریافت ہونے والی چیز کی عمر کا پتہ کیسے چلتا ہے؟ سائنس کی ترقی کی بدولت تاریخ دان اس قابل ہو گئے ہیں کہ قریب قریب ہر قدیم چیز کی عمر کا بالکل صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ سائنس کے اس فارمولے کا نام ''ریڈیو کاربن 14'' کا اصول ہے۔ جسے شکاگو کے ایک سائنسدان ڈبلیو ایف لیبی نے موجودہ صدی ہی میں مکمل کیا تھا۔

اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر نشو نما پانے والی چیز جن میں انسان، جانور، درخت سب ہی شامل ہیں۔ کاربن کی موجودگی لازمی ہوتی ہے اور اس کاربن کا ایٹمی وزن 12 ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں کاربن کا تابکاری آئسوٹوپ جس کا ایٹمی وزن 14 ہے وہ بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ تابکاری آئسوٹوپ 14 فضا کے بالائی حصے میں سورج کی شعاعوں کے نائٹروجن گیس کے ملنے سے بنتا ہے اور

یہ دونوں قسم کے کاربن زمین پر گرتے رہتے ہیں۔ کاربن کے یہ ذرات پہلے درختوں اور پودوں میں حلول کرتے ہیں اور پھر ان کے ذریعے جانداروں میں سرائیت کر جاتے ہیں۔ مگر کاربن 14 اور کاربن 12 کا تناسب ہر جاندار میں ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔

کسی بھی جاندار کی موت کے بعد اس کا جسم کاربن 14 کو جذب نہیں کرتا بلکہ کاربن 14 کا جو حصہ اس مردہ جسم میں موجود رہ جاتا ہے وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ کاربن نائٹروجن میں تبدیل ہو جاتا ہے اور 5730 سال کے بعد ایک مردہ جسم میں کاربن 14 بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح جس چیز کی بھی عمر معلوم کرنی ہو اس میں کاربن میتھڈ سے صرف یہ جانچنا ہوتا ہے کہ اس میں کاربن 14 کی کس قدر مقدار باقی رہ گئی ہے۔ یہ طریقہ کار لکڑی، ہڈی، گھونگا، جلی ہوئی اشیاء، انسانی اور حیوانی ڈھانچوں میں یکساں آزمایا جا سکتا ہے اور ان کی عمر معلوم کی جا سکتی ہے۔ اس طریقے سے کسی بھی دریافت کی ہوئی تاریخی چیز کی بالکل اصلی عمر معلوم کی جا سکتی ہے۔ یہ طریقہ اب عام طور پر مستعمل ہے اور ہر ماہر آثار قدیمہ اس کی صحت کو تسلیم کرتا ہے۔

آیئے عراق کے تہذیبی اور قدیم تاریخی ورثے پر نظر ڈالنے سے پہلے ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ عراق کی تاریخ کو کھنگالنے اور دریافت کرنے میں کس کس ماہر آثار قدیمہ نے کب کب خدمات انجام دیں۔

عراق میں آثار قدیمہ کی دریافت کی ابتدائی کوشش 1786ء میں فرانسیسی ماہر جوزف ڈی بیوسٹمپ نے کی تھی۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ملازم نے جس کا نام کلاڈیس جیمس رچ تھا اور جو کمپنی کی طرف سے بغداد میں بطور ریزیڈنٹ تعینات تھا۔ عراق میں مختلف مقامات کی کھدائی میں حصہ لیا جو 1807ء میں شروع کی گئی تھی۔ ان دو ماہرین کے بعد مندرجہ ذیل تاریخ دانوں نے بھی عراق میں کھدائیاں کرائیں اور مختلف آثار برآمد کئے جس سے عراق کی قدیم تاریخ کی گرہیں کھلتی چلی گئیں۔

1۔ سر جیمس بکنگھم (1826ء)۔ 2۔ رابرٹ مکفن (1827ء)۔
3۔ جیمس بیلی فریسر (1834ء)۔
4۔ سر ہنری کرس وائیک (1880-95ء)۔
5۔ پال ایل بوٹا (1843): ایسرتین کے آثار دریافت کئے۔
6۔ سر ہنری لیارڈ (1845ء): سمیر کے اور نینوا کے مقامات دریافت کئے۔
7۔ ارنسٹ ڈی سارزی (1877ء): سمیریوں کی تہذیب دریافت کی۔

8۔ سر چارلس وولی: بیسویں صدی کے شروع میں اُرک میں دریافتیں کیں۔ یہ سر جان مارشل کے دوست تھے اور چارلس وولی سے اس سرگزشت کے راوی جان میلکم کی ملاقات وہاں 1910ء میں ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ تاریخ میں ماہرین آثار قدیمہ میں گروئے فنڈ کا نام بھی مشہور ہے کیونکہ اس نے پہلی بار پرسی پولس اور اُر کے کھنڈرات سے نکلنے والی مٹی کی اینٹوں پر کھدی ہوئی تصویری زبان کو پڑھنے کی کامیاب کوشش کی تھی جو قدیم فارسی زبان کی ایک بالکل ابتدائی شکل تھی۔ یہی زبان جنوبی عراق میں بھی پائی جاتی تھی۔

عراق کے آثار قدیمہ کے ماہرین کا تذکرہ رافن سن کے نام کے بغیر نامکمل سا لگتا ہے کیونکہ یہی وہ باہمت اور پاگل پن کی حد تک مستقل مزاج شخص تھا جس نے 1835ء سے ..184 تک جنوبی عراق میں بلکہ مغربی ایران کے اونچے پہاڑوں پر ڈاریس اعظم کے دور کی کندہ کی ہوئی عبارتوں کو چٹانوں سے منتقل کیا۔ یہ چٹانیں اس قدر خطرناک گھاٹیوں اور زاویہ قائمہ کی طرح کی عمودی صورت میں موجود تھیں کہ ان پر قدم جمانا اور ٹھہر جانا بھی ناممکن تھا اور ان تمام سالوں میں ہر لحظہ اس کی جان کو خطرہ لاحق تھا کہ اگر ذرا بھی بے احتیاطی ہو جاتی ہے یا ذرا سا بھی توازن بگڑ جاتا ہے تو ہزاروں فٹ گہری کھائی میں اس کی قبر بن جاتی۔

رافن سن اور اس کے ہمعصر فرانسیسی جیولس لوپرٹ اور ایک برطانوی ماہر ایڈورڈلس نے مل کر عراق کی مختلف تحریری زبانوں کو جن کو بابلی، اسیری یا اکادین زبان کہا جاتا ہے، پہچان لیا تھا اور اس کے مفہوم سے آگاہی حاصل کر لی تھی۔

ہم لوگ یعنی سر جان مارشل، میں جان میلکم اور روسی وغیرہ جن دنوں عراق پہنچے تو ایک دوسرے جرمن ماہر آثار قدیمہ سر رابرٹ کالڈیوی بابل کی کھدائی میں مصروف تھے۔ سر جان مارشل بھی اپنے اس ہمعصر کی بے حد عزت و توصیف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کالڈیوی عصر حاضر کا ایک کامیاب اور بے حد مشہور آثار قدیمہ ہے اور کچھ عجب نہیں کہ وہ بابل کی اصل تاریخ کو واقعی ڈھونڈ نکالے۔

جب ہم عراق پہنچے تو کالڈیوی واقعی بابل کی چھپی ہوئی اور سینکڑوں سالوں سے ہزاروں ٹن مٹی کے نیچے دبی ہوئی تصویر کو برآمد کر چکا تھا۔ عراق ہی میں سر جان مارشل کے دوسرے دوست سر جان وولی بھی بڑی مستقل مزاجی سے اُرک میں کھدائی اور تحقیقاتی کاموں میں مصروف تھے۔

بابل کی طرف نظر ڈالنے سے قبل یہ سمجھئے کہ عراق ہی میں انسانی تہذیب کے ارتقاء کی اولین

شکل ظاہر ہوئی ہے اور یہ دریافت جرمو نام کے ایک کھنڈر سے ہوتی ہے جس کے قریب قریب تین اور ٹیلے بھی دریافت ہوئے تھے۔ پہلا کھنڈر جس کی کھدائی کی گئی شاہنپدار کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرا اکرم شہر کے نزدیک ہے، تیسرے کا نام میلاغات ہے جو کرکوک کی شاہراہ پر واقع ہے اور چوتھا جرمو کے کھنڈرات کے نام سے مشہور ہے اور یہ چاروں بستیاں بالکل ابتدائی دور کی ہیں۔

مگر جرمو کے آثار قریب قریب 6500 سال قبل مسیح کے قدیم دور سے متعلق ہیں۔ یہ بستی اگرچہ چھوٹی تھی لیکن اس میں سے جو اشیاء برآمد ہوئی ہیں وہ بہت ہی اہم اور قیمتی تھیں کیونکہ جلے ہوئے جو اور گندم کے دانے اور پالتو جانوروں کی ہڈیاں، ہڈیوں کے بنے ہوئے چاقو اور چھرے، کلہاڑی نما اوزار وہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس دور میں عراق کی ان بستیوں میں رہنے والے زرعی کاشتکاری اور گلہ بانی کے دور میں داخل ہوئے تھے اور یہاں فینولیتھک تہذیب شروع ہو چکی تھی۔

یہ وہ عہد ہے جس کی عمومی تاریخ ہمارے پاس نہیں ہے البتہ 5 ہزار سال قدیم کے زمانے میں ہمیں شمالی عراق میں مسونا اور سماترا اور پھر اس کے 5 سو سال کے بعد حلاف اور پھر عبید کی تہذیبیں اور سلطنتیں نظر آتی ہیں۔ 3500 سال قبل مسیح سے لگ بھگ شمالی عراق میں گاوارا تہذیب اور جنوبی عراق میں اُرک تہذیب کے آثار نظر آتے ہیں اور پھر 3 ہزار سال قبل مسیح میں نینوا تمدن کی ابتداء ہوتی ہے۔ جس میں رسم الخط کی کچھ شعوری کوششیں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس دور میں الفاظ تصویروں کی بجائے ایک مخصوص انداز میں بنائے جانے لگے تھے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب سرسبز میدانوں اور پانی کی تلاش میں ریگستان میں پھرنے والے خانہ بدوش افراد نے جتھوں کی صورت میں چھوٹی چھوٹی بستیاں بنا کر رہنا شروع کر دیا تھا۔ اس دور میں گلہ بانی بھی شروع ہو چکی تھی۔ گندم، جو، جوار اور غالباً کپاس کی کاشت بھی ہونے لگی تھی۔ مویشی پالے اور سدھائے جا چکے تھے۔ ان سے دودھ اور غذا اور زراعت کا بھی کچھ کام لیا جانے لگا تھا۔ مکانات کچھ مٹی کی بنائی ہوئی اور دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنائے جانے لگے تھے اور درختوں کی شاخوں سے چھتیں بنائی جانے لگی تھیں۔ یہ انسانی تہذیب کے ارتقاء کا گویا ابتدائی زمانہ تھا جو 5 ہزار سال قبل مسیح سے 3500 قبل مسیح کے زمانے تک محیط ہے۔

پھر انسانی تہذیب نے کچھ اور سماجی شعور حاصل کیا۔ بستیاں چھوٹے چھوٹے شہروں میں تبدیل ہونے لگیں۔ ان شہروں کی آبادی کی بنیاد سرسبز علاقہ اور وافر پانی کی وصولیابی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ان آبادیوں پر خانہ بدوشوں پر حملوں کے بھی مستقل خطرات منڈلاتے

رہتے تھے۔ان خطرات کے دفاع کے لئے فوجی تنظیمیں بننا شروع ہوئیں۔قبیلوں اور بستیوں کے راجہ، سرداراور سپہ سالار بھی بننے لگے۔ مذہبی رسومات کی تیاریوں اور ادائیگیوں کے لئے مذہبی پیشوااور رہنما بھی متعین ہونے لگےاوراس طرح انسانی معاشرے میں راجہ،فوج، مذہبی پیشوا، سپہ سالاراور دیگر عمال کے عہدے پیدا ہونے لگے۔

ایک طرف انسانی تہذیب کی ترقی ہوتی گئی اور دوسری طرف انسانی تاریخ بنتی گئی۔انسانی مذاہب کے خاکے ابھرنے لگے۔مذہب انسان کی ضرورت بن گیا تھا کیونکہ مظاہر فطرت اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔انسان کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کیوں مر جاتا ہے اور مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں اس نے اپنی عقل سمجھ کے مطابق بہت سے دیوتا بنائے۔

عراق میں مختلف سلطنتوں میں خصوصاً سمیریوں اور اسیریوں میں جو بہت سارے دیوتا بنائے گئے تھے وہ یہ تھے:

عین اُرتا: جنگ کا دیوتا۔

اُتو: سورج دیوتا جو اندھیرے کے خلاف تھا۔

نین ہرساگ: مادر دیوی جو تمام انسانوں کی ماں تھی اس کو اشتر دیوی بھی کہتے ہیں۔

انانا: محبت کی دیوی۔

دوموزی: سبزے اور درختوں کا دیوتا۔

ان لیل: فضاؤں اور آسمانوں کی قوت کا دیوتا۔

ان کی با عنقی: یہ سمیریوں کا عظیم دیوتا کہا جاتا تھا۔

مردوک یا مردوقش: ہواؤں کا دیوتا۔

(بعض کہانیوں میں مردوک (مردوقش) کو ان لیل کے مساوی دیوتا مانا گیا ہے۔مردوک بابل کا دیوتا تھا اور تمام بادشاہوں اور بابل کے راجہ، مہاراجہ سب ہی مردوک کو سب سے بڑا دیوتا مانتے تھے)۔

آشور: اسیریوں کا قومی خدا بھی یہی تھا۔

ان دیوتاؤں کے ناموں سے زمینوں، آسمانوں، ہواؤں، جگہوں اور فضاؤں کے قصے کہانیاں مشہور تھیں۔ان کے بارے میں منظوم خیالات پیش کئے جاتے تھے۔مثلاً ایک جگہ کہا جاتا ہے:

''فقط دیوتا ہی سورج کی دھوپ میں باقی رہ سکتے ہیں اور انسان؟ تو اس کے تو گنتی کے چار دن ہیں اور انسان جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے وہ کیا ہے، ہوا کا ایک جھونکا جس پر ان کا

کوئی قبضہ نہیں رہتا۔۔۔''۔

ایک جگہ انسان کی تخلیق کے بارے میں مردوقش دیوتا کہتا ہے:

''میں ایک حیوان کو انسان میں بدل دوں گا یہ جنگلوں میں رہنے والا جانور آدمی بنادیا جائے گا۔اس کے ذمے دیوتاؤں کی خدمت کرنا ہوگی۔اس لئے کہ دیوتا اپنے کام بانٹ کر آرام سے رہ سکیں۔۔۔''۔

ایک بابلی نظم میں عقل کے خدا کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''آسمانوں کے خداؤں کی مرضی کو کون جانتا ہے؟ کون جانتا ہے کہ ان کی عقل اس دنیا کے لئے کیا سوچ رہی ہے؟ فانی انسانوں نے دیوتاؤں کے طریقوں کو کب سمجھا ہے؟ جو انسان کل تھا آج کہاں ہے؟ وہ آج رو رہے ہیں۔ دیوتاؤں کے ان منصوبوں ہی سے دیوتاؤں سے خوف کھانا سیکھو''۔

ان قدیم قصوں میں ہمیں یہ بھی ایک تصور ملتا ہے کہ انسان فانی کب بنا؟

یہ قصہ بھی ''ادایا'' کے واقعے میں موجود ہے۔عنقی دیوتا نے اپنی خدمت کے لئے ایک جنگلی جانور کو اس کا روپ بدل کر اسے انسان بنادیا اور اس کا نام ادایا رکھا گیا۔ادایا کا اصل کام دیوتاؤں کے لئے خوراک جمع کرنا تھا۔ایک دن جبکہ ادایا سمندر سے مچھلیاں پکڑ رہا تھا تو جنوب کی ہواؤں کا شیطان وہاں آ گیا اور ان ہواؤں نے ادایا کی کشتی الٹ کر پانی میں پھینک دی۔اس پر ادایا کو بھی غصہ آ گیا اور اس نے جنوب کی ہواؤں کے شیطان کو بددعا دے دی جس کے بعد زمین پر جنوب کی ہوائیں چلنا بند ہوگئیں۔

یاد رہے کہ یہی ہوائیں جو آج بھی عراق میں سردیوں کی تھوڑی بہت بارش کا سبب بنتی ہیں جن سے کاشت میں مدد ملتی ہے اور گرمیوں میں انہی جنوبی اور مشرقی ہواؤں کی بدولت کھیتوں میں غلہ پکتا ہے۔

چنانچہ جب ہوائیں نہ چلیں تو غلہ بھی نہ پک سکا۔اب آنو دیوتا کو ادایا پر غصہ آیا اور اس نے ادایا کو اپنے دربار میں طلب کرلیا۔یہاں ادایا کی مدد عنقی دیوتا نے کی جس نے اپنی خدمت کے لئے اسے انسان کا روپ دیا تھا۔

عنقی دیوتا نے ادایا کو بتایا کہ

''دربار کے دروازے پر دوموزی دیوتا (جو کہ زراعت اور سرسبزی کا دیوتا تھا) ملے گا۔اگر ادایا اس کو خوش کردے گا تو آنو دیوتا بھی خوش ہو جائے گا''۔

مگر اس منصوبے کے ساتھ ہی عنقی دیوتا نے اس کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ:

"جب آنو دیوتا تجھے کھانے اور پینے کے لئے کچھ دیں تو وہ نہ کھانا پینا کیونکہ یہ موت کا کھانا ہوگا اور موت کا پانی ہوگا"۔

ادایا کے ساتھ سب کچھ اسی طرح ہوا جیسا کہ عنقی دیوتا نے کہا تھا۔ بجز اس کے کہ دوموزی دیوتا کی دوستی اور سفارش کی وجہ سے آنو دیوتا بھی ادایا کا دشمن نہ رہا اور اس نے ادایا کو موت کا پانی اور موت کا کھانا دینے کی بجائے زندگی کا کھانا اور زندگی کا پانی دیا جسے ادایا نے عنقی کی ہدایت کے مطابق نہ کھایا نہ پیا۔ اگر ادایا یہ تحفہ لے لیتا تو وہ امر ہو جاتا اور اس کی موت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی مگر اس نے زندگی کے یہ تحفے اپنی نا سمجھی سے رد کر دیئے جس کی وجہ سے وہ فانی ہو گیا۔ تب آنو دیوتا نے غصے سے کہا:

"۔۔۔۔اسے فانی بنا کر زمین پر واپس کر دو"۔

اور اس طرح ادایا یعنی انسان کو اس کے بعد سے موت کا ذائقہ چکھنا ضروری ہو گیا تھا۔

قدیم عراق کے یہ خدوخال واضح کرنے کے بعد اب میں پھر اپنے اور سر جان مارشل کے سفر کی طرف لوٹتا ہوں۔ عراق میں ہماری منزل دراصل اُرک تھی۔ یہ ایک ٹیلہ تھا جہاں سر جان مارشل کے ایک ہمعصر دوست آثار قدیمہ کی کھدائی کر رہے تھے۔ ہمارا قیام یہاں چند دن کا تھا اور ہم انہی کی دعوت پر اُرک پہنچ رہے تھے اور پھر وہاں سے ہمارا ارادہ بابل کی طرف جانے کا تھا۔ اُرک میں سر جان مارشل کے دوست لیونارڈ وولی کھدائی کر رہے تھے۔ انہوں نے کچھ عظیم دریافتیں بھی کر لی تھیں اور سر جان مارشل کو اپنی دریافتیں دکھانا چاہتے تھے اور ان سے کچھ مشورہ بھی کرنا چاہتے تھے۔

اُرک کے متعلق ہمیں بعد میں لیونارڈ وولی نے بہت کچھ بتایا تھا۔ ہم پہلے اسکندریہ سے بصرہ پہنچے اور پھر وہاں سے اُرک گئے تھے۔

عراق میں بصرہ پہنچ کر ہمیں وہاں سے 120 میل دور شمال کی طرف لے جایا گیا۔ بغداد ریلوے جو ان دنوں نئی نئی بچھائی گئی تھی، ٹرین ایک اسٹیشن پر آ کر رکی جس کا نام اُرک تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا جس کی چاروں طرف خشک جھاڑیاں اور ریت کے پہاڑ پھیلے ہوئے تھے۔ اس اسٹیشن پر علاوہ اسٹیشن ماسٹر کے ایک چھوٹے سے کمرے اور برابر میں بنے ہوئے عملے کے دو کمروں کے اور کچھ نہ تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹا کیبن تھا جس میں چائے بسکٹ اور کھجوریں مل جاتی تھیں۔ کچھ دور جنگلی جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں اور تیز چمکتی ہوئی دھوپ میں ریگستان کے ہر ذرے سے سورج طلوع ہوتا نظر آتا تھا۔ اتنے سارے ذرات کے انعکاس سے دھوپ کی تمازت اور حدت

اپنے شباب پر پہنچ گئی تھی۔ ریلوے لائن کے دونوں طرف ہی بے آباد چٹیل صحرا پھیلا ہوا تھا اور دور دور تک اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ علاوہ ایک مٹی کے سرخ ڈھیر کے جو کہ اسٹیشن سے قریباً 1/2 میل کے فاصلے پر تھا۔ سرخ مٹی کا یہی ٹیلہ ہماری منزل تھی۔

اس ٹیلے کے قریب ہمیں دو کمرے بنے ہوئے نظر آئے جو ایک میوزیم نما عمارت تھی۔ اس ٹیلے کے اِدھر اُدھر چند صحرائی بدو ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ ان کے اونٹ اسی ٹیلے کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے اور صحرائی لوگ اسٹیشن سے پانی لے کر آ رہے تھے۔ جہاں کئی کئی دن کی ضرورت کا پانی ریلوے کے ذریعے لایا جاتا تھا۔ یہاں ہماری ملاقات سر لیونارڈ وولی سے ہوئی۔ جس کی دعوت پر ہم لوگ یہاں آئے تھے انہوں نے بڑے پر جوش انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا۔

یہ بے آباد ٹیلہ جو آج ریگستانی طوفان میں اٹا ہوا صحرا کی وسعتوں میں حقیر نظر آ رہا تھا دراصل یہ وہ شہر تھا جہاں حضرت ابراہیمؑ کے والد کی رہائش تھی اور یہی وہ جگہ تھی جہاں کے بت تراش بہت مشہور تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد اسی جگہ ہی سے ہجرت کر کے حران اور کنعان جا کر آباد ہو گئے تھے۔ یہ ٹیلہ اُرک کے شہر کا بچا کھچا سرمایہ تھا جسے حال ہی میں دریافت کیا گیا تھا۔ اُرک سے ذرا فاصلے پر ایک اور ٹیلہ تھا جس کا نام اُر تھا۔ یہ بھی بہت اہم جگہ تھی۔ اس شہر کی کھدائی کے بعد جو سب سے نمایاں عمارت دریافت ہوئی وہ ایک چوکور مینار تھا جو اینٹوں سے بنایا گیا تھا جو ہر طرف سے 120 فٹ طویل اور 75 فٹ اونچا تھا۔ اس کی چھت پر سونے اور چاندی کی ملمع کاری کی گئی تھی۔ اُر کے اطراف میں اُس دور میں زرخیز زمینیں آباد تھیں جن میں جو اور جوار کی کاشت ہوتی تھی۔ یہاں کے باغات میں کھجور اور انجیر کی بہتات تھی اور دور دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقے میں آبپاشی کے لئے نہروں کا ایک جال بچھا ہوتا تھا۔ یہ نہریں فرات سے نکالی گئی تھیں۔ قدیم زمانے میں یہ شہر اُر، سمیری تہذیب و تمدن کا ایک مرکز تھا۔ اس میں دولت و قوت کی خزانے محفوظ تھے۔ طاقتور بادشاہ اور اس کی فوجیں اس شہر کی حفاظت کرتی تھیں اور قرب و جوار کے مہم جو اور قسمت آزما اس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کرتے تھے۔

1910ء میں جس دور کا میں حال لکھ رہا ہوں وہ عثمانی سلطنت کا دور ہے مگر جب سے انگریزوں نے وہاں اپنا عمل دخل بڑھایا تھا، انہوں نے اکثر جگہ کھدائی کر کے زیر زمین سونے چاندی کے زیورات اور دولت کی تلاش شروع کر دی۔ دجلہ و فرات کی وادی جو آج بھی عراق کی زرخیز زمین ہے ہمیشہ سے قدیم تہذیب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس وادی کے اس علاقے میں جب ایک بار چند انگریز فوجی بصرہ سے نکل کر صحرائی ہرن کے شکار کے لئے گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے گئے تو وہاں

تھوڑی بہت کھدائی ہی سے ان کو یہاں سونے چاندی کے ٹکڑے مل گئے تھے۔ پھر انہوں نے اُر کے اس مینار سے کچھ سونے چاندی کے علاوہ یہاں سے مختلف اشیاء اور ظروف بھی برآمد کیں۔

اب کیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے ہر فوجی چھٹی کے دن غزالوں کے شکار کو جانے لگا، مینار کی شکست و ریخت ہونے لگی اور اس کی کھدائی جاری رہی۔ ادھر عربوں نے بھی اس طرف کا رخ کیا اور جاہل بدو اس مینار سے اینٹیں اٹھا اٹھا کر لے آتے تھے اور اپنے گھر بناتے تھے۔ ان میں سے اکثر اینٹوں پر کسی مخصوص قسم کے رسم الخط کی تحریریں تھیں جو سب لاعلمی اور صحیح حفاظت نہ ہونے کی وجہ سے برباد ہو گئیں۔

اس مینار کی خبریں جب برطانیہ پہنچیں تو وہاں کے ایک مشہور ماہر آثار قدیمہ لیونارڈ وولی نے ادھر کا رخ کیا اور یہاں آ کر پڑاؤ ڈالا۔ انہی کی وجہ سے اُر تک ریلوے لائن بچھائی گئی۔ انہوں نے اُر اور اُرک دونوں جگہ پر تقریباً چھ سال تک قیام کیا۔ اس مینار کے اردگرد کے ٹیلے کو چاروں طرف سے ناپا اور پھر اس کی کھدائی کی جغرافیائی حدود متعین کیں۔ تب اس کی کھدائی شروع کی۔ حکومت برطانیہ نے ان کی بڑی بھرپور مدد کی۔ ان کو مالی امداد کے علاوہ ترکی سے خصوصی مراعات دلوائیں اور ان کے بچوں اور ان کے گھر والوں کی کفالت کا ذمہ لیا تا کہ سر لیونارڈ وولی دلجمعی سے اپنا تحقیقی کام جاری رکھ سکیں (یہ کھدائی بعد میں 1928ء میں ختم ہوئی)۔ جیسے جیسے کھدائی کا کام بڑھتا گیا ویسے ویسے ہی تاریخی علم کا دامن بھرتا گیا۔

اُر کے مینار کے چاروں طرف مندر اور عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ تعداد میں پانچ تھیں۔ ان عبادت گاہوں سے ذرا باہر کی طرف ایک پورا شہر آباد تھا۔ گلیاں، عمارتیں، چوراہے اور مکان سب ہی نکلتے چلے آئے۔ یہ شہر نہایت نفیس، باضابطہ تعمیر کیا ہوا اور نہایت ہی عمدہ گلیوں اور سڑکوں والا شہر تھا۔

سر لیونارڈ وولی نے اپنی کتاب ''دیوتا، قبریں اور عالم'' میں اس شہر کی تفصیلات لکھتے ہوئے بیان کیا کہ:

> ''مکانات کی تعمیر میں آرام بلکہ تعیّش کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ مکانات میں مذہبی نظمیں لکھی ہوئی ملیں جو کہ عبادت گاہوں میں پڑھی جاتی تھیں اور حساب دانی کے علم سے متعلق کتبے رکھے ہوئے ملے۔ حساب دانی کی کلید جو معمولی جمع تفریق سے لے کر مربعوں کا رقبہ اور حجم کے نام معلوم کرنے کے بھی لکھے ہوئے ملے تھے۔ کچھ اور کتبوں پر اُر کے قدیم مندروں اور مشہور عمارتوں کی تفصیل لکھی ہوئی ملی جو ایک طرح سے اُر شہر کی ایک مختصر سی

تاریخ ثابت ہوئی"۔

لیونارڈ وولی (جن کو بعد میں حکومت برطانیہ نے سر کا خطاب بھی دیا تھا) کی ٹیم نے اپنی کھدائی کے دوران سمیرین بادشاہوں کے مقبرے بھی دریافت کئے۔ یہ مقبرے بھی تھے اور چھوٹے چھوٹے اہرام بھی۔ ان میں پتھروں کی قبریں بنائی گئی تھیں اور قبریں اندر سے وسیع کمروں جیسی تھیں۔ ان میں بادشاہ کے روزمرہ کے استعمال کی اکثر و بیشتر چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ سونے کے جگ، پانی پینے کے گلاس، پھول رکھنے کے لئے گلدان، مینا کاری کے زیورات، سر پر پہننے کے لئے خود اور لوہے کی مختلف ٹوپیاں، تاج، آلات موسیقی، باجے اور کنگھی وغیرہ سب ہی کچھ تھے۔

ان مقبروں سے جو سونے کے زیورات اور ہیرے جواہرات ملے تھے وہ اس قدر زیادہ تھے کہ مصر کے اہراموں میں نفرتین اور دوسرے بادشاہوں کے مقبرے کے مقبروں سے ملنے والی دولت ان کے آگے کچھ نہ تھی۔ ہر بادشاہ کے مقبرے میں اس کے ہمراہ اور بھی بہت سے زندہ افراد کو دفن کیا جاتا تھا۔ عموماً ان کی سواری کے گھوڑے، بیل، گاڑیاں، فرنیچر، خدام، حفاظتی عملہ، باڈی گارڈ اور غلام و کنیزیں سب کی سب زندہ دفن کی جاتی تھیں تاکہ کسی وقت بادشاہ موت کی بندش یا نیند سے چونک اٹھے تو جاگ جانے پر وہ خود کو تنہا محسوس نہ کرے۔ یہ شہر تقریباً چار ہزار سال قدیم تھی اور اس شہر کی یہ قبریں سر چارلس وولی کے اندازے کے مطابق مصر کے اہراموں سے کوئی ایک ہزار سال قدیم تھی۔

سر چارلس وولی کے مزدور تنکوں کی ٹوکریوں میں کباڑ اور کوڑا بھر بھر کر نکالتے تھے اور پھر ریت، مٹی، کوڑا اور ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑے، جواہرات، زیور، سونے چاندی یا کسی اور دھات کے ظروف اور اوزار وغیرہ سخت محنت کے بعد علیحدہ علیحدہ کر لیتے تھے۔ اس طرح یہ ایک صبر آزما کام تھا جو دن رات جاری رہتا تھا۔ بادشاہوں کے مقامات پر جو تحریریں کندہ ملیں اور جو کتبے لگے نظر آئے ان سے اس تمدن کی عمر تقریباً 3500 سال قبل مسیح معلوم ہوئی۔

جوں جوں کھدائی کا کام بڑھتا گیا یہ اندازہ ہوتا جارہا تھا کہ اوپر کی سطح پر جس تہذیب کے آثار ملے ہیں وہ دراصل اپنے انداز فکر کی اور طرز رہائش کی بدولت ایک اور قدیم تر تہذیب کی پیش خیمہ تھی۔ آخرکار یہ قدیم تر تہذیب مل ہی گئی۔

ایک بادشاہ کے مقبرے کے نیچے کھدائی کرتے کرتے ایک دن مٹی سے بھری ٹوکری میں جلی ہوئی لکڑیاں اور چند تختیاں ملیں اور چند مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑے ہاتھ لگ گئے۔ یہ چیزیں مقبروں سے تقریباً 300 سال قدیم تھیں۔ اب وولی کا یہ یقین اور پختہ ہوگیا کہ ان مقبروں

کے نیچے بھی ایک اور تہذیب دفن ہے۔ چنانچہ اسی زور وشور سے کھدائی چلتی رہی۔ تہہ در تہہ غلافوں میں لپٹا ہوا ماضی حال کے اجالوں میں ابھرتا گیا۔ ہر تہہ پر کم و بیش ایک ہی قسم کی روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کے برتن اور ظروف نکلتے رہے جب کہ ہر ایک تہہ میں ایک دور پوشیدہ تھا اور یہ ادوار ایک دوسرے سے کئی کئی سالوں کا فرق لئے ہوئے تھے۔ اس طرح قریباً 3800 سال قبل مسیح تک کی تاریخ سامنے آ گئی۔

وولی نے اشیاء کے معائنے کے بعد یہ اندازہ لگایا کہ سمیرین تہذیب جو اس شہر میں پھلی اور پھولی کم بیش 1500 سال تک زندہ و تابندہ رہی۔ یہ قوم حساب، جیومیٹری، سیاروں کی گردش کے علم سے تعمیراتی معلومات سے زندگی کے بعد الموت کے تصور سے اور لوہے کے فن سے آشنا ہی نہیں بلکہ اس فن میں خاصی بلندی تک جا پہنچی تھی۔

اُر کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، وولی کے مزدوروں نے ایک دن ایک مٹی سے بھری ہوئی ٹوکری کو باہر کھینچا تو اس میں ایسی کیچڑ نما مٹی نکلی جو کسی بہتے دریا کی تہہ ہی میں جم کر خشک ہو جانے والی چکنی مٹی سے مشابہ تھی۔

پہلے پہل وولی نے یہ سمجھا کہ کسی زمانے میں دریائے فرات اس علاقے کے قریب سے گزرتا ہوگا اور جب اس نے راستہ بدلا تو بدلتی ہوئی گزرگاہ پر اُر کا شہر آباد ہوا ہوگا جس کی مٹی سامنے آتی جا رہی ہوگی، مگر یہ کیا ہے؟ اس مٹی میں تو سمندری سیپیاں، گھونگے اور بے شمار اس قسم کی چھوٹی چھوٹی چیزیں ملتی جا رہی تھیں کہ جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ دریا کی گزرگاہ کے علاوہ یہ کسی اور قسم کے پانی کی جس میں نمکین پانی بھی شامل تھا اس کی کرشمہ سازی تھی۔ پھر یہ مٹی دریاؤں کی لائی ہوئی نئی اور زرخیز مٹی سے مختلف تھی۔ اس مٹی میں تو ٹوٹی پھوٹی اشیاء اور روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں دفن تھیں۔ مٹی کے ظروف بھی مل گئے مگر اُر سے جو مٹی کے برتن ابھی تک ہاتھ لگے تھے وہ بڑی حد تک ہموار اور خوبصورت تھے جنہیں کمہار کے پہیئے پر چلا کر درست کیا گیا تھا اور جو ظروف اس مٹی سے نکلے تھے وہ ہاتھ کے بنائے ہوئے ناہموار اور بے ترتیب برتن تھے۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ بھی تھی کہ جتنی بھی ٹوکریاں اس مٹی کے کوڑے سے نکلی تھیں ان میں دھات کے بنے ہوئے کسی برتن کا یا کسی ایک چھوٹے سے ٹکڑے کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ گویا یہ ایک پرانی تہذیب تھی جو پانی میں دفن ہوئی تھی۔ خالصتاً بحری یا پتھروں کے زمانے کی تہذیب تھی۔ مگر یہ کون سی تہذیب تھی اور یہ پانی کونسا تھا جو سمندری پانی کو اپنے ساتھ بہا کر لایا؟ اور یہ مٹی کہاں کی تھی جو ریگستانی علاقے میں چکنی مٹی کی صورت میں دفن تھی؟ مٹی کی یہ تہہ 10 فٹ

موٹی تھی۔ جب تک مٹی نکلتی رہی سر چارلس وولی کی ٹیم روز سر جوڑ کر بیٹھتی تھی۔ نئے نئے نظریات پیش کئے جاتے، اشیاء کا بار بار معائنہ کیا جاتا، ایکسپرٹس اور ماہرین کو بلایا جاتا۔ ان کی رائے لی جاتی اور بڑے طویل مباحثے ہوا کرتے آخر کار وولی ایک نتیجے پر پہنچ ہی گئے کہ مٹی قریباً 5 ہزار سال قبل مسیح کے عہد کی تھی۔ اس دن اُر کے شہر سے وولی نے لندن میں برٹش میوزیم کے سربراہ کو ایک تار بھیجا جس کا مضمون تھا کہ:

''۔۔۔ہم نے طوفان نوح کو دریافت کرلیا ہے۔۔۔۔وولی''۔

سر چارلس وولی نے بتایا کہ جب انہوں نے تحقیقات سے یہ ثابت کردیا کہ بابل کا طوفان نوح ایک مسلّمہ حقیقت تھا تو اب نوحؑ کی کشتی کی تلاش شروع ہوئی اور اُر کی تو دریافت ہوگئی تھی اور طوفان نوحؑ کے اثرات کو تلاش کرلینے کے بعد یورپ کے تاریخ دان اس کشتی کی تلاش میں نکلے جو بائبل، توریت اور قرآن کے مطابق حضرت نوحؑ نے بنائی تھی۔

اس میں طوفان نوح کے متعلق لکھا ہے کہ: ''طوفان 40 دن تک جاری رہا۔ سمندروں کا پانی خشکی پر آ گیا۔ زمین پر ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ تمام دنیا کے بڑے بڑے پہاڑوں کی چوٹیاں پانی سے چھپ گئی تھیں۔ تب نوح نے خدا کو یاد کیا۔ ایک ہوا چلی جس نے پانی کو مزید آگے بڑھنے سے روک دیا۔ چشموں سے پانی ابلنا بند ہوگیا۔ بادلوں کو لانے والی ہوائیں بند کردی گئیں۔ بارش کو بھی بندش کا حکم ملا۔ پھر پانی اترنا شروع ہوا۔ 150 دن تک مسلسل پانی ترائیوں کی طرف اور وہاں سے سمندر کی طرف پھیر دیا گیا۔ نوح کی کشتی بھی حفاظت سے پہاڑ کی چوٹی پر رکی رہی۔ ساتویں مہینے کی سترہویں تاریخ کو اس کشتی کو کوہ ارارات پر ٹھہرا دیا گیا''۔

کوہ ارارات مشرقی ترکی میں ایران اور روس کی سرحد پر واقع ہے۔ اس کی 11 ہزار فٹ کی چوٹی تھی۔ اس کی اور بلند چوٹیاں بھی تھیں۔ ان تمام سلسلوں کی اونچائی 12 ہزار سے 13 ہزار فٹ کے لگ بھگ ہے اور یہ پورا سلسلہ ارارات کے نام سے مشہور ہے۔ ان پہاڑوں پر ہر وقت برف جمی رہتی ہے۔ وولی اور دوسرے ماہرین کا خیال تھا کہ اس ہزاروں لاکھوں ٹن برف کے نیچے کہیں وہ کشتی بھی جمی ہوئی ہوگی جس کو نوح کی کشتی کہا جاتا رہا ہے۔ اس کشتی کی تلاش ایک قدیم رسم ہے۔ یہودی مؤرخ جوری منس نے 2 ہزار سال قبل مسیح اس کی تلاش کی کوشش کی تھی۔ بابل کے رہنے والے بھی اس کو کھوجتے رہے کہ اس دور کے گرمیوں میں ریوڑ چرانے والے چرواہے جو کبھی کبھی زیادہ بلندی پر چلے جاتے تھے۔ اس کشتی کے ٹکڑے کہیں اور کبھی کبھی برف میں دبے ہوئے دیکھ لیتے تھے۔

یہ مشغلہ ایک مدت تک مذہبی تقدس اور مقدس جوش کے ساتھ چلتا رہا اور پھر بعد میں ماہرین

تاریخ اور قدیم علوم کے محققین نے اس کی تلاش میں کافی محنت کی۔ اس کشتی کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ اس لئے بھی مسلّم ہے کہ اس کے متعلق زبور، توریت، انجیل اور قرآن چاروں کتب میں بہت واضح اشارات موجود ہیں۔ یہ کشتی کوہ جودی پر ٹھہر گئی تھی۔ کوہ جودی آج بھی موجود ہے اور اس کے اطراف میں بسنے والے لوگ آج بھی عیسائی، یہودی اور مسلمان مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے اپنے مذاہب کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ہمیشہ اسے کھوج نکالنے کی کوشش کی ہے۔

سر لیونارڈ وولی نے بتایا کہ: ''روز ہی ان کو کشتی نوحؑ سے متعلق کوئی نہ کوئی اطلاع مل جایا کرتی تھی۔ اکثر اوقات یوں بھی ہوا کہ وہ چرواہے کوہ پیمائی کے شوقین شکاری جو کوہ جودی پر بلندیوں تک پہنچ گئے انہیں جب بھی برف میں دبی لکڑیاں نظر آئیں ان کو حضرت نوحؑ کی کشتیوں کے ٹکڑے سمجھا گیا۔ مگر یہ بات ہمیشہ سچ نہیں ہوتی تھی''۔

لیونارڈ وولی کا خیال تھا کہ نوحؑ کی کشتی اور نوحؑ کے طوفان سے بھی زیادہ اہم ایک اور دریافت بھی ہو چکی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ طوفان نوح سے ملتی جلتی کہانی سمیریوں کی تاریخ میں بھی موجود ہے۔ اس میں حضرت نوحؑ کی جگہ ایک بادشاہ ضیاالصدرا کا نام لیا گیا ہے اور کہیں اس کو گلگمیش کا نام دیا گیا ہے اور کہیں اس بادشاہ کو اتنا پشتم کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔ ان سب کو کم وبیش وہی حالات پیش آئے جو حضرت نوحؑ پر گزرے۔ اتنا پشتم کو بھی پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ ایک زبردست طوفان آنے والا ہے جو ہر ذی روح کو تباہ کر دے گا۔ گلگمیش کے کارناموں پر مشتمل جو کتبے لیونارڈ وولی کو ملے ان میں بتایا گیا ہے کہ گلگمیش کو سمندروں اور پہاڑوں کو عبور کر کے اتنا پشتم تک پہنچنا ہے تو اس کو طوفان کے بارے میں بتایا کہ اتنا پشتم کو طوفان کے بارے میں دیوتاؤں نے کہا تھا کہ

> ''اپنا گھر توڑ دے، ایک جہاز بنا، دولت کو فراموش کر دے، زندگی کی تلاش کر، جن چیزوں پر تیرا قبضہ ہے انہیں بھول جا، ہر قسم کے پودوں کے بیج جمع کر اور ہر قسم کی زندگی کی چیزوں کو جہاز میں رکھ دے پھر یہ بھی اس لئے کہ جو جہاز تو بنائے گا اس کی جسامت اور اس کا سائز بالکل متناسب ہونا چاہئے''۔

(نوٹ: 1951ء میں روسیوں کی ایک جماعت نے جو بلند پہاڑوں کی آب وہوا اور جغرافیائی تبدیلیوں سے متعلق موضوعات پر تحقیق کر رہی تھی اس قسم کی ایک واضح نشانی حاصل کی جو بعد کی تحقیق سے حضرت نوحؑ کی مشہور ومعروف کشتی ہی کا ایک ٹکڑا ثابت ہوئی۔

اس کے مقابلے میں بائبل میں طوفان نوحؑ کا یہ حال بھی قابل غور ہے:

''اور نوح کشتی میں بیٹھ گئے۔ نوح کی بیویاں کشتی میں بیٹھ گئیں۔ نوح کے بیٹوں کی بیویاں کشتی میں بیٹھ گئیں اور طوفان کا پانی چڑھنا شروع ہوا۔ وہ تمام جانور جو پاک تھے اور وہ تمام جانور جو ناپاک تھے وہ پرندے جو پاک تھے اور وہ پرندے جو ناپاک تھے اور وہ تمام جانور جو چلتے تھے یا رینگتے تھے سب کے جوڑے جوڑے کشتی میں لا لا کر جمع کر دیئے گئے اور پھر کشتی طوفان کے پانی کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی گئی''۔

لیونارڈ وولی نے مٹی کے جو کتبے دریافت کئے ان میں گلگمیش اور اتنا پشتم کے طوفان کا حال سمیری کتبوں کی زبانی یوں آتا ہے:

''جو کچھ بھی میں نے کشتی میں ڈال دیا ہے وہ زندگی کے تمام بیجوں پر مشتمل ہے۔ میں نے اپنی کشتی میں اپنے خاندان کو سوار کر لیا ہے۔ اپنے کنبے والوں کو بٹھا دیا ہے۔ میں نے چراہگاہوں کے مویشی بٹھائے ہیں۔ میں نے جنگلوں کے درندے سوار کرائے ہیں۔ میں نے تمام کاریگر اور ہنرمند کشتی میں سوار کرا دیئے ہیں اور میں نے کشتی کو حکم دیا ہے کہ وہ پانی کے ساتھ اوپر اٹھتی رہے''۔

اس طرح یوں معلوم ہوتا ہے کہ اتنا پشتم نے طوفان کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ ہر جگہ اس کہانی میں لفظ ''میں'' آیا ہے۔ گویا طوفان سے گزرنے والا اپنی کہانی سنا رہا ہے:

''چھ دن اور چھ راتوں تک تند و تیز ہوائیں چلتی رہیں۔ پھر ہواؤں اور طوفان نے زمین کو ہلا کر رکھ دیا۔ جب ساتواں دن آیا طوفان، ہوا اور بارش سب رک گئے۔ پانی رک گیا۔ ہوائیں خاموش ہو گئیں اور زمین پر رہنے والوں کی تمام تہذیبیں مٹی کے ڈھیر میں بدل گئیں اور میدان اتنے اونچے ہو گئے جیسے کہ اونچے اونچے مکانوں کی ہموار سطحیں ہوتی ہیں''۔

آگے چل کر اس کہانی میں اتنا پشتم کشتی کے رکنے کی جگہ کو یوں بیان کرتا ہے:

''اور پھر میں نے کھڑکی کھولی۔ صبح کے سورج کی روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ کشتی ایک پہاڑ پر ٹھہر گئی ہے۔ یہ پہاڑ کوہ نصیر تھا اور چٹانوں نے کشتی کو اس طرح جکڑ لیا تھا کہ وہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ کوہ نصیر دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیان واقع تھا''۔

یہ پہاڑ ایران کے شمال میں کردستان کے علاقے میں واقع ہے۔ اس سلسلۂ کوہ کو کوہ ارارات بھی کہتے ہیں۔ اسی کے ایک حصے کو کوہ نصیر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اب جب کہ یہ تذکرہ نکل ہی آیا ہے تو یہ بھی سنتے چلئے کہ اتنا پشتم یا ضیاالصدرا کون تھا اور گلگمیش سے اس کا کیا تعلق تھا؟

گلگمیش کی داستان 1872ء میں جارج اسمتھ نامی ماہر آثار قدیمہ نے دریافت کی تھی اور برطانوی ماہر اسیریائی تہذیب و نسل پر تحقیق کرنے والوں میں نہایت اعلیٰ درجے پر تھا۔ لیونارڈ دولی نے بھی ان مٹی کے کتبوں پر تحقیق کی تھی۔

گلگمیش دراصل اُرک کا بادشاہ تھا اور اس کی داستان پر مشتمل چونے کے پتھروں پر لکھی ہوئی بارہ تختیاں ملیں جو اشو نبی پال کے بادشاہ کے محل سے برآمد ہوئیں۔ یہ اشورہنی پال سیناشرب کا پوتا تھا جس نے 631ق م سے 668ق م تک بابل پر حکومت کی۔ یعنی بابل کی دوبارہ تعمیر کے بعد جو سارگان نے کی تھی بابل پر اشورہنی پال کی حکومت ہوئی۔

چونے کے پتھروں پر لکھی ہوئی ان بارہ تختیوں پر گلگمیش کے کارنامے درج ہیں۔ گلگمیش 2700ق م میں اُرک کا بادشاہ تھا جو سمیریوں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ تاریخ دان آج بھی یہ نہیں جانتے کہ سمیری کون تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ مگر ان کا سائنسی علم اور ان کا علم الحساب آج کے ترقی یافتہ دور سے کچھ کم ترقی یافتہ نہ تھا۔ اشورہنی بال سمیری نہ تھا بلکہ اسیری بادشاہ تھا۔ اس لئے جو تحریریں اشورہنی پال کے دور میں لکھی گئیں وہ اس کے دور سے بھی 2ہزار سال قدیم دور کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

یہ دریافت کیوں جک کے پہاڑی ٹیلے سے ہوئی تھی۔ سر لیونارڈ وولی نے سر جان مارشل کو اور ہمیں ان تختیوں پر تحریر کردہ پوری کہانی سنائی تھی جواب مجھے پوری طرح یاد بھی نہیں ہے۔ مگر بہر حال شاید مفہوم میں واضح کر سکوں۔

یہ داستان ایک ہیرو کی داستان ہے۔ گلگمیش ایک نیم انسانی دیوتا تھا جو ایک چوتھائی انسان اور تین چوتھائی دیوتا تھا۔ اس نے اُرک کے چاروں طرف ایک مضبوط اور پختہ چہار دیواری بنوائی تھی۔ گلگمیش کی آنکھوں میں ہیبت اور خوبصورتی دونوں ہی ایک حسین امتزاج کے ساتھ پائی جاتی تھیں۔ گلگمیش کے زمانے میں آسمانوں کے دیوتا اری دو نے انکیدو کو پیدا کیا۔ انکیدو کے بہت لمبے لمبے بال تھے اور وہ بالوں اور جانوروں کی کھال کے کپڑے پہنتا تھا اور جنگلوں میں گھاس کھاتا تھا۔ انکیدو کو آبادیوں میں آنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ لوگ اس جنگلی انسان نما جانور سے خوف کھاتے تھے۔ گلگمیش کو اس پر رحم آ گیا کیونکہ وہ جنگلوں اور صحراؤں میں اکیلا اکیلا پھرا کرتا تھا۔ تب گلگمیش نے اس کی شادی ایک خوبصورت اور حسین دیوی سے کرادی تاکہ اس کی تنہائی بھی دور ہو اور اس کی اولاد میں طاقت اور حسن دونوں ہی اکٹھے ہو جائیں۔ مگر یہ بات سورج دیوتا کو بری لگی اور اس نے سزا کے طور پر انکیدو کو بہت بے دردی سے مار اپیٹا۔ اس ظلم کے خلاف انکیدو اور گلگمیش دونوں نے دیوتاؤں کے

مسکن کی طرف جانے کا ارادہ کیا تا کہ اس ظلم سے ان کو آگاہ کیا جائے اور ساتھ ہی کوئی ایسا طریقہ معلوم ہو جائے جس کی بدولت وہ موت سے نجات حاصل کر کے ابدی زندگی حاصل کر سکے۔

یہ دونوں سفر پر چلے تو پہلے دیوی ارضی لس کا محل آتا تھا۔ یہ بھی پہاڑوں کی بلندیوں پر تھا اور اس محل کے محافظوں نے دونوں پر تیروں کی بارش کر دی مگر ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا مگر پھر محل کے اندر سے بڑے محافظ نے للکار کر کہا:

''واپس لوٹ جاؤ! کوئی فانی انسان دیوتاؤں سے نہیں مل سکتا جب تک کہ دیوتا خود نہ چاہیں اور جو دیوتا کے چہرے کو دیکھ لے گا اسے زندگی نہیں ملے گی۔۔ اسے مرنا ہی ہوگا''۔

سر چارلس وولی یہ قصہ سنا رہے تھے تو مجھے ایک دم یاد آیا تھا کہ توریت کی کتاب ہجرت میں جو Exodus کے نام سے ہے خدا کی زبان سے یہ جملہ ادا کیا گیا ہے:

''تم میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتے کیونکہ کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جس نے میرا چہرہ کبھی دیکھا ہو اور وہ زندہ بھی رہا ہو''۔

اسی طرح مسلمانوں کی کتاب قرآن میں حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر کہا گیا تھا کہ جب انہوں نے ضد کی کہ:

''خدایا! میں تیری تجلی دیکھنا چاہتا ہوں''۔

تو ان سے خدا نے کہا تھا کہ: ''موسیٰ! تم مجھے نہیں دیکھ سکتے''۔

میرے اس جملے کے بعد سر جان مارشل اور سر لیونارڈ وولی میں بڑی دیر تک اس بات پر بحث ہوتی رہی تھی کہ آخر قدیم زمانے کی دیو مالائی کہانیوں میں اور آسمانی کتابوں کے ان قصوں میں اس قدر مماثلت کیسے پیدا ہوتی ہے؟

بہر حال یہ ایک الگ بحث تھی۔ تو گلگمیش نے ان محافظوں کو بتایا کہ:

''وہ خود بھی تین چوتھائی دیوتا ہے''۔

اس طرح اس کو اندر آنے کی اجازت ملی اور پھر ان دونوں کو ایک آسمانی سفر پر اوپر لے جایا گیا۔ ساتویں کتبے کی پوری تحریر ہی اس فضائی سفر سے متعلق ہے جو قریب قریب چار گھنٹے جاری رہا۔ جو ایک تانبے کے بنے ہوئے عقاب کے پروں کے اندر بیٹھ کر شروع کیا گیا تھا۔ سفر کی کہانی یوں ہے:

''نیچے زمین کی طرف دیکھو یہ کیسی لگتی ہے؟ نیچے سمندر کی طرف دیکھو یہ کیسا لگتا ہے''؟

اور جب میں نے نیچے دیکھا تو زمین پہاڑ کی طرح تھی اور سمندر ایک جھیل کی مانند تھا۔ پھر چار گھنٹے تک اوراوپر کی طرف اڑتے رہے۔ تب دیوتا نے پھر پوچھا:

''اب زمین کی طرف نیچے دیکھو اور سمندر کی طرف نیچے دیکھو۔ زمین اور سمندر کیسے لگتے ہیں''؟

اور جب میں نے نیچے دیکھا تو زمین ایک باغ کی طرح لگتی تھی اور سمندر اس باغ میں بہتے ہوئے ایک نالے کی مانند تھا۔

اور تب وہ مزید چار گھنٹے تک اونچے اور اونچے اڑتے رہے گویا زمین سے اوپر اڑتے ہوئے اب انہیں بارہ گھنٹے گذر چکے تھے۔ تب دیوتا نے پھر پوچھا:

''نیچے زمین کی طرف دیکھو، نیچے سمندر کی طرف دیکھو۔ تمہیں زمین کیسی لگتی ہے؟ تمہیں سمندر کیسا لگتا ہے؟ اور تب زمین سنہرے بھوسے کی مانند لگتی تھی اور سمندر ایک پانی کی بلبلے کی طرح اٹھا ہوا نظر آتا تھا''۔

(آج جب میں یہ کہانی لکھ رہا ہوں تو ہوائی جہاز ایجاد ہو چکے ہیں اور یہ بات لوگ جانتے ہیں کہ جس طرح اوپر سے ہوائی جہاز کے ذریعے نیچے کی زمین کو لگنا چاہئے۔ اس سفر میں زمین اور سمندر کی صورت اسی طرح بتائی گئی ہے)۔

دراصل حال ہی میں یعنی 1899ء میں امریکہ کے دو بھائیوں نے جن کو رائٹ برادران کہا جاتا ہے ایک ہوا میں اڑنے والی مشین ایجاد کی ہے اور اس سے قبل کاؤنٹ ریلپن نے بھی ایک مشین پر بیٹھ کر فضا میں اڑنے کا تجربہ کیا تھا اور ان دونوں نے فضائی بلندی سے جس طرح زمین کو دیکھا تھا اس کی تفصیل بھی سر چارلس وولی کے مطابق اُرک سے نکلنے والے گلگمیش کے کارنامے کی ساتویں تختی سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ مگر یہ دونوں ہوا میں اڑنے والے لوگ زیادہ اونچائی تک نہیں جا سکے تھے جب کہ گلگمیش کا عقاب بہت اونچا اڑا تھا۔

اسی تختی پر سفر کی تفصیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دروازہ آدمی کی طرح گفتگو کرتا تھا تو شبہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے کسی لاؤڈ اسپیکر سے مشابہ کسی قسم کی کوئی چیز تھی؟ یہ کون سی ایجاد تھی؟ جو آج سے لگ بھگ 4500 سال قبل کی دنیا میں موجود تھی؟ یہ ایک عجیب گتھی ہے۔

آٹھویں تختی میں درج ہے کہ انکیدو سفر میں کسی قسم کی گیس سے مر گیا تو گلگمیش نے اس کی ایکا ایکی موت کی بارے میں سوچا:

''کیا انکیدو کسی آسمانی پرندے کی زہریلی سانس سے ہلاک ہو گیا ہے''؟

اور جب یہ فضائی سفر ختم ہو گیا تو دیوتا نے اسے نیچے اتار دیا اور کہا کہ:

''وہ بڑے دیوتاؤں سے ملنے سے قبل اتنا پشتم سے ملے''۔

تب گلگمیش اکیلا ہی دیوتاؤں کی ملاقات کو گیا اور پھر وہ ایک ایسے اونچے دو پہاڑوں تک آ گیا جن پر آسمان ٹکا ہوا تھا اور جن کو سورج کا دروازہ کہتے تھے اور اس کے سامنے ایک وسیع و عریض سمندر تھا جس کے پیچھے دیوتاؤں کے مکان تھے۔ یہاں آ کر پھر دیوتاؤں کے محافظین نے گلگمیش کو روک لیا۔ گلگمیش کو انکیدو کا غم تھا جس کو سفر کے دوران ہی موت نے ڈس لیا تھا۔ اس نے اپنے غم کا اظہار ان محافظوں سے کیا تو انہوں نے کہا: ''تو موت سے کیوں ڈرتا ہے؟ تجھے اگر جاوداں زندگی کی تلاش ہے تو وہ کہیں نہیں ملے گی۔ جب دیوتاؤں نے انسان کی تخلیق کی تو انہوں نے زندگی خود رکھ لی اور موت انسان کی قسمت میں لکھ دی''۔

اور پھر جب گلگمیش نے محافظوں کو بتایا کہ

''وہ تین چوتھائی دیوتا ہے اور ایک چوتھائی انسان ہے''۔

تو پھر انہوں نے اس کو آگے جانے کی اجازت دے دی اور پھر دیوتاؤں کی ملاقات سے پہلے گلگمیش کی ملاقات ضیا الصدر یا اتنا پشتم سے ہوئی جو انسانوں کا باپ اور سب آدمیوں میں پہلا آدمی تھا اور در حقیقت یہ وہی شخص تھا جس کو دیوتاؤں نے ابدی زندگی بخش دی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ آدم کا نام کہانی میں اتنا پشتم بتایا گیا ہے۔

تب گلگمیش کو اتنا پشتم نے اپنا۔۔۔۔اور یہی وہ مقام تھا جہاں اس پوری کہانی کا سب سے حیرت ناک قصہ شروع ہوا۔ یعنی ایک ایسے طوفان کی کہانی جو ہر طرح سے نوحؑ کے طوفان جیسا تھا اور۔۔۔۔ میں جہاں اتنا پشتم بادشاہ تھا، دیوتاؤں نے ایک عظیم طوفان لانا طے کیا تا کہ گنہگار ختم ہو جائیں اور نسل انسانی نئے سرے سے تعمیر کی جائے۔ یعنی گناہوں کے پھیل جانے کی وجہ سے دنیا میں طوفان لایا گیا تھا۔ یہی تصور توریت، انجیل اور قرآن کا بھی ہے کہ بت پرستی اور گناہ گاروں کی اتنی کثرت ہو چکی تھی کہ اُس دور کی دنیا کو طوفان سے دھو کر پاک کر دیا گیا تھا۔

اتنا پشتم نے کہا کہ:

''دیوتاؤں نے اسے بتا دیا تھا کہ ایک قیامت خیز طوفان آنے والا ہے''۔

چنانچہ دیوتاؤں کے کہنے پر اس نے ایک وسیع و عریض کشتی تیار کی جس میں دس منزلیں تھیں اور تمام زندہ جانوروں اور ہر قسم کے کیڑے مکوڑوں، درندوں اور پرندوں کا ایک ایک جوڑا اس کشتی میں رکھ لیا گیا اور پھر وقت معین پر ہر طرف سے بادل منڈلانے لگے۔ اندھیرے چھا گئے، آسمانوں سے پانی ابلنے لگا، ہر طرف پانی پانی ہو گیا اور جس طرح کشتی کنارے آئی اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

جس دن سے اشورہنی پال کے محل سے اُرک بادشاہ گلگمیش کے سفر کی داستان کی بارہ تختیاں حاصل ہوئی ہیں یہ سوال ہزاروں بار اٹھا کہ آخر اتنا پشتم کے طوفان کے تذکرے میں تو قرآن، توریت اور بائبل میں بیان کئے ہوئے طوفان نوحؑ سے اس قدر مشابہت کیسے ہوئی؟

یہ پوری داستان جو اسیریائی عہد کے بادشاہ اشورہنی پال کے محل سے ملی۔ دراصل اسی نسل سے تعلق رکھتی ہے جسے ہم سمیری نسل کہتے ہیں۔ جس کے متعلق آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ آخر یہ کون لوگ تھے اور کہاں سے آئے تھے اور ان کے علوم اور سائنس کی ترقی آخر کس طرح ہوئی تھی؟

ان کے متعلق عام نظریہ یہ ہے کہ یہ لوگ یا تو آریائی تھے یا پھر اس نسل کے لوگ تھے جو براعظم اٹلانٹا کے فنا ہونے سے قبل وہاں آباد تھے اور اس کی تباہی کے بعد کسی نہ کسی طرح اس براعظم سے بچ کر نکل آئے تھے۔ انہی لوگوں نے اہرام مصر تعمیر کئے اور انہی لوگوں نے سمیریوں کا روپ دھارا اور انہی سمیریوں کا ایک بادشاہ اتنا پشتم بھی تھا جس کا نام سمیریوں کے بادشاہوں کی فہرست میں موجود ہے۔ جس کا تذکرہ آگے ہوگا۔

مذہبی کتب میں طوفان نوحؑ کا تذکرہ سب سے پہلے توریت میں آیا ہے۔ اس میں پہلے پہل طوفان نوحؑ کا ذکر بھی ہوا ہے۔ سر لیونارڈ وولی کا اس بارے میں ایک نظریہ یہ تھا کہ فراعین جو کئی ہزار سال پہلے مصر میں حکمران رہے۔ اٹلانٹا کے براعظم سے آئی ہوئی ترقی یافتہ نسل سے تعلقات پیدا کر چکے تھے۔ جنہوں نے ان کو زندگی بعد الموت کا نظریہ دیا تھا اور انہوں نے ہی ان کو اہرام تعمیر کرانا سکھائے تھے۔ انہی کے دیوی دیوتاؤں اور ان ہی کی دیومالائی کہانیاں فراعین کے زمانے میں مذہبی داستانوں کا درجہ اختیار کر گئی ہوں گی۔

بعد میں یہی نسل سمیری نسل کے طور پر عراق میں ابھری اور اس کے قصے جو مصر میں موجود تھے ان کو عراق میں بھی جگہ ملی مگر توریت میں موسیٰؑ نے کس طرح اس طوفان کے قصے کو داخل کیا اور اتنا پشتم کا نام نوحؑ کیسے ہوگیا؟

سر لیونارڈ وولی کا اس بارے میں یہ خیال تھا کہ توریت الہامی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی بائبل کوئی آسمانی کتاب تھی۔ چنانچہ موسیٰؑ نے جو فرعون کے محل میں پلے بڑھے اور علم لیا ان کی رسائی ان کتابوں، لائبریریوں یا تختیوں تک رہی ہوں گی جہاں مختلف قسم کی داستانیں جمع کی جاتی تھیں اور تصویری یا نیم تصویری زبان میں لکھی جاتی تھیں اور چونکہ طوفان کی داستان ایک عظیم داستان تھی چنانچہ انہوں نے اسے اپنی کتاب توریت میں جگہ دے دی اور اس طرح حضرت عیسیٰؑ نے اس کو بائبل میں بیان کر دیا۔ بہر حال سر چارلس وولی کے اس نظریے سے نہ تو سر جان مارشل متفق تھے اور

نہ میں۔مگر یہ بحث ایک الگ موضوع ہے۔

اس موضوع کو ختم کرنے سے قبل سمیری بادشاہوں کی فہرست جو طوفان تک آتی ہے اور بائبل میں Genesis یعنی تخلیق کے باب میں آدمؑ سے نوحؑ تک کے بادشاہوں کی جو فہرست آئی ہے ان کا ایک نظر مطالعہ کر لینا برا نہ ہوگا۔

یوں بھی میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ سر وولی اس بات کے قائل تھے کہ بائبل کو صدفی صد الہامی کتاب تسلیم کر لینا درست نہیں ہے کیونکہ اس طرح تحقیق اور علم حاصل کرنے والے کو اپنے علم کی حد بندی کرنا پڑتی ہے اور وہ آزادانہ انداز سے نہ سوچ سکتا ہے اور نہ ہی تخلیق کر سکتا ہے۔پھر ان کا خیال یہ بھی تھا کہ بائبل کی چاروں تصانیف چار لوگوں کی اپنی لکھی ہوئی کتابیں ہیں وہ بیان کرتی ہیں جو ان کے راویوں نے عیسیٰؑ سے سنی تھیں مگر آسمان سے اتری ہوئی بائبل نہیں ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ عیسیٰؑ کی احادیث کہا جا سکتا ہے۔

سر چارلس وولی ہی نے ہمیں دونوں فہرستیں دی تھیں۔ایک بائبل کے مطابق اور دوسری سمیریوں کے کتبوں سے حاصل کی ہوئی۔

انجیل یا بائبل میں تخلیق (Genesis) کے نام سے جو باب ہے اس میں آدمؑ سے لے کر نوحؑ تک کے تمام بڑے بڑے سرداروں کی عمریں بیان کی گئی ہیں۔اس تفصیل کے مطابق آدمؑ سے آگے تک کی عمریں کچھ یوں تھیں:

آدمؑ۔ کل عمر 930 سال:

آدمؑ کے بعد شیثؑ آئے تو حضرت آدمؑ کی عمر اس وقت 130 سال تھی۔

شیثؑ ۔ کل عمر 920 سال:

شیثؑ کے 105 سال کی عمر میں ایک بیٹا ہوا جس کا نام اینوش رکھا گیا۔

اینوش۔ کل عمر 905 سال:

اینوش کی 90 سال کی عمر میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام کنعان رکھا گیا۔

کنعان۔ کل عمر 910 سال:

کنعان کے 70 سال کی عمر میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام مھالیل تھا۔

مھالیل۔ کل عمر 895 سال:

مھالیل کے خدا نے 65 سال کی عمر میں جرید نام کا بیٹا دیا۔

جرید۔ کل عمر 962 سال:

جرید کے 165 سال کی عمر میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اینوش تھا۔

اینوش۔ کل عمر 365 سال:

اینوش کے 65 سال کی عمر میں مہدی الصالح پیدا ہوئے۔

مہدی الصالح۔ کل عمر 969 سال:

مہدی الصالح کے بیٹے کا نام لامیش تھا۔

لامیش۔ کل عمر 500 سال:

لامیش کے بیٹے کا نام نوحؑ تھا۔

یہ شرویک کے رہنے والے تھے اور ان کی عمر 600 سال تھی کہ طوفان آیا اور پھر اس طوفان کے بعد بھی وہ 350 سال زندہ رہے اور انہی سے دوبارہ اولادِ آدمؑ چلی۔ ان کو آدم ثانی بھی کہا گیا۔

نوحؑ۔ کل عمر 950 سال: کل۔ 8198 سال۔

اب توریت یا بائبل قدیم کے مقابلے میں سمیریوں کے بادشاہوں کی فہرست ہے۔ جس میں ان کی عمریں اور نام بھی دیئے گئے ہیں۔ سمیریوں کی بادشاہوں کی فہرست کے جو کتبے ملے ہیں ان سے بھی بے حد طویل عمروں کا انکشاف ہوتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سمیریوں کے بادشاہوں کی فہرست، ناموں اور ترتیب کے لحاظ سے صدفی صد درست تسلیم کی جاتی ہے مگر عمروں کی جو طوالت اس میں ملتی ہے وہ ناقابل یقین ہے۔ جس طرح آدمؑ سے نوحؑ تک کی عمروں میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اسی طرح سمیری بادشاہوں کی فہرست اور ان کی عمروں کے متعلق بھی کوئی قطعی شہادت یا کوئی تاریخی گواہی موجود نہیں ہے۔

ان کتبوں سے جو اطلاعات ہمیں ملتی ہے وہ یوں ہے کہ جب بادشاہی آسمانوں سے اتر کر زمین پر آئی تو اریدو بادشاہوں کا شہر قرار پایا۔ یہاں سب سے پہلے ایلولم نے حکومت کی۔

ایلولم کا صدر مقام اریدو تھا اور مدت حکومت 28,800 سال تھی۔

۔۔۔۔۔ صدر مقام اریدو تھا اور مدت حکومت 39,000 سال تھی۔

۔۔۔۔۔ میں دو بادشاہوں نے حکومت کی۔

۔۔۔۔ کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ انہی کے زمانے میں صدر مقام ایدو سے بدطبریہ منتقل ہوا اور مدت حکومت 64,800 سال تھی۔

۔۔۔۔۔ لونا۔ صدر مقام طبریہ اور مدت حکومت 64,800 سال تھی۔

۔۔۔ میسا گلانا۔ صدر مقام بدطبریہ اور مدت حکومت 28,800 سال تھی۔

۔۔۔ کی گذریا۔ صدر مقام بدطبریا اور مدت حکومت 36,000 سال تھی۔ اس کے بعد مختلف بادشاہوں نے حکومت کی۔

صدر مقام طبریہ سے لارک منتقل ہوا۔ مدت حکومت 26,800 سال تھی۔

ابرتوتو۔ اس کے عہد میں دارالحکومت شرویک ہوگیا اور مدت حکومت 18,600 سال تھی۔

اس طرح طوفان سے قبل 200 ,241 سال تک آٹھ بادشاہوں نے حکومت کی اور کل پانچ دارالحکومت بنائے گئے۔

اس کے بعد دنیا کو طوفان نے گھیر لیا اور طوفان نے تمام پہاڑوں، کھیتوں، خشکی اور ندی نالوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ شہنشاہ ابرتوتو کے بعد اس کا بیٹا ضیاالصدرا بادشاہ بنا اور اسی کے زمانے میں طوفان آیا۔ یہ ضیاالصدرا وہی ہے جس کو سمیریوں کے گیتوں میں طوفان کے زمانے کا بادشاہ کہا گیا ہے۔

نینوا (عراق) کے آثار قدیمہ کی کھدائی سے برآمد ہونے والے بہت سے کتبوں پر مشتمل تحریروں میں جن کو گلگمیش کے کارناموں کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ ضیاالصدرا کو شرویک کے ابرتوتو کے بیٹے کے نام سے پکارا گیا ہے۔

سمیریوں کے یہاں گلگمیش کے کارناموں پر مشتمل جو تحریریں ملی ہیں ان کا پس منظر بھی بالکل نوحؑ ہی کی طرح ہے۔ گلگمیش طوفان کے بعد بادشاہوں میں سمیریوں کا ہیرو ہے اور گلگمیش ہی کے زمانے میں بابل کی تہذیب کو ترقی ملی۔ ضیاالصدرا کے بعد یعنی طوفان کے بعد سمیری بادشاہوں کی عمروں کی طوالت کم ہوگئی۔ طوفان کے بعد کل بارہ بادشاہ ہوئے جس میں طویل ترین عمر 420 سال کی ہوئی اور سب سے کم آٹھ سال کی۔ ان تمام بادشاہوں کا زمانۂ حکومت 3210 سال پر مشتمل ہے۔ اس عرصے کے بعد سمیری بادشاہوں کی فہرست باقی رہی۔ ان بادشاہوں میں 28 ویں نمبر پر گلگمیش آتا ہے۔ گویا ضیاالصدرا سے گلگمیش تک سمیریوں کے کل بادشاہوں کی تعداد 40 ہوئی۔

گلگمیش نے کل 139 سال حکومت کی۔ اس کا دارالحکومت اُرک یا ایرش تھا۔ یہ ایرش جنوبی عراق کے موجودہ شہر ورنا کے قریب موجود تھا۔ جرمن آثار قدیمہ نے اسی ایرش کے کھنڈرات سے 3100 سال قبل مسیح کے مٹی کے کتبے حاصل کئے ہیں جو سمیریوں کی تہذیب سے متعلق تحریروں کا سب سے پرانا ریکارڈ ہے۔ گلگمیش کے کارناموں پر مشتمل جو کتبے ملے ہیں وہ کسی ایک مقام پر موجود نہ تھے بلکہ وہ نینوا، اُر، بابل شرویک اور نیپر کے کھنڈرات کے مختلف مقامات سے برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں شرویک کے کھنڈرات خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں نوحؑ نے اپنی زندگی کے 600 سال گذارے۔ جہاں کے رہنے والے ان کو کشتی بناتا دیکھ کر

ہنسی اور ٹھٹھول کیا کرتے تھے۔ یہ شہر بغداد سے 95 میل دور جنوب مشرق میں موجود قصبے نارا اور نجف کے مقام پر آباد تھا۔ یہ جگہ اُر سے 40 میل کے فاصلے پر تھی۔

ان کتبوں کی تحریریں نہایت خوشنما، صاف اور واضح ہیں، ان میں ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی ہیں جس کی وجہ سے ان کتبوں پر مشتمل تحریروں سے مکمل کہانیاں اور مکمل روایات ظاہر نہیں ہوتیں۔ یہ کتبے اب لندن کے برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔ انہی کی تحریروں کے مطالعے سے سمیریوں کے طوفان سے متعلق خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ کتبے کس طرح لکھے گئے ہیں اس کی مثال یوں ہے:

دوسرا کتبہ:

''جب دیوتاؤں کے آدمی۔ کل تعداد 431 ابلیت آیا کا ہاتھ یہ تحریر لکھتا ہے۔ مہینہ ثبات کا اٹھائیسواں دن، سال وہ جس میں ایمی صدوقہ بادشاہ نے فرات کے دہانے پر ایمی صدوقہ کا قلعہ تعمیر کیا''۔

اس کتبے کی تحریر پڑھنے والوں نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ یہ کتبہ ابتدائی الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

''جب دیوتاؤں کے آدمی'' اس کہانی سے کتبوں کی سطروں کی کل تعداد 439 تھی۔ کتبوں کی فہرست میں اس کتبے کا نمبر دوسرا تھا۔ یہ کتبہ بادشاہ ایمی صدوقہ کے دور حکومت میں جو 1692 قبل مسیح میں بادشاہ بنا تحریر کیا گیا۔ اس کے دور حکومت میں بھی اس تحریر کا وہ مخصوص سال تھا جب کہ فرات کا قلعہ تعمیر ہوا۔ اس میں کل 339 سطریں تھیں مگر موجودہ کتبے میں صرف 50 سطریں ملیں اور باقی ضایع ہو چکی ہیں۔ اس کتبے میں وہ الفاظ جن کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے ''جب دیوتاؤں کے آدمی'' سمیریوں کی اصل زبان میں یوں لکھے گئے ہیں:

''الوما ایلوا اوی لم۔۔۔۔۔۔یعنی۔۔۔۔۔جب دیوتاؤں کے آدمی''۔

انہی کتبوں سے ہمیں سمیریوں کی تہذیب اور تمدن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ میں، سر جان مارشل اور رودولی قریباً ایک ماہ تک ساتھ ساتھ رہے اور پھر ہم لوگ سر جان مارشل کے ہمراہ عراق کے مختلف علاقوں میں دوسرے کھنڈرات دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک ماہ کا یہ زمانہ جو اُرک اور اُر، شرو یک وغیرہ کے مطالعے میں گذرا ایک بہت اعلیٰ علمی وقفہ تھا اور طوفان نوح، نوحؑ کی کشتی، سمیری نسل اور ان کی زبان اکادین کے حروف تہجی وغیرہ اور مختلف ٹیلوں سے برآمد ہونے والے کتبے اور تختیاں ہی ہر وقت موضوع بحث بنی رہتی تھیں۔ اس پورے وقفے میں ایک بار بھی میری توجہ کسی وقت بھی نہ تو ملکہ یوران کے رومال پر گئی اور نہ ہی اس سیاہ فام حبشی ساحرہ جامش کے دیئے

ہوئے ہڈی کے تحفے پر جو ہمیشہ میرے پاس رہتے تھے۔ میں نے ان دونوں تحفوں کو تعویذ کی طرح گلے میں اور بازو پر باندھنے کی عادت ڈال لی تھی۔ ہڈی تو فقط ایک شلنگ (ایک روپیہ) کے سائز کی تھی۔ رومال بھی چمڑے کا ایک بھدہ سا ٹکڑا تھا مگر چونکہ سارحان کے معرکوں میں، میں ان کی اہمیت دیکھ چکا تھا اس لئے ان کو اپنے سے کبھی جدا نہ کرتا تھا۔

سارحان کے معرکوں کو اب قریب قریب سات آٹھ ماہ گذر چکے تھے اور ہڈی کو بارہ ماہ۔ اور ان سے متعلق کوئی نئی بات ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی۔ شاید اسی لئے میں نے ان دونوں چیزوں کو کسی حد تک فراموش کر دیا تھا۔

اس دن ہم نے نمرود کے کھنڈرات کی تحقیقات میں کافی وقت صرف کر دیا تھا اور بہت تھک گئے تھے۔ خلاف توقع اس شام کو سخت قسم کی بارش بھی شروع ہو گئی تھی اور ہم تینوں یعنی سر جان مارشل، میں اور روسی بارش میں شرابور سات بجے کے قریب بھیگتے ہوئے ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تھے۔ بھیگے ہوئے کپڑے بدل کر اور معمولی سا کھانا کھا کر میں جلد ہی اپنے کمرے میں سونے چلا گیا تھا۔ شاید آدھی رات کا وقت تھا کہ میں نے اپنے سینے پر گرمی کی جلن محسوس کی اور اسی جلن کی بدولت سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی۔ سینے پر جیسے کسی نے انگارے رکھ دیئے تھے مگر یہ گرمی لحظہ بھر کو ابھرتی اور پھر معدوم ہو جاتی۔ نیند کی مدہوشی سے نجات پاتے ہی میرے ذہن نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ گرمی گردن میں پڑے ہوئے مردوتش کے عطیے کی ہے۔ اس پراسرار ہڈی سے جب کبھی مجھے کوئی پیغام ملنا ہوتا تھا تو وہ اسی طرح ملتا تھا۔

ہڈی آہستہ آہستہ سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ میں نیند سے پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور اس ہڈی پر نظریں جمائے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ ایک جوان سپہ سالار ایک فوج لئے ہوئے شاید کئی ریگستانوں کی مسافت طے کرتا ہوا ایک عظیم چہار دیواری سے گھرے ہوئے شہر کی فصیل تک پہنچ رہا تھا۔ یہ منظر آہستہ آہستہ اس ہڈی پر ابھر رہا تھا۔ تفصیلاً اور فوج کے گھوڑے، سپاہیوں کے لباس، ان کے سامان سے لدے ہوئے رتھ، سب کے سب واضح طور پر نظروں کے سامنے آ چکے تھے۔

اس ہڈی پر جو نقوش ابھر رہے تھے وہ بہت واضح تھے جس طرح ایک آئینے میں کوئی منظر ابھرتا ہے۔ یہ منظر بھی اسی طرح صاف طور پر ابھر آیا تھا اور اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ زندہ اور سانس لیتا ہوا منظر میری آنکھوں کے سامنے آویزاں تھا۔

اس نوجوان سپہ سالار نے فصیل کے گرد پہنچ کر اپنا گھوڑا روک دیا۔ فصیل کے پھاٹک بند تھے اور اندر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نوجوان کے ہمراہی فوجیوں نے آگے بڑھ کر

پھاٹک کے دروازے کھول دیئے۔ اندر کون تھا جو مزاحمت کرتا؟ شہر کے اندر اور قلعے کے چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ یہ فوج حملہ آور نہیں تھی، اور نہ ہی ان فوجوں کی آنکھوں میں حملہ آوروں کی سی خون آشامی تھی۔ نہ اس کے سپہ سالار کی چال ڈھال میں شکار پر جھپٹنے والے درندوں کی سی تیزی تھی۔ یکایک اس کی آواز ابھری:

''اشتر دیوی کی قربان گاہ تک ... مردوقش دیوی کے مندر تک''۔

اور پھر ساری فوج آہستہ آہستہ پھاٹک کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ اس کے ہمراہی پھاٹک سے اندر داخل ہونے کے لئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ فولاد کے اسلحے کی جھنکاریں، گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ مل کر ایک عجیب سُر تال کی موسیقیت پیدا کر رہی تھی۔ فوجیوں کے چہرے تپے ہوئے تانبے کی طرح سرخ تھے اور ان کے جسموں پر سجے ہوئے اسلحوں پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ شاید کہیں دور کی مسافت طے کر کے یہ فوجیں اس گم گشتہ اور بھولے بسرے شہر کی فصیل تک آ پہنچی تھیں۔ اس شہر کے مکین شاید کہیں اور جا کر آباد ہو گئے تھے اور اگر تھے بھی تو شاید بہت کم لوگ تھے جو اس عظیم فوج کی آمد کے گردِ کارواں ہی سے ڈر کر ادھر اُدھر چھپ گئے تھے۔

یکایک فصیل کے فولادی اور عظیم دروازے کا ایک حصہ کھلا۔ ایک بہت بڑے بیل کا مجسمہ جس کے سینگ اونچے اور نوکیلے تھے ایک رتھ پر رکھا ہوا نظر آیا۔ اس رتھ کو چار پجاری کھینچ رہے تھے اور ان کے پیچھے ایک بڑا پجاری تھا جس نے زرق برق لباس پہن رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ کھلے دروازے سے آگے بڑھ کر پجاری سپہ سالار کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس سے مخاطب ہوا کہ:

''اشتر دیوی، مشرق کے فاتح کو آشیرباد دیتی ہے''۔

دوسرا باب

عراق میں

کسی نے میرے قریب ہی سے کان میں سرگوشی کی:

"یہ مقدونیہ کے بادشاہ فلپ کا بیٹا سکندر ہے اور وہ مُردوں کی زمین کے کھنڈرات سے گذر کر یہاں آیا ہے مگر اب اس شہر سے آگے نہیں جا سکے گا۔ یہ بستی بھی اسے اسی طرح اپنے اندر ڈھانپ لے گی جس طرح وہاں مُردوں کی زمین نے انسانوں کو ڈھانپ لیا تھا"۔

گھوڑے کا سوار جو اپنی فوج لئے دروازے پر کھڑا تھا کچھ زیادہ لمبے قد کا نہ تھا۔ اس کے چہرے لباس اور اسلحے پر سفر کی مشقت اور راستے کی گرد چھائی ہوئی تھی مگر کسی لمبے سفر کی تھکن اور بہتے ہوئے پسینے سے زیادہ اس کے چہرے پر نقاہت اور بیماری کے آثار زیادہ نمایاں تھے۔

میرے کانوں میں مسلسل سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ اس کی قسمت میں جنگوں کی فتح تھی مگر کسی علاقے اور ملک پر اپنے نام کی حکومت قائم کرنا اس کے نصیب میں نہ تھا۔ اسے 20 سال کی عمر میں تاج ملا اور تاجداری کے بعد 14 سال اور ملے لیکن اس نے یہ سب سال لڑنے بھڑنے میں گذار دیئے۔ یہ یونان میں اپنی ریاست مقدونیہ سے نکلا تو جنوب میں فراعین کے مصر کو فتح کیا اور وہاں فتوحات کرتا ہوا ایران سے بلخ تک اور بلخ سے جنوب کے سمندر تک پہنچ گیا۔ جہاں جہاں بھی گیا فتح اس کے قدم چومتی رہی مگر زمین کے ان خطوں میں سے کسی نے بھی اس کی مستقل حکمرانی قبول نہیں کی۔ اس کے فتح کئے ہوئے تمام علاقے اس کے جنرلوں کی گود میں گر گئے۔ اب اس کے دو سپہ سالاروں سلیوکس اور پوٹولمی کے حصے میں آئیں گے جہاں وہ اب اپنی خاندانی سلطنت قائم کریں گے اور یہ اپنی عمر کے 34 ویں سال کی آخری سانس اسی شہر بابل میں لے گا۔

"— مگر یہ مُردوں کے کھنڈرات کا علاقہ کونسا ہے"؟

میں نے بھی دبی آواز اور زبان میں پوچھا۔

جس کے جواب میں کہا گیا:

''جتنا دکھایا اور بتایا جا رہا ہے اس سے زیادہ کی ہوس نہ کر۔ ان کے راز کھلنے میں ابھی دیر ہے۔ تو ضرور اپنی آنکھوں سے خود اسی زمین کو دیکھے گا''۔

پھر آن کی آن میں یہ سارے منظر خود بخود تحلیل ہو کر معدوم ہو گئے۔

صبح میری آنکھ دروازے پر کسی کی کھٹکھناہٹ سے کھلی۔ سر جان مارشل ناشتے کے میز پر میرے منتظر تھے۔ قیام مصر کے چند ماہ اور عراق کے ان چند مہینوں ہی میں وہ مجھے بہت معتمد سمجھنے لگے تھے ورنہ کہاں وہ جہاں دیدہ عالم اور کہاں میں 20 سال کا ناتراشیدہ بے ہنگم سا نوجوان۔ یہ بھی ان کی مہربانی ہی تھی کہ وہ مجھے کسی لائق سمجھ کر اپنا علم میری جھولی میں ڈالتے رہتے تھے۔ ہم نے ناشتہ کیا اور یہ ناشتہ ہی کیا ہوتا تھا۔ گرم گرم دودھ، گندم کی روٹیاں اور کھجوریں۔

وہ کہتے تھے کہ

''ریگستان میں کھجور ضرور کھاؤ۔ یہ اللہ کا تحفہ ہے، نشاستہ، پروٹین اور دوسری غذائیت سے بھرپور جو سانس سے جسم کے اندر جانے والی ریت، مٹی اور گرد و غبار کو پتھریاں بننے سے روکتی ہے۔ کھجور طاقت بھی دیتی ہے اور معدے میں پتھریاں بھی نہیں بننے دیتی''۔

عراق کا موسم بہت گرم تھا۔ صبح آٹھ بجے ہی سے جو دھوپ اور سورج کی تمازت بڑھنا شروع ہوئی تو پھر شام پانچ بجے تک زمین اور فضا سے بس آگ ہی آگ برستی محسوس ہوتی تھی۔ ہم برطانوی لوگ بھی اب کوٹ پتلون وغیرہ کو چھوڑ کر عربوں ہی جیسا ڈھیلا ڈھالا لباس پہننے لگے تھے اور سر پر انہی کی طرح سوتی کپڑے کی ٹوپی بھی اوڑھ لیتے تھے جس سے جسم میں گرمی کی تپش اور تمازت کم ہو جایا کرتی تھی۔ یہاں کا درجہ حرارت 50 ڈگری سے لے کر 54 ڈگری تک چلا جاتا تھا اور بغیر جوتوں کے زمین پر پاؤں رکھنا بھی ناممکن ہو جاتا تھا۔

عراق کے قیام اور پھر یہاں سے آگے کے سفر کے واقعات بیان کرنے سے قبل آپ کو کچھ پچھلی باتیں بتانا چاہتا ہوں۔

میں اپنے دادا چارلس میلکم کی یہ سرگزشت 1978ء سے لکھ رہا ہوں۔ میرے دادا 1923ء میں انتقال کر گئے تھے۔ پھر میرے والد بھی انہی عجیب و غریب حالات کا شکار ہو کر 1948ء میں فوت ہو گئے تھے۔ میں نے یہ سرگزشت اپنے دادا کی ایک ڈائری کے نوٹس سے (جو مجھے ان کے پرانے کاغذات میں ملی تھی) اخذ کر کے جوڑ جوڑ کر لکھے ہیں اور یہ داستان اب 1978ء میں پرتگال کے ایک اخبار ''دی کالونی'' کے ذریعے آپ تک قسط وار پہنچ رہی ہے۔ اس میں 1920ء تک ہی

کے واقعات شامل ہیں مگران کی مصر، عراق اور اس کے بعد کے سفرنامے کی تفصیلات میں نے خود ہی ترتیب دی ہیں جو مجھے مختلف رسالوں میں لکھی ہوئی ملی تھیں۔

چنانچہ اس سرگزشت میں کبھی تو آپ کو 1900ء کا حال ملے گا اور کبھی 1910ء کا اور کبھی 1920ء کا۔ یہ اس لئے کہ میں نے اس کہانی کو ترتیب دیتے ہوئے سالوں کو ترتیب وار نہیں لکھا اور میں نے کچھ سال گنتی بہ گنتی کے مطابق یعنی پہلے 1900ء اور 1901ء اور 1902ء کے تسلسل سے لکھنے کی بجائے صرف واقعات کے تسلسل کو مدنظر رکھا ہے اور ذیلی حاشیوں میں کبھی کچھ تحریریں اپنے وقت کی یعنی دادا کے زمانے سے بھی 60/70 سال بعد کی تحریں ڈال دی ہیں۔ چنانچہ آپ سالوں کی ترتیب سے زیادہ واقعات پر توجہ مرکوز رکھئے گا اور اگر پھر بھی آپ کے ذہن میں کوئی الجھاوا آ جائے تو آپ ''دی کالونی'' کے ایڈیٹر کی وساطت سے مجھ سے رابطہ کر کے اس الجھاوے کو دور کر سکتے ہیں۔

ایک دن میں نے جب سر جان مارشل سے عراق کے گرم موسم اور اپنے ملک برطانیہ کے ٹھنڈے موسم کا موازنہ کرتے ہوئے کہا:

''ہم تو انگلستان ہی میں اچھے تھے''۔

تو انہوں نے مجھے ایک لمبا سا لیکچر دے ڈالا۔ وہ ہماری قوم کی عظمت کے سینکڑوں گوشوں کو کھولتے جاتے تھے اور مجھے ہمیشہ یہی ایک سبق دیتے تھے کہ:

''میلکم! تمہیں خود کو بھی اتنا بلند کرنا ہے کہ تم خود اپنی قوم کی عظمت کا ثبوت بن جاؤ''۔

چنانچہ جب میں نے عراق کے گرم موسم کا شکوہ کیا تو وہ مجھے کہنے لگے: ''میلکم! تم جانتے ہو کہ آج ہم دنیا کی عظیم ترین قوم کیوں ہیں؟ اور آج برطانوی سلطنت کے طول وعرض میں سورج کبھی کیوں غروب نہیں ہوتا؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کبھی موسموں کی سختی، جغرافیائی فاصلوں اور بدترین حالات میں بھی ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ ہم مشکلات اور پریشانی میں بھی کسی مایوسی اور گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے اور اپنے مقصد کو پانے کے لئے جنون کی حد تک اس میں منہمک رہتے ہیں اور ہماری ہر جدوجہد اور ہر کام میں ہمارا مرکز نگاہ تاج برطانیہ کی سرخ روئی اور بلندی ہوتا ہے اور یہی ہمارا مشترکہ مقصد ہوتا ہے''۔

وہ کہہ رہے تھے کہ:

''ہم میں اور دوسری یورپی قوموں میں بس یہی فرق ہے کہ ہمارا ہر برطانوی شہری اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ پوری قوم کا نمائندہ بن کر سوچتا ہے اور ہمیں ہمارا ملک ہر قسم کی دوستی، ہر ملک سے تعلقات اور ہر قسم کی مذہبی وابستگی اور جذبات سے زیادہ عزیز ہوتا ہے اور ہم اپنے

مقصد کو پانے کے لئے اور اپنے مخالف کو زیر کرنے کے لئے ہر حد کو پار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔
ہم ہر قسم کا حربہ آزمانے کے لئے تیار رہتے ہیں اور اسی لئے بالآخر ہمیں کامیابی ملتی ہے''۔
اس سلسلے میں انہوں نے مشرقی یورپ میں مسلمانوں کی عظیم عثمانی سلطنت کے کچھ واقعات کا حوالہ بھی دیا۔ انہوں نے بتایا کہ:

''تیرھویں صدی سے پندرہویں صدی تک اس عثمانی سلطنت نے پورے یورپ کو اپنے رعب وجلال میں جکڑ کر رکھا ہوا تھا اور ہم مسیحی جو اس بات پر بہت خوش تھے کہ ہم نے 1492ء میں اسپین سے مسلمانوں کو باہر دھکیل کر پورے یورپ کو مسلمانوں سے محفوظ کر لیا تھا اب اس نئی مصیبت سے بہت پریشان تھے۔ ان کی بحری طاقت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ بحیرہ ایجیئن، بحیرہ ایڈریاٹک، بحیرہ مارمورا بحر قلزم، بحیرۂ اسود اور بحیرہ معتدل سب ہی سب ان کے صحن کے تالاب بن گئے تھے۔ ان کا ایک مشہور امیر البحر خیر الدین باربروسا تھا جس کی جنگی فراست اور تنظیمی ذہانت کا ہمارے ہاں کوئی مدمقابل نہ تھا۔ بلقان سے جارجیا، آرمینیا اور یونان بلکہ ہنگری تک سب کچھ ان کے قبضے میں جا چکا تھا۔ آسٹریا کا دارالحکومت ویانا بھی ان کی یلغار سے صرف اس لئے بچ گیا تھا کہ اُس سال عام اندازوں سے بہت پہلے برف باری شروع ہوگئی تھی جس سے بچنے کے لئے ان کے پاس مناسب ساز وسامان نہیں تھا پھر وہاں آسٹریا کے لوگوں نے بھی اس شہر کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔

یہ سب کچھ برطانیہ کے لئے بھی ایک چیلنج تھا سو ہم نے تمام حالات پر غور کر کے اس کا یہ حل نکالا کہ مسیحی یورپی بادشاہوں کو ملا کر ایک کرسچن لیگ بنائی اور اس کے ماتحت یورپ کے سب ملکوں نے ایک مشترکہ بحری بیڑہ تیار کیا اور کوئی 200 سال کے بعد پہلی مرتبہ 1561ء میں اٹلی کے قریب لی پینٹو (Le-Pento) کی جنگ میں عثمانی بحری فوج کو ایک سخت شکست دی۔ جس کے بعد ہی ہم کچھ سنبھلے۔ مگر ہم نے پھر بھی یہی غنیمت سمجھا کہ یورپ اور شمالی افریقہ میں عثمانیوں کا مقابلہ کرتے رہنے کی بجائے ہم نئی دریافت شدہ دنیا یعنی شمالی اور جنوبی امریکہ کی طرف اپنی تجارت بڑھائیں اور پھر برطانیہ نے شمالی امریکہ کے وسیع وعریض خطوں پر قبضہ کر لیا۔ اگر عثمانی حکومت بحیرہ معتدل سے آگے بڑھ کر اٹلانٹک کی طرف امریکہ کی جانب پیش قدمی کرنا شروع کرتی تو ہم وہاں بھی آج تک ان کا مقابلہ کر رہے ہوتے۔

مگر چونکہ یہ نئی دنیا اسپین نے دریافت کی تھی اور وہ اس پر اپنا زیادہ حق سمجھتے تھے سو اب ہمارے برطانیہ کے مفادات مسلمان سلطنت سے نہیں بلکہ خود اسپینی مسیحی سلطنت سے

ٹکرا رہے تھے۔ سو ہم نے ان کے عیسائی ہم مذہب ہونے کو کوئی اہمیت نہ دی اور پھر ایک موقع ایسا بھی آیا کہ اسی مسیحی لیگ کے رکن اسپین کی بحری فوج کے بیڑے آرمیڈا (Armeda) کو برطانیہ نے شکست دی۔ یعنی ہمیں مسیحی بھائیوں کا خون تو بہانا پڑا مگر برطانیہ کے مفادات کو ہم نے زیادہ عزیز رکھا اور پھر ہم نے اپنے بحری تجارتی راستوں کو افریقہ کے مشرق سے لے کر ایشیا کے مشرقی ساحلی ممالک تک پھیلا دیا۔ جس کے نتیجے میں برطانوی مقبوضات کی سلطنت ابھرتی چلی گئی اور اس لئے آج (1910ء) میں ہندوستان جیسا ملک بھی ہمارے قدموں میں ہے اور میں اب اسی ملک میں آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اعلیٰ عہدے پر کام کرتا ہوں اور میں وہیں سے ایک سال کی چھٹی لے کر برطانیہ آیا تھا جہاں کیمبرج کے لیکچر کے دوران میری تم سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب عراق سے میں بمبئی ہوتا ہوا سندھ کے ایک کھنڈر کی کھدائی کے لئے پہنچوں گا"۔

برطانوی شہریوں کے جوش ولولے کے ہزاروں قصے جان مارشل کو زبانی یاد تھے۔ اسی ضمن میں انہوں نے مجھے ارنسٹ شیکلٹن (Earnest Shackleton) کا قصہ بھی سنایا جو جنوبی امریکہ میں برطانوی مقبوضہ جزیرہ فاکلینڈ سے آگے قطب جنوبی پر برطانوی جھنڈا لہرانا چاہتا تھا۔

ارنسٹ شیکلٹن، جان مارشل کا ہم عصر تھا اور 1874ء میں آئرلینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ اسے سمندری سفر کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ 16 سال کی عمر میں اس نے ایک برطانوی بحری جہاز پر ملازمت اختیار کر لی جو جنوبی امریکہ کی طرف تجارتی سامان لے جایا کرتا تھا۔ اس نے فاکلینڈ کے جزائر کے بہت سے سفر کر لئے تھے۔ اب اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ قطب جنوبی قریب ہی ہے اور ابھی تک وہاں کسی دوسرے یورپی ملک کے قدم نہیں پہنچے ہیں تو کیوں نہ وہاں برطانیہ کا قبضہ کرایا جائے اور اسی مقصد کے لئے اس نے ایک بحری جہاز بھی خرید لیا تھا۔

لندن میں شیکلٹن کی ملاقات جان مارشل سے ہو چکی تھی اور وہیں اس نے قطب جنوبی کو فتح کرنے کے عزم کا اظہار بھی کیا تھا (اب میں آپ کو شیکلٹن کی کہانی کا بقیہ حصہ سنا رہا ہوں جو میں نے بعد کے سالوں کی ڈائریوں کے نوٹس سے دادا کی تحریروں سے اخذ کیا تھا)۔

1913ء میں ارنسٹ شیکلٹن نے اینڈیورنس (Endurance) نامی ایک جہاز خرید لیا اور اسے لے کر فاکلینڈ کے راستے قطب جنوبی کی جانب روانہ ہوا۔ وہ 8 اگست 1914ء کو برطانیہ کے جنوب سے روانہ ہوا۔ اس سے دو سال قبل ہی ایک امریکی یہودی کا جہاز Titanic برطانیہ سے کچھ دور شمال مغربی سمندر میں ایک جزیرے New Found Land کے قریب ایک آئس

برگ سے ٹکرا کر ڈوب چکا تھا جس میں تقریباً ایک ہزار انسان موت کا شکار ہوئے تھے۔ تو تمام احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے شیکلٹن اپنا بحری جہاز آئس برگوں سے بچا بچا کر فاکلینڈ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر کچھ آگے جا کر اس کا جہاز سمندر کی جمی ہوئی برف میں پھنس گیا اور اس کو برف سے نکالنے کی اس کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ سخت سردی، برفباری اور تند و تیز ہواؤں کے جھکڑوں سے بچتا بچاتا وہ اور اس کے 37 ملاح ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ہو کر ایک ماہ کے سفر کے بعد ایک دور دراز کے ویران جزیرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ تھا۔ نہ سردی کے کپڑے تھے۔ بس ان کا زندہ بچ جانا ہی ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ کئی ماہ اسی کسمپرسی میں گزرے۔ جنگلوں کے پھل اور پتے کھا کر وہ زندہ رہے اور کئی ماہ بعد پھر اتفاقاً ادھر سے گذرتے ہوئے ایک برطانوی جہاز نے ان کو بچا لیا اور پھر برطانیہ لا کر چھوڑا۔

ان کی کہانی اخبارات میں آئی تو لوگوں کو ان کے عزم و استقلال اور برطانیہ کو سرخرو کرنے کی کوششوں کا پتہ چلا۔ سوار نسٹ شیکلٹن قطب جنوبی پر برطانیہ کا جھنڈا لہرانے میں تو کامیاب نہ ہو سکا اور اس کی زندگی بھر کی کمائی بھی اینڈیورنس (Endurance) نامی جہاز کے ساتھ ہی برف میں دفن ہو گئی۔ لیکن وہ پوری برطانوی قوم کا ہیرو ضرور بن گیا۔

ایسی کہانیاں اور ایسے واقعات سن کر ہمارا سر بھی فخر سے بلند ہو جاتا تھا اور ہم بھی یہی سوچتے تھے کہ کوئی ایسا کام کر گذریں کہ تاج برطانیہ ہم پر بھی فخر کر سکے۔ سر جان مارشل اکثر کہا کرتے تھے کہ:

”کوئی بڑا کام کرنے کے لئے تیاری، صبر اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لئے محنت کرتے رہتے ہوئے بہت انتظار کرنا پڑتا ہے“۔

جس زمانے کے عراق کی باتیں میں آپ کو بتا رہا ہوں یعنی 1910ء کے لگ بھگ کی، وہ ترکی کی عثمانی سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا اور 600 سالہ یہ شہنشاہیت اب یورپ کا مرد بیمار کہلاتی تھی۔ عراق کی سیاسی فضا بھی اب بہت بوجھل اور ترکوں کے قبضے کے خلاف بھی یہ مخالفت ایک آگ کی طرح سلگ رہی تھی۔ عرب اپنی دکانوں میں یا شیشہ خوانوں میں جہاں فرصت کے وقت بیٹھے حقہ پیتے تھے اور گپیں مارتے تھے عموماً باب عالی ہی کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے۔

”باب عالی“ استنبول (یعنی قسطنطنیہ) میں عثمانی سلطنت کے شاہی دربار کا نام تھا جہاں اس زمانے میں سلطان عبدالمجید کی حکومت تھی۔ جس کو عام لوگ خلیفہ کہتے تھے اور عراق بھی اسی عثمانی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ عراق ہی کیا شام، فلسطین، آرمینیا، جارجیا، یونان کا بڑا حصہ بلکہ بلقان کا

پورا علاقہ سب کا سب اس عظیم سلطنت کا حصہ تھے۔

ملک عراق جو ترکی، عرب، شام اور ایران کے درمیان واقع تھا اور ایک طرح سے پورے مشرق وسطیٰ کے سیاسی درجہ حرارت کو ناپنے کے لئے تھرمامیٹر کا کام دیتا تھا۔ یہ پورا ملک دجلہ و فرات نامی دو دریاؤں کی زرخیز وادی تھا اور پورا علاقہ زراعت کے لئے مشہور تھا۔ یہیں آ کر ہمیں معلوم ہوا تھا کہ مسلمان دو بڑے فرقوں میں تقسیم ہیں۔ جن میں ایک سنی جو اپنے رسول ﷺ سے سنی ہوئی باتوں پر عمل کر کے زندگی گذارتے ہیں اور دوسرے شیعہ ہیں جو کہ رسول ﷺ کی جو باتیں اور ہدایتیں ان کے قریبی خاندان والوں سے ان تک پہنچی ہیں ان کے مطابق مذہب کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ دونوں یوں تو ایک ہی خدا، ایک ہی رسول، ایک ہی کتاب قرآن اور ایک ہی کعبے کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں مگر مذہب کے تفصیلی معاملات میں بہت چھوٹے چھوٹے پہلوؤں پر ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم مسیحی بظاہر تو صرف عیسائی کہلاتے ہیں مگر ہمارے بھی دو بڑے مذہبی فرقے ہیں۔ ایک روم کے کیتھولک عیسائی اور دوسرے یونان کے آرتھوڈوکس مسیحی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ہم میں 20/25 دوسرے چھوٹے بڑے فرقے موجود ہیں۔

عراق میں شیعہ اکثریت میں ہیں اور ان کی تعداد کل آبادی کا تقریباً 70 فیصد ہے۔ مگر یہاں حکومت عثمانی سنی ترکوں کی ہے۔ عرب کے مکہ اور مدینہ کے علاوہ شیعہ مسلمانوں کے دو بڑے مذہبی مراکز نجف اور کربلا بھی ہیں جہاں ان کے دو اکابرین کے مقبرے ہیں۔ اکثریت میں آبادی ہونے کے باوجود یہاں کے شیعہ سرکاری شعبوں، زراعت یا تجارت، بڑے امیر طبقوں میں شمار نہیں کئے جاتے ہیں کیوں کہ ان پر تمام سنی مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ چنانچہ سیاسی انتشار کے علاوہ یہ مذہبی فرقہ بندی بھی یہاں کافی سختی کے ساتھ موجود ہے۔ مگر سلطنت عثمانیہ کی سخت بندشوں اور کڑی سزاؤں کے ڈر سے یہ مذہبی اور گروہی اختلافات اوپر کی سطح تک ابھر کر سامنے نہیں آتے۔

دوسری سیاسی شورش باب عالی کے ترک حکمرانوں کے خلاف بھی پھیلتی نظر آتی ہے اور وہاں نوجوان ترک (Young Turks) کے نام سے بھی ایک فوجی گروہ ابھر رہا ہے جو پوری سلطنت عثمانیہ کو نئے جمہوری اور قومی زاویوں سے ازسرنو منظم کرنا چاہتا ہے۔

تیسرا باب
آثار قدیمہ کے دو محققین کا تعارف

''مینا متی'' کے اس تحریری سفر میں قارئین نے سر جان مارشل اور لیونارڈ وولی کے نام کئی بار سنے اور پڑھے ہیں۔ یہ دونوں ماہرین آثار قدیمہ برطانوی نژاد تھے اور قدیم دنیا کے کھنڈرات میں دفن شدہ آثار قدیمہ کو دنیا میں روشناس کرانے میں ان کا بہت بلند مقام ہے۔ لیونارڈ وولی نے عراق میں ''اُر'' کے کچھ کھنڈرات سے بہت قیمتی معلوماتی سرمایہ جمع کیا تھا اور اسی طرح سر جان مارشل نے سندھ کے مقام موئن جودڑو پر کھدائی کر کے 4 ہزار سال قبل مسیح کی باقیات نکالی تھیں۔

قارئین کی معلومات کے لئے ان دونوں شخصیات کی مختصر سوانح عمریاں اور ان کے علمی و تحقیقی کارناموں کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

سر جان مارشل (Sir John Marshal):

ان کا اصل نام جان ہربرٹ مارشل (John Herbert Marshal) تھا۔ وہ 17 اگست 1876ع کو لندن کے قریب چیسٹر (Chester) میں پیدا ہوئے اور پھر برطانیہ ہی کے شہر گل فورڈ (Guilford) میں 82 سال کی عمر میں 17 اگست 1957ء کو وفات پا گئے۔

ان کی تعلیم کیمبرج کے دو کالجوں میں ہوئی۔ پہلے وہ ڈل وچ کالج (Dulwhich College) میں اور پھر کنگز کالج کیمبرج (Kings College Cambridge) میں زیر تعلیم رہے۔ تاریخ اور خصوصاً قبل مسیح کی قدیم تواریخ ان کا پسندیدہ شعبہ تھا۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ مصر، عراق۔ کریٹ اور Norte Chico وغیرہ کے علاقوں میں موجود کھنڈرات کی کھدائیوں میں حصہ لیتے رہے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور آثار قدیمہ کے صدیوں پرانے زیرزمین دفن شدہ تمدنی خزانوں کی تفتیش اور ان پر باریک بینی سے تحقیق میں وہ بہت مستقل مزاجی اور لگن سے مشغول رہتے تھے۔ عراق میں ان کے ہم عصر لیونارڈ وولی تھے

جو خود بھی ایک ماہر اور مستند تاریخ کے عالم تھے اور آثار قدیمہ کی کھدائیوں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔

یوں تو جان مارشل ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ سے کافی عرصے سے منسلک رہے تھے مگر جنگ عظیم اوّل سے قبل ہیبر طانوی حکومت نے جان ہربرٹ مارشل کو برطانوی مقبوضہ ہند کا ڈائریکٹر آثار قدیمہ اور نقشہ جات (Director Archeological Survey of India) مقرر کر دیا تھا اور جب وہ کیمبرج سے ہندوستان کے لئے ایک بحری جہاز میں براستہ نہر سوئز روانہ ہو رہے تھے تو درمیان میں انہوں نے کچھ عرصہ مصر اور عراق میں بھی قیام کیا تھا اور یہیں ان کی ملاقات لیونارڈ وولی سے بھی ہوئی تھی۔

ہندوستان آنے کے بعد یوں تو انہوں نے اس پورے ملک کے مشہور کھنڈرات کا دورہ بھی کیا تھا اور ان علاقوں کے نقشے بھی تیار کرائے تھے اور ان کے مقامات اور محل وقوع کے بارے میں بہت سی ضروری معلومات اکٹھی کیں۔ مگر آخر کا ان کی نظریں سندھ کے مشہور شہر لاڑکانہ کے کھنڈرات موئن جو دڑو (یعنی مُردوں کا ٹیلہ) پر جم گئیں۔ جس کے بارے میں مقامی لوگوں میں عجیب وغریب کہانیاں مشہور تھیں۔ اس طرف توجہ دلانے میں بمبئی کے ایک پارسی تاریخ دان آر۔ ڈی۔ بینرجی (R.D. Bennerjee) کا بہت ہاتھ تھا جو خود بھی کئی بار اس کھنڈر کا دورہ کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور ماہر قدیم تاریخ کاشی ناتھ ڈکشٹ نے بھی جان مارشل کو اس علاقے میں کھدائی پر آمادہ کیا تھا۔ بعد میں اس کھنڈر کی کھدائی میں ایک ارنسٹ فنلے (Earnest Finlay) نام کے ماہر بھی شامل ہو گئے تھے۔

موئن جو دڑو کی یہ کھدائی 1913 عیسوی سے شروع ہو کر 1925 عیسوی بلکہ 1930 عیسوی تک چلتی رہی۔ یہ پورا کھنڈر 300 ہیکٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ بستی بار بار آباد ہوتی تھی اور پھر اجڑ جاتی تھی۔ اس طرح اس کی سب سے نچلی سطح پر آبادی اور معاشرتی رہن سہن کے جو آثار ملے وہ ساڑھے چار ہزار سال قدامت کے تھے۔

موئن جو دڑو کی یہ بستی سات مرتبہ ویران ہوئی اور پھر سات مرتبہ ہی آباد ہوئی۔ اس کی آخری سب سے اوپر کی آبادی تقریباً 1900 قبل مسیح تک موجود تھی اور سندھ کی وادی کی تہذیب میں اس شہر کو کسی قسم کی مرکزی حیثیت حاصل تھی اور اس کی آبادی 5000 نفوس پر مشتمل تھی۔

اس بستی کا شہری منصوبہ (Layout) بڑی حد تک منظم تھا۔ مکان عموماً پکی مٹی کے بنے ہوئے اور دو منزلہ ہوتے تھے اور اکثر گھروں کے اندر ہی کنویں موجود تھے۔ چوڑی چوڑی گلیوں کے کناروں پر گندے پانی کے نکاس کی نالیاں بھی موجود ہوتی تھیں۔ بستی میں غلہ رکھنے کے گودام بھی

تھے اور عوام کے نہانے کے لئے ایک بڑا حوض نما غسل خانہ (Public Bath) بھی موجود تھا۔

یہاں چالیس فٹ اونچا ایک بدھی پگوڈا بھی دریافت ہوا جس کے قریب ہی 78 کمروں پر مشتمل ایک عمارت کے آثار بھی ملے تھے جو غالباً یہاں کی رہنے والے بدھی طلباء کی قیام گاہ یا ہوسٹل تھا۔ ایک بڑی عمارت کے آثار بھی برآمد ہوئے جو شاید اسیمبلی ہال یا شہر کے نظم و نسق سے متعلق اہلکاروں کے دفاتر کا حصہ تھا۔

موئن جودڑو سے یوں تو ترازو، پیتل کے بہت سے برتن، مٹی کے کھلونے اور کانسی کے ایک بیل کا مجسمہ بھی ملا جو چار انچ اونچا تھا۔ مگر جو چیزیں خصوصیت سے ماہرین آثار قدیمہ کی توجہ کا مرکز بنیں وہ تین تھیں:

1۔ پاشو پاتی مہر (Pashopat Seal): اس میں ایک شخص کو مذہبی نوعیت کی پوجا کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے جس کے چاروں طرف بہت سے جانور بھی بیٹھے نظر آتے ہیں۔ یہ مٹی کی پلیٹ کی مہر غالباً کسی چوکی کی تھی جس کی ریاضت کی تصویر کشی کی گئی تھی۔

2۔ پادری کا مجسمہ (Priest Head): ایک چھوٹا مجسمہ بھی ملا جو کسی پادری نما شخصیت کا تھا یہ 9 انچ اونچا مجسمہ جس کی داڑھی اور سر کے بال اور چہرہ عراقی خدوخال والا نظر آتا ہے۔ مگر اب تک اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکی۔ اس کے بال بھی بڑی نفاست سے آراستہ کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

3۔ ناچنے والی لڑکی (The Dancing Girl): موئن جودڑو کی کھدائی میں سر جان کو ایک لڑکی کا پیتل کا ایک مجسمہ بھی ملا جو کسی نوجوان لڑکی کا ہے۔ جو ایک خاص ناچنے والے زاویے یا پوز میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کھڑی نظر آتی ہے۔ جیسا کہ ابھی اسے حکم ملے گا اور وہ اپنا ناچ دکھانا شروع کردے گی۔ یہ مجسمہ پانچ انچ اونچا تھا۔

جہاں سے یہ مجسمہ ملا تھا اس کے قریب ہی سے سات لڑیوں کا سونے اور قیمتی پتھروں کے دانوں کا ایک ہار بھی ملا جس کا وزن 220 گرام تھا۔ اس مجسمے اور ہار کی قدامت کا اندازہ ڈھائی تین ہزار سال قبل مسیح سے ساڑھے چار ہزار سال قبل مسیح تک لگایا گیا ہے۔

موئن جودڑو کے علاوہ سر جان مارشل نے سندھ کے دوسرے شہر سکھر کے قریب ''لکھوین جو دڑو'' نامی ایک برباد شدہ قدیم بستی کی بھی نشاندہی کی تھی اور میر پور خاص کے قریب ایک اور ٹیلا بھی دریافت کیا تھا جسے ''کاہو جودڑو'' کہا جاتا تھا۔ ان دونوں مقامات کی کھدائی نہیں کی جاسکی تھی۔

سر جان مارشل نے آثار قدیمہ کی کھدائیوں کے طریقہ کار اور اس سے متعلق ایک کتاب بھی

لکھی تھی، جس میں کھنڈرات سے نکالی ہوئی قدیم اشیاء کی حفاظت کے طریقہ کار سمجھائے گئے تھے۔اس کا نام تھا:

CONSERVATION MANUAL.
(A Hand Book for the use of the Archeological Officers and others Entrusted with Care of Ancient Monuments).

یہ کتاب دراصل ایک ٹیکسٹ بک کی طرح تھی جو ان افسران اور افراد کے لئے لکھی گئی تھی جن کے ذمے قدیم نوادرات کی دیکھ بھال کا کام سونپا جاتا تھا۔ یہ کتاب بھی جان مارشل کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ جس کی محنت اور اعلیٰ خدمات کے صلے میں انہیں 1924 عیسوی میں "سر" کا خطاب دیا گیا تھا اور وہ سر جان مارشل کے نام سے مشہور ہوئے۔ 1936 عیسوی میں ان کو فیلو آف برٹش اکیڈمی (Fellow of British Academy) کے لئے بھی منتخب کرلیا گیا تھا۔

موئن جودڑو کی کھدائی کا ابھی بہت سا کام باقی ہے اور اس کھنڈر سے نکلی ہوئی سرخ پکی ہوئی مٹی کی مہروں پر جو الفاظ لکھے ہوئے ہیں ان کو اب تک پڑھا نہیں جاسکا ہے۔

اس ناچنے والی لڑکی سے متعلق ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ کسی خاص درباری رقاصہ یا کسی قید کی ہوئی شہزادی کا مجسمہ ہے۔ جسے کسی کے حکم سے ہر وقت ناچنے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا۔ بعض تاریخ کے طلباء کا یہ بھی نظریہ ہے کہ یہاں سے 220 گرام سونے کا جو ہار ملا ہے وہ بھی اسی لڑکی یا شہزادی کا تھا اور یہ کہ پھر وہ کانسی کا مجسمہ جو عراقی صورت سے مشابہ ہے کسی عراقی شخصیت کا بھی ہو سکتا ہے جسے اس وقت اس شہر میں یا اس دور کے سماجی طبقے میں کسی قسم کی کوئی خاص اہمیت حاصل تھی۔ سر جان مارشل کی وفات کے بعد اس کھنڈر پر نہ تو کوئی بڑا کام ہوسکا ہے اور نہ ہی اس سے ظاہر ہونے والی مہروں پر لکھی ہوئی عبارات کو آج تک پڑھا جاسکا ہے۔

سر لیونارڈ وولی (Sir Leonard Wooly):

برطانوی نژاد مشہور آثار قدیمہ لیونارڈ وولی ایک مشہور قانون دان، سفارتکار اور آثار قدیمہ کی کھدائی کی ماہر سر آسٹن ہنری لیونارڈ (Sir Austen Henry Leonard) کا بیٹا تھا۔ وہ 17 اپریل 1880 عیسوی کو پیرس میں پیدا ہوا اور بعد میں انگلستان آ کر مقیم ہوگیا تھا۔ یہ سر جان مارشل کا ہم عصر اور انہی کے دور کا تاریخ دان تھا۔ اس کا انتقال 20 فروری 1960 عیسوی کو ہوا تھا۔

سر لیونارڈ وولی (Leonard Wooly) کو قدیم کھنڈرات سے دلچسپی اس کے باپ آسٹن ہنری سے ورثے میں ملی تھی۔ جو اس فن اور علم کی کوئی باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کرسکا تھا مگر

کسی تاریخ کے طالبعلم اور معلّم سے زیادہ اس طرف فطری رجحان رکھتا تھا جس نے اسے دنیا کے ماہرین تاریخ کی صفوں میں لاکر کھڑا کر دیا۔

لیونارڈ وولی کے باپ آسٹن نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پیشۂ وکالت کا آغاز کیا مگر جلد ہی وہ اس پیشے سے اکتا گیا۔ وہ ایک عملی انسان تھا۔ وہ 5 جولائی 1817 عیسوی کو پیرس میں پیدا ہوا تھا مگر پھر وہ لندن آ گیا پھر یہیں 22 سال کی عمر میں یعنی 1839 عیسوی میں اس کو عثمانی سلطنت کے پایہ تخت استنبول کے برطانوی سفارتخانے میں تعینات کر دیا گیا۔ یہاں وہ سفارتکاری سے زیادہ عراق، ترکی، شام اور فلسطین کے علاقوں کے دیہی کھنڈرات اور یہاں کی لوک داستانوں کی معلومات میں وقت گذارتا تھا۔ 1849 عیسوی سے اس نے زمین میں دفن شدہ قدیم تاریخی ورثے تلاش کرنے شروع کیے۔ اُس نے شروع ہی سے ''نمرود'' نامی بستی کی کھدائی کر کے اس شہر کو دریافت کیا مگر بعد میں اسے معلوم ہوا کہ یہ شام کی ایک پرانی سلطنت کے دارالحکومت قلاہ (Calah) نامی بستی کے کھنڈرات تھے اور نمرود کی بستی نہ تھی۔

اس نے عراقی بادشاہوں کے مقابر بھی دریافت کیے اور خصوصاً آشورنس پال نامی بادشاہ کے دور کی باقیات بھی دریافت کیں۔ یہیں اسے وہ دو پروں والے بیل کا مجسمہ بھی ملا جو فنکاری کا ایک شاہکار مانا جاتا ہے۔ بعد میں آسٹن نے دوسرے عراقی شہروں نپر (Nippur) اور بابل کو بھی دریافت کیا اور یہاں کے بادشاہوں کی باقیات منظر عام پر آئیں۔ 1850 عیسوی تک اس نے سیناشرب نامی بادشاہ کا محل بھی دریافت کر لیا تھا (یہی وہ شرب سینا ہے جس کا نام اس بینامتی کی تحریر میں بار بار آتا ہے) اور پھر 1853 عیسوی میں اس نے بابل اور نینوا کے کھنڈرات نامی ایک کتاب The Ruins of Nineveh and Babylon بھی لکھی جس میں اور بادشاہوں کے علاوہ عراقی بادشاہ سارگان کا بھی تذکرہ تھا اور یہ بادشاہ بھی بینامتی کی کہانی کا اہم کردار ہے۔ یہ محل بھی موجودہ عراقی شہر موصل کے قریب ہونے والے نینوا کی کھدائی کے دوران ہی ملا تھا اور اس دور کے بہت سے بادشاہوں کے مظاہر، کتبے، گھریلو اشیاء اور شاہی استعمال کی اشیاء پر بنی ہوئی تصاویر وغیرہ بھی ملیں۔

حکومت برطانیہ نے آسٹن لیونارڈ کو 1878 عیسوی میں ''سر'' کے خطاب سے نوازا۔

لیونارڈ وولی اسی نامور باپ کا بیٹا تھا مگر اس کی شہرت اور عظمت اس کے باپ سے بھی آگے بڑھ گئی تھی کیونکہ آثار قدیمہ سے دلچسپی تو خیر اسے اپنے باپ سے ورثے میں تو ملی ہی تھی مگر اسے اس علم اور فن میں بہت آگے جانے کا موقع مل گیا تھا۔

انیس سال کی عمر میں یعنی 1912 عیسوی سے 1914 عیسوی تک اسے ایک اور برطانوی شخص ٹی۔ای۔ لارنس (T.E. Lawrence) کے ساتھ مصر کے دیہی علاقوں میں گھومنے پھرنے کا موقع ملا۔ یہ لارنس یوں تو حقیقتاً برطانوی خفیہ انٹیلیجنس کا ایک جاسوس تھا جو عربوں، عراقیوں اور مصریوں میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف عرب قومیت کی تحریک کو ابھارنے اور انہیں ملوکیت کا باغی بنانے اور ان کو ترکیہ کے خلاف بھڑکانے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

یہی وہ شخص ہے جو سلطنت عثمانیہ کے حجازی ریلوے لائن کے منصوبے کو سبوتاژ کرنے اور عرب نجدی قبائل کو اور خصوصاً سعودی قبیلے کو عرب میں برسر اقتدار لانے کے لئے سرگرم تھا اور اسی کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کے گورنر مکہ شریف حسین کو عربوں نے قتل کر کے وہاں بدامنی پھیلائی تھی اور جنگ عظیم اوّل کے بعد 1922 عیسوی میں سعودی قبیلے کی حکومت حجاز (یعنی مکہ اور مدینہ) میں اور جنوب کے نجدی علاقوں میں قائم کر دی گئی۔ لارنس کی توجہ تو زیادہ تر اپنی جاسوسی سرگرمیوں کی طرف مبذول رہی مگر لیونارڈ وولی نے اپنی کوشش ان علاقوں میں موجود آثار قدیمہ کی کھدائیوں کی طرف رکھی اور ان دو سالوں یعنی 1912ء سے 1914ء تک سوڈان کی وادی حلفہ میں کھدائی کی۔

پھر شام کے شمال میں مصر کے قریب ایک اور بستی کارشی میش (Carche Meish) کو بھی دریافت کیا جو بنی اسرائیل کے یعقوبؑ ہی کے بیٹے یوسفؑ کے دور میں مصر میں حکمران ہٹیٹ (Hattite) نامی قبیلے کا ایک مشہور شہر تھا۔ 1922ء سے 1934ء تک کا دور لیونارڈ وولی کی ناقابل یقین کامیابیوں کا دور ہے۔ کیونکہ اس دور میں اس نے عراقی قدیم اسیریائی سلطنتوں اور انکے بادشاہوں کے مرکزی شہر ''اُر'' (Ur) کو دریافت کیا۔ یہ وہی شہر ہے جس میں ایک مدت تک یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے مشہور بزرگ اعلیٰ ابراہیمؑ کا خاندان آباد تھا اور یہیں سے ابراہیمؑ ہجرت کر کے حران اور پھر فلسطین، کنعان اور مصر پہنچے تھے۔

اسی اُر شہر سے لیونارڈ وولی کو بہت سے اور دوسرے بادشاہوں کے مقبرے بھی ملے۔ ان کے زمانے کے برتن، پکی ہوئی مٹی کے دوسرے ظروف، ان پر کھدی ہوئی تصاویر اور چھوٹے بڑے بہت سے بتوں سے متعلق بھی معلومات حاصل ہوئیں۔ اُر کا یہ شہر یکے بعد دیگرے برباد ہو کر ختم ہو ہو کر دوبارہ آباد ہوتا رہا تھا اور یہ شہر 4 ہزار سال قبل مسیح سے 4 سو سال قبل مسیح تک آباد رہا اور اپنے عروج کے دور میں یہ سمر نامی سلطنتوں کا پایہ تخت بھی رہا تھا۔

آسٹن نے 1927ء میں ''اُر کی کھدائی اور شاہی مقبرے'' (Ur, Excavation of Royal Tombs) نامی ایک کتاب بھی لکھی۔ پھر دوسرے سال یعنی 1928ء میں ''سمیری''

(The Sumerian) اور 1929ء میں ''سمیریوں کا اُر'' (Ur of Sumerian) نامی ایک اور کتاب بھی تحریر کی۔ 1935ء میں برطانوی حکومت نے لیونارڈیو وولی کو بھی ''سر'' کا خطاب عطا کیا۔

وولی کا دعویٰ تھا کہ اس نے طوفان نوح (Noah's Deluge) کو بھی دریافت کر لیا تھا یعنی زیر زمین کی چکنی مٹی کی تہہ دریافت کی تھی جو کئی سالوں تک جمع پانی کی مٹی (Silts) سی بنی ہوئی تھی۔ جس میں مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتن کے ٹکڑے بھی ملے تھے جو چھ ہزار سال قدیم تھے۔ جن کے مطالعے سے لیونارڈ وولی نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ یہ مٹی طوفان نوح میں بہہ کر آئی ہوئی مٹی ہے۔ لیکن بعد میں بہت سے ماہرین نے وولی کی اس دریافت کو غلط قرار دیا تھا۔

ہماری اس تحریر بینا متی کی سچائی اور حقیقت بھی ان دونوں محققین یعنی آسٹن لیونارڈ اور لیونارڈ وولی اور پھر تیسرے محقق سر جان مارشل کی تحقیقات سے جڑی ہوئی ہے۔

چوتھا باب

ابراہیمؑ کا ''اُر''

میں آپ سے جس زمانے کی بات کر رہا ہوں وہ 1906ء کا دور ہے۔ ہم لوگ 5 سال مصر میں قیام کر کے اب عراق پہنچے ہیں۔ جان مارشل برطانیہ کی وزارت کلچر میں ایک مشیر کی حیثیت سے آرکیالوجیکل سروے ڈیپارٹمنٹ سے متعلق ہیں۔ وہ 1900ء میں ہندوستان سے برطانیہ آئے تھے تا کہ ہندوستان کے شمالی علاقے سندھ کے ایک شہر لاڑکانہ میں واقع ''موئن جودڑو'' نامی کھنڈرات کی ابتدائی کھدائیوں کے لئے حکومت برطانیہ کو اس جگہ کی اہمیت اور اس کی قدامت اور یہاں سے ممکنہ طور پر نکلنے والی باقیات کی طرف متوجہ کریں اور کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں میں ان موضوعات پر لیکچر بھی دیں اور اس طرح حکومت برطانیہ سے ان تحقیقات کے لئے مزید کچھ فنڈز مہیا کر سکیں۔

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ کیمبرج کی ایک ایسی ہی تقریری کے دوران میری ملاقات جان مارشل سے ہوئی تھی اور انہی کی دعوت پر میں کیمبرج میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر 1900ء ہی میں ان کے ساتھ مصر آ گیا تھا جہاں ہم 5 سال مقیم رہے تھے اور وہاں کچھ کھدائیوں میں بھی حصہ لیا تھا اور فرعون کی حنوط شدہ لاش برآمد کر لی تھی۔ عراق میں ہمارے قیام کی کل مدت 1905ء سے لے کر 1910ء تک رہی تھی۔ یہیں میری ملاقات بغداد میں تعینات بریگیڈیئر جنرل اینگر یوٹمین کی بیٹی جولی سے ہوئی تھی (جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا)۔ پھر یہاں سے ہمیں اب ہندوستان جانا تھا جہاں جان مارشل کو وائسرائے ہند کو تاج برطانیہ کی وزارتوں سے اپنی ملاقاتوں کی رپورٹ بھی دینی تھی اور پھر سندھ کے شہر لاڑکانہ جانا تھا۔ ان دنوں سندھ صوبہ بمبئی سے متعلق تھا۔ مگر انہی زمانے میں وائسرائے ہند پر مقامی سیاسی رہنماؤں کا یہ دباؤ بھی تھا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک مکمل علیحدہ صوبے کی حیثیت ملنی چاہئے۔

عراق میں لیونارڈ وولی سے ملاقات ایک یادگار علمی تجربہ تھا۔ مصر اور عراق کے بے شمار

کھنڈرات میں وہ کام کرنا چاہتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ:

''وادئ دجلہ وفرات میں زیرِ زمین کم از کم دو سوایسے قدیم آثار دفن ہیں جن کی اگر صحیح معنوں میں کھدائی کی جائے تو علم تاریخ کے بے بہا خزانے ہماری نظروں کے سامنے آجائیں گے اور ان قدیم تہذیبوں، معاشروں اور سماجی وسیاسی زندگیوں کو اصل صورت میں دیکھا جاسکے گا۔ مگر مشکلات یہ تھیں کہ نہ تو ان بے شمار قدیم مقامات کی کھدائی کے لئے وافر فنڈز میسر تھے اور نہ ہی تجربے کار کارکن جو نہایت احتیاط اور مستقل مزاجی سے ان باقیات کا ذرّہ ذرّہ ٹٹول کر ان کا صحیح تجزیہ کرسکیں اور ان ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتنوں، مہروں اور مجسموں کے چھوٹے بڑے ایک ایک ٹکڑے کو تلاش کر کے جمع کر کے ان کو دوبارہ ان کی صحیح شکل وصورت میں ڈھال سکیں اور نہ ہی تاریخ کے طلباء دستیاب تھے جو ان کا ہاتھ بٹا سکیں۔ اسی لئے ان کے منصوبے فی الحال ناکام ہی تھے''۔

دورانِ گفتگو جان مارشل نے ان سے وعدہ کرلیا کہ جب کبھی بھی انہیں مناسب وقت میسر آگیا تو وہ آثارِ قدیمہ کی کھدائی کرنے والے کارکنوں کی معلومات کے لئے ایک ایسا ہدایت نامہ ضرور ترتیب دیں گے جس سے کھدائی کا کام کرنے والے مزدوروں اور ان کے اور تعینات مہتمم افراد ان کو اوزاروں کو صحیح استعمال کرنا سکھائیں۔ جان مارشل کے دوست لیونارڈ وولی کو عراق کی تاریخ سے اور قدیم عراقی آثارِ قدیمہ کی بستیوں سے نکلنے والی اشیاء سے بہت دلچسپی تھی۔ یہاں سے نکلے ہوئے مقبرے، برتن، تصویریں اور اوزار وغیرہ سب ایسے تھے جن پر تحقیقات کر کے انہوں نے دجلہ وفرات کے 4 سے 5 ہزار سال قدیم تمدن کو گویا مستند اور زندہ تاریخ بنا دیا تھا۔

ایک دن اُر کے کھنڈرات میں تعمیر شدہ اس ہال میں جہاں جان مارشل، روسی، میں اور وولی لنچ کے بعد اکثر فارغ اوقات میں بیٹھ کر مختلف موضوعات پر باتیں کیا کرتے تھے۔ انہوں نے عراق کی پرانی بادشاہتوں کا پورا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ دیا۔

لیونارڈ وولی بتا رہے تھے کہ:

''اُر'' کی اس بستی کی پہلی بڑی سلطنت سمیریوں کی تھی جو 2850 ق م سے لے کر 2380 ق م تک باقی رہی تھی۔ ان کے دو بادشاہ جنہوں نے سمیری سلطنت کو وسعت دی اور کئی علاقے فتح بھی کئے وہ اینی پدا (Anne Pedda) اور میسینی پدا (Mesanne Pedda) تھے اور ان دونوں بادشاہوں کے بعد انہی کے قریب بڑے بڑے مندر موجود تھے اور یہیں اُر شہر کا وہ مشہور 300 فٹ اونچا مینار بھی موجود تھا جو آج بھی یعنی 4500 سال گزرنے کے بعد بھی اپنے مقام پر موجود ہے۔

عکاظ قبیلے نے اپنا دارالحکومت عکاظ نامی ایک بستی ہی کو بنایا۔ عکاظی سلطنت 100 سال قائم رہی۔ یہ سلطنت 2379 ق م سے لے کر 2280 تک عکاظ ہی کے شہر سے حکومت کرتی رہی۔ ان کا نامی گرامی بادشاہ سارگان تھا۔ اس نے شام کے ساحل سے لے کر عراق کے جنوب مغربی پہاڑی سلسلے زغراض تک اپنی بادشاہت قائم کر لی تھی۔ کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ سارگان آریائی نسل کا شخص تھا جس کا یہ قبیلہ ایرانی علاقوں سے جنوبی عراق میں داخل ہوا تھا۔ سارگان نے 55 سال حکومت کی تھی۔

زغراض کے پہاڑوں ہی میں گیتیان نام کا ایک اور قبیلہ بھی آباد تھا۔ سارگان کے مرتے ہی جب عکاظی حکومت کمزور ہونے لگی تو گیتیان اس علاقے کے حکمران بن گئے۔ یہ لوگ سخت جنگجو مگر نہایت ہی غصیلے لوگ تھے اور آپس ہی میں کشت وخون بہاتے رہتے تھے۔ ان کی گیتیانی سلطنت 2334 ق م سے 2004 ق م تک قائم رہی۔

عکاظی سلطنت کے بعد جہاں کچھ علاقوں میں گیتیانوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی وہیں اس دور میں سمیریوں نے بھی پھر دوبارہ اُر شہر میں اپنی بادشاہت قائم کر لی جو 2004 ق م تک چلتی رہی۔

سمیریوں کی یہ بادشاہت جو 2004 ق م تک باقی رہی اور اس میں اتو ہیگل (Utuhegal) اور اس کا بیٹا ارنمو (Ur Nammu) بڑے فاتح حکمران رہے تھے اور پھر ایک دوسرا قبیلہ عراق کے شمال مشرق سے ابھرا جس کا نام امورا تھا۔ ان کی ریاست نے اُر اور عکاظ کو یعنی دونوں بڑے اور پرانے شہروں کو برباد کر دیا اور اپنے لئے ایک نئی بستی آباد کی جس کا نام بابل رکھا۔ پھر یہ بابل شہر ایک ہزار سال تک دجلہ وفرات کی تہذیبوں کا بڑا مرکز رہا اور اس شہر کا ذکر یہودیوں کی توریت، عیسائیوں کی انجیل اور مسلمانوں کے قرآن میں بھی آیا ہے۔

امورائیوں نے اُر کی تباہی اس طرح سے کی تھی کہ اس کی فصیل، محلات، گلیاں، گھر اور اس کے بڑے بڑے مندر سب ہی کو توڑ پھوڑ دیا گیا تھا مگر پھر وہاں کے لوگوں نے اس شہر کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے بہت کوششیں کیں۔ اس وقت اس شہر اُر کا سب سے بڑا دیوتا ننّا (Nanna) کہلاتا تھا اور سال میں ایک بار پورے اُر کے لوگ جلوس کی صورت میں اس کے لئے چڑھاوے لے کر اس کے مندر تک پہنچتے تھے جہاں وہ شہر کی دوبارہ عظمت وشہرت واپس لانے کے لئے ننّا سے التجائیں کرتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے۔

لیونارڈ ے وولی بتا رہے تھے کہ:

''انہیں اُر کی کھدائی سے ایک کتبہ بھی ملا ہے جس پر ننّا دیوتا کے ایک سالانہ جلوس کے

اختتام پر اس سے مانگی گئی دعائیں یوں لکھی گئی ہیں:

''اے ننّا دیوتا! یہ شہر تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ اے ننّا! اس شہر کے لوگ ادھر اُدھر بھٹک رہے ہیں، ان کے گھر ٹوٹ گئے ہیں۔ اے دیوتا! تو اس کی دیواروں کے شگاف بھر دے۔ اس شہر کے لوگ تکلیف اور غم میں ہیں ان کو سکون اور آرام دے۔ اس شہر کے دروازوں ور مُردوں کے جسم پڑے ہیں۔ اس شہر کی گلیاں جو تیرے پجاریوں کے قدموں سے گونجتی تھیں اب ویران ہیں۔

اے ننّا! یہ شہر ویران ہو گیا ہے۔ یہاں کے لوگ ادھر اُدھر جانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ان کو دوبارہ یہاں بسا دے اور اس شہر کی بستی اور عظمت دوبارہ بحال کر دے''۔

مگر دیوتاؤں کی منت سماجت کے باوجود بھی یہ بستی اس شان و شوکت کے ساتھ پھر دوبارہ کبھی آباد نہیں ہوئی۔

لیونمارڈ وولی نے بتایا کہ:

''یہی 2004 ق م سے لے کر 1980 ق م کا 20 سال کا دور ہے جب ناھور کے بیٹے ابراہیمؑ یہاں پیدا ہوئے تھے اور یہاں سے ہجرت کرنے اسلے لوگوں میں ناھور، ابراہیمؑ اور ان کے بھتیجے لوطؑ بھی شامل تھے جو ناھور کے ساتھ اُر سے نکل کر حرّان نامی ایک بستی میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ جہاں ابراہیمؑ 70 سال تک مقیم رہے''۔

ابراہیمؑ 1980 ق م میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی عمر 180 سال کی ہوئی تھی۔

اموراتی بادشاہوں کے بعد بابل میں تین بڑی سلطنتوں نے راج کیا۔

1۔ غسائی خاندان (Kassites Dytnasty)۔ 1750 ق م سے 1390 ق م تک۔

2۔ اشوری خاندان (Assyrian Dynasty)۔ 1365 ق م سے 1056 ق م تک۔

3۔ شالدین خاندان (Chaldean Dynasty)۔ 626 ق م سے 529 ق م تک۔

ان تینوں خاندانوں میں بڑے بڑے بادشاہ ہوئے اور خصوصاً اشوری خاندان کا ایک بڑا جنگجو بادشاہ ٹیگ لیتھ پائیسلر بھی تھا۔

اشوری سلطنت کوئی 1400 ق م میں قائم ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابراہیمؑ کے پوتے یعقوبؑ کی اولاد جو بنی اسرائیل کہلاتی تھی مصر میں رہ رہی تھی۔ جسے پھر ان کے نجات دہندہ موسیٰؑ نے 1300 سال قبل مسیح میں مصری فراعین کی غلامی سے نکال کر فلسطین کے علاقوں میں پہنچا دیا تھا جہاں بعد میں انہوں نے اپنی یہودی بادشاہتیں قائم کیں اور یہیں ان کے تین بڑے بادشاہوں

نے حکومت کی۔ جن میں:

1۔ طالوت۔ جو جنگ ابی نظر (جو یہودیوں نے فونیشیوں کے ساتھ لڑی تھی اور شکست کھائی تھی) کے بعد بادشاہ بنا۔

2۔ داؤدؑ نے 995ق م سے 922ق م تک حکومت کی۔

3۔ سلیمانؑ نے 961ق م سے 922ق م تک حکومت کی۔

سلیمانؑ کی حکومت شام، فلسطین سے لے کر یمن تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کی خشکی کی بھی بڑی تجارت تھی۔ جس میں شاہراہ ریشم کے ذریعے یعنی موجودہ ترکی اور لبنان (جسے پہلے کنعان کہا جاتا تھا) سے فلسطین تک ہوتی تھی۔ اسی طرح ان کی بحری تجارت حبشہ، مصر، یمن اور ہندوستان پھر جنوب مشرقی ایشیا یعنی سری لنکا اور ملایا کی طرف سے بھی ہوتی تھی جہاں سے مصالحہ جات، عود، عنبر اور قیمتی پتھر وغیر فلسطین لائے جاتے تھے۔ سلیمانؑ نے فرعون مصر کی ایک بیٹی سے بھی شادی کی تھی جس کی وجہ سے ان کے تعلقات مصر کی فرعونی سلطنتوں سے بھی بے حد خوشگوار تھے۔

سلیمانؑ بڑے کرّ و فر والے بادشاہ تھے۔ مشہور تھا کہ ان کے حرم میں ان کی کئی سو بیویاں رہتی تھیں۔ مگر ان کے بعد ان کے بیٹوں اور جنگی وفوجی اُمراء میں اتنے جھگڑے بھڑک اٹھے کہ ان کی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

ایک سلطنت یہوداہ کہلائی جو 922ق م سے 587ق م تک قائم رہی۔

دوسری سلطنت اسرائیل کہلائی جو کہ 909ق م سے 721ق م تک قائم رہی۔

یہ دونوں سلطنتیں عراق کے بابل اشورائی خاندان اور شالدین بادشاہوں ہی نے ختم کر دی تھیں۔

عراق کے اشورائی خاندان کا ایک بادشاہ جو بابل کے دارالحکومت سے مرکز سے اپنی حکومت چلاتا تھا ٹیگ لیتھ پائیلسر (Tiglath Pileser) تھا۔ جس نے 745ق م سے 727ق م تک حکومت کی تھی اور فلسطین میں یہودیوں کی سلطنت اسرائیل کو اسی نے تباہ و تاراج کیا تھا اور اسی سلطنت کی باقی بیخ کنی 721 میں ٹیگ لتھ پائیلسر کے بیٹے سارگان دوم نے اسی سلطنت کے دارالحکومت سامریہ کی فتح سے کر دی تھی۔

سارگان دوم کی سلطنت اسرائیل کی فتح کا حال لیونارڈ وولی کو بابل سے نکلتے ہوئے پکی سرخ اینٹوں پر کھدی ہوئی عبارت سے معلوم ہوا۔ یہ کھدائی لیونارڈ وولی کے باپ آسٹن لیونارڈ نے انیسویں صدی کے وسط میں کی تھی۔

لیونارڈ وولی نے ہمیں ایسی ہی ایک مٹی کی تختی بھی دکھائی جس پر لکھی عبارت کو اس طرح

پڑھا گیا تھا:

''سامریہ کی فتح سے میں نے (سارگان دوم نے) 27,290 باشندے قید کئے جن کو شمالی عراق میں تتر بتر کر دیا اور اسرائیل کی مفتوحہ ریاست میں دوسرے فتح کئے ہوئے علاقے کے لوگوں کو ان کی جگہ آباد کرایا۔ اس طرح میں نے اسرائیل کے باشندوں کی شناخت تک ختم کر دی''۔

سامریہ کی اس فتح کے بعد بھی عراقی بابلی سلطنتوں کے بادشاہوں نے یہودیوں کی دوسری سلطنت یہوداہ پر بھی اپنے حملے جاری رکھے۔

جان وولی کی گفتگو میں سارگان اوّل اور سارگان دوم کا ذکر سن کر میں چونک گیا کیونکہ مینا متی کی سرگزشت میں اس نام کو میں کئی بار سن چکا تھا۔ پھر میری حیرت کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب میں یہودیوں کی دوسری ریاست یہوداہ کے حملوں میں ایک اور جانا پہچانا نام سنا۔

لیونارڈ وولی عراق کے بادشاہوں کی فتوحات بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ

''بابلی شالدین خاندان کے بادشاہ سینا شرب نے 687ق م میں یروشلم کے یہودیوں سے جو خراج وصول کیا تھا اس کی بھی تفصیل بابل ہی کے کھنڈرات سے دریافت شدہ مٹی کی تختیوں (Clay Slates) پر لکھی ہوئی عبارت سے ملی جو کچھ یوں ہے:

''میں نے (سیناشرب نے) 30 کلو سونا، 800 کلو چاندی، قیمتی ہیرے و جواہرات، سرخ روبی کے بڑے بڑے ٹکڑے، مرصع کرسیاں، ہاتھیوں کے لمبے دانت، کالی آبنوس کی لکڑی کا فرنیچر، یروشلم کے بادشاہوں کی شہزادیاں، امراء کی نوجوان لڑکیاں، بہت سی داشتائیں اور ناچنے گانے والی اور ساز بجانے والی لڑکیاں خراج کے طور پر وصول کیں''۔

وولی بتا رہے تھے کہ:

''اس خراج کی وجہ سے یروشلم کی سلطنت یہوداہ کوئی 100 سال کے لئے تو بچ گئی تھی مگر پھر 587ق م میں عراق ہی کے ایک دسرے بادشاہ نبو بخت نصر (جسے انگریزی میں وہ Nebu Chaud Nezzar) نے اس ریاست کو مکمل طور پر فتح کر کے فلسطین سے یہودی قبضے کو بالکل ہی نیست و نابود کر دیا تھا''۔

لیونارڈ وولی اور جان مارشل تو نہ جانے کب تک ان قدیم عراقی بادشاہوں کی فتوحات کا تذکرہ کرتے رہے مگر میرا ذہن سارگان اور سیناشرب ہی کے دو ناموں میں الجھ کر رہ گیا۔

اچھا تو یہ دونوں نام حقیقی تھے۔ گزرے ہوئے بادشاہوں کے تھے۔ جن کی زندگی اور

کارناموں کے ثبوت زمین کی مُردہ بستیوں سے نکل نکل کر اوپر آ رہے تھے۔ مجھے پہلے پہل جب ان کے نام بتلائے گئے تھے تو میں نے ان کو محض افسانوی اور خیالی ہی سمجھا تھا۔ تو اس زمانے میں بھی لڑکیاں اور عورتیں درباروں میں ناچنے کے لئے رکھی جاتی تھیں؟

تو کیا مینامتی نے بھی ناچ سیکھا ہوگا؟

میرے ذہن میں تو بس خیال ہی خیال تھے اور جامش وہ سیاہ فام ساحرہ جو مجھے بچپن میں اتفاقاً مل گئی تھی اور جس نے مجھے مینامتی کا نجات دہندہ کہا تھا۔ بس اس کے وہی الفاظ، وہی باتیں اور پھر اس کا دیا ہوا رومال اور ہڈی، بس یہی سب کچھ میرے ذہن میں گھومتا رہا۔

نہ جان ے کب ہم اُر کے اس کھنڈر سے نکلے اور نہ جانے کب اپنے ریسٹ ہاؤس میں واپس پہنچے۔ وولی کے پاس عراق کی قدیم تہذیبوں کی اتنی بہت ساری معلومات تھیں کہ کوئی گھنٹوں بھی ان کے پاس بیٹھا ان کو سنتا رہے تو بھی ان کی باتیں ختم نہ ہو سکتی تھیں۔

نوٹ: (میرے دادا کی بہت موٹی موٹی نوٹ بکس جن سے ترتیب دے کر میں یہ کہانی دوبارہ لکھ رہا ہوں وولی اور عراق سے متعلق ہزاروں نکات سے بھری ہوئی تھیں اور میں نے آپ کو اب تک جو کچھ بھی سنایا ہے وہ تو یوں سمجھئے کہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے)۔

ایک دن وہ اپنے والد آسٹن لیونارڈ کے بابل سے نکلنے والی مٹی کی تختیوں پر لکھے ہوئے بہت سے بتوں کے نام اور ان دیوی دیوتاؤں کی خدمت کرنے والے پجاریوں کا تذکرہ لے بیٹھے اور اس سلسلے میں انہوں نے ابراہیمؑ کے شہر اُر کے بت خانوں کا بھی ذکر کیا۔

انہوں نے بتایا کہ:

''اُر کا سب سے بڑا دیوتا آنو (Annu) تھا جو پورے آسمان کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ پھر آنو (Annu) کا ایک بیٹا بھی بنا لیا گیا جس کا نام ان لیل (An-Lail) تھا۔ اسے خدا کی طرف سے زمین کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ ان لیل کا ایک بھائی بھی تھا جسے اِنن (Innin) کہا جاتا تھا۔ یہ میٹھے پانی، دریاؤں، چشموں، جھیلوں اور ندیوں کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ ان نن ہی کو جادوگروں کا بھی خدا سمجھا جاتا تھا اور اسی کے واسطے دے دے کر جادو اور سحر کی دعائیں پڑھی جاتی تھیں۔ پھر ان کا دیوتا ننن بھی تھا جسے چاند کا ٹھنڈا اور سمجھدار دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ جو آنو (Annu) کا بہت ہی چہیتا تھا اور وہ آنو سے کہہ کر دعائیں جلد قبول کرا دیا کرتا تھا۔

ایک اور بڑا دیوتا مردوخ تھا جو سورج کا دیوتا تھا۔ یہ قہر، گرمی اور غیض و غضب کا دیوتا تھا جو فصلوں کو پکاتا بھی تھا اور اگر ناراض ہو جاتا تھا تو فصلوں کو جلا بھی سکتا تھا۔ اس کے پجاری بہت اعلیٰ

درجوں میں شمار ہوتے تے اور اس کے ذریعے سے جادو سیکھنے والے بھی بہت بلند حیثیت لوگ ہوتے تھے اور یہ ہمیشہ صرف بادشاہوں ہی کے دربار سے منسلک رہتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے لوگوں کی ان تک رسائی ناممکن ہی ہوتی تھی۔ مجھے اس بات پر یاد آیا تھا کہ مجھے بھی مردوخ (یا شاید مردوقش) ہی کی ایک ہڈی دی گئی تھی جس میں مجھے خودبخود پچھلی گذری ہوئی دنیا کے منظر دکھائے جاتے تھے۔

اسی اُر کی طرح بابل کے بھی بے شمار دیوتا تھے اور ان کے بہت بڑے نامی گرامی جادوگر بھی تھے۔ بعض جگہ کے کتبوں سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ آسمان سے آنے والی کوئی مخلوق بھی اس کو سحر اور جادو سکھاتی تھی۔ (بعد میں مجھے جان مارشل نے بتایا تھا کہ مسلمانوں کی الہامی کتاب میں بھی بابل کے لوگوں کا آسمانی فرشتوں سے جادو سیکھنے کا حوالہ موجود ہے)۔

بابل کی مشہور دیوی اشتر (Ishtar Goddess) تھی جس کے لئے بابل میں بڑے بڑے مندر بنائے گئے تھے اور اس کا سالانہ جلوس جب شہر سے نکلتا تھا تو یہاں کے سب پجاری اور جادوگر اس کے رتھ کو سارا راستہ خود ہی کھینچتے تھے اور اس جلوس میں بڑے سینگوں والے بیل کے ایک مجسمے کو بھی بہت عزت واحترام سے آگے آگے چلایا جاتا تھا۔

بابل کے غلوں اور فصلوں کا دیوتا اشنان (Ashnan) تھا۔ بچوں کی پیدائش کی دیوی گولا (Gula) کہلاتی تھی۔ پیدل چلنے والے اور تنہا سفر کرنے والوں کی دیکھ بھال اور ان کی حفاظت کے لئے پساگ (Pasag) نامی ایک دیوی تھی جس کی پوجا کر کے مسافر گھر سے سفر کے لئے نکلتے تھے۔ ایسے ہی لاتعداد بت تھے جو وقتاً فوقتاً ضرورت کے لئے بنا لئے جاتے تھے۔

بتوں کی پوجا کرانے والوں کا ایک الگ معزز گروہ تھا جو بتوں کی عبادت کے آداب سکھاتا تھا۔ اس مذہبی عبادت کے پجاریوں کی آٹھ شاخیں اور ان کے آٹھ درجے تھے اور ان کے عہدے، نام اور فرائض بھی الگ الگ متعین تھے۔

1۔ میش باشو پجاری: یہ مندر میں داخل ہونے والوں کے ہاتھ پیر دھوتا تھا اور انہیں دھلوا کر ہی مندر کے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتا تھا۔

2۔ کالعہ (Kalea): یہ دیوتا کی پوجا سے پہلے اس کو خوش کرنے کے لئے موسیقی کا بندوبست کرتا تھا۔

3۔ یارو (Yaro): یہ پجاری عبادت سے پہلے دیوتا کے لئے لڑکیوں کے رقص کا انتظام کرتا تھا۔

4۔ ناش یاتری (Nash Tatri): یہ پوجا سے پہلے نذر کے لئے لائے گئے جانوروں کی قربانی کراتا تھا جس کا زیادہ تر گوشت مندر کے دیوتاؤں اور پجاریوں کے لئے رکھ لیا جاتا تھا۔

5۔ بارو (Baro): یہ مندر کا ۔۔۔ جوتشی ہوتا تھا جس کو دیوتاؤں کا عزیز پجاری اور دست راست سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی بادشاہ کہیں فوج کشی کرنا چاہتا تھا تو وہ دیوتا سے پوچھ کر اس کا نیک یا بدشگون بتایا کرتا تھا اور اگر شگون غلط ہو جاتا تھا تو وہ اس کو بادشاہ کی کسی کوتاہی یا بتوں سے بے اعتنائی پر محمول کرتا تھا۔

6۔ ستائی لو (Stylo): یہ خوابوں کی تعبیر بتانے والا پجاری تھا اور اس کے پاس ہمیشہ لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور اسے خواب کی اچھی تعبیر بتانے پر بہت سارے نذرانے اور تحائف سے بھی نوازا جاتا تھا۔

7۔ اَن تو (Entu): یہ دیوتاؤں کی وہ پجارن اور ناچنے والی لڑکیاں ہوتی تھیں جو مندروں ہی میں رہتی تھیں اور مندروں کی صفائی ستھرائی اور دیوتاؤں کے بتوں کو نہلانے دھلانے کا کام کرتی تھیں۔ ان میں سے اکثر حاملہ ہو جاتی تھیں تو ان کی پیدا ہونے والی اولاد کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ وہ دیوتاؤں کی اولاد سمجھی جاتی تھی۔

8۔ فادش تو (Fadash-Tu): یہ دیوتاؤں کے پجاریوں کا دل بہلانے اور ان کی خبر گیری کرنے والی عورتیں ہوتی تھیں اور ان کے حاملہ ہونے کو یہی سمجھا جاتا تھا کہ پجاری نے دیوتا کے حکم ہی سے ان سے جنسی تعلقات پیدا کئے تھے۔

ان بتوں کے بنانے والے کاریگر اور بت تراش اونچے درجے کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور ان کو بت تراشی کے بڑے معاوضے ملتے تھے۔ بعد کے ادوار کے عراقی آثار قدیمہ میں ایسے بت بھی ملے ہیں جن کے چہروں پر مخصوص قسم کے جذبات بھی ابھارے جاتے تھے۔ یعنی بت سازی کا فن نہایت ہی چابکدست اور ماہر بت تراشوں کے ہاتھوں میں تھا''۔

اُر کے وہ دور جو دور ابراہیمی یعنی 1980 ق م کے لگ بھگ کا دور کہلایا جا سکتا ہے وہ بت تراشی کے عروج کا زمانہ تھا کیونکہ سمیرائی بادشاہ بت تراشوں کی بڑی قدر دانی کیا کرتے تھے اور ان کو بھاری بھاری تحائف اور رقومات بھی ادا کیا کرتے تھے۔ اس دور کا ایک بہت مشہور بت تراش آذر (Azar) بھی تھا۔ جو ابراہیمؑ کا قریبی رشتے دار بھی تھا۔ اس کے فن کی اُس دور میں بہت دھوم تھی۔ مگر وولی کا یہ کہنا تھا کہ: ''اس کے بنائے ہوئے بتوں کا حوالہ تو عراق سے ملنے والے کئی مٹی کے کتبوں سے ملا مگر خاص اس کا اپنا بنایا ہوا کوئی بت کہیں نہیں مل سکا کیونکہ ان بتوں کے

بنانے والوں کا نام بتوں پر نہیں لکھا ہوتا تھا''۔

شہر بابل ہو یا اُر ہر جگہ سال میں ایک بار بتوں کی پوجا کا ایک سالانہ جلوس ضرور نکالا جاتا تھا۔ جس میں بستی کا ہر فرد چاہے مرد ہو یا عورت ضرور شامل ہوتا تھا اور پوری بستی کی آبادی کو اس دن کا بڑا انتظار رہتا تھا اور اکثر بستی کا والی، بادشاہ یا حکمران خود بھی ان جلوسوں میں بتوں کے رتھوں کے ساتھ ساتھ پیدل چلا کرتا تھا اور یہ جلوس شہر کے سب سے بڑے بت خانے یعنی مندر میں پہنچ کر اختتام پذیر ہوتے تھے۔ یعنی بابل کا جلوس اُشتر دیوی کے مندر تک جاتا تھا اور اُر کا سالانہ پوجا کا جلوس آنو (Annu) دیوتا کے مندر پر پہنچ کر ختم ہوتا تھا۔

اُر، بابل، نینوا، نیپر اور کئی مقامات پر جیسے جیسے دفن شدہ تہذیبوں کے آثار برآمد ہوتے جاتے تھے ویسے ہی ویسے عراق کے قدیم شہر کی سماجی اور معاشرتی زندگی تہہ در تہہ ابھرتی چلی آتی تھی۔

لیونارڈ وولی کچھ تو اپنے والد کے نوٹس اور یادداشتوں کی مدد سے اور کچھ اپنے تجربات اور قدیم عراقی تاریخی واقعات کی آگاہی سے اس طرح واقعات کی کڑی سے کڑی جوڑتے چلے جاتے تھے کہ لگتا تھا وہ کل کی تاریخ نہیں بلکہ آج کے ہمارے زمانے ہی کی باتیں بتا رہے ہیں۔

وہ بتاتے تھے کہ:

''عراقی لوگ مستقبل کا حال معلوم کرنے کے لئے فال نکالنے کے بڑے شوقین تھے اور سانپ کے نکل آنے یا دائیں طرف چلے جانے یا بائیں طرف جانے سے بھی فال نکالتے تھے۔ اسی طرح وہ خوابوں پر بھی بہت یقین رکھتے تھے اور ہر مندر میں ایک پجاری ایسا ضرور ہوتا تھا جو لوگوں کے خواب سن کی ان کی تعبیریں بھی بتایا کرتا تھا''۔

اسی طرح شادی بیاہ کے بھی قوانین تھے۔ یعنی اگر کوئی نوجوان کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا تو وہ اس لڑکی کے باپ کے پاس جا کر اپنی خواہش کا اظہار کر سکتا تھا اور اس کے لئے لڑکی کا باپ یا تو کسی رقم کا مطالبہ کر دیتا تھا یا کبھی اس نوجوان کے لئے یہ شرط بھی لگا دیتا تھا کہ اسے سال دو سال یا کسی بھی معینہ مدت کے لئے لڑکی کے باپ کے پاس بغیر اجرت کے ملازمت کرنا پڑے گی۔

چوری چکاری ناپید تھی۔ جھگڑوں اور عام لوگوں کے آپس کے اختلافات یا مار پیٹ ہونے کی صورت میں سزائیں بھی مقرر تھیں۔ بیلوں اور خچروں کی گاڑیوں کا مشاہرہ مقرر تھا اور مزدور کی اجرت کے ساتھ ساتھ جانوروں کا چارہ بھی بطور جانور کی کھلائی کے دیا جاتا تھا۔

عام لین دین چاندی کے ذریعے یا نمک کے ادلے بدلے کے ذریعے یا مختلف اجناس کے بدلے میں ہوا کرتا تھا۔ شہری قوانین کا نفاذ بستی کے حکمران کی ذمے داری تھی اور وہی مجرموں کو سزا

بھی دینے کا اختیار رکھتا تھا۔ سزائیں عموماً جسمانی ایذاء رسانی یا جرمانوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ جیسے کہ اگر کسی کے بیل نے کسی راہگیر کو ٹکر مار دی اور اسے سخت چوٹ لگ گئی تو بیل کے مالک کو چاندی کا جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا اور بیل کو دس سے پچاس ڈنڈے تک مارے جانے کی سزا ملتی تھی۔

جب بھی ہم وولی سے ملتے ہمیں عراق کی قدیم تہذیب و تمدن کے بارے میں نت نئی معلومات ملتی تھیں۔

آج کا سارا دن جان مارشل اور لیونارڈ وولی ہی کے ساتھ گذرا، میں اور روسی ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ ہم اُر کے کھنڈرات ہی میں گھومتے رہے تھے۔

اُر کا کھنڈر بہت دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا تھا کہ یہاں وولی نے ایک لمبا سا ہال نما کمرہ بنوالیا تھا جہاں بہت سی میزوں پر وہ سب کچھ لا لا کر ڈھیر کیا جاتا تھا جو کہ اُر کے ملبے سے نکلتا تھا۔ جس کی تحقیق، تفتیش اور ترتیب کرنے کے لئے 20/25 لوگ ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ وہ سب لوگ مٹی سے نکلنے والی ہر شے کو نمبر لگا لگا کر ترتیب سے علیحدہ علیحدہ رکھتے جاتے تھے۔ یہ بڑا صبر آزما کام ہوتا تھا۔

ان لوگوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ کبھی کبھی تو پورا ہفتہ بھی گذر جاتا تھا اور ایک معمولی چیز بھی نہ ملتی تھی۔ حد یہ کہ ٹوٹے ہوئے کسی پیالے کا ٹکڑا تک بھی مٹی سے نہیں نکلتا تھا اور کبھی کبھی ایک ہی دن میں 50/60 برتن اور دوسری کام کی چیزیں یا ٹوٹی ہوئی اشیاء ہاتھ آجاتی تھیں۔

میں کبھی بابلی عراقی تہذیب کی باقیات اور آثار قدیمہ سے جڑی ہوئی داستانیں سنتے سنتے پھر سارگان اور سیناشرب کے تصور میں کھو جاتا تھا۔ پھر ایک دن نہ جانے کب ہم اُر کے کھنڈرات سے نکلے اور ایک ریسٹ ہاؤس (Rest House) پہنچے میں اس دن کافی تھک گیا تھا اور جاتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ آنکھیں کبھی کھلیں اور پھر کبھی نیند میں بند ہو جاتیں۔ میں ہوا کی تیز سنسناہٹ بھی سن رہا تھا اور کسی کے تیز تیز چلتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں اونگھ بھی رہا تھا اور سو بھی رہا تھا اور جاگ بھی رہا تھا۔ میں کہیں بیٹھا ہوا تھا مگر کہاں؟ میں بیٹھا ہوا تھا مگر کس جگہ؟ میرے قریب میں کئی گھوڑے دوڑ رہے تھے مگر کوئی نظر نہیں آتا تھا اور پھر نیند مجھ پر اور بھی غالب ہوتی گئی۔ میں کتنی دیر سوتا رہا مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔

''اترو۔'' کسی نے مجھے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اور میں ایک چلتے پھرتے بے جان سائے کی طرح نیچے اتر آیا۔ یہ ایک سجی سجائی خوبصورت سی دو پہیوں والی گھوڑا گاڑی (Charriot) تھی۔ دو آدمی میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور

پیچھے سے بھی کئی لوگوں کے ساتھ ساتھ چلنے کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ کسی کا بھی میرے ساتھ رویہ گستاخانہ نہ تھا۔

اب میں پوری طرح جاگ چکا تھا۔ چار چھ سیڑھیاں چڑھ کر میں ایک چوڑے اور بڑے وسیع چبوترے تک پہنچ گیا۔ ایک کرسی نما تخت پر کوئی شخص بڑے طمطراق سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بائیں طرف ایک عورت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ عورت کا سر جھکا ہوا تھا جیسے وہ کسی غم میں ڈوبی ہوئی امید ویاس سے کسی کی منتظر ہو۔

''شہنشاہ سیناشرب اور ملکہ یوران کے لئے تعظیم میں جھک جاؤ''۔

ایک آواز گونجی اور میں مشین کی طرح زمین بوس ہو گیا۔

''یہی ہے تین ستاروں والا۔ جس کے ہاتھ اس کے گھٹنوں سے نیچے ہیں''۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے لمبے چوڑے شخص نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

ملکہ نے سر اٹھایا:

''تو یہ نجات دہندہ آ پہنچا ہے۔ آہ کتنا انتظار! کتنے لمبے انتظار کے بعد امید کی ایک کرن ابھری ہے''۔

بادشاہ نے پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا:

''تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ میرے سپاہیوں نے کوئی سختی تو نہیں کی''؟

''سختی؟ نہیں مجھے تو یہاں پہنچنے کے بعد ہی احساس ہوا کہ میں یہاں آ گیا ہوں''۔

''نوجوان! ہم نے اپنی بیٹی کی جدائی میں ایک لمبا عرصہ گزارا ہے۔ اور تم ہی ہو جو ہمارے طویل انتظار کو ختم کر سکتے ہو''۔

پھر اس نے کسی کو حکم دیا کہ: ''ہمارے درباری مہنت کو سامنے لاؤ''۔

''سمورگان حاضر ہے''۔

لمبا سا چوغہ پہنے ننگے سر گول چہرے والا ایک 50/60 سالہ شخص ایک لکڑی ٹیکتا ہوا دربار میں داخل ہوا۔ اس کے سر کے بال اس کے سر پر نہایت ترتیب سے جمے ہوئے تھے اور چھوٹی سی داڑھی بھی ایسی لگ رہی تھی جیسے ابھی کسی نے کنگھا کر کے اسے نفاست سے درست کر دیا ہو۔

''سمورگان۔۔!''۔ بادشاہ کی آواز ابھری۔

''دیکھ اور بتا کیا یہی وہ نوجوان ہے جس کا ہم صدیوں سے انتظار کر رہے ہیں؟ کیا تو اسی نجات دہندہ کے ظاہر ہونے کی دعائیں ڈھائی ہزار سال سے مانگتا آیا ہے''؟

شہنشاہ کے حکم پر وہ شخص قدم بہ قدم چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے میری پیشانی پر گہری نظر ڈالی۔ جہاں پیدائشی طور پر تین چھوٹے چھوٹے نشان بنے ہوئے تھے۔ پھر میرے لمبے ہاتھ دیکھے جو گھٹنوں سے ذرا نیچے تک آتے تھے۔ پھر ایکدم وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور میرے دونوں ہاتھوں کو بوسے دینے لگا۔

''وہی تین ستارے۔ وہی گھٹنوں سے نیچے تک کے ہاتھ۔ بادشاہ! دیوتا غلطی نہیں کرتے۔ سب کچھ اسی طرح ہے جیسا کہ ہمیں بتایا گیا تھا۔ میں تو صدیوں سے اس کا انتظار کر رہا ہوں اور دیکھتے ہی پہچان گیا تھا مگر صرف تیری تسلی ہی کیلئے میں نے اس جیتے جاگتے نجات دہندہ کو پھر سے ایک بار غور سے دیکھا ہے۔ یہ وہی ہے۔ وہی ہے جس کے آنے کی اطلاع دی گئی تھی۔

بادشاہ! خوش ہو جا اور ملکہ تو بھی اپنے غم بھلا دے۔ امید کا سورج طلوع ہو چکا ہے۔ روشنی پھیلے گی''۔

''سمورگان! اس نوجوان کو اپنے بھائی جے پوکارا کی تصویر بھی دکھا دے۔ ہماری بیٹی کا مجسمہ اور اس کا ہار بھی تاکہ یہ نشانیاں اچھی طرح پہچان لے''۔

اب پھر سمورگان میری طرف بڑھا:

''آقا! جے پوکارا میرا بھائی ہے۔ وہ بابل کا مہان جادوگر تھا۔ جب وہ شہزادہ شہزادی کو اٹھا کر لے بھاگا تو جے پوکارا اپنے علم کے زور پر اس کے ساتھ ہی چلتا رہا وہ جہاں جہاں بھی لے جاتی گئی جے پوکارا اس کے ساتھ رہا۔ وہ شہزادی کے علاوہ کسی کو نظر بھی نہیں آتا تھا۔ میرا بھائی بالکل میرا ہم شکل تھا۔ ایسی صورت، ایسی داڑھی، ایسے ہی بال، اتنا ہی قد کاٹھ۔ کوئی مشکل ہی سے پہچان سکتا تھا کہ ان میں سمورگان کون ہے اور کون جے پوکارا ہے۔

وہ شہزادہ اپنے چند فوجی سواروں کے ساتھ شہزادی کو لے کر مشرق کی طرف چلتا گیا۔ وہ بادشاہ کے عتاب سے بچ کر ایسی جگہ پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں اس کو کوئی بھی پا ہی نہ سکے۔ اسی نے اسے بتا دیا تھا کہ مشرق میں ایک دسیوں میل چوڑا اور گہرا دریا بہتا ہے۔ اسے سردیوں کے علاوہ کبھی پار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بھی پار اور دوسرے بہت سے دریاؤں کی زمین پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں بادشاہ سے بھی محفوظ رہے اور اپنی شکستوں کے غم کو بھی غلط کرتا رہے اور اپنی فتح کی نشانی کے طور پر شہزادی کو ہمیشہ کے لئے قید رکھے۔

راستوں میں رکتا رکاتا آخر کار وہ اس دریا کے قریب مُردوں کے کھنڈر تک پہنچ ہی

گیا۔ یہاں دریا کا بہاؤ کم ہونے کے لئے اسے ایک سال تک رکنا پڑا۔ جب اسے اپنے ماں باپ اور اپنی بادشاہی یاد آتی تو وہ اس شہزادی کو قید سے نکال کر بلواتا اور اسے ناچنے کا حکم دیتا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے ایک بے بس کنیز کی طرح منتظر رہتی کہ کب اسے حکم ملے اور وہ ناچ شروع کرے۔

سفر کے دوران اس کے شاہی کپڑے پھٹے پرانے ہو گئے تھے اور اس کے پاس اپنی ماں کے ایک سات لڑیوں والے سونے کے ہار کے علاوہ کچھ نہ بچا تھا۔ اس دور میں مُردوں کے اس کھنڈر میں آبادی تھی مگر یہ بستی بار بار اجڑتی تھی اور پھر بس جاتی تھی۔ اس میں مٹی کی اینٹوں پر تصویریں بنانے کا رواج تھا اور پیتل کے مجسمے بھی بنوائے جاتے تھے اور اس بستی میں ایک بہت بڑا پیتل کا مجسمہ کسی ناچنے والی کا پہلے ہی سے موجود تھا جسے رقص کی دیوی کہا جاتا تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ مجسمہ ساز اسی طرز کا ایک مجسمہ اسے بھی بنا دے مگر اس کا چہرہ ہماری شہزادی مینا متی کا ہو۔

میرے بھائی نے شہزادی کا پیتل کا ایک بڑا مجسمہ بنوایا جس میں اسے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے ناچ شروع کئے جانے کے حکم کا انتظار کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس نے اپنی بھی ایک تصویر مٹی کی اینٹوں پر بنوائی۔

آقا! تو نے مجھے تو دیکھ ہی لیا ہے۔ اب تو میرے بھائی جے پوکارا کی تصویر بھی پہچان لے گا۔ شہزادی کا ہار بھی وہیں ہے۔ شہزادی ایک سال تک مُردوں کے کھنڈر میں قید رہی تھی۔ پھر اسے دریا پار کرایا گیا اور پھر اسے دریاؤں کی سرزمین کی طرف سفر کرایا جاتا رہا۔ آخر میں اس شہزادے کے سارے ہمراہی مارے جا چکے تھے اور صرف یہ بھگوڑا شہزادہ اور مینا متی ہی لال پہاڑیوں تک پہنچے تھے۔

میرا بھائی مجھے اپنے علم کے ذریعے شہزادی کے حالات مجھے بتا دیتا تھا اور میں بادشاہ اور ملکہ کو تسلی دے دیتا تھا۔ بڑے دریا کو پار کرنے کے بعد وہ اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن میں مشرق کی سمت چلتی گئی اور پھر جے پوکارا سے، شہزادی سے اور اس کے فوجی دستے سے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ مگر ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ مُردوں کے کھنڈرات میں اب بھی کہیں شہزادی کا مجسمہ، میرے بھائی کی تصویر اور وہ سونے کا ہار ضرور موجود ہوگا جو تجھے دکھا دیا جائے گا۔ کب، کیسے اور کہاں مجھے اس کا پتہ نہیں مگر آقا تو ضرور ان کو دیکھے گا اور پھر تو شہزادی تک بھی ضرور پہنچا دیا جائے گا۔

کے ضلع میں واقع چھٹی صدی عیسوی کے ایک کھنڈر پر جم گئی۔

جب وہاں سے متعلق مقامی لوگوں سے معلومات کیں تو معلوم ہوا کہ بدھ مذہب کے دور کی ایک بے آباد بستی ہے جہاں قریباً 1200 سو سال پرانی عمارات اور بدھ پگوڈا بھی موجود ہیں''۔

میں نے لقمہ دیا:

''اور آپ سندر بن اور بنگال ٹائیگر کو بھول کر اس بے آباد بستی میں چلے گئے''۔

''ہاں! بالکل یونہی ہوا تھا۔ وہ مون سون کا موسم تھا اور تقریباً ہر روز ہی بارش ہوتی تھی۔ چھوٹی بڑی پگڈنڈیاں اور راستے اور ان کچے مکانات کی بستیوں کو ملانے والی تمام سڑکیں ہی چھوٹے نالوں اور آبی نہروں کی طرح آبی راستے بن جاتے تھے۔ نہ تو گھوڑوں پر سفر ممکن ہوتا تھا اور نہ ہی بیل گاڑیوں پر۔ برہم پترا اور بوڑھی گنگا (ہمالیہ کے برف پوش پہاڑوں سے نکل کر شمالی ہندوستان میں بہتی ہوئی گنگا جب بنگال پہنچ کر اپنا ڈیلٹا بناتی ہوئی خلیج بنگال میں گرتی ہے تو پورے بنگال میں اس کو بوڑھی گنگا کہا جاتا ہے) میں ان دنوں طغیانی تھی۔ ان دونوں دریاؤں کا پاٹ 10 سے 15 میل تک پھیل جاتا ہے اور اس طرح کشتی کا سفر بھی مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ مجھے ایک ماہ تک وہیں ٹھہرنا پڑا۔ مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بعد میں جب میں کومیلا کے ان کھنڈرات کو دیکھنے گیا تو اس ایک ماہ میں، میں ان سے متعلق میں مقامی لوگوں سے بہت کچھ سن چکا تھا اور کتابوں میں بھی پڑھ چکا تھا اور یہ جان چکا تھا کہ بینامتی کی یہ گمشدہ بستی ساتویں صدی کے بدھ مذہب کے دور کی تعلیم گاہ تھی جو سیاسی اور سماجی لحاظ سے ایک مرکزی بستی کا درجہ رکھتی تھی''۔

اس دن مجھے پہلی بار بدھ کے مذہب، اس کی شخصیت اور بدھ کے افلکار سے کچھ آگاہی حاصل ہوئی جو ظاہر ہے سر جان مارشل ہی کے علم و مطالعے کی بدولت مجھ تک پہنچی تھی۔ میری اس سرگزشت میں ایک ہڈی اور رومال کا ذکر بھی کئی بار آیا ہے اور اس تحفے کے تانے بانے بھی کئی طرح سے حامش اس سیاہ فام حبشی عورت اور کچھ بدھ بھکشوؤں سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔

اس لئے میں آپ کو گوتم بدھ کے مذہب اور اس کے دور سے متعلق بھی کچھ بیان کروں گا۔

برصغیر ہندوستان کے شمال میں 500 سال قبل مسیح اور سکندر اعظم کے حملوں سے کوئی 250 سال قبل بنگال اور اس کے قریبی علاقے بہار میں ایک علاقہ تھا جسے مگدھ کہتے تھے جہاں سات چھوٹے بڑے راجہ حکومت کرتے تھے اور ان ہی میں سے ایک ریاست کا نام کپل وستو تھا۔ پورا

مگدھ جنگلوں، کھیتوں اور ندی نالوں سے بھرا ہوا خطہ تھا اور یہ تمام راجے امن و چین کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔ یہ سب ہندو مذہب کے ماننے والے تھے۔ ان کے سماج کے تمام لوگ چار ذاتوں میں تقسیم تھے۔ عالم فاضل اور مذہب کے طور طریقے سکھانے والے برہمن کہلاتے تھے۔ جنگجو سپاہی کھتری اور زراعت اور دوسرے پیشوں سے وابستہ لوگوں کو ویش کہا جاتا تھا۔ ان سب کے نوکر، ملازم اور نیچے درجوں پر کام کرنے والے لوگ شودر کہلاتے تھے۔

یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان مرنے کے بعد بھی بار بار پیدا ہوتا ہے اور زندگی میں جس طرح کے اچھے یا برے کام اس نے کئے ہوں گے تو اسی کے بدلے میں اسے اونچی یا نیچی ذاتوں میں پیدا کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ عقیدہ عام تھا کہ ذاتوں کی تقسیم اللہ کی طرف سے بنائی گئی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور کسی میں بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اچھے کام کر کے اسی زندگی میں اونچی ذاتوں میں شامل ہو جائے۔ ہاں مرنے کے بعد جب اسے دوسرا جنم ملے گا تو آسمانی طاقت (جسے ہندو پرم آتما کہتے ہیں) اس کو کسی بھی اعلیٰ یا پست ذات میں پیدا کر سکتی ہے۔

مگدھ کی ریاستوں میں سے ایک ریاست کپل وستو تھی جس کے راجہ کا نام سدھودان تھا۔ 538 ق م میں اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سدھارتھ رکھا گیا۔ اس خاندان کا لقب شاکیہ متی تھا۔ سو اس کا نام بھی سدھارتھ شاکیہ متی پڑ گیا۔ 27 سال کی عمر میں اس نے شہزادگی کی زندگی کو خیر باد کہا اور جنگلوں میں جا کر تنہائی میں ''گیا'' نامی ایک بستی کے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر ذہن کو یکسوئی دلا کر سوچ بچار کرنا شروع کیا کہ: ''دنیا کی تکالیف اور دکھوں کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے''؟

آخر کار کئی سالوں کی جسمانی ریاضتوں اور ذہنی ارتکاز فکر سے اس نے ایک نظریہ تیار کیا کہ:

''تمام تکالیف کی بنیاد انسان کا اپنا ذہنی رویہ ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ذہنی رویے کو ٹھیک کرنے سے پہلے چار سچائیوں کو مان لینا چاہئے۔

1۔ دنیا دکھوں سے بھری ہوئی ہے۔ 2۔ تکالیف کی وجہ خواہشات ہیں۔

3۔ دکھ ختم ہو سکتے ہیں اگر۔۔ 4۔ غلط خواہشات کو ذہن میں آنے ہی نہ دیا جائے''۔

اس نظریے کی بنیاد اس بات پر تھی کہ سب سے پہلے اپنے ذہن کو غلط خواہشات سے پاک کر کے اسے صحتمند بنایا جائے۔ ذہن کو صحیح اور صحتمند رکھنے کے آٹھ راستے ہیں۔

1۔ صحیح سمجھ بوجھ۔ 2۔ صحیح خیالات۔ 3۔ صحیح گفتگو۔

4۔ صحیح عمل۔ 5۔ صحیح طرز زندگی۔ 6۔ صحیح کوشش۔

7۔ صحیح غور وفکر۔ 8۔ صحیح یکسوئی ذہن۔

ذہن کو صحتمند بنانے کے لئے اور پھر معاشرے کو بھی صحتمند بنانے کے لئے پانچ راستوں یا پانچ اصولوں پر سختی سے عمل کیا جانا چاہئے۔

1۔ کسی کی جان نہ لی جائے۔

2۔ کسی دوسرے کی کوئی بھی چیز زبردستی یا چوری سے نہ لی جائے۔

3۔ کسی دوسرے غیر مرد یا غیر عورت سے جنسی تعلقات قائم مت کرو۔

4۔ کسی بھی قسم کا جھوٹ نہ بولو۔

5۔ کسی بھی قسم کا نشہ نہ کرو کیونکہ نشہ ذہن پر قبضہ کر لیتا ہے اور غلط خواہشات پیدا کرتا ہے۔

گوتم بدھ ذات پات کا قائل نہ تھا بلکہ یہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص اپنے آپ کو اسی دنیا میں صحیح اصولوں پر عمل کر کے اپنی زندگی بلند یا پست کر سکتا ہے۔

گوتم بدھ کا انتقال 80 سال کی عمر میں ہوا اور اس کے بعد اس کے پیروکار اس کی تعلیمات کو دنیا بھر میں پھیلاتے رہے۔ یہ لوگ بھکشو کہلاتے تھے جو اپنی ذہنی اور جسمانی تربیت بچپن ہی سے بدھ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق کرتے تھے اور اپنی تربیت اور علوم سے دنیا کے باطنی علوم اور ماضی کے رازوں اور مستقبل میں پیدا ہونے والے واقعات کا علم بھی حاصل کر لیتے تھے۔

مگر اس بدھ مذہب اور گوتم بدھ سے مینامتی کے کھنڈرات کا کیا تعلق؟

میرا ذہن کچھ انہی تانوں بانوں میں الجھا ہوا تھا اور شاید سر جان مارشل بھی بھانپ گئے تھے کہ میں اتنی دیر سے کیوں خاموش ہوں؟ تو پھر وہ خود ہی کہنے لگے: ''مگدھ سے نکل کر گوتم بدھ کی یہ تعلیمات نہ صرف قرب و جوار میں بلکہ صرف 300 سال میں ہندوستان کے شہنشاہ اشوکا کے وقت میں پورے برصغیر بلکہ اس سے آگے تبت، چین، مشرق بعید اور جنوب مشرق کے بہت سے علاقوں میں پھیل گئیں اور کم و بیش 1500 سال تک لوگوں کے ذہنوں پر چھائی رہیں۔

بدھ مذہب میں ایک کشش یہ تھی کہ اسے ہر شخص آسانی سے اپنا بنا سکتا تھا اور خود اپنے ذہن کی تعمیر کر کے بہت سی برائیوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس میں ذات پات کے پر پیچ عقیدے بھی نہیں تھے اور یہ تمام انسانوں کو ایک ہی سطح پر دیکھتا تھا۔

اس فلسفے کو نہ صرف مگدھ کی ریاستوں میں پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ یہ بہت جلد شمالی ہندوستان میں بھی چاروں طرف پھیل گیا اور پھر یہ مذہب سندھ اور پنجاب کی وادیوں سے نکل کر آگے بڑھا۔ اس کی ایک شاخ ہمالیہ کے پار وسطی ایشیا اور تبت تک جا پہنچی اور جنوبی ہندوستان سے

یہ سری لنکا اور مشرقی ایشیائی اور جنوب مشرقی ساحلی ایشیا کے ممالک میں بھی پھیلنا شروع ہو گیا۔

شمالی ہند میں یہ اتار چڑھاؤ ساتویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ شمالی ہندوستان میں عرب سے اٹھنے والے مذہب اسلام نے آہستہ آہستہ اس پر غلبہ پالیا۔ مگر مگدھ یعنی بہار اور بنگال اور جنوبی ہند میں اس کی توانائی بارہویں صدی تک باقی رہی"۔

میں نے کہا:

"جان مارشل! لیکن اس بدھ مذہب کا عراق سے کیا تعلق ہے۔ یہ تو برصغیر ہندوستان کا مذہب تھا"۔

جان مارشل نے جواب دیا:

"ہاں! اس کا عراق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر میں تمہیں یہ تفصیل اس لئے بتا رہا ہوں کہ عنقریب ہی ہم ہندوستان کی طرف کوچ کرنے والے ہیں۔ وہاں میں بہت سے ایسے مقامات کا سروے کر چکا ہوں جو زمین میں دفن بدھ مذہب کی باقیات اور اس دور کی تہذیب ہمارے سامنے لا سکتے ہیں۔ ان ہی پرانے آثار میں بنگال کے بھی کچھ مقامات میری نظری میں ہیں اور شمالی ہندوستان میں سندھ کے کچھ مقامات پر بھی کام کرنے کئی بہت مواقع موجود ہیں"۔

میں نے پوچھا: "کیا بنگال اور سندھ قریب قریب واقع ہیں"؟

جان مارشل نے کہا:

"__ نہیں! بنگال تو وہی علاقہ ہے جہاں ہندوستان میں ہمارا پہلا دارالحکومت کلکتہ قائم ہوا تھا۔ یہ کئی ایسے دریاؤں کے ڈیلٹا کی زمین ہے جو ہمالیہ کے بلند پہاڑوں سے نکل کر بہتے بہتے خلیج بنگال میں گر جاتے ہیں۔ شمالی ہند کے دو بڑے دریا گنگا اور جمنا جو انڈیا کے صوبے یوپی میں مل کر ایک ہو کر بوڑھی گنگا کے نام سے پکارے جاتے ہیں ان کا ڈیلٹا بھی بنگال میں ہی ہے۔ اس کے علاوہ برہم پترا نامی ایک بڑا دریا بھی یہیں سمندر سے ملتا ہے اور پھر کئی اور بھی چھوٹے چھوٹے معاون دریا ان بڑے دریاؤں سے مل کر اس پورے علاقے کو دریاؤں کی سرزمین بنا دیتے ہیں۔ بنگال بہت بڑا صوبہ ہے مگر آج کل 1910ء میں حکومت برطانیہ نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

سندھ اس علاقے کے برخلاف ریگستانی خطہ ہے۔ یہ مغربی ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے ملحق ہے۔ مگر اس علاقے میں ایک بہت بڑا دریا بہتا ہے جو گرمیوں میں پہاڑوں کی برف پگھلنے سے اپنے اندر بے پناہ پانی لے کر آتا ہے اور پھر پہاڑوں میں

700 میل بہہ کر پنجاب اور سندھ کے میدانی علاقوں میں آتے آتے اس میں کئی اور چھوٹے بڑے دریا مل کر اسے پانی کا ایک سمندر بنا دیتے ہیں اور پھر گرمیوں میں کئی جگہ اس کی چوڑائی 20 میل سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے"۔

اب میرا ذہن صرف دو باتیں سوچ رہا تھا۔ دریاؤں کی سرزمین اور میلوں چوڑا دریا۔ یہ الفاظ تو میں سن چکا ہوں مگر کہاں؟ تب مجھے یاد آیا۔ سیمورگان نے جب اپنے بھائی جے پوکارا کا تذکرہ کیا تھا تو اس نے بھی یہی الفاظ استعمال کئے تھے کہ مُردوں کا کھنڈر بھی اسی میلوں چوڑے دریا کے کنارے کہیں واقع تھا ___ اور دریاؤں کی سرزمین؟ تو یہ ہندوستان میں بنگال کا علاقہ ہے۔ جہاں اونچے اونچے پہاڑوں سے نکلنے والے دریا آ کر سمندر میں گرتے ہیں۔

چھٹا باب

عراق میں بغداد کے برطانوی سفیر سے ملاقات

مصر کے برطانوی سفارت خانے سے میرے لئے ایک خط بغداد کے برطانوی قونصل خانے کو ملا۔ یہ میرے والد کا خط تھا جو انہوں نے دو ماہ قبل اس وقت مصر بھیجا تھا جب میں وہاں مقیم تھا اور جہاں میں نے اس سے قبل بھی ان کا ایک خط وصول کیا تھا۔ مگر اب ہم لوگ عراق آ چکے تھے سو یہ خط بھی مجھے بغداد ہی میں مصری سفارت خانے سے بھیجا گیا تھا۔

میرے والد میرے بارے میں متفکر تھے۔ انہیں میری پڑھائی کے بیچ ہی میں ختم ہو جانے پر تشویش تھی اور ان کے خط میں یہی تاکید تھی کہ مجھے اس طرح وقت ضایع کرنے کی بجائے پہلے کیمبرج اور آکسفورڈ سے اپنی تعلیم مکمل کر لینی چاہیئے۔ اس تنبیہ کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا کہ:

''کسی پب (Pub شراب خانے) میں ان کی ملاقات اچانک ایک بالکل اجنبی شخص سے اتفاقاً ہی ہو گئی تھی۔ یہ شخص کافی دیر سے انہی کی طرف بغور دیکھتا رہا۔ میرے والد خود ہی اٹھ کر اس کے پاس گئے اور پوچھا کہ:

''کیا ہم لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہیں''؟

تو اس نے جواب دیا کہ:

''نہیں! مگر اپنے بیٹے کو یہ پیغام ضرور دے دو کہ جہاں وہ ہے اسے وہاں اپنا وقت ضایع نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کی منزل کہیں اور ہے۔ اسے ابھی بہت آگے جانا ہے''۔

والد صاحب نے لکھا تھا کہ:

''انہیں کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ تمہیں (یعنی مجھے) کیسے جانتا تھا اور اس کا یہ پیغام کیا تھا''؟

لیکن انہوں نے یہ ضرور لکھا تھا کہ:

''وہ خود بھی یہی سمجھتے تھے کہ مصر میری منزل نہیں ہے''۔

اس خط کے ساتھ میری ماں کی بھی چند لائنیں لکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے پوچھا تھا کہ:
''چھ سات قبل گھر سے چلتے وقت جو 1000 پاؤنڈ کی رقم ہم نے تمہیں دی تھی وہ تو اب تک ضرور ختم ہوگئی ہوگی۔ سو اب اگر وہ مجھے مزید کچھ رقم بھیجیں تو کہاں بھیجیں''؟

اس خط میں مجھے اپنی صحت اور کھانے پینے کا خیال رکھنے کی بھی تاکید کی گئی تھی۔

پیسوں کا معاملہ خود مجھے بھی پریشان کر رہا تھا۔ میں اپنے والد سے اب مزید کوئی بھی رقم مانگنا نہیں چاہتا تھا اور چونکہ روسی کا خرچہ بھی میں ہی اٹھاتا تھا اس لئے میری رقم اب بہت کم ہو چکی تھی۔ انہی دنوں میں نے جان مارشل سے کہا کہ:

''اگر ان کا ارادہ عراق میں زیادہ دیر رکنے کا ہو تو پھر میں یہاں بغداد کے کسی اسکول میں انگریزی پڑھانے کی نوکری ہی کرلوں تاکہ کچھ آمدنی کا بندوبست بھی ہو سکے''۔

جس کے جواب میں انہوں نے مجھے چند دن انتظار کرنے کا مشورہ دیا۔

ایک ہفتے کے بعد وہ مجھے بغداد میں برطانوی سفارتخانے لے گئے۔ برطانوی سفیر نہ صرف ان کو جانتا تھا بلکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ وائسرائے ہند کے پاس مشیر (Advisor) محکمہ آثار قدیمہ اور سروہ جات کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور ابھی چھٹی پر ہیں اور عراق سے وہ (انگلستان) واپس ہندوستان جانے والے ہیں۔

ان دنوں بغداد میں برطانیہ کی طرف سے جو سفیر مقرر تھا اس کا نام اسٹیفن بینجمن (Stephen Benjamin) تھا۔ یہ ایک یہودی نژاد برطانوی تھا اور بطور سفیر مقرر تھا۔ 25 سے 30 سال پہلے ہمارے ملک کا ایک وزیراعظم یہودی تھا جس کا نام ڈزرائیلی تھا۔ اسی کے زمانے سے برطانوی یہودی کافی بڑی تعداد میں ہماری سول سروس، تجارت، علمی پیشوں اور سفارت کاری میں داخل ہو چکے تھے۔ مگر یہ سب ہماری ہی طرح تاج برطانیہ کے وفادار ہی سمجھے جاتے تھے۔ ویسے بھی مذہبی نقطۂ نظر سے عیسائیت تو خود یہودی مذہب ہی کا ایک حصہ تھی۔

اسٹیفن بینجمن سے جان مارشل نے میرا تعارف بہت اچھے الفاظ میں کرایا کہ پھر اس کی ساری توجہ میری سمت ہی مبذول ہوگئی۔

''تاج برطانیہ اپنے ہونہار نوجوانوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مصر میں آپ کے کارنامے مجھ تک پہنچ چکے ہیں میں تو خود آپ سے ملنے کا مشتاق تھا''۔

رسمی گفتگو کے بعد برطانوی سفیر نے مجھ سے کہا کہ:

''جان مارشل اُسے میری کسی ملازمت کی ضرورت کے مطابق بتا چکے ہیں اور اس

کے جواب میں میں نے اپنے صوابدیدی فنڈ سے آپ کو چھ ماہ کے لئے 1000 پاؤنڈ ماہانہ مخصوص مشاہرہ مقرر کر دیا ہے''۔

یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ اسی دوران جان مارشل نے وائسرائے ہند کو بھی ایک خط لکھا تھا جس میں ان کے اپنے ہی محکمہ آثار قدیمہ میں مجھے ڈپٹی ڈائریکٹر شمالی ہند تعینات کرنے کی سفارش بھی کر ڈالی تھی اور مصری قیام کے دوران میری شہرت کی وجہ اور اخبارات کے تراشے وغیرہ اسی درخواست کے ساتھ منسلک کر کے پہلے ہی ہندوستان میں بھجوا چکے تھے۔

بغداد میں برطانوی سفیر کے دفتر میں اس وقت تو ہم لوگ محض 20 منٹ ہی رہے مگر اسی شام کو ہم لوگ سفارتخانے میں چائے پر مدعو کر دیئے گئے تھے اور پھر شام کی یہ نشست کوئی ڈھائی گھنٹے جاری رہی اور اس نشست میں مجھ پر عراق، شام و عرب وغیرہ میں ہونے والی سیاست و سفارت کاری کے بہت سے پہلو منکشف ہوئے۔ اسٹیفن بینجمن نے ہم سے بہت اپنائیت سے اور دل کھول کر گفتگو کی۔

اس نے ہمیں بتایا کہ:

''برطانوی سیاست کا اس وقت ایک نکاتی منصوبہ یہ تھا کہ یورپ، ایشیا و افریقہ میں پھیلی ہوئی اس عثمانی سلطنت کو کس طرح گرایا جائے یا کمزور کر دیا جائے۔ اس کے لئے ہماری برطانوی حکومت نے یہ منصوبہ تیار کیا تھا کہ طاقت اور جنگ میں اپنے فوجی قربان کئے بغیر کیسے اس سلطنت کو بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے کہ مقامی آبادیاں بھی اس کو اپنی فتح سمجھیں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ترکوں سے ان کے دلوں میں ایک منتقمانہ عصبیت بھی بیدار کی جائے۔ تا کہ ان کی یہ تفریق لمبے عرصے تک باقی رہ سکے اور نہ صرف برطانیہ کی ریاست بلکہ پورا کا پورا مسیحی یورپ بھی پھر کسی اسلامی خوف سے آزاد کر دیا جائے۔

سو اسی منصوبے پر عمل کرتے ہوئے ہماری سیاست اس خطے میں یہ تھی کہ ہم یہاں پر ترکوں اور عربوں کے درمیان قومیت کے فلسفے کو پروان چڑھائیں اور عربوں کو یہ باور کرائیں کہ ترک غیر عرب ہو کر بھی عربوں پر حکومت کر رہے ہیں جو عرب کی حمیت کے خلاف ہے''۔

ہمیں یہاں آ کر یہ بھی معلوم ہوا کہ ترکوں کے خلاف برطانیہ کے تمام سیاسی، سفارتی اور جاسوسی ادارے 100 سال سے در پردہ اسی ایک نکاتی اسکیم پر عمل کر رہے تھے اور اسٹیفن بینجمن کو یہ یقین تھا کہ اب یہ آگ سلگ سلگ کر بہت دور دور تک پھیل چکی ہے اور اس کے شعلے بھڑکنے ہی والے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ خود سلطنت ترکیہ کے اندر فوج میں بھی بددلی پھیلائی جارہی تھی اور ترک نوجوان سپاہیوں کو ماضی کی شاندار کامیابیوں کے قصے سنا کر یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی تھی کہ اب یہ عثمانی سلطنت ماضی کے جیسا کوئی بھی بڑا کارنامہ انجام دینے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔اسلئے اس لبادے کو اتار کر اب ریاست کو ایک نئے جمہوری طریقہ کار پر چلایا جانا چاہئے۔

دوسری طرف عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنے کے بھی تمام حربے آزمائے جارہے تھے اور پھر پوری مسلمان قوم کے اندر بھی مختلف طریقوں سے شگاف ڈالے جارہے تھے تاکہ اس کی یکجائی اور وحدت کو توڑ کر اسے بہت سے ٹکڑوں، خطوں اور مذہبی فرقوں میں بانٹ دیا جائے۔

اس پوری گفتگو میں اسٹیفن بینجمن نے اشارتاً یہ بھی بتایا تھا کہ:

''برطانوی مقبوضات بھی جلد یا بدیر برطانوی سلطنت کے درخت سے کسی پکے ہوئے پھل کی طرح ضرور گر جائیں گے تو اس وقت جب ان مسلمان ممالک کو جواب شمالی افریقہ، مشرق وسطیٰ، مشرقی افریقہ اور جنوب مغربی ایشیا کے ساحلی علاقوں میں برطانوی حکومت کے پاس ہیں وہ آزاد ہو جائیں گے تو سوئز کینال کے راستے بحر ہند تک برطانوی تجارت کیسے چلتی رہے گی؟ چنانچہ اس آنے والے وقت کے لئے ابھی سے اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ ایک اسرائیلی یہودی ریاست کو مشرق وسطیٰ میں قائم کیا جائے جو برطانیہ اور عیسائی ممالک کی وفادار رہے اور ان مسلمان ممالک کے درمیان رہ کر ان کے لئے ایک چوکیدار کی حیثیت سے برطانوی اور دوسرے یورپی مفادات کی محافظ بن جائے''۔

اسٹیفن بینجمن کا نظریہ تھا کہ یہودی بھی 587 ق م میں یعنی جب سے وہ بیت المقدس سے نکالے گئے تھے آج تک اسی تمنا میں ہیں کہ وہ واپس فلسطین جا کر اپنے قدیم سلیمانی معبد کو اپنا سکیں۔تو اگر وہاں ان کی ریاست بحال کر دی گئی تو وہ ہمیشہ برطانیہ کے ممنون احسان رہیں گے اور برطانیہ کی مالی امداد کے ساتھ ساتھ اس کے فرنٹ آفس کا کردار بھی ادا کریں گے۔اور یوں تاریخی طور پر بھی ہمیشہ عیسائی اور یہودی پچھلے 200 سال سے مسلمانوں سے زیادہ آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔ یورپ سے امریکہ کی طرف جو برطانیہ یا دوسرے ممالک کی تجارت ہوتی ہے اس میں عیسائی تاجروں کے شراکت دار ہیں اور اس تجارتی تعلق کو سیاسی تعلق بنا لینا دونوں ہی کے حق میں بہتر ثابت ہوگا۔

برطانوی سفارت خانے میں چائے پر جو دو ڈھائی گھنٹے ہماری آپس کی گفتگو ہوئی اس کا ماحاصل یہی تھا کہ پورے کا پورا مشرق وسطیٰ اور اس کے تمام اسلامی ممالک اب سلطنت عثمانیہ سے

اتنے بیزار کر دیئے گئے ہیں کہ وہ اس ترک ریاست سے باہر نکلنے کو تیار ہو چکے ہیں اور سلطنت عثمانیہ کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد مسلمانوں کو پھر ایک ملت اور بڑی قوت بن جانے سے بچانے کئے لئے اگلے مرحلے پر بھی کام بہت آگے بڑھ رہا ہے اور یہ اگلا مرحلہ ہے کیا؟ مسلمانوں کو اندر ہی اندر سے توڑا اور مزید منتشر کرتے رہا جائے۔ان کے شعیہ سنی جھگڑے اور نجد کے عربی علاقوں سے سفاک اسلام کو متعارف کر کے ایسے علمی گروہ پیدا کئے جائیں جو اسلام کو تقسیم در تقسیم اور در تقسیم کرتے جائیں اور خود ہی ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہیں۔ ہمارا کام ان سے کسی بھی قسم کی جنگ کرنے کی بجائے صرف یہ ہو کہ ہم انہیں خنجر فراہم کرتے رہیں۔

اس سلسلے میں اسٹیفن بینجمن نے عرب کے نجدی سعودی سنی وہابی قبیلے کے اس حملے کا تذکرہ بھی کیا جو 1799ء میں انہوں نے کربلا کے شیعوں پر کیا تھا اور وہاں کئی سو شیعہ مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا اور پھر اس حملے کا بھی حوالہ دیا جو سعودی نجدیوں نے مکہ کے قریب طائف میں شیعوں کے علاوہ مالکی اور حنفی سنیوں پر کر کے وہاں کے بہت سے علماء اور عام سنی مسلمانوں کو قتل کر کے وہاں کی مذہبی کتابوں کی لائبریریوں کو جلا دیا تھا۔

انہی واقعات کو پس منظر میں رکھ کر یہ سوچا جا سکتا تھا کہ برطانوی یہودی اور عیسائی منصوبہ سازی بہت کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی اور اسلامی مذہب کی فصیل جو اس مذہب کو اندر سے ایک رکھے ہوئے تھی آہستہ آہستہ شگافوں کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔

یورپ میں ہم عیسائی لوگ تو اسلام اور مسلمانوں کو ایک ہی مذہب سمجھتے آئے تھے، مگر جب یہاں آ کر سفارت خانے میں پہلی بار یہ سیاسی گفتگو سنی تو معلوم ہوا کہ ان کے دو بڑے ٹکڑے ہیں۔شیعہ اور سنی، اور ان کے آپس کے اختلافات ایسے نرم ہدف ہیں جن کو جب چاہیں اور جہاں چاہیں نشانہ بنا کر ان کی باہمی نفرت کی آگ کو دہکایا جا سکتا ہے۔

آہستہ آہستہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ عراق تو شیعوں سے بھرا پڑا تھا اور یہاں ہی ہمیں یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ کیوں دوسرے مسلمان سنیوں سے مختلف ہیں؟ اور ان کے مضبوط گڑھ کون کون سے ہیں؟ یہ موضوعات ہماری دلچسپی کے معاملوں یعنی تاریخ، آثار قدیمہ اور کھنڈرات کے دفن شدہ سماجی اور علمی خزانوں سے علیحدہ تھے مگر پھر بھی کم از کم مجھے تو اب مسلمانوں کے اندرونی معاملات کی جانکاری کا تجسس کچھ زیادہ ہی ہونے لگا تھا۔

ساتواں باب

عراق کی سیاسی فضا

عراق کے قیام کے دوران ہی ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ عراق کی سیاسی فضا اس زمانے میں کچھ اچھی نہ تھی۔ ہر طرف آتے جاتے لوگوں سے ملتے ملتے یا شیشہ خانوں (حقہ پینے والے کیفوں اور قہوہ خانوں سے) گفتگو میں جو رجحانات ہمیں نظر آتے تھے ان سے صاف پتہ چلتا تھا کہ عرب قومیت کا برطانوی منصوبہ سازوں کا لگایا ہوا پودا خوب پھل پھول رہا تھا۔

ترکی کی عثمانی سلطنت کے خلاف بددلی عام ہو رہی تھی اور عرب اکثر یہی شکوہ کرتے سنائی دیتے کہ اسلام تو عربوں نے ترکوں کو دیا اور ترکوں نے ہمیں ہی محکوم بنا رکھا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ترک شہری نظم ونسق کے ذمے دار افسران عربوں کو کسی تضحیک کا نشانہ نہیں بناتے تھے اور نہ ہی ان کی سماجی عادات، رسوم ورواج یا ان کے قبیلہ وارانہ نظام میں کوئی مداخلت کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی عربوں کی آنکھوں میں تبدیلی کی امیدوں کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

ایک دن سر جان مارشل اور میں شام کے وقت بغداد سے سامرہ جانے والی سڑک کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ گھوڑا گاڑیاں، بگھیاں اور زرعی اجناس سے چارے اور جو جوار سے لدی ہوئی گاڑیاں سڑک پر آ جا رہی تھیں اور کہیں کہیں کوئی عراقی گھوڑا سوار بھی آتا جاتا نظر آ جاتا تھا۔ کچھ عراقی بھی اپنے ٹخنوں تک کے لمبے روایتی کرتوں کے ساتھ سر پر پگڑیاں باندھے پیدل بھی چل رہے تھے۔ سڑک کے کنارے کہیں کہیں ترک سپاہی بھی آ جا رہے تھے۔

ادھیڑ عمر کا ایک عراقی گھوڑا سوار دوسری طرف سے آتا نظر آیا۔ اس کے گھوڑے کا پاؤں سڑک میں گندے پانی سے بھرے ایک گڑھے میں پڑا اور اس کی چھینٹیں اڑ کر ایک ترک سپاہی کی وردی پر آ گئیں۔ سپاہی نے ایک دم جھپٹ کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔ سپاہی بھی کوئی تنک مزاج شخص ہی تھا اور عراقی سوار نے بھی نہ کوئی معذرت کی اور نہ اس بے ارادہ گندگی اچھلنے پر سپاہی سے کسی افسوس کا

اظہار کیا۔ سپاہی نے ایک جھٹکے سے سوار کو گھوڑے سے نیچے اتار لیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھوٹی سی ڈنڈی سے 10/15 کوڑے گھوڑے کو اور اس کے سوار کے رسید کر دیں اور ذرا سے دیر میں ان دونوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ وہ عراقی عربی میں چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا جو ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آ تا تھا۔ بس پھر کیا تھا آتے جاتے عراقی اس گھوڑے سوار کے گرد جمع ہونے لگے اور آن کی آن میں 60/70 آدمیوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو گیا اور پھر ان سب نے مل کر اس ترک سپاہی کی درگت بنا ڈالی۔ تھپڑ، گھونسے اور زور زور سے غالباً گالیوں سے اس کی خاصی تواضع کر دی گئی۔ وہ ترک سپاہی بڑی مشکل سے جان بچا کر ایک طرف دوڑا اور پھر ایک بڑے سے احاطے میں گھس گیا۔

ابھی شاید دس پندرہ منٹ ہی نہ گذرے تھے، مجمع کچھ تو چھٹ چکا تھا اور کچھ لوگ ابھی وہیں کھڑے اس واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے کہ دس بارہ گھوڑے سوار سپاہی اسی احاطے سے نکلے۔ یہ احاطہ شاید کوئی پولیس چوکی تھا۔ انہوں نے مجمع کی طرف آتے ہی بلا وارننگ اور بلا تفریق ان لوگوں پر لاٹھی چارج کر دیا اور چار پانچ منٹ ہی میں ان لوگوں کو مار مار کر ادھر ادھر منتشر کر دیا۔ عراقی بکتے جھکتے اور نعرے مارتے وہاں سے نکل گئے۔

ہم نے اس پورے واقعے کو بچشم خود دیکھا۔ بمشکل بیس منٹ کا دورانیہ رہا ہو گا اور بظاہر معمولی سا جھگڑا ہی تھا جسے پولیس نے فرو بھی کر دیا تھا مگر ہمیں اسی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ ترکوں کے خلاف مقامی آبادی میں نفرت کا ایک شدید لاوا پک رہا ہے جو یقیناً ایک دن دہانوں سے باہر نکلے گا۔ بغداد کی گلیوں اور دیواروں پر بھی ہمیں عربی میں بڑے بڑے الفاظ لکھے نظر آتے تھے جس کا مفہوم ہمیں معلوم نہ ہوتا تھا۔ ایک دن یونہی میں نے وولی کے ایک اسسٹنٹ سے جو اُر میں ان کے ساتھ کام کرتا تھا اور کچھ انگریزی بھی سمجھ لیتا تھا میں نے دیواروں پر لکھی ہوئی عبارت سے متعلق پوچھا تو اس نے کہا:

''یہ ایک نعرہ ہے جو یہاں کی ایک نئی سیاسی پارٹی جس کا نام بعث پارٹی ہے وہی یہ نعرے دیواروں پر جا بجا لکھ جاتی ہے جس کا مطلب ہے ''بغداد باب عالی کا غلام نہیں ہے''۔ (باب عالی استنبول کے شاہی محل کا نام تھا)۔

عراقی بھی ایک خاص وضع قطع کے لوگ تھے۔ گورے اور سرخی مائل چہروں والے لمبے قد اور چوڑی ہڈی کے جسم والے عموماً ان کے جسم موٹے اور فربہی مائل ہوتے تھے۔ یہ چاول اور روٹی، دودھ، کھجور اور میٹھا کھانے کے بہت شوقین ہوتے تھے اور محنت سے جی چراتے تھے اور فراغت کے اوقات میں چہ مگوئیاں کرنے اور گپیں مارنے کے بڑے شوقین تھے۔ سڑکوں کے کنارے جا بجا قہوہ خانے، شیشہ خانے اور کہیں کہیں شراب خانے بھی کھلے ہوتے تھے جہاں یہ لوگ اپنے اپنے

شوق پورے کر لیتے تھے۔

عراقی عورتیں بھی لمبے قد اور صاف سرخ رنگت کی ہوتی تھیں۔ان کا سارا جسم ایک لمبی چادر سے ڈھکا ہوتا تھا مگر چہرہ پورا کھلا ہوتا تھا۔وہ بازاروں میں خرید و فروخت بھی کرتی نظر آتی تھیں۔ سڑک کے کنارے پھل وغیرہ بھی بیچتی دکھائی دیتی تھیں اور عام طور پر کوئی نظر بازی نہ مردوں میں نظر آتی تھی اور نہ ہی عورتوں میں۔ان میں اکثر چہرے ہی سے شریف اور پاکباز لگتی تھیں۔

عراقی زور زور سے باتیں کرتے تھے اور عام گفتگو میں بھی اس طرح شدت کے لہجوں میں بات کرتے تھے کہ لگتا تھا کہ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔امیر لوگ گھوڑا گاڑیوں اور بگھیوں میں آتے جاتے نظر آتے تھے مگر غریب عورتیں ایک گدھا گاڑی میں یا کسی آدمی کے کھینچے ہوئے ریڑھے (ٹرالی) میں آتے جاتے نظر آتے۔کھانا پینا سستا تھا۔مفلوک الحالی اور غربت کم ہی نظر آتی تھی۔ہاں! البتہ امارت اور غربت کا فرق ضرور تھا۔بازار پھلوں اور کھانے پینے کی اشیاء سے بھرے نظر آتے تھے۔سماجی زندگی پرسکون اور آرامدہ نظر آتی تھی۔اکثر شام کو اگر ہم کسی گنجان محلے سے گذرتے تو وہاں کبھی کبھی حسین حسین کی صدا ضرور سنائی دیتی تھی۔اسی طرح کہیں کہیں کچھ بڑے بڑے ہال بھی بنے ہوئے تھے۔وہاں بھی اکثر لوگ شام اور رات کو کافی تعداد میں آتے جاتے نظر آتے تھے۔انہی دنوں بغداد میں قیام کے دوران ہی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ بغداد سے کوئی 60 میل دور ایک جگہ کربلا کے نام سے آباد ہے۔جہاں مسلمانوں کی کسی بڑی شخصیت کی قبر ہے۔ وہاں سال میں ایک بار ایک Carnival بھی لگتا ہے جہاں لوگ جمع ہو کر اس شخص کی موت یاد کرتے ہیں اور ان واقعات پر روتے ہیں۔

ہم تو عراق میں صرف ایک اُر یا پھر بابل ہی کو عراق کی وراثت سمجھتے تھے مگر آہستہ آہستہ ہمیں معلوم ہوا کہ عراق کے معاشرے کی اصل روح تو کربلا اور اس کے قریب ایک اور بستی نجف میں ہے۔جہاں مسلمانوں کے رسول ﷺ کے بھائی اور نواسے کے مقبرے ہیں۔جن کو خود انہی رسول ﷺ کے چاہنے والوں نے ہی 1300 سال قبل قتل کر دیا تھا۔

ایک عراقی دوست نے ہمیں بتایا کہ اگر عراق کی اصل لازوال شخصیت کو سمجھنا اور اس کے اثرات کو دیکھنا ہے تو ہمیں کربلا اور نجف جانا چاہئے۔ جہاں اسلامی سال کے شروع کے دس دن تک لوگ جمع ہو کر جلسے کرتے ہیں اور رسول ﷺ کے خاندان پر ہونے والے مظالم کی یاد تازہ کرتے ہیں۔اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ اگر ہم وہاں جانا چاہیں گے تو وہ ہمیں کربلا لے جا سکتا ہے۔مگر ابھی اس Carnival میں دو ماہ کا عرصہ باقی تھا کیونکہ سال ختم ہونے میں ابھی دو ماہ تھے۔

آٹھواں باب

عراق کا دل۔۔ کربلا

ہمارا 20/25 اونٹوں کا قافلہ کربلا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں، ابوبکر تمیمی اور روسی ایک ہی اونٹ پر تھے اور جان مارشل، لیونارڈ وولی اور جعفر عبداللہ طیاری ایک دوسرے اونٹ پر سوار تھے۔ طیار خاندان کی عورتیں، بچے، مرد اور دوسرے کچھ اور افراد بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر اور اونٹوں کی محملوں میں سوار تھے۔

جعفر عبداللہ طیاری کا خاندان رسول اسلام ﷺ کے چچازاد بھائی جعفر طیار کے نسب نامے سے اپنا تعلق جوڑتا تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ 8 ہجری میں بائی زنطائین رومن ایمپائر کے غسانی باج گذار عرب عیسائی قبیلے سے جنگ کرتے ہوئے شام کی موتہ نامی ایک بستی میں وہ یعنی ان کے جد جعفر بن ابو طالب شہید ہو گئے تھے۔ مسلمان اپنی دفاعی مذہبی جنگوں میں مارے جانے والوں کو شہید کہتے ہیں اور ان کے لئے قرآن کی ایک آیت پر یقین رکھتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ:

''جو خدا کی راہ میں جنگ کرتا ہوا شہید ہو جائے (یعنی مارا جائے) اسے مُردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہے اور خدا کی طرف سے رزق پاتا ہے''۔

اس قبیلے کے لوگ اس لئے طیاری کہلاتے ہیں کیونکہ رسول ﷺ کے چچازاد بھائی جعفر جب موتہ کی جنگ میں لڑ رہے تھے تو تلواروں کے وار سے یکے بعد دیگرے ان کے دونوں بازو کٹ کر گر گئے تھے اور پھر انہیں تلواروں اور نیزوں سے قتل کر دیا گیا تھا۔ تو ان کے لئے ہی رسول اسلام ﷺ نے فرمایا تھا کہ: ''اللہ نے جعفر کو جنت میں دونوں بازوؤں کی جگہ دو پر عنایت کر دیئے ہیں جن سے وہ جنت میں اِدھر اُدھر اڑتے پھرتے ہیں''۔

عربی میں طیار اڑنے والے کو کہتے ہیں اور اسی سے لفظ طائر (پرندہ) نکلا ہے۔ چنانچہ ان کی نسل کی کنیت طیاری ہو گئی تھی اور آج تک ان کی نسل کے لوگ خود کو اسی مناسبت سے طیاری لکھتے

اور کہتے ہیں۔ انہی جعفر طیار کے دو پوتے 61 ہجری میں 12/13 سال کی عمر میں اپنے ماموں حسین بن علیؓ کے ہم رکاب ہو کر لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ جعفر عبداللہ طیاری کا پورا خاندان اسی لئے ہر سال کربلا جاتا ہے کہ یہ ان کے گھر والوں ہی کا معاملہ تھا اور کربلا والے ان کے قریبی عزیز تھے۔ جن کے لئے وہ آج تک یعنی 1300 سال تک غم مناتے چلے آئے ہیں۔

مجھے یہ باتیں بہت بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ کیمبرج میں تو خیر کیا مگر مجھے تو مصر یا عراق پہنچنے تک بھی مذہب اسلام، ان کے رسول محمد ﷺ، کربلا کے حسینؓ یا ان کے والد علیؓ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کے متعلق کوئی علم ہی نہیں تھا۔ نہ کبھی ہم نے ان کو پڑھنے یا اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ باقی عیسائیوں کی طرح ہمارا بھی یہی نظریہ تھا کہ اسلام خون بہانے والوں، جنگ کرنے والوں اور بزور شمشیر اپنا مذہب پھیلانے والوں کا دین ہے۔ لیکن عراق آ کر اور پھر جعفر عبداللہ طیاری کے ساتھ کربلا میں پورے دس دن گزار کر ہمیں اسلام اور رسول اسلام ﷺ اور ان کے خاندان اور حسین ابن علیؓ سے واقفیت پیدا ہوئی۔

اس سے پہلے عراق اور مشرق وسطیٰ میں برطانوی سیاسی سرگرمیوں اور مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کا کچھ اندازہ ہمیں بہرحال ہو چکا تھا۔ کربلا کی طرف سفر کرتے ہوئے اور وہاں کے دس دن کے قیام کے دوران ہمیں اسلام، رسول اسلام ﷺ، عراقی مسلمانوں اور کربلا سے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ یوں تھیں۔

رسول اسلام ﷺ 570 عیسوی میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ 610 عیسوی میں انہوں نے نبی ہونے کا اعلان کیا۔ آپ ﷺ 13 سال تک وہ اپنے شہر مکہ ہی میں لوگوں کو قرآن پڑھ پڑھ کر سناتے رہے اور لوگوں کو یقین دلاتے رہے کہ یہ خدا کا فرشتہ جبرائیلؑ ان پر خدا کی طرف سے پیغامات لے کر آتا ہے، جس میں نیکیوں کی ہدایات دی گئی ہیں۔ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہب کی نفی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی اصلاح کی تعلیم دیتے تھے۔

رسول اسلام ﷺ پانچ عقیدوں کو مذہب اسلام کی بنیاد بتاتے تھے:

1۔ خدا ایک ہے جو کائنات کا خالق ہے اور صرف اسی کا حکم ماننا چاہئے۔

2۔ خدا اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے رسول بھیجتا رہتا ہے اور رسول اسلام ﷺ اس کے آخری رسول ہیں۔

3۔ تمام انسانوں کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور دنیا کی زندگی میں جو جو اچھائیاں یا برائیاں انہوں نے کی ہیں ان کے مطابق انہیں سزا یا جزا دی جائے گی۔

4۔ تمام انسانوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا برتاؤ کیا جائے اور انصاف کے ساتھ صرف سچ، حق کے ساتھ نیک کام کئے جائیں تا کہ معاشروں میں امن، نیکی اور انصاف پھیلتا رہے۔

5۔ ایک ایسی ریاست اور حکومت قائم کی جائے جو عدل و انصاف اور عام لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کرے اور برائیوں کو روکے اور نیکیوں کو پروان چڑھائے۔

جب 13 سال تک ان کے شہر کے لوگ ان کی مخالفت کرتے رہے اور ان کو قتل کرنے کے منصوبے بنانے لگے تو رسول اسلام ﷺ وہاں سے نکل کر 300 میل دور ایک اور شہر چلے گئے۔ یہ 623 عیسوی کا سال تھا۔

اس شہر میں آ کر انہوں نے اسلامی اصولوں پر ایک ریاست قائم کی جس میں امیروں سے ٹیکس (زکواۃ) لے کر غریبوں کی مدد کے لئے دیا جاتا تھا۔ شہر کے جھگڑے مکمل غیر جانبدارانہ اور انصاف سے طے کئے جاتے تھے اور جو لوگ بھی اس ریاست پر حملہ کرنے یا اس کو ختم کرنے کی سازشیں کرتے تھے ان سے جنگ کی جاتی تھی یا ان کو سزا دی جاتی تھی۔ ایسی کوئی بھی جنگ جو خدائی اصولوں پر قائم ریاست کو بچانے کے لئے کی جاتی تھی جہاد کہلاتی تھی اور ایسی کسی بھی جنگ میں یا خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کی کوششوں میں کوئی شخص مارا جاتا تھا تو وہ شہید کہلاتا تھا۔ رسول اسلام کا انتقال 633 عیسوی میں ہوا۔

رسول ﷺ کی زندگی ہی میں پورے عرب میں اسلام پھیل چکا تھا اور مدینہ شہر کی وہ چھوٹی سی شہری حکومت جو رسول اسلام ﷺ نے 623 عیسوی میں قائم کی، دس برسوں میں پورے عرب کی بڑی ریاست بن چکی تھی اور اس ریاست پر قبضہ کرنے کے لئے بہت سے حریص مسلمانوں کی نظریں اس کے اقتدار کو حاصل کرنے پر لگی ہوئی تھیں۔

رسول اسلام ﷺ کے معتمد ترین ساتھی اور اوّلین مسلمان ان کے چچازاد بھائی علیؑ تھے۔ جو بہت چھوٹی عمر ہی سے ان کے ساتھ رہتے آئے تھے۔ جن کی مکمل تربیت خود رسول ﷺ ہی نے کی تھی اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی بھی رسول ﷺ نے علیؑ سے کردی تھی۔ علیؑ کی پوری زندگی رسول ﷺ کی حفاظت، جانثاری اور اسلام کی مکمل پابندی کرنے میں گذری۔ رسول ﷺ کے اپنی اور کوئی اولاد نہ تھی اور وہ اپنے دونوں نواسوں حسنؑ اور حسینؑ کو ہی اپنی اولاد سمجھتے تھے۔

اسلام کے ان مخالفین نے جو رسول ﷺ کی زندگی میں بھی ان کے خلاف تھے اور ان سے جنگیں کر چکے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد 50 سال کے اندر ہی اس پوری ریاست اسلامیہ پر قبضہ کرلیا اور وہی قبائلی نظام اور غیر عادلانہ طرز اقتدار جس کو رسول اسلام ﷺ نے اپنی زندگی میں

ختم کر دیا تھا پھر سے زندہ کر دیا اور جہاد کو اپنی ذاتی سلطنت اور قوت و دولت کو بڑھانے کے لئے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا۔ اس اصل اسلام کو بچانے اور ریاست کی اصلاح کر کے اسے حق، عدل اور معاشرہ پروری کی خالص بنیادوں پر چلانے کے لئے جو ایک اکیلا شخص اٹھا اس کا نام ''حسینؓ'' تھا۔ جو رسول ﷺ کے نواسے اور علیؓ کے بیٹے تھے۔ گو ان کے ساتھ بہت چھوٹی سی جمعیت تھی اور اس دور کے بادشاہ یزید سے ٹکرانا موت کو دعوت دینا تھا لیکن ان تمام خطرات کے باوجود حسینؓ نے ہار نہ مانی اور اصلاح ریاست کے موقف پر جمے رہے۔

بادشاہ یزید کی حمایتی فوج نے ان کو، ان کے تمام ساتھیوں، عزیزوں، جوانوں، بچوں اور حد تو یہ کہ ایک چھ ماہ کے بچے تک کو نہایت ہی سفا کی سے بھوکا پیاسا رکھ کر ظلم سے ایک ایک کر کے قتل کر ڈالا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر یزید کی پوری ریاست میں گھما کر یزید کے سامنے پیش کر دیا۔ مگر حسینؓ کے خاندان کے کسی مرد یا عورت یا بچے تک کو بھی حسینؓ کے مقصد سے نہ ہٹا سکا۔ عوامی شورش کے دباؤ نے یزید کے باپ معاویہ کی قائم کردہ بادشاہت حسینؓ کے قتل و شہادت کے بعد تین سال کے اندر ہی اندر ختم ہو گئی اور بادشاہت پر اس کی خاندان کے اور لوگوں نے قبضہ کر لیا۔

یہ سب کچھ ہوا مگر کربلا کا واقعہ اور حسینؓ کی جرأت، بہادری اور اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی یاد آج تک کربلا میں منائی جاتی ہے اور اسی سالانہ یاد کے مناظر کو دیکھنے ہم لوگ کربلا آئے تھے۔

ایک جم غفیر تھا جو ہر طرف سے پیدل، گھوڑوں پر، اونٹوں پر، گدھا گاڑیوں پر کربلا کی طرف بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ ہم نے ایسے ضعیف اور نابینا افراد بھی دیکھے جو لکڑی ٹیک ٹیک کر بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ایسے بھی چند لولے لنگڑے نظر آئے جو زمین پر بیٹھے گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان سب کی منزل ہماری ہی طرح حسینؓ کی قبر تھی۔

اس جگہ ہم روز جاتے رہتے تھے۔ یہاں روز لوگ کرسی پر بیٹھ کر مجمع میں تقریر کرتے تھے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی کیونکہ ہم عربی جانتے ہی نہ تھے۔ مگر ہم ہر روز سینکڑوں لوگوں کو اپنے آنسو پونچھتے دیکھتے تھے۔ بچے، بڑے، مرد اور عورتیں اس طرح دھاڑیں مار کر روتے تھے کہ لگتا تھا کہ ان کے کسی عزیز کی لاش ابھی ابھی میدان جنگ سے ان کے پاس پہنچی ہو۔ ہمیں ہر طرف سے ایک ہی آواز یا ایک ہی گونج سنائی دیتی رہتی تھی۔ حسینؓ، حسینؓ، حسین۔

ہمیں اس بستی کربلا میں پہنچے ہوئے دسواں دن تھا۔ ابوبکر تمیمی اور جعفر عبداللہ طیاری ہم سے روز ملنے آتے تھے۔ ہمیں ٹوٹی ہوئی انگریزی میں ہر روز حسینؓ ہی کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا کر ہماری معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے اور حسینؓ کی یاد میں ہزاروں دیگوں میں جو کھانا پکا کر

لوگوں میں بانٹا جاتا تھا وہ بھی لا کر ہمیں کھلاتے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ:

''حسینؓ کے ساتھ کچھ عیسائی لوگوں نے بھی جانیں دی تھیں''۔

ہم ان دنوں کربلا ہی میں تھے اور دس محرم کی صبح ہی سے یہاں عجیب سوگواری کا سماں نظر آتا تھا۔ روتے، سسکتے، آہیں بھرتے اور اپنا سینہ پیٹتے حسینؓ حسینؓ کرتے لوگ ہر طرف سے حسینؓ کی قبر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

یکا یک ایک طرف سے ہمیں کئی سو لوگوں کا ایک قافلہ حسینؓ کے روضے (قبر) کی طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔ ان کے کندھوں پر زمین کھودنے والے بیلچے تھے اور وہ سینے پر زور زور سے ہاتھ مار کر یا حسینؓ یا حسینؓ کہتے اور روتے ہوئے روضے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دور سے یہ گروہ جہاں سے آ رہا تھا وہ سڑک یوں تو ہزاروں کیا لاکھوں آدمیوں، عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی تھی مگر ان کے لئے پورا مجمع کائی کی طرح پھٹ جاتا تھا اور ان کے آگے جانے کا راستہ دے دیتا تھا۔ حسینؓ کے روضے اور وہاں بنی ہوئی دوسری قبروں کے قریب پہنچ کر انہوں نے بیلچوں سے زمین کھودنی شروع کی اور وہاں سے تھوڑی تھوڑی مٹی اٹھا کر اپنی چند چادروں میں بھر لی اور پھر یہ مٹی مٹھی بھر بھر کر ان قبروں کی چاروں طرف ڈالنی شروع کی اور پھر وہیں ایک گھیرا اور دائرہ سا بنا کر حسینؓ حسینؓ کر کے عربی میں کوئی نظم پڑھنا شروع کی۔ یہ لوگ حسینؓ حسینؓ کرتے جاتے تھے اور دھاڑیں مار مار کر روتے اور اپنا سر اور سینہ بھی پیٹتے جاتے تھے۔

بعد میں ہمیں جعفر طیاری نے بتایا تھا کہ:

''یہ لوگ اس کربلا کی بستی کے قدیم باشندوں کی اولادیں تھیں جو ہر سال دس محرم کی تاریخ کو اسی طرح آتی رہتی تھیں۔ یہ لوگ اس طرح آ کر حسینؓ سے کیا ہوا اپنا ایک وعدہ نبھاتے تھے۔ اس کا واقعہ کچھ یوں تھا کہ جب رسول ﷺ کے نواسے کو بادشاہ کی فوجوں نے چاروں طرف سے گھیر کر اس بستی کے مقام تک پہنچا دیا تو حسینؓ نے یہاں کے باشندوں سے یہاں 50/60 ہزار دینار دے کر کوئی 100 ایکڑ زمین خرید لی۔ پھر یہ خریدی ہوئی زمین بھی انہی کو تحفے میں واپس کر دی مگر ان سے یہ عہد لیا کہ جب وہ (حسینؓ) یہاں پر قتل کر دیئے جائیں تو وہ لوگ یہاں آئیں اور ان کی لاشوں کو دفن کر دیں اور اگر یہاں ظالم افسران کی وجہ سے ان کو دفن نہ بھی کر سکیں تو اپنے بچوں کو بھیجیں کہ وہ ان کے مُردہ جسموں پر ایک ایک مٹھی خاک لے کر ڈال دیں تا کہ ان کے جسم مٹی میں چھپ جائیں۔ سو یہ لوگ اسی وعدے کو نبھانے یہاں آتے ہیں۔ اس قبیلے کا نام بنی اسد ہے جو آج تک یعنی 1300

سال گذر جانے کے باوجود ابھی تک اس زمین کا مالک ہے''۔

عجیب داستان تھی۔ عجیب لوگ تھے اور عجیب ان کی روایات تھیں۔ حسینؓ کے روضے کے پاس آ آ کر لوگ اس طرح دعائیں مانگتے تھے کہ لگتا تھا کہ ایک زندہ بادشاہ کے سامنے لوگ اپنی زبانی درخواستیں پیش کر رہے ہیں اور پھر ان کو یہ بھی یقین ہوتا تھا کہ ان کی درخواستیں سنی جا رہی ہیں اور قبول بھی ہو جائیں گی۔

ہم نے یورپ کے بہت سے بادشاہوں کی بہادری کی داستانیں سنی تھی۔ خود عراق میں دفن شدہ مقامات سے بادشاہوں کے مجسمے اور ان کے کتبوں سے ان کی شان وشوکت کو زندہ ہوتے بھی دیکھا تھا مگر یہ شخص حسینؓ جو نہ بادشاہ تھا نہ اس کا کوئی مجسمہ نظر آتا تھا مگر پھر بھی سینکڑوں سالوں سے آج تک زندہ لوگوں کے دلوں پر بادشاہوں سے زیادہ حکومت کرتا تھا اور اپنا بڑا اثر ورسوخ رکھتا تھا۔

کربلا کا سفر اور اس بستی میں دس دن کا قیام اور حسین کے قتل سے متعلق معلومات میرے، سر جان مارشل، لیونارڈ اور وولی کے لئے ایک ناقابل فراموش تجربہ تھا۔ یہ بھی ہمیں یہیں آ کر معلوم ہوا تھا کہ مسلمان، رسول اسلام ﷺ کو، ان کی بیٹی فاطمہؓ کو، ان کے شوہر علیؓ کو اور ان دونوں نواسوں یعنی حسنؓ اور حسینؓ کو اسلام کی بزرگ ترین ہستیاں اور شخصیات مانتے ہیں۔

نواں باب
نقش سلیمانی

ہمارے عراق میں قیام کے دوران وہاں کے ایک ماہانہ عربی رسالے ''اساس'' کا مدیر فرزوق باہلی برطانوی سفارتخانے کی مدد سے لیونارڈ وولی کا انٹرویو کرنے اور عراقی آثار قدیمہ پر ان کی کی ہوئی کھدائیوں کے تجربات پر ایک مضمون لکھنے کے لئے وولی سے ملنے آیا۔

ہم لوگ یعنی میں اور جان مارشل اس دن بھی حسب معمول وہیں اسی لمبے سے ہال میں لیونارڈ وولی کے ہمراہ موجود تھے۔ عراق کی قدیم تہذیب اور وہاں کے آثار قدیمہ کی دریافت کے موضوعات تو وولی کے پسندیدہ عنوانات تھے ہی مگر یہ نیم سماجی اور نیم سیاسی انٹرویو بھی بے حد علمی معلومات سے بھرپور تھا اور کئی گھنٹے تک چلتا رہا۔ دوپہر کے کھانے پر فرزوق باہلی، لیونارڈ وولی، میں اور جان مارشل اکٹھے ہوئے تو عراق کے سماجی اور مذہبی پہلوؤں پر بھی گفتگو ہوئی۔ یہ اخبار برطانوی سفارتخانے سے کافی قریب تھا اور وہیں سے اسے یورپ، مصر اور مشرق وسطیٰ سے متعلق بہت سے خبریں بھی مل جاتی تھیں۔

برطانوی سفارتخانے کا تعلقات عامہ کا شعبہ اس اخبار کی در پردہ مالی امداد بھی کرتا تھا اور کچھ برطانوی تجارتی کمپنیوں سے جو وہاں کام کرتی تھیں اس اخبار کو اشتہار بھی دلوا دیا کرتا تھا۔ تھوڑی سی دیر کی گفتگو کے بعد یہ رسمی ملاقات ایک اپنائیت کی نجی محفل میں بدل گئی اور مذہبی نکات پر بھی بات چیت ہونے لگی۔

اس دن ہمیں فرزوق نے اپنی فائل سے ایک تصویر نکال کر دکھائی جس پر عبرانی زبان میں کچھ قدیم تحریر موجود تھی۔ عبرانی زبان کی تحریر پر جو کچھ موجود تھا وہ انجیل قدیم (تورہ) کے مشہور پیغمبر سلیمانؑ کی دعا کا ایک صفحہ تھا جو نہ جانے کس طرح فرزوق باہلی کے ہاتھ آیا تھا اور پھر اس نے اس کا ترجمہ کرا کے اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ نہ تو اس عبارت کی اصلیت اور قدامت پر کوئی زیادہ

گہری تحقیق کی تھی اور نہ ہی میں نے اس کے اصل (Original) ہونے پر اس سے کوئی زیادہ گفتگو کی۔ کیونکہ اس کا تعلق چند اسلامی اشخصیات سے تھا نہ کہ عیسائی پوپ یا کسی اور عیسائی سینٹ (Chiristian Saint) وغیرہ سے تھا۔ اس لئے میں نے اس کاغذ کے متعلق کچھ زیادہ بات نہیں کی تھی مگر چونکہ فرزوق نے مجھے اس کی نقل دے دی تھی تو میں اس کو اپنی تحریر میں ضرور پیش کروں گا۔ مگر اس سے قبل میں آپ کو یہودی بادشاہ سلیمانؑ کے متعلق بتا چکا ہوں کہ ان کی حکومت 961 قبل مسیح سے لے کر 922 قبل مسیح تک موجود تھی۔

ان کے دور میں بلکہ ان سے بھی کئی صدیاں پہلے ہی سے یہودیوں کی زبان عبرانی کا نام پا چکی تھی۔ گو یہودیوں نے توریت کو پہلی بار کتابی صورت میں 322 قبل مسیح (یعنی سکندر یونانی کے عہد میں) لکھا تھا۔ وہ بھی عبرانی میں نہیں بلکہ یونانی اور آرمائیک زبان میں لکھی گئی تھی۔ آرمائیک وہی زبان تھی جو عیسیٰؑ بولتے تھے۔ لیکن عبرانی بہرحال اُس ایک ہزار سال کے دور میں بھی یعنی موسیٰؑ سے لے کر سکندر کے زمانے تک ایک معروف زبان کے طور پر زندہ تھی۔ اس کے حروف تہجی موسیٰؑ ہی کے دور میں تشکیل پا چکے تھے اور سلیمانؑ نبی کے جس نقش یا لوح کی تصویر فرزوق باہلی نے ہمیں دکھائی تھی وہ بھی عبرانی ہی میں تھی۔

اس سے پہلے کہ میں اس نقش سلیمانی کی تحریر اور اس کا ترجمہ آپ کے سامنے رکھوں میں عبرانی زبان کے حروف تہجی اور ان کے ہم تلفظ انگریزی (اور پھر اردو) کے الفاظ میں بھی آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔

A			El		Aleph
B			Bet		Beyt
J			Gam		Gimal
D			Dal		Dalet
E			Hey		Hey
Y			Waw		Vav

Z			Zan		Zayin
H			Hhet		Chet
T			Tet		Tet
Y			Yad		Yud
K			Kaph		Kaph
L			Lam		Lamed
M			Mem		Mem
N			Nun		Nun
			Sin		Samech
O			Ghah		Ayin
P F			Pey		Pey
Z			Tsad		Tsade
Q			Quph		Quph
R			Resh		Resh
S			Shin		Shin
T			Taw		Sin
G			Ghah		Tav

اب یہ تحریر دیکھئے جو سلیمانؑ نبی سے منسوب کی گئی تھی اور ایک طرح سے سلیمانؑ نبی کی دعاؤں کا ایک ورق تھا۔

اللہ

احمد عیلی باہتول

حاس حاسین یاہ

احمد مقدا یاہ

عیلی ان سطاہ یاہ

باہتول اکانی یاہ

حاسن اضوسطح یاہ

حاسین بارمح

عیلی عیلی عیلی

سلیمان صوہ

اس عبارت کا جو کچھ ترجمہ حاصل ہو سکا وہ یوں ہے:

اللہ۔

احمد۔

ایلی۔

باہ تول۔

حسن۔

حاسین۔

یا احمد میری مدد کو پہنچو۔

یا ایلی مدد کرو۔

یا بتول نظر رکھو۔

یا حسن کرو۔

یا حسین خوشی بخشو۔

عیلی عیلی عیلی

سلیمان انہی پانچوں سے فریاد کر رہا ہے اور اللہ کی قوت عیلی ہے۔

فرزوق باہلی، جان مارشل، وولی اور میں سب مل کر اس تحریر پر کافی دیر بحث کرتے رہے کہ اس کی اصلیت اور دریافت کا ذریعہ اور اس کی بنیاد کیا ہے؟

بہت لمبی بحث و تمحیص کے باوجود بھی ہم لوگ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ مگر فرزوق باہلی کو پکا یقین تھا کہ یہ نقش مسلمانوں کے رسول ﷺ اور ان کے کی انہی پانچ بزرگ ہستیوں کی عظمت کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیشہ ہی سے تمام مسلمانوں کے لئے بڑی محترم رہی ہیں اور یہ کہ یہ اپنی پیدائش سے قبل بھی نبیوں، رسولوں اور مقربین کے علم میں تھیں اور اسی لئے سلیمان نبی نے بھی ان کو خدا کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں کا واسطہ یا وسیلہ بنایا تھا۔ بہر حال یہ طویل مذہبی بحث اس لحاظ سے لا حاصل ہی رہی کیونکہ ہم کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکے تھے اور پھر یہ مذہبی مضامین ہم جیسے تاریخ اور آثار قدیمہ کے طالب علموں کے دائرے سے بھی باہر تھے۔

دسواں باب

جولی سے ملاقات اور شادی 1907ء

بغداد میں ایک بار برطانوی سفیر اسٹیفن بینجمن سے ملاقات کے بعد جب میں اور جان مارشل واپس اپنے ریسٹ ہاؤس جا رہے تھے تو وہ مجھ سے کہنے لگے:

''جان میلکم! اگر تم پسند کرو تو سفارت خانے کے ملٹری سیکریٹری بریگیڈیئر جنرل انگریو پٹمین جو میرے ایک پرانے دوست ہیں اور آج کل یہیں تعینات ہیں تو تمہیں ان سے ملانے لئے چلتا ہوں۔ وہ بھی برمنگھم شہر ہی کے رہنے والے ہیں، تمہیں ان سے مل کر خوشی ہوگی''۔

میں نے ہاں کردی اور ہم اگلے دن شام پانچ بجے اینگریو پٹمین کے گھر پہنچ گئے۔ اینگریو پٹمین ابھی تو اکیلے ہی رہتے تھے مگر ان کا خاندان برطانیہ میں ہی تھا اور کچھ دن میں عراق پہنچنے والا تھا۔ ان کی بیوی اور ایک بیٹی پر مشتمل مختصر سی فیملی تھی اور یہ دونوں فل الحال برمنگھم ہی میں تھے اور ان کی بیٹی آکسفورڈ میں گریجویشن کر رہی تھی۔ یہ لوگ اگلے ماہ یہاں آنے والے تھے۔ پٹمین سے پہلے تو عراق کی سماجی اور سیاسی باتیں ہوتی رہیں اور پھر جان مارشل سے قدیم تاریخ مصر اور عراق کے موضوعات پر بات چل نکلی۔ مصر میں میری اور جان مارشل کی پانچ سالہ رفاقت پر گفتگو ہوئی اور اہرام مصر سے دورِ فرعون رامسیس کی لاش کی برآمدگی کی بات بھی ہوئی۔ جس کو انہوں نے بہت مؤثر اور قدر افزاء الفاظ میں بیان کیا اور پھر یہاں عراق میں ہماری لگ بھگ تین سال کی مختلف آثار قدیمہ کی کھدائیوں میں میری شرکت پر بھی سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ جان مارشل میری تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے اور وہ مجھے برطانیہ کے اعلیٰ روایتی خاندانوں میں شمار کرانے پر تلے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا بلکہ انہوں نے اسکا اظہار بھی کیا کہ جلد یا بدیر مجھے برطانوی محکمہ آثار قدیمہ سے باقائدہ منسلک ہو جانا چاہئے کیونکہ میرا فطری میلان قدیم تواریخ کی طرف ہے

اور مجھے اسی میدان میں آگے بھی ناموری کے مواقع ملتے رہیں گے۔ جان مارشل تو خود بھی برطانوی ہند میں محکمہ آثار قدیمہ کے مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور ان کا تاج برطانیہ کی طرف سے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر تھا اور اسی لئے وہ مصر میں بھی اور اب عراق میں بھی آثار قدیمہ کے بہت سے منصوبوں سے متعلق تھے۔ بہر حال ہماری ملاقات بہت اچھی رہی اور اینگر یو پٹمین نے مجھ سے وعدہ بھی لے لیا کہ جب تک ہم لوگ عراق میں موجود ہیں میں بھی جان مارشل کے ساتھ ان کے پاس آتا رہوں گا۔

ہم پانچ سال گزار کر 1905 میں مصر سے عراق پہنچے تھے۔ یہ جون 1907ء کی گرمیوں کا مہینہ تھا۔ گرمیاں بغیر کسی بارش کے گزرتی جارہی تھیں اور سورج اپنی پوری تمازت سے چمکتا رہتا تھا مگر یہاں کے مقامی لوگ یہ ضرور کہتے تھے کہ نومبر سے جنوری تک یہاں جنوبی ہوائیں کچھ نہ کچھ بارشیں ضرور برسا دیتی ہیں۔

مصر کی طرح عراق میں بھی جان مارشل کسی خاص علاقے کی کھدائی میں بذات خود مامور نہیں تھے اور نہ ہی شریک رہتے تھے مگر ان سے متعلق مشورے، تجزیے اور ان باقیات کی علمی تحقیقات میں مکمل مصروف بھی رہتے اور ہمہ طور پر شرکت بھی کرتے تھے۔ وہ کبھی لیونارڈ وولی کے پاس کبھی اطراف کے دوسرے آثار قدیمہ کی کھدائی کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ان کی کاموں میں شرکت کرتے اور آگے کے معاملات کی منصوبہ بندی بھی کرتے رہتے تھے۔ روسی اور میں بھی ان مصروفیات میں ہمیشہ ہی ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

عراق سے متعلق میں نے پہلے بھی جو کچھ سنا تھا وہ گذشتہ صفحات پر بیان کر دیا ہے مگر عراق کی باتیں ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھیں۔

بابل اور نینوا اس وادیٔ دجلہ و فرات کے دو قدیم شہر تھے۔ نینوا کی بستی 6000 سال قبل مسیح بھی آباد تھی اور 2000 سال قبل مسیح بھی یہ شہر اسیریائی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ یہاں اشتر دیوی کی پوجا کی جاتی تھی جو زرخیزی کی دیوی سمجھی جاتی تھی۔ کھیتوں کی ہریالی اور فصلوں کا بار آور ہونا سب اشتر دیوی ہی کا مرہون منت سمجھا جاتا تھا۔

دوسری طرف بابل کا شہر تھا جو کہ موجودہ بغداد کے جنوب میں آباد تھا اور دجلہ و فرات کے بیچ میں بسا ہوا تھا۔ قدیم عراق کا پہلا قانون بنانے اور نافذ کرنے والا ہیمورابی 1792 ق م سے 1750 ق م تک اسی ریاست کا حکمران تھا۔ اس کی عمر کا کچھ حصہ ابراہیمی زندگی کے قریب کا ہے۔ جب ابراہیمؑ اپنی عمر کے آخری حصے یعنی 1980 ق م سے 1800 ق م میں زندہ تھے۔ اس طرح

ان کے صرف آٹھ سال کے بعد ہیمورابی کا دور شروع ہوا تھا۔

جب شالدین سلطنت کے اسیریائی بادشاہوں نے نینوا کو چھوڑ کر بابل کو اپنا دارالحکومت بنایا تو پہلے اس کو فتح کرتے ہوئے انہوں نے اس کی دجلہ وفرات کے بند کو توڑ کر اسے مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا اور بعد میں پھر اسی بادشاہ نے جس نے بابل کو تباہ کر دیا تھا پھر اسے نئے سرے سے آباد کیا۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس نے یہاں مٹی کے تودے بنوا کر مصنوعی پہاڑیاں بنوائی تھیں اور ان پر باغات لگوائے جو یہاں کے معلق باغات کہے جاتے تھے اور ان کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ یہ معلق باغات کا محل ایک برطانوی ماہر آثار قدیمہ آسٹن ہنری لیارڈ (Austin Henry Liyard) نے 1850ء کے لگ بھگ دریافت کیا تھا جو Medes یعنی ایرانی خاندان کی ایک ملکہ کے لئے تعمیر کرائے گئے تھے۔

اسیریائی سلطنت کا ایک بڑا اور مشہور بادشاہ آشور نبی پال (Assurnabi Paul) بھی تھا جو 859 ق م سے 823 ق م تک نینوا سے عراق کی وادیوں پر حکومت کرتا رہا تھا۔

ایک دن جان مارشل نے ایک بار پھر مجھے اپنے ساتھ اینگر یو پٹمین کے گھر چلنے کی دعوت دی۔ انہوں نے بتایا کہ پٹمین کی فیملی بھی بغداد آ گئی ہے اور وہ لوگ اب تقریباً ایک سال تک یہیں قیام کریں گے۔ برطانیہ کے کچھ فوجی افسروں اور برطانوی سفارت خانے کے کچھ افسران نے جو پچھلے 7/8 سال سے یہاں مقیم تھے مل کر بغداد میں ایک چھوٹا سا کلب بھی بنالیا تھا اور وہ اکثر شاموں کو یہاں ٹینس کھیلتے تھے۔ کبھی برج کی پارٹیاں جمتیں اور کبھی کسی کی سالگرہ وغیرہ ہوتی تو ڈانس اور کچھ نا ؤنوش کا بھی اہتمام کرلیا جاتا۔ تو دراصل پروگرام یہی تھا کہ ہم لوگ پہلے پٹمین کے گھر جا کر اس کی فیملی سے ملیں گے اور پھر ڈنر اسی کلب میں کریں گے جہاں برطانوی اکثر جمع ہوتے رہتے تھے۔

پٹمین کی بیگم اور ان کی بیٹی جولی دونوں ہی برطانوی وضع قطع کے پڑھے لکھے لوگوں کی طرح تھے۔ گو وہ ہمارے خاندان سے واقف نہیں تھے کیونکہ میرے والد تو برمنگھم سے دور ایک گاؤں بائرن کے فارم ہاؤس میں رہتے تھے جب کہ یہ لوگ شہر کے رہنے والے تھے۔

ان سے لندن اور برمنگھم کی خوب باتیں ہوئیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں بھی آکسفورڈ ہی میں گریجویشن کرنے گیا تھا مگر ابھی تین سال کی تعلیم ہی مکمل کی تھی کہ جان مارشل کے ساتھ مصر آ گیا اور اب یہاں سے اگلے سال شاید برطانوی ہند کی طرف جانا ہو جائے کیونکہ اب جان مارشل بھی وہیں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جولی نے بھی آکسفورڈ ہی سے مشرق وسطیٰ کی قدیم تاریخ میں گریجویشن کیا تھا اور اس کا ارادہ اب وہیں سے ہی ڈاکٹریٹ کرنے کا تھا مگر کسے معلوم تھا کہ اب وہ آئندہ 12 سال

تک آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کرنے تو کیا واپس برطانیہ جانے کا بھی خواب نہ دیکھ سکے گی۔

ڈنر بہت اچھا تھا، کلب میں اور بھی کئی برطانوی افسران سے ملاقاتیں ہوئیں اور شام بہت اچھی گزری۔

چند دن کے بعد جان مارشل نے لیونارڈ وولی کو اینگر یو پٹمین کی فیملی کو پھر کلب میں کھانے پر مدعو کر لیا اور یہاں جولی نے خاص طور پر وولی کی ''اُر'' کی معلومات اور قدیم اسیریائی سلطنت سے متعلق ان کی مختلف جگہ کی گئی دریافتوں پر بہت دلچسپی کا اظہار کیا اور یہ محفل بھی رات 9 بجے تک جاری رہی۔ اسی دوران جان مارشل نے مصر میں اپنی پانچ سالہ مصروفیات کی کچھ باتیں بتائیں تو لازماً راسیس کی حنوط شدہ لاش کی دریافت کا سہرا میرے سر باندھا اور میں نے محسوس کیا کہ اینگر یو پٹمین کی بیگم اور خود جولی بھی میرے اس کارنامے سے بہت متاثر نظر آتے تھے۔ گو میری عمر اس وقت 26/27 سال ہی کی تھی مگر جان مارشل کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ میرا مرتبہ وولی اور خود جان مارشل کے برابر آ گیا ہے جو مجھ سے عمر میں 12/14 سال بڑے تھے۔

جولی اور اس کی والدہ کو لیونارڈ وولی کے اس ہال کو دیکھنے کی بہت دلچسپی تھی جہاں پر مختلف کھنڈرات سے نکالی ہوئی اشیاء ابتدائی مطالعے اور تجزیے کے لئے وہاں رکھی جاتی تھیں۔ سو یہ طے پایا کہ میں تین دن کے بعد 9 بجے صبح ان دونوں کو لے کر پہنچ جاؤں اور پھر 12 بجے تک وولی ان کو وہاں سے نکالی ہوئی اشیاء دکھائیں اور ان سے متعلق معلومات بھی فراہم کریں۔

اس دن میں نے محسوس کیا کہ جولی کی قدیم عراقی تاریخ سے دلچسپی اور معلومات خاصی وسیع ہیں اور اس معاملے میں اس کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ وہ وولی سے ان قدیم اشیاء کی معلومات تو حاصل کر رہی تھیں مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ قدیم تاریخ عراق پر بہت عالمانہ گفتگو بھی کر سکتی ہے۔ اس کا علم بھی بہت بڑھا ہوا تھا۔ واپسی پر اینگر یو پٹمین کی بیگم نے مجھے لنچ پر روک لیا اور وہ اور جولی مجھ سے اہرام مصر کے واقعات اور فرعون کی لاش کا پورا قصہ سن کر رہیں۔ گو میں سارجان میں روحوں سے معرکوں کی تمام تفصیل گول ہی کر گیا تھا مگر پھر بھی وہ اس دریافت سے مجھے بھی میرے قد سے کچھ زیادہ ہی اونچا سمجھنے لگی تھیں۔

یہ بالکل اتفاق ہی تھا کہ لیونارڈ وولی نے موصل کے قریب واقع نینوا کے کھنڈرات کے قریب کی کھنڈر بستیوں کی کھدائی سے ان کی عبادت گاہوں کی بنیاد پر پہنچ کر دو مجسمے حاصل کر لئے تھے۔ ایک تو اُر بو (Ur Bau) کے بادشاہ کا مجسمہ تھا جو غالباً 2800 قبل مسیح کا تھا اور دوسرا اُرنمو (Ur-Nammu) کے بادشاہ کا تھا جو 2100 ق م کا تھا اور یہ دونوں مجسمے وہ اسی ہفتے موصل سے بغداد لے آئے تھے۔ یہ تازہ ترین دریافت تھی۔ چنانچہ وولی کو اس دریافت پر اور ان کی پچھلی عظیم

الشان دریافتوں کی خوشی میں برطانوی افسران کے کلب نے طے کیا کہ وہ لوگ وولی کو اپنے کلب بلا کرایک ڈنرڈانس پارٹی کا اہتمام کریں گے اور ہر افسر اپنی اپنی طرف سے ان کو کوئی تحفہ بھی دے۔ چنانچہ جولی سے ملنے کا ایک اور موقع نکل آیا۔

اس پورے ایک ماہ میں، میں نے کئی بار جولی سے متعلق کافی سوچ بچار بھی کیا تھا۔ وہ میری طرح ایک لمبے قد کی خوبصورت لڑکی تھی۔ آکسفورڈ سے قدیم مشرق وسطیٰ کی تاریخ کی گریجویٹ تھی۔ اس کا باپ برطانوی فوج میں بریگیڈیئر جنرل تھا اور جتنی مرتبہ بھی میں اس سے ملا تھا اس کی آنکھوں میں، میں نے اپنے لئے کبھی کوئی منفی تاثر نہیں پایا تھا۔

کھانے سے قبل لیونارڈ وولی کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کے لئے تقاریر ہوئیں اور ان کی تحقیقی خدمات کو بہت سراہا گیا اور جواب میں انہوں نے بھی مختلف عراقی بستیوں میں پچھلے چند سالوں میں جو کھدائیاں کی تھیں ان کا مختصر احوال بیان کیا اور خصوصاً ڈھائی تین ہزار سال قبل مسیح کے جن کھنڈرات کا ذکر کیا ان میں یہ بستیاں بھی شامل تھیں۔

کش (Kish)، اُرک (Uruk)، سی پار (Sippar)، اکشاک (Akshak)، لاراک (Larak)، نپر (Nippur) اداب (Adab)، اُماہ (Ummah)، لاگاش (Lagash)، بدطبرہ (Bad Tibira) اور لارسا (Larsa) وغیرہ کے مقامات اور وہاں سے جو باقیات حاصل ہوئی تھیں ان کا ذکر بھی کیا۔

ڈانس فلور پر مختلف برطانوی جوڑے رقص میں مصروف تھے۔ جولی کو بھی دو نوجوان رقص کی دعوت دے چکے تھے۔ اینگریو ہمین بھی ایک دو خواتین کے ساتھ رقص کر چکے تھے۔ جولی اور میں ایک ہی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی ایک دو پیگ پی چکا تھا۔ بات کرتے کرتے میں نے گویا اچانک ہی اس کو رقص کا پارٹنر بننے کی دعوت دے ڈالی۔ جولی تو جیسے اسی کی منتظر تھی۔ ہم ڈانس کرنے لگے۔

میرا تو ڈانس فلور کا کچھ ایسا تجربہ نہ تھا مگر اس کے قدم بڑے نپے تلے اٹھتے تھے اور پھر اسی محتاط انداز میں واپس جمتے بھی تھے۔ موسیقی کی ہلکی ہلکی دھنیں ابھرتی اور ڈوبتی تھیں اور فلور کی لائٹیں بھی الگ الگ رنگوں میں جل بجھ کر قوس قزح بنا رہی تھیں۔ جولی میرے کندھے پر اپنا سر ٹکائے ہوئے نیم خمار آلودگی اور نیم سرمستی میں میرے ساتھ ہوا کے جھونکوں کی طرح ہلکورے لے رہی تھی۔ ماحول بہت طلسماتی، خوابناک اور افسانوی ہو رہا تھا۔

ایک ہلکا سا قدم لیتے ہوئے میں نے جولی کے کان میں سرگوشی کی:

"___ جولی! مجھ سے شادی کرو گی"؟

شایداس کے لئے یہ جملہ ذرا غیر متوقع تھا۔اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:

''جان میلکم! تم دو پیگ پی چکے ہو۔سوبر (سنجیدہ) نہیں ہو۔یہ بات پھر کبھی ہوش میں آ کر کرنا''۔

اب ایکدم میرا جوان برطانوی خون جیسے ابل پڑا اور یہ جو انکار تھا نہ اقرار، میرے پورے وجود کو تلملا کر بیدار کر گیا۔

''تم سے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک میں نے تمہارے متعلق تمام تر سنجیدگی ہی سے سوچا ہے اور اپنی عقل اور اپنے جذبات کے ساتھ ہی یہ درخواست کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ہاں! اگر تم اور وقت لینا چاہو تو اس کا تمہیں حق حاصل ہے۔میں انتظار کروں گا''۔

اس نے کہا:

''____ تمہارے ساتھ پہلی ملاقات میرے لئے ہمیشہ ایک نہ بھولنے والا واقعہ تھا اور مجھ پر بھی اس کا ایسا ہی اثر ہوا تھا۔پھر تمہاری عادات، اخلاق اور پوری شخصیت بھی میرے لئے مسحور کن بنتی گئی ہے''۔

اور پھر ایک ماہ کے بعد میں نے اپنے ماں باپ کو ایک تار بھیجا:

''برمنگھم میں رہنے والے ایک خاندان کی بیٹی جولی سے میں نے 7 ستمبر 1907ء کو بغداد میں شادی کر لی ہے____''۔

گیارہواں باب

عراق سے روانگی

ہم لوگ عراق کی گرمیاں گزار چکے تھے اور اب ستمبر 1909ء کا مہینہ بھی گزر چکا تھا اور سر جان مارشل اب ہندوستان واپس لوٹنے کے لئے اپنے دوستوں سے الوداعی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ چند دنوں سے میں روسی کے رویے میں ایک واضح تبدیلی دیکھ رہا تھا۔ غائب الدماغ اور مضطرب! جیسے اسے کسی کا انتظار ہو یا وہ اپنے لئے کچھ فیصلے کر رہا ہو یا کسی بڑے خطرے کو بھانپ رہا ہو۔ مگر وہ ہر وقت میرے قریب ہی رہتا تھا بالکل اسی طرح جیسے کوئی باڈی گارڈ ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

ایک دن جب سر جان مارشل اور وولی کے ہمراہ میں اور روسی دونوں ہی ان کے ''اُر'' کے کھنڈر میں موجود اس بڑے ہال کے باہر کھڑے ہوئے کچھ باتیں کر رہے تھے اور چند مزدور زمین سے نکالے ہوئے ملبے کی ٹوکریاں لالا کر انہیں اندر میزوں پر الٹ رہے تھے کہ آٹھ دس عراقی اپنے گھوڑوں پر سوار ہمیں اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ یہ لوگ ہمارے قریب پہنچ کر گھوڑوں سے اتر گئے اور ہمارے مزدور جو ملبے کی ٹوکریاں اٹھائے ہال کے اندر آ جا رہے تھے ان سے تیز تیز لہجے میں کچھ گفتگو کرنے لگے۔

ان لوگوں کی تند و تیز گفتگو سن کر مزدوروں کا سپروائزر جو چند ماہ سے لیونارڈ وولی کے ماتحت کام کر رہا تھا اور کچھ انگریزی بھی جانتا تھا وہ بھی کھدائی والے گڑھوں سے نکل کر ادھر ہی آ گیا تھا۔ وہ بھی ان کے تند و تیز جملوں کے جواب دینے میں شریک ہو گیا۔ آنے والے ایک عراقی نے جیب سے ایک چھوٹا سا تھیلا نکالا اور اس میں سے ایک کاغذ نکال کر اس سپروائزر کو دکھایا۔ جس نے کاغذ دیکھ کر بھی اسے چپ کرانے کی کوشش کی مگر اس عراقی کا رویہ جارحانہ ہو رہا تھا اور پھر وہ سب کے سب ہال کے اندر گھسنے کے لئے آگے بڑھے۔

لیونارڈ وولی اور روسی دونوں ایکدم ان کے سامنے آ کر دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو گئے

اور سپروائزر سے پوچھا کہ: ''کیا معاملہ ہے''؟

اس نے بتایا کہ:

''یہ عراقی کسی سیاسی جماعت کا کوئی کارکن ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس علاقے کی ساری زمین اس کی اور اس کی باپ دادا کی موروثی ملکیت ہے اور یہاں جو کھدائی ہو رہی ہے وہ سب اس کی اجازت کے بغیر ہو رہی ہے۔ اس نے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ اس زمین سے سونے کے زیورات اور پرانی قیمتی اشیاء غیر قانونی طور پر نکالی جا رہی ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ اس ہال کو اس کی تمام چیزوں کو اور کھدائی والے خطے کو اپنے قبضے میں لینا چاہتے تھے۔ اس کے پاس اس زمین کی ملکیت کے کاغذات بھی موجود ہیں''۔

وولی نے اس کو بتایا کہ:

''حکومت عراق کی جانب سے ان کے پاس کھدائی کرنے کے اجازت نامے تو موجود ہیں مگر زمین کی ملکیت کے بارے میں انہیں کوئی علم نہیں ہے''۔

اب ان عراقیوں کو لاکھ سمجھایا جا رہا تھا کہ یہاں سے نہ کوئی خزانہ نکالا جا رہا ہے اور نہ ہی سونے کے زیورات یہاں سے ملے تھے مگر ان کا بس یہی اصرار تھا کہ:

''وولی اور ان کے تمام کارندے، مزدور اور ہال کے اندر چیزیں اکٹھا کرنے والے سب کے سب فوراً کام چھوڑ کر وہاں سے نکل جائیں اور آئندہ ان کی اجازت کے بغیر ادھر کا رخ نہ کریں''۔

وہ لوگ بار بار ہال کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور نوبت اب ہاتھا پائی تک آ گئی تھی۔ اب سر جان مارشل بھی آ گئے تھے اور انہوں نے اسی سپروائزر کے ذریعے ان لوگوں سے بات کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ تمام کام ابھی اسی وقت روک دیا جائے گا اور ہال کے دروازوں پر تالے ڈال دیئے جائیں گے، ایک تالا ان لوگوں کا اور دوسرا وولی کا اور ایک ہفتے تک نہ ان کا اور نہ ہی وولی کا کوئی بھی شخص یہاں آئے گا۔ اس دوران میں حکومت کے متعلقہ محکموں سے بات چیت کر کے اس معاملے کا کوئی حل نکال لیا جائے گا۔

بڑی مشکل سے وہ لوگ اس مصالحت پر راضی ہوئے تھے بعد میں اس سپروائزر نے بتایا کہ:

''زمین کا یہ مالک پچھلے کئی ماہ سے اس سے ایک باقاعدہ رقم وصول کرتا رہا تھا اور اسی لئے کسی بھی قسم کی کوئی دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ مگر اب وہ اس رقم کو دوگنا یا اس سے بھی زیادہ کرنا چاہتا تھا''۔

لیونارڈ وولی اور سر جان مارشل اس قسم کے جھگڑوں اور قضیوں کا کئی اور مقامات پر کھدائی کے دوران سامنا کر چکے تھے اور یہاں کے جاہل عوام کی ذہنیت سے خوب واقف تھے۔
اس کا حل عموماً یہی ہوتا تھا کہ اگر اس ضلع کی انتظامیہ کھدائی کرنے والوں کی مدد کرنا مناسب سمجھتی تھی تو وہاں اپنی پولیس کی ایک عارضی چوکی بنا کر ان کی حفاظت کے لئے وہاں تین چار سپاہیوں کو تعینات کر دیتی تھی اور زمین کے مالک کے کچھ آدمیوں کو بطور مزدور رکھ کر ان کا ماہانہ مقرر کر دیتی تھی۔
اس دن ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ روسی جو اتنے عرصے یعنی تقریباً 10 سال سے ہمارے ساتھ تھا اور عموماً کسی بھی گفتگو میں نہ شرکت کرتا تھا اور نہ ہی زیادہ بولتا تھا، اب مصری اور عراق کی عربی زبان خوب اچھی طرح جان گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک طرف الگ لے جا کر بتایا کہ:

"یہ عراقی تو ابھی واپس چلے گئے ہیں مگر آپس میں عربی میں بات کر رہے تھے کہ وہ اپنے مطالبات منوانے کے لئے مجھے اغوا کر کے لے جائیں گے۔ انہوں نے آپس میں عربی میں یہ بات بھی کی تھی کہ اگر یہاں حکومت کے سپاہی آ بھی گئے یا انہوں نے ان کے حق ملکیت کو تسلیم نہ کیا یا اس زمین کی کھدائی سے ان کو کوئی فائدہ یا رائلٹی دینی طے نہ کرائی تو وہ نہ صرف مجھے مستقل روپوش رکھیں گے بلکہ قتل بھی کر دیں گے"۔

یہ روسی کے لئے بہت پریشانی کی بات تھی۔
جب میں نے یہ بات سر جان مارشل کو بتائی تو انہوں نے اسی دن مجھے برطانوی سفارتخانے منتقل کرا دیا اور برطانوی سفیر نے وولی کے معاملے کو بغداد کی عثمانی حکومت کے گورنر کے ساتھ ہنگامی طور پر حل کر درخواست کی۔
میں اس سفارتخانے سے ایک ہفتہ تک بالکل بھی باہر نہ نکلا اور اپنا زیادہ تر وقت سفارت خانے کے اخبارات، رسالے پڑھ کر یا لائبریری میں ہندوستان سے متعلق کتابیں پڑھ پڑھ کر گزارتا رہا۔ روسی نے بھی میری طرح باہر آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ برطانوی سفیر کی مدد سے زمین کی کھدائی کا وولی کا مسئلہ حل کر دیا گیا تھا اور اس زمین کی رائلٹی اسی عراقی کو دی جانی بھی طے کر لی گئی تھی اور دوسری طرف برطانوی سفارتخانے کی مدد سے ایک برطانوی بحری جہاز وکٹوریا میں بمبئی کے لئے ہماری 28 نومبر 1909 کی نشستیں بھی مخصوص کرائی جا چکی تھیں۔

بارھواں باب

بصرہ سے بمبئی تک

22 نومبر 1919ء کو ہمارا جہاز وکٹوریہ (Victoria) صبح سویرے ہی بندرگاہ سے نکلا۔ اس فیری نما جہاز میں تقریباً 200 مسافر سوار تھے، جن میں کچھ تو ایرانی تاجر تھے اور کچھ ہندوستان کے سندھی ہندو تھے اور کچھ پارسی بھی جو ہندوستان جا رہے تھے مگر زیادہ تر برطانوی ہند کے وہ ملازمین تھے جو اپنی چھٹیاں گزار کر واپس جا رہے تھے اور انہیں بمبئی سے فوراً دہلی روانہ ہونا تھا۔ آبنائے ہرمز کے مشرقی کناروں پر چلتا ہوا ہمارا جہاز جو غالباً 10 ناٹیکل میل یعنی قریباً 12 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا اور دوڈھائی دن کی مسافت کے بعد جا کر ایران کی بندرگاہ بندر عباس جا پہنچا۔ یہاں کچھ ایرانی مسافر اتر گئے تھے اور جہاز نے کھانے پینے کی اشیاء جمع کیں، ایندھن بھی لیا۔ یہاں ہم تین دن رکے رہے۔

ایران میں ان دنوں احمد شاہ قاچار کی حکومت تھی، جس کا وزیر اعظم مرزا حسن خان اشتیانی المصطفوی تھا۔ یہ نوجوان بادشاہ 21 جنوری 1898ء کو پیدا ہوا تھا اور ابھی صرف 12/13 سال کا نوجوان ہی تھا مگر ایرانیوں میں اس کی ساکھ کچھ اچھی نہ تھی۔ وہ بہت تنگ مزاج اور خود غرض قسم کا شخص سمجھا جاتا تھا۔ جہاز کے بندرگاہ سے نکلنے سے پہلے ایران کی کسٹم پولیس نے اس جہاز کا سرسری سا معائنہ کیا اور اسے بندرگاہ چھوڑنے کی اجازت دیدی۔ حالانکہ اگر وہ ایک گہری تلاشی لیتے تو ان کو اس مسافر جہاز میں برطانیہ سے آنے والے اسلحے کی پیٹیاں بھی نظر آ جاتیں جو ہندوستان بھیجی جا رہی تھیں۔ ایسی صورت میں شاید اور پھر شاید ہمارا جہاز بندر عباس سے نکل ہی نہ پاتا۔

یہ ضرور ہے کہ یہ دور برطانوی اقتدار کے عروج کا دور تھا اور ایران جیسی معمولی سی بادشاہت نہ برطانیہ سے کوئی جھگڑا مول لے سکتی تھی اور نہ ہی کسی تنازع میں الجھنا اس کے لئے سودمند ہوتا۔ مگر کسٹم کے اصولوں کے مطابق اسلحہ لے جانے والے ہر جہاز کو اپنے ہتھیاروں اور ہر قسم کے آتش

گیر مادے والی چیزوں کا بتانا ضروری ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ مسافر جہاز بھی کئی ہفتوں کے لئے لنگر انداز رکھا جا سکتا تھا اور پھر یہ تو ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ خلیجی ریاستوں کی کمزوری اور عمومی غفلتوں کی وجہ سے برطانوی حکومت نے یہ طریقہ عام طور پر ہی اپنا لیا تھا کہ وہ اپنے ہر مسافر جہاز میں اور ہر مال بردار جہاز میں بھی کچھ نہ کچھ اسلحہ ضرور اپنے مقبوضات کی افواج کے لئے بھیجتی رہتی تھی۔

بندر عباس سے ہمارے جہاز کو نکلے ہوئے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ چیف انجینئر نے کپتان جیمس ہارلے (James Harley) کو کسی خرابی کی اطلاع دی اور شکر ہے کہ یہ خرابی انجن روم میں نہیں ہوئی تھی بلکہ جہاز کے اطراف میں جو پندرہ سولہ حفاظتی کشتیاں (Life Boats) رسیوں سے لٹکی ہوئی تھیں ان کے لوہے کے ہک کھل کر ٹوٹ گئے تھے اور ان کی رسیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں۔ جس کی وجہ سے یہ کشتیاں سمندر میں گرنے کے بالکل ہی قریب تھیں۔ یہ رسیاں سمندر کی موجوں سے جہاز کے اوپر نیچے ہچکولے (Tossings) کھانے کی وجہ سے ٹوٹ گئی تھیں اور کئی کشتیوں کے تو تختے بھی نکل گئے تھے۔

جہاز کے چیف انجینئر نے جب یہ اطلاع جہاز کے کپتان جیمس ہارلے کو پہنچائی تو انہوں نے فوری طور پر عارضی قیام کے لئے اور Shelter لینے کے لئے اس کا رخ چاہ بہار کی طرف موڑ دیا اور بندرگاہ میں آنے کی اجازت لی۔ یہ ایک چھوٹی سی پورٹ تھی مگر خوش قسمتی سے ہمارا جہاز بھی صرف 140 فٹ ہی لمبا تھا اور اس طرح 20/25 فٹ گہرے پانی میں بھی اس کا Bow پہنچایا اور ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

چنانچہ کم گہری یعنی Shallow بندرگاہ ہونے کے باوجود ہم یہاں چاہ بہار کی بندرگاہ میں چار دن رکے رہے تھے اور جب تک ہماری ساری کشتیاں اور ان کے تمام ہک اور رسیوں کے بندھن اور ایک ایک چیز ٹھیک نہ ہو گئی جیمس ہارلے نے آگے جانے کی ذمے داری نہیں اٹھائی۔ ہم لوگوں نے پہلا سارا دن تو پناہ لینے کی خاطر رکے ہوئے جہاز کی حیثیت سے گزارا۔ مگر عموماً ہنگامی قیام کی مدت ایک یا دو دن سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ پھر ہمیں ایرانی بندرگاہ کے افسران کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ہمیں ہنگامی پناہ لینے کی ضرورت اور قیام کی مدت کیوں بڑھ گئی ہے۔ چونکہ نومبر کے مہینے میں سمندر نسبتاً پرسکون اور بڑا نرم رو اور غیر طوفانی بھی ہوتا تھا اور ایسی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی کہ ہم یہاں پناہ (Shelter) لینے کے لئے زیادہ دن ٹھہریں رہیں۔

اس لئے ہمارے کپتان نے بندرگاہ کے عملے کو اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا اور انہیں ٹوٹی ہوئی کشتیوں کا معائنہ بھی کرایا اور اس طرح ہمیں جہاز کی اضافی کشتیوں کی مرمت ہونے تک

وہاں بندرگاہ میں رکنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔اسی لئے ہم وہاں چار دن تک رکے رہے تھے۔

ہماری اگلی منزل سے اب برطانوی مقبوضات یعنی ہندوستان کی بندرگاہیں شروع ہو رہی تھیں اور ہم آزادی سے بمبئی تک کا سفر باآسانی طے کر سکتے تھے۔چاہ بہار سے یہ جہاز جیوانی، گوادر، پسنی وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی مچھلی بندرگاہوں (Fish Ports) پر چند گھنٹوں کے لئے ٹھہرتا ہوا آگے بڑھ جاتا تھا۔ان بندرگاہوں میں خشکی سے چند سو گز دور 15/20 فٹ گہرے پانی میں ہمارا جہاز رکتا تھا وہاں بھی اپنے لئے ساحلی گاؤں سے جہاز تک یہ لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں مچھلیاں بھر بھر کر ہمارے جہاز تک لے آتے تھے اور اسے بیچ کر نقد رقم وصول کرتے تھے۔یہ مچھلیاں بالکل تازہ تو نہیں ہوتی تھیں مگر ان کا ذائقہ بے حد اچھا ہوتا تھا اور پھر ان کے ساتھ ہی ہمیں کیکڑے (Crabs) اور بڑے سائز کے جھینگے (Prawns) بھی مل جاتے تھے۔کبھی کبھی ان مچھلیوں کے ساتھ لوگ بادام، انار اور کھجوروں کی بوریاں بھی ساحل کے علاقوں سے اس جہاز تک لے آتے تھے تو ہمیں اچھے خشک میوے اور تازہ پھل بھی مل جاتے تھے۔

یہاں سے آگے اب ایک نسبتاً بڑی بندرگاہ کراچی آنے والی تھی۔جیمس ہارلے کو یہاں بھی کچھ اسلحہ اتارنا تھا اور تین دن کے لئے یہاں رکنا بھی تھا۔ابھی ہم کراچی سے 20 میل دور تھے کہ ہمیں اس کی بندرگاہ کے Light House کا مینار روشنی پھینکتا ہوا نظر آنے لگا۔

سر جان مارشل اس علاقے سے کافی واقفیت رکھتے تھے اور وہ یہاں کی تاریخی معلومات ہمیں بتاتے رہتے تھے۔ان ہی کی اطلاعات کے مطابق ہمیں معلوم ہوا کہ یہ بندرگاہ بمبئی سے ملحق ایک ساحلی علاقے کی ہے جسے سندھ کہا جاتا ہے۔سندھ کا یہ علاقہ 1845ء میں انگریزوں کے ایک علاقائی فوجی جنرل چارلس نیپئر نے وہاں کے راجاؤں سے جنہیں ''میر'' کہا جاتا تھا، ایک جنگ کر کے فتح کیا تھا۔یہ جنگ میانی کی جنگ کہلاتی تھی اور پھر اسی علاقے کا سروے کر کے ہمارے برطانوی انجینئرز نے حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس بندرگاہ کو بڑی پورٹ کے طور پر استعمال کرنا چاہئے کیونکہ اس علاقے میں اگر ریلوے لائن بچھائی جائے اور اس کو اگر اس کے پس پشت علاقے Hinter Land پنجاب اور شمال مغربی صوبے سے بھی منسلک کر دیا جائے تو وسطی ہند سے تجارتی سامان پر جو سفر خرچ بمبئی کی بندرگاہ تک لانے میں خرچ ہوتا ہے اسے کم کیا جا سکتا ہے۔

اسی لئے برطانوی حکومت نے 1860ء میں یہاں نارتھ ویسٹرن ریلوے لائن کا جال بچھا دیا۔جس کو ایک طرف پنجاب سے سندھ کے اس ساحلی شہر کراچی تک ملا دیا گیا اور دوسری طرف اسی ریلوے کے شمالی حصے کو افغانستان سے، ملحقہ شہر پشاور تک پہنچا دیا گیا۔پشاور سے آگے افغانستان

تک اپنی حدود وسیع کرنے کے لئے برطانوی حکومت 1850ء میں اور اس کے بعد بھی افغانستان کے علاقے میں فوجیں بھیج چکی تھی مگر یہاں کے پہاڑی علاقوں میں افغانیوں کی بے ضابطہ مگر بے حد تجربہ کار فوج نے اور ان کے قبائلی دستوں نے انہیں بری طرح شکست سے دوچار کر دیا تھا۔

کراچی کی بندرگاہ سے کپاس، تیل، چمڑہ، گندم، اون اور کھانے پینے کی کافی اشیاء برطانیہ کے کارخانوں میں پہنچائی جانے لگی تھیں اور یہاں تک کہ 1887ء میں برطانوی حکومت نے کراچی بندرگاہ کا قانون 1887ء (Karachi Port Act 1887) جاری کر دیا تھا۔

اس قانون اور اس ریلوے لائن کے بچھانے سے اس پورے علاقے میں تجارتی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں بلکہ علاقے کے پارسی اور سندھی ہندو یہاں کی تجارت میں برطانیہ کے سرمایہ داروں کے بھی مال سپلائی کرنے میں انگریزوں کے شریک کار بن چکے تھے۔ سرجان مارشل نے بتایا تھا کہ سندھ کے جس شہر لاڑکانہ کے قریب وہ کھدائی کرنا چاہتے ہیں وہ اسی بندرگاہ کے قریب واقع ہے۔

کراچی میں قیام کے بعد ہمارا رخ اب جونا گڑھ کی طرف ہوا اور وہاں کی بندرگاہ دوارکا سے نکل کر ہمیں اپنی آخری منزل بمبئی تک پہنچنا تھا۔ یعنی اب ہمیں کہیں رکنا نہیں تھا اور دوارکا کی بندرگاہ سے کوئی تین سو میل دور ہی سے سمندر ہی سمندر میں آگے بڑھتے ہوئے ہمیں بمبئی پہنچ جانا تھا جو ہماری منزل تھی۔ حالانکہ نومبر کے اس ماہ میں موسم کبھی شاذونادر ہی طوفانی یا Stormy ہوتا تھا مگر جب ہم دوارکا سے کوئی 100 میل دور تھے تو جہاز کے اندر ہمیں کچھ افسروں کی اچانک بھاگ دوڑ کا احساس ہوا۔ جہاز کا عملہ تیزی سے ادھر سے ادھر آ جا رہا تھا۔ دو ایک آفیسر نے وہ چھوٹی چھوٹی کشتیاں جو بطور Life Boats جہاز کے دونوں اطراف لگی ہوئی تھیں ان کو چیک کرنا شروع کیا۔ پھر مسافروں کے معلوم کرنے پر انہوں نے بتایا کہ:

> ''جہاز کے عملے کو 80 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آندھی آتی ہوئی نظر آ رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی شدید بارش کا بھی خدشہ ہے۔ ان تیز ہواؤں اور تیز بارش سے 12 سے 14 فٹ تک کی لہریں اٹھیں گی جو جہاز کو بڑے ہچکولوں سے دوچار کریں گی''۔

سب کو تیار رہنے اور چوکنہ ہونے کی وارننگ دے دی گئی اور سب لوگ ہی گویا خطرے سے نمٹنے کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔

دن کے بارہ بجے ہمیں اس طوفان کی آمد کی اطلاع ملی اور دو بجے دوپہر تک ہم اس بڑے طوفان کی مکمل زد میں آ چکے تھے۔ بارش بہت شدید تھی اور ہر طرف گہرے سیاہ بادل چھا چکے تھے۔ دن رات میں بدل گیا تھا اور جہاز بڑی موجوں پر اس طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا جیسے جھولا جھلایا جا رہا

ہو یا جیسے ایک کاغذ کی کشتی کو بار بار ایک کونے سے اٹھا کر سیدھا کھڑا کر دیا جائے اور پھر دوسرے کونے سے دوبارہ پھر اسی طرح سیدھا نوے ڈگری کے زاویے پر لے آیا جائے۔

مسافروں میں افراتفری تھی۔ ہندوستانی کبھی اللہ اللہ کبھی رام رام پکارتے تھے۔ انگریزوں کے ہاں سے صرف جی سیس جی سیس (Jesus, Jesus) کی آوازیں آرہی تھیں۔ جہاز کا کیپٹن جیمس ہارلے پریشان تو ضرور تھا مگر اس نے اپنے حواس بحال رکھے ہوئے تھے اور نہایت ہی وقار، بہادری اور اعتماد کے ساتھ اپنے پورے عملے کو ہدایات جاری کرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ایک مرتبہ ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے سرجان مارشل کو مخاطب کر کے ہمت دلاتے ہوئے کہا:

"آپ لوگ حوصلہ رکھیں۔ میں نے ایسے کئی طوفانوں کا پہلے بھی سامنا کیا ہے۔ فرانس اور اسپین کے درمیان ایک بندرگاہ بسرے (Bisray) نام کی ہے جہاں اکثر ایسے ہی بڑی بڑی موجوں کے طوفان آتے جاتے ہیں۔ میں کئی بار بحر روم کی طرف آتے جاتے اس بندرگاہ سے گزرا ہوں، یہ موجیں ہمارے جہاز کو ڈگمگا تو سکتی ہیں مگر ہم اس سے جلد ہی باہر نکل جائیں گے"۔

مسافروں کا سامان جہاز کے ہچکولے کھانے سے کبھی ایک طرف لڑھکتا تھا کبھی دوسری طرف اور بعض لوگ بھی ادھر اُدھر گرے ہوئے تھے۔ جہاز میں کئی جگہ Sea Sickness کی وجہ سے لوگ الٹی اور متلی کرتے ہوئے نظر آرہے تھے اور اکثر جگہ قے کی غلاظت بکھری پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جہاز ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ رہا ہے حالانکہ اسی کے انجن اسی رفتار اور پاور سے چل رہے تھے مگر بڑی بڑی موجیں اس کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی تھیں۔ تین چار گھنٹے تک یہی صورتحال چلتی رہی۔

رفتہ رفتہ بارش میں کمی آئی۔ سیاہ بادل بھی چھٹنے لگے اور جہاز کا ڈگمگانا بھی کچھ کم ہوا مگر پورے جہاز میں ہر جگہ الٹیوں اور متلی سے بھری سیٹیں، فرش اور گلیاں غلاظت کی بدبو پھیلا رہی تھیں۔ آخر کار جہاز کے مزدوروں نے کپڑے، جھاڑو اور کچھ چھڑکنے والی دواؤں سے اسے صاف کرنا شروع کیا تو ماحول میں کچھ بہتری آئی۔ پوری شام اور آدھی رات اسی ہنگامے میں گزر گئی اور صبح ہوتے ہوتے ہمارا جہاز وکٹوریہ دوارکا سے نکل کر بمبئی کی طرف پھر سے گامزن ہو گیا اور اگلی صبح رات کے تین بجے ہمیں بمبئی کی بندرگاہ کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

تیرھواں باب

برطانوی حکومت کا دارالحکومت دہلی

بمبئی سے دہلی پہنچ کر جان مارشل سب سے پہلے وائسرائے کے ملٹری سیکریٹری سے ملے اور مل کر وائسرائے سے ملنے کا وقت مانگا۔ جو تیسرے دن صبح گیارہ بجے کا طے ہوا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر وائسرائے لاج کے استقبالیے میں پہنچے اور پھر مجھے وہیں بٹھا کر اندر چلے گئے۔

بمبئی سے ہم نارتھ ویسٹرن ریلوے ہی کے ذریعے دہلی تک پہنچے تھے۔ یہ سفر صبح دس بجے سے شروع ہو کر رات بھر جاری رہا تھا۔ پھر اگلی شام کو پانچ بجے ہم دہلی پہنچ گئے۔ ہندوستان کو میں جتنا بھی ٹرین سے دیکھ سکا وہ مجھے سرسبز وشاداب اور صاف ستھرا نظر آیا۔ اس پورے ملک کی آبادی اس وقت (1910ء میں) کوئی 25 کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ یعنی ہمارے برطانیہ کی کل آبادی ڈھائی کروڑ سے کوئی 10 گنا زیادہ اور ہمارے ملک کا پورا رقبہ اس کے صرف ایک صوبے بنگال سے بھی چھوٹا تھا۔ جس کے ابھی چند سال قبل حکومت برطانیہ نے دو حصے کر کے مشرقی اور مغربی بنگال میں دو الگ الگ انتظامی یونٹس میں بانٹ دیا تھا۔

وائسرائے کے ملٹری سیکریٹری سے یونہی تھوڑی بہت گپ شپ سے اندازہ ہوا کہ بظاہر تو یہ ملک بہت پرسکون لگتا ہے مگر اندر ہی اندر سے بہت ساری سیاسی سرگرمیوں کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ جیسے عراق میں ہم لوگ عربوں کو قسطنطنیہ کی عثمانی سلطنت کے خلاف بھڑکا کر ابھار رہے تھے تو اسی طرح یہاں بغیر کسی بیرونی مداخلت کے ایسی ہی ایک تحریک جو ابھی صرف داخلی آزادی (Home Rule) کی حد سے آگے نہیں بڑھی تھی وہ سر اٹھا رہی تھی۔ اس میں ایک طرف تو مسلمان تھے جو پچھلے 900 سال سے ہندوستان پر حکومت کر کے اب بے دخل کر دیئے گئے تھے۔ ان کا اقتدار ہم نے 1857ء ہی میں ختم کر دیا تھا اور دوسرے وہ ہندو تھے جن کو خود ہم نے ہی مسلمانوں کے مقابلے میں آگے بڑھایا تھا وہ بھی اب آہستہ آہستہ ہمارے خلاف سر اٹھانے لگے تھے۔ گو ان دو

نوں یعنی ہندواور مسلمانوں کی تحریکیں ابھی ابتدائی مراحل ہی میں تھیں مگر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جیسا ایک بڑا طوفان ہم دوارکا کی بندرگاہ کے قریب ابھی دیکھ آئے تھے ویسا ہی ایک سیاسی خلفشار یہاں بھی دور سے آتا دکھائی دے رہا تھا۔

سر جان مارشل کے وائسرائے کے آفس میں داخل ہونے کے کوئی 30 منٹ بعد مجھے بھی اندر بلالیا گیا۔

وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ جو میرے سامنے تھے یہ پچھلے سال ہی لارڈ کرزن کے جانے کے بعد یہاں وائسرائے کے طور پر تعینات ہوئے تھے، تمکنت اور خوداعتمادی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ انہوں نے بہت ہی مختصر الفاظ میں مجھ سے کیمبرج کی تعلیم اور مصر وعراق کے بارے میں اور کچھ عرصے کام کے متعلق سوالات کیے اور پھر کہا:

''جان مارشل نے مجھ سے آپ کا تذکرہ بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے اور اسی حوالے اور مناسبت سے میں آپ کو فوری طور پر حکومت برطانیہ کے محکمہ آثار قدیمہ میں تین ماہ کے لئے جان مارشل کا اسپیشل ریسرچ اسسٹنٹ مقرر کرنے کے احکامات جاری کر رہا ہوں۔ مگر Special Resrearch Assistant مقرر کئے جانے کی باقی کارروائی متعلقہ محکمہ مالیاتی امور اور وزارت کلچر پوری کرے گی جو میرا کیس دیکھنے کے بعد اس پر اپنے ریمارکس لکھ کر اس کو اپنے محکموں میں بھیجیں گے''۔

گویا یہ میری عارضی تعیناتی تھی اور مستقل تعیناتی اور ملازمت کا انحصار میرے بارے میں آنے والے متعلقہ محکموں کے ریمارکس پر تھا۔ بہرحال عراق میں مجھے دوسال کی عارضی ملازمت کے کچھ پیسے تو پہلے ہی مل چکے تھے جو میرے پاس موجود ہی تھے اور اب تین ماہ کے لئے یہ مزید انتظام بھی ہو گیا تھا سو اب کسی قسم کی پیسے کی تنگی کا سوال ہی نہ تھا۔

بعد میں جان مارشل نے مجھے بتایا تھا کہ:

''سندھ کے شہر لاڑکانہ کے جس علاقے میں جس جگہ وہ کھدائی کرنا چاہتے تھے اور جس کے لئے وہ برطانیہ بھی گئے تھے اور کیمبرج یونیورسٹی میں جس کے بارے میں انہوں نے لیکچر بھی دیئے تھے اس کے لئے بھی وائسرائے نے محکمہ آثار قدیمہ کو پہلے ہی تین سال کے لئے ایک لاکھ پاؤنڈ سالانہ کے حساب سے انہیں رقم مہیا کر دی تھی جس سے سندھ کے علاوہ بنگال کے کسی دوسرے سروے شدہ مقام کی کھدائی کرنے کی اجازت بھی انہیں دے دی گئی تھی کہ گویا یہ دو مقامات پر تین سال تک کھدائی کرتے رہنے کے لئے فنڈ تھا جو اس

کے لئے منظور کر لیا گیا تھا''۔

جان مارشل کا محکمہ آثار قدیمہ وزارت کلچر کے ماتحت کام کرتا تھا۔ یہ لارڈ ہارڈنگ جس سے میری ملاقات کرائی گئی تھی اس کے دادا ہارڈنگ بھی 1844ء سے 1848ء تک کلکتہ میں اسی برٹش انڈیا کے گورنر جنرل رہ چکے تھے۔ (1857ء کے بعد برطانیہ کے گورنر جنرل کو وائسرائے ہند کا نام دیا گیا تھا)۔ یعنی یہ خاندان بہت پہلے ہی سے ہندوستان سے متعلق کافی معلومات رکھتا تھا۔

وائسرائے ہارڈنگ 1858ء ہی میں پیدا ہوئے تھے اور ہندوستان کا وائسرائے بن جانے سے قبل وہ سفارت کے عہدوں پر کام کر چکے تھے۔ جس وقت کی یعنی 1910ء کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کے خلاف ہندو قوم پرستوں کی تحریک چل رہی تھی اور لارڈ ہارڈنگ ہی نے اس تقسیم کو ختم کر کے پورے صوبہ بنگال کو ایک وہی پرانے متحدہ صوبہ بنگال کے درجے پر بحال کر دیا تھا۔

اسی کے زمانے میں The Indian Council Act 1909 جسے منٹو مارلے ریفارم بھی کہا جاتا تھا نافذ کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں اس وقت ایک مشہور مقامی قومی لیڈر گوکھلے کا نام بہت مشہور اور ہر دلعزیز تھا جو بمبئی کے علاقے سے ایک مشہور وکیل اور سیاستدان کے طور پر جانے پہچانے جاتے تھے۔ انہی دنوں ان کے ایک اور مددگار مسلمان بیرسٹر محمد علی جناح کا نام بھی سیاسی حلقوں میں کافی مقبول ہو رہا تھا۔ جان مارشل نے یہ بھی بتایا تھا کہ:

> ''اگلے سال یعنی 1911ء میں تاج برطانیہ کا بادشاہ جارج پنجم اس برطانوی مقبوضہ ہند کے دورے پر بھی آنے والا تھا جس کی آمد کے سلسلے میں پوری حکومت اور وائسرائے ہند بہت زور و شور سے تیاری کر رہے تھے''۔

دہلی ہمارے برطانوی ہندوستان کا دارالحکومت تھا۔ یہ ہمالیہ سے نکلنے والے ایک دریا جمنا کے کنارے آباد تھا۔ ہندوستان پر ہمارا مکمل قبضہ ابھی 60/70 سال قبل 1857ء ہی میں ہوا تھا۔ جب کہ مسلمانوں کی 800 سالہ حکومت کو ہم نے ختم کر کے یہاں پر اپنی حکومت قائم کی تھی اور اپنا دارالحکومت بھی کلکتہ بنگال سے دہلی منتقل کر دیا تھا۔

دہلی ایک قدیم شہر تھا۔ مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہونے سے قبل اس خطے میں ایک ہندو راجہ رائے پتھورا پرتھوی راج کے خاندان کی ڈیڑھ ہزار سالہ بادشاہت قائم تھی جو دہلی کی بجائے کوئی 500 میل دور مشرق میں واقع ایک مشہور شہر قنوج سے اپنی سلطنت کو کنٹرول کرتا تھا۔

دہلی کے اس شہر میں مسلمانوں کا بنایا ہوا ایک اونچا مینار بھی ہے جو یہاں کے پہلے مسلمان

بادشاہ قطب الدین ایبک نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مینار 1193ء میں بنایا گیا تھا اور اس کی بلندی تقریباً 225 فٹ ہے اور بنیاد سے اس کی موٹائی 725 فٹ کے قریب ہے۔ یہ موجودہ دہلی شہر سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی تعمیر میں قنوج ہی کے قریب کے ایک شہر جودھپور سے لائے گئے سرخ پتھروں کو استعمال کیا گیا ہے۔ انہی پتھروں سے یہاں پر مسلمان مغل حکمرانوں نے اپنا ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا جسے مقامی لوگ لال قلعہ کہتے ہیں۔ اسی شہر میں مغل حکومت کے بانی ظہیرالدین بابر کے بیٹے نصیرالدین محمد ہمایوں کا مقبرہ بھی موجود ہے۔

مغلوں کا یہ بادشاہ ہمایوں 1508ء میں پیدا ہوا تھا اور 1556ء میں دہلی میں انتقال کر گیا تھا۔ مغلوں کے اس بادشاہ کی پوری زندگی بھی اتار چڑھاؤ سے لبریز تھی۔ اس نے 1535ء میں گجرات (بمبئی کے شمال میں ایک بڑا صوبہ) کو بھی فتح کر لیا تھا مگر پھر ایک مسلمان افغانی جنرل شیر شاہ سوری نے 1539ء اور 1540ء میں چوسہ اور پھر قنوج میں اس کی فوجوں کو شکست دے کر اسے دہلی سے نکال دیا تھا تو یہ بادشاہ سندھ کی طرف نکل گیا اور پھر وہاں سے میگھواڑ کی طرف چلا گیا کہ وہاں میگھواڑ راجپوتوں کی بھی کچھ مدد حاصل کر سکے مگر یہاں سے ناامید ہو کر یہ پھر سندھ واپس آ گیا تھا اور اسی سندھ کے جنوبی علاقے میں 1542ء میں اس کا وہ بیٹا اکبر پیدا ہوا جو خود بھی بعد میں ایک مشہور بادشاہ بنا۔

سندھ سے ہمایوں ایران کی سلطنت کی طرف چلا گیا جہاں وہ 11 سال تک صفوی خاندان کی پناہ میں رہا اور پھر اسی بادشاہ کی مدد سے واپس افغانستان آیا جہاں اس کے بھائی کامران مرزا نے اس کی شمالی سلطنت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ 1545ء میں اس نے کابل پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا اور 1550ء میں پورے افغانستان پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ 1555ء میں اس نے لاہور کو بھی دوبارہ فتح کر لیا اور اسی سال وہ دہلی واپس آنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ مگر اگلے یعنی جنوری 1556ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ جس کے بعد اس کا کم سن بیٹا جلال الدین محمد اکبر نوعمری ہی میں بادشاہ بنا جس نے بعد میں 50 سال تک دہلی پر حکومت کی۔

دہلی میں اور بھی بہت سی تاریخی عمارات تھیں جن کی ہم خوب سیر کرتے رہتے تھے۔ چار ہفتے جان مارشل دہلی ہی میں اپنے آثار قدیمہ کے ڈائریکٹوریٹ میں کام کرتے رہے پھر دو ماہ تک وہ قرب و جوار کی اور کئی قدیم تباہ شدہ بستیوں کا دورہ کرتے رہے اور پھر ہم نے مارچ 1910ء میں سندھ کے شہر لاڑکانہ کا رخ کیا جہاں ہمیں ایک قدیم دفن شدہ کھنڈر میں کھدائیاں کرانی تھیں۔ اس دوران میں مجھے ایک Notification کے ذریعے جان مارشل کے خصوصی نائب کے طور پر

باقاعدہ تعینات کرنے کے احکامات بھی مل چکے تھے اور میرا عہدہ ان کے خصوصی نائب تحقیق کا بنادیا گیا تھا۔ میری تنخواہ 150 پاؤنڈ کے مساوی مقرر کی گئی تھی اور رہنے کے لئے جو مکان الاؤنس، دونوکروں کی تنخواہ اور سواری کا جو ماہانہ الاؤنس مقرر کیا گیا تھا وہ میرے لئے بہت معقول اور اچھا مشاہرہ تھا اور یہ سب کچھ سر جان مارشل کی شفقت اور مدد ہی کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ میری عمر اب 29 سال ہے اور کیمبرج سے نکلے ہوئے مجھے لگ بھگ 9 سال ہو چکے ہیں اور کیونکہ میں نے آثار قدیمہ کی علمی ڈگری حاصل نہیں ہے مگر پھر بھی اب میں ہندوستان کے مرکزی شعبہ کلچر میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے مساوی عہدے پر تعینات ہو چکا ہوں۔

ایک دن جان مارشل اپنے دفتر سے واپس آئے تو میں بھی اسی بگھی میں ان کے ساتھ ریسٹ ہاؤس آ گیا تھا۔ آتے ہی انہوں نے ایک موٹی سی فائل نکالی اور مجھے پڑھنے کو دی اور ہدایت کی کہ اس میں سندھ کے شہر لاڑکانہ سے 25 میل دور ایک تحصیل ڈوکری کے ایک کھنڈر کی تفصل درج ہے جسے مقامی لوگ ''موئن جودڑو'' کہتے ہیں۔ میں اس فائل کا اچھی طرح مطالعہ کروں، اس کے ضروری نوٹس بناؤں اور ایک ہفتے کے بعد میں اس فائل پر ان سے گفتگو کروں۔

اس کی کھدائی سے پہلے اس کا پورا سروے کرنا میرا کام ہوگا۔ یہ پورا علاقہ کوئی 1500 ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ مجھے اس کی کھدائی کے لئے اسے کم از کم بیس حصوں میں تقسیم کر کے اس کے Phases بنانے تھے اور بیک وقت کئی حصوں میں کھدائیاں کرنی تھیں۔ ان کے لئے اوزار، خیمے، ناپنے والے فیتے، کام کرنے والے مزدوروں کے لئے وردیاں اور مختلف قسم کا ضروری سامان جمع کرنا تھا۔ پھر مزدوروں کی باقاعدہ بھرتی کرنا اور ان کا مشاہرہ طے کرنا، ان کے کھانے پینے کے لئے الاؤنس مقرر کرنا، رہنے کے انتظامات کرنے کے لئے رہائشی کوارٹر تعمیر کرانا، ان کی چھٹیوں، کام کے اوقاتِ کار اور طریقہ کار کو منظم کرنا اور متعلقہ قواعد و قوانین کے مطابق ان کے سپروائزر مقرر کرنا۔ یہ سب مجھے ہی کرنے کی ہدایات دی گئی تھیں۔

دہلی سے ہی ہمیں ضرورت کی اشیاء خرید کر لے جانی تھیں۔ کیونکہ لاڑکانہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کی آبادی 10/15 ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ وہاں کے بازار چھوٹے اور صرف مقامی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تھے۔ کھدائی کے مخصوص آلات اور مٹی چھاننے کی چھلنیاں وغیرہ ہمیں سب کچھ دہلی ہی سے خرید کر لے جانی تھیں۔

جان مارشل کا خیال تھا کہ یہ دفن شدہ بستی ہندو آریاؤں (Indo Aryan) کے دور کی ہوگی جو 2000 قبل مسیح سے لے کر 1500 سال قبل مسیح کے لگ بھگ ہندوستان میں داخل

ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ دریائے سندھ اور اس کے معاونین دریاؤں کے ساتھ ساتھ چلتے اور رہتے بستے جنوب اور شمال مغربی ہندوستان سے وسطی اور جنوبی ہندوستان کی گنگا اور جمنا کی وادیوں تک پھیل گئے تھے۔

اس علاقے کے لوگ اس کھنڈر کے بارے میں عجیب وغریب کہانیاں بیان کرتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ یہاں سے بارش کے بعد جب پانی بہہ کر زمین کی نچلی پرتوں کو آگے اور سامنے لے آتا ہے تو یہاں سے گھونگے اور مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے نکلتے ہیں۔ کبھی کبھی تانبے اور پیتل کے کچھ برتنوں کے ٹکڑے بھی مل جاتے ہیں اور کبھی یہاں مُردوں کی ہڈیاں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ کچھ ان پڑھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس ڈھیری پر جنات کا قبضہ ہے اور ان کے نیچے ان کے مکانات ہیں جہاں وہ رہتے ہیں اور ان کے برے اثرات اور غصے سے بچنے کے لئے وہ اس سنسان اور ویران مقام کے قریب سے بھی نہیں گزرتے تھے اور نہ ہی اپنے بچوں کو اس کھنڈر کے آس پاس پھٹکنے دیتے تھے۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں کسی قدیم بادشاہ کا کوئی محل تھا جس نے کوئی بڑا گناہ کیا تھا جس کی وجہ سے اللہ نے اس کے محل کو زمین پر الٹ دیا تھا۔ کچھ لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس مٹی کے تودے کے نیچے بہت سے خزانے دفن ہیں اور ان خزانوں پر ہمیشہ سانپوں کا پہرہ رہتا ہے جو کسی اور کو اس جگہ کے قریب بھی نہیں آنے دیتے۔ اس لئے یہاں سانپ بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

جان مارشل نے مجھ سے سانپوں کے کاٹنے سے پھیلنے والے زہر کو روکنے کے لئے بھی بہت سے انجکشن اور دوائیاں، مچھروں سے بچاؤ کے لئے مچھر دانیاں اور ملیریا کے بخار سے بچنے کی دوائیاں بھی ساتھ لے جانے کی خاص طور پر ہدایت کی تھی۔ اس کے علاوہ پیٹ کی بہت سی بیماریوں کے لئے بھی دوائیاں لے جانے کا حکم دیا تھا کیونکہ صاف پانی کا حصول ایک مسئلہ بن سکتا تھا۔

میں ہر روز دفتر سے تین بجے کے قریب واپس آ کر ان چیزوں کی خریداری میں لگ جاتا تھا اور ہر ایک چیز کی خریداری کا حساب کتاب ایک رجسٹر میں لکھ لیتا تھا۔ اس کے علاوہ جب بھی مجھے فرصت کا موقع ملتا تھا تو میں آثار قدیمہ کے اپنے ڈائریکٹوریٹ میں اور کبھی کبھی دہلی کی مرکزی حکومت کے سینٹرل سیکٹریٹ کی لائبریری میں جا کر بھی قدیم ہندوستان کی تاریخ کی ورق گردانی کرتا رہتا تھا۔

چودھواں باب

برٹش امپیریل گزٹ

سندھ کی طرف جانے سے قبل جان مارشل دہلی سے 60 میل دور ایک اور تاریخی مقام کے ٹور پر چلے گئے تھے جہاں انہیں ایک ہفتے کے لئے رکنا تھا۔ یہ جگہ ضلع مظفر نگر کے قریب ہستنا پور نامی ہندو تاریخ کی ایک قدیم بستی تھی جہاں کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس جگہ قدیم تاریخی نوادرات کے لئے کھدائی کی جانی چاہئے۔ اس دوران میں نے طے کیا کہ سندھ اور اس کے بڑے شہروں اور اس علاقے کے تاریخی پس منظر سے واقفیت حاصل کر لی جائے تا کہ میں جب جان مارشل کے اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے سندھ کے اس قدیم کھنڈر کی کھدائی کے لئے وہاں پہنچوں تو اس علاقے سے میرا اچھا خاصا تعارف ہو چکا ہو۔

میں نے وزارت کلچر دہلی سے رابطہ کر کے اس سلسلے میں ان سے مناسب کتب کی فہرست مانگی تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں وائسرائے کی سرکاری سیکٹریٹ کی لائبریری (Viceroy Secretariat Library) میں جا کر برٹش گزٹ کا مطالعہ کروں۔ یہ سال بہ سال نکلتے ہیں اور ہر صوبے کے ہر ضلع کے حالات، وہاں کے لوگوں کی ذات، مذہب اور رسم و رواج وغیرہ کے لحاظ سے معلومات اکٹھی کر کے اس میں تحریر کی جاتی ہیں۔

اس طرح ان شہروں کی قدیم تاریخ وغیرہ سب ہی اس میں موجود ہوتی ہیں۔ یہ برٹش گزٹ ہر ضلع کا ڈپٹی کمشنر نکالتا تھا۔ چونکہ ہر ایک ضلع کا ڈپٹی کمشنر اپنی تعیناتی کے دوران کم از کم تین سال کے لئے ضرور وہاں ٹھہرایا یعنی Post کیا جاتا تھا اور وہ اپنے ذرائع سے تمام اطلاعات جمع کر کے گزٹ میں تحریر کرانے کے لئے بھیجتا ہے اور اپنے اپنے ضلعوں کی انتظامی صورتحال اور ان کے دیگر معاملات اور مسائل کا بھی تذکرہ کرتا ہے اور اس کے نوٹس (یادداشتیں وغیرہ) اس کے بعد میں آنے والے ہر ڈپٹی کمشنر کے لئے ایک گائیڈ (رہبر) کا کام بھی کرتے ہیں جسے پڑھ کر وہ اس ضلع

میں اپنی آئندہ کی حکمت عملی طے کرتا ہے۔

اس ضمن میں مجھے یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ سندھ کے شہر لاڑکانہ سے متعلق معلومات کرنے سے قبل میں اس کے دو تین اور بڑے شہروں سکھر اور حیدر آباد یا کراچی سے متعلق بھی ضرور معلومات حاصل کرلوں کیونکہ وہ بھی اس علاقے کے بڑے شہر ہیں۔

اگلے دو ہفتے انہی برٹش گزٹ کے صفحات پلٹنے میں گزرے اور میں نے اس علاقے کے بارے میں بہت کچھ اطلاعات اور معلومات اکٹھی کر کے اپنے لئے کچھ یادداشتیں یعنی Notes بھی بناڈالے۔

سندھ کا یہ خطہ تقریباً 500 میل لمبا ہے جس کے بیچوں بیچ دریا بہتا ہے جو سندھ کے جنوبی شہر ٹھٹھہ کے قریب 60/70 میل کا ڈیلٹا بناتا ہوا بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔ یہ دریا ہمالیہ کے ایک اونچے مقام یعنی 17,000 فٹ بلند پہاڑوں پر واقع جھیل مان سرور سے نکل کر 500 میل کے قریب صرف پہاڑوں ہی میں بہتا ہوا میدانی علاقوں میں نکل آتا ہے۔ جس کے بعد وہ پھر 1100 میل بہہ کر سمندر سے جا ملتا ہے۔ اس کی کل لمبائی 1700 میل ہے اور بہت سے دریا راستے میں آ آ کر اس سے ملتے رہتے ہیں۔

بعض جگہوں پر اس کی چوڑائی گرمیوں میں 15 سے 20 میل تک پھیل جاتی ہے اور اس کا بہاؤ 15 لاکھ کیوسکس فی منٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ دریا شمال کے پہاڑوں کے نیچے جب پنجاب اور سندھ کی طرف آتا ہے تو بعض مقامات پر 200 فٹ تک کی گہرائی تک کا پانی لے کر بہتا ہے اور سردیوں کے علاوہ گرمیوں میں پورے میدانی علاقے میں اس کی گہرائی 20/25 فٹ تک رہتی ہے اور جب بھی پہاڑوں پر برف زیادہ گر جائے یا میدانی علاقوں میں بارش زیادہ ہو جائے تو اس دریا میں سیلاب بھی آتے رہتے ہیں اور یہ اپنا رخ بھی بدلتا رہتا ہے

اس دریا کے کنارے گھنے جنگلات ہیں۔ جن میں بھی دو تین صدیاں پہلے تک شیر گینڈے اور دوسرے جنگلی جانوروں کی بہتات ہوتی تھی اور یہ جنگلی درندے اب بھی مل جاتے ہیں۔ یہاں کی آبادی کا تمام دارومدار اسی دریا پر ہے۔ اس دریا میں شمال کے میدانی علاقوں سے جنوب تک بڑی بڑی مسافر بردار اور مال بردار کشتیاں چلتی ہیں۔ یہ کشتیاں چلانے والے اور مچھلیاں پکڑنے والے لوگ ایک مخصوص برادری سے تعلق رکھتے ہیں جن کو ''میر بحر'' یعنی ''پانی کا سردار'' کہا جاتا ہے۔

اس دریائے سندھ میں پنجاب کے چار دریا راوی، ستلج، چناب اور جہلم آ آ کر ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں اور سندھ کے شمال میں ایک مقام پنجند تک آ کر یہ دریائے سندھ میں مل جاتے

ہیں اور اپنی گزرگاہ کا آخری 500 میل کا لمبا حصہ یہ سندھ ہی میں گزارتا ہے اور سندھ میں جو کشتیاں شمال کی طرف سے جنوب کی طرف چلتی ہیں ان کا پہلا بڑا پڑاؤ سکھر نامی ایک شہر میں ہوتا ہے جہاں کشتیوں کے رکنے کی جگہ کو منزل گاہ کہا جاتا ہے اور کشتیوں کے رات کے سفر کی رہنمائی کے لئے یہاں ایک اونچا سا مینار بھی بنا ہوا ہے جو معصومی مینار کہلاتا ہے۔

سکھر شہر کی جگہ ایک پرانا شہر اروڑ آباد تھا اور اس سے قبل بھی اس موجودہ شہر سے سات میل دور ایک قدیم بستی موسی کانو (Musi Kano) کے نام سے آباد تھی۔ سکندر اعظم دریائے جہلم کے قریب ایک آریائی بادشاہ پورس کو شکست دے کر اس علاقے سے گزرا تھا اور سن 322 ق م میں سکھر کے قریب اس بستی میں رکا تھا اور موسی کانو کو بغیر جنگ کے مطیع کر لیا تھا۔

برٹش امپیریل گزٹ میں کچھ مختصر بیان سکندر کا بھی موجود تھا جو میں نے اسی سے اخذ کر کے لکھ دیا تھا۔

سکندر کے باپ کی سلطنت مقدونیہ کی چھوٹی سی حکومت سے شروع ہوئی اور یہ موروثی سلطنت آرگیاڈ سلطنت (Argead Dynasty) کہلاتی تھی۔ سکندر 356 ق م میں پیلا (Pella) نامی ایک شہر میں پیدا ہوا تھا۔ 16 سال کی عمر تک اس نے یونان کے ایک مشہور فلسفی ارسطو سے تعلیم حاصل کی تھی اور اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ سورج دیوتا کا خاص فرستادہ ہے اور اسے اس جگہ تک جانا ہے جہاں اپنے سورج دیوتا کا گھر ہے۔ یعنی مشرق کے اس مقام تک جہاں سے سورج نکلتا ہے۔ یہ سارا علاقہ اس کے دیوتا کا ہے یعنی خود سکندر ہی کا علاقہ ہونا چاہئے۔

چنانچہ اس نے پہلے اپنے باپ کے ایک منصوبے کو پورا کرنے کے لئے اکیلے شمالی افریقہ کے ان علاقوں پر حملہ کیا جہاں پچھلے تین ہزار سال سے فراعین کی حکومت چلی آ رہی تھی۔ مصر کی فتح کے بعد وہ ایران کی اشمینڈ سلطنت (Achaemenid Empire) پر حملہ آور ہوا اور کئی چھوٹی چھوٹی جنگوں کے بعد اس سلطنت کے بادشاہ دارا سوم سے 334 ق م میں اسوس (Issus) کے مقام پر مقابلہ کیا۔ دارا کی ایک لاکھ کی فوج کو سکندر کی تقریباً بیس ہزار کی فوج نے پہلی بڑی شکست دی اور پھر اگلے ہی سال گوگومیلا (Gaugamela) کے مقام پر دارا کو دوسری مکمل شکست دے کر اس نے پوری سلطنت آشمینڈ کا خاتمہ کر دیا۔

پھر یہاں چند سال رک کر اس نے اپنے لئے ایرانی فوجی بھرتی کئے۔ دارا کا سفید محل جلا کر خاکستر کر ڈالا اور ہزاروں فارسیوں کا خون بہایا۔ چنانچہ ایرانی تاریخ میں سکندر کو ایک سفاک اور بے حد ظالم شخص کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ سلطنت فارس اس زمانے میں آرمیدیا، جارجیا، جنوبی

ترکی، عراق، شام، فلسطین، ایران اور موجودہ افغانستان میں بلخ تک اور جنوب میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک پھیلی ہوئی تھی اور موجودہ بلوچستان کا علاقہ جو ایران سے ملحقہ تھا وہ بھی ایران ہی کا حصہ تھا اور توران کہلاتا تھا۔ سکندر کی فتوحات کی جو بنیادی وجوہات اور خصوصیات مورخین نے بیان کی ہیں وہ یہ ہیں:

سکندر کی ذاتی بہادری اور بے خوفی اور ہمیشہ خود صف اوّل میں رہ کر فوج کی رہبری کرنا، فوج کے سخت نظم وضبط کی پابندی اور عام فوجی سے شفقت ومحبت رکھنا، سپاہیوں کا پندرہ فٹ کے لمبے لمبے نیزوں کا استعمال جو یونانی فوج سے پہلے کسی نے بھی استعمال نہیں کئے تھے اور جنگ صرف ڈھائی تین فٹ لمبی تلواروں سے لڑی جاتی تھی۔ ان نیزوں کی لمبائی اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ مخالفین کی تلواریں کسی کام ہی نہ آتی تھیں اور تیر چلانے کے لئے وہ جتنا وقت لیتے تھے یونانی سپاہی نیزے کے ایک ہی وار سے دشمن کا کام تمام کر سکتے تھے۔

سکندر بلخ تک گیا تھا اور بلخ سے جنوب کی طرف آ کر اس نے درہ بولان کے پہاڑوں کے راستے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر ایک ہندو آریائی بادشاہ پورس سے جنگ کی جو ساڑھے پانچ فٹ قد کے سکندر کے مقابلے میں خود سات فٹ کا قدآور شخص تھا اور سکندر کے مقابلے میں ہاتھیوں کے بڑے بڑے جتھے لے کر آیا تھا مگر یہاں بھی سکندر کو فتح حاصل ہوئی اور دریائے جہلم کے کنارے واپس جنوب میں سمندر کی طرف جاتے ہوئے وہ سندھ کے دریا کی مغرب کی طرف سے گزرا اور اسی راستے میں وہ موسی کانو (Musi kano) نامی بستی میں ٹھہرا اور یہیں سے وہ مکران کے ساحلی راستوں سے گزر کر آبنائے فارس پہنچا اور وہاں سے عراق کے شہر بابل میں گیا جہاں سیناشرب کے محل میں اس کی وفات ہوگئی۔

موسی کانو کی یہ بستی دریائی بندرگاہ تھی اور آہستہ آہستہ اس جگہ ہندو کھتری ذات کے لوگ جو اروڑ کہلاتے تھے یہاں آباد ہوتے گئے تھے۔ غالباً اروڑ کا ن لفظ دراوڑ نسل کے لوگوں کے نام کی بگڑی ہوئی شکل سے ان لوگوں کی مناسبت سے اس بستی کا نام اروڑ یا اروڑ کوٹ پڑ گیا تھا۔ یہ علاقہ رائے خاندان کے بدھ مذہب کے راجاؤں کی حکومت کا مرکز تھا۔ انہی بدھی راجاؤں کے دربار میں ایک ہندو برہمن نوجوان چچ نے آ کر دربار کی ملازمت شروع کی تھی اور پھر اسی ہندو پنڈت ذات کے شخص چچ نے اس سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا اور اس بدھ راجہ کی بیوہ سے شادی بھی کر لی تھی اور بعد میں اسی اروڑ کے شہر میں اس نے اپنے دیوتا ''شیو'' کا ایک بڑا مندر بھی تعمیر کرایا تھا۔

711ء میں عرب کے اموی بادشاہ کی فوجوں نے ایک سترہ سالہ فوجی سردار محمد بن قاسم کے

ماتحت یہاں حملہ کیا اور پانچ سال کی مدت میں نہ صرف اروڑ کو جو اس وقت کی ہندو حکومت کا دارالحکومت تھا فتح کر لیا بلکہ آگے بڑھ کر شمال میں پنجاب کے وسیع علاقے کو بھی عربی اُموی بادشاہت کا حصہ بنالیا اور تب سے یہ شہر بلکہ پورا سندھ ہی مختلف مسلمان سلطنتوں کے ماتحت رہا اور یہ صورت 1843ء تک چلتی رہی جب یہاں برطانیہ نے قبضہ کیا تھا۔

711ء میں مسلمانوں کی فتوحات کے بعد 862ء میں اس علاقے میں ایک بہت شدید زلزلہ آیا جس کی وجہ سے دریا کا رخ بدل گیا اور پھر وہ اپنے اسی موجودہ بہاؤ کے راستے پر بہنے لگا ہے۔ اس زلزلے اور اس دریا کے رخ بدلنے سے اروڑ کے شہر کا کچھ حصہ بھی منہدم ہو گیا تھا پھر سے آباد ہو گیا تو یہاں کی قدیم اروڑ برادری ادھر سے نقل مکانی کر کے دریا کے مغربی کنارے پر جا کر آباد ہو گئی اور اسی اپنے خاندانی نام کی مناسبت سے اس بستی کا نام اروڑ رکھا جو بعد میں کئی صدیوں کے زبان کے تلفظ کے فرق کے ساتھ بگڑ کر روہڑی کہلانے لگا جو آج تک آباد ہے۔ اروڑ کے پرانے شہر سے کچھ فاصلے پر دوسرا شہر آباد ہو گیا جو سکھر کہلاتا ہے۔

مسلمانوں کے پورے دور میں جو مختلف بادشاہتیں یہاں قائم ہوتی گئیں انہوں نے 711ء سے 1843 تک اس پورے خطے پر حکمرانی کی۔ یہ پورا علاقہ صرف دریائے سندھ ہی کی بدولت آباد تھا۔ چنانچہ اس کے اکثر حصے ریگستانی ہی تھے اور یہاں بھی اونٹوں کو وہی حیثیت حاصل تھی جو عرب کے ریگستانی اور صحرائی تمدن میں اس جانور کو حاصل رہی تھی۔

1530ء کے بعد مغلوں کی حکومت کابل سے جنوب کی طرف پنجاب اور دہلی تک پھیلتی رہی۔ سندھ پر ان کا اقتدار تو تھا مگر یہاں کے کے بے آباد علاقوں کی طرف ان کی توجہ کم ہی رہتی تھی۔ سندھ کا ملحقہ علاقہ بلوچستان بھی مختلف قبائلی سرداروں کے قبضے میں تھا جہاں ان کی موروثی جاگیریں قائم تھیں اور وہ بھی نیم خود مختار ہی ہوتے تھے۔

مغلوں کی حکومت کمزور ہونے لگی تھی تو یہاں کلہوڑہ نامی خاندان نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی جو بلوچستان کے ایک بلوچ قبیلے تالپور کے نسل کی سلطنت کہلاتی تھی۔ 1832ء میں قندھار کے افغان فوجی سردار شاہ شجاع نے سبی کی طرف سے سندھ کے ایک متمول شہر شکار پور پر حملہ کیا۔ یہاں ہندو برادری آباد تھی جس کی تجارت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور یہ شہر بہت سی صنعت وحرافات کی وجہ سے بھی مشہور تھا اور سندھ کی افغانستان سے خشک پھلوں کی تجارت کا مرکز تھا۔ یہ بہت خوبصورت شہر تھا۔ اس شہر اور سکھر کے شہر کو افغان فوجوں نے خوب خوب لوٹا اور پھر واپس چلے گئے۔

اس زمانے میں یعنی 1809ء سے 1824ء تک پہلے افغانیوں کی اور پھر سندھ کے جنوبی

حصے پر میروں کی حکومت قائم رہی لیکن شاہ شجاع کے حملوں نے سندھ کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ جس کا فائدہ میروں یعنی تالپروں کو یہ ہوا کہ وہ شمالی اور جنوبی پورے سندھ پر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ لیکن صرف دس سال کے بعد ہی یعنی 1843ء میں انگریزوں نے سندھ پر حملہ کردیا اور سر چارلس نیپئر نے اپنی پانچ چھ ہزار فوج کے ساتھ میانی کی جنگ میں میروں کو آسانی سے شکست دے کر پورے سندھ پر اپنا قبضہ کرلیا۔ چارلس نیپئر ہی کو برطانوی حکومت نے سندھ کا پہلا گورنر تعینات کیا۔

چارلس نیپئر نے 1844ء ہی سے اس شہر کی اہمیت کا اندازہ لگالیا تھا۔ اس نے سکھر کی پرانی آبادبستی سے آگے نیا سکھر کے نام سے ایک نیا شہر آباد کرانا شروع کیا جواب نیا سکھر کہلاتا ہے۔ پرانے سکھر کی قدیم آبادی میں میر محمد معصوم شاہ کی اولاد ابھی تک آباد ہے جو معصومی سادات کہلاتی ہے۔ شہر کے باقی حصوں میں بلوچ قبائل کے لوگ بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ یہاں ہندو، سکھ اور مسلمان مذاہب کے لوگ آباد ہیں مگر اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ مگر یہاں کی تجارت ہندو برادری کے ہاتھ میں ہے۔ 1901ء کی مردم شماری کے مطابق اس شہر کی آبادی 20 ہزار کے قریب ہے۔ یہ شہر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر آباد ہے اور بلوچستان کے شہر کوئٹہ سے یعنی افغانستان سے آئے گئے مختلف خشک میوہ جات کی تجارت کا مرکز بھی ہے۔ اس شہر کی تمام تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔

1901ء میں اس شہر کو ایک الگ ضلع کا درجہ دیا گیا۔ برطانوی حکومت نے اس کے قریبی شہر شکارپور سے کچھ حصہ لے کر اور دوسرے ہمسایہ علاقے لاڑکانہ سے کچھ زمین ملا کر یہ نیا ضلع تشکیل دیا ہے۔

سر چارلس نیپئر نے جب اس علاقے کا سروے کرایا تو اسے اندازہ ہوا کہ گو یہ سارا شہر اور اس سے ملحقہ سارا علاقہ نیم ریگستانی ضرور ہے جہاں درجہ حرارت بعض اوقات 120 ڈگری تک پہنچ جاتا ہے مگر یہاں دریا پر پل بنا کر اسے پنجاب اور بلوچستان سے ملایا جاسکتا ہے اور اگر اس دریا پر کوئی بڑا بند باندھ کر پانی کو روک کر مختلف سمتوں میں نہریں نکال لی جائیں تو اس پورے علاقے کی بہت زیادہ زمین زیر کاشت آسکتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس صوبے کی آمدنی کو بڑھایا جاسکتا ہے۔

اسی منصوبے پر کام کرتے ہوئے اس نے دہلی کی برطانوی حکومت کو اس بات پر بھی آمادہ کر لیا تھا کہ جو نئی ریلوے لائن بمبئی کی بندرگاہ کو باقی ہندوستانی زراعتی علاقوں سے ملانے کے لئے بچھائی جارہی ہے اس کے شمال مغربی حصے کو سندھ کے ساحلی شہر کراچی تک بڑھایا جائے اور سکھر کے

پاس اس ریلوے لائن پر ایک پل تعمیر کرلیا جائے تو سکھر کے مغرب میں واقع بلوچستان کے قبائلی علاقے بھی سلطنت برطانیہ میں پوری تندہی اور مکمل طور پر شامل کئے جاسکتے ہیں اور حکومت برطانیہ نے یہ منصوبہ منظور کرلیا تھا۔

اس پل پر کام کرنے کا منصوبہ 1887ء سے شروع ہوا تھا۔ اس پل کا ڈیزائن سر الیگزینڈر میڈو (Sir Alexander Meadow) نے تیار کیا تھا اور اس کی تنصیب کا کام ایف۔ ای۔ رابرٹسن (F.E. Robertson) نے انجام دیا تھا۔ اس کی تعمیر میں 3,300 ٹن لوہا استعمال کیا گیا تھا جس کے تمام پینل یعنی مختلف لمبے لمبے ٹکڑے اور شہتیر تمام کے تمام انگلستان ہی میں بنا کر لائے گئے تھے۔ اس کا سب سے چوڑا Span یا فاصلہ 790 فٹ کا تھا اور یہ اپنے وقت میں انجینئر نگ کا ایک شاہکار سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کے 790 فٹ کے نیچے کوئی ستون نہ تھا اور اس پر کام کرتے ہوئے رسیوں کے جھولے ضرور موجود ہوتے تھے۔ مگر ہر وقت کسی بھی مزدور یا انجینئر کا دریا میں گر کر ڈوب جانے کا خطرہ موجود رہتا تھا اور یہ کام مسلسل دو سال تک سخت سردی اور سخت گرمی میں پورے زور و شور سے جاری رہا تھا۔

25 مارچ 1889ء کو اس پل کا افتتاح ہوا تھا اور اس کا نام اس وقت کے وائسرائے ہند کے نام پر لینس ڈاؤن پل (Lansdowne Indus River Bridge) رکھا گیا تھا۔ اس کے افتتاح کے لئے J.L. Kippling اور Lord Reay جیسے نامور لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ سخت گرمی کی وجہ سے اس کا افتتاح صبح ساڑھے چھ بجے کیا گیا تھا۔ لارڈ رے نے اس پل کے اندر جانے والا لوہے کا دروازہ چابی سے کھولا پھر یہاں کے افسران اور انجینئر ز کے ساتھ پورے پل پر چہل قدمی کی اور پھر پل کے عین درمیان میں لگی ہوئی میزوں اور کرسیوں پر بیٹھ کر یہیں صبح کا ناشتہ بھی کیا۔

کچھ ہی عرصے کے بعد اس پل پر ریلوے لائن جو کہ افتتاح سے قبل ہی بچھا دی گئی تھی وہ ریلوے کی آمد و رفت کے لئے بھی استعمال ہونے لگی تھی اور اس شہر سکھر کا تعلق ملحقہ شہر روہڑی کے ذریعے دریا کے مشرقی کناروں پر بنے ہوئے شہروں سے بمبئی سے پنجاب تک پورا ہو گیا تھا اور جنوب میں کوئٹہ بھی اس سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ اس سے قبل جو مال بردار کشتیاں (Steam Ferries) یہاں دریا میں ایک شہر سے دوسرے شہر تک لوگوں کو یا مال و سامان کو لایا اور لے جایا کرتی تھیں ان کی بجائے مال برداری کا تمام کام ریلوے کے ذریعے ہونے لگا تھا اور آہستہ آہستہ اب یہ کشتیاں دریا کے ساحلی علاقوں سے لکڑیاں وغیرہ لانے اور لے جانے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔

اس پل کے فوراً بعد ہی دریا پر ایک بڑا بند بنا کر پانی روکنے اور یہاں سے نہریں وغیرہ

نکالنے کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ برٹش امپیریل گزٹ نے لکھا تھا کہ گو اس پل کے بعد بیراج بنانے کی اصولی منظوری دی جا چکی ہے مگر ابھی یہ کام آٹھ دس سال کے بعد ہی شروع ہو سکے گا کیونکہ اس کا ڈیزائن کچھ اس طرح سے بنایا جا رہا ہے کہ شاید یہ دنیا کا سب سے بڑا بیراج بنے گا اور اس سے چار کروڑ ایکڑ کا رقبہ سیراب ہو سکے گا۔ جس کے لئے اسی شہر کے قریب جہاں یہ بیراج بنے گا وہاں سے دائیں اور بائیں جانب سے سات نہریں نکالے جانے کا منصوبہ ہے۔ یہ بیراج 5000 فٹ لمبا ہوگا اور اس کے چھیاسٹھ دروازے بنائے جائیں گے۔ چنانچہ آج کل اس کے سروے، نقشہ جات اور تخمینے وغیرہ مکمل کئے جا رہے ہیں۔

گزٹ کے مطابق اس کا ڈیزائن سر آرنلڈ مستو (Sir Arnold Mustu) نامی ایک انجنیئر بنا رہے ہیں۔ ابھی اس بیراج کا ابتدائی کام شروع ہوا ہے مگر سکھر کے اس بیراج کی تعمیر شمالی ہندوستان میں برطانوی حکومت کا شاید سب سے بڑا زراعتی منصوبہ ہوگا۔ اسی دریا کے بیچ میں ایک چھوٹا جزیرہ بھی ہی جسے سادھو بیلا کہتے ہیں جس کی تعمیرات 1823ء میں شروع ہوئی تھی اور یہاں ہندو برادری کے مندر وغیرہ بھی تعمیر ہو رہے ہیں۔

سکھر کے علاوہ یہاں کا دوسرا بڑا شہر حیدرآباد ہے۔ یہاں کی زمین زرخیز ہے اور گرم موسم کافی معتدل ہے۔ یہ شہر سمندر سے قریباً 100 میل دور ہے اور یہ ہندوؤں کا ایک بڑا تجارتی مرکز ہے۔ یہاں بڑے بڑے مسلمان زمیندار اور جاگیر دار رہتے ہیں مگر ان کی تمام زرعی پیداوار کی تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے جو اقلیت میں ہونے کے باوجود بہت فعال، تعلیم یافتہ اور زیادہ بااثر ہیں۔

حیدرآباد کا یہ شہر تالپور میروں کی بادشاہی کے زمانے میں ان کا پایہ تخت بھی رہا تھا۔ یہاں پرانی تعمیرات میں ایک کچا سا قلعہ بھی موجود ہے اور یہیں مسلمانوں کے کسی بزرگ جس کا نام علی تھا ان کے قدم کا کوئی نشان بھی موجود ہے جسے یہاں کے مسلمان بہت محترم سمجھتے ہیں۔

اسی شہر میں دریائے سندھ کی ایک بڑی بندرگاہ بھی ہے جہاں پر کشتیوں سے مال اتارنے اور چڑھانے کا سارا کنٹرول ایک بااثر ہندو خاندان کے پاس ہے اور جنگلات کی لکڑی، مٹی کے برتن، گندم، کپاس اور مختلف اجناس کی تجارتی ترسیل اسی بندرگاہ سے ہوتی ہے۔ اب حکومت ہند نے اس شہر میں ریلوے لائن پر ایک بڑا اسٹیشن بھی بنا دیا ہے جہاں سے مال اور مسافر کراچی کی بندرگاہ تک آتے جاتے ہیں۔

اس شہر سے آگے بڑا شہر کراچی کا ہے جو سندھ کی ایک قدرتی بندرگاہ ہے۔ اس کے قریب

ایک چھوٹا سا کیاڑی نام کا جزیرہ ہے جہاں اب برطانوی حکومت اس جزیرے کو خشکی کے راستے کراچی سے ملانے کے لئے ایک بڑا منصوبہ بنا رہی ہے۔ حال ہی میں برطانوی حکومت نے یہاں کراچی بندرگاہ کا قانون (Karachi Port Act 1887) بھی نافذ کیا ہے اور یہ بندرگاہ ترقی پانے لگی ہے۔ یہاں کی بحری تجارت کا کسٹم اور بندرگاہی نظام کا کنٹرول یہاں کے زرتشتی لوگ جن کو پارسی کہا جاتا ہے ان کے ہاتھوں میں ہے۔ انہی کے انجینئرز اب اس شہر کو نئے طریقے سے آباد کرنے کے لئے سڑکوں اور یہاں کی نئی کالونیوں کی منصوبہ بندی بھی کر رہے ہیں۔ یہاں زیادہ تر ہندوستان کے مغربی علاقوں یعنی کچھ اور کاٹھیاواڑ کے ماہی گیر آباد ہیں جن کا پیشہ مچھلیاں پکڑنا ہے۔

شہر ابھی چھوٹا ہے مگر برطانوی حکومت یہاں مقامی آبادیوں کو یسوع مسیح کی تعلیمات سے آگاہ کرنے کے لئے تبلیغی اسکول بھی کھول رہی ہے اور چرچ بھی تعمیر کرا رہی ہے۔ یہ ماہی گیروں کی قدیم بستی تھی جو اب ایک بڑے شہر کا روپ دھارتی جا رہی ہے۔ یہاں ایک ایرانی مسلمان آفندی نے بھی ایک بڑا اسکول بنالیا ہے جو بندرگاہ کے پاس ہے جس کا نام سندھ مدرستہ الاسلام رکھا گیا ہے۔ یہاں زیادہ تر تجارت، دولت اور شہر کے نظم ونسق کا انتظام ہندوؤں اور پارسیوں کے ہاتھوں میں ہی ہے۔

پندرہواں باب

مُردوں کا کھنڈر

ایک رات کو جب میں ابھی دہلی ہی میں تھا اور چند دن کے بعد جان مارشل کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہونے والا تھا تو اس رات کو سوتے اور جاگتے رہنے کی درمیانی کیفیت میں میں نے خود کو ایک گھنے جنگل میں پایا۔ یہ دن کا وقت تھا۔

میں نے دور سے کسی بڑی جھیل یا دریا کے کنارے اس گھنے جنگل میں بہت بڑے بڑے تنوں والے درخت اگے ہوئے دیکھے۔ دور تک سایہ ہی سایہ تھا اور وہ بھی اتنا تھا کہ دن کے وقت اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس جنگل میں خوفناک درندوں کے دھاڑنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ یکا یک میرے قریب ہی سے کسی درخت کی کوئی بڑی سی شاخ کی ٹوٹنے کی تڑاخ کی سی آواز آئی اور پھر کئی آوازوں کا ملا جلا سا قہقہہ سا سنائی دیا۔

میں ذرا آگے بڑھا تو دیکھا کہ آٹھ دس لوگ جن کی کمر تک کوئی لباس نہ تھا اور نچلے دھڑ کو کسی کھال سے ڈھانپ رکھا تھا وہ ایک موٹی سی ٹوٹی ہوئی شاخ کے پاس کھڑے ہوئے ایسے خوش خوش ہنس رہے تھے جیسے ان کو کوئی بڑی فتح حاصل ہو گئی ہو۔ ان سے ذرا آگے اسی طرح ایک اور موٹے سے تنے پر چڑھتے ہوئے دس بارہ اور لوگ بھی نظر آئے اور آن کی آن میں یہ تنومند لوگ درخت سے نکلی ہوئی اس موٹی سی شاخ پر بیٹھ گئے جو زمین سے زیادہ اوپر نہیں تھی۔ شاخ پر آگے آگے سرکتے ہوئے انہوں نے اس موٹی سی شاخ کو زور زور سے ہلانا شروع کیا اور بہت دیر تک وہ اس شاخ کو اتنا زور زور سے ہلاتے رہے کہ یہ شاخ بھی پوری کی پوری درخت سے ٹوٹ کر نیچے آ گری اور پھر ان لوگوں کے بھی اسی طرح قہقہے گونجنے لگے۔

میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑا کر دیکھا تو اس جنگل میں بہت سے اور چھوٹے چھوٹے گروہ کی ٹولیاں ٹولیاں بھی اسی طرح بڑی بڑی لکڑیاں توڑ توڑ کر جمع کر رہے تھے۔ میرے پاؤں کے نیچے

آہستہ آہستہ پانی آنے لگا اور یہ پانی بڑھتا ہی جارہا تھا اور چند لمحوں ہی میں یہ میرے گھٹنوں تک آ پہنچا۔ اِدھر اُدھر سے بہت سے لوگ اپنی توڑی ہوئی لکڑیاں اسی پانی میں بہا کر ایک طرف لے جارہے تھے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ نہ انہوں نے میری طرف دیکھا اور نہ میرے پیچھے آئے نہ کسی نے درشتگی کا مظاہرہ کیا بلکہ اس طرح مجھے نظر انداز کرتے رہے جیسے میرا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

پانی سے نکل کر یہ لوگ ایک ذرا اونچی زمین تک پہنچے۔ ساری توڑی ہوئی لکڑیاں پانی سے نکال کر کھینچتے ہوئے یہ تھوڑا آگے بڑھے تو میں نے دیکھا یہاں بھی دس پندرہ آدمیوں کے چھوٹے چھوٹے جتھے بنے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں پتلے اور چوڑے پتھر ہیں جن کے کنارے گھس گھس کر انہیں دھاردار بنالیا گیا تھا اور وہ ایسی بڑی لکڑیوں کو جو تقریباً ایک ایک فٹ تک موٹی تھیں چھیل چھیل کر ان کے اوپر کی گولائی کو ختم کر کے انہیں تختوں کی طرح سپاٹ بنانے میں لگے ہوئے تھے۔

ذرا اور آگے بہت سی عورتیں بیٹھی نظر آئیں جن کے سروں پر پتلی پتلی شاخوں سے بنی ہوئی ٹوپیاں سی رکھی تھیں جو شاید گرمی سے بچنے کے لئے اوڑھی گئی تھیں۔ ان کے سامنے روئی کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے اور یہ عورتیں روئی کو اٹھا اٹھا کر ہتھیلیوں سے ان کو رگڑ رگڑ کر اور لمبا لمبا کر کے موٹے موٹے دھاگے سے تیار کر رہی تھیں۔ کچھ عورتیں ان بٹے ہوئے لمبے ریشوں کو ایک دوسرے سے ملا کر ان کی لمبی لمبی ڈوریاں بنا رہی تھیں۔ اسی میدان میں آگے ان ڈوریوں کی دس، دس ڈوریوں کو جوڑ جوڑ کر بٹ کر موٹی موٹی رسیاں بنائی جارہی تھیں اور آگے جا کر میں نے دیکھا کہ ان ڈوریوں کے جال بھی بنائے جارہے تھے جن سے شاید یہ لوگ مچھلیاں پکڑتے ہوں گے یا درختوں کے ایسے کئی کئی تختوں کو ملا کر اور ان تختوں سے کشتیاں بنا کر ان کشتیوں کو کنارے پر لا کر اس سے باندھتے ہوں گے۔

میں اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ ان تختوں سے ایک طرح کی بیل گاڑیاں بنائی جارہی تھیں جن کے لئے لکڑی ہی کے گول گول پہیئے بھی بنائے جارہے تھے مگر مجھے اس میں بھی نہ لوہے کی کیلیں نظر آئیں اور نہ ہی لوہے کے اوزار ملے۔ سب کچھ لکڑیوں ہی سے بن رہا تھا اور حد یہ کہ لکڑی کی نوکیں بھی جن سے یہ لوگ کیلوں کا کام لے رہے تھے وہ سب کچھ بھی لکڑی اور دھار والے پتھروں سے بنایا جارہا تھا۔

ان لوگوں کے قد چھوٹے تھے اور وہ بمشکل ساڑھے پانچ فٹ کے مگر بہت گٹھے ہوئے مضبوط اور ان کا رنگ گویا بالکل سیاہ تو نہ تھا مگر کافی حد تک سیاہی مائل ضرور تھا۔ عورتوں کے قد بھی پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھے اور انہوں نے بھی کہنیوں سے اوپر تک لکڑی کے بنے ہوئے گول گول چوڑیوں کی

طرح کے چھلّے پہنے ہوئے تھے۔ نہ میری ان مردوں یا عورتوں سے کوئی بات ہوئی اور نہ ہی انہوں نے میری طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ لوگ آپس میں کچھ گفتگو بھی کرتے جاتے تھے مگر مجھے ان کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ سب لوگ باتیں بھی اس طرح کر رہے تھے کہ جیسے انہیں کسی اور سے مطلب یا واسطہ ہی نہ ہو۔ میں ذرا دو قدم ان کی طرف اور بڑھا ہی تھا کہ جیسے سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گیا اور میں اسی چبوترے جیسی ذرا اونچی جگہ پر اکیلا کھڑا رہ گیا۔

پھر ایک اور منظر ابھرنے لگا۔ یہ کوئی جھیل نہ تھی بلکہ ایک بہت بڑا چوڑا دریا میری نظروں کے سامنے سے بہہ رہا تھا۔ کچھ کشتیاں دریا سے ادھر آ رہی تھیں، کچھ کنارے پر آ چکی تھیں۔ ان سے لکڑیاں اتار اتار کر ایک میدان میں ڈالی جا رہی تھیں۔ جہاں قریب ہی بیل گاڑیاں کھڑی تھیں اور یہ لکڑیاں ان میں بھر دی جاتی تھیں۔ ان میں جلانے کی لکڑیاں بھی تھیں اور درختوں کے تنے بھی جو تین طرف سے گول تھے اور ایک طرف سے چھلے ہوئے ہموار تھے۔ شاید یہ گھروں کے دروازے بنانے کے لئے استعمال ہوتے ہوں گے۔

اب جو میں نے دوسری طرف دیکھا تو بہت سی عورتیں مٹی کی اینٹیں بنا بنا کر دور تک رکھتی نظر آئیں۔ ایک اور طرف کچھ لوگ مٹی کے برتن یعنی پیالے، گلاس اور ہانڈیاں اور بڑے بڑے جار اور مٹکے بھی بناتے جاتے اور دھوپ میں سوکھنے کے لئے رکھتے جاتے تھے۔ کہیں کہیں ان بڑے جاروں میں گندم کو بھی بھرا جا رہا تھا۔ جس طرح کی بیل گاڑیاں میں نے پہلے منظر میں دیکھی تھیں مجھے وہاں بھی چلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ یہ جگہ شاید کوئی بازار تھا۔ دکانوں پر اکثر چیزیں خریدی اور بیچی جا رہی تھیں اور مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں رکھی تھیں، گندم، جو، جوار اور شہد بیچا اور خریدا جا رہا تھا۔ مردوں کے اوپر کا جسم ننگا ہی تھا۔ کسی کسی نے ایک کپڑا سا کندھے پر ڈال رکھا تھا اور نچلے حصے کو بھی کپڑے میں لپیٹ کر اسے چھپایا ہوا تھا۔ عورتیں بھی آ جا رہی تھیں اور ان کے سروں پر اور ان کے گلوں میں سیپیوں اور کوڑیوں کے ہار سے پڑے نظر آتے تھے۔ ایک اور جگہ ایک کڑھاؤ میں ہرے ہرے درختوں کے پتے اور چھوٹی چھوٹی سبز شاخیں ابالی جا رہی تھیں۔ جب ان کا سبز سا عرق نکل کر ٹھنڈا ہو جاتا تھا تو مٹی کے گلاس، پیالوں اور برتنوں پر اس سبز رنگ سے آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر ان کو زیادہ خوبصورت سا بنا دیا جاتا تھا۔ یہ بھی دکانوں پر بک رہے تھے۔

ذرا دیر میں یہ سب کچھ پھر غائب ہو گیا اور پھر میں نے خود کو ایک ویران سی جگہ کھڑے پایا۔ دریا یونہی بہہ رہا تھا۔ کشتیاں اسی طرح پانی میں آ جا رہی تھیں اور ذرا سے فاصلے پر دور ایک چھوٹے سے شہر کے خد و خال ابھر رہے تھے۔

دور سے مجھے ایک اونچی عمارت کا گنبد نظر آ رہا تھا۔ یہ بڑا شہر تھا اور اسی دریا کے کنارے آباد تھا جہاں کشتیاں آ جا رہی تھیں۔ مجھے وہی لکڑیاں اتارتی کشتیاں پھر نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف کچی اینٹیں بھی اسی طرح بنائی جا رہی تھیں اور اسی طرح کی بیل گاڑیاں اس شہر کے اندر بھی چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اس کے بازاروں میں اب جو دکانیں دیکھیں وہ زیادہ بڑی اور زیادہ بھری پڑی تھیں اور ان کا ساز و سامان بھی مختلف قسم کا تھا۔

ایک جگہ تانبے اور پیتل کے برتن بھی رکھے دیکھے۔ ایک دکان پر موتیوں جیسے بے ڈول دانوں کے بنے ہوئے ہار بھی دکھائی دیئے۔ اب یہاں لوہے کے بنے ہوئے اوزار اور مٹی کھودنے اور درخت کاٹنے کی کلہاڑیاں بھی لٹکی دیکھیں۔

میں نے اس شہر کے اندر کی گلیوں میں گھومنا شروع کر دیا۔ اس کی گلیاں چوڑی چوڑی تھیں، کناروں پر گندے پانی کی نالیاں بھی بنی ہوئی تھیں جہاں سے گھروں کا گندا پانی ان نالیوں میں آ رہا تھا۔ مکان بھی عموماً دو منزلہ تھے۔ ایک بڑی سی کھلی جگہ پر ایک لمبا چوڑا سا گودام بھی بنا ہوا تھا جہاں بیلوں کی کئی گاڑیاں سے مٹی سے بنے ہوئے بڑے بڑے جاروں میں شاید گندم اتار کر جمع کیا جا رہا تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تو ایک اور بڑا سا احاطہ نظر آیا اس کا بھی ایک دروازہ تھا اور یہ کھلا ہوا بھی تھا۔ سو میں اس کے بھی اندر گھس گیا کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ نہ کوئی مجھے دیکھ رہا تھا اور نہ کوئی میری موجودگی اور میرے چلنے پھرنے کو کوئی اہمیت دے رہا تھا۔

یہ ایک بڑا سا حوض تھا جس کے کناروں پر اترنے کے لئے سیڑھیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ اس میں کچھ لوگ نہا رہے تھے۔ اس میں مٹی کی ایک نالی سے جو حوض کے اوپر کھلتی تھی پانی حوض میں گرتا جاتا تھا۔ ایک ہی وقت میں یہاں پندرہ سے بیس لوگ نہا رہے تھے اور کچھ تو حوض سے نکل کر ایک گیرڑ دے (یعنی گہرے زرد) رنگ کی چادر اوڑھ اوڑھ کر اور کمر کے گرد باندھ کر اس کا پلو اپنے کندھے پر ڈال کر باہر نکل جاتے تھے اور کچھ رنگین یا سفید سوتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ وہ بھی حوض سے نکل کر باہر چلے جاتے تھے۔ حوض کے آمنے سامنے دونوں طرف کئی کمرے بنے ہوئے تھے جہاں سے کچھ اور لوگ بھی مختصر سا لباس پہن کر آتے اور اسی حوض میں نہانے کے لئے اتر جاتے۔

میں بھی اس حوض والے احاطے سے باہر نکل کر ان گیرڑوا چادر اوڑھے ہوئے لوگوں کی پیچھے چلنے لگا۔

وہ جو ایک اونچی سی گنبد والی عمارت بنی ہوئی مجھے نظر آئی تھی یہ لوگ اسی طرف جا رہے تھے۔ قریب جا کر اندازہ ہوا کہ یہ تو ایک گول سی اور بہت بڑی عمارت تھی جس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ کمروں کے باہر ایک بڑا سا مٹی کا مجسمہ بھی رکھا ہوا تھا جس میں ایک شخص

کو آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کیۓ ہوئے بیٹھا دکھایا گیا تھا۔ یہ زرد رنگ کی چادر اوڑھے جو بھی لوگ اندر آئے تھے وہ پہلے اس مجسمے کے سامنے جھکتے تھے اور پھر سامنے بنے ہوئے کمروں میں سے کسی میں بھی چلے جاتے تھے۔ اس عمارت کے بڑے گنبد کے اوپر چھ چھوٹے چھوٹے اور بھی گنبد بنے ہوئے تھے۔ گویا یہ چھ سات گنبدوں کا ایک مینار سا بن گیا تھا۔

پھر میں بھی وہاں اس کے دروازے سے باہر نکل آیا اور باہر نکل کر گلیوں سے نکلتا ہوا آگے چلا تو سامنے ہی دریا بہتا نظر آنے لگا۔ بڑا ہی دلکش نظارہ تھا، بہت خوبصورت منظر تھا اور میرے بائیں طرف جہاں شہر ختم ہوتا تھا وہیں دور تک گندم اور کپاس کے کھیت ہی کھیت نظر آ رہے تھے۔

یکا یک میں نے دیکھا کہ دریا کی سطح پر ایک شخص پیدل چلتا ہوا کنارے کی طرف آ رہا تھا اور یہ اس اطمینان سے چل رہا تھا گویا پانی پر نہیں زمین پر قدم بقدم آگے بڑھ رہا ہو۔ میرے کان میں کسی نے سرگوشی کی کہ: ''یہ جے بوکارا ہے۔ دریا کی دوسری طرف سے عبادت کر کے آ رہا ہے۔ یہ ہر چھ ماہ بعد اسی طرح یہاں آتا ہے''۔ یہ یہاں سے کہیں اور نہیں جا سکتا۔ اس کو دیکھ اور یہ بھی دیکھ کہ اس شہر کے اوپر گزرے ہوئے کتنے اور پرانے اور پرانے دور تجھے دکھا دیۓ گئے ہیں۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا میرے قریب کوئی بھی نہیں تھا۔

''تو یہ جملہ کس کا تھا؟ یہ سرگوشی کس نے کی تھی''؟

اس شخص نے قریب آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اتنی لمبی مدت میں آج پہلی بار سیاہ فام جادوگرنی جامش نے مجھ سے بات کی تھی۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ:

''ماتھے پر تین ستاروں اور گھٹنوں سے لمبے ہاتھوں والے نوجوان کو مین نے تجھ تک پہنچا دیا ہے''۔

وہ مجھ سے کہہ رہا تھا:

''نوجوان! تو نہیں جانتا ہم نے کتنی مرتبہ تجھ کو دیوتاؤں سے مانگا ہے۔ کتنی صدیوں تیرا انتظار کیا ہے اور کئی التجاؤں اور دعاؤں کے بعد تجھے پایا ہے۔ اب میرا انتظار اور میرا کام ختم ہونے والا ہے۔

میں نے سوال کیا:

''_ مگر یہ کون سی جگہ ہے؟ میں کہاں ہوں؟ اور یہاں مجھے کیا کام انجام دینا ہے''؟

جواب ملا:

"تجھے کچھ نہیں کرنا ہے۔ سب کام آسمانی دیوتا تجھ سے خود ہی کرائیں گے۔ ملکہ یوران کا رومال اور مردوقش کی ہڈی تیری رہبری کے لئے کافی ہیں اور وہ تیری حفاظت بھی کرتے رہیں گے اور یہ جگہ، یہ شہر، یہی تو مُردوں کا کھنڈر ہے۔ تجھے یہ بستی پہلے بھی دکھائی جا چکی ہے"۔

میں نے کہا:

"مگر جب بھی میں نے اسے دیکھا تو ہر بار یہ بدلی ہوئی نظر آتی ہے"۔

اس نے کہا:

"ہاں! کیونکہ یہ سات مرتبہ آباد ہوئی اور پھر سات مرتبہ ہی اجاڑ دی گئی۔ یہ سیاہ فام لوگ جو سب سے پہلے ادھر آئے۔ یہاں کے اصلی باشندے تھے۔ امن پسند، مل جل کر رہنے والے، لوگوں کو مارنے اور لڑنے کے لئے انہوں نے لوہا دیکھا ہی نہ تھا۔ یہ جنگلی درختوں کے پھل اور دریاؤں کی مچھلیاں کھاتے تھے۔ پھر انہوں نے کہیں کہیں سے گندم کے جنگلی پودے لا کر کاشت کرنے شروع کئے۔ جنگلوں کی لکڑی سے گھر بنایا اور اس کے درختوں سے پھل اور تھوڑا بہت غلہ اگایا یہ بھی ان کا مشغلہ تھا۔ یہ ایک مدت تک اسی طرح رہتے بستے رہے۔

مگر پھر ایک ایسی بیماری پھیلی کہ ان میں سے کوئی بھی نہ بچا۔ یہ شہر اجڑ گیا۔ اس پر مٹی پڑی رہی اور پھر ایسے ہی صدیاں گزر گئیں اور یہ شہر پھر سے آباد ہو گیا اور بہت دن بعد پھر سے یہ شہر اجڑ گیا۔ اس بار اسے دریا نگل گیا تھا۔ یہ شہر اسی طرح سات بار اجڑا اور پھر آباد ہوا۔ آخری مرتبہ جب یہ شہر اجڑا تو اس کے 500 سال کے بعد مینا متی یہاں لائی گئی تھی۔ اس وقت بڑی بستی تو ویران ہی تھی مگر اس کے قریب ہی کچھ لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا کر رہنے لگے تھے۔ یہیں کچھ کشتیاں آ آ کر لکڑیاں اتارتے تھے اور یہاں سے جنگلی پھل اور جانوروں کی کھالیں لے جاتے تھے۔ جس سے وہ پانی کی مشکیں بناتے تھے۔ اس طرح یہاں کشتیاں بھی رکنے لگی تھیں اور کچھ کھیت بھی آباد ہوتے جا رہے تھے اور کچھ مجسمہ ساز بھی یہاں پیتل اور کانسی کے مجسمے اور مٹی کی مہریں بنانے لگے تھے۔ یہ شہر آہستہ آہستہ پھر سے آباد ہونے لگا تھا۔ یہ اس شہر کی آخری آبادی تھی۔

مینا متی یہاں لائی گئی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا مگر جب تک میں خود ظاہر نہ ہوتا تھا کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا اور یہ وہ منتر تھے جن کی بدولت میں غائب ہو کر بھی موجود رہتا تھا۔ ایک دن ایک مجسمہ ساز نے مجھے اپنا ایک بہت بڑا اور پرانا مجسمہ دکھایا تھا جو کسی دیوی کا تھا یا شاید وہ کسی مندر

کی دیوداسی تھی جو گھٹنے پر ہاتھ رکھے ناچنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ میں اس سے اسی انداز کا ایک مجسمہ شہزادی مینا متی کا بنوایا تا کہ اس کے نجات دہندہ کو اس کو پہچاننے میں آسانی ہو اور ایک ایسا ہی مجسمہ مٹی کا بنوایا تا کہ یہ جگہ پھر کبھی برباد ہو جائے تو نجات دہندہ یہ گواہی دے سکے کہ جے بوکارا یہاں تک شہزادی کی حفاظت کرتا ہوا آ چکا تھا۔ پھر وہ مجھے اس شہزادے کے متعلق بھی نہ جانے کیا کیا بتاتا رہا جو اس شہزادی کو قید کئے ہوئے اتنے دور دراز کے علاقوں تک آ چکا تھا۔ وہ اس شہزادی پر کوئی ظلم تو نہ کرتا تھا مگر اسے قید میں رکھ کر اس کے باپ سے اپنی شکست کا انتقام لے رہا تھا۔ اس شہزادے کا نام دخت رز تھا۔

پھر میں نے سنا وہ کہہ رہا تھا:

"یہ جگہ چھوٹی سی بستی تھی اور اس مُردوں کا کھنڈر یا بستی کے آس پاس یہاں قریب میں کوئی بڑی بستی نہیں تھی اسی لئے شہزادی کو یہاں آسانی بغیر کسی حملے کے خطرے کے لمبی مدت کے لئے قید بھی رکھا جا سکتا تھا اور اس باغی شہزادے کو اپنے پکڑے جانے کا خطرہ بھی نہ تھا۔ شہزادی یہاں دو سال قید میں رہی۔ میں ہر چھ ماہ کے بعد اس دریا کی دوسری طرف جا کر ایک ماہ دیوتاؤں کی عبادت کیا کرتا تھا اور ایک بار جب میں اس پوجا سے واپس آیا تو نہ اس بستی کا نشان باقی تھا اور نہ شہزادی کا کچھ پتہ تھا۔ یہاں صرف دریا کا پانی پھیلا ہوا تھا۔ کسی سیلاب نے پھر سے یہ بستی اجاڑ دی تھی۔ دیوتا مجھے بتا چکے تھے کہ میں اس کھنڈر سے آگے نہیں جا سکوں گا اور مجھے یہیں اسی ویرانے میں اسی مُردوں کے کھنڈر میں رہ کر تیرا انتظار کرنا ہوگا"۔

میں نے پوچھا:

"مگر جو لوگ یہاں آ کر رہتے تھے کیا انہوں نے ہی وہ اونچی گنبدوں والی عمارت بنائی تھی جو مجھے ابھی یہیں پر نظر آئی تھی"؟

"نہیں! وہ تو ان لوگوں نے بنائی تھی جو آخری مرتبہ یعنی ساتویں بار یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ یہ ان کی پوجا کا مندر تھا اور ان کے سادھوؤں کا مدرسہ بھی تھا۔

اس بستی میں بہت سا پیسہ اور خوشحالی تھی۔ بہت امن تھا اور ہر گھر میں گائے بیل رکھے جاتے تھے۔ ہر گھر میں ایک کنواں بھی ہوتا تھا۔ یہاں سے کشتیوں کے آنے جانے والوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ یہاں سونے اور چاندی کی زیورات بھی بنتے تھے اور مٹی کی مہریں بھی جو مال بیچنے اور خریدنے والے ضمانت کے طور پر استعمال کرتے تھے"۔

میں نے سوال کیا:

''مگر یہ اتنا بڑا مندر یہاں کیوں بنایا گیا تھا''؟

اس نے کہا:

''یہ مندر ان لوگوں نے بنایا تھا جو شہزادی کے اس بستی میں آنے سے 5/6 سو سال پہلے یہاں آباد تھے۔ اس وقت یہ شہر بہت بڑا اور خوشحال تھا۔ یہ ان کا مندر تھا اور یہیں اس مندر کے پجاری نوجوان شاگردوں کو پوجا کی تعلیم دیتے تھے۔ دور دور کے نوجوان سادھو یہاں آ کر ٹھہرتے تھے اور کچھ مستقل قیام بھی کر لیتے تھے۔ وہ اپنے کسی دیوتا کو بھی پوجتے تھے اور سورج چاند اور دریا کی بھی پوجا کیا کرتے تھے۔ یہ مندر بہت دور دور تک مشہور تھا اور کشتیوں میں جو لوگ اس شہر میں مال لے کر آتے تھے وہ بھی دریا پر اپنی کشتیاں ٹھہرا کر سب سے پہلے اسی مندر میں آ کر پوجا کرتے تھے اور پھر جا کر اپنی چیزیں بیچا اور خریدا کرتے تھے''۔

جے بوکارا سے میں اس شہر کی بارے میں بہت کچھ پوچھتا رہا اور وہ مجھے اس طرح اس کے بارے میں بتاتا رہا جیسے وہ اس زمانے میں خود بھی اسی شہر میں رہتا رہا ہو۔ مگر یہ شہر تو اس کے یہاں آنے سے بھی 500 سال پہلے برباد ہو کر مُردوں کا کھنڈر بن چکا تھا۔ پھر اس کو یہ سب معلومات کیسے حاصل ہوئیں؟ میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا کہ اس نے میرا ذہن پڑھ لیا اور پھر میری طرف یونہی سرسری سی نظر ڈال کر کہنے لگا کہ:

''__ دیوتا جنہیں آنکھیں دیتے ہیں وہ ہزاروں سال پیچھے اور صدیوں آگے تک دیکھ سکتے ہیں''۔

جے بوکارا نے مجھے بتایا کہ:

''شہزادی مینامتی اس بستی میں دو سال قید رکھی گئی تھی۔ وہ ایک گھر میں رہتی تھی۔ کچھ عورتیں بھی اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے اس کے ساتھ رکھی گئی تھیں جو اسے کھانا پینا دیتی تھیں اور اسے ناچ گانا بھی سکھاتی تھیں۔ شہزادی کبھی بھی کسی سے کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ جو اسے دے دیا جاتا تھا وہ کھا لیتی تھی اور جب بھی کبھی اس کو قید کرنے والا شہزادہ اسے ناچنے کے لئے بلاتا تو وہ بغیر کسی انکار کے اس کے روبرو چلی جایا کرتی تھی۔ بس اس نے ایک چپ سی سادھ لی تھی اور ایک چلتی پھرتی لاش کی طرح سے وہاں رہا کرتی تھی۔

اس گھر میں ایک کنواں تھا وہیں سے اس کو پانی ملتا تھا اور دودھ بھی گھر ہی کی گائے سے مل جاتا تھا۔ نہ وہ کچھ مانگتی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی شکایت کرتی تھی۔ یا تو وہ چپ رہتی تھی یا روتی رہتی تھی۔ ہر ماہ چاند کی چودھویں تاریخ کی سہ پہر کو اسے ناچنے کے لئے شہزادے

کے گھر پہنچا دیا جاتا تھا جہاں وہ رات کے کھانے سے پہلے واپس آ جاتی تھی۔ شاید اس طرح قید میں رکھ کر اور اسے ناچ پر مجبور کر کے یہ شہزادہ اس کے باپ کا انتقام لے رہا تھا''۔

میں نے پوچھا:

''مگر یہ شہزادہ اسے کیوں لئے لئے پھر رہا تھا؟ یا تو باپ کا انتقام لینے کے لئے وہ اس کی بیٹی کو مار دے یا پھر کسی نہ کسی طرح اپنے ملک واپس جا کر سیناشرب سے اپنے باپ کی حکومت دوبارہ چھین لیتا''؟

اس نے بتایا:

''یہاں تک پہنچنے سے پہلے وہ کئی سال تک مشرق کی سمت سفر کرتا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے کچھ فوجی بھی تھے اور وہ جہاں بھی جاتا وہاں کے جادوگروں سے یہی ایک سوال پوچھتا کہ:

''کیا کوئی کبھی اس شہزادی کو واپس لینے کے لئے آئے گا''؟ اور یہ جو اپنے باپ کو یاد کرتی روتی رہتی ہے یہ کبھی اپنے باپ سے ملے گی؟

سب اسے یہی جواب دیتے تھے کہ:

''ہاں! اسے لینے کے لئے ضرور کوئی آئے گا''۔

اور پھر میں نے بھی اس کو بتا دیا تھا بلکہ اسے یقین دلا دیا تھا کہ:

''بادشاہ اپنی شہزادی کے لئے بہت دکھی اور پریشان ہے اور ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب مینامتی کو آزاد کرانے کے لئے کوئی اس کے پیچھے پیچھے چلا آئے گا''۔

تو اسی لئے اس شہزادے نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے اس قیدی کو جب ہی قید سے آزاد کر کے اپنے باپ کے پاس واپس بھیجے گا جب بدلے میں اس کی کھوئی ہوئی سلطنت اسے واپس ملے گی۔ اسی امید پر وہ اس شہزادی کو نہ قتل کر سکتا تھا اور نہ ہی اسے بہت سختیوں اور دکھوں میں ڈال سکتا تھا۔

شہزادی بھی اس سے کسی قسم کی بغاوت یا سرکشی کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ بس سختیوں اور صبر کی ایک جنگ تھی جو چل رہی تھی۔ لیکن کبھی کبھی شہزادہ یہ ضرور سوچتا تھا کہ اس لمبے عرصے تک اس لڑکی کو قید میں رکھ کر وہ کیوں اس کے صبر کو آزما رہا ہے؟ کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے وہ خود ہی اپنے انتقام کی ضد کا قیدی بن چکا ہے اور شہزادی اسی طرح بے خوف و خطر صبر کرتی جا رہی ہے جیسا کہ پہلے ہی دن سے اس کا طور طریقہ رہا تھا کہ گویا وہ آج بھی ہر فکر سے آزاد تھی۔

جہاں بھی شہزادہ پہنچتا تھا وہ اس سے نہ اس مقام کا پتہ پوچھتی تھی، نہ یہ معلوم کرتی تھی کہ وہ وہاں کب تک رکے گا، نہ اس کی منتیں کرتی تھی کہ اسے اس کے باپ کے محل میں واپس کر دیا جائے۔ جب بھی وہ کسی نئے مقام سے آگے کی طرف کوچ کرتا وہ اگلی منزل کے بارے میں بھی کوئی سوال نہیں کرتی تھی۔

شہزادہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے سامنے روئے، آنسو بہائے، چیخے چلائے اور گڑگڑا کر اپنے باپ کی طرف سے اس سے معافیاں مانگے تو اس کے جذبہ انتقام کو اور اس کی نخوت کو کچھ سکون ملے۔ مگر شہزادی یہ سب کچھ کبھی نہیں کرتی تھی۔ جب بھی شہزادہ ان جادوگروں، پجاریوں اور گیانیوں سے پوچھتا کہ اس شہزادی کی طرف بھیجا گیا آدمی کب اسے چھڑانے آئے گا تو سب اسے کسی بھی معین وقت کا اتا پتہ بتانے سے قاصر رہتے مگر ان سب کا علم یہ ضرور بتاتا تھا کہ کوئی آئے گا اور ضرور آئے گا۔ بس انتظار کرتے رہو۔

مگر اسی بستی میں دو سال گزر گئے اور کوئی بھی اس شہزادی کو لینے نہیں آیا تھا''۔

میں نے پوچھا:

''____ لیکن برباد ہونے کے بعد ہر مرتبہ یہ شہر پھر اسی جگہ کیوں آباد ہو جاتا تھا؟ کیا یہ کسی حکومت کا پایہ تخت تھا''؟

اس نے بتایا:

''نہیں! یہ شہر کسی راجہ یا بادشاہ کا شہر کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ مگر اس کو دریا کا کنارا اور اس کے آس پاس کی زرخیز زمین نے اس شہر کو ہمیشہ ایک متمول شہر بنائے رکھا۔ جب دریاؤں میں سیلاب آتے تھے تو اس کے کناروں سے بھی بہت آگے تک پانی پھیل جاتا تھا اور پھر یہ نیا پانی اور دریا کے سیلاب کی نئی مٹی اس جگہ کو اور بھی زرخیز اور سرسبز بنا دیتی تھی۔ اس شہر میں دولت آتی بھی تھی اور امن بھی تھا اور کوئی خطرہ بھی نہ تھا۔ اسی لئے اس کے چاروں طرف کبھی کوئی بھی فصیل نہیں بنا کر رکھی گئی تھی۔ بس ایک بار اس شہر پر کشتی والوں نے حملہ کیا تھا۔ یہ جب ہی ہوا تھا جب مینا متی وہاں قید تھی اور یہ اس شہر کی آخری بستی تھی مگر اس لوٹ مار کے حملے کے بعد بھی یہ شہر کئی سو سال تک آباد ہوتا چلا گیا۔ اسی حملے میں مینا متی کا ایک چھوٹا سا مجسمہ جو میں نے بنوا کر تمہارے لئے رکھا تھا وہ بھی چلا گیا تھا اور پھر اس حملے کے بعد جب میں ایک ماہ کی پوجا سے لوٹا تو یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ شہزادی، نہ اس کا مجسمہ اور ہاں بستی اسی طرح آباد ہوتی جا رہی تھی''۔

میں نے بے تابی سے پوچھا: ''کشتی والوں کا حملہ؟ مینامتی کا مجسمہ''؟

اس نے کہا:

''میں تو تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس شہر کی آخری آبادی ہمارے یعنی میرے، مینامتی اور شہزادے کے یہاں پہنچنے سے بہت پہلے ہی سے شروع ہو چکی تھی اور اس کی شان وشوکت پھر سے ابھر رہی تھی اور اسی دریا کے قریب ہی یہ معمولی سی بستی آباد ہو رہی تھی۔ سو جب مینا متی کے ساتھ ہم سب یہاں پہنچے تو اس چھوٹی سی بستی میں ہم سب رک گئے تھے۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ میری قسمت میں یہاں سے آگے جانا نہیں ہوگا۔ سو یہاں کے ایک مجسمہ ساز کے پاس پرانے وقتوں کا کسی لڑکی کا ایک پیتل کا مجسمہ تھا۔ اسی طرح ناچنے کے انداز میں۔ اس مجسمہ ساز نے مینامتی کا مجسمہ بھی بنا دیا تھا مگر اس کا چہرہ شہزادی مینامتی ہی کا تھا اور انداز وہی پرانے مجسمے کا تھا۔ مگر یہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ شہزادی کا مجسمہ تو لٹ گیا مگر میرا مجسمہ رہ گیا اور وہ پرانا پیتل کا مجسمہ بھی جس کو دیکھ کر اس مجسمہ ساز نے میرے لئے ''مینامتی'' کا مجسمہ بنایا تھا۔ مگر وہ سب کچھ نہ جانے کہاں گم ہو چکا تھا۔

دن انتظار میں گزرتے گئے۔ شہزادے نے دو سال یہاں انتظار کیا۔ وہ مینامتی کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ بس اس کے بدلے میں اسے اپنی حکومت واپس لینی تھی۔ دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ مینامتی کو قید سے چھڑانے کوئی بھی نہیں آیا۔ مجھے دیوتاؤں نے زندہ رکھا تھا کہ میں تجھے ساری کہانی بتا سکوں۔ پھر میں زندوں سے سایوں میں بدل دیا گیا۔ مگر مجھے یہیں رکنے کا حکم تھا''۔

میں نے پوچھا:

''پھر تمہیں شہزادی کے حال کا پتہ ہی نہ چلا ہوگا کہ وہ کہاں چلی گئی''؟

اس نے کہا:

''میں اپنی طاقتوں سے یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ کہاں لئے جائی جا رہی ہے؟ کس حال میں ہے؟ اور وہ کن دکھوں اور تکلیفوں سے گزر رہی ہے۔ مگر ان کے جانے کے بعد میں ان کی کوئی مدد کرنے کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔ شہزادی کو وہ باغی شہزادہ اسی طرح قیدی بنا کر اونچے اونچے پہاڑوں سے نکلنے والے دریاؤں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے؟ وہ بس مشرق کی سمت چلتا رہا تھا۔ پہاڑوں سے نکلنے والے ایک دریا کا نام گنگا تھا۔ وہ وہاں تک جا پہنچا۔ کبھی رکتا اور کبھی چلتا وہاں تک پہنچ ہی گیا جہاں

وہ دریا یا ندی بوڑھی ہو کر بوڑھی گنگا کہلانے لگی تھی۔ یہیں اس کا آخری پڑاؤ تھا''۔

جے بوکارا اب مجھے دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ دور فضاؤں میں نظریں گاڑے کہیں اور ہی کھویا ہوا تھا۔ پھر وہ خود ہی مجھ سے کہنے لگا:

''یہاں کے لوگ سیاہ فام کالے تھے اور شہزادی کا رنگ سرخ تھا تو وہ لال مائی کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ جب یہ شہزادہ اس حملے کے دوران یہاں سے نکل گیا تھا تو دریا کے کنارے چلتے چلتے ایک دن اسی باغی شہزادے نے مینامتی کو شادی کا پیغام دیا۔ وہ اس معصوم شہزادی سے خاموش محبت کرنے لگا تھا جو چپ چاپ اس کا ہر حکم مانتی چلی آ رہی تھی''۔

ماں باپ سے بچھڑے ہوئے شہزادی کو پانچ سال گزر چکے تھے۔ تنہائی میں اسے اپنا محل، اپنے ماں باپ، بھائی، بہن سب ہی بہت یاد آتے تھے۔ مگر وہ نہ ان عورتوں سے کوئی بات کرتی تھی جو اس کے ساتھ رہ کر اس کی حفاظت کرتی تھیں اور اسے ناچ گانا بھی سکھاتی تھیں۔ نہ وہ اپنے قید کرنے والے شہزادے سے بات کرتی تھی، نہ اس سے کبھی کوئی شکایت کی اور نہ ہی اس دور دراز کے سفر پر ایک بھی لفظ کہا۔ وہ ہنسنا مسکرانا تو بہت پہلے ہی بھول چکی تھی اب بات کرنا بھی اسے یاد نہ رہا تھا۔ وہ ایک جادو کی مورت جیسی بن گئی تھی۔ جیسا اس کو حکم دیا جاتا تھا بس وہی کرنے لگتی تھی۔

پانچ سال کی قید کے دوران ایک دن شہزادے نے اس سے پوچھا:

''اگر میں تمہیں قید سے آزاد کر دوں تو تم کیا کرو گی''؟

اس نے اس بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ چند دن اور گزر گئے اور شہزادے نے پھر وہی سوال دہرایا:

''اگر میں تمہیں آزاد کر دوں تو تم کیا کرو گی''؟

اس پر شہزادی کے دل میں جو پانچ سال سے لاوا پک رہا تھا وہ ابلنے لگا۔ لال مائی تو وہ تھی ہی اس سوال پر اس کا چہرہ اور بھی سرخ ہو گیا۔ کانوں کی لوئیں تک تمتمانے لگیں۔ آنکھوں میں ایکدم ایسی سرخی آ گئی جیسے آگ کے شعلے دہکنے لگے ہوں۔

اس نے نہایت آہستگی سے کچھ کہا۔ شہزادے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کیا کہا ہے۔ اس نے شہزادی کی طرف پھر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس کے لب ہلے۔ اس کا سارا غصہ، اس کی نفرت، بے چارگی اور اس کا جذبہ انتقام صرف یہ کہہ سکا:

''پہلے میں تمہیں قتل کروں گی''۔

شہزادے کو شاید اس جواب کی توقع نہ تھی مگر پھر بھی اس نے ذرا سی خاموشی اختیار کی اور پہلو میں کمر پیٹی سے بندھے ہوئے خنجر کو نکال کر سامنے رکھ دیا اور شہزادی کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ وہ اس کی ایک ایک حرکت کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شہزادی کی نظر صرف خنجر پر تھی۔ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی اور پھر بجلی کی سی تیزی سے خنجر کی طرف لپکی۔

اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ خنجر تک پہنچتا شہزادے نے اسے بیچ میں روک لیا اور کہا:

''خنجر اٹھانے سے پہلے یہ بتاؤ کہ مجھے مارنے کے بعد تم واپس اپنے ملک کیسے پہنچو گی؟ کیسے اپنے ماں باپ سے ملوگی؟ یہ جو پانچ سال کا سفر کر کے ہم یہاں تک آگئے ہیں تو یہاں سے واپسی کا راستہ خود بھی بھول چکا ہوں تو یہ واپسی کا راستہ تمہیں کیسے ملے گا''؟

شہزادی رک گئی۔ خنجر ابھی تک اس کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ ایک بار اس نے تھوڑا سا ہاتھ آگے بڑھایا۔ شہزادے نے نہ اسے روکا اور نہ ہی خنجر کو اس کی جگہ سے ہٹایا۔ وہ خود بھی جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا اور پھر شہزادی نے خود ہی اپنا بڑھتا ہوا ہاتھ روک لیا اور پھر بغیر کچھ کہے سنے واپس پلٹ گئی''۔

جے بوکارا یہاں تک مینا متی کی بات کر کے چپ ہو گیا۔

میں نے پوچھا: ''پھر کیا ہوا''؟

جے بوکارا نے کہا:

''یہاں کے بعد میرا علم مجھ سے بالکل چھن گیا اور مجھ سے مینا متی شہزادی سے متعلق آئندہ کی ہر چیز واپس لے لی گئی۔ مجھے سایوں کی حیثیت سے زندہ رکھا گیا۔ بس مجھے اتنا بتایا گیا تھا کہ اگر کوئی بھی کبھی بھی شہزادی کو اس کی مرضی کے بغیر چھوئے گا تو اس کی انہی انگلیوں سے خون کا فوارہ بہنا شروع ہو جائے گا اور نہ صرف یہ بلکہ اس کی آئندہ تین نسلیں بھی اس گناہ کا خمیازہ بھگتیں گی اور اسی طرح انگلیوں سے خون بہہ جانے سے مرا کریں گی۔ میں تمہیں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں بتا سکتا اور نہ ہی تمہارے آگے کے سفر میں کوئی راستہ دکھا سکوں گا اور شہزادی کا مجسمہ بھی ضایع ہو چکا ہے۔ اب دیوتا خود ہی تمہیں راستہ دکھائیں گے اور خود ہی شہزادی تک پہنچائیں گے''۔

میں نے سوال کیا:

''مجھے تو شہزادی کا چہرہ بھی کبھی نہیں دکھایا گیا ہے تو میں اسے کیسے پہچانوں گا''۔

اس نے کہا:

"تمہیں یہاں تک دیوتا ہی تو لے آئے ہیں اور وہی تمہیں آگے بھی لے جائیں گے۔تم روسی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا وہ دیوتاؤں کا آدمی ہے۔ جہاں تم رک جاؤ گے وہ تمہیں راستہ دکھائے گا اور پھر ماضی تمہیں ہڈی پر دکھایا جاتا رہا ہے۔خطروں سے حفاظت یوران کے رومال سے ہے۔تمہیں علم ہی نہیں کہ تمہیں کتنا مالا مال کیا جاچکا ہے"۔

اور پھر آن ہی آن میں ہمیشہ کی طرح سب کچھ معدوم ہو گیا۔ پھر کوئی دریا، نہ جنگل، نہ کشتیاں، نہ کوئی آواز، نہ کوئی سایہ، بس میں اور میری خاموشی۔

موئن جودڑو کی کھدائی۔۔ابتدائی تیاریاں

میرا دفتر لاڑکانہ شہر میں بن گیا تھا اور جس جگہ ہمیں کھدائی کرنا تھی وہ اس شہر سے 26 میل دور ایک جگہ ڈوکری کی قریب تھی۔ مجھے وہاں اس لمبے سے ٹیلے کا سروے کرنا تھا جسے مقامی لوگ ''موئن جودڑو'' (Mound of Deads) کہتے تھے۔

بظاہر میرا کام بہت معمولی لگتا تھا مگر اس میں زمین کی ساخت دیکھ کر اور اس جگہ پر پھیلے ہوئے تمام کنکر، مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلوں کو اور اس ٹیلے پر مٹی کے برتنوں کی معمولی معمولی نشانیوں کو غور سے دیکھ دیکھ کر اور اس پورے علاقے میں بکھری ہوئی زمین کی ہر چھوٹی بڑی یکسانیت یا تفریق کو نظر میں رکھ کر یہ اندازہ لگانا تھا کہ اگر کھدائی شروع کی جائے گی تو وہ زیر زمین کتنے لمبے چوڑے رقبے پر محیط ہوگی اور پھر یہ بات بھی لازمی تھی کہ زمین کی اوپری سطح سے نیچے دبی ہوئی بستی کا آپ کتنا ہی اندازہ لگالیں مگر اس کی وسعت اور اس کے پھیلاؤ کا اندازہ اور صحیح رقبہ جب ہی متعین کیا جاسکتا تھا جب یہ کھدائی اندر ہی اندر ملتی چلی جاتی۔

جان مارشل نے مجھے اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ بھی ہدایت کی تھی کہ میں یہاں مختلف جگہ کئی کنویں کھدوا کر یہ بھی معلوم کرلوں کہ زیر زمین پانی کتنی گہرائی میں موجود ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ انڈیا میں کئی جگہ جب انہوں نے اس طرح کی کھدائیاں کرنا شروع کی تھیں تو جیسے جیسے کھدائی گہری ہوتی جاتی تھی تو اندر تہہ در تہہ دس پندرہ فٹ کی گہرائیوں پر ایک ہی کھنڈر سے اور پرانی اور اس کے نیچے اس سے بھی پرانی اور اس کے نیچے اس سے بھی پرانی کئی کئی قدیم تہذیبوں کے آثار نکلتے چلے آتے تھے۔

چونکہ یہ قدیم آبادیاں ہمیشہ دریاؤں کے کناروں پر یا تجارتی قافلوں کی راہوں پر ہی بسائی جاتی تھیں تو ان کے قریب دریاؤں کا پانی بھی زیر زمین پہلے ہی موجود ہوتا تھا اور جب کچھ پانی کہیں کی سطح اوپر آنے لگتی تھی تو اس میں سے زیر زمین پانی کو نکالنے کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جاتا تھا اور اگر اندر زیر زمین اس پانی کو ان کھدائیوں تک رستے رہنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تو ان کھنڈرات کی تمام قیمتی باقیات اور جزوی سماجی اور روزمرہ کی زندگی کے سب کے سب آثار ہی بری طرح

بوسیدگی کا شکار ہو کر تقریباً ضایع ہی ہو جاتے تھے۔ مگر ایسے کئی کنویں کھدوانے سے پہلے مجھے یہ بھی یقین کرنا تھا کہ یہ کنویں زیرِ زمین دفن شدہ آثار سے دور کھدوائے جائیں تاکہ اصل آثار کو اس طرح بے فائدہ کھدائی سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مجھے یہاں سے اوپری سطح پر پڑی ہوئی ہر چھوٹی سے چھوٹی حاصل ہونے والی ہر چیز کا ایک مکمل ریکارڈ بھی رکھنا تھا کہ اگر کوئی قابلِ ذکر چیز مجھے ملی ہے تو وہ اس ٹیلے کے کس مقام سے اور سروے ہونے والے رقبے کے کس دائرے پر نظر آئی تھی۔ اس کی دریافت کی تاریخ کیا تھی۔ اس کی لمبائی، چوڑائی اور موٹائی کو بھی ناپ کر لکھنا تھا کہ اس کا حجم کیا تھا اور اس شے کو ایک الگ شیشے کے برتن میں محفوظ کر کے اس ریکارڈ کی ایک نقل اس کی پشت پر بھی چسپاں کر دینی تھی۔

جان مارشل کی ہدایت کے مطابق مجھے اس کھنڈر کے قریب ایک ایسا ہی لمبا سا کمرہ بھی بنوانا تھا جہاں مجھے 100 کے قریب شیشے کی ایسی الماریاں اور کم از کم بیس ایسی میزیں بھی رکھنی تھیں جہاں کھدائی کے بعد چھلنیوں سے چھنا ہوا ملبہ بچھا کر ان کا معائنہ کر کے ضروری اشیاء کو نکال کر ترتیب سے رکھا جا سکے گا۔ گویا جیسا کہ جان وولی کے ہاں ایسا لمبا کمرہ میں دیکھ چکا تھا ویسا ہی کمرہ مجھے یہاں بنوانا تھا اور اسی طرح کی میزیں اور کام کرنے والے اوزار، رسیاں، پھاوڑے، بیلچے، شیشے کے ڈبے اور رجسٹر وغیرہ جمع کر کے رکھنا تھے تاکہ جب یہاں کھدائی کا باقاعدہ کام شروع کیا جائے تو ضرورت کی تمام اشیاء پہلے ہی سے موجود ہوں۔

سروے کئے جانے کے بعد سے اس کے تمام نقشہ جات جان مارشل کو بھیجے جانے تھے۔ جسے وہ صوبائی حکومت سے منظور کرا کے یہاں پر کھدائی کی اجازت حاصل کر سکیں اور یہ علاقہ ہر قسم کے ملکیتی، زراعتی یا تجارتی مصرف سے علیحدہ قرار دیا جا سکے اور اس کا ایک باقاعدہ نوٹیفکیشن بھی جاری کر دیا جائے۔

اس کھنڈر کے بارے میں عجیب عجیب کہانیاں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا یہاں سے گھنگروؤں کے ساتھ چلنے کی آواز آتی ہے، کوئی اسے جنوں کی بستی سمجھتا تھا اس لئے کوئی بھی ادھر جانے کی حامی نہیں بھرتا تھا۔ یہ لوگ اس ٹیلے کو "مُردوں کا ٹیلہ" یعنی "موئن جودڑو" کہتے تھے اور یہاں کی بابت لوگوں میں عجیب عجیب کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ پورا کھنڈر بہت ہی زہریلے سانپوں کا مسکن تھا جو ہر وقت اِدھر اُدھر رینگتے نظر آتے تھے۔ اگر کسی کی بکری بھی اِدھر یا اُدھر جا نکلتی تو وہ زندہ بچ کر نہیں آ سکتی تھی۔ سانپ کے زہر کے جھاگ اس کے منہ سے نکلتے اور وہ دم توڑ دیتی تھی۔ وہاں پر جنگلی کیکر کی ایسی جھاڑیاں بھی تھیں کہ اگر ان کا

کانٹا بھی جسم میں چبھ جاتا تو اس آدمی کو دست اور قے شروع ہو جاتے اور اس کا بدن سوکھتا چلا جاتا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر کبھی کوئی بچہ بھی کھیلتا ہوا اس کھنڈر کی کوئی معمولی سی مٹی کے برتن کی ٹوٹی ہوئی چیز اٹھا لاتا تو اسے اس قسم کی بیماریاں لگتی تھیں کہ اسے کوئی آرام یا افاقہ نہ ہوتا تھا۔

خاص طور پر یہ بات مجھے کئی لوگوں نے بتائی تھی کہ اگر ان کی بیل گاڑیاں یا اونٹ بھی اس طرف سے گزر رہے ہوتے تھے تو وہ اس ٹیلے سے خود بخود مڑ کر دور ہو جاتے تھے اور پھر ایک آدھ میل دائرے کا چکر لگا کر بچ بچ کر آگے بڑھتے تھے۔ کسی نے بتایا کہ ایک بار اس نے کسی کتے کو اس ٹیلے کی طرف بھاگتے دیکھا وہ کسی رینگنے والی چھپکلی جیسی چیز کا تعاقب کر رہا تھا جو اس ٹیلے پر چڑھ گئی تھی۔ جیسے ہی کتے نے اس ٹیلے پر چھلانگ لگا کر اس جانور پر منہ ڈالنے کی کوشش کی وہ الٹے منہ پیچھے کی طرف گرا اور پھر کبھی نہ اٹھ سکا۔ گویا جتنے منہ اتنی باتیں۔

کئی دن اسی تگ و دو میں گزر گئے اور میں کسی ایک مزدور کو بھی اس ٹیلے پر لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس زمانے میں جوان، جفاکش اور تجربہ کار کھدائی والے مزدور چار آنے یومیہ پر مل جاتے تھے مگر مجھے ایک روپیہ یومیہ پر بھی مزدور نہ ملے۔ آخر ایک دن میں نے اپنے ساتھ دس مزدور لئے۔ ان کو تین اونٹوں پر سوار کرایا اور خود ان کے آگے آگے چلا اور ان کو اجرت بھی پہلے ہی دے دی تھی۔ وہ اس شرط پر ساتھ چلے کہ وہ خود ایک خاص فاصلے پر پہنچ کر رک جائیں گے۔ مُردوں کے ٹیلے پر میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ مگر وہ شام تک ادھر ہی رکیں گے اور میرا حشر دیکھ کر ہی واپس لوٹیں گے۔ میں نے احتیاطاً ایک پستول اور 30/40 راؤنڈ اپنی جیب میں رکھ لئے تھے۔ لاڑکانہ سے ہم سب لوگ اپنے اپنے اونٹوں پر صبح سویرے ہی نکل آئے تھے۔ وہاں سے ڈوکری کے گاؤں پہنچے جس سے کچھ فاصلے پر یہ مُردوں کا کھنڈر واقع تھا۔ اونٹ کی مہار میں نے ان کے سپرد کی اور میں پیدل چلتا ہوا ٹیلے تک پہنچ گیا۔

یہاں جنگلی جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے صحرائی پودوں کی بھرمار تھی۔ زمین کا رنگ کالا تھا جس میں نمکیت صاف نظر آتی تھی۔ یہ پوری زمین شوریدہ اور کلر زدہ تھی۔ اکّا دکّا سانپ بھی اور ان کے بہت سے بل بھی نظر آئے۔ بھرا ہوا پستول میرے ہاتھوں میں تھا مگر چلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

یہ ٹیلہ کوئی آدھ میل لمبائی اور دو سو گز چوڑائی کا تھا۔ کہیں کہیں اوپری سطح پر لال مٹی کے برتنوں کے ٹوٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی پڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ میں نے ان تمام لوگوں کی موجودگی میں اور ان کی نظروں کے سامنے اس پورے ٹیلے کا دو مرتبہ پھیرا لگایا اور پھر دو

تین گھنٹے وہاں رک کران کی طرف چلا گیا۔ گرمی بھی سخت ہونے لگی تھی اور میں نے ان ہی کے پاس واپس جا کر ان کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر اسی دن واپس لاڑکانہ لوٹ آئے۔

آہستہ آہستہ ان مزدوروں میں کچھ ہمت پیدا ہوئی۔ اب ہم نے لاڑکانہ کی بجائے ڈوکری کے گاؤں ہی میں اپنا عارضی پڑاؤ بنالیا تھا اور میں نے یہیں چند خیمے لگا کر انہی میں دن رات رہنا شروع کر دیا تھا۔ جلد ہی مجھے لاڑکانہ شہر سے ایک ایسا شخص بھی مل گیا جو کچھ انگریزی سمجھتا تھا اور میرے اور مزدوروں کے درمیان مترجم کا کام سرانجام دینے لگا تھا۔ میں نے اس کو مزدوروں کا انچارج اور ٹھیکیدار بنادیا اور ان کی چھٹیوں، تنخواہوں اور دیگر معاملات کا اسی کو ذمے دار بنادیا تھا۔

عراق سے بمبئی آنے کے بعد ہی سے روسی کا زیادہ وقت جان مارشل کے ساتھ ہی گزرتا تھا وہ اسے نہایت ہی با اعتماد شخص سمجھتے تھے اور ہمیشہ اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ حالانکہ وہ بار بار یہی اصرار کرتا رہتا تھا کہ اسے میرے ساتھ ہی رہنے کا موقع دیا جائے۔ لاڑکانہ اور ڈوکری کے قیام کے دوران بھی وہ میرے ساتھ نہ تھا۔ جان مارشل جب ہسنا پور کے ضلع میں گئے تو روسی ان ہی کے ساتھ تھا۔ اس دوران میں یعنی میرے لاڑکانہ کے ایک سال کے قیام کے وقفے میں ایک بار جان مارشل دہلی میں اپنے ہیڈکوارٹر سے لاڑکانہ کے ایک مختصر دورے پر میرے پاس آئے اور روسی بھی ان ہی کے ساتھ تھا۔ وہ مجھ سے ایک سال کے سروے کی تفصیلات پوچھتے اور سروے ہی سے متعلق مزید ہدایات دینے کے لئے آئے تھے۔

روسی نے تو مجھ سے اس عرصے میں مجھ سے جدا رہنے پر کوئی تبصرہ نہ کیا مگر جان مارشل نے اس سے متعلق ایک عجیب محیر العقول واقعہ ضرور سنایا۔ جان مارشل نے بتایا کہ

> ''ہستناپور کے قدیم علاقے سے کچھ دور انہیں ایک قدیم بدھ پگوڈا (عبادت گاہ) کے آثار کے متعلق معلوم ہوا تو وہ اپنے کچھ عملے کے ساتھ جن میں روسی بھی شامل تھا اس تباہ شدہ قدیم منہدم عبادت گاہ کے پاس پہنچے۔

اس مقام کی ابتدائی معلومات اور تفتیشی کھدائی کرنے کا طے کرنے کے بعد اس جگہ کو صرف دس فٹ گہرا کھودنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ کھدائی صرف بیس فٹ لمبے اور دس فٹ چوڑے زمین کے ٹکڑے پر کرنے کا کام شروع ہوا۔ روسی بھی بطور مزدور اور بطور مزدور گائیڈ کے اس کام میں شریک تھا اور یہ کھدائی ایک ماہ تک جاری رہی تھی۔ یہاں کی کھدائی کے دوران روسی کو لکڑی کا ایک چوکور تختہ ملا جو دو فٹ لمبا اور دو ہی فٹ چوڑا تھا۔ یہ لکڑی جب جان مارشل کے پاس پہنچائی گئی تو انہوں نے اسے دیکھ کر روسی ہی کو واپس کر دیا کہ اس کی مٹی وغیرہ صاف کر کے فی الحال اسے اپنے

ہی پاس رکھے تاکہ بعد میں اس کا تفصیلی معائنہ کیا جا سکے۔

روسی نے جب بہت محنت اور صفائی سے اسے صاف کر لیا تو معلوم ہوا کہ اس پر ایک گھوڑا گاڑی کی تصویر کا نقش تھا جس میں ایک شخص کو گھوڑے کی لگام تھامے گاڑی کے اندر کھڑا ہوا دکھایا گیا تھا اور اس کی پشت پر اسی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کوئی عورت بیٹھی ہوئی دکھائی گئی تھی۔ اس لکڑی پر بہت اچھی فن کاری سے گاڑی کے بہت ہی عمدہ اور شاہانہ نقوش ابھارے گئے تھے اور گھوڑے کم بھی اس انداز سے دکھایا گیا تھا جیسے وہ سرپٹ بھگایا جا رہا ہو۔

اس چھوٹی سی بگھی میں سوار عورت کا چہرہ بے حد دھندلا اور بہت غیر واضح تھا۔ سورج کی روشنی اس کے چہرے کی دائیں طرف پڑتی دکھائی دیتی تھی۔ روسی اس لکڑی کے نقش کو کئی دن سے بار بار صاف کر کے غور سے دیکھ دیکھ کر اس میں کچھ ڈھونڈتا ہوا معلوم ہوتا تھا''۔

ایک دن جب جان مارشل بھی اس کے کمرے کے قریب ہی تھے جہاں روسی قیام پذیر تھا تو ان کو کمرے کی کھڑکی سے روسی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا نظر آیا اور وہ لکڑی کا تختہ اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک جان مارشل نے اس کا ایک قہقہہ سنا پھر وہ زور سے چلایا:

''____ آخر تم مجھ سے کب تک بچ سکتے تھے''؟

جان مارشل اس کی آواز سن کر اس کے کمرے میں داخل ہو گئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس دو فٹ کی لکڑی پر بنے ہوئے گھوڑا رتھ کے پہیے تیز تیز گھوم رہے تھے اور تصویر میں بنے ہوئے گھوڑے بھی سرپٹ دوڑتے نظر آتے تھے۔ پہلے تو ان کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ تصویر کے رتھ کے پہیے کس طرح گھومتے دکھائی دے سکتے ہیں یا لکڑی پر کھدے ہوئے بے جان گھوڑوں کے جسم کی حرکت کیسے نظر آ سکتی ہے اور وہ کس طرح بھاگتے ہوئے دکھائی دے سکتے ہیں؟ لیکن وہ پھر بھی روسی کے پیچھے چپ چاپ کھڑے رہ کر اسے دیکھتے رہے۔

انہیں پھر روسی کی آواز سنائی دی جو خود ہی اپنے آپ سے ہمکلام تھا:

''یہ صبح کا وقت ہے، سورج کی روشنی تمہاری دائیں طرف آ رہی ہے یعنی تمہارے دائیں طرف مشرق ہے اور تم شمال کی طرف بھاگ رہے ہو۔ مُردوں کے کھنڈر سے شمال کی طرف یا شمال مشرق کی طرف۔ ہاں! اب میں سمجھا کہ مجھے نجات دہندہ سے ایک سال تک کیوں الگ رکھا گیا تھا۔ اس لئے کہ مجھے تمہاری صورت دکھائی جا سکے۔ کسی نہ کسی وقت مُردوں کے کھنڈر سے ضرور کوئی یہاں آیا ہوگا اور وہ تمہاری تصویر لے آیا ہوگا۔۔۔ ہاں! ایسا ہی ہوا ہوگا''۔

جان مارشل جیسے ہی آگے بڑھے کہ روسی سے کچھ پوچھ سکیں، تختے کے نقوش پھر سے ویسے ہی ساکت ہو گئے۔

جان مارشل نے اس لکڑی کی چوکور تختی کو روسی سے لیا تو اس نے درخواست کی کہ وہ اس کا معائنہ کر کے کچھ عرصے کے لئے اسے روسی کے پاس ہی چھوڑیں اور پھر یہ تختہ ان کو ضرور واپس مل جائے گا۔

دہلی واپس پہنچ کر جب انہوں نے اس تختی کا باقاعدہ معائنہ کیا تو انہیں اس لکڑی کی قدامت کئی صدیاں یعنی 600 سال قبل مسیح جتنی پرانی نظر آئی۔ دہلی میں ان کے محکمہ آثار قدیمہ نے جب اس کی مکمل قدامت کا اندازہ لگایا تو یہ کم وبیش 2500 سال (یعنی 600 سال قبل مسیح) کی طویل العمر تختی ثابت ہوئی۔ جب جان مارشل نے ایک دن روسی سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ:

''اس نقش پر بنے ہوئے گھوڑا گاڑی کے پہیئے کس طرح سے خود بخود گھومنا شروع ہو گئے تھے اور گھوڑے حرکت کرتے کیسے نظر آئے تھے''۔

تو اس نے صرف یہ جواب دیا کہ:

''پرانی دنیا کو جیتا جاگتا دکھا دینے کا ہنر اسے دیوتاؤں نے دے رکھا تھا''۔

اس جملے سے زیادہ وہ اس موضوع پر کوئی بات کرنے پر تیار ہی نہ تھا۔

جان مارشل نے مُردوں کے کھنڈر سے متعلق میری اب تک کی کارکردگی کو بہت سراہا اور جس تندہی سے میں نے یہاں ابتدائی کام شروع کیا تھا اس کی بھی بہت تعریف کی۔

دہلی میں وائسرائے کی سیکریٹریٹ سے ان کو یہ خبریں بھی ملی تھیں کہ یورپ میں سربیا کے علاقے میں ایک عوامی تحریک بہت تیزی سے ابھر رہی تھی جو آسٹرو ہنگیرین بادشاہت کو ختم کر کے وہاں پارلیمانی جمہوریت لانے کے لئے زیر زمین کام کر رہی تھی۔ اور ایسی ہی تحریک روس کے زار بادشاہوں کے خلاف بھی ابھر رہی تھی جہاں لوگ اس بادشاہت کو ختم کر دینے کے بعد غریب عوام کی عوامی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔

میں نے ایک سال تک سروے کا جو کچھ کام ضلع لاڑکانہ کی بستی ڈوکری میں کیا تھا اس سے جان مارشل کافی مطمئن تھے۔ اس دوران میں ''موئن جو دڑو'' کا جو سروے میپ (Survey Map) میں نے تیار کیا تھا اس میں یہاں پر آثار قدیمہ کی کھدائی کے لئے 300 ہیکٹر (تقریباً 1700 ایکڑ کا رقبہ) مختص کیا تھا۔ لیکن احتیاطً اس ٹیلے کی چاروں طرف چار چار میل کا ایک دائرہ بنا دیا تھا کہ یہ تقریباً 16 مربع میل کا رقبہ حکومت سے ایک سرکاری حکم نامے کے ذریعے آثار قدیمہ کی

ملکیت کے طور پر مانگ لیا جائے۔ اس 16 مربع میل کے اندر چاروں سمت میں نے چھ کنویں بھی کھدوائے تھے جن میں زیر زمین پانی تقریباً 30 فٹ کی گہرائی پر موجود تھا۔ جس کا بظاہر مطلب یہی تھی کہ 30 فٹ تک اس ٹیلے کی کھدائی آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے اور اگر اس سے نیچے اور گہرائی تک کھدائی کرنی ہو تو پانی کھینچنے والی موٹریں لگا کر پہلے اس جگہ کا پانی خشک کیا جائے اور اس کے بعد مزید آگے بڑھا جائے۔

جان مارشل کا خیال تھا کہ کنویں کی کھدائی کے دوران جو مٹی نکلی وہ ایسی چکنی تھی جو دریاؤں کی لائی ہوئی ریت، مٹی، کنکروں اور گول چھوٹے پتھروں پر مشتمل تھی۔ یہ سب اس بات کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ قریب ہی بہنے والا دریائے سندھ پہلے اس ''موئن جو دڑو'' کے پاس سے گذرتا تھا اور اگر یہ بستی کبھی آباد تھی تو اسی دریا کے کناروں پر آباد تھی۔

اسی ٹیلے سے تقریباً ایک میل دور میں نے ایک 100 فٹ لمبے اور 30 فٹ چوڑے لمبے ہال کی تعمیر کی بھی ابتداء کر دی تھی اور ہر دس دس فٹ پر چار فٹ چوڑے، چار فٹ لمبے اور پندرہ فٹ اونچے پتھروں کے ستون بھی کھڑے کر دیئے تھے۔ لیکن ان ستونوں کے چوگرد جب میں نے دیواریں کھڑی کرنے سے قبل جان مارشل کو اپنی Progress Repost دی تو بذریعہ تار مجھے یہ مشورہ دیا کہ یہ تعمیر قبل از وقت ہے اور اس میں اب مزید کوئی پیش رفت نہ کی جائے کیونکہ جب تک حکومت کی طرف سے یہ زمین جیالوجیکل محکمہ کو الاٹ نہ کر دی جائے۔ اس پر کسی بھی قسم کی تعمیر کو ناجائز سمجھا جائے گا۔ چنانچہ اس کام کو میں نے فوراً ہی رکوا دیا مگر بہرحال اب یہ جگہ ایسی ضرور ہو گئی تھی کہ متعلقہ محکموں کی اجازت ملتے ہی یہ ہال دو تین ماہ ہی میں مکمل کیا جا سکتا تھا کیونکہ بنیادی کام تو مکمل ہو ہی چکا تھا۔

میرا یہ خیال تھا کہ جیسے ہی میری سروے شدہ زمین کا نقشہ جان مارشل کے پاس پہنچے گا وہ دو ایک ہفتے ہی میں اسے دہلی کے متعلقہ محکموں سے اس کی منظوری دلا کر تیسرے ہفتے یہاں باقاعدہ کھدائی کا آغاز کر دیں گے۔ لیکن یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ حکومت برطانیہ اس قسم کے معاملات میں قطعاً کوئی جلدی نہیں کرتی نہ ہی ان میں کوئی بے ضابطگی گوارا کرتی ہے اور اس طرح کے سرکاری نوٹیفکیشن کے لئے وہ کوئی شارٹ کٹ یعنی مختصر راستہ اختیار نہیں کرتی۔

اب میرے فیلڈ سروے کو بنیاد بنا کر جان مارشل نے چیف سیکریٹری حکومت برطانیہ دہلی کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اس 16 مربع میل کے علاقے کو ان کے محکمہ کو الاٹ کئے جانے کی استدعا کی گئی تھی اور چیف سیکریٹری دہلی کو اسے پھر حکومت بمبئی کو بھیجنا تھا جہاں سے وہ لاڑکانہ کے

اسسٹنٹ کمشنر کو ارسال کی جائے گی جو علاقے کے مختیار کار اور اس کے ماتحت پٹواری سے اس زمین کی ملکیتی رپورٹ طلب کرے گا کہ آیا وہ کسی اور کی موروثی زمین تو نہیں ہے یا وہ سرکاری یا قبولی یا Reserve کی ہے کہ نہیں یعنی ہے تو سرکار کی مگر کسی کو لیز پر نہیں دی جا چکی ہے یا پھر آزاد اور غیر الاٹ شدہ پلاٹ ہے۔ اس طرح کی سرکاری تفتیش میں ایک سال سے زیادہ کا عرصہ بھی لگ سکتا تھا۔ چنانچہ اسی لئے مجھے منع کر دیا گیا تھا کہ جب تک یہ قطعہ زمین باقائدہ جیالوجیکل ڈپارٹمنٹ (محکمہ آثار قدیمہ) کو لیز پر الاٹ نہ کر دیا جائے، اس پر کوئی عمارت تعمیر نہ کی جائے۔

گویا اب میرا کام یہاں ختم ہو چکا تھا۔ میں بعد میں بھی اس ڈوکری میں چھ ماہ رہا۔ یعنی اس بستی میں کوئی ایک سال مقیم رہا۔ پہلا سال تو میں تقریباً اکیلا ہی رہتا رہا مگر بعد میں جب جان مارشل اور روسی مجھ سے ملنے یہاں آتے تھے تب سے روسی میرے ساتھ ہی رہتا تھا۔

جان مارشل میرے پاس دو ہفتے رکے اور پھر وہ واپس چلے گئے اور اب میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ بعد میں فراغت کے دن چند ماہ میں ہم دونوں لاڑکانہ شہر کے اطراف میں کبھی سکھر کی طرف نکل کر اور کبھی خیر پور کی ریاست کی طرف جاتے تھے اور کبھی جنوب میں ایک اور جگہ میر پور خاص تھی وہاں چلے جاتے۔ سکھر کی کھجوریں اور میر پور خاص کے آم بہت مشہور تھے اور یہاں کے زمیندار بھی ہماری خوب آؤ بھگت کرتے تھے۔

میں ہمیشہ ہی اسی تگ و دو میں لگا رہتا تھا کہ کیا یہاں ''موئن جودڑو'' جیسی کوئی اور بھی دفن شدہ باقیات یا اور ڈھیریاں یا قدیم منہدم شدہ بستیاں لوگوں کو معلوم ہیں جن کے متعلق ان کی قدامت یا پرانے آثار کی کچھ مقامی کہانیاں مشہور ہوں۔ جلد ہی مجھے دو ایسے مقامات کی اطلاع مل گئی جن سے متعلق مقامی آبادی میں یہ مشہور تھا کہ یہ کئی سو سال سے یعنی ان کے داداؤں اور ان کے بھی بڑے بڑوں کے زمانے سے یہ شہرت رکھتی ہیں کہ یہاں پہلے کچھ قدیم بستیاں موجود تھیں جو کسی نہ کسی وجہ سے زمین میں دھنس گئی ہیں یا برباد ہو کر ختم ہو گئی ہیں۔

ان میں ایک کا نام تو ''کاہو جودڑو'' تھا اور دوسری بستی سندھ سے ذرا آگے بلوچستان کے قبائلی علاقے میں تھی جس کا نام ''مہر گڑھ'' مشہور تھا۔

''کاہو جودڑو'' کی بستی ''موئن جودڑو'' سے کوئی 60/70 میل دور جنوب مغرب میں ایک اور شہر نوابشاہ اور میر پور خاص کے درمیان کہیں واقع تھی۔ ایک اور تیسری بستی شہر سکھر میں اور میروں کی ریاست کے شہر خیر پور کے نزدیک تھی۔ خیر پور ایک چھوٹی سی نیم خود مختار ریاست ہے جس کے اندرونی و داخلی معاملات میں اس کے والیان جو ''میر'' کہلاتے ہیں ان کی اجازت کے بغیر

برطانوی حکومت بھی کوئی مداخلت نہیں کرتی تھی۔
سکھر کا یہ مقام ''لکھین جو دڑو'' کہلاتا ہے جو ''موئن جو دڑو'' سے تقریباً 100 میل دور دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر سکھر شہر کے قریب واقع ہے۔ میں نے ان دونوں مقامات کی ابتدائی رپورٹس جان مارشل کو بھیج دی تھیں۔
اب یہ ان کا کام تھا کہ ان دونوں اور بہت سے دوسرے ایسے مقامات کی تفتیش اور معلومات مہیا کرنے کے لئے وہ کیا فیصلے کرتے ہیں۔ کیا انہیں محض معمولی مقامی افواہیں سمجھ کر چھوڑ دیا جائے یا ان کے بارے میں کچھ تحقیقی کام کا بھی آغاز کیا جائے، جو بعد میں شاید ان کی بھی کھدائیوں کی طرف محکمے کو راغب کر سکے۔ جانے سے قبل جان مارشل نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں فی الحال اسی شہر لاڑکانہ ہی میں رکوں اور اپنے لئے کسی نئی تعیناتی کا انتظار کروں کیونکہ یہاں کی کھدائی ڈیڑھ سال سے قبل ممکن نہ ہو سکے گی۔
جان مارشل سے ''لکھین جو دڑو'' کے متعلق بھی تفصیلی بات ہوئی جو شاید کوئی اہم مدفون شدہ قدیم کھنڈر یا کسی قدیم بستی کی ڈھیری تھا۔ یہ مقام سکھر اور خیر پور ریاست کے درمیان واقع تھا۔ انہوں نے خیر پور کے متعلق بھی مجھے کافی معلومات فراہم کیں اور بتایا کہ اس شہر کا پرانا نام برھان پور تھا اور یہ شہر اس ریاست کے پہلے سربراہ میر سہراب خان تالپور نے 1783ء میں شمالی سندھ میں کلہوڑو نام کے قبیلے کی حکومت ختم کر کے آباد کیا تھا اور اس شہر کو اپنا دارالحکومت بنالیا تھا اور پھر برھان پور کی جگہ اس شہر کا نام خیر پور رکھ دیا تھا۔ میرے ساتھ دو ہفتے کے قیام کے دوران جان مارشل نے مجھے خیر پور کی تاریخ اور اس کے متعلق بہت کچھ بتایا۔
انہوں نے بتایا کہ جب 1707ء میں مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہونے لگی تھی تو اس علاقے پر کلہوڑہ خاندان نے اپنی ایک خودمختار حکومت قائم کر لی تھی۔ ان کے ایک حکمران بہرام خان کو 1775ء میں محلاتی سازشوں کی وجہ سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد سندھ کے علاقوں میں افراتفری پھیل گئی۔ یہاں بلوچستان کے بھی بہت سے قبائل آباد تھے۔ اور کچھ ہندوستان کے مغربی ساحلی علاقے یعنی کاٹھیاواڑ کے اور کچھ راجھستان کی برادریاں بھی آباد تھیں۔ انہی میں ایک بلوچ قبیلہ تالپور کے نام کا بھی تھا۔ ان لوگوں نے اس عوامی شورش کے درمیان بلوچی سرداروں اور قریب کے اضلاع یعنی سبی اور ڈھاڈر وغیرہ کے بلوچوں کو ساتھ ملا کر شمالی سندھ کے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور ان کے ایک نامور سردار میر سہراب خان تالپور نے اپنی حکومت قائم کر لی اور پھر آہستہ آہستہ زیریں سندھ کے علاقوں سے جہاں افغان سردار مختلف علاقوں پر حکمران

بن گئے تھے ان کو بھی سندھ سے نکال دیا اور اس طرح پورے سندھ پر تالپور قابض ہو گئے۔

سندھ کے زیریں علاقوں یعنی حیدر آباد، ٹھٹھہ وغیرہ میں میر سہراب خان نے اپنے ہی قریبی تالپور عزیزوں اور رشتیداروں کو اپنا گورنر مقرر کر رکھا تھا جنہوں نے 1786ء سے 1811ء تک اس علاقے پر مکمل اقتدار کے ساتھ حکومت کی۔ میر سہراب خان نے پورے سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اس کا مرکز خیر پور ہی کو بنائے رکھا تھا۔

1811ء میں میر سہراب خان نے حکومت کے نظم و نسق سے علیحدگی اختیار کر کے خیر پور کے قریب ایک قلعے جس کو "کوٹ ڈیجی" کہتے تھے وہاں سکونت اختیار کر لی تھی اور سندھ ریاست کا سارا نظم و نسق اپنے بڑے بیٹے میر رستم علی خان کے سپرد کر دیا تھا۔ 1830ء میں میر سہراب خان تالپور کا انتقال ہو گیا۔

میر سہراب خان کے انتقال کے بعد میر رستم علی خان کا ایک سوتیلا بھائی میر مراد علی خان بھی ریاست کی حصہ داری کا مطالبہ کرنے لگا تھا۔

اس دور میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھی اور بنگال سے شمالی ہند تک ان کی ایک بے حد مضبوط حکومت بن گئی تھی۔ اسی دوران برطانوی کمپنی نے شمالی ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں ان کی اپنی خاندانی اور محلاتی سازشوں اور اندرونی کمزوریوں کو بھانپ کر ایک پالیسی بنائی تھی کہ جو بھی ریاست اپنی خودمختاری قائم رکھنے کے لئے "کمپنی بہادر" سے مدد لینا چاہے وہ اس کی مدد کریں گے اور اس کی اندرونی خودمختاری کی ضمانت دیں گے بشرطیکہ وہ ریاست اپنے تمام خارجی معاملات میں برطانوی کمپنی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرے۔ اس صورت میں ہر ریاست میں برطانوی کمپنی کا اپنا ایک افسر یا نمائندہ جسے Resident یا برطانوی نمائندہ کہا جائے گا وہاں تعینات کر دیا جائے گا جو اس ریاست کے حکمران کی حفاظت اور اس کے تمام ترقیاتی منصوبوں وغیرہ پر حکمران کو مشورے بھی دے گا اور اس خدمت کے عوض ہر ریاست برطانوی ریذیڈنٹ کے تمام اخراجات بھی اٹھایا کرے گی۔

مگر ہر ریاست اپنے محلاتی یا خاندانی قریبوں سے محفوظ رہ کر اپنی حکمرانی بدستور قائم کر رکھے گی۔ ہندوستان کی بہت سی ریاستوں نے اسی برطانوی لائحہ عمل کو مان کر برطانوی حکومت کی پشت پناہی حاصل کر لی تھی۔

میر رستم علی خان تالپور نے بھی اپنے سوتیلے بھائی میر مراد علی خان کو حکومت میں حصہ دینے کی بجائے کمپنی کی حفاظت میں آنا بہتر سمجھا اور اس نے 1832ء میں برطانوی حکومت کی طرف دوستی

کا ہاتھ بڑھایا۔ 1838ء میں میر رستم علی خان نے برطانوی تحفظ حاصل کردینے کا British Proctoorate کا معاہدہ کرلیا۔

اس کا خیال تھا کہ جب اس نے تمام خارجی معاملات کو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کردیا ہے تو اندرونی خلفشار سے بھی یہ معاہدہ اسے بچاتا رہے گا مگر ایسا نہ ہوسکا۔

میر مرادعلی خان اس معاہدے کے سخت خلاف تھا اور اس طرح کی بالائی نگرانی کو وہ اپنی خودمختاری پر ایک ضرب کاری خیال کرتا تھا۔ اس طرح اب اس نے عوام کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا تھا اور دوسرے سرداروں کے ساتھ مل کر اس نے اس معاہدے اور اپنے بھائی میر رستم علی خان کے خلاف ایک بڑا محاذ قائم کرلیا اور جب میر رستم علی خان نے برطانوی حکومت سے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے مدد کی درخواست کی تو انہوں نے۔ اس خاندانی معاملے کو ریاست کا اندرونی معاملہ کہہ کر اس کی کسی بھی قسم کی مدد سے نہ صرف صاف انکار کردیا بلکہ اسے تخت سے اتارنے میں بھی میر مرادعلی خان کی پوری مدد کی۔ جس کی وجہ سے 1842ء میں میر مرادعلی خان کو ریاست خیرپور کا حکمران تسلیم کرلیا گیا۔ مگر اس طرح خیرپور کی ریاست اور اقتدار دونوں ہی مفلوج ہوکر رہ گئے۔

میر مرادعلی خان نے اقتدار میں آکر اندازہ لگالیا تھا کہ اب برطانوی جال سے نکلنا تخت سے ہاتھ اٹھالینے کے مترادف ہوگا، چنانچہ اس نے بھی پھر کسی بھی برطانوی پالیسی کی کبھی کوئی مخالفت نہیں کی۔

زیریں سندھ مین ریاست خیرپور کا نمائندہ تالپور حکمران تھا جو اس برطانوی پالیسی کے خلاف تھا۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے اپنے ایک جرنیل چارلس جیمز نیپئر (Charles James Napier) کو فوج دے کر زیریں سندھ کے ٹھاروخان سے جو حیدرآباد کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست میں حکمران تھا لڑنے کے لئے بھیجا۔ اس نے حیدرآباد کے جوار میں ایک جنگل کے علاقے میانی (Miani) میں ٹھاروخان کو شکست دے دی۔

1843ء کی اس شکست سے اس سارے زیریں سندھ پر قبضہ کرلیا گیا، جس میں بحیرۂ عرب کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ کراچی بھی شامل تھی، یہ بھی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ زیریں سندھ کی یہ نیم خودمختار تالپور ریاست 1783ء سے 1843ء تک قائم رہی تھی۔

مگر انگریزوں نے میانی کی جنگ کے ساتھ ہی خیرپور ریاست کا رقبہ بھی کم کردیا اور اس کے چاروں طرف کے علاقے یعنی سکھر، لاڑکانہ اور نواب شاہ وغیرہ کے سب شہروں کو 1851ء میں اس ریاست سے الگ کرکے بلاواسطہ ہندوستان کی برطانوی حکومت میں شامل کرلیا تھا مگر خیرپور

کے قرب وجوار کے معمولی اضلاع اور علاقوں پر مشتمل خیر پور ریاست کو ایک چھوٹی سی حیثیت میں باقی رکھا مگر ان کے حکمرانوں کو 19 توپوں کی سلامی دینا بھی برطانوی فرائض میں شامل کر لیا۔

خیر پور ریاست اب مکمل طور پر برطانوی رحم وکرم پر آ گئی تھی اور باوجود اپنے تمام غم و غصے کے مراد مراد علی خان کو دم مارنے کی بھی مجال نہ تھی۔ اس سے قبل 1847ء میں میر مراد علی خان نے انگریزوں کے خلاف جو تحریک عثمانی خلافت ترکی کی تھوڑی بہت حمایت کی تھی جس کی وجہ سے انگریز اس سے ناراض تھے اور اس نے عثمانی خلافت کا ساتھ دے کر برطانوی ناراضگی مول لینے کی سزا بھگت ہی لی تھی۔

چنانچہ برطانوی ہندوستان سے جو فوج افغانستان پر حملہ کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی اس کو اسی خیر پور کے راستے سے گذارا گیا جس پر میر مراد علی خان نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور پھر 1857ء میں جو برطانوی کمپنی کے اقتدار کے خلاف ایک عام بغاوت شروع ہوئی تھی تو اس میں بھی اس نے انگریزوں ہی کا ساتھ دیا اور پھر اسی وجہ سے وہ اپنی چھوٹی سی ریاست خیر پور کو بچانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ میر مراد علی خان کا انتقال 1894ء میں خیر پور ہی میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا میر فیض محمد خان تالپور 1894ء میں تخت نشین ہوا اور 1901ء تک حکمران رہا۔

جان مارشل جس زمانے کی بات ہمیں بتا رہے تھے وہ میر فیض محمد خان تالپور کے بیٹے میر امام بخش تالپور کی نوابی کا دور تھا اور میر امام بخش اپنے علاقوں میں آنے والے تمام انگریز افسروں کی بہت خاطر و مدارت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ میں، جان مارشل، روسی اور ہم سب تین دن کے لئے خیر پور ریاست کے اس والی سے ملنے اس کی ریاست میں بھی گئے۔ وہاں ہمیں ان کے ایک محل میں ٹھہرایا گیا جو 1783ء میں میر تالپوروں کے والیٔ خیر پور میر فیض نے تعمیر کرایا تھا اور فیض محل کہلاتا تھا اور ہم فیض محل ہی میں ٹھہرائے گئے تھے۔

میر امام بخش تالپور نے ہمیں اپنی جدّی گڑھی یا اپنا آبائی قلعہ کوٹ ڈیجی بھی دکھایا تھا اور ہمیں شکار پر بھی لے جانے کی دعوت دی تھی جو ہم نے بصد شکریہ معذرت کے ساتھ نامنظور کر دی تھی۔

''لکھین جودڑو'' کی قدیم بستی کے متعلق جو ہمارے سفر کا اصل موضوع اور مقصد تھا اس کی ہمیں کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔ ہاں! اس کے اصرار پر ہم یہاں ان کے ایک مذہبی تہوار جسے وہ مجلس کہتے تھے اس میں شرکت کے لئے جانے پر ضرور تیار ہو گئے تھے کیونکہ اس قسم کا ایک اجتماع ہم عراق میں پہلے یعنی کربلا کے مقام پر دیکھ چکے تھے۔

اس صبح ہماری آنکھ زور زور سے نقارے اور ڈرم بجنے سے کھلی۔ ناشتے کی میز پر میر امام بخش

تالپور کے ایک افسر نے جو خصوصی طور پر ہمارے قیام کی دیکھ بھال کے لئے متعین کیا گیا تھا، ہمیں بتایا گیا کہ اس دن اسلامی سال کے پہلے مہینے محرم کی پہلی تاریخ تھی اور اس دن سے اگلے دس دن تک تمام مسلمان نواب ایک بڑے ہال میں جا کر مجلسیں سنتے تھے اور ہر روز صبح کو دس دن تک اسی طرح نقارے بھی بجائے جاتے تھے۔ ہم بھی مجلس میں شریک ہونے کے لئے چل دیئے۔

مجلس میں ہمیں سب سے آگے بٹھانے کا اہتمام کیا گیا تھا اور ہمارے سامنے لکڑی کا ایک پلیٹ فارم سا بنا ہوا تھا جس پر لوگ آ آ کر کھڑے ہوتے اور اپنی زبان میں کچھ پڑھتے تھے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا اور اس پڑھنے والے کی باتیں سن سن کر لوگ دھاڑیں مار مار کر اس طرح روتے تھے جیسے ان کو اچانک اپنے کسی قریبی عزیز کے انتقال کی خبر ملی ہو۔

یہاں لوگوں نے بتایا کہ یہ لوگ زمین پر بیٹھ کر اسی طرح صبح سے رات تک تقریریں سنتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بیچ بیچ میں اٹھ اٹھ کر آتے جاتے بھی رہتے ہیں اور تقریر کرنے والے لوگ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ تقریر کرنے والے کبھی 20 کبھی 10 اور کبھی 15 بھی بولتے ہیں۔ جو ایک کے بعد ایک آ آ کر تقریریں کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کے رسول ﷺ کے نواسے حسینؓ کی باتیں کرتے ہیں جس کو مسلمانوں ہی کے مذہب کے ایک مخالف اور بدکار بادشاہ نے اس لئے قتل کرا دیا تھا کہ وہ کسی ظالم اور غیر اسلامی شخص کی حکومت کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

اس کی فوج نے نہ صرف رسول ﷺ کے نواسے کو مار دیا تھا بلکہ اس کے خاندان کے بچے بچے کو قتل کر دیا تھا اور اسے تین دن بھوکا پیاسا بھی رکھا گیا تھا اور جب وہ جنگ کرتا ہوا مارا گیا تو اس کے مُردہ بدن پر گھوڑے بھی دوڑائے تھے اور اس کے بچوں اور عورتوں کو رسیوں سے باندھ کر کئی سو میل دور بادشاہ کے دربار میں بھی پیش کر دیا گیا تھا اور جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے رسول ﷺ کے نواسے کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہے تو وہ اس بادشاہ کے خلاف ہو گئے۔

خیر پور کے یہ میر اپنی ان عوامی مجلسوں کو جس جگہ منعقد کرتے تھے وہاں انہوں نے رسول ﷺ کے نواسے کی قبر اور عمارت کی بھی ایک شبیہہ (Replica) بنا رکھی تھی جو ہم عراق کے شہر کربلا میں پہلے ہی دیکھ آئے تھے۔

خیر پور کی ریاست کا دورہ میرے لئے اس واسطے بھی دلچسپ تھا کہ میں نے ہندوستانی نوابوں اور یہاں کے لارڈز کے بارے میں اور ان کی دولت اور ان کی شاہانہ طرزِ رہائش کے سلسلے میں بہت کچھ سن رکھا تھا مگر کسی ریاست کے نواب سے ملنے یا اس کے محل میں مہمان رہنے کا میرا یہ پہلا اتفاق تھا۔

میر امام بخش تالپور ایک چھوٹے قد اور موٹے سے جسم کا آرام پسند اور عشرت پسند آدمی لگتا تھا۔ اس نے ایک لمبی قمیض کے نیچے ایک بہت ہی گول مول قسم کا لباس باندھا ہوا تھا جو اس پر غبارے کی طرح پھیلا ہوا لگتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس لباس کو مقامی زبان میں شلوار کہتے ہیں اور یہ شلوار 22 سے 30 گز لمبے کپڑے سے بنوائی جاتی تھی۔ قمیض کے اوپر اس نے کمر سے نیچے تک کا ایک سوتی کپڑے کا کوٹ بھی پہنا ہوا تھا اور سر پر ایک گول ٹوپی تھی جس میں چاندی کے باریک تاروں سے جیومیٹریکل زاویے بنے ہوئے تھے۔ وہ فرش پر ایک گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتا تھا۔ قیمتی قالین اس کے نیچے بچھے رہتے تھے اور اس کے کئی درباری اسی کے ساتھ وہیں قالینوں پر ہی اس کے پاس ہی دائرہ بنا کر مؤدب ہو کر اس کے ساتھ بیٹھتے تھے اور بیچ میں ایک شیشہ (میں یہ شیشہ عراق میں بھی دیکھ چکا تھا اور یہاں اس کو حقہ کہتے تھے) رکھا ہوا تھا جس کا لمبا سا رسی نما پائپ ہونٹوں سے لگا کر وہ حقے کے تمباکو کا دھواں منہ کے اندر کھینچ لیتے تھے اور پھر یہ دھواں نکال بھی دیتے تھے اور اس طرح تین چار کش لگا کر وہ حقے کی یہ رسی یا پائپ برابر بیٹھے دوسرے شخص کی طرف موڑ دیتے تھے۔ حقے کو بہت ہی خوبصورتی سے بنایا ہوا تھا اور اس کے پائپ پر بھی چاندی کے تاروں سے ایک جال سا بنا ہوا تھا۔ گویا یہ ان کی درباری محفل ہوتی تھی۔

اس ریاست کے لوگ عموماً لمبے قد کے سیاہی مائل اور تنومند تھے۔ عام لوگ سروں پر پگڑیاں باندھتے تھے اور بہت ملنسار، ایماندار اور آہستہ گفتگو کرنے والے لوگ تھے۔ مگر ایسے بھی غریب نظر آجاتے تھے جن کے جسم پر کمر تک صرف ایک معمولی سی قمیض اور اس کے نیچے ایک تولیہ نما چھوٹی سی چادر ہوتی تھی۔ ان کو دیکھ کر میں کبھی کبھی یہ سوچتا تھا کہ کہاں تو یہ میر صاحبان اور ان کے درباری تیس گز کی شلوار پہنے بیٹھے رہتے ہیں اور کہاں یہ بے چارے جن کو ڈیڑھ گز بھی میسر نہیں آتا ہے۔

لیکن اس تضاد کے باوجود لوگ بڑے مطمئن نظر آتے تھے اور ان کے رویے سے ان میروں کے خلاف کوئی باغیانہ حسد یا بغض ان کی آنکھوں میں نظر نہیں آتا تھا۔ یہ لوگ اپنی اس چھوٹی سی ریاست میں پرسکون دکھائی دیتے تھے اور میروں کے طریقۂ نظم و نسق سے مطمئن نظر آتے تھے۔

سولہواں باب

بجٹ کی کمی اور بلقان کی شورش

یورپ سے جو بحری جہاز بمبئی آتے تھے ان کے ذریعے ہمیں وہاں کے کچھ حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ یہ خبریں بمبئی سے دہلی تک اور دہلی سے اُڑتی اُڑاتی ہم تک بھی پہنچ جاتی تھیں۔

ان تمام خبروں اور اطلاعات کا ہمارے فرائض اور آثار قدیمہ پر بھی اثر پڑ رہا تھا کیونکہ وائسرائے ہند کی مختلف محکموں کو ترقیاتی فنڈز مہیا کرنے کی ترجیحات بھی بدلتی نظر آنے لگی تھیں اور پھر ہمارا محکمہ آثار قدیمہ اور اس کے اخراجات جو نہ زرعی، نہ صنعتی، نہ سیاسی اور نہ ہی سماجی ترقی کے بجٹ میں شامل ہو سکتے تھے کیونکہ ان کی وجہ سے برطانوی حکومت کا کوئی فوری فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ حالات کچھ ایسے ہو رہے تھے کہ فوجی اور دفاعی معاملات سب سے اوپری سطح پر رکھے جانے لگے تھے اور ان ہی محکموں کو زیادہ فنڈز دیئے جا رہے تھے۔

چھ ماہ قبل جان مارشل تو دو ہفتے ہمارے پاس رہ کر واپس دہلی چلے گئے تھے مگر مجھے یہ ہدایت کر گئے تھے کہ میں ان کے محکمے کے کسی نوٹس کا انتظار کروں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ لاڑکانہ میں ''موئن جو دڑو'' کے ابتدائی نقشے اور سروے کا کام تو مکمل ہو چکا تھا اور اب جب تک اس قطعہ اراضی کے بارے میں کوئی سرکاری نوٹیفکیشن (اعلان) جاری نہ ہو جائے۔ اس وقت تک یہاں کھدائی کرنا یا کوئی اور کام چھیڑنا قبل از وقت ہوگا۔ اس لئے وہ مجھے یہاں سے کسی اور جگہ ٹرانسفر کرنے والے تھے۔ ان کے پچھلے دورے میں ہم خیر پور بھی گئے تھے۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ جان مارشل، روسی اور میں تین دن میر امام بخش تالپور کے فیض محل میں رہے تھے اور مہمان بن کے رہ کر لوٹ آئے تھے۔ ہم اس کی مہمان نوازی کو بہت یاد کرتے تھے۔ اس محل میں ایک 25/30 فٹ لمبی اور سات فٹ لمبی کھانے کی میز بھی تھی جس پر ایک رات ہمیں کھانے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس میز پر 60/70 لوگ بیٹھے تھے۔ آبی پرندوں جیسے مرغابیوں کے

گوشت سے لے کر جنگلی ہرنوں کا گوشت تک موجود تھا اور بھنی ہوئی کلیجیاں اور بھنے ہوئے مغز تک نہ جانے کس کس قسم کی کھانے انہوں نے بنوار کھے تھے اور شاید اپنے ریاستی امراء کو مرعوب کرنے یا دکھانے کے لئے کہ ان کے گورے انگریزوں سے کتنے تعلقات ہیں وہ ہم پر بہت مہربان ہو رہے تھے۔ وہ ہمیں اپنے تالپور خاندان کی عظمتوں اور بہادری اور شکار کے بہت سے قصے بھی سناتا رہا۔

''لکھین جودڑو'' جو ہماری اطلاع کے مطابق سکھر کے قریب کی ایک گمشدہ تہذیب ہو سکتی تھی یا ''موئن جودڑو'' جو اس کی ریاست سے صرف 80 میل کے فاصلے پر تھا، اس کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہ تھا اور بلوچستان کے ''مہر گڑھ'' کے بارے میں تو اس نے سنا تک نہ تھا۔ گویا ہمارے آثار قدیمہ کی ممکنہ تلاش اور بستیوں کی نشاندہی کے بارے میں وہ قطعاً نابلد تھا۔

جان مارشل نے جب اسے بتایا کہ ان کی نظر میں ''موئن جودڑو'' کی تہذیب کا تسلسل بہت دور تک ہونا چاہئے کیونکہ اور اس جسے اور بھی کھنڈر ضرور موجود ہوں گے کیونکہ دریاؤں کی گزر گاہوں کے قریب دریافت ہونے والی تہذیبیں الگ تھلگ نہیں ہوتی تھیں بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ان کی چھوٹی چھوٹی بستیاں اور ان کے آثار کئی سو میل تک پھیلے ہوئے مل سکتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوا کہ اس خشک اور بظاہر فضول سے موضوع پر اس کی دلچسپی صفر حد تک تھی۔ جس کا اندازہ ہمیں اسی وقت ہی ہو گیا تھا جب اس نے ہمیں اپنی چھوٹی سی لائبریری دکھائی تھی جس میں مذہبی کتب کے علاوہ اور کوئی بھی کتاب نہیں تھی۔

جان مارشل بذریعہ ٹرین خیر پور سے براستہ روہڑی، لاہور اور پھر واپس دہلی چلے گئے اور وہاں ان کو دہلی سے 30 میل دور ایک جگہ ''میرٹھ'' کے شہر کے پاس ''عالم گیر'' نامی ایک بستی میں جانا تھا جہاں ان کو ایک قدیم کھنڈر کے متعلق کچھ قیمتی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

میں اور روسی اکثر ساتھ ہی ہوتے تھے مگر علمی موضوعات سے یا آثار قدیمہ سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اکثر خاموش ہی رہتا تھا۔ گو میں اور روسی اسکول کے دوست تھے اور وہ پچھلے 10 سال سے میرے ساتھ ساتھ ہی تھا مگر میرا ہم مزاج بالکل بھی نہ تھا۔ ایک دن جب ہم دونوں لاڑکانہ ہی میں تھے تو وہاں شام کے وقت ایک سخت آندھی آئی اور ایسی ریتلی آندھیاں وہاں گرمیوں میں ہر دوسرے تیسرے دن آتی رہتی تھیں مگر یہ آندھی بہت تیز تھی جس نے دوپہر ہی سے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔

اس دن سہہ پہر ہی سے آسمان پر غبار کے بادل جمع ہونے لگے تھے۔ سخت حبس تھا اور ہوا کا کوئی جھونکا تک بھی نہ چلتا تھا۔ گرمی اور ہوا کے بند ہونے سے جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ پھر ہوا یوں

کہ سہ پہر کے چار بجے ہی سے ایسا اندھیرا چھانے لگا جیسے شام کیا بلکہ رات ہی ہوگئی ہے۔ ہم نے اپنے خیموں میں لالٹین جلا کر رکھ لی تھیں۔ ماحول بہت ہی بوجھل اور بے کیف تھا مگر ہمیں اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ اندازہ تھا کہ ابھی ذرا دیر میں آندھی کے جھکڑ چلنا شروع ہو جائیں گے اور ریت کے بگولے ہمارے ٹینٹ (خیمے) سے ٹکرا ٹکرا کر ہر طرف ریت کی ایک موٹی سی تہہ بچھا دیں گے اور ہوا بھی یہی۔ آدھا گھنٹا بھی نہ گزرا تھا کہ شائیں شائیں آندھی چلنا شروع ہوگئی۔

باہر سخت آندھی اور اندر ایک ٹمٹماتی لالٹین۔ روسی کے سامنے لکڑی کی وہی تختی بھی پڑی ہوئی تھی جسے وہ اکثر چپ چاپ دیکھتا رہتا تھا۔ میں بھی خاموش اور روسی بھی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ آنکھیں تو بند ہونے ہی لگی تھیں مگر لگتا تھا کہ اس پر ایک عجیب سی استغراق (Stance) کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی اور اس نے بر بڑانا شروع کیا۔

''ایسا ہی ایک وقت ہے۔ ایک طرف سے دریا کی بڑی بڑی موجیں بہہ بہہ کر بستی کے اندر آ رہی تھیں اور تیز آندھی کے رتیلے جھکڑ ہر گھر پر ریت برسا رہے تھے۔ پھر گلیوں میں چیخ پکار مچنے لگی ہے۔ حملہ آور تعداد میں بہت ہیں۔ وہ لوگوں کو مار بھی رہے ہیں اور گھروں کو لوٹ بھی رہے ہیں۔

اس نے شہزادی مینامتی کو گھوڑا گاڑی میں سوار کر لیا ہے اور ایک سنسان سی گلی سے گاڑی نکال کر اس نے دریا کے کنارے کنارے بائیں طرف کی پگڈنڈی پر گھوڑا دوڑا دیا ہے۔ اندھا دھند کئی گھنٹوں تک وہ گاڑی بھگا تا چلا گیا اور پھر وہ جنگل کے اندھیرے ہی میں کچھ دیر کے لئے رک گیا ہے۔ وہ رک کر سانس لے رہا ہے یا شاید صبح کا انتظار کر رہا ہے''۔

روسی کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بولتا چلا جا رہا تھا کہ سارا واقعہ اس کے سامنے ہی ہو رہا ہو۔

''صبح ہوتے ہی وہ پھر چل نکلا ہے۔ اب وہ شمال کی طرف جا رہا ہے۔ سورج اس کے دائیں طرف ہے۔ اس نے کئی دریا عبور کر لئے ہیں۔ اب وہ بالکل سورج کی سیدھ میں آ گیا ہے۔ بالکل مشرق کی طرف چل رہا ہے اور پھر اس نے پھر دریا پار کئے ہیں۔ اب وہ دریاؤں اور جھیلوں اور پانی کی سرزمین تک پہنچ چکا ہے۔

اوہو! یہ تو لال مائی کی پہاڑیاں شروع ہوگئی ہیں۔ ہلکے سرخ رنگ کے پتھر کی چھوٹی پہاڑیاں جو شمال کی طرف اٹھتی چلی جا رہی ہیں''۔

سترہواں باب

27 نومبر 1914ء

آج بہت عرصے کے بعد میں اپنی ذاتی ڈائری میں کچھ لکھنے کے لئے بیٹھا ہوں۔ پانچ چھ سال سے زیادہ عرصہ ہندوستان آئے ہوئے گزر چکا ہے۔ دو مرتبہ جان مارشل نے مجھے چار چار ماہ کے لئے افسر بکار خاص (Officer on special duty) کے طور پر دہلی کی ڈائریکٹوریٹ آف جیالوجیکل سروے میں عارضی طور پر تعینات کر چکے ہیں اور پھر لاڑکانہ بھیج دیتے ہیں۔ اب میں تقریباً سال سے پھر دہلی بلا لیا گیا ہوں۔ لاڑکانہ میں کھدائیوں کا کام اور نوٹیفکیشن (Notification) وغیرہ کا سب کام رکا ہوا ہے۔ وہیں میں نے دو مکان کرائے پر لے لئے تھے جس میں ایک میں روسی اور میں رہتے تھے اور دوسرے میں ہم 30/40 مزدوروں اور ان کے سپروائزر جو آنے والے دنوں میں "موئن جودڑو" کی کھدائی اور وہاں سے نکلے متوقع آثار قدیمہ کی صفائی اور دیکھ بھال اور قدیم تاریخوں سے متعلق ان کو تربیت دیتے تھے۔ مگر دہلی آنے سے قبل وہ اب مکان وغیرہ چھوڑ کر اور اپنے عارضی آفس کو سمیٹ کر میں دہلی آ چکا ہوں، کیونکہ ہمارے بجٹ اور فنڈز نصف سے بھی کم کر دیئے گئے ہیں۔

ادھر جان مارشل کی مصروفیات اور ممکنہ آثار قدیمہ رکھنے والے تمام کھنڈروں کا کام اور سروے بھی سب کا سب عارضی طور پر بند کر دیا گیا ہے کیونکہ اب برطانوی سیاست یورپ کی بلقانی جنگوں اور وہاں سے اٹھنے والی خطرناک شورشوں کی وجہ سے ایک بڑی جنگ میں گھر چکی ہے اور دوسرے برطانوی مقبوضات کی طرح ہندوستان کی آمدنی کا بھی زیادہ بڑا حصہ برطانیہ کے سرکاری مالیاتی بینکوں میں بھیجا جا رہا ہے۔

برطانوی انگریزی اخبارات مسافر جہازوں کے ذریعے بمبئی اور کبھی کراچی کی بندرگاہوں تک پہنچ جاتے اور مہینہ دو مہینہ پرانے ہی سہی مگر ہم تک بھی آ جاتے ہیں۔ جو خبریں مل رہی ہیں ان

سے معلوم ہو رہا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کی فوجی افسران کی تربیت جرمنی میں ہونے لگی ہے اور ہمارے ملک برطانیہ کا جھکاؤ روس کے نکولس زار کی طرف زیادہ ہو رہا ہے۔ تمام یورپ کی بڑی شہنشاہتیں ایک دوسرے سے کئے گئے دفاعی معاہدوں میں الجھی ہوئی ہیں۔ بلقانی آتش فشاں بھی پھٹنے والا ہے اور بہت سے محاذ کھلنے والے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ محاذ کھل چکے ہیں۔

جب تک میں لاڑکانہ میں تھا تو لاڑکانہ میں کچھ زیادہ اچھی کتابیں نہیں تھیں اور پھر انگریزی کی کتابیں تو کم ہی ملتی تھیں۔ میں اپنا زیادہ وقت وہاں یورپی سیاست اور سلطنت عثمانیہ کی تاریخ کے مطالعے میں گزارتا تھا اور اپنی معلومات کے علمی اور تاریخی نوٹس بھی بناتا رہتا ہوں۔ اپنے نوٹس اور معلومات کے یہ حصے میں ابھی لکھوں گا۔

لاڑکانہ کے مسلمان زمیندار اور بڑے بڑے جاگیردار مجھے اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دیتے رہتے تھے اور مجھے شکار وغیرہ پر بھی لے جانے پر اصرار کرتے رہتے تھے۔ یہاں قریب میں ایک منچھر نامی جھیل بھی تھی وہاں آبی پرندوں کے شکار کی بھی دعوت دیتے تھے۔ مگر میں ان دعوتوں سے معذرت بھی کر لیتا تھا کیونکہ ان کے کھانوں میں تیز مصالحے اور مرچیں زیادہ ہوتی تھیں اور شکار وغیرہ میری ہابی (شوق) نہیں ہے۔

آثار قدیمہ سے متعلق تمام مصروفیات بیچ ہی میں معلق تھیں۔ میں نے جان مارشل کو ایک خط بھیجا تھا کہ وہ مجھے دہلی کی ہی مرکزی ڈائریکٹوریٹ آف آرکیالوجی میں بلوالیں کیونکہ یہاں تو کوئی قابل ذکر کام ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اب میں دو سال سے دہلی ہی میں ڈپٹی ڈائریکٹر آرکیالوجیکل سروے میں بطور افسر بکار خاص (Officer on special duty) تعینات ہوں اور اب میری عمر 31 سال ہو چکی ہے اور میرا بیٹا ولسن میلکم اب 8 سال کا ہے۔

اس وقت تک یورپ کی جو خبریں ملی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک برطانیہ، فرانس اور روس نے سربیا کے دفاع کے لئے مل کر ایک سہ فریقی مزاحمتی اتحاد بنالیا ہے جسے وہ Triple Detante کہتے ہیں اور دوسری طرف جرمنی، آسٹریا اور عثمانی حکومت کے بادشاہوں نے اپنی سلطنتوں وغیرہ کو بچانے کے لئے بھی اپنا ایک سہ فریقی اتحاد قائم کر چکی ہے جس کو انہوں نے Triple Alliance کا نام دے رکھا ہے۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ برطانیہ، روس اور جرمنی کے تینوں شہنشاہ آپس میں خالہ زاد اور ماموں زاد بھائی ہیں یعنی cousins ہیں مگر ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

زار نکولس دوم روس کا شہنشاہ ہے۔

جارج پنجم آف برلی ہیڈ برطانیہ کا بادشاہ ہے۔
قیصر ویلہیلم دوم جرمنی کا شہنشاہ ہے۔
لیکن اس رشتے داری کے باوجود ان کی آپس کی ناراضگیاں اور حسد و نفرتیں ان کو ایک دوسرے کے خلاف ممالک کے کیمپس (Camps) میں لے جا چکی ہیں۔
بلقان کا علاقہ آج کی تمام سیاسی اور جنگی بحرانوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس لئے میں یورپ کی سیاسی، ریاستی وابستہ گیری اور دفاعی معاہدوں اور ان یورپی ممالک کی آپس کی خودغرضانہ منصوبہ بندیوں کا احوال بھی ذرا تفصیل سے لکھ رہا ہوں۔
یورپ میں فرانس، جرمنی، روس، آسٹریا، برطانیہ، اسپین اور عثمانی شہنشاہتیں عرصہ دراز سے چلی آ رہی ہیں مگر میں بلقان کی ریاستوں اور یہاں کے چھوٹے علاقوں کے جھگڑوں سے اپنی تحریر شروع کر رہا ہوں۔ یورپ کی ان تمام سلطنتوں کے علاوہ جزیرہ نمائے بلقان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور ان کے مختلف قبیلے اور ان کی اپنی اپنی زبانیں ہیں جن کی تھوڑی بہت تفصیل جو میں حاصل کر سکا ہوں وہ یوں ہے۔
بلقان، فارسی لفظ بالا خانہ (یعنی اوپر کا حصہ) سے نکلا ہے۔ اس پہاڑی خطے کو عرب بھی بلقان ہی کہتے تھے۔ اس پہاڑ کا پرانا نام ہومس پہاڑ (Haemus Mountain) تھا۔ اس جزیرہ نما کے تین اطراف میں سمندر ہیں اور یہ پہاڑی سلسلہ تقریباً 7000 ہزار فٹ تک بلند ہے۔ ترکمانستان کا ایک صوبہ اب بھی بلقان کہلاتا ہے۔ بلقان کے اس خطے کے اطراف کے سمندروں میں یہ بحیرے بھی شامل ہیں:

بحیرہ ایڈریاٹک (Adriatic Sea)۔ بحیرہ آئیونیا (Ionian Sea)۔
بحیرہ اسود (Black Sea)۔ بحیرہ ایجین (Agean Sea)۔
بحیرہ معتدل (Mediteranian Sea)۔

یہ سب چھوٹے سمندر بحیرہ معتدل کے ذریعے اسپین کے پاس بحر اٹلانٹک سے نہر سوئز کے ذریعے بحر ہند (Indian Ocean) سے مل جاتے ہیں۔
اس جزیرہ نما کا کل رقبہ 286,000 مربع میل ہے اور اس کی آبادی 1902ء کے مطابق لگ بھگ تین کروڑ کے قریب ہے اور اس میں چھوٹے بڑے ممالک موجود ہیں ان میں جو دریا بہتے ہیں ان میں دریائے ڈینوب (Danube) Saval اور دریائے کوپا (Kupa) زیادہ مشہور ہیں۔ اس خطے میں جو ممالک شامل ہیں وہ یہ ہیں:

البانیہ(Albania)۔	سربیا(Serbia)۔
رومانیہ(Romania)۔	سلووینیا(Slovenia)۔
کروشیا(Croatia)۔	میسی ڈونیا(Mecedonia)۔
مونٹی نیگرو(Monte Negro)۔	بوسنیا(Bosnia)۔
گورینیا(Gorania)۔	ہرزی گووینا(Herzegovina)۔
بلغاریہ(Bulgaria)۔	یونان(کچھ حصہ)(Greece)۔

ان ممالک کی جغرافیائی حدود میں انہی علاقوں کیڈ ناموں کے قبیلے بھی آباد ہیں۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں اوران کا پیشہ بھیڑ، بکریاں، جانور پالنا، زراعت و باغبانی ہے اور معدنیات وغیرہ اور چھوٹے کارخانے لگانا بھی ان کے عام پیشے ہیں۔

اس علاقے میں عیسائیوں کے قدیم عیسائی چرچ کا عمل دخل زیادہ ہے یعنی Arthodox Christianity کے زیادہ ماننے والے ہیں جبکہ مسلمان بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔

اس علاقے کی قدیم تاریخ اور پرانے کھنڈرات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بلقان میں 6000 سال قبل مسیح میں بھی آبادیاں موجو تھیں اور عراق کے سمیریوں سے بھی پہلے ان کا ایک رسم الخط ایجاد ہو چکا تھا جسے ماہر لسانیات یورپی رسم الخط (Proto Writings) کی ابتدائی صورت قرار دیتے ہیں۔

اس علاقے سے سکندر اعظم کے بعد آنے والی رومی سلطنت پر بھی حملے ہوتے رہے تھے اور اس علاقے کے پہاڑی لوگ جفاکش تھے مگر مغلوب الغضب (جلد غصے میں آجانے والے لوگ) بھی تھے۔ یہ نہ صرف اپنے نسلی گروہوں، اپنے قبیلوں اور برادریوں ہی میں گھلتے ملتے تھے اور قبیلے کے نظام ہی کے تحت حکومت کا نظم ونسق چلاتے تھے۔

1565ء کے بعد اس پورے علاقے پر عثمانی سلطنت کا مکمل کنٹرول قائم ہو گیا تھا جو ان ہی کے لوگوں ہی میں سے یہاں کا گورنر وغیرہ مقرر کرتے تھے تاکہ مقامی قبائل اور ان کی عیسائی آبادیاں عثمانی حکومت سے دوریاں محسوس نہ کریں۔ لیکن جیسے جیسے عثمانی حکومت کمزور ہوتی گئی ویسے ہی ویسے ان چھوٹی بڑی زمینی اکائیوں میں آزادی اور خودمختاری کی تحریکیں بھی ابھرتی چلی گئیں۔

اس خطے کی نسبتاً تھوڑی بڑی آبادیاں جیسے میسی ڈونیا (یونان)، سربیا اور بلغاریہ تھیں اور یہ سب کی سب آہستہ آہستہ نیم خودمختاری حاصل کرتی گئیں۔

سلطنت عثمانیہ کی ایک جنگ 1878ء میں روس سے ہوئی جو روسی ترکیہ جنگ (Russio-Turkish War) کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ روس ہی سے 1850ء میں بھی ان کا

ٹکراؤ ہوا تھا اور دونوں جنگوں میں حکومت ترکیہ ہی کو اپنے کچھ علاقوں سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔
سربیا، رومانیہ اور مونٹی نیگرو 1878ء کی جنگ کے بعد اپنے پرانے نام ہی سے سلطنت عثمانیہ کے برائے نام ہی تو حصے رہ گئے ورنہ تو ان کے اپنے وزیر اعظم تھے اور اپنی پارلیمان تھیں اور داخلی طور پر خود مختار بھی تھیں۔ پارلیمان کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا۔ اس سے قبل 1821ء میں میسی ڈونیا (یونان) ترکی کی ریاست سے پہلے ہی باہر آ چکے تھے اور اب دو سال قبل 1912ء میں البانیہ، بلغاریہ اور سربیا بھی ترکوں سے آزاد ہو چکے تھے۔
اس عثمانی سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ سے سارے یورپی ممالک فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، روس بحر روم تک رسائی چاہتا ہے۔ آسٹریا کی شہنشاہیت سربیا کو اپنی حدوں میں رکھ کر اپنا اقتدار مضبوط کرنا چاہتی ہے۔ ہماری حکومت برطانیہ عثمانی خلافت کے مقابلے میں روس کی حکومت سے زیادہ قریب ہوتی جا رہی ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں جو اس کی کالونیاں موجود ہیں جن میں مسلمان بہت زیادہ تعداد میں رہتے ہیں اور ان کا جھکاؤ ترکی کی مسلمان خلافت ہی کی طرف رہتا ہے۔ تو اس بنیادی خطرے کو کم سے کم رکھے اور مسلمانوں کو مطیع کرنے کے لئے روس کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئے۔
اُدھر جرمنی کے قیصر ولیہلیم کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ بلقانی جزیرہ نما سے نکل کر روس کی رسائی بحر روم تک ہو جائے کیونکہ وہاں شمالی افریقہ میں جرمنی کی کالونیکل مقبوضات کو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس لئے وہ عثمانی حکومت کو زیادہ مضبوط دیکھنا چاہتا ہے۔ پھر کچھ سالوں سے جرمنی اپنی بحری طاقت بھی مستقل بڑھاتا چلا جا رہا ہے جس سے برطانیہ کو یہ ڈر ہونے لگا ہے کہ جلد یا بدیر جرمنی اس کی بحری طاقت کو ضرور چیلنج کرے گا جس کی وجہ سے اس کی تمام مقبوضات اور ان مقبوضات سے برطانیہ کی ساری بحری تجارت کو بھی شدید خطرات لاحق رہیں گے۔
اسطرح یورپ میں بلقانی علاقے کو مرکزی دائرہ بنا کر روس اور برطانیہ قریب آ گئے ہیں۔ جرمنی اور آسٹرو ہنگیرین شہنشاہتیں ترکی کی عثمانی حکومت سے میل جول بڑھا رہی تھیں اور جرمنی نے ترک فوجی افسران کی تربیت بھی جرمنی میں ہی دینی شروع کر دی تا کہ زار روس کے اقتدار کو محدود کر سکے اور اُدھر جیسا کہ میں نے لکھا روس اپنی بحری طاقت سے بحیرہ روم (یعنی بحیرہ معتدل تک) کی طرف آنا چاہتا ہے تا کہ اس کی بحری تجارت بھی افریقی اور ایشیائی ممالک میں فروغ پا سکے۔
بلقانی ریاستیں جو 1396ء سے عثمانی حکومت کی گود میں گرنا شروع ہو گئی تھیں اور پھر 1565ء کے آتے آتے سارا بلقان ہی سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن گیا تھا، اب بہت حد تک آزاد

ہو چکا تھا۔ مگر سربیا اب بھی مکمل آزاد نہیں ہے اور بلغاریہ یا رومانیہ وغیرہ بھی ابھی نیم آزاد ہی ہیں۔ سربیا پر اب سلطنت عثمانیہ سے زیادہ سلطنت آسٹریا کا کنٹرول ہے۔

پچھلے 50/60 سال سے بلقان کی عیسائی ریاستوں کے آرتھوڈوکس عیسائی آبادی اور عثمانی خلافت کے مسلمانوں میں مذہبی منافرت بھی بڑھتی چلی آرہی ہے۔ ان کے اپنے علاقائی تعرضات اور مذہبی یعنی (مسلم اور عیسائی) حسد و بغض کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ 1857ء سے 1877ء تک بلغاریہ میں نسلی اور مذہبی تصادم کی وجہ سے عثمانی سلطنت کے خلاف بغاوتیں شروع ہو گئی تھیں جو حکومت ترکیہ نے یہاں اپنے فوجی دستے جنہیں بندوق بردار فوج (Bashi Bazoka) کہا جاتا تھا بھیج کر اس بغاوت کو سختی کے ساتھ کچلنے کی کوشش کی تھی مگر عثمانیہ حکومت کے اس اقدام کو عیسائیوں پر بہت بڑا ظلم کہہ کر بڑھا چڑھا کر یورپ میں پھیلایا گیا تھا اور پھر انہی مظالم کو بنیاد بنا کر یورپی طاقتوں نے 1876ء میں ایک قسطنطنیہ کانفرنس (Constantinopole Conference) منعقد کی تھی جس میں خلافت عثمانیہ پر زور دیا گیا تھا کہ وہ اپنی ریاستی حدود میں اقلیتوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرے اور ان میں پھیلی ہوئی بے چینیوں کا سدِ باب کرے۔ خلافت عثمانیہ نے بھی اپنے ان بلقانی علاقوں میں ایک مصالحتی پروگرام شروع کرنے کی حامی تو بھر لی تھی مگر یہ پروگرام نافذ کرنا آسان نہ تھا کیونکہ ایک سال پہلے ہی یعنی 1874ء میں ترکی کے علاقے اناطولیہ میں موسم سخت خشک رہا تھا اور بارشیں نہیں ہوئی تھیں اور چاروں طرف قحط کی سی صورتحال تھی۔

اس پر طرّہ یہ ہوا کہ اگلے سال یعنی 1875ء میں دریاؤں میں سیلاب آ گئے جنہوں نے ترکیہ کی مالی حیثیت کو بے حد کمزور کر دیا تھا۔ چنانچہ 1876ء کی کانفرنس میں حامی بھرنے کے باوجود حکومت ترکیہ کچھ بھی نہیں کر سکی تھی، کیونکہ اس نے 1875ء میں اپنے آپ کو دیوالیہ (Bankrupt) ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام اصلاحات جو بلغاریہ، سربیا یا مونٹی نیگرو وغیرہ میں ہو سکتی تھیں وہ سب کی سب مؤخر یا ملتوی کرنی پڑیں۔ جن کو بنیاد بنا کر یہ علاقے بغاوت پر اتر آئے تھے۔ جن کی وجہ سے حکومت ترکیہ کو ان کے رضا کاروں سے لڑنے کے لئے اپنے بندوق بیردار دستے (Bashi Bazoka) بھیجنے پڑے تھے۔

1876ء میں ترکی کی جانب سے بھیجے گئے ان بندوق بردار دستوں میں وہ نیم فوجی رضا کار بھی شامل تھے جو 1850ء کی جنگ کریمیا کے بعد ترکمانستان کے علاقے پر روسی کنٹرول ہو جانے کی وجہ سے وہاں سے زبردستی نکال دیئے گئے تھے اور یہ سلطنت عثمانیہ کے دوسرے بلقانی علاقوں

میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہ لوگ بہادر، جفاکش اور جان پر کھیل جانے والے لوگ تھے۔ حالات نے انہیں سفاک بھی بنا دیا تھا۔ انہوں نے سلطنت ترکیہ کی وفاداری میں ہر قسم کی ابھرتی ہوئی تحریک کو کچل دینا اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ جہاں بھی ان کو مدافعت کے آثار نظر آتے وہاں یہ زیادہ ہی سختی کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک سخت مہم انہوں نے باتک (Batak) کے زرعی علاقوں میں بھی روا رکھی، جہاں 15,000 کے قریب بلغارین مارے گئے اور پھر ان کے قریب کے علاقوں جیسے مونٹی نیگرو، سربیا وغیرہ میں بھی بظاہر بغاوت کی آگ سرد پڑ گئی۔

مگر درحقیقت ان علاقوں کی مسلح کارروائیاں صرف کچھ ہی عرصے کے لئے موقوف ہوئی تھیں ورنہ وہ زیر زمین رہ کر بھی ان ریاستوں کی آزادی کا مطالبہ کرتی رہتی تھیں۔

سربیا اور بلغاریہ وغیرہ کے ان بلقانی خطوں میں جنہیں چھوٹی چھوٹی ریاستیں (Principalities) کہا جانے لگا تھا۔ اب آسٹریا کے Habsburg خاندان کی شہنشاہیت پر یہ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ ان عیسائی ریاستوں کی مدد کے لئے آگے آئے اور ترکوں کے خلاف تادیبی کارروائیاں کرے۔ بلغاریہ، سربیا، مونٹی نیگرو، ہرزی گووینا اور بوسنیا سب کی سب آسٹریا کی شہنشاہیت پر ہر طرح کا دباؤ ڈالنے لگی تھیں۔

ان حالات سے مجبور ہو کر آسٹریا کے شہنشاہ فرانز جوزف (Franz Joseph) نے جو خود تن تنہا خلافت عثمانیہ سے ٹکر نہیں لے سکتا تھا اس نے روس کے شہنشاہ کو خلافت عثمانیہ کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ جس کی پہلی جنگ 1850ء میں ترکوں سے ہو چکی تھی۔

1878ء میں روس اور ترکی کی جنگ واقع ہوئی۔ جس کی وجہ سے آسٹریا کو ان ریاستوں پر ایک طرح سے اپنے سیاسی اقتدار کو بڑھانے کا موقع مل گیا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عیسائی اقلیتوں پر ایسے مظالم نہیں ہوئے تھے جن کا نقشہ کھینچ کھینچ کر یورپ کو دکھایا جا رہا تھا کیونکہ جہاں جہاں مسلمان تعداد میں کم تھے ان کو بھی مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور عیسائی قومی رضا کار بھی اتنے معصوم نہیں تھے کہ انہوں نے بھی جہاں جہاں ان کا بس چلا وہاں کے مسلمانوں پر تشدد و قتل و غارت گری نہ کی ہو۔

آرتھوڈوکس عیسائیوں نے مسلمانوں کی بے شمار عبادتگاہیں، مدرسے اور لائبریریاں جلا ڈالی تھیں اور بے شمار مسلمانوں کو قتل بھی کیا تھا۔ 1877ء میں بلغاریہ میں ٹرنووو (Turnovo) کے مقام پر ایک بڑی مسجد کو جلایا گیا تھا۔ پھر اسی سال میں اس کے اطراف میں کئی کتب خانوں کو بھی آگ لگا دی گئی تھی۔ 1877ء ہی میں صوفیا کے شہر میں ایک دوسری مسجد کو بھی پھونک ڈالا گیا تھا اور

دسمبر 1878ء میں ایک ہی رات میں آتشگیر دھماکے کر کے سات مساجد کو خاکستر کر دیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ اِکادُکا مسلمانوں پر رضا کاروں کے اجتماعی حملے روز کا معمول بن چکے تھے اور ان کی املاک، دکانوں اور گھروں کو لوٹ لینا تو روزمرہ کی بات بن چکی تھی۔

مگر آسٹریا کی حکومت روسی حکومت کے بل پر عیسائی کاز کو ایک ڈھال بنا کر پیش کر رہی تھی۔ روس اور ترکی اس سے قبل بھی کئی جنگوں میں ایک دوسرے کے حریف رہ چکے تھے اور جارجیا، یوکرین اور آرمینیا کو روسی زار اپنی مملکت کا حصہ بھی بنانا چاہتے تھے کیونکہ اس سے قبل بھی سلطنت عثمانیہ کی اور روسی زاروں کی ایک طویل دس سالہ جنگ 1782ء سے 1792ء کو ایک صلح نامہ جو معاہدہ جیسی (Treaty of Jassy) کے نام سے ہوا تھا۔ جنہیں عثمانی حکموت نے روس سے بہت دب کر اپنی شکست قبول کر لی تھی اور اس کے صلح نامے کے مطابق کریمیا کے وہ علاقے جو روس نے سلطنت عثمانیہ سے چھین لئے تھے ان پر روس کا مکمل اقتدار تسلیم کر لیا گیا تھا اور اوڈیسہ (Oddisa) کی بندرگاہ بھی روس کے حوالے کر دی گئی تھی۔

چنانچہ اب روس کے پاس ایک اور اچھا موقع تھا کہ وہ آگے بڑھ کر بلقانی جزیرے تک اپنی ریاست وسیع کر سکے اور بحر روم تک رسائی حاصل کرے۔

حکومت آسٹریا کی اعانت سے روس نے 24 اپریل 1877ء کو سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف سربیا اور مونٹی نیگرو کی چھوٹی ریاستوں نے بھی اپنے مسلح رضا کاروں کی فوج بنا کر 1878ء میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔

اس جنگ کے دوران روسی فوجوں نے جنگی میدانوں کے علاوہ شہری آبادیوں کو بھی بے دریغ نشانہ بنایا تھا اور کئی جگہ مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ ہرمانی (Harmani Massacre) کے زرعی علاقے میں مسلمان کسانوں کو صرف اسی لئے بڑی تعداد میں قتل کر دیا گیا تھا کہ وہ روسی فوج کو غلے کی سپلائی بند نہ کر سکیں اور خود بلغاریہ کے شہریوں نے بھی روسی فوج کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اکثر علاقوں میں مسلمانوں کی بڑی تعداد کو قتل کیا۔ یہ جنگ جنوری 1878ء تک چلی تھی مگر اس دوران 130,000 مسلمان مارے جا چکے تھے اور 350,000 مسلمان بے گھر کئے جا چکے تھے اور تقریباً 800,000 مسلمانوں کی آبادی میں سے صرف 350,000 مسلمان ہی باقی بچے تھے۔ یعنی بلغاریہ کو مسلمانوں سے تقریباً صاف ہی کیا جا چکا تھا کیونکہ باقی وہاں سے ہجرت کر کے جا چکے تھے۔

ترکی کی حکومت کو اس جنگ میں بھی ایک طرح سے شکست ہی ہوئی کیونکہ اس جنگ کے بعد

جو صلح نامہ مارچ 1878ء میں معاہدہ اسٹی فانو (Treaty of Stefano) کے نام سے ہوا تھا اس میں بلغاریہ کو ایک آزاد ملک کا درجہ دیا گیا تھا۔

بوسنیا، سربیا، رومانیہ اور مونٹی نیگرو نیم آزاد ریاستوں کے طور پر سلطنت عثمانیہ کا حصہ تو بنی رہیں مگر وہ نیم خودمختار ہو چکی تھیں اور یہاں آسٹریا کا اقتدار بھی دخل انداز ہو گیا تھا۔

روس نے کارس (Cars) اور باطوم (Batum) کے علاقوں پر قبضہ کر لیا مگر جنگ ختم ہونے کے باوجود بھی روسی بحری بیڑہ قسطنطنیہ کی طرف ہی بڑھتا رہا تھا اور اب فرانس اور برطانیہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ روس سلطنت عثمانیہ کے اور دوسرے قابض علاقوں پر بھی قابض ہونے کی پالیسی بنا رہا ہے۔ اس صورتحال سے برطانوی حکومت روس کی اس توسیع پسندی کو پورے یورپ کے لئے خطرہ سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس نے عثمانی سلطنت کی مدد کے لئے اپنا بحری بیڑہ بحر معتدل کے اس علاقے کی طرف روانہ کر دیا جس کی وجہ سے مجبور ہو کر روس کو اپنے ارادے ترک کرنا پڑے تھے جس کے بعد صلح نامہ اسٹی فانو ترتیب دیا گیا تھا۔

سلطنت عثمانیہ تو یورپ کی ایک کمزور طاقت بنتی جا رہی تھی اور اس کے مقابلے میں آسٹرو ہنگیرین سلطنت میں جو ہبس برگ (Habsburg) خاندان کی موروثی سلطنت تھی وہ ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھر رہی تھی لیکن سربیا اور بلغاریہ وغیرہ میں جو خودمختاری کی تحریک ابھر چکی تھی وہ ترکوں اور اب آسٹریائی حکومت کے ماتحت بھی نہیں رہنا چاہتی تھی اور اپنی مکمل آزادی کی خواہاں تھی۔ اس بلقانی علاقے کی ہمسایہ ریاست آسٹرو ہنگیرین سلطنت میں بھی اندرونی کمزوریاں ابھر رہی تھیں۔

1881ء میں آسٹریا کے ولی عہد نے خودکشی کر لی اور پھر اس کی بیوی کو 1898ء میں ایک اطالوی نے سوئٹزرلینڈ میں قتل کر دیا۔ ولی عہد کے خودکشی کرنے کے بعد آسٹریا کے بادشاہ نے اپنے بھتیجے فرانز فرڈی ننڈ (Franz Ferdenand) کو اپنی ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ جس نے ایک نچلے طبقے کی عورت صوفی شوٹک (Sofie Choteck) سے شادی کر لی تھی جس پر درباری امراء بہت نارض رہتے تھے اور خود ولی عہد بھی بدمزاج تھا اور تلخ گفتگو کے لئے مشہور تھا۔

آسٹریا کی ریاست سربیا، مونٹی نیگرو اور بوسنیا وغیرہ کی نیم خودمختار ریاستوں میں کبھی اپنا عمل دخل بڑھاتی رہتی تھی اور کبھی ان کو کنٹرول کرنے کی پالیسی اپناتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے اب آسٹریا کی حکومت کے خلاف بھی ان چھوٹی ریاستوں میں جن کو Principalities کہا جاتا تھا بے چینی پھیلنے لگی تھی۔

1903ء میں سربیا کی آسٹریا دشمنی اور کھل کر اس وقت سامنے آئی تھی جب سربیا کی فوج کے ایک عہدے دار آپک (Apic) نے ایک سازش تیار کی جس کی وجہ سے آسٹریا کے شاہی جوڑے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ آسٹریا کی حکومت نے جب سربیا کی حکومت پر اس کا الزام لگایا تو انہوں نے آپک (Apic) کے خلاف تفتیش شروع کی اور بظاہر اس انکوائری کی بنیاد پر اس کو موت کی سزا بھی دے دی مگر درحقیقت وہاں سربیا میں جو ایک انقلابی حکومت (Radical Government) برسراقتدار آ چکی تھی اس کی آسٹریائی ریاست سے پس پردہ مخالفت چلتی ہی رہی تھی۔

اسی دوران میں سربیا میں دو زیر زمین تنظیمیں بھی بہت متحرک ہو چکی تھیں۔ ایک نے اپنا نام سیاہ ہاتھ (Black Hand) رکھا ہوا تھا اور دوسری کا نام ناردانہ (Nardanna) تھا اور یہ لوگ آسٹریا کی طرف سے جو گورنر سربیا میں تعینات تھا اس کے خلاف بیان بازی کرتے رہے تھے۔ اس کے علاوہ Madxa Bosan کی تحریک بھی مکمل آزادی کی تحریک تھی۔

8 اکتوبر 1911ء کو بلغاریہ، یونان، میسی ڈونیا اور مونٹی نیگرو نے مل کر ایک بلقان لیگ بنائی جس نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، یہ جنگ سات ماہ چلتی رہی۔ ترکی کی حکومت کمزور تو ہو ہی چکی تھی چنانچہ اس جنگ میں بھی ترکوں کو بہت سے محاذوں پر پیچھے ہٹنا پڑا اور انہوں نے دریائے مارٹس (River Martis) کی وادی کا سارا جنوبی علاقہ گنوا دیا۔ یہ جنگ 3 مئی 1913ء کو ختم ہوئی۔ جس کے بعد برطانوی حکومت کی مداخلت پر سلطنت عثمانیہ اور بلقان لیگ کا ایک معاہدہ ہوا جو معاہدہ لندن (London Treaty) کہلاتا ہے۔ جس کے بعد یہ تمام بلقانی ریاستیں عثمانیہ حکومت سے بالکل ہی علیحدہ ہو کر آزاد ہو گئیں اور برطانیہ کو بھی سائپرس کے علاقے میں اپنا اقتدار قائم کرنے کا موقع مل گیا۔

اس طرح 1912ء تک وہ چھوٹی بڑی ریاستیں جو سلطنت عثمانیہ کی حکومت سے باہر نکل چکی تھیں وہ یہ ہیں:

یونان 1821ء میں آزاد ہوا۔

سربیا، مونٹی نیگرو اور رومانیہ 1878ء میں آزاد ہوئے۔

بلغاریہ 1908ء میں آزاد ہوا۔

البانیہ 1912ء میں آزاد ہوا۔

سائپرس (قبرص) 1913ء میں آزاد ہوا۔

ابھی یہ ممالک آزاد ہوئے ہی تھے کہ ترکی میں سلطنت کے اندر حکومت عثمانیہ کی مخالفت

میں بھی ایک اندرونی تحریک شروع ہوگئی جس میں خصوصیت سے ترکی فوج کے نوجوان آفیسران شامل تھے اوران میں یہ جذبہ پرورش پانے لگا کہ یہ 500 سالہ قدیم عثمانی سلطنت اب بوسیدہ ہو چکی ہے۔اس کا نظم ونسق، ظلم وزیادتی، لوٹ ماراور صرف چند امراء کو تحفظ دینے کے لئے کام کرتا ہے اور فوج میں فوری طور پر مکمل اصلاحات کی ضرورت ہے۔اس تحریک کا نام Young Turks تھااوران کاایک سرگرم کارکن کمال نام کاایک افسر تھا۔

1912ء کی پہلی بلقان جنگ کی شکست کا ذمے داراس کے کمانڈر ناظم پاشا کو ٹھہرایا گیااور اسے موت کی سزادے دی گئی۔

ان جنگوں سے ہٹ کر اسی دوران ایک یہ خبر بھی ہم نے پڑھی کہ 14 اپریل 1912ء کو امریکہ کا ایک مسافر بردار بحری جہاز ٹائی ٹینک (Titanic) سمندر میں غرق ہو گیا ہے جس میں قریباً 2000 مسافر جاں بحق ہوئے۔

پہلی جنگ بلقان کی جو متحدہ کمان بلقان لیگ کے نام سے تشکیل دی گئی تھی ان کے اراکین بھی جلد ہی آپس میں جنگ پر تل گئے کیوں کہ ان بلقانی ریاستوں نے اپنے آپس کے معاہدوں کے مطابق عثمانی حکومت سے حاصل شدہ مفتوحہ علاقے آپس میں ٹھیک طرح سے تقسیم نہیں گئے تھے اور خصوصاً بلغاریہ کو ابھی آزادی تو مل گئی تھی مگراس کی جغرافیائی حدود کو یونان اور سربیا نے بہت حد تک کانٹ چھانٹ دیا تھا۔چنانچہ 16 جون 1913ء کو بلغاریہ نے یونان اور سربیا پر حملہ کردیا۔

جیسے ہی جنگ شروع ہوئی یونانیوں اور سربیا کی متحدہ فوجوں نے نہ صرف بلغاریہ کا حملہ پسپا کردیا بلکہ وہ بلغاریہ اور رومانیہ کے اندرونی علاقوں میں بھی گھس گئے۔اس ہنگامے کا فائدہ عثمانی حکومت نے یہ اٹھایا کہ وہ بھی اس جنگ میں شامل ہوگئی اور بلقان کی پہلی جنگ میں جو علاقے اس کی ہاتھ سے نکل گئے تھے ان کو واپس لینے کی کوشش کی اور ایڈریانوپل کا علاقہ فتح کرلیا۔اس جنگ میں حکومت سربیا ایک اور مضبوط قوت بن کر ابھری کیونکہ اس نے جنوبی سلوک (Southern Salvac) کے بھی کچھ علاقوں کو فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کرلیا تھا۔

سربیا کے نوجوانوں کی احتجاجی تحریکیں اب آسٹریائی حکومت کے خلاف ہوتی جارہی تھیں انہی کی ایک تحریک سیاہ ہاتھ (Black Hand) نے سربیا کے گورنر Potioreck (یعنی سربیا میں متعین آسٹریا کے گورنر) کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور سربیا کی خفیہ ایجنسیوں نے ان کے کارکنوں کی مدد کی۔انہی دنوں بوسنیا کے شہر Sarajevo میں آسٹریا کے ولی عہد اوراس کی بیوی کا دورہ ہونے والا تھا تو اس تحریک کے نوجوانوں نے گورنر کی بجائے اب ولی عہد کو نشانہ بنانے کا

پروگرام بنالیا۔

فرانز فرڈیننڈ (Franz Ferdinand) یعنی ولی عہد ایک بدزبان اور تیز اور تلخ لہجوں کا شخص تھا اور خصوصاً جنوبی سالوک کو آسٹریا کی بلاواسطہ حکومت میں شامل کرنے کا کئی بار عندیہ بھی دے چکا تھا جس کو سربیا اپنا علاقہ سمجھتا تھا۔

اس سازش میں سات نوجوان طلباء کا ایک چھوٹا سا گروہ بہت سرگرمی سے اس کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔

آسٹریا کا ولی عہد فرانز فرڈیننڈ اور اس کی بیوی صوفی شوٹک (Sophie Chotec) ایک کھلی گاڑی میں سربیا کے شہر جیو کے ایک کیفے کے پاس سے گزرے تو اس وقت ان سات طالب علموں میں سے ایک نے جس کا نام وارسوکو برولک (Vasoco Brivolic) تھا اس نے ولی عہد کے قافلے کی گاڑی پر بم اچھال دیا۔ ولی عہد کی گاڑی تو گزر چکی تھی مگر یہ بم اس کے پیچھے آنے والی حفاظتی گاڑی پر گرا جس سے سات لوگ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے اور دوسرے گیارہ افراد بھی زخمی ہوئے جنہیں اسپتال پہنچایا گیا۔

ولی عہد کو جب اس حادثے کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے سارے پروگرام ملتوی کر کے زخمیوں کی عیادت کے لئے اسپتال جانے کا قصد کیا اسپتال سے واپسی میں ولی عہد کی گاڑی پھر اسی راستے سے گزر رہی تھی کہ ایک پل کے قریب اس کو اپنا مقررہ راستہ بدل کر ایک اور تنگ سڑک سے گزرنا پڑا۔ جہاں اسی تحریک کا ایک دوسرا لڑکا اتفاقاً ابھی تک وہیں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پہلے تو یہی خیال کیا تھا کہ ولی عہد مارا جا چکا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ زندہ سلامت اپنی بیوی کے ساتھ اسی گاڑی میں موجود ہے اور اب یہ گاڑی اس کے بالکل سامنے ہی نہایت قریب سے گزرنے والی تھی تو اس نے اپنے ریوالور سے دو فائر کئے جن سے ولی عہد اور اس کی بیوی دونوں ہی مارے گئے۔ قاتل کو موقع پر ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اس لڑکے کا نام گویرلو پرنسپ (Gavirlo Princip) تھا اور یہ 17 سالہ ایک نوجوان شخص تھا۔ یہ واقعہ 28 جون 1914ء کو پیش آیا۔

اس واقعے کے بعد بھی مزید دو ماہ گزر گئے۔ خفیہ ایجنسیوں کی تفتیش ہوتی رہی مگر روس، برطانیہ اور جرمنی نے اس طرح کے حالات پر کوئی خاص توجہ نہ کی اور نہ ہی امن قائم کرنے میں کوئی پہل کی۔ پھر آسٹریا نے جرمنی کے شاہ قیصر ویلہیلم (Kaiser Willhelm) کو اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ آسٹریا کی شہنشاہیت کا ساتھ دے تا کہ آسٹریا سربیا کو اس حملے اور قتل پر سزا دے سکے۔ وہ اس سزا پر بضد تھا۔

چنانچہ اس نے سربیا کے سامنے کچھ ایسے مطالبات رکھے جن کو انہیں 48 گھنٹوں میں تسلیم کر لینا تھا یا رد کر دینا تھا۔ یہ مطابقت سے زیادہ الٹی میٹم کا نوٹس تھا۔ جس کی تحقیر آمیز شرائط کو سربیا کا وزیراعظم منظور کر ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ آسٹریا نے سربیا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور روس نے سربیا کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ دوسری طرف جرمنی نے فرانس کے خلاف بھی جنگ کا محاذ کھول دیا۔

آسٹریا اور روس کا خیال تھا کہ وہ چھ ہفتوں کے اندر ہی اندر سربیا میں داخل ہو چکا ہوگا کیونکہ ایک طرف تو فرانس کی فوج جرمنی کی مزاحمت کر رہی ہوگی اور دوسری طرف برطانیہ کی بحری طاقت جرمنی کے شمالی افریقہ کے مقبوضات کی بھی ناکہ بندی کر دے گی جس کی وجہ سے جرمنی کو اپنے افریقی علاقوں سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکے گی۔ اس لئے جرمنی کی زمینی طاقت کو ختم کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ لیکن اس قسم کی منصوبہ بندی کرنے والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ جرمنی نے کئی سال کی محنت کر کے سمندر کی سطح پر نظر نہ آنے والی ایسی آبدوزیں بنالی ہیں جو پانی کے اندر ہی تیرتی ہیں اور پانی کے اندر ہی سے اپنے سامنے آنے والی کسی بھی کشتی یا بحری جنگی جہاز کو بم مار کر ڈبا سکتی ہیں اور ان کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ جرمنی کئی سالوں سے بارود یعنی پوٹاشیم نائٹریٹ (Potassium Nitrate) کا بہت ذخیرہ جمع کرتا چلا آ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے پاس بم بنانے کی صلاحیت بہت ہی بڑھ چکی تھی۔

اس سال یعنی 1914ء کے اعداد و شمار کے مطابق روس، فرانس اور برطانیہ کی بحری فوج 335,000 فوجیوں پر اور 43 بحری جنگی جہازوں پر مشتمل ہے۔ جبکہ جرمنی، آسٹریا اور عثمانیوں کے کل 17 بحری جنگی جہاز اور ان کی مشترکہ فوج تقریباً 95 ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن جرمنی کی آبدوزیں اس کے علاوہ ہیں جن کی تعداد تو کیا کسی کو ان کی موجودگی کا بھی علم نہ تھا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ابھی تک ایک راز ہی تھا کہ ترکوں کی فوج کے افسروں کی تربیت بھی بہت عرصے سے جرمنی میں ہی ہوتی چلی آ رہی تھی جس کی صرف ایک ہی وجہ تھی کہ جرمنی نہیں چاہتا تھا کہ روس کو بلقان کے راستے بحیرہ معتدل میں کوئی راستہ دیا جائے کیونکہ اس طرح شمالی افریقہ کے اس کے کالونیل مقبوضات بھی خطرے میں پڑ سکتے تھے۔ یورپ میں فوج اور بحری طاقتوں کے اس تعین سے یہ بات مشکل نظر آتی ہے کہ یہ جنگ جلدی ختم ہو سکے گی۔

برطانیہ نے اپنے تمام مقبوضات سے سپاہی بھرتی کرنا شروع کر دیئے ہیں اور جنگ کے بادل پورے یورپ میں اور ادھر روس کی وجہ سے ایشیا تک پھیل چکے ہیں۔ ادھر کچھ عرصے سے روس میں بھی ایک نئی اندرونی بغاوت سر اٹھا رہی ہے۔ وہاں پر صدیوں کی جاگیرداری اور امرائی نظام

کے خلاف ایک یہودی فلاسفر کارل مارکس کے نظریۂ اشتراکیت نے پورے روس کے مزدوروں، کسانوں اور غریب طبقے کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا ہے۔ جس کا نعرہ یہ ہے کہ:

''ان تمام امیروں، جاگیرداروں اور کارخانہ داروں کی دولت میں عوامی مزدوروں کو بھی برابر کا شریک ہونا چاہئے اور یہ کہ شہنشاہی نظام مُردہ ہو چکا ہے اور اس کو عوامی مشکلات کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ اس لئے اس نظام کو ختم کر کے عوامی اشتراکی فلسفے کے مطابق مشترکہ ملکیتوں کا نظام رائج کر دینا چاہئے''۔

اس تحریک میں لینن، ٹراؤسکی اور اسٹالن وغیرہ جیسے لوگوں کے نام سامنے آ رہے ہیں جو اس تحریک کو اپنی شعلہ بیان تقریروں سے روز بروز زیادہ ہر دلعزیز بنا رہے ہیں۔

دوسری طرف مکڑی کے جالوں کی طرح سے پورا یورپ شہنشاہوں اور ریاستوں کی باہمی معاہدوں سے جکڑا نظر آتا ہے۔ جن میں آپس کی خود غرضانہ ہوس ملک گیری اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی مستقل مہم چلتی رہتی ہے۔

جرمنی نے آسٹریا کا ساتھ دے کر مشرقی یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں جیسے لیتھونیا، اسٹونیا، لٹویا اور پولینڈ وغیرہ پر بھی قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ پولینڈ آج کل روس کی زار سلطنت کا ماتحت ہے۔

آسٹریا کی شاہی کاؤنسل نے ولی عہد کے قتل کے جرم کی ساری ذمے داری بوسنیا اور سربیا پر ڈال دی تھی اور 48 گھنٹوں کے اندر سربیا کو یا تو یہ ذمے داری قبول کرنا تھا یا جنگ کے لئے تیار رہنا تھا۔ روس نے سربیا کی مدد کا اعلان کیا اور جرمنی نے آسٹریا کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ سلطنت عثمانیہ کی ترک حکومت نے جرمنی کا ساتھ دینے کا اعلان کیا ہے۔ ادھر فرانس چونکہ روس کے ساتھ تھا اس لئے جرمنی نے فرانس کو بھی اپنے دشمنوں میں شامل کیا ہے اور برطانیہ نے روس، فرانس اور سربیا کی حمایت کی۔ اس طرح یورپ کی ریاستوں کے دو گروپ بن گئے ہیں اور دونوں آمنے سامنے آ گئے ہیں۔

ایک گروپ جو جرمنی، آسٹریا اور سلطنت عثمانیہ کا ہے وہ اپنے آپ کو سہہ فریقی اتحاد (Triple Allaince) کہتا ہے۔ دوسرا گروپ برطانیہ، روس اور فرانس کا ہے جو خود کو سہہ فریقی مزاحمتی گروپ (Triple Detante) کا نام دیتا ہے۔

جرمنی نے 4 اگست کو فرانس سے اعلان جنگ کر دیا۔ اگلے دن یعنی 5 اگست کو جرمنی نے بیلجیم سے بھی اعلان جنگ کیا۔ 5 اگست کو آسٹریا نے روس سے اعلان جنگ کیا کیونکہ روس نے سربیا کی

امداد کا اعلان کیا تھا۔

فرانس کی مدد کرنے کے لئے برطانیہ نے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا طبل بجا دیا اور اٹلی نے بھی برطانیہ کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ گویا اگست 1914ء تک پورا یورپ جنگ کی زد میں آ چکا تھا۔

تمام ممالک نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنی اپنی فوجیں محاذوں پر پہچانی شروع کر دیں تھیں۔ چنانچہ اب کسی بھی قسم کی صلح یا گفت وشنید کے امکانات بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔

برطانیہ کے وزیر جنگ لارڈ کچنر نے برطانوی وزیر اعظم جارج لائیلڈ کو تجویز بھیجی ہے کہ برطانوی مقبوضات سے کم از کم پندرہ ملین (یعنی ڈیڑھ کروڑ) سپاہی بھرتی کیئے جائیں تاکہ ان کو تربیت دے کر بوقت ضرورت ان کو ان کے ممالک سے یورپ کے محاذ پر بھیجا جا سکے۔

ابھی صرف چند سال پہلے تک روس کے آسٹریا سے اچھے تعلقات تھے مگر پہلے تو 1908ء میں آسٹریا اور روس کی تعلقات اس وقت خراب ہوئے جب بوسنیا کے معاملات پر روس نے بوسنیا کی حمایت کا اعلان کیا تھا اور پھر 1912ء میں بلقان کی جنگ کی وجہ سے ان میں مزید تلخی پیدا ہوئی جب سربیا اور یونان نے بلقان لیگ بنا کر عثمانی سلطنت کے مقبوضات پر حملہ کیا اور روس نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور پھر جب آسٹریا نے اپنے ولی عہد کے قتل پر سربیا کو چارج شیٹ (الزامات کی فہرست) بھیجی اور 48 گھنٹوں میں اس کا جواب مانگا تو روس نے سربیا کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ ولی عہد کے قتل کے بعد 2 ماہ ایسے تھے کہ جس کے دوران یورپ کی یہ شہنشاہتیں گفت و شنید کے ذریعے اپنے اختلافات کو سلجھا سکتی تھیں۔ مگر کسی نے بھی اس کے لئے کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی اور نتیجتاً پورا یورپ جنگ کی آگ میں جلنا شروع ہو گیا تھا۔

اور آج 27 اکتوبر 1914ء کو جب میں یہ تحریر اپنی ڈائری میں لکھ رہا ہوں تو جنگ کے ختم ہونے کے نہیں بلکہ اس کے اور مزید پھیلنے کے امکانات ہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ جنگ یورپی طاقتوں کے کالونیل مقبوضات تک بھی پھیل جائیں۔

آثار قدیمہ کے تمام اخراجات نصف سے بھی کم کر دیئے گئے ہیں اور مجھے بھی دہلی آنے کا حکم ملا تھا۔ سارے عملے کی چھٹیاں منسوخ کر دی گوئی تھیں اور ہمیں یہ خفیہ سرکلر بھیجا گیا ہے کہ مقامی جذبات اور خصوصاً مسلمانوں کے جذبات بہت مشتعل ہیں کیونکہ برطانوی حکومت مسلمانوں کی عثمانیہ خلافت کے خلاف جنگ کر رہی ہے۔ اس لئے ہمیں بازاروں اور عام مجمع کی جگہوں پر اور ہجوم میں جا کر اپنے آپ کو غیر ضروری تشہیر سے گریز کرنا چاہیئے، ہمیں سختی سے منع کری دیا گیا ہے

اور یہاں ہندوستان سے خیمے، کمبل، وردیاں اور جوتے اور عام پہننے کے کپڑے لاکھوں کی تعداد میں برطانیہ پہنچائے جانے لگے ہیں۔

روسی اور میں زیادہ وقت دہلی کے سیکٹریٹ میں یا پھر ڈائریکٹوریٹ آف آرکیالوجیکل سروے ہی کے دفاتر میں گزارتے ہیں۔ ہمارے کرنے کے لئے کوئی خاص کام بھی باقی نہیں ہے اور میرا پہلے یہ ارادہ تھا کہ اپنے والدین سے ملنے کے لئے برطانیہ یعنی کیمبرج چلا جاؤں کیونکہ تقریباً میں ان سے 8 سال سے نہیں ملا ہوں۔ مگر اب نہر سوئز کے راستوں پر مسافر جہازوں کا آنا جانا بھی کم ہو گیا ہے۔ جرمنی کی آبدوزیں ہر جگہ حملہ آور ہو رہی ہیں اور عام شہریوں کے لئے بھی سفر میں خطرات بہت بڑھ گئے ہیں اور پھر حکومت برطانیہ نے سب جگہ چھٹیاں منسوخ کر رکھی ہیں۔ دیکھئے! اب کتنا عرصہ اور اسی طرح جنگ اور بے کاری کی نذر ہوتا ہے۔

اٹھارواں باب

شیشے کا گھر

پانچ سال بعد میں پھر اپنی ڈائری لکھ رہا ہوں۔

آج 30 جون 1919ء ہے۔ یہ تاریخ کی سب سے زیادہ خونی جنگ ہے جسے ورلڈ وار یعنی دنیا بھر کی جنگ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ جنگ 4 اگست کو شروع ہو کر 11 نومبر 1918ء کو برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی فتح کے ساتھ ختم ہو چکی ہے اور اسی ماہ یعنی جون 1919ء میں فاتحین نے فرانس کے شہر Versailles میں شکست خوردہ جرمنی سے ایک معاہدہ کر لیا ہے جس میں فاتحین نے مفتوح سے اپنی ساری شرائط زبردستی منوالی ہیں۔

جنگ کے یہ چار سال ہم نے ہندوستان میں کیسے گزارے اور یہاں سلطنت عثمانیہ ترکی کے حق میں مسلمانوں میں کسقدر جوش و جذبہ پھیلا ہوا تھا اور ہندو قوم اپنی جماعت نیشنل کانگریس کے ذریعے کس طرح برطانیہ سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ یہ سب باتیں تو بہت تفصیل کی متقاضی ہیں مگر اب مجھے یہ اندازہ ہونے لگا ہے کہ ہم ہندوستان پر زیادہ عرصہ قابض نہیں رہ سکیں گے اور یہ کہ ہم برطانوی اپنے محفوظ مقبوضات میں نہیں بلکہ صرف شیشے کے گھر میں رہتے ہیں۔

غربت اور بھوک سے مارے ہوئے ہندوستانی نوجوان جوق در جوق ہماری یورپ کی لڑائیوں میں حصہ لینے کے لئے فوجی بھرتیوں کے دفاتر میں داخل ہوتے رہے اور وہاں یورپ کی اجنبی زمین میں پیوند خاک ہوتے رہے۔ ہندوستان کی آمدنی کے اربوں کھربوں پاؤنڈ ہم نے جنگوں میں جھونک دیئے اور وہاں ہر احتجاج کرنے والے کو یا سر اٹھانے والے کو سختی سے کچل دیا تاکہ ہماری کسی بھی قسم کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کہ یہ مقامی باشندے (Native) ہمارے ہاتھ سے نہ نکل سکیں۔ ہماری پالیسی اسی دوران یہی رہی تھی کہ اونچے درجے والوں کو مراعات دو اور نیچے کے عام لوگوں سے سختی سے نمٹو تاکہ کوئی عوامی تحریک سر ہی نہ اٹھا سکے۔

ان چار سالوں میں مجھے نہ صرف یہاں ہندوستان کے سیاسی اور سماجی اور تاریخی حالات کو سمجھنے کا موقع ملا بلکہ یورپ کی عام تاجرانہ ذہنیت اور مکاری وخودغرضی کو اور اپنے ملک کی مالی ہوس اور ملک گیری پر بھی تنقیدی نظریں ڈالنے کا خوب موقع ملا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ جب میں بچہ تھا اور میری والدہ مجھے سونے سے پہلے برطانوی بہادر ہیروز کئے قصے سناتی تھیں تو میں سمجھتا تھا کہ ہم یسوع مسیح کے امن اور پیار ومحبت کی تعلیمات کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لئے برطانوی جھنڈے کے نیچے اپنا خون تک بہا دینے کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر یہاں آ کر اور اس عالمی جنگ کے واقعات پڑھ پڑھ کر مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ سب خود فریبی اور دھوکہ تھا۔ ہم اپنی طاقت کے بل بوتے پر یسوع مسیح کا دین پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ صرف اور صرف ڈاکوؤں کی طرح ملکوں ملکوں کی دولت لوٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم نے اپنے اوپر جو دوسروں سے محبت و ہمدردی کا خول چڑھایا ہوا ہے اس کی تہہ میں ہماری نیتیں؟ ان ممالک کے ذرائع آمدن اور ان کی جمع شدہ دولت کو لوٹنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتی تھیں۔ میں جب یہ سب کچھ سوچتا ہوں تو بطور ایک برطانوی شہری میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

اس عالمی جنگ سے دنیا کو کیا ملا؟ کتنی دولت ضائع ہوئی؟ اور کون کون سی شہنشاہتیں زمین پر گر پڑیں؟ اور قدرت نے کس طرح ہماری یورپ کی 2 سو سالہ لوٹ مار کو 4 سال ہی میں مٹی میں ملا دیا ہے؟ یہ ہمیں سوچنا چاہئے۔

اس چار سالہ جنگ میں چھوٹے بڑے کل 60 ممالک نے کسی نہ کسی طور پر حصہ لیا اور نقصان اٹھایا ہے۔ اس کے کل اخراجات کا تخمینہ 35 ارب پاؤنڈ (3500 Millions) لگایا گیا ہے۔

اس جنگ میں کل ملا کر 90 لاکھ سے زیادہ فوجی سپاہی مارے گئے ہیں اور 71 لاکھ سویلین یا عام شہری ختم ہو گئے اور زخمیوں کی تعداد بھی 40 لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔

اس جنگ کی وجہ سے 4 موروثی شہنشاہتیں ختم ہو گئی ہیں۔ یعنی روس میں زار شہنشاہوں کی سلطنت کو وہاں کے اشتراکی فلسفے کی انقلابی لہر نے ڈبو دیا ہے۔ جرمنی کے قیصروں کی حکومت شکست کی وجہ سے زمین بوس ہوئی ہے۔ آسٹرو ہنگیرین ہسبرگ (Habsburg) کی خاندانی شہنشاہیت ختم ہو چکی اور سلطنت عثمانیہ بس اب کوئی دن کی مہمان ہے۔

اس جنگ کے بعد یورپی اور مشرق وسطیٰ کے علاقوں کی ریاستوں کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔

یورپ میں سات نئی ریاستیں وجود میں آ گئی ہیں ان میں یہ ریاستیں شامل ہیں:

لٹویہ (Litvia)، اسٹونیا (Estonia)، لیتھونیا (Lithoania)، چیکوسلواکیہ

(Czechoslovakia)، یوگوسلاویہ (Yugoslavia) جو پہلے روس کا ایک حصہ تھا وہ الگ کر کے پولینڈ (Poland) کے نام سے ایک آزاد ریاست قرار دیا گیا ہے۔

اسی جون 1919ء میں فاتحین نے مل کر مفتوحہ شہر یعنی اتحاد پر وارسائے، معاہدے کے نام سے ایک سخت صلح نامہ تھوپ دیا ہے۔ اس معاہدے کے بنیادی فریقین میں امریکہ کا صدر ووڈر ولسن (Wooder Wilson)، برطانیہ کا وزیر اعظم لائیلڈ جارج (Liolyd George) اور اٹلی کا وزیر اعظم کلے من سو (Clemenceau) بہت پیش پیش رہے ہیں۔

Treaty of Versailles 1919 کی رُو سے یہ شرائط نافذ کی گئیں۔

اس جنگ کا پورا ذمے دار جرمنی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے جرمنی کو 6 ارب 60 کروڑ پاؤنڈ تاوان جنگ ادا کرنا ہوگا۔ جرمنی کو مکمل طور پر غیر مسلح کر دیا گیا ہے اور اس کی بحری اور بری فوج کو بالکل نہتا کر دیا گیا ہے۔

جرمنی کے وہ دو علاقے جہاں سے لوہا اور کوئلہ نکلتا تھا یعنی آلسیس (Alsaice) اور لوران (Ĺoran) جس پر فرانس کا بہت پرانا دعویٰ چلا آ رہا تھا، وہ فرانس کو واپس کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جرمنی کا اپنا Saar علاقہ جہاں سے بڑی مقدار میں کوئلہ نکالا جاتا تھا، پندرہ سال کے لئے فرانس کو مل جائیں گے۔ جہاں پندرہ سال کے بعد استصواب یا رائے شماری (Voting) سے یہ طے کیا جائے گا کہ اس علاقے کو فرانس ہی کے ساتھ رہنا چاہئے یا جرمنی کے ساتھ؟ اور ان پندرہ سالوں میں فرانس وہاں سے کوئلہ نکال کر اپنے جنگی نقصانات کا ازالہ کرنے کا حقدار رہے گا۔

روس جو کہ اب ایک اشتراکی فلسفے کا مالک بن گیا ہے۔ اس لئے یورپ اور روس کے درمیان اور جرمنی کے شمال مشرق میں پولینڈ کی جو نئی ریاست بنائی گئی ہے وہ پولش راہداری (Polish Corridor) کہلائے گی اور یہ روس اور یورپ کے درمیان حدّ فاصل سمجھی جائے گی۔ جرمنی کے شمالی افریقہ کی کالونیاں بھی برطانیہ کے ماتحت رہیں گی اور وہاں بھی جمہوری نظام نافذ کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ چونکہ جنگ کے دوران ہی میں روس برطانیہ سے الگ ہو کر جنگ سے علیحدہ ہو گیا تھا اور اس کی جگہ ریاست ہائے متحدہ نے سہ فریقی مزاحمتی گروپ کی حمایت کی تھی اس لئے جرمنی اور دوسرے فاتح اور مفتوح مل کر امریکہ کو بھی اس کے نقصانات کے ازالے کے طور پر 10 ارب ڈالر ادا کریں گے۔ اس قسم کا تمام جنگی تاوان ادا کرنے کے لئے جرمنی کی حکومت کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے شہریوں پر سخت اور بڑے ٹیکس عائد کرے۔ جرمنی پر ان شرائط کو نافذ کرنے کے

علاوہ فاتحین نے خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے کرنے کا بھی عندیہ دیا ہے۔

آرمینیا کو ایک آزاد ریاست تسلیم کیا جائے گا۔ لبنان اور شام کو سلطنت عثمانیہ سے الگ کر کے فرانس کے ماتحت ایک زیر نگرانی ریاست یا Mandatory ریاست کے طور پر اس کے حوالے کیا جائے گا جہاں بعد میں انتخابات کرا کے ان میں جمہوری حکومتیں قائم کی جائیں گی۔

فلسطین میں یہودیوں کی ایک آزاد اور خودمختار ریاست قائم کرنے کا بھی منصوبہ اعلامیہ بالفور (Balfour Declaration) کے ذریعے جاری کیا جا چکا ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا بھر کے یہودی اب فلسطین اور یروشلم کی زمینیں وہاں کے عرب اور فلسطینی باشندوں سے منہ مانگی قیمتوں پر خرید رہے ہیں۔

سلطنت عثمانیہ کی مرکزی حکومت کو صرف ترکی کے علاقے یعنی قسطنطنیہ اور شمالی اور مرکزی ایشیا مائنر تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سمرنا اور ایڈریانوپول کے علاقے حکومت ترکی سے الگ کر کے یونان کو دیئے جانے کا بھی منصوبہ ظاہر کیا گیا ہے۔

اس عالمی جنگ کے ختم ہونے کے بعد فاتحین نے کسی نرم دلی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے اور مفتوحین پر ایسی کڑی شرائط رکھ دی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ کی بغض و حسد کی آگ ابھی اور بھڑکے گی۔

ہم برطانوی شاید دنیا بھر کو جمہوری اور پارلیمانی نظام کے فوائد بتانے ہی میں لگے ہوئے ہیں مگر ہم یہ بھول رہے ہیں کہ کسی بھی مغلوب یا مفتوح پر ظالمانہ شرائط ٹھونک کر یا کسی کو خنجر کے نیچے رکھ کر زبردستی کوئی نظام نافذ نہیں کرایا جا سکتا۔ نہ ہی ہر قوم اور ریاست کو ایک ہی چھڑی سے ہانکا جا سکتا ہے۔ پھر ہم نے اپنی کالونیوں میں پچھلے دو سو سال سے کونسا پارلیمانی نظام رائج کیا ہوا ہے؟ ایک تاریخ کے طالب علم کے طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر پھینک رہے ہیں۔ تاریخ جبر و تشدد اور ظلم کو برداشت نہیں کرتی اور کوئی بھی ظالمانہ نظام ہو وہ ضرور زمین بوس ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں بھی آزادی کی تحریکیں زور پکڑتی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کی نیشنل کانگریس کی طرز پر اپنی ایک سیاسی جماعت مسلم لیگ بنا لی ہے اور اس کا پہلا اثر یہ ہوا ہے کہ ''موئن جودڑو'' والے ضلع کے صوبہ سندھ کو بمبئی اور گجرات سے علیحدہ کر کے اسے ایک مستقل صوبہ بنا دیا گیا ہے اور یہاں کے مسلمان زمیندار اب ترکی کی خلافت کے حق میں زیادہ فعال نظر آنے لگے ہیں۔

ان پورے 9 سالوں میں جبکہ میں ہندوستان میں مقیم رہا ہوں اور پچھلے پانچ سال جب میں جان مارشل کے ساتھ مصر اور پھر پانچ سال عراق میں تھا۔ روسی نہ صرف ہر وقت میرا ایک اچھا مددگار رہا ہے بلکہ ان نے ہمیشہ ایک مکمل محافظ کا سا کردار ادا کیا ہے۔

کبھی کبھی تو میں سوچتا تھا کہ میں روسی سے متعلق شاید کچھ بھی نہیں جانتا۔ نہ کبھی وہ خود سے، اپنے خاندان یا اپنے کسی پس منظر یا اپنے کسی کنبے یا برادری کی بابت کچھ بتاتا تھا اور اگر میں کچھ پوچھتا بھی تھا تو وہ ٹال جاتا تھا۔ بس جب کبھی وہ مجھے بے کار، حالات سے بیزار یا مایوس دکھتا تھا تو کسی نہ کسی طرح یہ ضرور جتا دیتا تھا کہ:

''مجھے مشرق میں دریاؤں کی سرزمین کی طرف جانا ہی ہوگا اور جتنی کچھ دیر ہو رہی ہے وہ ہمیں اپنی منزل سے ہٹا نہیں سکے گی''۔

برطانیہ میں میرے والدین خیریت سے رہے۔ تین چار ماہ بعد میری ان سے خطوط کے ذریعے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میری والدہ اب مجھ سے ملنے کے لئے بہت بے تاب رہتی ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ جنگ ختم ہو ہی چکی ہے تو کیوں نہ میں چند ہفتوں کے لئے چھٹی پر کیمبرج چلا ہی جاؤں۔

ادھر ''موئن جو دڑو'' کی وہی 16 مربع میل کی زمین جو میں نے سروے کر کے جیالوجیکل ڈیپارٹمینٹ کو دی تھی اسی محکمے کو الاٹ کر دی گئی ہے اور جان مارشل بھی جلد وہاں اپنے کام کا آغاز کر دیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر کے طور پر لاڑکانہ ہی بھیجیں گے یا ان کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ میرے لئے تیار ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ تو ہے مگر میری چھٹی حس کہتی ہے کہ میرا وقت ہندوستان میں پورا ہونے والا ہے۔

ادھر بمبئی اور کراچی کے ساحلوں پر جن سے واپس آنے والے فوجیوں کے جہاز آتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کتنے گورکھے، کتنے پٹھان اور کتنے سکھ سپاہی اس حالت میں لائے جا رہے ہیں کہ کسی کا ہاتھ نہیں ہے، کسی کا پیر نہیں ہے، کوئی کسی طرح معذور ہے، کوئی کس طرح مفلوج ہے۔ غرضیکہ جنگ کی باقیات اور جنگ کے زخم یہاں ہندوستان تک صاف نظر آتے ہیں۔

یورپ کے تمام ممالک میں بے روزگاری پھیل گئی ہے۔ فرانس، جرمنی، برطانیہ، اٹلی اور آسٹریا میں مہنگائی بھی دوگنی ہوگئی ہے اور لوگوں کے لئے روزگار حاصل نہیں۔

زخمی فوجیوں کی پینشن اور ان کے علاج و معالجے اور مرنے والے فوجیوں کے خاندانوں کی دیکھ بھال کے لئے بھی یورپ کی ریاستوں کو اربوں ڈالرز کی ضرورت تھی۔

ادھر یورپ میں اب ہر ملک اپنی مصنوعات کو زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کی تگ و دو میں ہے تاکہ وہاں کی صنعتیں اور کارخانے چلیں تو لوگوں کو روزگار ملے۔ مگر اس طرح دوسرے ممالک کی صنعتوں کو یہ ممالک اپنے یہاں آنے نہیں دیتے تھے اور بین الاقوامی تجارتی حد بندیاں ہو رہی ہے اور ایک طرح سے معاشی قومیت (Economic Nationalism) یورپ میں زیادہ ہی فروغ پا رہی ہے اور تقریباً پورے ہی یورپ اور ایشیائی ممالک اور مشرق وسطیٰ کا پورا مستقبل بے یقینی اور سخت بے چینی کا شکار نظر آتا ہے۔

انیسواں باب

کومیلا کی طرف

27 جولائی 1919ء۔ کل بعد دوپہر میں اور روسی دونوں بذریعہ ٹرین یہاں دہلی سے ڈھاکہ روانہ ہو جائیں گے۔ میری نئی پوسٹنگ محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے ڈھاکہ کے قریب کومیلا کے ضلع میں کردی گئی ہے۔ ڈھاکہ صوبہ بنگال کا ایک بڑا شہر ہے۔ ہمارا یہ سفر دو راتوں کے بعد صبح 9 بجے ختم ہوگا اور ہماری یہ ٹرین صوبہ یوپی، صوبہ اڑیسہ اور صوبہ بہار سے ہوتی ہوئی بنگال کے مشرقی حصے میں پہنچے گی۔ گویا سارا کا سارا شمالی ہندوستان ہی ہماری گزرگاہ ہوگا۔

ہم وقت پر اسٹیشن پہنچ گئے۔ دہلی کے اسٹیشن پر بڑا رش تھا۔ خوانچے والے، پوری کچوری بیچنے والے، دال چنا اور دودھ لسی کے گلاس بھی اسٹالوں پر موجود تھے۔ آم، امرود، جامن اور لیچیاں وغیرہ بھی پھلوں کے اسٹال پر بک رہے تھے۔ دہلی سے ایک دو اخبار اردو اور ہندی کے بھی نکلنے لگے ہیں۔ ان کے ہاکرز بھی آوازیں لگا لگا کر یہ اخبار بیچ رہے تھے۔ لال رنگ کی وردی پہنے سامان اٹھانے والے قلی بھی ڈبوں میں سامان رکھ رہے تھے۔ ریلوے کے گارڈ اور ٹکٹ چیکر اور دہلی اسٹیشن کے دوسرے افسران بھی ٹکٹوں کو چیک کر کے مسافروں کی ان کے متعلقہ ڈبوں اور سیٹوں تک رہنمائی کرنے میں مصروف تھے۔

ہندوستان کی برطانوی حکومت اس بات کا بہت خیال رکھتی تھی کہ اس کے انگریز افسران اپنے مرتبے اور اعلیٰ حیثیت کے مطابق ریلوے کے بھی اعلیٰ درجوں میں سفر کریں اور اسٹیشنوں پر ریلوے کا متعلقہ عملہ ان کی خصوصی پذیرائی کرے۔ دوران سفر بھی ان کا خاص خیال رکھیں۔ اس لئے دہلی سے جب کوئی انگریز افسر باہر سفر کرتا ہے تو اس کی خبر ریلوے کو دی جاتی ہے اسی لئے اسٹیشن ماسٹر نے خود فرسٹ کلاس کی سیٹوں تک ہماری رہنمائی کی۔ اسٹیشن ہی سے ہمیں ایک دو انگریزی اخبار ہی منگوا کر دلوائے اور ہمارے ہی سامنے اپنے ایک اسسٹنٹ کو حکم دیا کہ ہمیں رات

کے لئے مناسب چادریں اور تکیے مہیا کر دیئے جائیں اور ٹرین چلنے سے پہلے چائے اور بسکٹ وغیرہ سے ہماری تواضع بھی کی۔ اسٹیشن ماسٹر کا خود ہماری بوگی تک آنا باقی عملے کے لئے اس بات کی وضاحت تھی کہ ہمارا پورا سفر ایک انتہائی اہم شخصیت یعنی وی آئی پی کی حیثیت سے کروایا جائے۔

ہمارے سفر کے تقریباً آخری حصے پر کلکتہ کا شہر آتا تھا جہاں ہماری ٹرین آدھا گھنٹہ رکی رہی۔ یہاں اسٹیشن پر بہت اژدھام تھا۔ پلیٹ فارم لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہمارے ڈبوں کی طرف تو خیر لوگ نہیں آتے تھے مگر باقی ساری ٹرین میں لوگوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ یہاں پھلوں میں آم، کیلے اور ناریل بہت بڑی مقدار میں بیچے اور خریدے جا رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ ایک لنگی اور ایک سوتی جیکٹ میں نظر آتے تھے۔

ہمارے ڈبے میں کل 10 افراد کی جگہ تھی اور اس میں اتفاق سے چار انگریز افسران بھی دہلی کے بعد کسی اور اسٹیشن سے ہمارے ساتھ ہی آ گئے تھے۔ ان کی بیگمات بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ ان میں سے تین افسران کو کلکتہ ہی میں اترنا تھا اور ایک کو ڈھاکہ تک جانا تھا۔

راستے بھر ان لوگوں سے زیادہ تر یورپ کی جنگ ہی کے متعلق باتیں ہوتی رہی تھیں اور ہم سب کا حتمی خیال یہی تھا کہ جو صلح کی شرائط یورپ میں جرمنی پر لاد دی گئی ہیں وہ لازمی طور پر محبت اور امن و سکون کی بجائے مزید نفرتیں اور مزید تصادم کی بنیاد بنیں گی اور ہم تمام ہی انگریز افسروں کا یہ خیال بھی تھا کہ ہندوستان پر ہماری گرفت مضبوط ہونے کی بجائے اب مزید کمزور ہو جائے گی کیونکہ ہندوستان کی بے حساب دولت ہم نے جنگوں پر خرچ کر کے اس ملک کو معاشی طور پر کمزور کر دیا ہے۔ اس کی ترقی کے سب کے سب منصوبے پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں اور پھر داخلی طور پر بھی پورے ہندوستان میں داخلی خود مختاری (Home Rule) کی جو تحریک آج کل ابھر رہی ہے وہ جلد یا بدیر لازمی طور پر اسی قسم کی خود مختاری کی تحریکوں میں بدل جائے گی جیسی عثمانی حکومت کے خلاف بلقانی ریاستوں میں ابھر چکی تھیں۔

کلکتہ کے بعد روسی، میں اور تیسرا انگریز افسر ہی ڈبے میں رہ گئے تھے۔ میں نے ڈھاکہ کے متعلق اس سے معلومات حاصل کرنا چاہیں تو اس نے کہا کہ:

''ڈھاکہ 5/6 لاکھ کی آبادی کا ایک بڑا شہر ہے۔ اس میں مسلمان زیادہ تعداد میں رہتے ہیں اور مسجدیں بہت زیادہ ہیں۔ یہ شہر دریائے بوڑھی گنگا کے کنارے آباد ہے۔ ناریل کی بہتات ہے۔ بارشیں بھی خوب ہوتی ہیں۔ گرمیوں میں دریاؤں میں سیلاب بھی آتے ہیں اور لوگ بانسوں سے بنائے ہوئے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہتے

ہیں۔ مچھلی اور چاول ان کی مرغوب غذا ہے اور غربت عام ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے اور درختوں کی فراوانی ہے۔ گاؤں سے گاؤں ملے ہوئے ہیں اور عموماً لوگ یہاں بیل گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہر وقت اپنے ساتھ ایک چھتری ضرور رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ بارش کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب شروع ہو جائے گی"۔

ڈھاکہ تک پہنچتے پہنچتے سفر کی کافی تھکن ہو چکی تھی۔ چنانچہ ہم نے یہی طے کیا کہ دو تین دن ڈھاکہ ہی میں رک جائیں اور پھر تازہ دم ہو کر اور ستا کر کومیلا کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ یہاں کے ڈپٹی کمشنر نے ہماری درخواست پر ہمارے لئے ایک ریسٹ ہاؤس میں جگہ مخصوص کرادی تھی اور ہم دھان منڈی کے قریب ایک جگہ جا کر ٹھہر گئے۔ دھان منڈی کا علاقہ یہاں کے کاروباری لوگوں کا ایک مشہور محلّہ تھا۔

ڈھاکہ جو جتنا سرسبز اور خوبصورت سنا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ حسین نکلا۔ پورے شہر میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے تالاب تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہر محلے کے اپنے اپنے جوہڑ تھے جہاں کنول کے پھول سطح آب پر کھلے نظر آتے تھے، زمین دکھائی ہی نہیں دیتی تھی کیونکہ ذرا سی بھی جگہ گھاس، پودوں اور خوردرَو پتیوں والی نباتات سے بھری رہتی تھیں۔

ڈھاکہ میں یا تو ہم نے سبزہ ہی سبزہ دیکھا یا پانی کے تالاب یا لوگوں کے جم غفیر۔ 30 جولائی 1919ء کا یہ مہینہ یہاں مون سون کی بارشوں کا تھا۔ دن میں دو تین مرتبہ بارش ضرور ہو جاتی تھی۔ بنگال کے شمال مشرق میں صوبہ آسام کی طرف جو گھارو اور کھاسی کے پہاڑی سلسلے ہیں ان سے ٹکرانے والے خلیج بنگال کے مون سون کے بادل پورے بنگال میں بارش برساتے ہیں۔ اسی لئے اپریل سے ستمبر تک یہاں کے دریا، تالاب، جھیلیں اور شہر پانی سے جل تھل رہتے ہیں۔

جب ڈھاکہ کے ڈپٹی کمشنر نے ہمارے لئے ریسٹ ہاؤس میں دو کمرے مخصوص کرا دیئے تو اسی وقت اس نے ہماری درخواست پر یہاں کے ایک مشہور انگریزی اسکول Nicholas Pogos School جو 1830ء میں آرمینیا کے کچھ تاجروں نے یہاں قائم کیا تھا کے ایک انگریز ٹیچر جارج میک گرد کو دو تین دن کے لئے ہمارے ساتھ کر دیا تھا تاکہ وہ اسکول کے بعد گیارہ بجے سے رات تک ہمارے ساتھ رہ کر ہمیں ڈھاکہ کے تاریخی مقامات دکھا بھی دیں اور یہاں پر برطانوی اقتدار کا کچھ تاریخی پس منظر بھی بتا دیں تاکہ ہمیں یہاں کا ماحول سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

اگلی صبح کو گیارہ بجے جارج میک گرد کو آنا تھا اور ہمارے ریسٹ ہاؤس کے قریب ہی ایک بڑا بازار بھی تھا سو میں نے ناشتہ کرنے کے بعد دو گھنٹے تنہا ہی شہر گھومنے اور بازار کا چکر لگانے کا ارادہ کر

لیا تھا۔ دکانیں زیادہ تر کپڑوں اور خواتین کے زیورات کی تھیں۔ ہوٹل اور ریستوران کم ہی نظر آتے تھے۔ کچھ دکانیں گھریلو صنعت وحرفت کی بھی تھیں۔ جہاں بانس کی بنی ہوئی تحفوں وغیرہ کے لئے Souvenior بھی فروخت ہو رہے تھے۔ خاص طور پر ناریل کے چھلکوں کے خول سے بانس کی پتلی پتلی تیلیوں اور کھپچیوں کو جوڑ کر مختلف ڈیزائن کی کشتیاں وغیرہ بہت تعداد میں بکتی نظر آتی تھیں۔

اس کے علاوہ پٹ سن (Jute) کے خوبصورت Table Mats اور بچوں کے جھولے اور اسکول کے بستے وغیرہ بھی رنگ برنگی چھوٹی بڑی الماریوں میں سجے ہوئے تھے۔ یہاں کی عورتیں زیادہ تر سوتی ساڑھیاں باندھتی ہیں سو وہ بھی طرح طرح کے رنگوں اور نقش ونگار اور ڈیزائنز کے ساتھ موجود تھیں۔ ایک بڑی دکان پر ''راج شاہی سلک'' لکھا ہوا تھا۔ میں یوں ہی اس کے اندر چلا گیا تو دکاندار نے مجھے ایک باذوق گاہک سمجھ کر طرح طرح کے سلک کے پارچہ جات دکھانے شروع کر دیئے اور مجھے بعض کپڑوں کی اس قدر تعریف کی کہ مجھے تکلفاً ایک قمیض کی سلک کا کپڑا خریدنا ہی پڑ گیا۔ تو اس نے بھی اخلاقاً مجھے ایک بڑے ناریل کا تازہ جوس پلوا دیا۔

دکان سے میں ابھی باہر ہی نکلا تھا تو میں نے دیکھا کہ گلیوں میں رش بڑھ رہا تھا اور بازار والے اور خوانچے والے بھی خوب چہل پہل پیدا کر چکے تھے۔ میں ابھی ریسٹ ہاؤس پہنچنے کے لئے اپنی واپسی کی سڑک کا اندازہ لگا ہی رہا تھا کہ انہی چلتے پھرتے لوگوں میں سے ایک لمبا اور مضبوط جسم کا شخص جو اپنے لباس اور وضع قطع سے اس ماحول میں اجنبی لگتا تھا بالکل اچانک ہی میرے روبرو آ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے بغیر کچھ کہے سنے ہاتھ بڑھا کر میرے دونوں کان مضبوطی سے پکڑ لئے اور سرخ وخونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا:

''____ ابھی وقت ہے لوٹ جا''۔

پہلے تو میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہاں جہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے نہ میری کسی سے دشمنی ہے نہ دوستی تو یہ کیا کر رہا ہے؟ پھر جس طرح جس بدتمیزی سے اس نے میرے کان پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بدتمیزی سے مجھ سے بات کی تھی تو میرا دل چاہا کہ میں بھی اس کو گردن سے پکڑ کر دو تین ہاتھ مار دوں۔ میں خود کو چھڑانے کی کوشش کیا کرتا کہ اس نے خود ہی میرے کان چھوڑ دیئے اور پھر ایک دم پیچھے ہٹ گیا اور پلک جھپکتے ہی وہ کہیں بھی مجمع میں غائب ہو گیا۔

بازار میں لوگ اسی طرح سے آ جا رہے تھے جیسے کسی کے لئے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ نہ کوئی میری طرف متوجہ ہوا تھا نہ کسی نے میرے یکدم رک جانے اور پھر اس طرح کسی سے مدبھیڑ کرتے ہوئے دیکھا تھا اور نہ ہی اس واقعہ کو کوئی اہمیت دی تھی۔ گویا ان کے لئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

یہ کون تھا؟ کیا اسے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی؟ یہ کیوں مجھ سے یہ جملہ کہہ کر گیا؟ اور پھر میں نے بس یہ سوچ کر اسے ذہن ہی سے جھٹک دیا کہ یہ کسی اور کے مغالطے میں مجھ سے آ کر الجھ گیا تھا۔

ریسٹ ہاؤس میں جارج میک گرو آ چکے تھے۔ 40/45 سال کا علمی اور ایک مخصوص سا استادی چہرے والا انگریز تھا جو مجھ سے متعارف ہو رہا تھا اور ہم جلد ہی آپس میں گھل مل گئے۔

روسی، میں اور جارج کا پروگرام یوں تھا کہ پہلے ہم یہاں کی کچھ تاریخی عمارات دیکھیں اور پھر شہر کے گردونواح کا چکر لگائیں۔ دن بھر کے لئے ایک گھوڑا بگھی ہم نے کرائے پر لے لی تھی۔

جارج سب سے پہلے ہمیں اپنے نکولس پاگوس اسکول لے گیا۔ اس نے بتایا کہ یہ اسکول آرمینیا کے ایک تاجر نے 1830ء میں قائم کیا تھا۔ بنگال میں آرمینین تاجر 1720ء کے لگ بھگ سے ہی آنے لگے تھے اور ان لوگوں نے یہاں کے نوابوں اور تاجروں کے ساتھ مل کر گندم، چاول، چوٹ،، ململ اور چمڑے کی برآمد شروع کی تھی۔ انہی لوگوں نے 1781ء میں یہاں ڈھاکہ میں پہلا آرتھوڈوکس چرچ بھی تعمیر کرایا تھا اور پھر رفتہ رفتہ یہاں ڈھاکہ میں بھی ان لوگوں نے کافی زمینیں خرید لی تھیں اور ان کا شمار بنگال کے بڑے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ بلکہ 1830ء سے قبل اس شہر میں ان کا اتنا عمل دخل تھا کہ ہر چھ بڑے زمینداروں میں سے پانچ کا تعلق آرمینیا سے ہی تھا۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور عیسائی بھی اور ڈھاکہ میں ابھی تک ایک محلّہ ان ہی کے نام سے اب بھی موجود ہے جسے ارمان ٹولہ کہا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے 50/60 سال میں انگریزوں کے بنگال میں صاحب اقتدار ہو جانے کی وجہ سے ان کی تجارت کم ہوتی چلی گئی تھی اور تقریباً یہ تمام ہی لوگ اب یہاں سے واپس اپنے ملکوں میں جا چکے تھے۔

یہاں سے ہم ایک دوسرے انگریزی اسکول پہنچے جس کا نام ڈاکٹر جیمس ٹیلر اسکول (Dr. James Taylor School) تھا۔ یہ ایک برطانوی سرجن نے یہاں 1835ء میں قائم کیا تھا اور پھر 6 سال بعد ہی یعنی 1841ء میں برطانوی حکومت نے اس کو کالج کا درجہ دے دیا تھا۔ جارج میک گرو نے ہمیں بتایا کہ اس کالج کے پہلے گریجوئیٹس میں مسلمان، ہندو، آرمینیا کے عیسائی اور مسلمان اور انگریز برطانوی بچے بھی شامل تھے۔

جارج میک گرو نے ہمیں بتایا کہ آرمینین، پرتگالیوں اور فرانسیسیوں نے ہندوستان سے تجارت شروع کی تھی تو برطانیہ کے بھی کچھ تاجروں نے ہندوستان اور مشرقی ایشیا سے بحری تجارت شروع کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لئے ان تاجروں نے ایک کمپنی بنائی جس کا نام British East India Company تھا۔ جس کی باقاعدہ اجازت تاج برطانیہ سے لی گئی

تھی اور اس کا سرمایہ بینک آف انگلینڈ میں رکھا گیا تھا اور وہی بینک اس کمپنی کو سود پر ادھار رقم بھی فراہم کرتا تھا۔ برطانیہ کے ہی ایک سفارتکار سر تھامس رو (Sir Thomas Roa) نے بھی باقاعدہ اجازت حاصل کر لی تھی۔

پھر 1866ء میں انگریز تاجروں نے بنگال میں اپنی فیکٹریاں اور مال گودام خانے بھی تعمیر کر لئے تھے۔ بالکل اسی طرح فرانسیسیوں نے بھی ڈھاکہ میں اپنا ایک بہت بڑا کمپنی کا دفتر قائم کیا تھا یہ فرانسیسی دفتر 1872ء تک قائم رہا بعد میں ڈھاکہ کے نواب خاندان نے جو کشمیری نسل کے لوگ تھے اور خواجہ کہلاتے تھے اس فرانسیسی کمپنی کی عمارت میں اپنی رہائش اختیار کر لی تھی اور انہی کے ایک نواب خواجہ حافظ اللہ نے اس عمارت میں کچھ ترمیم و تعمیر نو بھی کی تھی۔ اس کا نام 1830ء میں ''احسان منزل'' رکھا گیا تھا۔ 1843ء میں جب برطانوی حکومت نے نوابین بنگال کا عہدہ ختم کر دیا تو یہ فرانسیسی کمپنی کی عمارت جو اب ''احسان منزل'' کہلاتی تھی جسے اسی خواجہ خاندان نے اپنے استعمال میں رکھا ہوا تھا اور ابھی چند سال پہلے یعنی 1903ء میں انہی خواجگان نے اسے برطانوی حکومت سے 345,000 روپے میں خرید کر اپنی ذاتی جائیداد بنا لیا ہے۔ ہم نے یہ عمارت دیکھی جو بہت ہی خوبصورت اور تین منزلہ عمارت ہے۔

جارج میک گرو نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1881ء میں کلکتہ کے قریب اپنی ایک بڑی عمارت بنوائی تھی جس میں اپنا پہلا ڈائریکٹر ولیم ہیجز (William Hedges) کو مقرر کیا تھا جو کلکتہ میں رہتا تھا۔

جارج میک گرو نے بتایا کہ ڈھاکہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور یہاں قدم قدم پر ان کی مساجد بنی ہوئی ہیں۔ تین چار مذہبی عمارات ہم نے بھی دیکھیں۔ ایک تو یہاں کی ایک قدیم مسجد بھی ہے جسے مسجد بنیات بی بی کہا جاتا ہے جو 1454ء کی تعمیر شدہ ہے۔ ایک دوسری پرانی مسجد 1608ء کی بنی ہوئی ہے جسے موسیٰ خان کی مسجد کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک کربلا والے حسین کی یاد میں بنائی ہوئی بہت بڑی عمارت بھی ہے جسے حسینی دالان کہا جاتا ہے۔ یہ 1644ء میں مغل شہزادے شاہجہان نے بنوائی تھی اور اس میں محرم کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور مسجد ''سات گنبدوں والی'' کے نام سے بھی مشہور ہے اور اس کے علاوہ بھی بے شمار چھوٹی بڑی مساجد موجود ہیں۔

مساجد کے علاوہ یہاں ہندوؤں کے مندر بھی ہیں اور کہیں کہیں بدھوں کی عبادت گاہیں

(Buddhist Pigodas) بھی نظر آ جاتی ہیں۔ پھر ہم آرمینین عیسائی قدامت پسندوں کا چرچ (Armenian Orthodox Church) بھی دیکھنے گئے جو 1781ء میں آرمینیا کے تاجروں نے تعمیر کرایا تھا۔

اب جارج میک گرو نے ہمیں اس صوبے کی پرانی تاریخ بھی بتانی شروع کی۔ اس نے بتایا کہ ڈھاکہ کی تاریخ بنگال کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ شہر ساتویں صدی عیسوی سے آباد چلا آرہا ہے جب بنگال میں بودھ بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ ان کی ایک سلطنت کام پورہ سلطنت (Kamapora Dynasty) تھی اور اس کے بعد آنے والی سلطنت سینا سلطنت (Sena Dynasty) کہلاتی تھی۔ جب قطب الدین ایبک کے زمانے میں دہلی پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا تو پھر ان کا رخ بہار اور بنگال کی طرف بھی ہوا۔ چنانچہ پہلے یہاں ترک مسلمانوں کی اور پھر افغان مسلمانوں کی اور پھر مغلوں کی حکومتیں یکے بعد دیگرے قائم ہوتی اور ختم ہوتی رہیں۔

دہلی کے مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر جس نے 1556ء سے 1605 تک حکومت کی۔ اس کے زمانے میں یہاں بارہ بھائیاں حکومت قائم تھی جو مغلوں کو خراج دیتے تھے۔ لیکن 1605ء میں اکبر کے بیٹے شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے ایک سپہ سالار اسلام خان چشتی نے بارہ بھائیاں کے حکمران موسیٰ خان کو تخت سے اتار دیا اور یہ پورا علاقہ جس میں بہار، اڑیسہ اور بنگال شامل تھا بلا واسطہ دہلی کی مغل سلطنت کے ماتحت آ گیا۔

اسلام خان نے ڈھاکہ کا نام بھی جہانگیر پورہ رکھا تھا مگر یہ نام کچھ زیادہ مقبول نہ ہوسکا اور یہ شہر ڈھاکہ ہی کہلاتا رہا۔ پھر یہاں 1644ء میں مغل شہزادہ شاہ شجاع کو اس علاقے کا نواب بنا کر بھیجا گیا۔ لیکن جب اورنگزیب عالمگیر تخت نشین ہوا تو اس نے شاہ شجاع سے جنگ کے لئے فوج روانہ کی۔ پہلے تو شاہ شجاع اس فوج سے کئی مقامات پر لڑتا رہا مگر پھر شکست کھا کر مایوس ہوکر چٹاگانگ کے راستے اراکان اور پھر وہاں سے غالباً برما کر طرف روپوش ہوگیا تھا۔ تب اورنگزیب عالمگیر نے اپنے اسی سالار کو جو شاہ شجاع کو شکست دے چکا تھا یہاں کا گورنر بھی مقرر کر دیا۔ یہ سائیتہ خان تھا جو بنگال میں 1664ء سے 1688ء تک اورنگزیب کا گورنر رہا۔ پھر 1697ء میں اورنگزیب کا بیٹا اعظم شاہ بھی یہاں تعینات کیا گیا۔

1707ء میں جب اورنگزیب کا انتقال ہوا تو مرکزی مغل سلطنت کمزور ہونے لگی۔ تب اس علاقے کا مغل گورنر مرشد علی قلی خان تھا۔ اس نے بھی اپنے علاقے میں اپنی خودمختار حکومت قائم کر لی اور مرشد آباد کو اپنا مرکز بنالیا۔

علی قلی خان کے بعد اس کا بیٹا شجاع الدین خان 1739ء تک یہاں نواب رہا اور اس کے بعد سردار خان ایک سال کے لئے یہاں کا نواب رہا جس کے بعد علی وردی خان 1740ء سے 1756ء تک اور پھر اس کا بیٹا سراج الدولہ 1757ء سے 1772ء تک یہاں کا حکمران رہا۔ لیکن 1757ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لارڈ کلائیو نے جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو شکست دے دی اور اس کے بعد وہ بس نام کا نواب تھا کیونکہ اس کی ریاست اور خود مختاری دونوں ختم ہو چکی تھیں۔

سراج الدولہ ہی کے زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر لارڈ کلائیو کی سراج الدولہ سے دو جنگیں ہوئیں۔ ایک جنگ پلاسی 1757ء میں اور دوسری جنگ بکسر 1772ء میں اور ان دونوں میں سراج الدولہ کو شکستیں ہوئیں اور پھر جنگ بکسر کے بعد کمپنی میں اور بنگال سے متعلق مغلوں میں 1772ء میں اللہ آباد میں ایک معاہدہ ہوا جو معاہدہ الہ آباد کہلاتا ہے۔ جس کے بعد بنگال کے تینوں علاقوں یعنی اڑیسہ، بہار اور بنگال میں نواب کا تقرر صرف کمپنی کی اجازت سے ہی ہو سکتا تھا۔

اس معاہدے کی رُو سے بنگال کا ٹیکس جو چوتھ یعنی چوتھا حصہ کہلاتا تھا وہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے وصول کرنا شروع کر دیا تھا اور اسی 1772ء کی جنگ کے بعد برطانوی پارلیمینٹ نے پہلی بار کمپنی کے معاملات کی درستگی کے لئے ہندوستانی مقبوضات سے متعلق لگاتار دو بل بھی پاس کئے تھے جو Ragulating Act of India 1772 اور Pitt's India Act 1773 کہلاتے تھے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ برطانوی پارلیمان ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کو کنٹرول کرتی ہے اور اس کے ہندوستانی مقبوضات یعنی بنگال وغیرہ کے علاقوں پر بھی مکمل اختیارات رکھتی ہے۔

1793ء تک آتے آتے ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی ایک مضبوط سیاسی طاقت بن چکی تھی اور اب اس کی اصل کشمکش بنگال کی بجائے حیدر آبد دکن کے نواب حیدر علی اور اس کے بیٹے فتح علی ٹیپو سے تھی مگر 1799ء میں ٹیپو کی شہادت کے بعد یہ کانٹا بھی برطانوی اقتدار کے راستے سے نکل گیا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی جو پہلے پہل صرف ایک تجارتی کمپنی کے طور پر ہندوستان میں داخل ہوئی تھی اب اس ملک کی مضبوط ترین قوت بن چکی تھی۔

جارج میک گرو ہمیں ڈھاکہ کی فوجی چھاؤنی کی طرف بھی سیر کرانے لے گیا۔ یہ چھاؤنی 1835ء میں قائم کی گئی تھی اور بہت قاعدے اور طریقے سے بنائی گئی تھی۔ اس کی سڑکیں چوڑی اور دوطرفہ درختوں کی قطاریں تھیں اور سارے شہر کو ایک بڑے اور مکمل نقشے کے مطابق بسایا گیا تھا۔ اس چھاؤنی سے نہ صرف مشرقی بنگال بلکہ آسام اور ریاست تری پورہ اور اراکان اور برما کے علاقوں تک فوجی کمک پہنچائی جا سکتی تھی۔

وہاں۔ سے ہم لوگ پھر ڈھاکہ شہر کی طرف واپس آ گئے تھے یہاں کی میونسپلٹی 1864ء سے کام کر رہی ہے اور اب اس شہر کی میونسپل حدود کی آبادی 52,000 ہو چکی ہے اور اس میونسپل کمیٹی کی حدود یعنی شہر کا پھیلاؤ 30 مربع کلومیٹر ہو چکا ہے۔ 1880ء میں یہاں ایک انگریزی کالج ایڈن کالج (Eden College) کے نام سے بھی قائم کیا گیا ہے۔ 1885ء میں ڈھاکہ ہندوستان کی بڑی ملک گیر ریلوے لائین سے منسلک کر دیا گیا ہے اور ڈھاکہ ریلوے اسٹیشن ایک خوبصورت عمارت کے ساتھ وجود میں آ گیا ہے۔

ابھی چند سال پہلے برطانوی وائسرائے لارڈ کرزن نے ڈھاکہ کا دورہ بھی کیا تھا تو اس نے یہاں کے مسلمانوں کے بے حد اصرار پر بنگال کو مشرقی اور مغربی بنگال کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جہاں مسلمان اب اکثریت میں آ گئے تھے۔ انہی دنوں احسان منزل والے کشمیری خواجگان کی طرف سے ایک انجنیرنگ اسکول بھی قائم کیا گیا تھا جو Ehsanullah School of Engineering کہلاتا تھا۔

جارج میک گرو نے ہمیں بتایا کہ اب ڈھاکہ میں بھی ایک یونیورسٹی بنانے کی تیاری ہو رہی ہے جو اسی سال یعنی 1919ء میں قائم کر دی جائے گی اور اس کے وائس چانسلر کے لئے ایک مشہور برطانوی اسکالر اور ماہر تعلیم (Educationist) فلپ ہارتگ (Philip Hartug) کا نام زیر غور ہے۔ بنگال کی تقسیم صرف چھ سال ہی چل سکی اور نیشنل کانگریس جو ویسے تو ہندوؤں کی اور مسلمانوں کی نیشنل انڈیا سیاسی جماعت ہے اور خود کو مسلمان اور ہندو دونوں کی نمائندہ جماعت کہلانے پر بضد رہتی ہے، مگر اس ہی کے زبردست دباؤ کی بدولت تقسیم بنگال کو ختم کر دیا گیا ہے اور 1912ء میں وہی پرانا متحدہ صوبہ بنگال دوبارہ سے واپس وجود میں آ گیا ہے۔

صبح گیارہ بجے سے شام پانچ بجے تک ہم لوگ ڈھاکہ کے اطراف میں گھومتے رہے اور پھر شام کی چائے کے لئے کمروں میں جانے سے قبل اسی ریسٹ ہاؤس کے لان مین بیٹھ کر چائے پیتے رہے۔ یہاں ہمیں بنگال ہی کے شمالی علاقے سلہٹ کی پہاڑیوں پر سے آنے والی چائے پیش کی گئی۔ ہندوستان میں ابھی تک چائے کا کوئی خاص رواج نہیں ہے۔ یہ مشروب بہت ہی خاص مواقع یا بہت ہی خاص لوگوں کے لئے بنایا اور پیش کیا جاتا ہے۔

چائے کے دوران سلہٹ کے ذکر سے اس علاقے کے جنوب اور ڈھاکہ کے جنوب مشرق میں ایک پرانی ہندو ریاست تری پورہ کا بھی تذکرہ ہوا۔ یہ بھی برطانوی ہند کی ایک نیم خودمختار چھوٹی ریاست (Princely State) ہے۔ اس کا صدر مقام اگرتلہ نامی ایک شہر ہے اور یہ ڈھاکہ

سے کوئی 90 میل دوری پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ پہلے کافی بڑا تھا یعنی کوئی ساڑھے دس ہزار مربع میل اور اس کی آبادی بھی تین لاکھ کے لگ بھگ تھی۔

آج کل اس ریاست کا راجہ ورندرا کشور ہے اور یہ 1901ء سے اس ریاست کا حکمران چلا آرہا ہے۔ یہی بنگال بلکہ پورے مشرقی ہندوستان کی وہ پہلی ریاست ہے جس کے ایک سربراہ راجہ چندرا مانکیہ جو 1862ء سے 1896ء تک یہاں کا راجہ تھا اس نے اپنی حکومت میں برطانوی طرز پارلیمینٹ اور وزیراعظم اور کابینہ کے ادارے اور عہدے قائم کئے تھے مگر ابھی پارلیمان کے اراکین کسی عام انتخابات کے ذریعے نہیں بلکہ راجہ کی نامزدگی سے منتخب کئے جاتے ہیں۔

جارج میک گرو نے ریاست تری پورہ کی بہت دلچسپ تاریخ بتائی۔ یہ ریاست اپنے عروج و زوال اور سیاسی اتار چڑھاؤ کے باوجود تقریباً 500 سال سے قائم ہے۔ یعنی 1400ء سے بطور ریاست زندہ چلی آرہی ہے۔ اس ریاست کا پہلا مشہور سربراہ مہاراجہ چانکیہ تھا جس کے نام سے یہ ہندو ریاست آج تک اسی خاندان کی سلطنت کے طور پر چلی آرہی ہے۔ بعد کے بہت سے راجاؤں میں سے اس کے تین چار مشہور حکمرانوں میں دھرما چانکیہ 1714ء سے 1733ء تک اور وجے چانکیہ 1743ء سے 1760ء تک اور ایشان چندرا 1849ء سے 1860ء تک زیادہ مشہور ہوئے۔

مغل دور کے تمام مرکزی گورنروں اور اس کے بعد علی قلی خان کے سب جانشینوں نے اس ہندو راجہ کو داخلی طور پر خودمختار ہی رہنے دیا تھا کیونکہ یہ ایک بے ضرر اور پرامن ریاست تھی اور اس کے کبھی بھی ایسے خطرناک جارحانہ عزائم نہیں رہے جو بنگال کے کسی بھی حکمران کے لئے کسی جنگ کا باعث بنتے۔

نواب سراج الدولہ کی دونوں شکستوں یعنی جنگ پلاسی اور جنگ بکسر (Buxer) کے بعد جب پورا بنگال ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہء اقتدار میں آگیا تو یہ ریاست تری پورہ بھی ان کی ماتحتی میں آگئی لیکن برطانوی کمپنی حکومت نے اس کی داخلی خودمختاری جوں کی توں رکھی اور 1838ء تک یہی صورتحال رہی لیکن پھر یہاں کے ایک طبقے Kuki Group کی وجہ سے داخلی انتشار پیدا ہونے لگا۔ چوریاں، ڈاکے قتل وغارتگری اور پہاڑی لوگوں کی جتھہ بندی بڑھ گئی۔ جس کی وجہ سے ریاست کا نظم ونسق بگڑ گیا اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ ریاست کی تخت نشینی کے دعوے داروں میں بھی جھگڑے ہونے لگے اور یہ صورت 1812ء سے 1826ء تک مسلسل چلتی رہی۔

یوں تو 1809ء ہی سے یہ ریاست برطانوی تحفظ کی خودمختار ریاست (Soveriegn British Protectorat State) بن چکی تھی مگر برطانوی حکومت اس کے اندرونی خلفشار

میں یا اس کے تخت نشینی کے جھگڑوں میں مداخلت نہیں کرتی تھی لیکن ہر مرتبہ جو بھی راجہ یہاں ریاست کا سربراہ بنتا تھا اسے سخت شورشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ آخر 1904ء سے برطانوی حکومت نے یہاں ایک ''اعلان سند'' نامی کا قانون پاس کیا جس کے مطابق وہی شخص راجہ بن سکتا تھا جسے برطانوی سند حاصل ہوگئی ہو۔ یعنی اس طرح وائسرائے ہند اس کی تخت نشینی کی تائید بھی کرتا تھا اور اس کے تخت کے تحفظ کا بھی ذمے دار ہوتا تھا۔

1772ء کی جنگ بکسر کے بعد ہی اس تری پورہ ریاست کے رقبے میں رفتہ رفتہ کافی کمی ہوتی رہی اور اس کے نظم ونسق کی صورت برطانوی ہند کے ایک ضلع ہی کی طرح ہوگئی تھی۔ لیکن اس ریاست کا ایک بہت زرخیز حصہ جو روشن آباد کے نام سے ہے جو ہمیشہ ہی سے اور اب تک ریاست تری پورہ کے راجاؤں ہی کے پاس رہتا آیا ہے۔ یہاں جنگلات، پہاڑیاں، جانور اور خصوصاً ہرن، ریچھ اور چھوٹے چیتے وغیرہ بہت ہوتے ہیں اور یہ زرخیز علاقہ بھی ہے اور ریاست کے راجاؤں کی شکارگاہ بھی۔

اگرتلہ کی بھی ایک میونسپل کارپوریشن بنادی گئی ہے جو یہاں 1905ء سے کام کررہی ہے۔ جارج میک گرو نے بتایا کہ یہاں اس ریاست سے کچھ حصہ لے کر اب ایک نیا ضلع کومیلا بنایا جارہا ہے اور یہی کومیلا اب ہماری منزل بھی تھا۔

چائے پینے کے بعد بھی ہم لوگ کافی دیر تک ریسٹ ہاؤس کے اسی سبزہ زار میں بیٹھے رہے اور ہم نے اپنا کھانا بھی وہیں منگوالیا تھا۔ 9 بجے کے قریب جارج میک گرو ہم سے رخصت ہوگئے تھے پھر میں اور روسی دونوں اپنے کمروں کی طرف چلے گئے تھے۔

کمرے کا قفل کھول کر جیسے ہی میں اندر داخل ہوا تو یہاں ایک اور افراتفری میری منتظر تھی۔

بیسواں باب

رکاوٹیں ہی رکاوٹیں

کمرے کی ہر چیز بے ترتیب تھی۔ سب ہی اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ میزوں کی درازیں کھلی ہوئی تھیں اور بستر پر الٹا کر ڈال دی گئی تھیں کہ ان کے اندر کی ہر ہر شے بستر پر بکھری پڑی تھی۔ تکیوں کے غلاف تک کھول کر ان کے اندر کی بھی تلاشی لے لی گئی تھی۔ کتابوں کے شیلف میں جہاں چند رسالے اور تین چار کتابیں ہی تھیں ان کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا گیا تھا۔ بستر کی چادروں کو بھی اٹھا کر پلٹا گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرا اٹیچی کیس بھی فرش پر الٹا گیا تھا اور اسے خالی کر کے اچھی طرح سے چھان بین کی گئی تھی۔ اس میں تھا ہی کیا؟ میرے چند کپڑے، کاغذات، موئن جودڑو سے متعلق سروے کے کچھ نوٹس اور میری آج ہی کی خریدی ہوئی راج شاہی سلک کی قمیض کا کپڑا اور بس۔ کمرہ کیا تھا کسی شکست خوردہ فوج کا لٹا ہوا خیمہ بن چکا تھا۔

میں نے باہر نکل کر گارڈ کو بلایا۔ یہاں دو چوکیدار تعینات تھے۔ ایک تو باہر داخلہ گیٹ پر بیٹھتا تھا اور دوسرا ہمارے کمروں کی راہداری کے آخری سرے پر۔

میں نے دونوں سے الگ الگ باز پرس کی۔ جس کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ ان کے علم میں کسی کے کمرے میں آنے جانے کی کوئی اطلاع اور کوئی خبر نہ تھی۔ تعجب اس بات پر تھا کہ میرے سوٹ کیس یا میرے ہولڈ آل کی بظاہر ہر چیز موجود تھی۔ نہ تو کوئی کیش چرایا گیا تھا، نہ کوئی کپڑا غائب تھا اور نہ ہی کوئی کاغذ کا ایک ٹکڑا۔ مگر مجھے حیرت ہی تھی کہ یہ اگر کوئی چور تھا تو پیسے وغیرہ لئے بغیر کیسے چلا گیا؟ اور پھر یہ کہ کیا کوئی دیوار کود کر اندر آیا تھا اور گیٹ کے چوکیدار کو بھی اس کی آمد کی کوئی خبر نہ ہوئی اور جہاں تک راہداری والے گارڈ کا معاملہ تھا تو شاید وہ چند لمحوں کے لئے اِدھر اُدھر گیا ہوگا۔ بہر حال ایک گھنٹے سے زیادہ مجھے پھر اپنا کمرہ ٹھیک کرنے میں لگ گیا۔

کل صبح گیارہ بجے جان میک گرو کو پھر اپنی کلاسیں ختم کر کے ہمارے ہاں آنا تھا اور ہم لوگ

ڈھاکہ کے کچھ اور مقامات دیکھنے والے تھے۔ سو میں نے کمرے کے اس واقعے کو اپنے ذہن سے بالکل ہی جھٹک دیا اور سو گیا۔

صبح ناشتے پر روسی سے بھی حسب معمول ملاقات ہوئی مگر میں اس سے بس کل کے اور آج کے پروگرام ہی کے بارے میں بات کرتا رہا اور کچھ ایسا مشغول رہا کہ اس کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہوا۔

میک گرو بگھی لے کر آ چکا تھا۔ آج بادل بھی بہت تھے اور بارش کا بھی اندیشہ تھا مگر جارج نے کہا:

''یہاں بارشیں تو روز ہی کی بات ہے، اس سے یہاں کی زندگی اور یہاں کے کوئی کام بند نہیں ہوتے۔ بس ایک ایک چھاتہ (چھتری) ضرور ساتھ لے لیں اور چلیں''۔

مغل شہزادے شاہ شجاع کے رہنے کا ایک پرانا محل نما مکان یہاں موجود تھا۔ سو ہم اسے دیکھنے کے لئے نکل گئے۔ محل کیا تھا اجاڑ ویران گھر، جگہ جگہ خود رَو جھاڑیاں اور چھتوں پر بارش کی وجہ سے گھاس پھونس اگی ہوئی تھی۔ دیواروں کا رنگ بھی سیاہ ہو چکا تھا، دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔

گلہریاں اور چوہے ہماری آہٹ سن کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ صحن میں دو چار بڑے اور گھنے درخت کھڑے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی۔ یہ گھر جو کبھی شہزادے کے نوکروں، ملازموں اور چوبداروں کی نقل و حرکت سے اور آوازوں سے اور گھروں کے مکینوں سے زندہ و آباد ہوگا اور چہل پہل سے، انسانوں کے شور و غل سے اور ان کے چلنے پھرنے سے کسی شاہی محل کی طرح سے پر رونق رہتا ہوگا، اب بے کسی اور کسمپرسی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ خاموش اور ویران بلکہ عروج و زوال کا عبرت کدہ تھا۔ ہمارے علاوہ یہاں آس پاس کوئی اور نظر ہی نہ آتا تھا۔

باہر نکلے تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر پانی بہنے لگا تھا۔ میں ذرا موسم کا لطف لینے کے لئے کوچوان کے ساتھ آگے ہی بیٹھ گیا تھا۔ روسی اور میک گرو پیچھے بیٹھے تھے۔

پھر نہ جانے کیسے چلتے چلتے گھوڑے کے قدم بری طرح ڈگمگائے اور وہ کچھ اس طرح زمین پر گرا کہ پوری بگھی بائیں جانب الٹ گئی اور میں بھی گھوڑے کے نیچے گرا اور اس کی ٹانگوں کی زد میں آ گیا۔ جیسے جیسے وہ جانور زمین سے اٹھنے کی کوشش میں اپنی ٹانگیں اِدھر اُدھر مارتا تھا اور انہیں چلاتا تھا ویسے ویسے ہی اس کی پوری ضربیں میرے پیٹ اور جسم پر لگتی جاتی تھیں اور پھر مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔

مجھے ہوش آیا تو میں کسی ہسپتال میں کسی بستر پر پڑا ہوا تھا اور میری کھلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ایک نرس مجھ پر جھکی وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی:

''جان میلکم! کیا آپ مجھے سن سکتے ہیں''؟

مجھے یاد ہے کہ میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا: ''جی ہاں''۔

اور میں پھر بے ہوش ہو گیا۔

یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ میں پورے 48 گھنٹے بے ہوش رہا تھا اور میرے ہاتھ کی ہڈی اور دو پسلیاں ٹوٹ چکی تھیں اور میری ٹانگوں پر اور چہرے پر کئی زخم آئے تھے اور پٹیاں ہی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کسی برطانوی گورے کا کسی ایسے حادثے سے دوچار ہونا اور پھر اتنا شدید زخمی ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ڈاکٹرز اور نرسیں سب ہی مجھ پر بہت توجہ دے رہے تھے۔ ہسپتال کا سول سرجن انچارج بھی دن میں دو بار آکر میری طبعیت کا چارٹ دیکھتا تھا۔ روسی بھی میرے ہی پاس تھا جو مجھ سے مشکل ہی سے جدا ہوتا تھا۔ میرا پورا جسم دواؤں کے اثرات میں ہونے کے باوجود ہر جگہ سے دکھتا تھا۔ میں اس ہسپتال میں ایک ماہ تک پڑا رہا۔

ضلع کے پولیس انچارج نے روسی، جارج میک گرو اور بگھی کے کوچوان سب ہی کا الگ الگ بیان لیا تھا۔ تعجب انگیز بات یہ تھی کہ وہ سب ٹھیک ٹھاک رہے تھے اور معمولی خراشوں کے علاوہ کسی کو کوئی اور چوٹ تک نہیں لگی تھی۔ موقع واردات پر کوئی گواہ نہ تھا اور نہ ہی اس واقعے میں کسی سازش کی بو آتی تھی، سو پولیس کا یہی خیال تھا اور جو شاید درست بھی تھا کہ یہ سارا حادثہ صرف ایک گھوڑے کے گرنے کی وجہ سے تھا اور اتفاقی واقعہ ہی تھا اور اسی لئے پولیس نے کسی کے خلاف کوئی رپورٹ بھی درج نہیں کی تھی۔

جارج میک گرو بھی اس دوران میری مزاج پرسی کے لئے کئی بار ہسپتال آیا اور مجھ سے معذرت بھی کی اور شرمندگی کا اظہار بھی کیا کہ اچھا ہوتا کہ اس روز بارش کی وجہ سے ہم اپنا پورا پروگرام ہی ملتوی کر دیتے۔ نہ گھوڑا پھسلتا اور نہ گرتا۔

کوئی ایک ماہ کے بعد میں کافی حد تک چلنے پھرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ تو ہم لوگ پھر ریسٹ ہاؤس آ گئے۔ پھر مزید 10/12 دن کے بعد جب میں مکمل طور پر صحت یاب ہو کر اس قابل ہو گیا کہ اپنے آئندہ کے پروگرام یعنی کومیلا کے سفر سے متعلق کچھ سوچ سکوں اور ہم نے ایک ہفتے کے بعد کی اپنی ریلوے کے سفر کی بکنگ بھی کرالی۔

اب برسات تو کم ہو چکی تھی مگر دو تین دن بعد بادل ضرور برس جاتے تھے۔ بارشوں کے موسم کی وجہ سے ریسٹ ہاؤس میں کیڑے مکوڑے نکلتے ہی رہتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی چھپکلی بھی راہداری کی دیواروں پر نظر آ جاتی تھی اور ایک دو مرتبہ روسی نے کوئی چھوٹا موٹا سانپ بھی دیکھا تھا جو وہاں

کے لئے ایک عام سے بات تھی کیونکہ یہ مشہور تھا کہ یہاں کے سانپ زہریلے نہیں ہوتے تھے۔
آج شام جب کہ ہمارے کومیلا کے سفر میں ابھی تین دن باقی تھے جارج میک گرو مجھ سے رخصت ہونے کے لئے شام کو پانچ بجے ریسٹ ہاؤس آنے والا تھا۔ شام کو میں راہداری سے باہر نکلا اور میں نے چوکیدار سے کہا کہ:
''وہ لان میں تین کرسیاں اور ایک میز لگا دے۔ ہمارے ایک مہمان آنے والے ہیں''۔
معاً میری نظر اٹھی تو مجھے وہاں ایک پانچ چھ فٹ کا لمبا سبز رنگ کا سانپ لان میں رینگتا ہوا نظر آیا جو مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی وہ تیزی سے جھاڑیوں کی طرف بھاگ نکلا۔ میں نے چوکیدار سے کہا:
''تم نے وہ سانپ دیکھا! جھاڑیوں میں لاٹھیاں وغیرہ مار لینا تاکہ وہ وہاں سے بھاگ جائے''۔
موئن جودڑو کے قیام کے دنوں سے میرے پاس ایک پستول رہتا تھا۔ جب میں پونے پانچ بجے کے قریب جارج میک گرو کے آنے کے وقت لان کی طرف نکلا تو احتیاطاً وہ پستول اور اس میں چند گولیاں ڈال کر ساتھ ہی رکھ لیا تھا۔ میں لان کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ چوکیدار نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ:
''جارج کا ایک آدمی باہر آیا ہوا ہے اور وہ یہ بتانے کے لئے بھیجا گیا تھا کہ جارج کو آنے میں پندرہ منٹ کی تاخیر ہو جائے گی۔ کیا وہ اس تاخیر کے ساتھ میرے پاس آ سکتا ہے''؟
میں نے اس کو جواب بھجوا دیا کہ:
''ہاں! میں مصروف نہیں ہوں اور اس کا انتظار کروں گا''۔
میں نے سوچا کہ ان پندرہ منٹ باہر لان ہی میں چہل قدمی میں گزار لئے جائیں۔
میں نے ابھی لان کا ایک آدھ چکر ہی لگایا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہی ہرے رنگ کا سانپ میرے پیچھے 10/12 فٹ کے فاصلے پر میرے پیچھے آتا نظر آیا۔
میں نے پلٹ کر فوراً پستول نکال کر اس پر فائر کر دیا۔ وہ ایک ہی لمحے میں کہیں غائب ہو گیا اور گولی اوّل تو شاید اسے لگی ہی نہیں اور اگر لگی بھی تھی تو بس اسے چھو کر ہی گزر گئی تھی۔ مجھے نہ تو بندوق چلانے کا کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی میں نے نشانہ بازی میں کوئی پریکٹس کی تھی۔ سو گولی کو تو اسی طرح ضائع ہو جانا ہی تھا۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ میں نے ایک ہلکی سی لال لکیر ضرور دیکھ لی تھی جو اس سانپ کی

جگہ نظر آ رہی تھی۔ میں لان ہی میں وہیں کرسی پر بیٹھ گیا کیونکہ سانپ تو غائب ہو ہی چکا تھا۔

میں ابھی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے گیٹ کی طرف سے ایک نوجوان سا آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ اس نے ہرے رنگ کے عجیب سے لمبے کرتے نما کپڑے پہن رکھے ہیں اور وہ نوجوان نہیں بلکہ 30/40 سال کا ایک مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس کا رنگ بھی یہاں کے مقامی بنگالیوں کی طرح سیاہی مائل نہ تھا۔ یہ ہلکی سی سرخی لئے ہوئے تھا۔ کپڑوں کے علاوہ اس نے سر پر جو پگڑی نما ایک ٹوپی سی باندھ رکھی تھی وہ بھی کچھ مختلف طرح کی تھی۔ یہاں کے بنگالی ایسے کپڑے اور ایسی ٹوپی نہیں اوڑھتے تھے۔

وہ چلتا ہوا میرے قریب تک آ گیا۔ اس کے چلنے کا انداز بھی جارحانہ تھا۔ میں اس کے مرتبے کو جانچنے کی کوشش کرتے ہوئے ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ کرسی سے اٹھ کر اس سے ملوں یا بیٹھا ہی رہوں کہ وہ بالکل میرے روبرو آ گیا۔ نہ جانے کس جذبے سے یا شاید خود بخود ہی بغیر کسی ارادے کے میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اب ہم دونوں بالکل آمنے سامنے ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوئے تھے۔

''__ تو کیوں اپنی موت کو آواز دیئے جا رہا ہے؟ کیا بار بار کی تنبیہ تجھے کافی نہیں ہے؟ تو جہاں پہنچنے کے لئے آیا ہے وہاں سب کچھ سخت حصار میں ہے۔ ہزاروں سال سے وہاں پہرا ہے۔ کوئی زندہ آدمی آج تک وہاں کبھی بھی نہیں پہنچ سکا ہے__''۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ یہ سب کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے کہا:

''تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں کچھ سمجھا نہیں ہوں''۔

اس نے جواب میں کہا:

''جتنا مجھے بتانا تھا میں نے بتا دیا ہے۔ تو کیا تیری آئندہ تین نسلیں تک اس کی سزا بھگتیں گی۔ تو لال مائی کی پہاڑیوں تک بھی شاید کبھی بھی نہیں پہنچ سکے گا اور نہ ہی اس کو پا سکے گا جس کی تجھے تلاش ہے''۔

میں اس کو کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ مجھے ریسٹ ہاؤس کا بڑا گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور میں نے جارج میک گرو کی بگھی اندر آتے دیکھی جس پر سوار ہو کر پہلے ہم ڈھاکہ کی قدیم مساجد، چرچ اور اسکول وغیرہ دیکھے تھے۔ ایک ہی نظر اُدھر ڈال کر میں اب جو اس شخص کی طرف مڑا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا بس وہاں خون کے چند تازہ قطرے پڑے ہوئے تھے۔ جب وہ مجھ سے بات کر رہا تھا تو اس کے دائیں کندھے کے اوپر اس وقت بھی میں نے ایک سرخ لکیر دیکھی

تھی۔ شاید اس کا بازو تھوڑا زخمی تھا۔

بگھی کی آواز سن کر روسی بھی اپنے کمرے سے نکل کر ہماری ہی میز کی طرف آ رہا تھا۔

جارج میک گرو سے ملاقات اچھی رہی۔ ہم لوگ بہت دیر تک کومیلا کے سفر کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ کومیلا پہلے صرف ایک قصبہ تھا اور اس قصبے کا سارا علاقہ یعنی زمینی رقبہ پہلے ریاست تری پورہ کے علاقے میں تھا لیکن جب 1790ء کے بعد پورے بنگال پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو گیا تو تری پورہ ریاست کی داخلی خودمختاری تو جوں کی توں باقی رکھی گئی مگر اس کے کچھ علاقے اس ریاست سے الگ کر دیئے گئے تھے اور چند دیہات کی انہی تراش خراش کئے گئے دیہاتوں اور تحصیلوں کو ملا کر ابھی حال ہی میں یعنی 1891ء میں ایک نیا ضلع ''ضلع کومیلا'' بنا دیا گیا ہے۔ اس کی آبادی کوئی 4 لاکھ کے قریب ہے اور یہ ڈھاکہ چٹاگانگ کی شاہراہ پر واقع ہے جو یہاں (یعنی ڈھاکہ) سے کوئی 95 میل دور ہے۔ برہمن باڑیہ اور چاندپور کے جن علاقوں سے کچھ حصے لے کر اس ضلع کو تشکیل دیا گیا ہے وہ بھی چھوٹے چھوٹے قصبے ہی ہیں بلکہ خود کومیلا بھی رقبے کے لحاظ سے چھوٹا ہی ہے یعنی بس کوئی 3000 مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔

جارج میک گرو نے یہ بھی بتایا کہ یہ پورا ضلع درختوں اور جنگلات سے گھرا ہوا ہے اور یہاں پہاڑیاں بھی ہیں اور یہ پہاڑی سلسلہ جو تقریباً پوری ریاست تری پورہ ہی میں پھیلا ہوا ہے لال مائی کی پہاڑیاں کہلاتا ہے اور کومیلا کا ریلوے اسٹیشن بھی لال مائی کے اسٹیشن کے نام ہی سے مشہور ہے۔

جارج میک گرو کے جانے کے بعد میں نے روسی کو آج کے سارے واقعات بتائے، سبز رنگ والے سانپ کے متعلق بتایا اور پھر فائر کرنے کا بھی تذکرہ کیا اور وہ سبز رنگ کے کپڑوں والا آدمی جو مجھ سے آ کر ملا تھا اس کی بھی بات کی اور خون کے وہ دھبے بھی دکھائے جو مجھ سے بات کرتے وقت اس کے بازو سے گرے تھے۔ روسی نے مجھ سے پوچھا کہ اس آدمی سے میری کیا بات ہوئی تھی تو میں نے اس کو اس کی دھمکی سے بھی آگاہ کر دیا اور ڈھاکہ کے بازار میں جو یکایک کہیں سے نکل کر مجھ سے ٹکرا گیا تھا اور جو اس نے تنبیہ کی تھی وہ بھی روسی کو سنا دی۔

وہ سب کچھ بہت غور سے سنتا رہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھا:

''جان وہ تمہارا ملکہ یوران والا رومال اور مردوقش والی ہڈی تم اپنے ساتھ رکھتے ہو یا نہیں''؟

اس کے اس سوال نے مجھے ایکدم کئی سال پیچھے لوٹا دیا۔ 17 سال کی عمر میں میرا آکسفورڈ میں تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر جان مارشل کے ساتھ مصر آنا، پھر وہاں کا 6 سال کا قیام اور سرحان میں روحوں سے معرکے اور 1908ء تک عراق میں قیام اور مختلف مقامات کی کھدائیوں میں لیونارڈ

وولی کا ساتھ، جولی سے شادی اور اسی سال 1908ء میں میرے بیٹے ولسن کی پیدائش اور پھر ہندوستان آمد، بمبئی سے دہلی اور پھر وہاں سے مُردوں کے کھنڈر میں رہائش اور پھر دہلی سے ڈھاکہ، یہ سب کچھ آناً فاناً ہی میری نظروں کے سامنے سے گھوم گیا۔

جہاں تک اس ہڈی کا معاملہ تھا وہ تو ہمیشہ ہی میرے بازو پر بندھی ہی رہتی تھی مگر وہ یوران کا رومال؟ اس کی تو سرحان کی معرکوں کے بعد شاید کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہڈی پر بھی آخری منظر میں نے تب ہی دیکھا تھا جب وہ پانی پر چلتا ہوا آدمی جے بوکارا مجھ تک آیا تھا۔ سو پچھلے 9/10 سال سے تو ملکہ یوران کا دیا ہوا رومال میری یادداشت سے ہی گم ہو چکا تھا۔ اب جو روسی نے اس کا تذکرہ کیا تو میں نے ذہن پر زور دے کر یاد کیا کہ دہلی سے ڈھاکہ آتے وقت تک تو وہ میرے سوٹ کیس میں ضرور تھا پھر اس کے بعد مجھے اس کے بارے میں کچھ یاد نہ تھا۔

"نہیں! وہ رومال تو خود میں نے بھی بہت عرصے سے نہیں دیکھا ہے"۔

پھر مجھے یاد آیا کہ ڈھاکہ میں گھوڑا بگھی کے حادثے میں زخمی ہونے سے پہلے میرے کمرے میں جو میرا سامان الٹا پلٹا دیا گیا تھا تو اس کو بھی جب میں سمیٹ کر دوبارہ اپنے اٹیچی کیس میں رکھ رہا تھا تب بھی اس سامان میں مجھے وہ رومال نظر نہیں آیا تھا۔ ہاں! البتہ ایک چھوٹی سی شلنگ کے برابر ہڈی ضرور میرے بازو پر ہی بندھی رہتی تھی اور ہر وقت رہتی تھی اور اب بھی بندھی ہوئی تھی۔ مگر اس ہڈی پر بھی جے بوکارا سے ملاقات کے بعد میں نے پچھلے کئی سال سے کوئی پیغام وصول نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی منظر مجھے دکھلایا گیا تھا۔

روسی نے بڑے دکھ سے مجھ سے پوچھا:

"جان! اتنا کچھ ہو گیا اور آپ نے مجھے کچھ بھی بتایا تک نہیں؟ اچھا چلو اپنے کمرے میں وہاں ہم مل کر اس رومال کو دوبارہ ڈھونڈتے ہیں"۔

اپنے بکس کی تمام اشیاء کو میں نے بستر پر الٹ دیا۔ سب کو دوبارہ دیکھا۔ بستر کی چادریں، تکیے کے غلاف، الماریوں کی ایک ایک کتاب، غرضیکہ ہر ہر چیز چھان ماری، سب کچھ موجود تھا مگر وہ رومال غائب تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرے کمرے کی تلاشی اسی رومال کو اڑانے کے لئے لی گئی ہوگی۔

روسی نے صرف اتنا کہا:

"جان! جنگ شروع ہو چکی ہے بلکہ تمہارے ڈھاکہ پہنچتے ہی اس میں تیزی بھی آتی جا رہی ہے۔ بگھی سے گرنا بھی کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ یہ ایک طرح کا قاتلانہ حملہ بھی تھا"۔

اسی رات کو کمرے کے اندر پروں کے پھڑپھڑانے سے میری آنکھ کھلی۔ صبح کے تین بج

رہے تھے۔ سارے کمرے میں سفید پر ہی پر نظر آرہے تھے مگر اندھیرے میں کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مجھے ایسا لگا جیسے ایک بڑے سفید پرندے کے ساتھ کسی مسلح دستے کی طرح کچھ چھوٹے چھوٹے سفید پرندے بھی ہوا میں چکر لگا رہے ہوں۔

میرے کمرے کے دروازے بدستور بند تھے اور مچھروں سے بچاؤ کے لئے جو جالی دار دو کھڑکیاں کمرے میں لگی ہوئی تھیں وہ بھی کھلی ہوئی تو تھیں مگر ان کی جالی کے دروازے بھی بدستور بند تھے۔ ہر شے اُسی طرح تھی جیسے میں نے سونے سے قبل چھوڑی تھی۔ یہ سفید سفید روئی کے گالے جیسے پھڑ پھڑاتے پروں والی چیزیں آن کی آن میں کمرے سے نکل گئیں۔ دروازے اور کھڑکیاں بدستور ایسے ہی بند تھیں جیسے پہلے تھیں اور اب پھر ہر طرف خاموشی چھائی گئی تھی۔ میں نے اپنے بستر کے قریب رکھی ہوئی لالٹین کی بتی ذرا اونچی کی۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی مگر اب وہاں کچھ بھی نہ تھا اور میں ان سفید سفید روئی کے گالے جیسے پروں کو اور ان کی آوازوں کو اپنا ایک خواب سمجھ کر سو گیا۔

ہمارا سامان ریل گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔ روسی اور میرے علاوہ ڈبے میں اور کوئی مسافر نہیں تھا۔ شاید کومیلا کی طرف جانے والے مسافر زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ پلیٹ فارم پر بھی رش کم تھا۔ ٹکٹ چیکر نے رسمی استقبالیہ جملوں کے بعد ہم سے کہا:

"سر یہاں سے تھوڑا ہی آگے جاتے ہوئے ساگوان اور برگد جیسے گھنے درختوں کے جنگلات شروع ہو جائیں گے اور وہاں درندوں اور جنگلی جانوروں کی بہتات ہے۔ آپ دروازے بند رکھیں اور کھڑکیوں کے شیشے بھی اچھی طرح چیک کر لیجئے گا کہ وہ بند ہیں۔ اگر گاڑی اسٹیشن کے علاوہ کہیں بھی اتفاقاً رک بھی جائے تو بھی آپ نیچے مت اتریئے گا"۔

ازراہِ میزبانی وہ کومیلا سے متعلق ایک دو صفحات کا ایک سیاحتی اطلاع نامہ (Tourism Brochure) بھی ہمارے پاس چھوڑ گیا۔

ریلوے کے نظام الاوقات (ٹائم ٹیبل) کے مطابق ہمارا سفر صرف ڈھائی گھنٹے کا تھا۔ روسی تو جلد ہی اپنی برتھ (سیٹ) پر لیٹ کر اونگھنے لگا اور میں ذرا اپنی پچھلی زندگی کی بارے میں سوچنے لگا۔

ابھی تین چار ماہ قبل ہی جان مارشل نے مجھے کومیلا میں میری تعیناتی کا آرڈر دکھایا تھا تو مجھ سے کہا تھا کہ:

"تمہاری یہ تعیناتی تین سال کے لئے ہو رہی ہے اور اس کے بعد اگر میں کچھ دن کی

چھٹی لے کر برطانیہ واپس جانا چاہوں گا تو وہ میری اس چھٹی کی درخواست کو منظور کروانے کی کوشش کریں گے''۔

اور جب میں نے ان سے پوچھا کہ:

''ان کو آخر میری چھٹی کا اور برطانیہ جانے کا خیال کیسے آ گیا''؟

ان کا جواب تھا کہ:

''یورپ کی اس پچھلی عظیم جنگ میں لاکھوں مائیں اپنے بچوں سے محروم ہو چکی ہیں اور جو بیٹے خوش قسمتی سے بچ گئے ان کی مائیں انہیں اپنے سے دور رکھنا نہیں چاہتیں۔ سو جن کو یسوع مسیح نے بچا لیا ہے ان کو اپنے پیاروں سے ضرور ملتے رہنا چاہئے''۔

جان مارشل کی ان باتوں سے مجھے بھی اپنا سارا گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا تھا۔ اب تو میرے والد نے لندن میں ہارلے اسٹریٹ پر ایک اچھا سا مکان لے کر وہاں رہنا شروع کر دیا تھا، جسے میں نے ابھی تک دیکھا بھی نہیں تھا لیکن میری نظروں میں تو اب بھی اپنا وہی برمنگھم کے پاس بائرن والے زرعی فارم کا اپنا کاٹیج ہی گھومتا تھا جس کے پاس ایک ندی بھی بہتی تھی اور اس فارم میں ہماری بطخیں، مرغیاں اور کتے آزادانہ گھومتے پھرتے تھے۔

پھر مجھے اپنے اسکول کا اُس برابر والی کاؤنٹی سے کرکٹ کا میچ یاد آیا جس کے بعد میں اور روسی بارش میں بھیگتے ہوئے اس سیاہ فام ساحرہ جامش کے پاس پہنچے تھے۔ میں اس وقت 14 سال کا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ 14 مارچ 1897ء کا اتوار کا دن تھا۔ پھر وہ ہڈی اور رومال جسے میں نے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا جو مردوقش کا سفید عقاب دوبارہ میرے پاس ڈال گیا تھا۔ وہی مردوقش جو فرعون کا درباری جادوگر تھا۔ جسے فرعون کی بہن اور سیناشرب کی ملکہ یوران نے اپنی بیٹی شہزادی ''مینامتی'' کی بازیابی کے لئے بلوایا تھا۔ جسے شہزادہ ذخت رز نے انتقاماً اغوا کر لیا تھا۔ وہ سب واقعات میرے سامنے آ آ کر گزرتے گئے۔

مجھے ایکدم اپنے ماں باپ بہت یاد آنے لگے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ جب سینئر کیمبرج میں مجھے سونے کا تمغہ ملا تھا تو میرے والدین کتنا خوش ہوئے تھے۔ پھر آکسفورڈ میں داخلہ اور تاریخ کی گریجویشن چھوڑ کر 1900ء میں سترہ سال کی عمر میں جان مارشل کے ساتھ مصر آنا، پھر چار سال مصر میں قیام اور پھر 1904ء سے 1908ء تک عراق میں قیام اور لیونارڈ وولی کے ساتھ مختلف قدیم بستیوں کی کھدائیوں میں شرکت اور ان علاقوں سے نکالی ہوئی باقیات پر جان مارشل کے ہمراہ تحقیق و ترتیب کا کام کرنا پھر عراق میں 7 ستمبر 1907ء میں جولی سے شادی اور 1908ء میں ہمارے

بیٹے ولسن میلکم کی پیدائش، سب یکے بعد دیگرے سامنے آتے گئے اور پھر ہندوستان میں مُردوں کی کھنڈر میں قیام کے بعد جنگ کے دوران ہر قسم کی تاخیر کے بعد میرا کومیلا کی طرف روانہ ہونا۔

اب میں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا میں اسسٹنٹ ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوں اور مجھے کومیلا میں آثار قدیمہ کی کھدائیوں کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔

میں بائرن کے قصبے سے نکلا تھا تو سترہ سال کا تھا اور اب 1919ء میں 36 سال کا ہو چکا ہوں اور اگر دو تین سال کے بعد واپس اپنے ماں باپ کے پاس لوٹوں گا تو ایک سمجھدار، مشہور اور باعزت عہدے و سرکاری منصب پر فائز اور اپنے 1908ء میں پیدا ہونے والے نوجوان بیٹے کے ساتھ اپنے ماں باپ سے ملوں گا۔ میں سوچ سوچ کر ذرا جذباتی ہونے لگا تھا اور میری آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں۔

میں نے بس ذرا یونہی وقت گزاری کے لئے وہ پمفلٹ اٹھالیا جس میں کومیلا کے بارے میں معلومات درج تھیں۔

کومیلا برٹش آرمی کی چھاؤنی ہے۔ یہاں برطانوی فوج کا ایک بریگیڈ تعینات ہے اور یہاں کا انچارج آفیسر بریگیڈیئر جنرل کہلاتا ہے۔

اس ضلع کے قریب ہی چاند پور اور برہمن باڑیہ کے قصبے ہیں۔ دریائے میگھنا اور گومتی اس کے برابر سے بہتے ہیں اور یہاں کی پہاڑیاں، دریا اور زمین سب ہی گھنے گھنے جنگلات سے بھرے پڑے ہیں۔ جہاں ساگوان، چیڑ اور بہت سے انواع و اقسام کے گھنے درختوں کے جنگلات ہیں۔ یہاں شکار بھی وافر مقدار میں دستیاب ہے۔ درندے اور خصوصاً چیتے بھی بہت ہیں اور سانپ وغیرہ بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

یہاں کومیلا چھاؤنی کے قریب ہی بدھ مذہب کے وہ کھنڈرات بھی ہیں جن کی تفتیش، سروے اور کھدائیوں کے لئے میری یہاں تعیناتی کی گئی ہے۔ آج کل جولی کے والد کی پوسٹنگ بھی کومیلا ہی میں ہو چکی ہے۔

اس علاقے میں آثار قدیمہ کی پہلی دریافت بالکل ہی اتفاقاً ہو گئی تھی۔ 1803ء میں یہاں ایک کسان کو اپنی زمین میں ہل چلاتے ہوئے زمین سے دو فٹ نیچے ہی تانبے کی ایک پلیٹ (Copper Plate) ملی تھی اور جب یہ غریب بے پڑھا لکھا آدمی اسے بیچنے کے لئے بازار گیا تو وہاں باقیات آثار قدیمہ کا ایک شوقیہ تاریخ دان بھی موجود تھا۔ اسے اس تختی پر کسی غیر معمولی زبان کی کچھ الفاظ کندہ کئے ہوئے نظر آئے اور اس نے معمولی سی قیمت دے کر اسے خرید لیا۔ پھر جب

اس نے اس تختی کو وزارت کلچر دہلی کو بھیجا تو انہوں نے اسے محکمہ آثار قدیمہ (آرکیالوجیکل سروے) والوں کو بھیج دیا۔ جہاں سے یہ رپورٹ آئی کہ اس تختی پر قدیم ہندوستانی زبان ''پالی'' میں بدھ مذہب کی کچھ دعائیں تحریر ہیں اور یہ تختی 1000 سال پرانی ہے۔

پھر اس علاقے پر قدیم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی نظریں بھی پڑنے لگیں۔ 1896ء میں یہاں ایک تاریخ کے عالم فرانسس بوشانا (Francis Buchanna) نے بھی اس جگہ کا دورہ کیا اور اس جگہ کے کھنڈرات پر مضامین لکھے۔ پھر ابھی دو سال پہلے ہی یعنی 1917ء میں ایک اور بنگالی پروفیسر این۔ کے بھٹا سالی (N.K. Bhutta Sali) نے اس علاقے کا تفتیشی دورہ کیا اور یہاں کے قرب و جوار میں بکھرے ہوئے 60 سے زیادہ قدیم کھنڈر مقامات کا ابتدائی تعارف ایک کتابچے کے ذریعے کرایا اور پھر ان معلومات کو اپنے خطوط کے ساتھ منسلک کر کے دہلی میں محکمہ آثار قدیمہ کو زیادہ سنجیدگی سے لینے اور یہاں پر کھدائیاں کرانے کا مشورہ دیا۔

ابھی دہلی کی مرکزی حکومت نے کوئی فیصلہ نہ کیا تھا مگر مقامی صوبائی حکومت نے یہاں کا ابتدائی سروے کرا کے کچھ ابتدائی طور پر ذرا فاصلے پر ایک ریسٹ ہاؤس اور ایک بڑا ہال اور چند کمرے تعمیر کرا دیئے تھے تا کہ یہاں تک آ کر لوگوں کو قیام کی دقت نہ ہوا کرے۔

اسی دوران میں ڈھاکہ کے ایک کالج کے تاریخ کے ایک استاد نے اس علاقے کی پرانی شاہی تواریخ کو بھی کھنگال ڈالا اور ایک چھوٹا سا معلوماتی مضمون بھی شائع کیا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس علاقے کی موجودہ ریاست تری پورہ ہی کے تسلسل کی یہاں پر 3 قدیم سلطنتیں بھی حکومت کرتی رہی ہیں جو یہ تھیں:

1۔ گپتا خدگاس سلطنت (Gupta Khadgas Dynasty)۔

2۔ دیوا چندرا سلطنت (Deva Chundra Dynasty)۔

3۔ آنندا وہارا سلطنت (Ananda Vehara Dynasty)۔

ویسے تو سلطنتیں چھٹی صدی عیسوی سے ایک ہزار صدی عیسوی تک لگا تار اور یکے بعد دیگرے قائم ہو کر بنتی اور بگڑتی رہیں مگر زیادہ وسیع کبھی نہیں ہو سکی تھیں۔ مگر ان سلطنتوں کے تمام راجے مہاراجے ہمیشہ خود مختار اور آزاد ہی رہے اور ان کے اپنے سکے بھی ان کی ریاستوں میں چلتے رہے۔

اس کھنڈر بستی کا نام ''مینامتی'' تھا اور اسی پمفلٹ میں اس نام سے متعلق یہاں کی ایک لوک کہانی بھی دی گئی تھی کہ اس چندرا سلطنت کی کسی شہزادی نے ایک مرتبہ ایک خواب دیکھا کہ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئی ہے جہاں بہت سے اہرام بنے ہوئے ہیں اور یہ مصر کا علاقہ ہے۔ انہی اہراموں

کے پاس سے ایک آدمی پرانے وقتوں کا لباس پہنے گلے میں بہت سی مالائیں ڈالے اس کے پاس آتا ہے اور اس شہزادی کو کہتا ہے کہ:

''____ تو جب اپنے ملک کی ملکہ بن جائے گی تو اپنی بیٹی کا نام ''مینامتی'' رکھنا____''۔

اس ملکہ نے اپنی بیٹی کا نام خواب میں آنے والے آدمی کی ہدایت پر ''مینامتی'' رکھ دیا اور جب یہ ''مینامتی'' بڑی ہوئی تو اس کی شادی بھی وہاں کے راجہ سے ہوئی۔ لیکن یہ راجہ جلد ہی کسی مہلک بیماری کا شکار ہو کر مر گیا۔ تب اس کا چھوٹا بیٹا یہاں کا راجہ بنا۔ اس کا نام گوندا چندرا تھا۔ جب یہ بڑا ہوا تو اتفاقاً اس کو باتوں باتوں میں اپنی ماں سے معلوم ہوا کہ اس کی ماں کا نام ''مینامتی'' کیوں رکھا گیا تھا؟ تو اس نے اپنی اس بستی کا جس میں وہ رہتا تھا اس کا نام بھی ''مینامتی'' رکھ دیا اور یہ بستی جب تک آباد رہی یعنی کوئی 1000 عیسوی تک تو ''مینامتی'' ہی کے نام سے مشہور رہی اور جب یہ برباد ہو کر ویران کھنڈر ہو گئی تو بھی اس کھنڈر کو ''مینامتی'' ہی کے نام سے پکارا جاتا رہا۔

یہاں کی جو اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں ان کا نام لال مائی کی پہاڑیاں تھا۔ اس نام کی وجہ تسمیہ (یعنی نام پڑنے کی وجہ) سے متعلق بھی بڑے بوڑھوں میں ایک کہانی گھومتی تھی۔ اس کہانی کا لب لباب یہ تھا کہ بہت پہلے ان پہاڑیوں پر سرخی مائل خوبصورت چہرے والی ایک شہزادی کسی کے انتظار میں بیٹھا کرتی تھی اور وہ جہاں جہاں سے بھی گزرتی تھی یا جن پتھروں پر وہ بیٹھتی تھی ان کا رنگ لال ہو جاتا تھا۔ اس لئے یہ پورا پہاڑی سلسلہ لال مائی کی پہاڑیوں کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔

اس علاقے کی مُردہ بستیوں کا جن جن لوگوں نے دورہ کیا تو انہوں نے یہ نشاندہی بھی کی تھی کہ یہاں قرب و جوار میں آثار قدیمہ کی کھدائیوں کے لئے کم و بیش پچاس ایسے ٹیلے اور گمشدہ تہذیبوں کے مقامات موجود ہیں جن سے 1000 سال کی قدامت کی اشیاء برآمد ہو سکتی ہیں۔ ان میں خصوصاً 18 بڑی بستیاں جن کے ٹیلے بھی زیادہ لمبے اور پھیلے ہوئے ہیں خاص طور پر شلمان وی ہارا (Shalman Vehara) اور کوٹیلا موبا (Kotilla Moba) کے دو ایسے مقامات ہیں جن کے متعلق پرانی بدھی کتابوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں بدھ دھرم کی دو بڑی درسگاہیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ راجہ بھاوا دیوا (Bhava Deva) کی تعمیر کرائی ہوئی ایک بڑی بدھی عبادت گاہ اور درسگاہ بھی یہیں کہیں ہونی چاہئے کہ جس کے لئے ان قدیم کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ ان درس گاہوں اور عبادت خانوں کے لئے جو لال پتھر استعمال کیا گیا تھا وہ لال مائی کی پہاڑیوں سے لایا گیا تھا اور جیسا کہ میں نے پہلے نوٹس میں لکھا ہے کہ یہاں بھی وہی لوک کہانی مشہور تھی کہ یہاں صدیوں پہلے کسی سرخ چہرے والی لڑکی یا کسی نوجوان شہزادی کو قید کر کے لایا گیا

تھا اور جہاں جہاں وہ ان پہاڑیوں پر کبھی کبھی اپنے محافظوں کے ساتھ لا لا کر بٹھائی جاتی تھی تو ان پتھروں کا رنگ بھی سرخ ہو جاتا تھا اور ان میں لال لکیریں پڑ جاتی تھیں اور ایسے پتھر اب بھی کہیں کہیں ان پہاڑیوں سے مل جاتے ہیں۔

لال مائی ریلوے اسٹیشن سے اتر کر میں اور روسی دونوں اس مکان کی طرف چل دیئے جو ہمارے عملے نے کومیلا چھاؤنی کے پاس ہماری رہائش کے لئے لیا تھا اور قریب کا دوسرا مکان آفس کے طور پر پہلے ہی سے استعمال ہو رہا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر احساس ہوا کہ میرے سامنے جو رکاوٹیں قدم قدم پر لائی جا رہی تھیں ان کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا بلکہ اور بڑھ گیا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ اس گھر میں جلد ہی جولی اور ولسن کو بھی ڈھاکہ سے بلالوں گا کیونکہ جولی کے والد انگریو پٹمین کا تبادلہ بھی یہیں ہو چکا تھا اور وہ کومیلا چھاؤنی میں بطور انچارج (Incharge Brigadier General) یہاں تعینات تھے۔ روسی کو آفس کے ساتھ ہی رہائش کی جگہ مل گئی تھی۔

اس مکان میں ہمارا تیسرا دن تھا۔ میں دفتر سے گھر واپس آیا ہی تھا کہ کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ملازم نے باہر جا کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ ذرا دیر بعد پھر دروازے پر دستک ہوئی اور نوکر پھر باہر گیا مگر پھر اس نے آ کر کہا کہ:

''باہر کوئی بھی نظر نہیں آتا ہے''۔

اب جو تیسری مرتبہ کسی نے دروازے پر کھٹ کھٹ کی تو روسی جو میرے ساتھ ہی دفتر سے واپس آیا تھا باہر نکلا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا ہڈیوں کا ایک پنجر جس کے جسم پر گوشت اور پٹھوں کا کوئی نشان تک نہ تھا ایکدم اندر گھس آیا اور ہچکولے کھاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ وہ چل نہیں رہا تھا بلکہ لگتا تھا کہ ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ہوا میں تیرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

میرے قریب پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے گلے پر رکھنے کی کوشش کی اور میں جو ذرا جھک کر ایک طرف مڑا تو میری گردن تو بچ گئی مگر میرے دائیں کندھے کو اس نے پکڑ لیا۔

کندھے پر اس کی گرفت کیا آئی کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے سخت دھاری دار ٹھنڈی سی چھری میری کندھے میں گھونپ دی ہو۔ کندھے سے اس کی انگلیاں میرے دائیں بازو پر گئیں جسے اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے میں کہیں بھاگ بھی نہ سکوں۔ مگر اس کا ہڈیوں والا ہاتھ جیسے ہی میرے بازو پر بندھی اس چھوٹی سی ہڈی سے ٹکرایا جو میں ہمیشہ باندھے رکھتا تھا۔ اسے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا اور وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے سنا وہ بڑبڑا رہا تھا:

''مجھے تو کہا گیا تھا کہ تیرے پاس سے سب کچھ چھین لیا گیا ہے ــــ''۔

اور ہوا کے ایک جھونکے کی طرح چلتا ہوا نہیں بلکہ لہراتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں اور روسی دونوں باہر کی طرف لپکے مگر اب دروازے کے باہر کچھ بھی نہ تھا۔

روسی اور میں اب یہی مشورہ کر رہے تھے کہ جن حالات سے میں یہاں پر گزر رہا ہوں کیا ان کی موجودگی میں مجھے جولی اور اپنے بیٹے ولسن کو یہاں بلانا چاہیے؟ یا اس گھر میں رکھنے کی بجائے کچھ عرصے کے لئے انہیں چھاؤنی میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رکھا جائے۔ روسی نے مجھے ہمت دلائی اور کہا کہ:

''ان ساری آفات اور رکاوٹوں کا شکار اور مرکز میں ہی ہوں اور کوئی نہیں ہے۔ اس لئے ان کو بلا کر گھر میں رکھنے میں تو بظاہر کوئی خطرہ نظر نہیں آتا ہے''۔

لیکن روسی نے مجھے یہ ضرور یاد دلا دیا کہ میں اس لال مائی کے اسٹیشن تک یا ''مینا متی'' کے کھنڈرات تک خود نہیں آیا ہوں بلکہ پہنچایا گیا ہوں۔

اکیسواں باب

ہمارا گھر

ستمبر 1907ء کو شادی ہونے کے بعد مجھے اور جولی کو کبھی اپنا گھر بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جب میں بمبئی سے دہلی پہنچا تو ہم ایک عارضی سرکاری رہائش گاہ میں رہتے تھے۔ ''موئن جودڑو'' (مُردوں کا کھنڈر) میں جب تک میں وہاں ابتدائی کام کرتا رہا وہاں بھی جولی اور ولسن کو رکھنا مناسب نہ تھا۔ وہاں جولی اور ولسن دونوں دہلی میں رہے۔ جنگ کے دوران پھر جب میں اس کھنڈر کا کام چھوڑ کر دہلی آ گیا تھا تو بھی حالات غیر یقینی ہی تھے کہ نجانے جنگ کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ سو ہم لوگ کوئی لمبی پلاننگ نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اب چونکہ یہ تعیناتی تین سال کے لئے ہوئی تھی تو میں یہاں کم از کم اس مدت کے لئے تو اپنا گھر بنا ہی سکتا تھا۔ چنانچہ چند دن کے بعد ہی جولی اور ولسن دونوں میرے پاس کومیلا پہنچ گئے۔

جولی اور ہمارے بیٹے ولسن میلکم کے ساتھ یہ ہمارے بہت اچھے دن تھے۔ جولی نے گھر کو برطانوی طرز کا ایک خوبصورت سا گھر بنا دیا تھا۔ گو ہمارے علاقے کی طرح یہاں برف تو نہیں پڑتی تھی مگر بارشوں کی اس قدر بہتات تھی کہ یہاں بھی گھروں کی چھتیں ہموار ہونے کی بجائے عموماً 90 درجے کے زاویے کی مخروطی اور اہرامی ہی ہوتی تھیں۔ جولی نے گھر کے اندر اور باہر ایسے رنگ برنگے پھول اور پودے لگا دیئے تھے کہ ہمارے گھر کے ہر کمرے سے ہمیں یہی تاثر ملتا تھا کہ ہم ایک شاداب اور رنگ برنگے پھولوں سے سجے ہوئے پارک میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ گھر کا فرنیچر بھی ساگوان کی مضبوط لکڑیوں کا بنا ہوا تھا اور وکٹورین ڈیزائن کا تھا۔

اس طرح کھانے کی میز، دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے، نشست کا کمرہ یا ڈرائنگ روم بھی بہت نفیس اور قیمتی میز کرسیوں اور ہم رنگ قالینوں سے سجا ہوا تھا اور بنگال کے ہنر مندوں کی ثقافتی دستکاریوں کے نمونے جیسے کشتیاں، ناریل کے خول سے بنی ہوئی بہت سی ڈیزائن کی کشتیاں اس

نشست گاہ کے کمرے کی ہر چیز ہی اور یہ سب کچھ جولی ہی کے اعلیٰ ذوق اور اس کے انتخاب کی وجہ سے تھے۔ میں جب بھی گھر میں آتا تھا تو مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے اب تک کی زندگی میں نے ایک خانہ بدوش ہی کی طرح گزاری تھی اور اب 33 سال کی عمر میں مجھے پہلی بار اپنا ذاتی گھر نصیب ہوا تھا۔

ہمارے گھر میں دو تین خادائیں بھی تھیں۔ جو ہمارے بیٹے کی اور ہمارے گھر کے بہت سے کاموں کی نگہداشت کرتی تھیں۔ ہم انہیں بہت اچھا معاوضہ دیتے تھے اور ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے بھی سب کا الگ الگ وظیفہ مقرر کر چکے تھے۔ ہم بھی ان سے مطمئن تھے اور وہ بھی ہم سے خوش ہی دکھائی دیتے تھے۔ جولی گھر پر ہی ولسن کو پڑھاتی بھی رہتی تھی۔ میرے والد اور والدہ دونوں ہی کے خطوط آتے رہتے تھے کہ وہ اب اپنے پوتے اور اپنی بہو سے ملنے کے لئے بہت بے تاب (Excited) تھے۔

ایک بار جان مارشل دہلی سے تین دن کے دورے پر ڈھاکہ آئے اور وہاں سے میرے کام کو اور ''ینامتی'' کے کھنڈرات کی کھدائی وغیرہ کی معلومات کرنے کے لئے صبح سے شام تک کومیلا بھی آ گئے تھے۔ میں نے کوئی چار پانچ گھنٹے تک انہیں اس علاقے سے متعلق بریفنگ (معلومات) دی اور نقشوں اور سروے چارٹس وغیرہ کی مدد سے یہاں کی تفصیلات بتائیں۔

جو چند لڑکے اور نوجوان اس دوران میں نے مقامی کالجوں سے بھرتی کر کے کھدائی وغیرہ کے لئے تیار کئے تھے ان کا بھی ذکر کیا۔ ان کی تربیت کے لئے جو کورسز میں نے ان کے لئے تشکیل دیئے تھے اور جس جس طرح سے میں آنے والے وقتوں کے لئے ان کی ٹریننگ اور تربیت کرتا رہا تھا ان سب پر سر جان مارشل سے بہت تفصیلی بات کی۔ سروے کی رپورٹس اور اس پورے علاقے کی مکمل معلومات اور تمام تاریخی مواخذات (Sources) کی تفصیل کے ساتھ جو 100 صفحات کی ایک تعارفی کتاب میں لکھتا رہتا تھا اس کی بھی خاکہ نگاری (Synopsis) ان کو دکھائی۔

انہوں نے مجھے بہت سی باتوں پر مشورے بھی دیئے اور ان چیزوں میں مناسب ترمیم کے دائرے بھی سمجھائے اور ترامیم کی وجوہات پر اپنا نقطہ نظر بھی بتایا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب کام ابھی اتنا زیادہ تھا کہ اس علاقے کی اصل کھدائی کرنے میں ابھی 2/3 سال مزید لگ سکتے تھے یعنی 1922ء سے پہلے یہاں کے مختلف مقامات (Sites) کی باقائدہ کھدائی کرنا ممکن ہی نظر نہ آتا تھا۔ ان کا مشورہ بھی یہی تھا کہ ہمیں ان تمام مقامات پر کھدائی سے پہلے بڑے بڑے ہال اور کمرے بنوا لینے چاہئیں تاکہ چھان بین اور تحقیق کے بعد میں آنے والے مراحل سے آسانی کے ساتھ نمٹا جا سکے اور ملنے والی اشیاء کو ترتیب وار رکھنا شروع کیا جا سکے۔

جان مارشل نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ میں آٹھویں صدی عیسوی میں دیوا سلطنت کے

بادشاہ راجہ بھاوا دیوانامی قدیم ڈھیری سے ہی اپنی ابتدائی کھدائی شروع کروں جوان کے خیال میں شاید اگلے پانچ سال تک چلتی رہے گی۔ کیونکہ یہاں کسی بڑی بودھی تعلیمی درسگاہ کی نشاندہی پرانی کتابوں سے بھی ہوتی تھی اور پہلے یہاں ایک عارضی کمرہ بنوا کر کھنڈر سے نکلنے والے کچرے کے ہرٹوکرے کو پہلے یہاں منگوا کر اور اسے چھلنیوں سے چھان پھٹک کر اس میں سے نکلنے والی ہر معمولی سے معمولی ٹکڑے یا برتن یا چوڑی کے ٹکڑوں یا مٹی کے بتوں کے ٹکڑوں تک کو الگ الگ رکھنا شروع کردوں۔ اس طرح باقی کام کے ساتھ ساتھ کچھ جیالوجیکل کا تحقیقی کام بھی چلنا شروع ہو جائے گا۔

جان مارشل نے مجھے ایک ذاتی مشورہ بھی دیا کہ چونکہ میرا دورہ مصر اور اہرام مصر سے میری وابستگی اور پھر موسیٰ والے فرعون رامسیس کی لاش کے دریافت ہونے تک بے حد اہم واقعات کا سہرا میرے سر تھا تو ان سب واقعات کو میں اپنی نوٹس بک میں لکھتا رہوں اور مصر کے ان تجربات کو اور پھر عراق میں لیونارڈ وولی سے ملاقات اور وہاں کے قدیم نوادرات اور آثار قدیمہ کے متعلق بھی اپنے مشاہدات کو لکھنا شروع کروں۔

اسی طرح برطانوی ہند میں مُردوں کے کھنڈر سے متعلق واقعات کا بھی احاطہ کرلوں اور جب برطانیہ واپس جانا ہو تو اس کو کتابی صورت میں وہاں شائع کرواؤں تاکہ عوام تک اور علمی درسگاہوں تک میرے یہ مندرجات (تحاریر) پہنچ کر ایک تاریخی ریکارڈ بن جائیں۔

(سو یہ جو نوٹس میں آج کل اپنی ڈائری میں لکھ رہا ہوں وہ جان مارشل کی اسی ہدایت اور ان کی مشورے کے بعد ہی میں نے لکھنا شروع کئے تھے۔ یہ میں اس لئے بھی تحریر کرتا تھا کہ جولی بھی میرے ماضی سے اچھی طرح واقف ہو جائے اور جب میں اتنا لکھ چکا ہوں تو جولی سے میری اکثر انہی واقعات پر بات چیت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اس داستان میں جو جو ماورائی واقعات شامل ہیں وہ فقط میرے تخیلات کی کارگزاریاں ہیں ورنہ تو حقیقت کی دنیا میں یہ سب کچھ ممکن نہیں ہوتا۔ بہر حال جو بھی ان واقعات کو پڑھے تو وہ جیسا چاہے سمجھے مگر میں نے تو ہر جگہ حقیقت ہی حقیقت بیان کی ہے)۔

رات کے کھانے پر میں نے جان مارشل اور جولی کے ماں باپ کو بھی ڈنر پر مدعو کرلیا تھا اور جان مارشل تو جولی سے مل کر بہت ہی خوش ہوئے تھے اور اب تو اور خوش ہوئے اور انہوں نے گھر اور گھر کی سجاوٹ کی بھی بہت تعریفیں کیں اور اینگر یو مین سے مل کر بھی بہت خوشی کا اظہار کیا۔ کھانے کے بعد بھی ہماری نشست بہت دیر تک چلتی رہی اور یہاں بھی ہماری گفتگو کا مرکز یورپ کی پچھلی پانچ سالہ جنگ اور اس کی تباہ کاریاں اور جنگ کے بعد کے معاشی اور سیاسی حالات اور

برطانوی ہند میں برطانیہ کا مستقبل ہی رہے۔

کومیلا کی چھاؤنی میں انگریز افسروں کی تعداد بہت کم ہے اور اس نئے ضلع میں انتظامیہ کے انگریز افسر بھی دو تین ہی ہیں۔ مگر پھر بھی ہماری یہاں اچھی دوستیاں ہوگئی ہیں اور جولی کی بھی اپنی ہم عمر چند خواتین کے ساتھ اچھے تعلقات قائم ہو گئے ہیں۔ یہ خواتین اپنے شوہروں کے ساتھ ہی رہتی ہیں مگر یہاں مقامی بنگالی لوگوں (Natgives) یا خواتین سے ہمارا ملنا جلنا بہت کم ہی رہتا ہے۔ یہاں ابھی تک کوئی اچھا انگریزی اسکول بھی نہیں ہے چنانچہ جولی اور میں اکثر یہی سوچتے ہیں کہ:

''کیا ہمیں اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے لئے برطانیہ واپس چلے جانا چاہئے''؟

مسلمان خواتین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں سے تو ہمارا ملنا اس لئے کم ہے کہ ایک تو ان کی خواتین عام طور سے انگریزی میں مہارت نہیں رکھتیں اور نہ وہ ہماری گفتگو اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں اور نہ ہی ہم ان کی سوسائٹی میں گھل مل سکتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ بہت زیادہ مذہب پرست ہیں اور ہندوؤں کی طرح زیادہ آزاد خیال اور ملنسار بھی نہیں ہیں۔

مردوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہمارے ہاں کا کوئی بھی گوشت نہیں کھاتے علاوہ مچھلی کے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ہمارے گھروں میں پکے ہوئے کسی بھی گوشت پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا۔ ان کے ہاں حلال و حرام کا بہت مسئلہ ہے۔ رہیں ہندو خواتین تو ان کے ہاں صرف گائے کے گوشت سے اجتناب کیا جاتا ہے باقی وہ سب چیزیں اور حد تو یہ ہے کہ سؤر کا گوشت تک ہمارے ساتھ کھا لیتے ہیں۔ مگر ان کے جو اچھے اور وفادار لوگ ہمارے ساتھ تھے اور کچھ ابھی تک بھی ہیں وہ بھی آہستہ آہستہ ہندوستان کے ہوم رُول (Home Rule) کی تحریک کے حامی ہوتے جا رہے ہیں اور ہم یہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ تحریک بہت جلد مکمل آزادی کے مطالبے میں بدل جائے گی۔

چنانچہ ابھی سے وہ ہمیں اپنا حاکم نہیں بلکہ غاصب اور رقیب سمجھنے لگے ہیں اور جولی کا میرے متعلق یہ بھی خیال ہے کہ اس آثار قدیمہ کی دلچسپی نے مجھے کچھ ماورائی طاقتوں سے الجھا دیا ہے۔ چنانچہ اس کا اکثر یہی مشورہ ہوتا ہے کہ واپس کیمبرج جا کر کسی بھی علاقے کی قدیم تاریخ میں پی ایچ ڈی کر لوں اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے لوں۔ پھر دنیا کے کسی بھی ملک میں کسی یونیورسٹی میں پڑھانے لگوں اور اس طرح میرے ساتھ ساتھ جولی کی تعلیم بھی مکمل ہو سکے گی جو خود بھی پی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ میں اور جولی کم از کم دو یا تین سال اور برطانوی ہند ہی میں رہیں اور کھدائیوں کے وہ معاملات جو مجھے جنگ عظیم کی وجہ سے مُردوں کے کھنڈر میں ادھورے چھوڑنا پڑے تھے کم از کم یہاں کومیلا میں انہیں مکمل کر سکوں۔

بائیسواں باب

بھاوادیواوی ہارا

بھاوا دیوا کی تباہ شدہ بستی کی ابتدائی کھدائی جو پہلے 1896ء میں فرانس بوشانا (Francis Buchana) کے دورے کے بعد مقامی ضلعی انتظامیہ کے ماتحت شروع ہوئی تھی اب ہم نے وہیں سے اسی بستی میں اپنا کام بھی شروع کیا ہوا تھا۔

ہم نے سب سے پہلے اُسی بھاوادیواوی ہارا یعنی بدھی درسگاہ سے اپنی کھدائی کا آغاز کرنے کا ارادہ کیا۔ جس کے ٹیلے کی اوپری سطح کی پیمائش 55 فٹ چوڑی اور 560 فٹ لمبائی کی تھی یعنی تقریباً 56,000 مربع فٹ کا علاقہ تھا۔ اس ٹیلے کے قریب چھ اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور ڈھیریاں ہیں جو یقیناً اسی بڑی ڈھیری سے کسی نہ کسی طرح ضرور متعلق رہی ہوں گی۔ مگر فی الحال ہم ان بستیوں کو نہیں چھیڑ رہے ہیں اور صرف بھاوا دیواوی ہارا ہی کی ڈھیری پر توجہ مرکوز رکھیں گے۔

ابھی کھدائی کرتے ہوئے ہمیں صرف دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ روسی نے ایک شام کو مجھ سے بہت لمبی گفتگو کی۔ وہ عموماً چپ ہی رہتا تھا اور ایک خاموشی پسند کم گو شخص تھا۔ مگر اس شام کو ہماری گفتگو کوئی تین گھنٹے تک جاری رہی اور مجھے جولی کے پاس واپس گھر پہنچتے پہنچتے اس رات دس بج گئے تھے۔
جو کچھ میں یہاں لکھ رہا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ میں اس کو کتنا سچ اور صحیح سمجھوں مگر میری تو پوری کہانی ہی ایسی ہی ناقابل یقین باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ بہر حال روسی نے مجھے بتایا کہ:

''ملکہ یوران کا وہ رومال جو اب تک میری حفاظت کرتا آیا تھا میرے پاس سے لے جایا جا چکا ہے۔ میرے کمرے میں اس رات کو سفید پرندوں کا جو غول آیا تھا وہ مجھے صرف یہ باور کرانے کے لئے آئے تھے کہ گو میں اب بھی ان کی حفاظت میں تو ہوں مگر اب مجھ کو وہ پہلی سی بے خوفی حاصل نہ رہے گی جو اس رومال کی وجہ سے دن رات میرے دل میں اور

میرے اردگرد موجود رہتی تھی۔ میرے بازو پر بندھی ہوئی وہ چھوٹی سی ہڈی جو اس سیاہ فام جامش نے مجھے دی تھی وہ میری جان تو بچا سکتی ہے جیسا کہ ڈھاکہ میں اس گھوڑا بگھی کے حادثے میں بچ گئی تھی مگر اس کی طاقت بھی محدود ہے کیونکہ وہ صرف مجھے کچھ واقعات کی تصویر ہی دکھا سکتی ہے یا مخالفین کو دہشت زدہ کر کے میری گلو خلاصی کرا سکتی ہے جیسا کہ اس ہڈیوں کے پنجر سے ہوئی تھی۔ مگر میرے لئے خطرات بڑھ گئے ہیں''۔

اس رات روسی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ:

''سارحان کے روحوں کے حملوں میں نہ صرف میری بلکہ میری آنے والی تین نسلوں کی عمریں بھی 40 سال ہی رہ گئی ہیں کیونکہ میں نے ان کی وارننگ کی باوجود 40 قدم طے کر لئے تھے''۔

اس نے کہا:

''یہاں ''بینامتی'' کے کھنڈرات میں میرا آخری مقابلہ ہوگا اور یہاں کے مقابلوں میں پہلے ہی سے مجھ پر پڑی ہوئی نحوست جس کی وجہ سے پہلے ہی میری عمر صرف 40 سال رہ گئی تھی وہ اور بھی کم سے کم ہو سکتی ہے اور یہ بدبختی آئندہ تین نسلوں تک بھی چل سکتی ہے اور ختم بھی ہو سکتی ہے۔ سو اب مجھے ہر لمحے چوکنا رہنا پڑے گا''۔

میں نے کہا:

''مگر میں تو صرف اس شہزادی کو قید سے نکالنے کے لئے یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس کام میں کونسی مخالف طاقتیں ہیں جو مجھے یہ کرنے سے روکے رہتی ہیں''؟

اس نے کہا:

''میں تو صرف اندازے ہی لگا سکتا ہوں''۔

پھر روسی نے بہت تفصیل سے اس کا جواب دیا:

''جب یہ شہزادہ دخت رز اس قیدی کو لے کر یہاں پہنچ گیا تھا جہاں آج ہم کھڑے ہیں تو اب اسے کچھ اطمینان سا ہو گیا تھا کہ نہ اب شہزادی کے باپ سیناشرب کی طرف سے کوئی اس کے قیدی کو چھین لینے ادھر آ سکے گا اور نہ ہی اب شہزادی اس سے شادی سے انکار کر سکے گی۔ تو اس نے شاید ''بینامتی'' کو آزاد کر دیا۔ اور اس سے بہت ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ کرنے لگا۔ گو اب شہزادی بھی کبھی کبھی ان پہاڑیوں پر جا جا کر بیٹھ جایا کرتی تھی مگر وہ دور خلاؤں میں نہ جانے کیا گھورتی رہتی ہوگی۔ اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کا

نجات دہندہ ضرور یہاں آ پہنچے گا اور یہ شہزادے کی قید سے اسے آزاد کرا لے گا۔ اسی لئے شہزادے سے اس کی ناراضگی کسی طرح بھی کم نہیں ہوتی تھی اور اس میں واپس اپنے ماں باپ سے ملنے کی آرزو بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی"۔

اس علاقے میں ہندو دھرم کے پنڈتوں، جوگیوں، سادھوؤں، جوتشیوں اور جادوگروں کے بڑے بڑے گروہ بھی رہا کرتے تھے۔ ایسے ہی کسی گروہ کے ایک مشہور جوتشی سے شہزادی کی ملاقات بھی ہو گئی اور اس جوتشی نے ستاروں کا حال اور ان کی چال دیکھ کر شہزادے کو بتایا تھا کہ:

"اب وہ اور نہ ہی وہ شہزادی دونوں اس جگہ سے اور اس زمین سے آگے کہیں بھی نہیں جا سکیں گے اور یہ کہ "مینا متی" سے اس کی کبھی بھی شادی نہیں ہو سکے گی کیونکہ اسے ہمیشہ کنواری ہی رہنا ہے اور شہزادی کا ایک نجات دہندہ ضرور یہاں تک آ پہنچے گا اور وہ شہزادی کو نکال کر لے جائے گا اور یہ شہزادی اپنے ماں باپ کے پاس ضرور پہنچے گی"۔

شہزادے نے پوچھا:

"تو کیا تم اس آنے والے سے مجھے محفوظ رکھ سکو گے"؟

جوتشی نے جواب میں کہا کہ:

"ہاں! ہم تجھے ہر قیمت پر اس سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور شہزادی کو بھی ایسی جگہ چھپا دیں گے کہ شاید کسی کی بھی وہاں تک رسائی نہ ہو سکے اور کسی وقت ستاروں کی چال پلٹ گئی تو اس نجات دہندہ کو بھی ہم شاید اس شہزادی کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیں۔ گو یہ ابھی مشکل لگتا ہے مگر ناممکن نہیں ہو گا۔ اگر ستارے بدلے تو پھر سب کچھ بدل بھی سکتا ہے"۔

شہزادے نے ان سے وعدے لے لئے کہ:

"اگر وہ مر بھی جائیں تو اپنے وعدے اپنی نسل کو آگے منتقل کر دیں گے کہ نہ اس قیدی کو آزادی دلانے والا زندہ بچ کر جا سکے اور نہ ہی اس کی کبھی شہزادی تک رسائی ہو سکے"۔

اس جگہ پر مستقل قیام کے لئے پھر شہزادے نے اپنا حلیہ اور اپنی زندگی سب کچھ ہی کو بدل لیا۔ اس نے زمین پر کھیتی باڑی شروع کر دی مگر وہ شہزادی پر بھی ہر وقت نظر رکھتا تھا اور یہ دیکھ کر مطمئن رہتا تھا کہ وہ ان پہاڑیوں کے علاوہ کہیں اور جاتی ہی نہ تھی۔ وہ شہزادے کے لئے کھانا پکا دیتی تھی مگر کبھی بھی اس اسے بالکل بھی کوئی بات نہ کرتی تھی۔ یعنی شہزادے کی اس دو کمروں یعنی کوٹھڑیوں والی جھونپڑی میں خاموشی اور مسلسل خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

چند سال یونہی گزر گئے۔ شہزادے کو اب اپنی زندگی بالکل ویران، سپاٹ، بے وجہ اور بے

امید نظر آنے لگی تھی، آہستہ آہستہ وہ اس خیال کو دل میں بسانے لگا کہ مجھے شہزادی کے رویے کو بدلنا ہی ہوگا اور میں اس کی اس ''نا'' کو ضرور ''ہاں'' میں بدل دوں گا اور اگر یہ نہ ہوا تو میں اسے زبردستی حاصل کرلوں گا۔ مگر اسے کوئی کامیابی بھی نظر نہیں آتی تھی۔

ایک شام کو وہ ''مینا متی'' کی کوٹھڑی میں داخل ہوگیا۔ ہمیشہ سے ہی یہ جھونپڑی تو ایک ہی تھی مگر وہ بھی الگ اپنی کوٹھڑی میں رہتا تھا اور ''مینا متی'' بھی الگ ہی رہا کرتی تھی۔ شہزادے کا اس طرح اچانک کمرے میں داخل ہوجانا غیر معمولی بات تھی۔ شہزادی ایکدم اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

شہزادے نے ایک ہاتھ کی صرف تین انگلیوں سے ہی اسے چھونے اور پکڑنے کی کوشش کی مگر شہزادی کے بازو سے اس کے ہاتھ کی تین انگلیاں بس ابھی مَس ہی ہوئی تھیں کہ جیسے کسی سوکھے درخت کی سوکھی شاخیں ٹوٹ جاتی ہیں بالکل ویسے ہی اس کی تینوں انگلیاں اس کی ہتھیلی سے خود بخود ٹوٹ کر نیچے گر گئیں۔ ہاتھ سے خون نکلتا دیکھ کر اس شہزادے پر ایک پاگل پن کی سی جنونی کیفیت طاری ہوگئی اور اس نے دونوں بازوؤں سے شہزادی کو پکڑنے کی کوشش کی اور پھر شہزادی کے ہاتھ شاید پہلی بار اس کے جسم سے لگے اور اس نے شہزادے کو زور سے دھکا دیا۔ اس میں نہ جانے کہاں سے اتنی قوت آ گئی تھی کہ یہ دھکا اتنے زور سے دیا تھا اور وہ اتنی شدت کا تھا کہ شہزادہ الٹے قدموں پیچھے کی طرف گر گیا اور پھر کبھی نہ اٹھ سکا۔ اس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔

مگر ابھی چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ کسی نے شہزادے کا نام لے لے کر جھونپڑی کے باہر اسے پکارنا شروع کیا۔ باہر کی آوازیں بھی اور زیادہ ہونے لگیں، لوگوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ گویا بہت سے لوگوں کا مجمع ہوگیا تھا اور جب اندر سے شہزادی نے کوئی جواب نہ دیا تو کئی آدمی ایکدم اس جھونپڑی کے اندر گھس آئے۔ شہزادہ ان کے سامنے مُردہ پڑا تھا اور ''مینا متی'' بے حس وحرکت اور اپنے سپاٹ چہرے کے ساتھ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

شہزادے کے جوتشی اور اس کے ساتھ آئے ہوئے بہت سے لوگوں نے لاش کو بھی قبضے میں لے لیا اور شہزادی کو بھی پکڑ کر اس کے ہاتھ پیر باندھ کر اسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ نجات دہندہ سے شہزادے کو بچانے سے پہلے ہی یہاں کے جادوگر اور ان کے چیلے جوتشی اس کا انجام دیکھ چکے تھے۔

شہزادی زندہ تو رہی مگر اب وہ بس روتی تھی، سسکیاں لیتی تھی، کبھی چلا چلا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتی تھی اور اس کے منہ سے ایک ہی جملہ نکلتا تھا:

''مجھے اپنے باپ کے پاس جانا ہے__''۔

اس شہزادی نے علاوہ دو وقت کی ان دو روٹیوں کے جو وہ صرف زندہ رہنے کے لئے کھاتی

تھی یا ان کے دو ایک جوڑوں اور کپڑوں کے جو اسے تن ڈھانپنے اور سردی گرمی سے بچاؤ کے لئے مل جاتے تھے۔ نہ کبھی اس نے شہزادے سے کچھ مانگا تھا اور نہ ہی جوتشیوں سے کبھی کچھ لیا، نہ مانگا اور نہ ہی کسی بات کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہاں اس نے شہزادے کی وہ تین انگلیاں جو اس کی بدنیتی کی وجہ سے اس کے بدن بلکہ بازو کو چھوتے ہی خود بخود ٹوٹ کر گر گئی تھیں وہ ضرور ان کو اپنے پاس رکھتی تھی۔ کیونکہ وہ ہی اب اس کی پاکدامنی کا سب سے بڑا ثبوت تھیں۔

شہزادی اب ان جوتشیوں کی قید میں تھی۔ انہوں نے شہزادی کے کسی بھی آنے والے نجات دہندہ سے بچاؤ کے جال تو بن دیئے تھے مگر شہزادے کی موت کا سبب جو لڑکی تھی اس کا انہیں خیال تک نہ تھا۔ اس طرف ان کا خیال و گمان کبھی گیا ہی نہ تھا۔ سو وہ اب اس سے کئے گئے وعدوں کی وجہ سے یہ سوچ چکے تھے کہ اس لڑکی کو وہ کسی قیمت پر بھی نہ آزاد کریں گے اور نہ ہی اسے واپس اپنے ماں باپ اور خاندان کی طرف جانے دیں گے۔

یہ جوتشی جب بھی ستاروں کا حساب کتاب لگاتے تو ان کو یہی جواب ملتا کہ شہزادی کو اس زمین سے اور ان کی قید سے نکالنے والا ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا اور شہزادی کو نکال کر اس کو اس کے باپ کے پاس ضرور پہنچا دے گا۔ مگر کب؟ اس کا جواب دور دور تک بھی ان کو ستاروں کی چال میں نظر نہیں آتا تھا۔

شہزادی انہی تین سوکھی ہوئی انگلیوں کے ساتھ زندہ تھی۔ اس کی آخری تمنا یہی تھی کہ وہ ایک بار اپنے گھر والوں سے ضرور مل لے اور جوتشی کسی بھی طرح یہ نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔

بہت سالوں تک ''مینا متی'' ان کی قید میں رہی۔ اسی یاس و ناامیدی میں وہ گھلتی ہی چلی جاتی تھی اور ایک دن جب حسب معمول اسے کھانا دینے کے لئے اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا گیا تو یہ شہزادی، لال مائی، ''مینا متی'' اپنی آخری سانس لے چکی تھی۔

جوتشیوں نے اس کو لکڑی کے ایک بکس میں بند کیا اور انہی تین انگلیوں کے ساتھ اور انہی کپڑوں میں جس میں اس کی موت ہوئی تھی اسے کسی نامعلوم مقام پر چھپا دیا اور آپس میں یہ بھی طے کر لیا کہ اس لکڑی کے صندوق کو یعنی اس کی لاش کو پھر کچھ کچھ دنوں بعد کسی وقت اور کسی بہت محفوظ جگہ پر چھپا دیا جایا کرے گا اور انہوں نے آپس میں عہد کر لیا کہ اپنی آنے والی نسلوں کو بھی اس آنے والے نجات دہندہ سے بچائیں گے۔

انہوں نے جادوگروں کو بلا کر اس لاش کو چھپانے سے پہلے اس کی لاش پر ایسے منتر پڑھوائے کہ اگر کوئی بھی اس کے جسم کو چرانے کی یا چرا کر لے جانے کی بھی کوشش کرے تو اس کی انگلیوں

سے بھی اسی طرح خون کا فوارہ پھوٹ پڑے۔ جیسے کہ شہزادے دخت رز کے ساتھ ہوا تھا اور وہ بھی زندہ نہ رہ سکے گا''۔

میں روسی کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ اس کو یہ سب باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟ کیا وہ بھی کچھ خفیہ یا ماورائی طاقتوں سے رابطے میں رہتا تھا یا یہ سب کچھ صرف اس کے اندازے ہی اندازے ہیں؟

پھر روسی آگے کا حال بھی بتانے لگا:

''سیناشرب کے مرنے کے 50 سال کے بعد اس علاقے میں وہ شخص پیدا ہو چکا تھا جس کا نام سدھارتھ تھا جو بعد میں گوتم بدھ کے نام سے مشہور ہوا۔ جب اس علاقے میں بدھ مذہب کا دور شروع ہو گیا تو یہاں کے راجاؤں اور رعایا سب ہی اس مذہب کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ ان کے عبادت گھر بنائے جانے لگے اور دور دور سے بدھ مذہب کے طالبعلم بھی ان درسگاہوں میں آ آ کر رہتے بھی رہے اور عبادات بھی کرتے تھے۔ ان عبادت گاہوں میں ذہن کو یکسوئی دینے۔ خیالات کو ایک مرکز پر لانے اور ذہنی قوتوں کو بڑھانے کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ سو یہاں کے جوتشی اور بھکشو اپنے علوم کے زور پر مستقبل میں دور دور تک دیکھنے کی قوت حاصل کر لیتے تھے۔

انہی جوتشیوں میں اس نسل کے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جو پہلے ہندو تھے اور صدیوں قبل شہزادے دخت رز سے شہزادی کی حفاظت کا وعدہ کر چکے تھے۔ سو جب یہاں بدھ مندر اور تعلیمی مدرسے بنائے جا رہے تھے تو انہوں نے شہزادی کی لاش کو جس لکڑی کے بکس میں چھپا کر پہلے ایک عام سی جگہ پر دفن کر دیا تھا اسے مزید محفوظ جگہ پر رکھنے کے لئے اور کسی بھی وقت چوری سے بچانے کے لئے ان نئی تعمیر ہونے والی درسگاہوں میں زیرزمین لکڑی کے بکس کو پہلی جگہ سے منتقل کر کے وہاں چھپا دیا تھا۔ مگر یہ بات ''بینا متی'' کی موت کے کوئی صدیوں کے بعد ہوئی تھی اور لوگوں نے جب اس تابوت کو دوبارہ زیرزمین دفناتے ہوئے اس بکس کو کھول کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ صدیوں کے بعد بھی ''بینا متی'' کا چہرہ اب بھی اسی طرح تروتازہ تھا کہ جیسے وہ مری نہ ہو بلکہ صرف سوئی ہوئی ہو''۔

روسی یہ ساری باتیں کیسے جان گیا تھا؟ اسے کس نے یہ سب احوال بتائے تھے؟ مجھے اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ مگر جس یقین اور تفصیل کے ساتھ اس نے یہ سب کچھ کہا تھا اس سے کوئی جھوٹ ظاہر نہ ہوتا تھا۔

روسی کی اتنی لمبی چوڑی تقریر سننے کے بعد اس رات کو میں اپنے آپ کو اور بھی کھویا ہوا محسوس

کرنے لگا تھا۔ مجھے منزل کا پتہ ہی نہ تھا، نہ روسی نے کسی جگہ کی نشاندہی کی تھی کہ وہاں کھدائی کر کے اس تابوت کو نکال لیا جاتا اور پھر اس نے تو مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ اسی کھنڈر ''مینا متی'' کے کسی ٹکڑے میں وہ صندوق دفن ہے۔ مگر یہاں تو آس پاس 50 ایسی ڈھیریاں اور ٹیلے تھے جن میں پرانے آثار مل سکتے تھے اور 16 ایسی بڑی ڈھیریاں بھی تھیں جن کی کھدائی کی جاسکتی تھی۔

میں اکثر اسی اُدھیڑ بُن میں لگا رہتا تھا کہ ''مینا متی'' کا واقعہ کب ہوا تھا؟ کس جگہ ہوا تھا؟ ہوا بھی تھا یا بس یہ ماورائی سی داستان مجھ تک حادثاتی طور پر ہی پہنچا دی گئی تھی؟ پھر عقل یہ بات بھی کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھی کہ اگر کسی طرح میں نے کسی قدیم لاش کا سراغ لگا بھی لیا تو اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو اس کے مُردہ باپ کے پاس پہنچانے سے کیا حاصل ہوگا؟ اور جتنا وقت مجھے یہاں ''مینا متی'' کے تابوت کو ڈھونڈنے میں لگے گا پھر شاید اتنا ہی وقت اس کے باپ کے بوسیدہ جسم کو تلاش کرنے میں لگ جائے گا۔

اس داستان کے شروع ہی سے مجھے یہ معلوم ہو ہی چکا تھا کہ ''مینا متی'' سینا شرب کی بیٹی تھی اور اس نے قریب کے بادشاہ کو شکست دے کر اس کے گھر والوں کو بھی قیدی بنا لیا تھا اور اسی کے انتقام کے لئے اس شکست خوردہ بادشاہ کا شہزادہ دخت رز اس کی بیٹی کو اغوا کر کے لے گیا تھا پھر یہ بھی مجھے ابتداء ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ وہ اس کو لے کر دریاؤں کی سرزمین تک آیا تھا اور میں اب انہی دریاؤں کی سرزمین میں موجود تھا۔

یہ دن میری بہت زیادہ مصروفیت کے دن تھے۔ میں جولی اور ولسن کو بھی کچھ زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا۔ ایک طرف تو دن بھر بھاوا دیوا وی ہارا کی کھدائی کے کام کی نگرانی کرنا پڑتی تھی پھر دوسری طرف میں اس کتابچے کو بھی تحریر کر رہا تھا جس کی ہدایت اور مشورہ مجھے جان مارشل دے کر گئے تھے اور پھر میں قدیم عراق اور بابل کی تواریخ کا بھی مطالعہ کرتا رہتا تھا کیونکہ عراق اور یہودیوں کی سلطنت یہودا کے تانے بانے ایک دوسرے سے جڑے نظر آتے تھے۔

ان ساری باتوں میں مجھے یہ خیال بھی ہر وقت چوکنا رکھتا تھا کہ ''مینا متی'' کی حفاظت کرنے والی اَن دیکھی طاقتیں میرا راستہ روکے کھڑی تھیں جو مجھے کسی وقت بھی کوئی نقصان پہنچا سکتی تھیں۔ کیونکہ اب میرے پاس ملکہ یوران کا رومال بھی موجود نہیں تھا۔ میرا دفاعی ہتھیار صرف اگر کچھ تھا تو صرف وہ ہڈی تھی جسے میں ہر وقت اپنے بازو پر باندھے رہتا تھا۔

تاریخ کے اس مطالعے سے مجھے یہ بات سمجھ میں آتی جا رہی تھی کہ جس بادشاہ کا نام سینا شرب تھا اور جس کی بیٹی یہاں کہیں کومیلا میں کھنڈروں میں دفن تھی وہ عراق کا ایک بڑا بادشاہ تھا۔

اسی نے بابل کو پہلے دجلہ کے بند کھول کرا سے برباد کیا تھا اور پھر اسی نے اس شہر کی تعمیر میں بھی بہت حصہ لیا تھا۔ غالباً یہی وہ بادشاہ تھا جس نے بابل میں اشتر دیوی کا ایک بہت بڑا مندر بھی بنوایا تھا۔
اس بادشاہ کا دور 704ق م سے 681ق م تک کا تھا اور اس کے زمانے میں جو چھوٹے چھوٹے شہر اور بستیاں آباد تھیں ان پر چھوٹے چھوٹے راجے اور بادشاہ حکومت کرتے تھے جو سلطنت یہودا کو خراج بھی ادا کرتے تھے۔ ان بستیوں میں ایکون (Ekon)، ٹی ماہ (Timah)، مزپاہ (Mizpah)، لبناہ (Libnah) اور بیتھل (Bethal) زیادہ مشہور تھیں اور انہی میں سے ایک پر سیناشرب نے حملہ کر کے اسے لوٹا تھا اور یہاں کہیں پر اس شہزادے دخت رز کے باپ کو قیدی بنا لیا تھا جس کا انتقام لینے کے لئے دخت رز نے سیناشرب کی بیٹی کو اغوا کر کے قیدی بنا لیا تھا اور مشرق کی طرف بھاگ نکلا تھا۔

سیناشرب کی زیادہ شہرت یہودیوں کی سلطنت یہودا پر حملوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہودیوں کی یہ سلطنت کہاں تھی؟ کب بنی؟ کب تقسیم ہوئی اور کب ختم ہوئی؟ یہ بھی عبرت کی ایک داستان ہے۔ اس کا کچھ احوال میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں اور اب ذرا تفصیل سے لکھتا ہوں۔

موسیٰ پر خدا نے توریت نازل کی تھی اور وہی یہودی شریعت کے بانی تھے اور وہی یہودیوں کو فرعون مصر کی غلامی سے نکال کر باہر لائے تھے اور ان کو فلسطین کے قرب و جوار میں آباد کرنے کے بانی تھے۔ موسیٰ کا انتقال غالباً 120 سال کی عمر میں ہوا تھا۔ ان کے بعد ان کے ماننے والوں میں ایک فوجی سردار شمعون یا یوشا کے نام کا ابھرا جس نے اس حکومت کی جو اس وقت عمالیقی ریاست کہلاتی تھی کی سرحدوں پر لوٹ مار کر کے اس پر چھاپہ مار حملے کرنا شروع کئے۔

وہ اکثر شہروں اور بستیوں کو لوٹتا تھا اور پھر انہیں جلا دیا کرتا تھا۔ اس نے کچھ ہی عرصے کے اندر اتنی طاقت حاصل کر لی تھی کہ قوم موسیٰ جو قوم یعقوب کو یا بنی اسرائیل کو (یعقوب کا دوسرا نام اسرائیل بھی تھا) یعنی ان کے بارہ قبیلوں کو الگ الگ چھوٹی چھوٹی بارہ بستیوں کا مالک بنا دیا۔ بعد میں ان بارہ قبائل نے مل کر پہلی بار طالوت کو جسے سول (Saul) بھی کہا جاتا ہے اپنا پہلا بادشاہ بنا لیا۔ لیکن ایک خوفناک جنگ میں جو جنگ جلوبہ کہلاتی ہے شکست کے بعد اس نے خودکشی کر لی تو پہلے داؤد اور پھر سلیمان اس یہودی ریاست کے بادشاہ بنے۔

1۔ طالوت (Saul)۔ 995ق م میں جنگ جلوبہ میں شکست کے بعد خودکشی کر کے مر گیا۔
2۔ داؤد (David)۔ 995ق م تا 960ق م۔
3۔ سلیمان (Solomen)۔ 960ق م تا 922ق م۔

سلیمان کے بعد یہ یہودی ریاست دو حصوں میں بٹ گئی۔ بنی اسرائیل کے دو قبیلے ایک طرف تھے انہوں نے سلطنت اسرائیل بنالی جو اپنے پہلے بادشاہ ناداب سے لے کر آخری بادشاہ ہوشیاہ تک یعنی 909 ق م سے 721 ق م تک قائم رہی۔ عراق سے اٹھنے والی اس ریاست کے بادشاہوں کے پے در پے حملوں نے اسے ختم کر ڈالا۔ جس کے مشہور جنگجو بادشاہوں میں ٹِگ لتھ پلسر و (Tiglith Pulsero)، شَل مانی سار (Shalmanesar) اور سارگان دوم شامل تھے۔

یہودیوں کی دوسری سلطنت، سلطنت یہودا کہلاتی تھی۔ جس میں ان کے 10 قبیلے شامل تھے۔ یہ سسلطنت اپنے آپ کو داؤد اور سلیمان کا جانشین سمجھتی تھی اور یہ 995 ق م سے 587 ق م تک قائم رہی۔ سارگان دوم جس نے سلطنت اسرائیل کو ختم کر دیا تھا اس نے اس حکومت کو بھی ختم کر دینا چاہا۔ مگر اسی دوران عراق میں اس کے ایک بیٹے فردوخ بالادان (Farodch Baladan) نے بابل میں اپنے ہی باپ کے خلافت بغاوت کر دی تھی جس کی وجہ سے اسے عراق واپس جانا پڑا اور سلطنت اسرائیل کچھ دن کے لئے بچ گئی۔

لیکن پھر سارگان کے بیٹے سیناشرب نے جو مردوخ بالادان کی بغاوت کے بعد جو 713 ق م سے 702 ق م تک جاری رہی تھی 704 ق م میں بادشاہ بنا اور 681 ق م تک حکومت کرتا رہا۔

سیناشرب نے بھی سارگان دوم کی طرح یہودیوں کے سلطنت یہودا پر بار بار حملے کرنا شروع کر دیئے۔ وہ ان کے دارالحکومت یروشلم تک پہنچ ہی گیا تھا کہ اس کی دو لاکھ سے بھی بڑی فوج میں یکا یک طاعون کی بیماری پھوٹ پڑی اور صرف چندی ہی دنوں میں اس کے 180,000 فوجی موت کا شکار ہو گئے اور وہ بدحواس ہو کر بابل کی طرف لوٹ گیا۔ مگر پھر اس نے اپنی فوج کو دوبارہ منظم کیا اور 687 ق م میں پھر یروشلم پر حملہ کر دیا۔ اس بار سلطنت یہودا نے سیناشرب کو بہت سا مال بطور خراج ادا کیا۔

سیناشرب نے 687 ق م میں یروشلم کے یہودیوں سے جو مال و دولت حاصل کی تھی اس کی تفصیل بھی آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے حاصل ہو گئی تھی جو یہ تھی:

''ـــ میں نے 30 کلو ٹیلنٹ سونا، 800 کلو ٹیلنٹ چاندی، قیمتی ہیرے جواہرات، روبی کے بڑے بڑے ٹکڑے، مرصع کرسیاں، ہاتھیوں کے لمبے دانت، کالی آبنوس کی لکڑی کا فرنیچر، یروشلم کے بادشاہوں کی شہزادیاں، امراء کی نوجوان لڑکیاں اور بہت سی ناچنے گانے والی داشتائیں اور موسیقار لڑکیاں خراج کے طور پر حاصل کیں ـــ''۔

سینا شرب 706 ق م سے 601 ق م تک تقریباً 20 سال حکومت کر کے ختم ہو گیا تھا۔
یروشلم کے بادشاہوں کی فہرست میں 19 نام شامل ہیں جنہوں نے 1075 ق م سے 587 ق م تک حکمرانی کی۔
سلطنت یہودا کے بادشاہ یہ تھے:
1۔ طالوت (Saul) 995 میں جنگ جلوبہ کی شکست کے بعد خودکشی سے مرا۔

2۔ داؤد (David)	995 ق م تا 961 ق م
3۔ سلیمان (Solomen)	961 ق م تا 922 ق م
4۔ رے ہوبام (Rehoboam)	922 ق م تا 915 ق م
5۔ ابی جام (Abijam)	915 ق م تا 913 ق م
6۔ آسا (Asa)	913 ق م تا 873 ق م
7۔ ذی ہوشافاہ (Jehosha Phat)	873 ق م تا 849 ق م
8۔ ذی ہورام (Jehoram)	849 ق م تا 842 ق م
9۔ ذوآش (Josh)	842 ق م تا 800 ق م
10۔ آمازیہ (Amazia)	800 ق م تا 783 ق م
11۔ عزیاہ (Uzziah)	783 ق م تا 742 ق م
12۔ ذودام (Jo Thom)	742 ق م تا 735 ق م
13۔ آہاز (Ahaz)	735 ق م تا 715 ق م
14۔ ہزقیہ (Hazekia)	715 ق م تا 687 ق م
15۔ مانیساہ (Manasseh)	687 ق م تا 622 ق م
16۔ آمون (Amon)	642 ق م تا 640 ق م
17۔ جوشیاہ (Josiah)	640 ق م تا 609 ق م
18۔ ذی ہوائی کم (Jehoiakim)	609 ق م تا 598 ق م
19۔ ضدیقاہ (Zedekia)	598 ق م تا 587 ق م

یروشلم کی اس تباہی کے بعد اس شہر کے یہودیوں کو یہاں سے نکال کر پھر دوسرے ممالک میں پھیلا دیا گیا تھا جو عراق اور شام میں جا کر بس گئے تھے۔ مگر خدا نے ان کو دوبارہ ایک بار پھ ایران کی ارشی نیڈ سلطنت کے عظیم بادشاہ سائرس اعظم (Cyrus the Great) کے ذریعے ان

کی نجات کا سامان پیدا کر دیا۔ سائرس اعظم کو مسلمان ذوالقرنین کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ اس نے ایران سے آگے بڑھ کر عراق کے بادشاہوں کو بھی شکستیں دیں اور پھر عراق، ترکی، جارجیا اور یونان تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا اور پھر وہ سلطنت قائم کی جو سکندر کے زمانے تک باقی رہی۔ اسی سکندر کو تاریخ دان مشرق کا فاتح بھی کہتے تھے۔

جس سال یعنی 835 ق م میں سائرس نے عراقی شالدین سلطنت کو شکست دی اسی سال ہندوستان کے صوبہ بہار میں کپل وستو کی ریاست میں جو نیپال کی ترائی میں مگدھ کے علاقے کی سات ریاستوں میں سے ایک ریاست تھی۔ وہاں کے شاکیہ منی شاہی خاندان کے راجہ سدھودان کے گھر اس کھتری ذات کے خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام سدھارتھ شاکیہ منی رکھا گیا۔ یہی وہ شہزادہ تھا جو بعد میں گوتم بدھ کے نام سے مشہور ہوا۔ جس کے ماننے والے بدھ مذہب کے لوگوں نے 8ویں صدی عیسوی سے 12ویں صدی عیسوی تک بنگال کے اس علاقے پر حکومت کی تھی جہاں اب ضلع کومیلا واقع ہے اور جہاں ''مینامتی'' نامی بستی کے کھنڈرات میں اب میں کھدائیاں کر رہا تھا۔

اس بدھ مذہب کا کچھ احوال میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ گوتم بدھ اور ذوالقرنین دونوں ہی ہم عصر تھے مگر ایک ایشیا کے مشرق میں تھا تو دوسرا اسی براعظم ایشیا کے مغرب میں اور ''مینامتی'' کی پوری داستان بھی بابل کے انہی بادشاہوں یعنی سارگان کے بیٹے سیناشرب اور بدھ مذہب کے آثار قدیمہ سے جڑی ہوئی ہے اور اس کا آخری باب اب شاید گوتم بدھ کی کسی تعلیمی درسگاہ ہی میں مکمل ہونے والا تھا۔

تاریخ کے اس مطالعے کے اس مرحلے پر پہنچ کر میں کم از کم اتنا تو سمجھ ہی گیا تھا کہ سارگان اور سیناشرب عراق کی اس موروثی سلطنت کے بادشاہ تھے جو شالدین سلطنت کہلاتی تھی اور انہوں نے 714 ق م اور 687 ق م کے درمیان یہودیوں کی سلطنت یہودا پر پے در پے کئی حملے کر کے اس کو پوری طرح روند ڈالا تھا۔ اسی سلطنت کے بادشاہوں یعنی حزاقیہ (Hazkia، 715 ق م سے 687 ق م) اور مانیسیا (Manasseh، 687 ق م سے 622 ق م) کے حکمرانوں کی بادشاہی چل رہی تھی۔ مگر سیناشرب کے حملے ہوتے رہے تھے۔ گویا اب تاریخ سے یہ تو ثابت ہو ہی چکا تھا کہ وہ جو دو نام یعنی سارگان اور سیناشرب مجھے بار بار بتائے جا چکے تھے وہ خیالی یا افسانوی نہ تھے بلکہ ایک وقت میں جیتے جاگتے بادشاہوں کے نام تھے یعنی آج 1919ء سے جب میں یہاں آثار قدیمہ کی کھدائیاں کرتا رہا ہوں یعنی ڈھائی ہزار سال قبل بابل کے دارالحکومت سے عراق کی دجلہ و فرات کی وادیوں پر حکومت کرتے تھے۔

یہ پُر ہیبت بادشاہ تھے جن کے پاس لاکھوں سپاہیوں کی فوجیں موجود رہتی تھیں۔ جن کے دو ہی کام تھے یا تو یہ دیوی دیوتاؤں کے بڑے بڑے عالیشان مندر تعمیر کرائیں یا پھر اپنی ریاستوں کی حدود کو بڑھاتے چلے جائیں اور اپنی حکومت کو اس قدر جبر و ہیبت سے قائم رکھیں کہ ملک کے اندر کسی کو بھی سر اٹھانے کی مہلت نہ ملے، نہ کسی میں حکم عدولی کی جرأت پیدا ہو سکے۔ ایسے بادشاہوں کی کسی بیٹی کو اگر کوئی کسی طرح اٹھا کر لے جائے اور پھر اس کا نام و نشان بھی نہ ملے تو وہ بادشاہ غصے سے پاگل نہ ہو تو اور کیا ہوا ہو گا؟

یہی حال سینا شرب کا بھی ہوا ہو گا۔ جب اس کے سپاہی اس شہزادے دخت رز کو ڈھونڈ نے میں ناکام واپس آئے ہوں گے تو اس نے ایک طرف تو اپنی بیوی کے باپ فرعون سے اس کے عالم و قابل جادوگروں کو بلوایا ہو گا کہ وہ اپنی ساحرانہ قوتوں سے ''بینامتی'' کا اتہ پتہ معلوم کریں اور دوسری طرف دخت رز کے خاندان کے تمام قیدیوں کو بھی فی الفور قتل کرا دیا ہو گا اور انہی دنوں مردوقش ساحر مصر سے سینا شرب کے دربار میں بھی پہنچا ہو گا اور اس نے ملکہ یوران اور ان کو وہ رومال بھی دیا ہو گا جو مجھے دیا گیا تھا۔

انہی دنوں ایک دن جب میں اور روسی بھاوادیوادی ہارا کی کھدائی کی نگرانی کر رہے تھے تو میں نے روسی سے کہا:

''روسی! تم بائرن کے میرے اسکول کے ساتھی ہو اور میرے ساتھ کم و بیش 14 سال ہی کی عمر سے ہمیشہ ساتھ رہے ہو۔ تم نے میرے دوست سے زیادہ میرے محافظ کا کردار ادا کیا ہے۔ سر جان مارشل کے مصر سے عراق اور عراق سے ہندوستان تک کے اس 19/20 سال میں نہ تم کبھی اپنے گھر واپس گئے، نہ مجھے چھوڑا۔ آخر یہ سب تم نے کیوں کیا ہے''؟

اس نے کہا:

''جان میلکم! آج تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو میں بھی تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ جس دن تم دوسری بار جامش ساحرہ کی جھونپڑی میں گئے تھے تو تمہارے بعد تمہیں بتائے بغیر اسی دن میں بھی اس کے پاس گیا تھا کہ اس سے معلوم کروں کہ اس دن اس نے جو عجیب و غریب باتیں میرے سامنے تم سے کی تھیں آخر ان کی حقیقت کیا تھی؟

تمہارے ساتھ اس کا لہجہ اور رویہ دوسرا تھا اور میرے ساتھ دوسرا۔ اس نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ جب تک تم دریاؤں کی سرزمین تک نہیں پہنچ جاؤ گے میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ اس نے مجھے اپنے استاد مردوقش کے بتائے ہوئے کچھ نام بھی بتائے تھے اور کہا تھا کہ

جب کبھی مجھے ہر طرف سے ناامیدی گھیر لیا کرے اور تمہارے اور اپنے لئے کوئی راستہ نظر نہ آتا ہو تو ان ناموں کو پڑھ لیا کروں اور ان کا ورد کر لیا کروں تو مجھے ماضی اور حال سب کچھ نظر آ جایا کرے گا۔ اور اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ تمہارے دوست کی یعنی تمہاری جان کو خطرہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ جیسے جیسے وہ ''مینا متی'' کی تلاش کے آخری مراحل میں داخل ہوگا اس شہزادے دخت رز کی حلیف طاقتیں اور اس کے جانشین اس کو مارنے کی کوشش کرتے رہیں گے اور تمہیں وہاں پہنچنے سے روکتے رہیں گے اور شاید تمہیں بھی کسی نہ کسی طرح ختم ہی کر ڈالیں۔ سو اسی لئے اس نے مجھے تمہارا محافظ بنا دیا تھا۔

اس نے کہا تھا کہ پھر ''مینا متی'' کو واپس سیناشرب کے پاس لانا''۔

میں نے پوچھا کہ:

''لیکن اگر ہم ''مینا متی'' تک کسی طرح پہنچ بھی گئے تو پھر ہم اس کے باپ سیناشرب کو کہاں ڈھونڈیں گے''؟

روسی نے کہا:

''مجھے بتایا گیا ہے کہ اس سوال کا جواب شیشے کی وہ 9 تختیاں دیں گی جو ہمیں شہزادی کے پاس مل جائیں گی''۔

جب تک روسی بولتا رہا تھا میں حیرت سے اس کا منہ تک رہا تھا کہ یہ سب کچھ روسی کو کیسے معلوم ہے؟

پھر جیسے ہی روسی نے فرعون کے درباری جادوگر مردوقش کا نام لیا تھا تو مجھے بھی یاد آ گیا تھا کہ ایک خدا کی عبادت کی طرف راغب کرنے والے موسیٰ کا واقعہ گزر چکا تھا۔ جس کے بعد دوسرے آنے والے فرعونوں نے اپنی خدائی کو بچانے کے لئے ہر طرف سے سینکڑوں ساحروں کو اپنے دربار میں جمع کر لیا تھا۔ شاید مصر کے فرعونوں نے اپنی بیٹی یوران کی شادی بھی اسی لئے عراقی بادشاہ سیناشرب سے کی تھی کہ موسیٰ کی قوم نے فلسطین سے یمن تک جو سلطنت اسرائیل اور سلطنت یہودا قائم کر لی تھی۔ وہ کہیں بڑھ کر مصر کی سلطنت فراعین تک پر قبضہ نہ کر لے یا اپنے مذہب کے ایک خدا کا فلسفہ وہاں تک نہ پہنچا دیں۔ عراقی بادشاہوں نے موسیٰ کی قوم کی حکومت کو تو مصر تک پہنچنے اور پھیلنے سے ضرور روک لیا تھا مگر نہ عراقی بابلی حکومت بچی، نہ مصری فرعون کی وہ شہنشاہیت جو پچھلے 3000 سال سے چلی آ رہی تھی بچ سکی۔

پھر مجھے یاد آیا کہ اس سیاہ فام ساحرہ جامش نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ جب ''مینا متی'' کو

قید سے آزادی مل جائے گی تو مردوقش بھی زندہ ہو جائے گا اور پھر اس لکڑی اور پانی والے بچے یعنی موسیٰ ہی کی طرح کا کوئی اور آدمی اٹھے گا جو ایک خدا ہی کی عبادت کی ویسی ہی بات کرے گا جیسی موسیٰ نے فرعون کے سامنے کی تھی۔ جامش نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کیا مردوقش خود زندہ ہو کر اٹھ بیٹھے گا یا اس کا سحر اور جادو اور عراقی بابلی بتوں کا پورا نظام دوبارہ سے زندہ ہو جائے گا؟ پھر جامش نے تو یہ بھی کہا تھا کہ جب ''مینامتی'' کو قید سے رہائی مل جائے گی اور مردوقش جی اٹھے گا تو اس زمانے میں جنگیں ہوں گی، زلزلے آئیں گے، نیلی آگ کے شعلے بھڑکیں گے اور ہر طرف تباہی پھیلے گی۔

تو کیا یورپ کی پچھلی پانچ سالہ جنگ جس میں کروڑوں لوگ مر گئے تھے اور زخمی و اپاہج ہوئے تھے تو کیا وہ اسی پیشگوئی کی اطلاع تو نہ تھی؟

روسی کی گفتگو سے میری سوچوں کے جالے میرے چاروں طرف تن گئے تھے۔ پھر میری زندگی پر ایک اور حملہ پر ہوا۔

بنگال کی تقسیم کو ختم ہوئے 09 سال ہو رہے تھے کہ اس صوبے کی حکومت نے کچھ بڑے شہروں میں بجلی پہنچانے کے لئے تیل سے چلنے والے پاور ہاؤسز لگانے شروع کر دیئے تھے۔ کومیلا کی چھاؤنی کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا تھا تو چند ماہ قبل ہمارے گھر میں بھی بجلی آ گئی تھی اور ہم نے بلب وغیرہ کے ساتھ ہی ساتھ گھر مین چھت کے پنکھے بھی لگوا لئے تھے۔

میں اکثر بھاوادیوادی ہارا کی کھدائی کے کام سے واپس آتا تھا تو اپنے گھر کے اس کمرے کو جسے ہم نے Study Room یا مطالعہ اور کام کا آفس سا بنایا ہوا تھا وہاں بیٹھ کر اپنے نوٹس اور دوسرے تحقیقاتی کام کرتا رہتا تھا۔ ایسی ہی ایک رات کو کھانے کے بعد میں سر جھکائے کرسی پر بیٹھا بھاوادیوادی ہارا کے ان چھوٹے چھوٹے کمروں اور کوٹھڑیوں کے نقشے بنا رہا تھا جو ایک بڑے سے گول دائرے میں بنے ہوئے ظاہر ہوتے ہی جا رہے تھے اور اب تک کوئی ایسے 70 کمرے ہم دریافت کر چکے تھے۔ ان کی دیواریں نکلتی چلی آ رہی تھیں۔ ایک دروازے کا نشان اور پشت پر ایک چھوٹی 2 فٹ کی کھڑکی بھی سب کمروں میں ظاہر ہوتی آ رہی تھی اور ہمارا یہ خیال اب پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا کہ یہ جگہ طالبعلموں کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہو گی یعنی ان کا ہاسٹل ہو گا۔

ایک لمحے کے لئے نہ جانے کیوں میں نے میز پر پھیلے ہوئے چارٹس (Charts) سے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر کرسی کی پشت پر ٹکایا ہی تھا کہ چھت پر لگا ہوا بجلی کا چلتا ہوا پنکھا خود بخود اس ہک سے نکل کر دھم سے میز پر آ گرا۔ میرے سر اٹھانے اور پنکھے کے گرنے میں شاید سیکنڈ کے بھی 50 ویں حصے کا فرق رہا ہو گا۔ یہ پنکھا اس جگہ گرا جہاں میں سر جھکائے نقشے دیکھ رہا تھا اور ان پر نشان لگا

رہا تھا۔ نقشے بھی پھٹ گئے اور اگر میرا سر وہاں سے نہ ہٹتا تو میرا سر پھٹتا تو کیا چورا چورا ہو جاتا کیونکہ یہ پنکھا بہت بھاری بھی تھا اور اس کے پر (Blades) بھی 3/4 فٹ لمبے تھے۔

جیسا کہ میرے ساتھ ڈھاکہ سے اب تک ہوتا آ رہا تھا تو میں اسی کی روشنی میں سمجھ چکا تھا کہ میرے دشمن اب بہت زیادہ متحرک ہوتے جا رہے ہیں۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کیا بھاوا دیوا وی ہارا کے کھنڈر کا کوئی تعلق اس مہم سے تو نہیں ہے جو اب تک کی میری تمام مسافرت کی وجہ بنی رہی ہے۔ مگر اب تک تو بھاوا دیوا وی ہارا کی اس قدیم تباہ شدہ بستی سے علاوہ اینٹوں، پتھروں اور سکوں کے اور کچھ بھی برآمد نہ ہوا تھا۔

جولی کے والد بریگیڈیئر جنرل اینگریو پٹمین (Bregadier General Angrew Pittman) جن کی پوسٹنگ بھی آج کل کومیلا ہی میں تھی۔ ان کو کسی ذاتی کام سے ڈھاکہ جانا تھا۔ اُن کی بیوی بھی ان کے ساتھ جا رہی تھیں۔ جولی نے مجھے بتایا کہ اس کی امی اور ابو دونوں نے انہیں بھی مدعو کیا ہے۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو تین دن کے لئے ان کے ساتھ ڈھاکہ چلیں۔ میں اور جولی اب تک کومیلا سے ہی کہیں باہر نہیں نکلے تھے کہ ہمارا تو ہنی مون بھی عراق کے اسی شہر میں گزر گیا تھا یعنی بغداد میں اور ہم لوگ کہیں بھی نہیں جا سکے تھے۔ سو ہم لوگ بھی ان کے ساتھ تین دن کے لئے ڈھاکہ روانہ ہو گئے۔

فوجیوں کو ویسے ہی بندوقوں سے فائر کرنے کی بہت عادت ہوتی ہے اور شوق بھی۔ تو ان کے ایک دوست نے ڈھاکہ سے چٹاگانگ کی طرف 40 میل دور لال مائی کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک جگہ شکار پر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ ہم لوگوں کو صبح جا کر شام میں واپس آ جانا تھا۔ 8/10 افسروں کی یہ پارٹی تھی جس میں مرد و خواتین سب ہی شامل تھے اور ہم ان پہاڑیوں اور جنگلات کی طرف نکل گئے۔

دوپہر 12 بجے تک ہماری پارٹی نے 6/7 ہرن شکار کر لئے تھے اور کچھ آبی پرندے یعنی مرغابیاں بھی مار لی تھیں۔ ہر شخص الگ الگ ہو کر اپنا شکار کھیل رہا تھا۔ جولی اور ہمارا بیٹا ولسن اور جولی کی ماں اپنے خیموں میں تھیں جنہیں ہمارے ملازمین نے پہلے ہی ایک پر فضا مقام پر نصب کر دیا تھا اور یہیں پر ہم لوگوں کا کھانا بھی تیار ہو رہا تھا۔

بڑے گھنے درختوں کے جھنڈ میں دور سے مجھے بالکل اپنے سامنے ایک بڑا سا ہرن نظر آیا۔ میں نے نشانہ باندھ کر فائر کرنا ہی چاہا تھا کہ مجھے اپنے بالکل پیچھے خشک پتوں کے چڑچڑانے کی آواز آئی۔ مجھے یوں لگا کہ کوئی دبے پاؤں بالکل میرے عقب میں آ رہا ہے۔ ایک خوف اور ایک

انجانی سی جبلت (Instinct) کے اثر میں بالکل غیر ارادی طور پر اس Urge سے جیسے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھ سے بمشکل پانچ فٹ کے فاصلے پر ایک سیاہ لکیروں والا بنگالی ٹائیگر نظر آ گیا جو مجھ پر حملے کے لئے چھلانگ لگانے ہی والا تھا۔ وہی فائر جو میں ہرن پر کرنے والا تھا میں نے پلک جھپکتے ہی ٹائیگر پر کر ڈالا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے میگزین سے دوسرا فائر کرتا وہ پلٹ گیا۔ گولی اس کے اگلے دائیں کندھے پر لگی تھی جس سے میں نے خون نکلتے دیکھا۔ میں نے دوسرا اور پھر تیسرا فائر بھی کیا مگر وہ جس بجلی کی تیزی سے بھاگ رہا تھا اسے کوئی اور گولی نہیں لگی۔ قسمت نے آج مجھے پھر بچا لیا تھا۔

میں واپس اپنے خیمے تک آیا اور میں نے ان لوگوں کو اپنا قصہ سنایا تو یہ سب لوگ میرے ساتھ ساتھ اس جگہ تک پہنچے۔ وہاں خون بھی تھا۔ اسی خون اور اسی چیتے کے پاؤں کے نشانات دیکھتے ہوئے وہ ذرا آگے تک گئے مگر آگے ایک چھوٹے سے دریا تک پہنچ کر یہ نشان ختم ہو گئے تھے یعنی شاید وہ جانور اسی زخمی حالت میں اس بہتے پانی کی شاخ (Stream) پار کر گیا تھا۔ پنکھے کے گرنے کے بعد گویا 15 ہی دن میں مجھ پر یہ دوسرا حملہ تھا۔

تیئیسواں باب

سیسے کی نو تختیاں

ڈھاکہ پہنچ کر جب میں نے یہ واقعہ روسی کو سنایا تو وہ ایکدم مجرم سا بن گیا اور کہنے لگا:

''میں نہیں چاہتا کہ آپ اکیلے ڈھاکہ جائیں۔ میں خود آپ کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر پھر یہی سوچ کر خاموش ہو گیا کہ یہ آپ کی فیملی کا بالکل ہی نجی سا دورہ ہے اور اس میں میری شرکت ایک مداخلت کے سوا کچھ نہ ہو گی''۔

بھاوادیواوی ہارا کی کھدائی زور و شور سے جاری تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں جون کے مون سون سے پہلے یہ کام ختم کر لینا چاہئے کیونکہ اس کے بعد تو بارشیں ہی بارشیں ہوں گی۔ اسی لئے اب یہاں دن رات 300 مزدور کام کر رہے تھے اور نئی نئی کوٹھڑیاں نکلتی چلی آ رہی تھیں۔ تیس لڑکے اور مختلف عمروں کے لوگ ان چھلنیوں سے کوڑا کرکٹ اور مٹی سے بھرے ہوئے ٹوکروں کے اندر لائی ہوئی اشیاء کو نکال نکال کر الگ الگ رکھتے جاتے تھے۔ مزدوروں میں سے کچھ وہاں ٹوتھ پیسٹ جیسے ہلکے ریشوں والے برش لے کر زمین کو بڑی احتیاط کے ساتھ صاف کرتے جاتے تھے کہ کسی معمولی سے معمولی مٹی، کانچ کے ٹکڑے یا برتن وغیرہ کو بھی کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ ہم نے ایسے برشوں سے صاف کی ہوئی مٹی کو بھی اٹھانے کے لئے یہاں سے مقامی ناریل کے درختوں کی شاخوں سے نرم تنکوں کی چھوٹی چھوٹی جھاڑوئیں بنا کر ان کو دی تھیں کہ بہت ہلکے ہاتھوں سے وہاں کی صفائی کرتے رہا کریں۔

24 اپریل 1920ء کا دن ہمارے لئے بہت تاریخی دن تھا۔ اس دن صبح ہی سے آسمان پر بادل آنا شروع ہو گئے تھے اور ہم نے تمام مزدوروں کو برساتیاں اور چھتریاں بھی پہلے ہی سے دے دی تھیں۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر مون سون کی بارشیں ہمیں 15 دن اور دے گئیں تو ہم یہاں 100 کمروں کی باقیات کو نکالنے کا کام ختم کر کے آئندہ بارشوں کے تین ماہ کے لئے کام

ملتوی کر دیں گے۔

اب روسی ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا بلکہ اگر اس کا بس چل سکتا تو شاید وہ مجھے راتوں کو جولی کے ساتھ بھی اکیلا نہ چھوڑا کرتا۔

اب تو ہم نے اس گول سے دائرے میں بنے ہوئے تقریباً 99 گھر برآمد کر لئے تھے اور اکثر کی 5/6 فٹ کی اونچی دیواریں بھی ظاہر کر لی تھیں۔ یہ عمارت اپنی گولائی میں آگے ہی آگے چل رہی تھی۔ اس گول عمارت یا اُس نیم دائرے کے اندر کی اگلی ڈھیری جو ٹیلے کی شکل میں تھی، ہمارا اگلا ہدف ہونے والی تھی۔ یہ ڈھیری مستطیل سی تھی یعنی کوئی 450 فٹ لمبی اور 30 فٹ چوڑی۔ مگر اس عمارت میں کوئی 25 کے قریب کمرے بھی تھے۔

ہم جس بڑے گول ہوسٹل نما دائرے کی کھدائی کر رہے تھے تو ہمیں شاید کل 115 کمرے تھے یعنی اگلے سیزن کے لئے کھدائی کے تقریباً 15 کمرے اور بھی بچے تھے اور پھر وہ سامنے والی گول عمارت آ جاتی تھی۔ 97 نمبر کی کوٹھڑی کے بعد ہی یہاں سے کثرت سے سانپ بھی نکلنے لگے تھے جو پہلے بالکل ہی نہیں ہوئے تھے۔ میں نے اسی احتیاط کے پیش نظر اب زمین اور کھنڈروں میں کام کرنے والوں کو گھٹنوں گھٹنوں تک کے اونچے جوتے بھی پہنوانا شروع کر دیئے تھے اور زہر سے بچاؤ کے انجکشن بھی ساتھ ہی سپروائزر میں تقسیم کر دیئے تھے۔ 99 نمبر کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے ہم کوئی 30 چھوٹے بڑے سانپ مار چکے تھے۔

ابھی 100 ویں کمرے کی کھدائی شروع ہوئی ہی تھی کہ ایک ہندو چوٹی والا آدمی میرے پاس پہنچا۔ یہ پنڈتوں جیسی دھوتی پہنے، کان میں بڑے بڑے بالے ڈالے اور ہرے رنگ کی ایک پگڑی سی سر پر رکھے ہوئے مجھ سے آ کر ملا۔ عام طور پر ہندو گرو یا سادھو وغیرہ صرف گیرُوا یعنی زمینی رنگ کے زنگ جیسے یا گہرے پیلے رنگ کی دھوتی پہنتے ہیں مگر یہ شخص ہرے رنگ کی پگڑی اور اپنے لباس اور وضع قطع سے اُس قسم کے سادھوؤں اور پنڈتوں سے مختلف نظر آتا تھا۔ 20/25 مزدور کوٹھڑی نمبر 100 میں کام شروع کرنے ہی والے تھے کہ یہ اسی صبح یعنی 24 اپریل کو اس کھنڈر میں مجھ سے ملا۔

اس نے کہا:

''تم نے اس پورے وہار (Vihar) کو کھودنا شروع کیا تھا تو ہم نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ مگر اب تم جہاں تک کھدائی کر چکے ہو اسے یہیں روک دو۔ ہماری پرانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ بھاوادیوا میں پرانے وقتوں کی بہت ہی مقدس چیزیں دفن ہیں جن کی ہندو اور بدھ مذہب کے عالموں، جوگی اور سادھو کو حفاظت کرنی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے

یہاں ہمارے پرانے وید، اپنشد یا یا ہمارے دیوتاؤں کے مجسمے اور بت دفن ہوں۔ سواب ہم تمھیں یہاں سے آگے کھدائی کرنے نہیں دیں گے"۔

میں اس قسم کے واقعات اور ایسی مخالفتیں لیونارڈ وولی کے ساتھ اس اُر کی کھنڈر اور سندھ میں مُردوں کے کھنڈر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ سو میں نے اس سے کہا:

"ہمارا خیال ہے کہ اس کمرے کی کھدائی کے بعد ہم 3/4 ماہ کے لئے کھدائی کا کام روک دیں گے اور پھر بارشوں کے بعد ستمبر میں دوبارہ شروع کریں گے۔ اور پھر ہم یہاں کے زمینداروں اور عام مقامی بستی کے لوگوں میں بہت سے انعام واکرام اور پیسے بانٹیں گے کہ انہوں نے ہمارے ان کاموں میں اتنی مدد بھی کی ہے اور ہمت افزائی بھی۔ اور اگر یہاں سے تمہاری کوئی بھی مقدس کتاب یا کوئی خزانہ یا کسی دیوتا کا بت ملا تو وہ بھی تمہیں ہی دے دیں گے۔ سو اس بات پر پریشان نہ ہو"۔

سادھو نے کہا:

"ہماری پوتھیوں (پرانی کتابوں) میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ یہاں کی کسی بھی قیمتی چیز کو نقصان پہنچانے والا یا اس کو چوری کرنے والا عجیب وغریب طریقے سے مار دیا جائے گا اور اس کی تین نسلیں بھی اس بے ادبی کا خمیازہ بھگتیں گی۔ سو یہ ہمارے دھرم کے لئے ہی نہیں بلکہ تمہاری اپنی زندگی کے لئے بھی ضروری ہے کہ سارا کام فوراً روک دو"۔

میں نے نہ کام رکوایا اور نہ ہی اس کی تنبیہ کو سنجیدگی سے لیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ایک تو یہ اِکا دُکا سادھو قسم کے لوگ اور ان کی دھمکیاں کھوکھلی ہی ہوتی ہیں اور پھر کومیلا کی چھاؤنی اتنی قریب ہی تھی کہ دس سے پندرہ منٹ میں ان کی مدد مجھے ہر وقت حاصل ہو سکتی تھی۔ سو میں کام کرتا رہا۔

یہ 100 نمبر کی کوٹھڑی ذرا بڑے سائز کی تھی۔ اس کی گہرائی میں 8 فٹ کی کھدائی ہو چکی تھی کہ ہمارے سینئر فیلڈ سپر وائزر کشن داس نے مجھے آ کر اطلاع دی کہ اس کے فرش کے نیچے بہت سے زندہ سانپوں کے بل نکل رہے ہیں اور ایک بڑا سانپ بھی بار بار پھن نکال کر سامنے آ جاتا ہے۔ جب اس کو مارنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ ایک طرف سے غائب ہو کر دوسری طرف سے نکل آتا ہے۔

داس اور میں دونوں وہاں پہنچے۔ پستول بھرا ہوا تھا اور اونچے اونچے گھٹنوں تک کے موٹے چمڑے کے بوٹ ہم نے بھی اور وہاں موجود سب مزدوروں نے بھی پہن رکھے تھے۔ جیسے ہی میں سیڑھی سے اس کوٹھڑی کے اندر اترا مجھے ایک کونے میں ایک موٹا سا سانپ نظر آ گیا۔ یہ اپنا پھن

نکالے ہوئے زمین سے قریباً ڈیڑھ فٹ اونچا ہو کر ایک جگہ ساکت سا کھڑا تھا۔ میری آہٹ سن کر اس نے اپنا پھن میری طرف موڑ دیا اور اس کی آنکھیں میری آنکھوں پر جم گئیں۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھ پر جادو کیا جا رہا ہو۔ میں اب اپنی آنکھیں کسی اور طرف موڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مقناطیسی کشش تھی جو مجھے سحر زدہ کر چکی تھی۔

میری کمر میں ریڑھ کی ہڈی پر خوف کی ایک کپکپی اور سردی کی ٹھنڈی لہر اٹھ اٹھ کر پورے جسم میں پھیلتی جا رہی تھی۔ قریب تھا کہ بھرا ہوا پستول میرے ہاتھ سے گر جاتا کہ ایک موٹی سی بوند اوپر کھلے آسمان سے میرے ہاتھ پر گری۔ میں سمجھا کہ بارش شروع ہو گئی ہے اور ذرا سا سر اٹھا کر میں نے اوپر دیکھا تو کالے کالے بادلوں میں مجھے ایک بڑا سا سفید پرندہ اڑتا ہوا نظر آیا۔ بارش تو کہیں نہیں تھی مگر اس ایک بوند نے میرے حواس بحال کر دیئے اور پھر جیسے ہی میں اس سحر زدگی سے باہر نکل آیا دیکھا کہ سانپ اب بھی تک وہیں کھڑا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے اس پر دو فائر کھینچ مارے۔ نشانہ اتنے قریب سے لگا تھا کہ غلطی کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ سانپ کی آنکھوں سے جیسے شعلے سے نکلے اور تڑ مڑاتے ہوئے اس کا پھن نیچے گر گیا۔ یہ مر چکا تھا۔

پھن کے علاوہ اس کا سارا جسم مٹی کے نیچے کسی بل میں اندر چھپا ہوا تھا۔ بعد میں جب اس کے منہ پر رسیاں باندھ کر اس کو باہر نکالا گیا تو یہ 8 فٹ سے زیادہ لمبے جسم کا ایک بہت ہی زہریلا سانپ ثابت ہوا۔

کھدائی چلتی رہی اور بہت سے چھوٹے موٹے سانپ بھی مرتے رہے۔ اس وقت تک ہلکی پھلکی بارش بھی شروع ہو چکی تھی مگر کام جاری تھا۔ میں بھی وہیں موقع پر ہی موجود تھا۔ اب چھنیوں اور چھوٹی کھرپیوں کی جو دھمک زمین پر مٹی کھرچنے کی وجہ سے پڑتی جا رہی تھی تو اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ نیچے زمین میں کوئی خلاء ہے۔ اس لئے اب کھدائی اور بھی احتیاط سے کی جا رہی تھی۔

زمین اب 17 فٹ تک کھودی جا چکی تھی کہ کسی مزدور کی کھرپی کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ یہ نہ نرم زمین تھی اور نہ سخت پتھر اور نہ ہی کسی دھات کے ٹکرانے کی آواز۔ کمرے میں 6 فٹ کی چوڑائی اور 3 فٹ کی چوڑائی میں اس کے قریب میں جہاں جہاں کھدائی بڑھتی جا رہی تھی ایک ہی سی آواز آتی تھی۔

میں نے نیچے اتر کر دیکھا تو مجھے یہ آواز لکڑی پر چوٹ لگنے سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آہستہ آہستہ وہاں ایک لکڑی کا بکس سا ظاہر ہونے لگا۔ اس کی چاروں طرف لوہے کی ایک ہلکی چادر کا خول تھا اور صرف اوپر کا حصہ لوہے کے اس غلاف سے آزاد تھا۔ لوہے کے اس بکس کے تین طرف

کنڈے لگے ہوئے تھے۔ انہی کنڈوں میں رسیاں ڈال کر اس بکس کو ہم نے باہر نکالا اور پھر ایک بیل گاڑی میں رکھ کر ہم اسے اس بڑے ہال نما کمرے کی میز تک لے آئے جہاں ہمارے سپروائزر مٹی کی ٹوکریوں سے ٹوٹی پھوٹی اشیاء ڈھونڈ کر جمع کرتے تھے۔

اب بارش بہت تیز ہونے لگی تھی، بادل بھی گرج رہے تھے۔ جب تک ہم اس کوٹھڑی سے اس میز تک آئے تھے بار بار بجلی بھی اتنے ہی قریب سے چمکتی تھی کہ جیسے اب گری اور اب گری۔ میں نے سب مزدوروں کی چھٹی کر دی کہ وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

بکس کو دیکھ کر میرا پہلا خیال یہی تھا کہ آج صبح جس سادھو نے قدیم کتابوں میں لکھے ہوئے جن مقدس کتابوں، بتوں یا تبرکات کا ذکر کیا تھا اس بکس میں اسی قسم کی کوئی چیز ہوگی۔ اب کمرے میں میرے اور روسی کے علاوہ کئی اور نہ تھا۔

کئی سال پہلے جب میں ''موئن جودڑو'' (مُردوں کے کھنڈر) میں کام کر رہا تھا تو میں نے وہاں کے ایک قریبی گاؤں کے رہائشی سے پوچھا تھا کہ:

''تمہیں یہاں آتے ہوئے یا قریب سے گزرتے ہوئے کوئی ڈر تو نہیں لگتا''؟

تو اس نے جواب دیا تھا کہ:

''ڈر تو زندوں سے لگتا ہے مُردوں سے نہیں۔ بس! کبھی کبھی یہاں کے قریب سے گزرتے ہوئے کسی کے چھم چھم چلنے کی آواز آتی رہتی ہے''۔

اور جب یہی بات میں نے بھاوادیوا وی ہارا میں ایک مزدور سے پوچھی تھی جو یہاں کئی ماہ سے کام کر رہا تھا تو اس نے کہا تھا:

''نہیں! ڈر کیسا؟ مگر کبھی کبھی یہاں کسی عورت کے چلنے کی آواز آتی ہے جیسے کہ وہ پیروں میں گھنگرو باندھے اِدھر اُدھر گھوم رہی ہو۔ مگر نظر تو کوئی بھی نہیں آتا''۔

اس وقت جب میں اور روسی اس تیز بارش میں اس ہال کے اندر کھڑے ہوئے اس لکڑی کے بکس کو دیکھ رہے تھے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی چھن چھن کرتا ہوا ابھی پاس سے گزرا ہو۔ مگر یہ آواز روسی نے نہیں سنی تھی کیونکہ جب میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا:

''کیسی آواز''؟

بکس کو کئی ہکس (Hooks) کے ساتھ نہایت سختی کے ساتھ بند کیا گیا تھا۔ اس کے لوہے پر زنگ اور مٹی لگی ہوئی تھی۔ کچھ تو ایک کھرپی سے روسی نے اس مٹی کو صاف کیا اور کچھ میں نے ایک چھوٹی ہتھوڑی اور سخت بالوں والے برش سے اس بکس سے زنگ کو نکالا۔

بکس کا ڈھکنا کھلتے ہی ایک اور چھوٹا لکڑی کا بکس اس بڑے بکس میں رکھا ہوا نظر آیا۔ اس پر بہت سلیقے سے ایک طرف کانسی کی سات پلیٹیں لگی ہوئی تھیں اور دو اور بھی اتنی ہی چھوٹی چھوٹی سیسے کی Plates یا تختیاں بھی برابر میں ذرا سے فاصلے پر رکھی نظر آئیں۔ یہ رکھی نہیں تھیں بلکہ چھوٹی چھوٹی کیلوں سے لکڑی میں گڑی ہوئی تھیں۔

پھر ہم نے اس دوسرے بکس کا ڈھکنا بھی کھول دیا۔ حیرت و استعجاب سے ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس بکس میں ایک 25/30 سال عمر کی سرخ و سفید لڑکی، سرخ چہرے اور کالے بالوں کے ساتھ اندر لیٹی ہوئی تھی۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ ابھی نیند سے جاگے گی اور بات کرنا شروع کر دے گی۔

میں اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ تو یہ ہے وہ ملکہ یوران کی بیٹی۔ سینا شرب کی شہزادی۔ اس باغی اغوا کرنے والے شہزادے دخت رز کی قید جس کو عراق کے شہر بابل کے قریب کی ریاستوں میں سے کسی ریاست کی شکست کی بعد اغوا کیا گیا تھا۔ پھر باپ کا انتقام بیٹی سے لیا گیا۔ یہ قیدی رہی ایک تابعدار کنیز کی طرح مُردوں کے کھنڈرات میں دخت رز کے لئے اس کو رقص بھی کرنا پڑتے تھے۔ پھر اس کی مرضی کے خلاف جب دخت رز نے اس کو اپنی بیوی بنانا چاہا تو وہ اپنے انجام کو پہنچا اور میں کہاں کیمبرج کا طالبعلم، بائرن کے گاؤں کے ایک معمولی کسان کا بیٹا جو اپنے فارم ہاؤس سے کس طرح اس ساحرہ جامش تک پہنچا اور پھر کیسے مصر میں پانچ سال اہراموں کے اردگرد کہاں کہاں کی خاک چھانتا رہا اور پھر عراق میں جولی سے شادی اور برطانوی ہندوستان میں مُردوں کے کھنڈر کی کھدائی کے لئے دہلی اور پھر یہ دریاؤں کی سرزمین بنگال اور یہ ''بینامتی''؟

میں نہ جانے کب تک یونہی سحر زدہ سا ہو کر اس صندوق میں پڑے جسم کو اور اس لاش کو ہی تکتا رہتا کہ روسی نے مجھے متوجہ کرتے ہوئے اس خواب سے بیدار کیا:

''جان! یہاں بہت سی ماورائی طاقتوں کا حصار ہے۔ ہم دونوں ابھی تک بہت سے خطروں میں ہیں۔ اس جگہ سے ان کھنڈروں سے نکلو۔ کہیں یہ سب کچھ ضائع نہ ہو جائے''۔

ہم دونوں نے اس چھوٹے اور بڑے دونوں صندوقوں کو دوبارہ سے بند کر دیا۔

روسی نے مجھے مشورہ دیا کہ:

''اس اندرونی صندوق پر جو سیسے کی سات ایک طرف اور دو دوسری طرف تختیاں لگی ہوئی ہیں ان کو کسی طرح نکال کر پڑھنے کی کوشش کی جائے اور اس صندوق کو کسی جگہ نہایت احتیاط کے ساتھ رکھ دیا جائے''۔

چند دن کے بعد ہی ایک بدھ مذہب کا سادھو (بھکشو) گیرو رنگ کی چادر اوڑھے ہمارے پاس ایک پگوڈا میں موجود تھا۔ ہم نے صندوق سے جو تختیاں نکالی تھیں ان کو ہم کئی مقامی لوگوں کو جو قدیم سنسکرت کے ماہرین میں سے تھے دکھا چکے تھے مگر کسی کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ تا تھا کہ ان پر کیا لکھا ہوا ہے؟ لیکن اس قدیم صندوق کو ہم نے ایک مقامی ہسپتال کے مردہ خانے میں رکھوا دیا تھا اور تین لوگ باری باری اس کی حفاظت کے لئے آٹھ آٹھ گھنٹے کی مستقل ڈیوٹی پر ہسپتال ہی میں تعینات کر دیئے گئے تھے۔

پگوڈا والا بدھ بھکشوان سات تختیوں کو تو بالکل بھی نہ پڑھ سکا مگر جو دوسری دو سیسے ہی کی تختیاں (Plates) تھیں ان کے متعلق اس نے کہا کہ:

''یہ بدھ ہی کے دور کی پرانی پالی زبان کے حروف ہیں اور وہ ایک ایسے بوڑھے بدھ راہب کو جانتا ہے جس کے پاس اس زبان کی پرانی کتابیں موجود ہیں۔ وہ ان کو ضرور پڑھ سکے گا۔ چنانچہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے یہ تحریر یوں پڑھی:

''____ یہ تحریر مہاتما گوتم بدھ شہزادہ سدھارتھ شاکیہ منی کے سورگ باشی ہونے کے 20 سال کے بعد لکھی جا رہی ہے (یعنی بدھ کا زمانہ عمر 538 ق م سے 80 سال تک ہے۔ جب اس کی وفات ہوئی یعنی 448 ق م کے 20 سال کے بعد 428 ق م میں یہ تختی لکھی گئی تھی)۔ یہ شہزادی یہاں لال مائی کے نام سے مشہور تھی اور بدھ مذہب کے عالموں، راہبوں اور دھرم کے بڑے بڑے بدھی بزرگوں کی سرپرستی میں رہتی تھی۔ ان کی دعاؤں اور منتروں سے موت کے بعد بھی ڈھائی ہزار سال تک اس کا جسم بوسیدہ نہیں ہوگا۔ جو کوئی بھی اس صندوق یا اس شہزادی کو یہاں سے لے جانے کی کوشش کرے گا اس کے جسم کے کسی حصے سے خود بخود خون بہے گا اور اس کی موت واقع ہو جائے گی اور اس کی تین نسلوں کو بھی یہی عذاب دیا جائے گا____''۔

یہ تحریر پڑھے جانے کے بعد میں نے روسی سے یہ عہد لے لیا تھا کہ:

''وہ اس تحریر کا متن کبھی بھی کسی کو بھی نہیں بتائے گا اور جولی اور ولسن کو بھی اس کا کوئی پتہ نہیں چلنے دے گا۔ ورنہ تو وہ اس المناک پیشنگوئی سے ویسے ہی نیم مُردہ ہو جائیں گے''۔

سیسے کی باقی سات تختیوں کے لئے ہم نے یہ کیا کہ سادے کاغذ پر کوئلے کی سیاہی کو انگوٹھوں پر مل مل کر اس کے کندہ کیئے ہوئے الفاظ کو اس سادہ سفید کاغذ پر اتار لیا اور اس تحریر کو سر جارج وولی کے پاس عراق بھیج دیا کہ شاید وہ اس تحریر کو پڑھ کر اس کا مطلب واضح کر سکیں۔ کیوں کہ انہوں نے

سارگان دوم اور سیناشرب کے محلات سے برآمد ہونے والے مٹی کے کتبوں کی تحریریں بھی پڑھ لی تھیں۔ چھ ماہ بعد ان کا جواب بھی مل گیا۔

سر جان وولی خود ان دنوں اپنے کسی علاج کے لئے لمبی چھٹی پر برطانیہ گئے ہوئے تھے اور ان کے کسی نائب نے ہمارے خط کا جواب بھیجا تھا۔ اس خط کے مندرجات یہ تھے:

''۔۔۔ یہ زبان مکمل طور پر بابلی تہذیب کی نہیں ہے بلکہ مصر کے فراعین کے زمانے کی تصویری حروف کے ساتھ ہے۔ یہ کچھ طلسماتی (غالباً) لکیروں اور الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس تحریر میں صرف سیناشرب کا نام بار بار آتا ہے اور اشتر دیوی کے مندر کا لفظ بھی دو جگہ استعمال ہوا ہے ۔۔۔''۔

بعد میں اسی نائب نے یہ بھی لکھا تھا کہ:

''۔۔۔ بابل کے کھنڈرات سے اشتر دیوی کا ایک بڑا مندر بھی دریافت ہو چکا ہے جس سے سیناشرب کا تعلق جوڑا جا سکتا ہے کیونکہ یہ مندر سیناشرب ہی نے بنوایا تھا ۔۔۔''۔

اس صندوق کے دریافت ہونے کے ایک سال بعد تک میں نے بھاوادیوا وی ہارا کی کھدائی کا کام جاری رکھا۔ میں نے اپنی تمام کارگزاری کی اور کھدائیوں کی تمام تفصیلات تو ہر ماہ باقاعدہ طور سے جان مارشل کو بھیجنا شروع کر دی تھیں مگر اس صندوق یا ان تحریروں کا کبھی کوئی تذکرہ کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔ نہ جولی سے نہ جان مارشل سے۔

مجھے کومیلا میں تعینات ہوئے 2 سال ہونے کو آ رہے تھے اور اس صندوق کو دریافت ہوئے بھی ایک سال گزر چکا تھا۔ جب سے بغداد سے جارج وولی کا خط میرے پاس پہنچا تھا تو میں نے تب ہی سے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ مجھے اس حنوط شدہ حسین لاش کو لے کر بابل کے کھنڈرات میں سیناشرب کے بتائے ہوئے اشتر دیوی کے مندر میں لے جانا چاہئے۔

جنوری 1922ء ہی کے سن ہی سے ہمارے بیٹے ولسن کی طبیعت خراب ہونی شروع ہوئی تھی اور اسے مستقل بخار رہنے لگا تھا۔ جولی کی تمام توجہ اور تمام دواؤں کے باوجود وہ ٹھیک ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ایک دن جولی کے والد اینگر یوٹمین ولسن کی عیادت کے لئے ہمارے گھر آئے۔ جولی بہت پریشان رہتی تھی۔ وہ اپنے باپ اور ماں کے گلے لگ کر بہت روئی تو ان دونوں ماں باپ نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ:

''میں اسے لے کر برطانیہ چلا جاؤں اور وہاں اس کا مکمل چیک اپ اور علاج کرواؤں''۔

میں نے یہ بات مان لی مگر میرے اور جولی کے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ میں اور وہ ساتھ

ساتھ بصرہ تک ایک ہی جہاز میں جائیں گے جہاں میں دو ہفتے کے لئے بغداد میں رکوں گا اور وہ اسی جہاز میں سیدھے لندن یا برمنگھم پہنچ کر ہمارے ہارلے والے مکان میں رکے گی۔ جہاں میرے ماں باپ بھی اس کے منتظر ہیں اور میں دو ہفتے قیام کے بعد ان سب سے آملوں گا اور پھر تین ماہ تک ان کے ساتھ ہی وہیں برمنگھم میں رکوں گا۔

چھٹی کی درخواست منظور ہوتے ہی ہم لوگ بمعہ روسی کے ڈھاکہ اور پھر دہلی اور پھر بمبئی پہنچ گئے۔صندوق کے بارے میں، میں نے جولی کو بتادیا تھا کہ:

''وہ روسی کا ہے اور اس نے کسی قدیم مندر سے بطور سونیئر (Souvenir) خریدا ہے''۔

جب ہم کومیلا کے اپنے گھر سے نکلے تھے تو میرا یہی خیال تھا کہ تین ماہ بعد میں پھر اسی گھر واپس آجاؤں گا۔لیکن جولی کا کہنا تھا کہ:

''ہمیں اپنے بیٹے ولسن میلکم کی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے لئے چند سال برطانیہ ہی میں رکنا چاہئے''۔

بصرہ کی بندرگاہ پر میں اور روسی اتر گئے اور جولی اور ولسن آگے لندن کے لئے روانہ ہوگئے۔ بغداد میں جارج وولی تو موجود نہ تھے مگر ہم نے صندوق کی تختیاں نکال کران کے نائب کو ان تختیوں کا معائنہ کرایا۔مگر وہ پھر بھی ہماری کوئی مدد نہیں کر سکے۔ہاں!البتہ ہمیں بابل کے کھنڈرات میں اشتر دیوی کے مندر کی نشاندہی کرتے ہوئے ہمیں وہاں تک ضرور پہنچادیا۔

اس رات میں نے دوالگ الگ خواب دیکھے۔

ایک خواب میں، میں نے دیکھا کہ دور دور تک لاشیں بکھری ہوئی ہیں اور جہاں تک نظر کام کرتی ہے صرف آگ ہی آگ پھیلی ہوئی ہے۔خاک اور خون میں لتھڑے ہوئے جابجا انسانی اعضاء بکھرے پڑے ہیں اور آسمان سے بار بار تڑاخنے کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔گرج اور چنگھاڑ سے کانوں کے پردے پھٹے جارہے ہیں۔لیکن ان سب کے باوجود آسمان پر دور بہت دور بہت ہی دور سے ایک بہت ہی ہلکی سبز رنگ کی روشنی کی باریک سی کرن کی لکیر بھی ابھر رہی ہے۔

میں نے دوسرا خواب بھی اسی رات میں ہی دیکھا۔دور ایک اونچا سا پہاڑ ہے جس کی اونچائی ایسی ہے کہ اس پر بادل چھائے ہوئے ہیں اور ان بادلوں کی وجہ سے اس کی اونچائی کا پتہ نہیں چلتا۔میرے ایک ہاتھ میں تین انگلیوں کی صرف ہڈیاں ہیں جن کو میں نے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے اور دوسرے ہاتھ میں ایک پیکٹ سا ہے جس میں سیسے کی تختیاں ہیں اور میں اس پہاڑ پر چڑھنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہوں۔

اب جو میں اپنے اس ہاتھ کی طرف نظر ڈالتا ہوں جس میں، میں نے تین انگلیوں کی ہڈیوں کو پکڑے ہوئے ہوں تو مجھے اپنی ہر انگلی سے خون ٹپکتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ میری انگلیوں سے خون بہنا بند ہو جائے مگر اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

عراق میں ان دنوں اتنی جگہوں پر ماہرین آثار قدیمہ عربی بستیوں کے آثار کھود کھود کر مختلف چیزیں برآمد کر رہے تھے کہ کسی قدیم چیز کو کہیں لاتے لے جاتے دیکھ کر کوئی پلٹ کر بھی نہ دیکھتا تھا کہ کیا چیز لی جائی جا رہی ہے۔ سو یہی ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ روسی اور میں اس صندوق کو لے کر جب ایک شام کو اشتر دیوی کے کھنڈرات تک پہنچے تو نہ تو گھوڑا گاڑی والے نے (جس میں بیٹھ کر ہم یہاں تک آئے تھے) ہم سے پوچھا کہ اس صندوق میں کیا ہے اور نہ ہی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ہم اس بکس کو اس کھنڈر میں کیوں لائے ہیں؟

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بکس کو ہم اس کھنڈر میں کہاں رکھیں۔ کبھی میں بکس کے پاس رک جاتا تو روسی دور دور تک اس مُردہ بستی کا چکر لگا کر آتا کہ کہیں کوئی مناسب جگہ ملے تو اس بکس کو وہیں چھوڑ کر آئیں اور کبھی روسی اس صندوق کی پاس رکتا اور میں ایک ایک کونا کدرا دیکھنے جاتا تھا۔ مگر کوئی مناسب جگہ نہ ملنی تھی نہ ملی اور نہ ہی ہمیں سیناشرب کی قبر وغیرہ کا کوئی نشان نظر آیا۔

اب رات سر پر آ گئی تھی۔ اس سنسان سے ویرانے میں یہاں کسی اور کا نام ونشان تک نہ تھا۔ یکا یک میں نے اپنے بہت قریب ہی چھن چھن کی سی آواز سنی۔ جیسے کوئی پاؤں میں گھنگرو یا پازیب پہنے ہوئے ہولے ہولے چل رہا ہو۔ یہ آواز شاید روسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی کیوں کہ اس کی چہرے پر کسی بھی قسم کا کوئی بھی تاثر نہ تھا اور بس ایک سپاٹ سا وہی چہرہ جو اس کے چہرے کی ایک مخصوص وضع قطع تھی وہی اب بھی نظر آتی تھی۔

پھر وہی آواز میرے قریب سے گزری اور پھر تیسری بار بھی جیسے وہی آواز کچھ آگے تک گئی اور پلٹ کر پھر مجھ تک آئی تو مجھے یوں لگا جیسے یہ گھنگروؤں کی چاپ مجھے کوئی راہ دکھا رہی ہے۔ سو میں نے روسی سے کہا کہ:

''میرے ساتھ اس صندوق کو اٹھاؤ اور چلو!''۔

اس نے پوچھا: ''جان! مگر کدھر''؟

میں نے کہا: ''مجھے کچھ نہیں معلوم مگر آگے بڑھو''۔

یہ گھنگروؤں کی آوازیں ہمیں لے کر آگے چلتی رہیں۔ ہم اس کھنڈر سے کافی دور نکل آئے۔ ایک جگہ یہ آوازیں رک گئیں تو ہم نے بھی اس تابوت یا صندوق کو زمین پر اتار کر نیچے رکھ دیا۔ ذرا

سے فاصلے پر ہمیں کچی اینٹوں کا ایک ڈھیر نظر آیا، جہاں ترتیب سے کچھ اینٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے جو آگے بڑھ کر نظر ڈالی تو 7 فٹ کے قریب کا ایک گڑھا کھدا ہوا نظر آیا۔ جیسے کسی نے کھود کر بیچ ہی میں چھوڑ دیا ہو۔

میں اب اپنے ادراک یا اپنی چھٹی حس (Intuition) ہی کو اپنا رہبر بنا چکا تھا۔ میں نے روسی سے کہا:

''یہی سیناشرب کی قبر ہے اور یہیں ہمیں اس صندوق کو دفن کرنا ہے''۔

اس صندوق کو زمین پر اتار کر میں نے ایک مرتبہ آخری بار اس کا ڈھکنا پھر کھولا۔ وہی رنگت، وہی خوابیدہ سی بند آنکھیں، وہی سیاہ بال۔ یہ شہزادی واقعی بہت سرخ و سفید رنگت والی ایک حسین لڑکی رہی ہوگی۔ اس لاش کے برابر رکھی ہوئی مجھے تین انگلیوں کی ہڈیاں بھی نظر آئیں تو میں نے نجانے کس جذبے کے تحت وہ تینوں ہڈیاں اٹھالیں اور سیسے کی 9 تختیاں تو ہم پہلے ہی نکال چکے تھے۔ جن کو ہم نے وولی کے نائب کے پاس لے جا کر اس کی عبارت کو پڑھوانے کی کوشش کی تھی۔

اس قبر نما گڑھے میں جب میں صندوق کو رکھنے کے لئے اترا تو میں نے دیکھا کہ اس گہرے اور چوڑے گڑھے میں ایک طرف ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بھی پڑا ہوا تھا۔ جو اوپر سے پہلے مجھے نظر ہی نہیں آیا تھا۔ کیا پتہ یہی وہ سیناشرب تھا جس نے بابل کو فتح کر کے اس پر دجلہ کا بند توڑ دیا تھا اور پھر اسی بابل کو پایہ تخت بنا کر اسے از سر نو تعمیر کرایا تھا۔

صندوق کو اس گڑھے میں اتار کر ہم نے اسے مٹی سے بھر دیا اور وہی کچی اینٹیں جو ایک طرف ترتیب سے رکھی ہوئی ملی تھیں اس مٹی کے ڈھیر پر سلیقے سے لگا دیں۔ ماتھے پر تین ستاروں والے اور گھٹنوں سے لمبے ہاتھ رکھنے والے نجات دہندہ کا کام ختم ہو چکا تھا اور سیسے کی تختیوں یا ہاتھ کی تین انگلیوں کی ہڈیوں کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور ثبوت نہ تھا کہ میں نے کسی ''ینامتی'' کے لئے کبھی بیس سال کی کوئی مہم انجام بھی دی تھی۔

اس دن کے بعد سے جتنے دن میں بغداد میں رہا ہر وقت مجھے بس ایک ہی خیال ستاتا رہتا تھا کہ جو وارننگ مجھے سر جان مارشل کے روحوں والے واقعے میں ملی تھی کہ:

''میرے 40 قدم آگے بڑھے رہنے کی وجہ سے میری عمر صرف 40 سال ہی کی ہوگی اور پھر اسی تنبیہ کا اعادہ کومیلا کے ''ینامتی'' کے کھنڈرات میں بھی ہو گیا تھا بلکہ مجھے تو یہ تک بتا دیا گیا تھا کہ میرے جسم کے کسی بھی حصے سے اچانک خون بہنا شروع ہو جائے گا اور شاید وہی میری موت کا سبب بھی بنے گا''۔

تو جب بھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ خیر میں نے جو کچھ کیا سو کیا مگر میری آئندہ آنے والی دو اور نسلیں میری ان معرکہ آرائیوں کی سزا کیوں بھگتیں گی؟ تو اس کا جواب اور اس کا تدارک میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ نہ اب یوران کا رومال میرے پاس تھا جو میں اپنے بیٹے ولسن کو اور اس کے بعد کی نسلوں تک پہنچا سکتا تھا اور نہ ہی اس گول سی جامش کی دی ہوئی ہڈی پر اب کوئی منظر ابھرتا تھا۔ کئی سالوں سے وہ بے نام سی چیز میرے پاس یونہی پڑی تھی۔

بلکہ جس رات کو میں نے اور روسی نے ''مینا متی'' کے صندوق کو اشتر دیوی کے مندر سے ذرا دور دفن کیا تھا تو اسی دن سے ہی میں نے اس ہڈی کو اپنے بازو پر باندھنا چھوڑ دیا تھا۔ لندن کے سفر کے لئے ہم دونوں بصرہ آ گئے تھے۔ ہماری سیٹیں بک ہو چکی تھیں اور ایک دن بعد ہمارا جہاز بصرے سے واپس خلیج فارس ہوتا ہوا سوئز کینال کے ذریعے جبرالٹر تک اور وہاں سے لندن کا سفر طے کرنے والا تھا۔

بغداد میں، میں عراق سے جولی کے لئے کوئی تحفہ خریدنے کے لئے بازاری کی طرف نکلا تھا کہ میری ملاقات طیّار سے ہوگئی۔ یہ ملاقات بھی اچانک ہی ہوئی تھی۔ اسی نے مجھے پہچانا اور بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ یہی وہی شخص تھا جو ہمیں کئی سال پہلے بغداد سے کربلا لے کر گیا تھا۔ اس سے بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ جنگ عظیم پر بھی اور اب فرانس اور برطانیہ نے جس طرح سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر کے اسے شام، عراق، اردن وغیرہ میں بانٹ دیا تھا اس پر بھی بات ہوئی۔ اس کو بہت افسوس تھا کہ مسلمانوں کی ایک قدیم سلطنت کو جو مشرق وسطیٰ کے تمام مسلمانوں کو متحد رکھے ہوئے تھی برطانیہ اور فرانس نے آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔

پھر ہمارے پچھلے دنوں کے تذکرے نکل آئے اور میں نے اس سے نقش سلیمانی اور کربلا کے حسین کے روضے پر پہنچانے پر بھی اس کا شکریہ ادا کیا۔ تب اس نے مجھ سے ایک عجیب بات کہی۔ اس نے کہا کہ:

''جان میلکم! ہم ہر سال تو کربلا میں حسین کے روضے پر ایک بار ضرور جاتے ہیں۔ مگر جب بھی ہمیں کوئی مشکل آ پڑتی ہے اور ہمیں اپنی اولاد یا گھر والوں کی طرف سے کوئی فکر لاحق ہوتی ہے تو بھی ہم کربلا کا رخ کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام ہے کہ حسین کی قبر کی اوپر جو گنبد بنا ہوا ہے اس کے نیچے کھڑے ہو کر جو کوئی بھی جب کبھی خیر اور نیک دعا مانگی جاتی ہے وہ کبھی رَد نہیں ہوتی اور ہماری دعائیں تو ہمیشہ اسی طرح قبول ہو جاتی ہیں''۔

مجھے ایکدم خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی اس کے ساتھ کربلا چلا جاؤں اور وہاں جا کر اپنی اور ولسن کی اور بعد میں اپنی نسلوں کی زندگی کی دعا مانگ لوں۔ شاید اسی بہانے ہم پر آتی ہوئی یہ نحوست اور یہ سزائیں سر سے ٹل جائیں۔ مگر وقت بہت کم رہ گیا تھا اور کل صبح ہمارا جہاز روانہ ہونے والا تھا اور اونٹوں پر ہمارا سفر کسی بھی طرح ہمیں یہاں بغداد سے کربلا اور پھر کربلا سے واپس بصرہ تک وقت پر نہیں پہنچا سکتا تھا۔ مگر میرے دل میں نجانے یہ خیال کیوں پختہ ہوتا چلا گیا کہ اگر میری یہ تحریریں اور میرے یہ نوٹس جو میں لکھتا چلا آیا ہوں میری نسل کے کسی فرد کے ہاتھ لگ جائیں اور وہ ان کو پڑھ لے تو اسے ضرور یہاں آ کر کربلا میں حسین کے روضے پر اپنی سلامتی کی دعائیں لازمی طور پر مانگنی چاہئیں۔ اس خواہش کو بھی میں اپنی Intuition اور چھٹی حس کا حصہ سمجھتا ہوں۔

بغداد میں ہی آ کر مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ لیونارڈ وولی اور جان مارشل نے میرا نام تاج برطانیہ کو اس سفارش کے ساتھ بھیجا ہے کہ میرے کارناموں کے پیش نظر مجھے نائٹ ہڈ (Knight Hood) عطا کیا جائے۔ یعنی مجھے سرکاری خطاب عنایت کیا جائے۔

جب ہم بصرہ سے نکل کر خلیج فارس ہوتے ہوئے سوئز کینال پار کر کے بحر روم کی طرف نکل رہے تھے تو اس دن میں اور روسی جہاز کے ڈیک پر ہی چہل قدمی کر رہے تھے۔ ہم لوگ جہاز کی ریلنگ تک جاتے اور پھر باتیں کرتے ہوئے واپس لوٹ آتے۔ میرے ساتھ چلتے چلتے جیسے ہی ہم جہاز کے اس آخری جنگلے کے پاس پہنچے تو روسی کا پیر اچانک پھسلا اور جہاز بھی اس وقت ہچکولے (Tossing) کھا رہا تھا۔ سمندر بھی تھوڑا رف تھا مگر خطرناک حد تک نہیں۔ روسی گر کر اور آگے کی طرف پھسل گیا اور ایک چھوٹے سے ہچکولے نے جہاز کو ذرا سا ترچھا کیا ہی تھا کہ روسی میرے سامنے ایک ہی جھٹکے میں سمندر میں جا گرا۔ جنگلے کے اندر ایک سے ڈیڑھ فٹ کی چوڑائی کی جالیاں بنی ہوئی تھیں اور عین اسی جگہ سے روسی نیچے گہرائیوں میں گر گیا تھا۔ جہاز کے پنکھوں کے شور اور انجن کے چلنے کی آوازوں نے اس حادثے کا کسی کو پتہ ہی نہیں چلنے دیا۔

روسی اور میں شاید دس سال کی عمر سے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ بائرن کے اسکول سے مصر کی سیاحت اور پھر عراق اور آخر میں کومیلا تک وہ ہر وقت میرے ساتھ رہا تھا۔ وہ میرا دوست ہی نہ تھا بلکہ میرا محافظ بھی تھا اور آج میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسے ہمیشہ کے لئے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

لندن پہنچ کر معلوم ہوا کہ ولسن کی طبعیت اب کافی حد تک سنبھل چکی ہے اور اس کا بخار بھی اتر چکا ہے۔ میں نے 19 سال کے بعد اپنے ماں باپ کو دوبارہ دیکھا تھا۔ دونوں کافی ضعیف ہو چکے

تھے اور دونوں ہی زیادہ بیمار رہتے تھے۔ بائرن کے فارم ہاؤس کو بیچ کر میرے والد نے لندن ہی میں 37 ہارلے اسٹریٹ پر ایک مکان لے لیا تھا اور اپنا بچا کھچا سارا سرمایہ بینک آف انگلینڈ میں جمع کرا دیا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد سے یہاں مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے اور آج کل لندن میں بھی بے روزگاری بہت زیادہ ہے۔

میری چھٹیاں ختم ہونے میں ابھی چند دن باقی تھے کہ میرے والد ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے اچانک انتقال کر گئے۔ اب میں سخت شش و پنج میں تھا کہ اپنی ماں کے پاس لندن ہی میں رکوں یا واپس کومیلا جا کر اپنے عہدے کا چارج دوبارہ سنبھال لوں۔ جولی نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ:

''میں چھ ماہ بغیر کسی تنخواہ کے چھٹی کے لئے درخواست دے دوں تو مجھے گھر کے معاملات کو دیکھنے اور ماں کے پاس بھی رہنے کا وقت مل جائے گا''۔

یہ نومبر 1922ء کا سال چل رہا ہے اور اگلے سال 18 اپریل 1923 کو میری عمر 40 سال ہو جائے گی۔ میرا بیٹا ولسن میلکم بھی اب 14 برس کا ہے اور وہ اگلے سال تک کیمبرج سے جونیئر کیمبرج کا امتحان دینے کے قابل ہو جائے گا۔ میں نے چھ ماہ کی چھٹی کی درخواست یہیں برطانوی ہند کے معاملات کے وزیر کے دفتر میں بھجوا دی ہے۔ جو یہیں سے دہلی بھجوائی جائے گی۔ دیکھئے کیا جواب آتا ہے۔

انگلیوں سے خون بہنے کا جو خواب میں نے ایک مرتبہ پہلے دیکھا تھا وہ اب بار بار سامنے آنے لگا ہے۔ ''مینامتی'' کے پچھلے سارے واقعے پر نظر ڈالتا ہوں تو وہ سب کچھ بھی مجھے ایک خواب ہی سا لگتا ہے۔ بلکہ بابل کے کھنڈرات میں ''مینامتی'' کے صندوق کو دفن کر دینے کے بعد تو لگتا ہے کہ جیسے اب زندگی میں کرنے کو کچھ بچا ہی نہیں۔

والد کے انتقال کے بعد ایک دن میں بینک آف انگلینڈ گیا تھا۔ وہاں ان کے حسابات چیک کیے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے میرے لئے ترکے میں کافی معقول رقم چھوڑی ہے۔ میں نے اسی بینک کے لاکر میں سیسے کی وہ 9 تختیاں اور شہزادے دخت رز کے ہاتھ کی تین انگلیوں کی ہڈیاں بھی جمع کرا دی ہیں۔

اس سال یعنی 1923 جنوری کی 20 تاریخ تھی کہ میری والدہ بھی انتقال کر گئیں اور گھر میں میرے باپ کے مرنے سے جو ویرانی اور اداسی پہلے ہی سے چھائی ہوئی تھی اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ان کے انتقال کے 10 دن کے بعد یکم فروری کو مجھے لندن میں وزیر اعظم سیکرٹریٹ کی طرف سے ایک تہنیتی خط موصول ہوا جس میں مجھے مبارکباد دی گئی تھی کہ تاج برطانیہ نے مصر میں

فرعون رامسیس کی لاش کی دریافت پر مجھے ''سر'' کے خطاب سے نوازا ہے۔

ساتھ ہی ایک دوسرا خط بھی تھا جس میں لکھا تھا کہ:

''میرے بیٹے کو عارضی طور پر ایک ماہ کے لئے مصر بھی بھیجا جائے گا جہاں وہ رامسیس کی حنوط شدہ لاش کو دیکھ سکے گا''۔

میں نے اپنی پچھلی زندگی پر بہت سوچ بچار کیا ہے اور اوّل تا آخر اس ساحرہ جامش کی کوٹھڑی سے لے کر بابل کے کھنڈرات میں شہزادی ''مینامتی'' کو دفن کر دینے تک کے سب واقعات کو بار بار ذہن میں لا کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجھے اپنی وصیت اس طرح لکھ دینی چاہئے۔

''آج 8 اپریل 1923ء کی رات کو 12 بجے میری انگلیوں سے خون بہنا شروع ہوگا جو میری موت کا سبب بنے گا۔ میری موت کو طبعی نہ سمجھا جائے اور نہ یہ خودکشی ہے۔ میری لاش کا پوسٹ مارٹم بھی نہ کیا جائے کیونکہ ڈاکٹروں کو میری موت کا سبب معلوم نہ ہو سکے گا۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ بینک آف انگلینڈ کے لاکرز میں سیسے کی 9 تختیاں اور ایک قدیم مُردہ ہاتھ کی تین خشک انگلیوں کی ہڈیاں جو میرا قیمتی سرمایہ ہیں موجود ہیں۔ یہ میرے بیٹے ولسن میلکم کو جو قاہرہ میں آثار قدیمہ کی مہم میں شامل ہے دیدی جائیں''۔

سر جان میلکم۔
37۔ ہارلے اسٹریٹ، لندن۔
عمر 40 سال۔

تاریخ کی گتھی

انسانی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس کی مثال ایک پیاز سے دی جا سکتی ہے جس کی پرتیں کھلتی ہی چلی جائیں اور عقل یہ سوچنے پر مجبور نظر آئے کہ آخر یہ گتھی کب سلجھے گی۔ انسانی تاریخ کی گتھی بھی نہ کبھی سلجھی ہے اور نہ ہی سلجھے گی۔ تاریخ ہر دور میں مختلف اور ادھوری ہی نظر آتی ہے لیکن مرتب اثرات اور انسانی فہم و ادراک اور شعور و آگہی نے تاریخ کو ملیا میٹ ہونے سے ہمیشہ بچا کر رکھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کسی بھی عہد کی تاریخ کو مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس بڑے کام کو سر انجام دینے میں بلاشبہ کسی بھی دور کے ان بڑے انسانوں کا ہاتھ ہے جو تاریخ بنانے میں اہم کردار انجام دینے کی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ علم کی پیاس رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر دور کے سماجی رویوں کے سبب جو تبدیلی روز افزوں ہوتی رہی ہے اس سے آگاہی ہو۔ شوکت زیدی بھی ایسے ہی لوگوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ آنے والا مورخ اپنے دور کی تاریخ میں جن چند نمایاں لوگوں کو تذکرہ ضروری سمجھے گا ان میں یہ بھی شامل ہوں گے۔ ان کا تعلق بھی سندھ کے تیسرے بڑے شہر سکھر سے ہے جو میرا بھی شہر رہا ہے اور ہم دونوں نے مشترکہ طور پر علمی، ادبی سیاسی و سماجی زندگی کے نشیب و فراز سکھر ہی میں گزارے ہیں۔ اس حوالے سے میں جانتا ہوں کہ شوکت زیدی ہمہ جہت و ہمہ صفت انسان کا نام ہے جو بیک وقت ایک ماہر تعلیم، ادیب و شاعر اور سماجی حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک مورخ اور جغرافیہ دان بھی ہے اس لئے کہ میری معلومات کے مطابق شوکت زیدی تقریباً آدھی دنیا دیکھ چکے ہیں اور آدھی دنیا دیکھنے والے شخص کو ایک سیاح کہنے کے ساتھ ہی ایک تاریخ دان بھی بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں۔ ”مینا متی“ ایک ایسی سلسلہ وار کہانی کا نام ہے جو ہمارے ایک اور دوست ضیاء شہزاد کے ”ماہنامہ سات رنگ ڈائجسٹ“ میں قسط وار شائع ہو کر مقبولیت کے نئے ریکارڈ بنا چکی ہے۔ یہ کہانی بیک وقت ایک تاریخ بھی ہے اور ایک ایسا فکشن بھی جو اپنی طرز کا انوکھا اور سحر انگیز بھی ہے۔ یہ کہانی جغرافیائی حیثیت بھی رکھتی ہے اور پراسراریت کی ایک ایسی دلچسپ مثال بھی کہی جا سکتی ہے کہ پڑھنے والے کے جسم میں جھرجھری آئے بغیر رہا نہیں جائے۔ یہاں کسی لمبی چوڑی تاویل میں جائے بغیر صرف اتنا کہوں گا کہ ”مینا متی“ ضرور پڑھیے۔ اگر اس کہانی کو نہ پڑھا تو آپ کی علمیت متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گی۔

تو آئیے ”مینا متی“ پڑھتے ہیں۔

مظہر جمیل